دارُالسّلام
کتاب وسنت کی اشاعت کا عالمی ادارہ
• ریاض • جدہ • الخبر • شارجہ • لاہور
• لندن • ہیوسٹن • نیویارک

ہیڈ آفس: پوسٹ بکس: 22743 الریاض: 11416 سعودی عرب فون: 4033962-4043432 (009661)

فیکس: 4021659 ای میل: Darussalam@naseej.com.sa

بک شاپ فون: 4614483 فیکس: 4644945

جدہ فون وفیکس: 6807752 الخبر فون: 8692900 فیکس: 8691551

شارجہ فون: 5632623 (00916) فیکس: 5632624

پاکستان: ☆ 50 لوئر مال نزد ایم۔اے۔او کالج لاہور فون: 7232400 - 7240024 (0092 42)

فیکس: 7354072 ای میل: darussalam@mail.com

☆ رحمان مارکیٹ' غزنی سٹریٹ' اردو بازار' لاہور فون: 7120054 فیکس: 7320703

لندن: والتھامسٹو برانچ فون: 5202666 (0044 208) فیکس: 5217645 ریجنٹ پارک برانچ فون: 207 7243363

ہیوسٹن فون: 7220419 (001 713) فیکس: 7220431 ای میل: darsalam@dar-us-salam.com.

Website: http://www.dar-us-salam.com

نیویارک فون: 625 5925 (001718)

فتاویٰ اسلامیہ

(جلد دوم)

فتاویٰ

سماحۃ الشیخ عبدالعزیز بن عبداللہ بن باز رحمہ اللہ

فضیلۃ الشیخ محمد بن صالح العثیمین رحمہ اللہ

فضیلۃ الشیخ عبداللہ بن عبدالرحمن الجبرین

اور

اللجنۃ الدائمۃ للافتاء والارشاد سعودی عرب

احکام المساجد تا کتاب البیوع

جمع وترتیب:

فضیلۃ الشیخ محمد بن عبدالعزیز المسند حفظہ اللہ

ترجمہ:

مولانا محمد خالد سیف حفظہ اللہ

(اسلامی نظریاتی کونسل پاکستان)

نظرثانی:

ابو عبداللہ محمد عبدالجبار

دار السلام

کتاب و سنت کی اشاعت کا عالمی ادارہ

ریاض ○ جدہ ○ شارجہ ○ لاہور

لندن ○ ہیوسٹن ○ نیو یارک

DARUSSALAM

بسم اللہ الرحمن الرحیم

www.KitaboSunnat
فاسئلوا أهل الذكر
إن كنتم لا تعلمون
اگر تم نہیں جانتے تو اہل کتاب
(اہل علم) سے پوچھ لو (الأنبیاء ۲۱/۷)

فہرست مضامین فتاویٰ اسلامیہ (جلد دوم)

www.KitaboSunnat.com
أحكام
المساجد

مساجد کے احکام

مسجد کی لغوی تعریف

سوال مسجد کی لغوی اور شرعی تعریف کیا ہے؟

جواب مسجد کا لغوی معنی ہے "سجدہ کرنے کی جگہ" اور شرعاً ہر اس جگہ کو مسجد کہتے ہیں جسے مسلمانوں نے نماز پنجگانہ باجماعت ادا کرنے کے لیے تیار کیا ہو' مسجد کا اطلاق اس سے عام پر بھی ہوتا ہے چنانچہ اس میں وہ جگہ بھی داخل ہے جسے انسان اپنے گھر میں نفل یا فرض نماز ادا کرنے کے لیے مخصوص کر لیتا ہے جب کہ کسی عذر کی وجہ سے مسجد میں نماز باجماعت ادا کرنے سے عاجز و قاصر ہو' چنانچہ اسی سلسلہ میں وہ حدیث ہے جسے امام بخاری اور دیگر محدثین نے حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

«أُعْطِيتُ خَمْسًا لَّمْ يُعْطَهُنَّ أَحَدٌ قَبْلِي، نُصِرْتُ بِالرُّعْبِ مَسِيرَةَ شَهْرٍ، وَجُعِلَتْ لِيَ الْأَرْضُ مَسْجِدًا وَّطَهُورًا فَأَيُّمَا رَجُلٍ مِّنْ أُمَّتِي أَدْرَكَتْهُ الصَّلَاةُ فَلْيُصَلِّ»(صحيح البخاري، التيمم، باب:(١)، ح:٣٣٥ وصحيح مسلم، المساجد، باب المساجد ومواضع الصلاة، ح:٥٢١)

"مجھے پانچ ایسی چیزیں دی گئی ہیں' جو مجھ سے پہلے کسی (نبی) کو نہیں دی گئیں ① میری' ایک ماہ کی مسافت سے رعب کے ساتھ مدد کی گئی ہے ② میرے لیے ساری زمین کو سجدہ گاہ اور پاک بنا دیا گیا ہے لہٰذا میری امت کے جس آدمی کے لیے (جس جگہ) نماز کا وقت ہو جائے وہ وہاں نماز پڑھ لے ....."

——— فتویٰ کمیٹی ———

خواتین امام کو نہیں دیکھتیں' صرف اس کی تکبیر کو سنتی ہیں

سوال ہماری مسجد کے شمالی جانب کچھ جگہ ہے جہاں چار دیواری کی گئی اور اس جگہ کو مسجد کے ساتھ ملایا گیا ہے' ہم اس جگہ کو عورتوں کے لیے مخصوص کرنا چاہتے ہیں تاکہ وہ یہاں رمضان میں نماز ادا کر سکیں' تو کیا ان کے لیے یہاں نماز ادا کرنا جائز ہے کیونکہ وہ اس جگہ سے امام کو دیکھ نہیں سکتیں بلکہ صرف لاؤڈ سپیکر سے آواز سن کر امام کی اقتداء کر سکتی ہیں؟

جواب اس مذکورہ جگہ میں عورتوں کی نماز کے صحیح ہونے کے بارے میں علماء میں اختلاف ہے جب کہ وہ امام اور امام کے پیچھے مقتدیوں کو نہ دیکھ سکتی ہوں بلکہ صرف تکبیر کی آواز ہی سن سکتی ہوں۔ زیادہ احتیاط اس بات میں ہے کہ وہ مذکورہ جگہ نماز ادا نہ کریں بلکہ اپنے گھروں ہی میں ادا کریں الا یہ کہ انہیں مسجد میں نمازیوں کے پیچھے جگہ مل جائے یا مسجد سے باہر کوئی ایسی جگہ میسر آ جائے جہاں سے وہ امام یا بعض مقتدیوں کو دیکھ سکیں۔

شیخ ابن باز

شرعی طور پر معتبر' مسجد کی حدود

سوال شرعی طور پر معتبر' مسجد کی حدود کیا ہیں؟ کیا مسجد کے ساتھ متصل سڑکیں بھی مسجد کے تابع ہیں اور کیا جب لوگوں کی کثرت کی وجہ سے مسجد میں جگہ تنگ ہو تو ان سڑکوں پر نماز جمعہ ادا کرنا صحیح ہے جب کہ شہر میں اور بھی مسجدیں ہوں اور ان میں نمازیوں کا اس قدر ہجوم بھی نہ ہو؟

جواب اس مسجد کی حدود' جسے مسلمانوں کے نماز پنجگانہ باجماعت ادا کرنے کے لیے تیار کیا گیا ہو' وہ ہیں جن کا عمارت یا لکڑیوں یا کھجور کے تنوں یا سرکنڈوں وغیرہ کے ساتھ احاطہ کر دیا گیا ہو' اس جگہ کا حکم مسجد کا ہوتا ہے کہ اس میں حیض و نفاس اور جنابت والوں کا داخلہ ممنوع ہوتا ہے۔ جو شخص مسجد میں آئے اور مسجد نمازیوں سے بھر چکی ہو تو اس کے لیے جائز ہے کہ نماز جمعہ یا دیگر فرائض و نوافل مسجد سے باہر لیکن مسجد سے متصل' قریب ترین جگہ میں ادا کرے' بشرطیکہ اس کے لیے امام کے ساتھ مل کر نماز ادا کرنا ممکن ہو اور وہ امام کے آگے نہ ہو۔ لیکن یاد رہے اس جگہ کا حکم مسجد کا نہیں ہو گا۔ واللہ اعلم۔

فتویٰ کمیٹی

عورت مسجد میں نماز ادا کر سکتی ہے

سوال کمیٹی کو حسب ذیل سوال موصول ہوا کہ تنزانیہ میں بعض مشائخ نے مسلمانوں کو یہ فتویٰ دیا ہے کہ مسجد میں عورتوں کی نماز جائز نہیں ہے کیونکہ وہ نجس ہیں اور ان کے لیے مسجدوں میں داخل ہونا جائز نہیں اور اس فتویٰ کی وجہ سے مسلمانوں میں بہت اختلاف پیدا ہو چکا ہے؟

جواب کمیٹی نے اس کا حسب ذیل جواب دیا: انسان نجس نہیں ہے خواہ وہ مرد ہو یا عورت' زندہ ہو یا مردہ' لہٰذا عورت مسجد میں داخل ہو سکتی ہے ہاں البتہ اگر وہ جنبی یا حائضہ ہو تو پھر اس کے لیے مسجد میں داخل ہونا جائز نہیں الا یہ کہ وہ راستہ عبور کرنے والی ہو تو پھر اس حفاظت کے ساتھ گزر سکتی ہے کہ مسجد میں خون نہ گرے' ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ وَلَا جُنُبًا إِلَّا عَابِرِي سَبِيلٍ حَتَّىٰ تَغْتَسِلُوا ﴾ (النساء ٤/ ٤٣)

''اور جنابت کی حالت میں بھی (مسجد میں نہ جاؤ نہ نماز پڑھو) جب تک کہ غسل نہ کر لو' ہاں اگر (مسجد کے اندر سے) راہ چلتے گزر جانے والے ہو (تو یہ جائز ہے)۔''

امہات المومنین نبی ﷺ کے پاس اس وقت مسجد میں تشریف لے آیا کرتی تھیں جب آپ مسجد میں اعتکاف میں ہوتے تھے' اسی طرح ایک باندی مسجد نبوی کی صفائی کا کام بھی کیا کرتی تھی' نبی ﷺ نے مردوں کو منع فرمایا کہ وہ عورتوں کو مسجدوں میں نماز ادا کرنے سے روکیں' چنانچہ آپ نے فرمایا:

«لَا تَمْنَعُوا إِمَاءَ اللهِ مَسَاجِدَ اللهِ» (صحيح البخاري، الجمعة، باب:١٣، ح:٩٠٠ وصحيح مسلم، الصلاة، باب خروج النساء إلى المساجد . . . الخ، ح:٤٤٢)

"اللہ کی بندیوں کو اللہ کی مسجدوں سے نہ روکو۔"

حدیث سے بھی یہ ثابت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا:

«خَيْرُ صُفُوفِ الرِّجَالِ أَوَّلُهَا، وَشَرُّهَا آخِرُهَا، وَخَيْرُ صُفُوفِ النِّسَاءِ آخِرُهَا، وَشَرُّهَا أَوَّلُهَا»(صحيح مسلم، الصلاة، باب تسوية الصفوف وإقامتها ... الخ، ح:٤٤٠)

"مردوں کی بہترین' پہلی صف اور بدترین صف آخری ہے اور عورتوں کی بہترین صف' آخری اور بدترین صف پہلی ہے۔"

اس حدیث میں اس بات کا بیان ہے کہ نماز باجماعت ادا کرتے ہوئے انہیں مردوں کی صفوں کے اعتبار سے کہاں کھڑا ہونا چاہیے' نبی ﷺ نے یہ بھی فرمایا ہے:

«إِذَا اسْتَأْذَنَكُمْ نِسَاؤُكُمْ بِاللَّيْلِ إِلَى الْمَسْجِدِ فَأْذَنُوا لَهُنَّ»(صحيح البخاري، الأذان، باب خروج النساء إلى المساجد بالليل والغلس، ح:٨٦٥ وصحيح مسلم، الصلاة، باب خروج النساء إلى المساجد ... الخ، ح:٤٤٢)

"عورتیں اگر تم سے رات کی نماز مسجد میں ادا کرنے کی اجازت طلب کریں تو انہیں اجازت دے دیا کرو۔"

فتویٰ کمیٹی کی طرف سے عورت کے مسجد میں نماز باجماعت ادا کرنے کے بارے میں پہلے ایک فتویٰ صادر ہو چکا ہے جو کہ حسب ذیل ہے:

عورت کے لیے اس بات کی اجازت ہے کہ وہ نماز جمعہ اور دیگر تمام نمازیں باجماعت ادا کرنے کے لیے مسجد میں آ سکتی ہے۔ اس کے شوہر کے لیے یہ جائز نہیں کہ وہ اسے مسجد میں آنے سے منع کرے ہاں البتہ عورت کے لیے اپنے گھر میں نماز ادا کرنا افضل ہے۔ عورت جب مسجد میں آئے تو اسے ان آداب کی پابندی کرنی چاہیئے جو اسلام نے اسے سکھائے ہیں' یعنی لباس ایسا زیب تن کرے جو ستر پوشی کے تقاضوں کو پورا کرتا ہو' چست اور باریک لباس پہننے سے اجتناب کرے' مسجد میں آتے وقت خوشبو بھی استعمال نہ کرے' مردوں کی صفوں میں بھی شامل نہ ہو بلکہ مردوں کی صفوں کے پیچھے صف بنائے۔ رسول اللہ ﷺ کے زمانہ میں عورتیں اس طرح مسجدوں میں آتی تھیں کہ انہوں نے اپنی چادروں کے ساتھ اپنے آپ کو چھپا رکھا ہوتا تھا اور وہ مردوں کی صفوں کے پیچھے صفیں بنا کر نماز ادا کیا کرتی تھیں۔ حدیث سے ثابت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا:

«لاَ تَمْنَعُوا إِمَاءَ اللهِ مَسَاجِدَ اللهِ» (صحيح البخاري، الجمعة، باب:١٣، ح:٩٠٠، وصحيح مسلم، الصلاة، باب خروج النساء إلى المساجد ... الخ، ح:٤٤٢)

"اللہ کی بندیوں کو اللہ کی مسجدوں سے نہ روکو"

اور آپ نے یہ بھی فرمایا ہے:

«خَيْرُ صُفُوفِ النِّسَاءِ آخِرُهَا، وَشَرُّهَا أَوَّلُهَا»(صحيح مسلم، الصلاة، باب تسوية الصفوف وإقامتها ... الخ، ح:٤٤٠)

"عورتوں کی بہترین صف' آخری صف اور بدترین صف' پہلی صف ہے۔ وصلى الله على نبينا محمد وآله

وصحبہ وسلم

فتویٰ کمیٹی

جب مقتدی امام اور اس کے پیچھے مقتدیوں کو نہ دیکھ سکتا ہو.....

سوال ① مسجد کے تہ خانے (یا گیلری) میں نماز پڑھنے کے بارے میں کیا حکم ہے جب کہ مقتدی' امام اور امام کے پیچھے کے مقتدیوں کو نہیں دیکھ سکتا بلکہ وہ صرف لاؤڈ سپیکر کے ذریعے امام کی آواز سن سکتا ہے؟

سوال ② مسجد کے گراؤنڈ فلور میں نماز جمعہ باجماعت ادا کی جا رہی تھی کہ دوران نماز بجلی کی رو منقطع ہو گئی اور اب چونکہ مقتدی امام کی آواز نہیں سن سکتے تھے اس لیے ان میں سے ایک مقتدی آگے بڑھا اور اس نے امام بن کر نماز پڑھا دی۔ تو اس نماز کے بارے میں کیا حکم ہے؟ یاد رہے کہ مقتدیوں میں سے اس امام بننے والے شخص نے اسے نماز جمعہ کے طور پر پڑھایا ہے۔ اور اگر اس صورت میں مقتدیوں میں سے کوئی آگے بڑھ کر نماز کی تکمیل نہ کرائے تو کیا پھر ہر شخص علیحدہ علیحدہ اپنی نماز کی تکمیل کر لے؟ اور اگر اس صورت میں الگ الگ نماز پڑھنا جائز ہے تو کیا ظہر کی نماز پڑھی جائے یا جمعہ کی جب کہ جمعہ کا خطبہ بھی سنا تھا اور نماز جمعہ کو امام کے ساتھ شروع کر کے ایک رکعت بھی پڑھ لی تھی؟

سوال ③ جب آدمی ممنوع وقت میں مسجد میں داخل ہو تو تحیۃ المسجد پڑھے یا نہ پڑھے؟

جواب ① اس میں کوئی حرج نہیں جب کہ تہ خانہ (یا گیلری) مسجد کے تابع ہو' دلائل کے عموم سے یہی معلوم ہوتا ہے۔

جواب ② اگر امر واقعہ اسی طرح ہے جیسا کہ سائل نے ذکر کیا ہے تو سب لوگوں کی نماز صحیح ہو گی کیونکہ جو شخص جمعہ کی ایک رکعت پا لے اس نے نماز جمعہ کو پا لیا جیسا کہ رسول اللہ ﷺ کی صحیح حدیث سے ثابت ہے۔ اس صورت میں اگر مقتدیوں میں سے کوئی امام نہ بنے تو ہر شخص آخری رکعت کو علیحدہ علیحدہ پڑھ لے' جس طرح کہ وہ شخص پڑھتا ہے جس نے امام کے ساتھ صرف ایک رکعت کو پایا ہو اور اس کی ایک رکعت رہ گئی ہو تو وہ اپنی دوسری رکعت خود پڑھ لیتا ہے۔ ان لوگوں کی نماز جمعہ صحیح ہو گی کیونکہ نبی ﷺ کے اس فرمان کے عموم سے یہی معلوم ہوتا ہے:

«مَنْ أَدْرَكَ رَكْعَةً مِّنَ الصَّلاَةِ فَقَدْ أَدْرَكَ الصَّلاَةَ»(صحيح البخاري، مواقيت الصلاة، باب من أدرك من الصلاة ركعة، ح: ٥٨٠ وصحيح مسلم، المساجد، باب من أدرك ركعة من الصلاة ... الخ، ح: ٦٠٧)

"جس نے نماز کی ایک رکعت پا لی اس نے نماز پا لی۔"

جواب ③ علماء کے صحیح قول کے مطابق اس کے لیے افضل یہی ہے کہ اس وقت بھی تحیۃ المسجد پڑھے کیونکہ نبی ﷺ کے اس فرمان کے عموم سے یہی معلوم ہوتا ہے:

«إِذَا دَخَلَ أَحَدُكُمُ الْمَسْجِدَ فَلاَ يَجْلِسْ حَتَّى يُصَلِّيَ رَكْعَتَيْنِ»(صحيح البخاري، التهجد، باب ما جاء في التطوع مثنى مثنى، ح: ١١٦٣ وصحيح مسلم، صلاة المسافرين، باب استحباب تحية المسجد ... الخ، ح: ٧١٤)

"جب تم میں سے کوئی مسجد میں داخل ہو تو اس وقت تک نہ بیٹھے جب تک دو رکعتیں نہ پڑھ لے۔"

اور اگر کوئی شخص بیٹھ جائے اور نماز نہ پڑھے تو پھر بھی کوئی حرج نہیں۔

——— شیخ ابن باز ———

مسجد نبوی کے توسیع شدہ حصے میں نماز کا حکم

سوال کیا مسجد نبوی کے توسیع شدہ حصہ میں چھتریوں کے نیچے نماز پڑھنا بھی اسی طرح ہے جس طرح مسجد نبوی کے اندر نماز ادا کرنا؟

جواب وہ مقامات جو توسیع کے وقت مسجد نبوی میں داخل ہو جائیں تو ان کا حکم بھی مسجد ہی کا ہے لہٰذا مسجد نبوی میں جو اضافہ و توسیع کی گئی اور جن مقامات کو اس میں داخل کر دیا گیا ان کا حکم بھی مسجد نبوی ہی کا ہے کہ وہاں اجروثواب زیادہ ملتا ہے' اگرچہ پہلی اور دوسری صفوں میں نماز ادا کرنے کے اعتبار سے اجروثواب میں یقیناً فرق ہو گا۔

——— فتویٰ کمیٹی ———

خواتین تکبیر تو سنتی ہیں لیکن امام اور اس کے پیچھے مقتدیوں کو نہیں دیکھتیں

سوال ہماری مسجد دو منزلہ ہے۔ اوپر کی منزل مردوں کے لیے اور نچلی منزل عورتوں کے لیے ہے۔ عورتیں بھی مسجد میں مردوں کے ساتھ نماز باجماعت ادا کرتی ہیں لیکن عورتیں امام کو بلکہ مردوں کی صفوں تک کو بھی نہیں دیکھ سکتیں' وہ صرف مائیکروفون کے ذریعے آواز سن سکتی ہیں تو اس حالت میں نماز کا کیا حکم ہے؟

جواب اس مذکورہ صورت میں سب کی نماز صحیح ہے کیونکہ سب مسجد میں نماز ادا کر رہے ہیں اور لاؤڈ سپیکر کے ذریعے آواز سننے کی وجہ سے امام کی اقتداء ممکن ہے' چنانچہ اس صورت میں علماء کے دو اقوال میں سے صحیح ترین قول یہی ہے کہ نماز صحیح ہے ہاں البتہ اس صورت میں اختلاف کی ضرور اہمیت ہے جب کچھ مقتدی مسجد سے باہر ہوں اور وہ امام اور مقتدیوں کو نہ دیکھ سکتے ہوں۔ واللہ ولی التوفیق.

——— شیخ ابن باز ———

مسجدوں میں بچوں کی حاضری

سوال بعض نمازی جب مسجد میں آتے ہیں تو ان کے ساتھ اتنے چھوٹے بچے بھی ہوتے ہیں جو ابھی تک شعور کی عمر کو نہیں پہنچے ہوتے اور وہ نماز بھی اچھے طریقے سے نہیں پڑھ سکتے لیکن نمازیوں کے ساتھ صف میں شامل ہو جاتے ہیں اور ان میں سے بعض دوران نماز ہی کھیلنے لگتے اور اپنے ساتھ کھڑے نمازیوں کو پریشان کرنا شروع کر دیتے ہیں تو اس سلسلے میں کیا حکم ہے؟ بچوں کے وارثوں کے لیے آپ کے کیا ارشادات ہیں؟

جواب میری رائے میں ایسے بچوں کو مسجد میں لانا جائز نہیں ہے جو نمازیوں کے لیے باعث تشویش ہوں کیونکہ اس میں فریضۂ الٰہی ادا کرنے والے نمازیوں کے لیے ایذاء ہے۔ نبی کریم ﷺ نے جب بعض صحابہ کو نماز پڑھتے اور جہری قراءت کرتے ہوئے سنا تو فرمایا:

«لاَ يَجْهَرْ بَعْضُكُمْ عَلٰى بَعْضٍ بِالْقِرَاءَةِ» (مسند أحمد: ٢/ ٣٦، ٦٧)

”جب کچھ لوگ نماز پڑھ رہے ہوں تو باقی جہری قراءت نہ کریں“

ایک دوسری حدیث میں یہ الفاظ ہیں:

«لاَ يُؤْذِيَنَّ بَعْضُكُمْ بَعْضًا»(سنن أبي داود، الصلاة، باب رفع الصوت بالقراءة ... الخ، ح:١٣٣٢)

”بعض نمازی بعض دوسروں کو ایذاء نہ پہنچائیں۔“

اس سے معلوم ہوا کہ وہ کام جائز نہیں ہے جس سے نمازیوں کو تکلیف پہنچتی ہو۔

میری ان بچوں کے وارثوں کو نصیحت ہے کہ وہ انہیں مسجد میں نہ لائیں اور اسی رشد و بھلائی کو اختیار کریں جو نبی کریم ﷺ نے اپنے اس ارشاد میں تعلیم فرمائی ہے:

«مُرُوا أَبْنَاءَ كُمْ بِالصَّلاَةِ لِسَبْعِ سِنِينَ وَاضْرِبُوهُمْ عَلَيْهَا لِعَشْرِ سِنِينَ» (سنن أبي داود، الصلاة، باب متى يؤمر الغلام بالصلاة، ح: ٤٩٤، ٤٩٥ ومسند أحمد: ٢/ ١٨٧، واللفظ له)

”اپنے بچوں کو نماز کا حکم دو جب وہ سات سال کے ہو جائیں اور اگر دس سال کے ہو کر بھی نماز نہ پڑھیں تو انہیں مارو۔“

میں اہل مسجد کے لیے بھی یہ وصیت کرتا ہوں کہ ان بچوں کے لیے ان کے سینے کشادہ ہونے چاہئیں جن کا مسجد میں آنا درست ہے، انہیں وہ مشقت میں نہ ڈالیں اور نہ اس جگہ سے انہیں اٹھائیں جہاں وہ سبقت کر کے آ بیٹھے ہوں کیونکہ جو شخص جس جگہ سبقت کر کے آ بیٹھے وہ اس کا زیادہ حق دار ہے۔ خواہ وہ بچہ ہو یا بڑا۔ بچوں کو صف میں سے ان کی جگہ سے اٹھا دینے میں (اولاً) ان کی حق تلفی ہے کیونکہ جو شخص سبقت کر کے کسی ایسی جگہ بیٹھ جائے جہاں کوئی اور مسلمان سبقت کر کے نہ پہنچا ہو تو وہ اس کا زیادہ حق دار ہے۔ (ثانیا) اس سے ان کے دلوں میں مسجد سے نفرت پیدا ہو گی۔ (ثالثاً) بچے کے دل میں اس شخص کے بارے میں کینہ اور کراہت پیدا ہو گی جو اسے اس جگہ سے اٹھائے گا جہاں وہ پہلے سے آ کر بیٹھا ہے۔ (رابعًا) بچوں کو ان کی جگہ سے اٹھا دینے کی صورت میں وہ سب اکٹھے ہو جائیں گے اور وہ کھیلنے لگیں گے جس سے اہل مسجد کو پریشانی لاحق ہو گی اور اگر بچے الگ الگ ہو کر مردوں کے درمیان میں کھڑے ہوں گے تو پھر اس طرح کی کوئی پریشانی لاحق نہ ہو گی۔

بعض اہل علم نے جو ذکر کیا ہے کہ بچوں کو ان کی جگہ سے اٹھا دیا جائے حتیٰ کہ وہ صف کے آخر میں یا آخری صف میں کھڑے ہوں اور انہوں نے اس سلسلہ میں نبی کریم ﷺ کے اس ارشاد سے استدلال کیا ہے:

«لِيَلِنِي مِنْكُمْ أُولُو الْأَحْلاَمِ وَالنُّهٰى» (صحيح مسلم، الصلاة، باب تسوية الصوف وإقامتها وفضل الأول منها... الخ، ح: ٤٣٢)

”تم میں سے بالغ اور صاحب فہم و دانش میرے قریب کھڑے ہوں۔“

تو یہ قول مرجوح ہے اور نبی کریم ﷺ کے اس ارشاد کے معارض بھی ہے:

«مَنْ سَبَقَ إِلٰى مَا لَمْ يَسْبِقْهُ إِلَيْهِ مُسْلِمٌ فَهُوَ لَهُ»(سنن أبي داود، الخراج، باب في إقطاع الارضين، ح: ٣٠٧١)

"جو شخص کسی ایسی چیز کی طرف سبقت کر گیا ہو جہاں کوئی اور مسلمان سبقت نہ کر سکا ہو تو وہ چیز اسی (سبقت کرنے والے) کی ہے۔"

ان حضرات کا استدلال نبی ﷺ کے اس ارشاد سے ہے:

«لِيَلِنِي مِنْكُمْ أُولُو الْأَحْلَامِ وَالنُّهٰى»(صحيح مسلم، الصلاة، باب تسوية الصوف وإقامتها وفضل الأول منها ... الخ، ح:١٢٣، ٤٣٢)

"میرے قریب وہ کھڑے ہوں جو صاحب فہم و دانش ہوں۔"

درست نہیں ہے کیونکہ اس حدیث کے معنی یہ ہیں کہ اس میں اصحاب فہم و دانش کو ترغیب دی گئی ہے کہ وہ آگے بڑھیں' سبقت کریں اور نبی کریم ﷺ کا جو عمل دیکھا یا قول سنا اس کو زیادہ یاد رکھنے والے ہوں گے۔ آپ نے یہ تو نہیں فرمایا کہ صرف صاحب فہم و دانش ہی میرے قریب کھڑے ہوں۔ ہاں اگر آپ نے ایسا فرمایا ہوتا تو پھر بچوں کو ان کی جگہ سے اٹھا دینے کی بات درست ہوتی لیکن حدیث کے الفاظ جو ہیں ان میں اصحاب فہم و دانش کو حکم دیا گیا ہے کہ وہ آگے بڑھیں اور سبقت کر کے نبی کریم ﷺ کے قریب کھڑے ہوں۔

شیخ ابن عثیمین

قدیمی مسجد کو منہدم کر کے اس کی جگہ پبلک لائبریری بنانا

سوال کیا قدیمی مسجد کو جو ابھی تک قائم ہو' منہدم کرنا جائز ہے تاکہ اس کی جگہ پر ایک پبلک لائبریری بنا دی جائے؟ اگر ایسا ممکن ہے تو کیا یہ جائز ہے کہ مسجد کی جگہ کا معاوضہ لے لیا جائے یا مسجد کی انتظامیہ کو کیا اس بات کا اختیار حاصل ہے کہ اس کی بجائے کسی دوسری جگہ نئی مسجد قبول کر لیں؟

جواب قائم شدہ مسجد کو منہدم کرنا جائز نہیں' خواہ وہ کتنی ہی قدیم کیوں نہ ہو' تاکہ اس کی جگہ پر ایک پبلک لائبریری بنا دی جائے بلکہ اگر مسجد منہدم ہو چکی ہو تو پھر بھی اس کی جگہ پر پبلک لائبریری بنانا جائز نہیں' بلکہ واجب یہ ہے کہ اگر مسجد کی عمارت پرانی ہو چکی ہے تو اس کی اصلاح کر دی جائے اور اگر از خود منہدم ہو چکی ہے تو اس کی جگہ پر از سر نو مسجد تعمیر کر دی جائے خواہ اس کی اصلاح و تعمیر کی غرض سے اس کے کچھ حصے کو بیچنا ہی کیوں نہ پڑے کیونکہ وقف کے سلسلہ میں اصول تو یہی ہے کہ اسے بیچا جائے نہ ہبہ کیا جائے اور نہ بطور وراثت تقسیم کیا جائے جیسا کہ نبی ﷺ نے حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ سے اس وقت فرمایا تھا' جب انہوں نے خیبر میں اپنے مال کو صدقہ کرنے کی خواہش کا اظہار کیا تھا:

«تَصَدَّقْ بِأَصْلِهِ لاَ يُبَاعُ وَلاَ يُوهَبُ وَلاَ يُورَثُ وَلٰكِنْ يُنْفَقُ ثَمَرُهُ» (صحيح البخاري، الوصايا، باب وما للوصي ان يعمل ... الخ، ح:٢٧٦٤)

"اصل مال صدقہ کر دیجئے کہ اسے نہ بیچا جائے نہ ہبہ کیا جائے اور نہ بطور وراثت تقسیم کیا جائے اور اس کا پھل خرچ کر دیا جائے۔"

یہ ارشاد نبوی گویا ہر وقف کے بارے میں ایک حکم عام کی حیثیت رکھتا ہے لیکن علماء نے اس صورت کو مستثنیٰ قرار دیا ہے کہ جب وقف کی افادیت ختم ہو جائے یا اسے کسی دوسری جگہ منتقل کرنے میں اس کی افادیت زیادہ ہو' لوگوں کی اس

میں دلچسپی زیادہ ہو اور خود وقف کی اصلاح کے لیے بھی بہتر ہو تو پھر اس کی بیع یا کسی دوسری جگہ سے اس کا تبادلہ کرنا جائز ہے جیسا کہ روایت کیا گیا ہے کہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کو جب یہ خبر پہنچی کہ کوفہ کے بیت المال میں نقب زنی کی واردات ہو گئی ہے تو انہوں نے حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ کو خط لکھا کہ "تمارین (جگہ) میں مسجد کو منتقل کر دو اور بیت المال کو مسجد کے قبلہ کی طرف بنا دو کیونکہ مسجد میں ہر وقت کوئی نہ کوئی نمازی موجود ہوتا ہے (اس طرح بیت المال محفوظ رہے گا۔)" [1]

حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی موجودگی میں یہ فیصلہ فرمایا اور جب کسی نے اس کی مخالفت نہیں کی تو گویا اس پر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا اجماع ہو گیا اور جب وقف کو اپنی اصلی شکل و صورت میں باقی رکھنا مشکل ہو تو پھر اس کے بقاء کی صرف یہی صورت ہے اور پھر یہ بھی ضروری ہے کہ جواز کی حالت میں وقف کی بیع یا تبادلہ شرعی حاکم یا اس کے نائب کے ہاتھوں سے ہو تاکہ وقف کے سلسلہ میں احتیاط اور حفاظت کا پہلو پیش نظر رہے اور وقف ضائع نہ ہو۔ وصلی اللہ علی محمد و آلہ وصحبہ وسلم۔

———— فتویٰ کمیٹی ————

حائضہ اور جنبی کے لیے مسجد حلال نہیں

سوال ایک عورت مسجد نبوی میں تھی کہ ماہواری کا خون شروع ہو گیا تو اس کے بعد وہ تھوڑا سا وقت مسجد میں رہی تاآنکہ اس کے اہل خانہ نماز سے فارغ ہو گئے اور پھر یہ ان کے ساتھ مسجد سے باہر چلی گئی' تو کیا یہ تھوڑا سا وقت مسجد میں رہنے کی وجہ سے یہ عورت گناہ گار ہو گی؟

جواب اگر یہ عورت از خود تنہا مسجد سے باہر نہ نکل سکتی ہو تو کوئی حرج نہیں اور اگر یہ از خود باہر نکل سکتی ہو تو پھر اسے فوراً مسجد سے باہر نکل جانا چاہیئے کیونکہ حیض' نفاس اور جنابت والوں کے لیے مسجدوں میں بیٹھنا جائز نہیں ہے۔ کیونکہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ وَلَا جُنُبًا إِلَّا عَابِرِي سَبِيلٍ ﴾ (النساء ٤/ ٤٣)

"اور جنابت کی حالت میں بھی (مسجد میں جاؤ نہ نماز پڑھو) ہاں اگر (مسجد کے اندر سے) راہ چلتے گزر جانے والے ہو (تو یہ جائز ہے۔)"

اور نبی کریم ﷺ سے روایت کیا گیا ہے کہ آپ نے فرمایا:

«إِنِّي لَا أُحِلُّ الْمَسْجِدَ لِحَائِضٍ وَّلَا جُنُبٍ»(سنن أبي داود، الطهارة، باب في الجنب يدخل المسجد، ح: ٢٣٢)

"میں حائضہ اور جنبی کے لیے مسجد کو حلال قرار نہیں دیتا۔"

———— شیخ ابن باز ————

[1] فتاویٰ ابن تیمیہ (216/31)

مسجد میں ایسی کتابوں کا پڑھنا جن میں تصویریں ہوں

سوال بعض طلبہ اپنے اسباق یاد کرنے کے لیے مسجدوں میں آ جاتے ہیں اور ان کی کتابیں بھی ان کے پاس ہوتی ہیں تو کیا ان کے لیے یہ درست ہے خصوصاً اس صورت میں جب بعض نصابی کتابوں میں انسانوں اور حیوانوں کی تصویریں بھی طبع ہوتی ہیں؟

جواب مسجدوں میں پڑھنے اور اسباق یاد کرنے میں کوئی حرج نہیں لیکن واجب ہے کہ اللہ تعالیٰ کے گھروں کو ایذاء اور آوازوں کے شور سے پاک رکھا جائے اور ایسے کم عقل اور چھوٹے بچوں کو مسجد میں نہ آنے دیا جائے جو مسجد کے قالینوں' قرآن مجید کے نسخوں اور درودیوار کا احترام نہ کریں۔ اگر ایذاء کی صورت نہ ہو تو مسجد میں اسباق یاد کرنے میں کوئی حرج نہیں' ہاں البتہ ایسے نصابی مواد اور مجلّات وغیرہ کو مسجد میں لانا جائز نہیں جن میں جانداروں کی تصویریں بنی ہوں تاکہ اللہ کے گھروں کے تقدس اور احترام کے پیش نظر انہیں ان تصویروں سے پاک رکھا جائے جن سے فرشتے دور بھاگتے ہیں لہٰذا طلبہ کو چاہیئے کہ وہ تصویروں والی کتابیں ساتھ نہ لائیں یا پھر جانداروں کی تصویریں یا ان کے سر وغیرہ مٹا دیں اور انہیں اس طرح کر دیں کہ جس سے زندگی ختم ہو جاتی ہے۔

——— شیخ ابن جبرین ———

مسجد میں جگہ نہ ملنے کی صورت میں سڑکوں پر نماز پڑھنا

سوال جو شخص مسجد سے باہر نماز جمعہ ادا کرتا ہے کیا اسے نماز جمعہ میں حاضر سمجھا جائے گا؟ حالانکہ فرشتے تو مسجدوں کے دروازوں پر کھڑے ہو کر لکھتے ہیں کہ پہلے کون آیا پھر کون؟ اس کے ساتھ ساتھ جو شخص مسجد سے باہر نماز پڑھے گا وہ تحیۃ المسجد پڑھے' مسجد کے اندر بیٹھنے اور خطبہ سننے سے بھی محروم رہے گا اور باہر سڑکوں پر صفیں بھی عموماً سیدھی نہیں ہوتیں؟

جواب جو شخص مسجد سے باہر سڑکوں پر نماز جمعہ ادا کرے گا' اسے نماز جمعہ میں حاضر سمجھا جائے گا بشرطیکہ وہ امام کے ساتھ مل کر نماز ادا کر سکتا ہو لیکن اس شخص کا ثواب مسجد کے اندر نماز پڑھنے والے کی طرح نہ ہو گا خصوصاً ان لوگوں کے ثواب کی طرح تو بالکل نہ ہو گا جو پہلی صفوں میں شامل ہوں گے۔ فرشتے خطیب کے منبر پر چڑھنے سے پہلے وقت کے حساب سے اجروثواب لکھتے ہیں جیسا کہ اس سلسلہ میں وارد حدیث کے عموم سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ اعتبار حاضری کا ہے مسجد کے اندر ہونے کا نہیں ہاں البتہ انتظار نماز اور سماعت خطبہ کی کمی کی وجہ سے اس کے اجروثواب میں بھی کمی ہو گی اور صفوں کے درست نہ ہونے کی کمی کی وجہ سے اس کے ثواب میں کمی ہو گی۔ واللہ اعلم وصلی اللہ وسلم علی نبینا محمد۔

——— فتویٰ کمیٹی ———

راستوں میں نماز پڑھنے کے بارے میں حکم

سوال کیا راستے بھی ان مقامات میں داخل ہیں جہاں نماز پڑھنا ممنوع ہے؟ اس کی کیا دلیل ہے؟ اور پھر اس میں اور نبی ﷺ کے اس فرمان میں تطبیق کی کیا صورت ہو گی کہ "میرے لیے زمین کو مسجد اور پاک بنا دیا گیا ہے؟"

جواب ہاں وہ راستہ جس پر لوگ چلتے اور اسے اپنے پاؤں سے پائمال کرتے ہیں وہ بھی ان سات مقامات میں داخل ہے

جن میں نماز پڑھنے سے نبی کریم ﷺ نے منع فرمایا ہے' چنانچہ ابن ماجہ نے "سنن" میں حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا:

«سَبْعُ مَوَاطِنَ لاَ تَجُوزُ فِيهَا الصَّلاَةُ: ظَاهِرُ بَيْتِ اللهِ، وَالْمَقْبَرَةُ، وَالْمَزْبَلَةُ، وَالْمَجْزَرَةُ، وَالْحَمَّامُ، وَعَطَنُ الْإِبِلِ، وَمَحَجَّةُ الطَّرِيقِ» (جامع الترمذي، الصلاة، باب ما جاء في كراهية ما يصلى إليه وفيه ح:٣٤٦ وسنن ابن ماجه، المساجد، باب المواضع التي تكره فيها الصلاة، ح:٧٤٧ واللفظ له)

"سات مقامات ایسے ہیں جن میں نماز جائز نہیں۔ (۱) بیت اللہ شریف کی چھت (۲) قبرستان (۳) کوڑے کرکٹ کا ڈھیر (۴) مذبح خانہ (۵) حمام (۶) اونٹوں کا باڑہ (۷) راستہ"

اس حدیث کی سند اگرچہ ضعیف ہے لیکن کچھ اور احادیث بھی ہیں جن میں ان مقامات کا ذکر ہے جن میں نماز پڑھنا ممنوع ہے۔ اور ان میں اور حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہما سے مروی اس حدیث میں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

«جُعِلَتْ لِيَ الْأَرْضُ مَسْجِدًا وَّطَهُورًا فَأَيُّمَا رَجُلٍ أَدْرَكَتْهُ الصَّلاَةُ فَلْيُصَلِّ حَيْثُ أَدْرَكَتْهُ»(صحيح البخاري، الصلاة، باب قول النبي ﷺ جعلت لي الأرض ... الخ، ح:٤٣٨ وصحيح مسلم، المساجد، باب المساجد ومواضع الصلاة، ح:٥٢١ ومسند أحمد:٣/ ٣٠٤)

"میرے لیے زمین کو پاک اور سجدہ گاہ بنا دیا گیا ہے۔ آدمی کے لیے جہاں نماز کا وقت ہو جائے' وہ وہاں نماز پڑھ لے۔"

تطبیق اس طرح ہو گی کہ حدیث جابر وغیرہ جن میں ہر جگہ نماز پڑھنے کی اجازت ہے' عام ہیں اور وہ احادیث خاص ہیں جن میں کچھ مقامات میں نماز پڑھنے کی ممانعت آتی ہے۔ لہٰذا ان احادیث سے ہر جگہ نماز پڑھنے کی اجازت والی احادیث کے عموم کو خاص کر دیا جائے گا۔ جیسا کہ بظاہر متعارض احادیث میں تطبیق کا معروف قاعدہ ہے' ہاں البتہ بوقت حاجت و ضرورت کسی ممنوع جگہ پر نماز ادا کرنا بھی جائز ہے۔

—— فتویٰ کمیٹی ——

مسجد میں جگہ مخصوص کرنا

سوال مسجد میں پہلی صف میں اپنے لیے جگہ مخصوص کرنے کے بارے میں کیا حکم ہے کہ نمازی کسی خاص جگہ پر کتاب یا کوئی اور چیز رکھ دے اور پھر مسجد کے آخری حصہ میں جا کر دیوار کے ساتھ ٹیک لگا کر بیٹھ جائے یا وضو کرنے کے لیے مسجد سے باہر چلا جائے؟

جواب اس میں کوئی حرج نہیں جب آدمی کو تجدید وضو کی ضرورت ہو اور وہ اپنی جگہ پر جائے نماز یا کوئی اور چیز رکھ کر چلا جائے تو وہی اس جگہ کا زیادہ حق دار ہے جیسا کہ حدیث میں آیا ہے:

«إِذَا قَامَ أَحَدُكُمْ مِّنْ مَّجْلِسِهِ ثُمَّ رَجَعَ إِلَيْهِ فَهُوَ أَحَقُّ بِهِ»(صحيح مسلم، السلام، باب إذا قام من مجلسه... الخ، ح:٢١٧٩)

"جب تم میں سے کوئی اپنی جگہ سے اٹھے اور پھر واپس لوٹ آئے تو وہ اس جگہ کا زیادہ حق دار ہے۔"

اسی طرح جب اسے ٹیک لگانے کی ضرورت محسوس ہو اور پہلی صف میں کوئی ایسی چیز نہ ہو جس کے ساتھ وہ ٹیک لگا سکے' اپنی جگہ پر مصلّٰی رکھ دے اور پیچھے ستون وغیرہ کے ساتھ ٹیک لگا کر بیٹھ جائے تو اس میں کوئی حرج نہیں۔ وہ اپنی اس جگہ کا زیادہ حق دار ہے بشرطیکہ اس سے نمازیوں کو کوئی تکلیف نہ ہو۔ وہاں اس صورت میں بھی جگہ مخصوص کرنا منع ہے کہ آدمی بہت جلدی جا کر جگہ پر قبضہ کر لے اور پھر اپنے گھر یا دوکان پر دنیوی کام کاج کے لیے چلا جائے یا جا کر سو جائے یا لوگوں سے ملنے ملانے کے لیے چلا جائے تو ایسی صورتوں میں اس کا مصلّٰی وغیرہ اٹھا کر اس جگہ نماز پڑھنا جائز ہے۔

——— شیخ ابن جبرین ———

مسجدوں اور عید گاہوں کا قبرستان کے قریب بنانا

سوال بعض مسجدیں' عید گاہیں اور نماز استسقاء ادا کرنے کے لیے بنائی گئی جگہیں قبرستان کے بہت قریب بنی ہوتی ہیں کہ قبرستان مسجد کے قبلہ کی طرف ہوتا ہے اور درمیان میں صرف چند میٹر کا فاصلہ ہوتا ہے' جب کہ بعض مسجدیں اور عید گاہیں بالکل قبرستان کے ساتھ ہی ملی ہوتی ہیں۔ بعض کے درمیان صرف چار دیواری ہی حد فاصل ہوتی ہے جب کہ بعض میں کوئی ایسی چار دیواری بھی نہیں ہوتی جو دونوں کے درمیان حد فاصل کا کام دے سکے تو اس بارے میں کیا حکم ہے؟

جواب اگر ان مسجدوں اور نماز عیدین و استسقاء کے لیے بنائی گئی جگہوں (عید گاہوں) کو قبرستان کے قریب اس میں مدفون لوگوں کی تکریم کی وجہ سے نہ بنایا گیا ہو یا یہ مقصود نہ ہو کہ ان مسجدوں میں نماز پڑھنے سے اجر و ثواب زیادہ ملے گا تو پھر ان کا بنانا اور ان میں تقرب الٰہی کے حصول کے لیے نماز پڑھنا جائز ہے۔ نماز اور مسجد میں ادا کی جانے والی دیگر تمام عبادات صحیح ہیں اور جن مسجدوں اور قبرستانوں کو دیوار کے ذریعہ الگ کر دیا گیا ہو تو یہ کافی ہے اور جہاں دیوار نہیں ہے وہاں دیوار بنا دی جائے تاکہ مسجدیں' عید گاہیں اور قبرستان الگ الگ ہو جائیں اور اگر مسجد و عید گاہ کی دیوار اور قبرستان کی دیوار کے درمیان خالی جگہ رکھنا ممکن ہو تو اس میں اور بھی زیادہ احتیاط ہے۔

اگر مسجدوں کو قبرستان کے قریب قبروں کی تعظیم کی وجہ سے بنایا گیا ہو تو پھر ان میں نماز پڑھنا جائز نہیں بلکہ ضروری ہے کہ ان مسجدوں کو گرا دیا جائے کیونکہ اس صورت میں ان کو برقرار رکھنا شرک کا سبب اور اہل قبور کو اللہ تعالیٰ کا شریک بنانے کا ذریعہ ہے اور صحیح حدیث میں ہے۔ نبی کریم ﷺ نے فرمایا:

«لاَ تُصَلُّوا إِلَى الْقُبُورِ، وَلاَ تَجْلِسُوا عَلَيْهَا»(صحيح مسلم، الجنائز، باب النهي عن الجلوس على القبر والصلاة عليه، ح: ٩٧٢)

"قبروں کی طرف منہ کر کے نماز نہ پڑھو اور نہ ان پر بیٹھو۔"

یہ بھی صحیح حدیث میں ہے کہ نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام نے ارشاد فرمایا:

«أَلاَ وَإِنَّ مَنْ كَانَ قَبْلَكُمْ كَانُوا يَتَّخِذُونَ قُبُورَ أَنْبِيَائِهِمْ وَصَالِحِيهِمْ مَسَاجِدَ، أَلاَ فَلاَ تَتَّخِذُوا الْقُبُورَ مَسَاجِدَ، إِنِّي أَنْهَاكُمْ عَنْ ذٰلِكَ» (صحيح مسلم، المساجد، باب النهي عن بناء المساجد على القبور ... الخ، ح: ٥٣٢)

"خبردار! بلاشبہ تم سے پہلے لوگ اپنے انبیاء و صلحاء کی قبروں کو مسجدیں بنالیا کرتے تھے۔ تم قبروں کو مسجدیں نہ بنانا' میں تمہیں اس سے منع کرتا ہوں۔"

اس موضوع کی دیگر احادیث بھی مخفی نہیں ہیں۔ وباللہ التوفیق' وصلی اللہ وسلم علی نبینا محمد.

—— فتویٰ کمیٹی ——

کیا مکہ میں برائیوں کا گناہ زیادہ ہوتا ہے؟

سوال کیا یہ صحیح ہے کہ مکہ مکرمہ میں جس طرح نیکیوں کا اجروثواب زیادہ ملتا ہے اسی طرح برائیوں کا گناہ بھی زیادہ ہوتا ہے؟

جواب برائیوں کا گناہ ہر جگہ کیفیت کے اعتبار سے زیادہ ہوتا ہے' عدد کے اعتبار سے نہیں کیونکہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ مَن جَآءَ بِٱلْحَسَنَةِ فَلَهُۥ عَشْرُ أَمْثَالِهَا ۖ وَمَن جَآءَ بِٱلسَّيِّئَةِ فَلَا يُجْزَىٰٓ إِلَّا مِثْلَهَا وَهُمْ لَا يُظْلَمُونَ ﴿١٦٠﴾ ﴾

(الأنعام٦/ ١٦٠)

"جو کوئی (اللہ کے حضور) نیکی لے کر آئے گا' اس کو ویسی دس نیکیاں ملیں گی اور جو برائی لائے گا' اسے سزا ویسی ہی ملے گی اور ان پر ظلم نہیں کیا جائے گا۔"

اسی طرح اس مفہوم پر دلالت کرنے والی بہت سی صحیح احادیث سے بھی یہی ثابت ہے۔ ہاں البتہ برائیوں کے گناہ میں فرق' ان کے کبیرہ و صغیرہ ہونے یا زمان و مکان کی وجہ سے ہوتا ہے۔ مثلاً رمضان یا عشرہ ذوالحجہ اور حرمین شریفین میں کئے جانے والے برے اعمال کا گناہ زیادہ ہوگا۔ واللہ ولی التوفیق.

—— شیخ ابن باز ——

نماز کے مصلوں پر تصویریں

سوال کیا نماز کے مصلوں کے لیے یہ شرط ہے کہ ان پر حرمین شریفین یا دیگر مساجد کی تصویریں بنی ہوں یا ان پر قرآنی آیات لکھی ہوں......؟ ان تصویروں کے بارے میں کیا حکم ہے جو مصلوں پر طول کے بجائے ان کے عرض کی طرف بنی ہوں؟ نیز ان مصلوں پر نماز کے جواز کے بارے میں شرعی حکم کیا ہے جن پر حیوانات یا پرندوں وغیرہ کی تصویریں بنی ہوں؟

جواب نماز کے لیے استعمال کئے جانے والے مصلوں پر آیات قرآنی ہونی چاہئیں نہ حیوانات اور پرندوں کی تصویریں' کیونکہ مصلوں پر آیات قرآنی لکھنے سے قرآن مجید کی بے ادبی و بے حرمتی ہے نیز جان دار اشیاء کی تصویریں جائز نہیں ہیں۔ اسی طرح نماز کے لیے استعمال کیے جانے والے مصلوں کے لیے یہ بھی شرط نہیں ہے کہ ان پر حرمین شریفین یا دیگر مساجد کی تصویریں بنی ہوں بلکہ اس طرح کی تصویریں مکروہ ہیں کیونکہ ان کی طرف دیکھنے سے نماز کے خشوع و خضوع میں فرق آجاتا ہے اور شریعت کا تقاضا یہ ہے کہ نماز خشوع و خضوع کے ساتھ ادا کی جائے' ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ قَدْ أَفْلَحَ ٱلْمُؤْمِنُونَ ﴿١﴾ ٱلَّذِينَ هُمْ فِى صَلَاتِهِمْ خَٰشِعُونَ ﴿٢﴾ ﴾ (المؤمنون٢٣/ ١-٢)

"بے شک ایمان والے فلاح پاگئے' جو اپنی نماز میں عجزونیاز کرتے ہیں۔"

—— فتویٰ کمیٹی ——

پیاز کھانے اور سگریٹ پینے والے کا مسجد میں داخلہ

سوال جو شخص مسجد میں لہسن یا پیاز کھا کر آئے تو اس کے مکروہ ہونے کی وجہ کیا ہے؟ اسلام کے نزدیک لہسن و پیاز اور سگریٹ کی بدبو میں کیا فرق ہے؟ بعض سگریٹ نوش نمازی جب سگریٹ پی کر مسجد میں آتے ہیں تو ان سے سگریٹ کی بدبو آ رہی ہوتی ہے اور وہ اس بات کی قطعاً پروا نہیں کرتے۔ امید ہے آپ واضح فرمائیں گے کہ سگریٹ نوش اور لہسن و پیاز کھانے والے کے مسجد میں داخلہ کے مکروہ ہونے میں کیا فرق ہے؟ جزاکم اللہ خیرا

جواب نبی کریم ﷺ سے یہ ثابت ہے کہ آپ نے فرمایا:

«مَنْ أَكَلَ ثُومًا أَوْ بَصَلاً فَلْيَعْتَزِلْ مَسْجِدَنَا وَلْيَقْعُدْ فِي بَيْتِهِ فَإِنَّ الْمَلاَئِكَةَ تَتَأَذَّى مِمَّا يَتَأَذَّى مِنْهُ بَنُو آدَمَ»(صحيح البخاري، الأذان، باب ما جاء في الثوم النيء ... الخ، ح: ٨٥٥ وصحيح مسلم، المساجد، باب نهى من أكل ثوما أو بصلا ... الخ، ح: ٥٦٤)

”جو شخص لہسن یا پیاز کھائے وہ ہماری مسجد سے الگ رہے اور اپنے گھر میں بیٹھ جائے کیونکہ فرشتے بھی اس چیز سے تکلیف محسوس کرتے ہیں جس سے انسان تکلیف محسوس کرتے ہیں۔“

اس مضمون کی اور بھی بہت سی احادیث ہیں۔ نبی کریم ﷺ سے یہ بھی ثابت ہے کہ جس شخص سے لہسن یا پیاز کھانے کی وجہ سے بدبو آ رہی ہوتی آپ حکم دے دیتے کہ ”اسے مسجد سے باہر نکال دیا جائے۔“ [1]

اس کا سبب یہ ہے کہ نمازی، قرآن مجید کی تلاوت کرنے والے اور فرشتے ناگوار بو سے ایذاء پاتے ہیں لہٰذا ہر وہ شخص جس سے ناگوار بو آ رہی ہو جیسے سگریٹ نوش، تو اس کا حکم بھی لہسن و پیاز کھانے والے کی طرح ہے۔ ان سب کے لیے (اس وقت تک) مسجد میں آنا منع ہے جب کہ کوئی ایسی چیز استعمال نہ کرلیں جس سے ناگوار بو زائل ہو جائے۔ علاوہ ازیں جس شخص کی بغلوں وغیرہ سے ناگوار بو آ رہی ہو تو اس کا حکم بھی یہی ہو گا کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے اس سلسلہ میں جو وجہ بیان فرمائی ہے اس کے عموم کا یہی تقاضا ہے۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو اپنی محبت اور رضا کے مطابق عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔

——— شیخ ابن باز ———

ایسی مسجدوں کو چھوڑ دینے کا حکم جن میں بدعات کی کثرت ہو

سوال کیا ایسی مسجدوں کو چھوڑ دینا چاہیئے جن میں بدعات کی کثرت ہو؟

جواب مسلمان کو چاہیئے کہ جہاں تک ممکن ہو بدعات کے ازالہ کی کوشش کرے اور اگر ان کا ازالہ مشکل ہو تو پھر ایسی مسجد کو چھوڑ کر کسی ایسی مسجد میں نماز پڑھے جو بدعات سے پاک ہو۔ وباللّٰہ التوفیق وصلی اللّٰہ وسلم علی نبینا محمد وآلہ وصحبہ۔

——— فتویٰ کمیٹی ———

[1] صحیح مسلم، المساجد باب نهی من اکل ثوما او بصلا او کراثا ..... الخ، حدیث: 567۔

فرض نمازوں کی نیت سے بنائی گئی مسجد کو نماز جمعہ کی مسجد کی طرف منتقل کرنا

سوال کیا ایسی مسجد میں نماز جمعہ ادا کرنا جائز ہے جس کی تاسیس کے وقت یہ نیت نہیں کی گئی تھی کہ اس میں نماز جمعہ بھی ادا کی جائے گی؟

جواب مذکورہ بالا صورت میں کوئی امر مانع نہیں ہے کہ اس مسجد میں نماز جمعہ بھی ادا کی جائے جس میں پہلے نماز جمعہ ادا نہیں کی جاتی تھی بلکہ صرف دیگر نماز پنجگانہ کو باجماعت ادا کیا جاتا تھا۔ مسجد کی تعمیر کے وقت اگر نماز جمعہ کی نیت نہیں بھی کی گئی تھی تو اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ مسجد کی تعمیر مکمل ہونے کے بعد یا اس سے پہلے ہی یہاں نماز جمعہ بھی شروع کر دی جائے کیونکہ ہمارے علم کے مطابق اہل علم میں سے کسی نے بھی ایسی کسی شرط کا کوئی ذکر نہیں کیا لہٰذا یہ ایک ایسی شرط ہے جس کی کتاب و سنت میں کوئی اصل نہیں۔

——— فتویٰ کمیٹی ———

رات کے وقت مسجد کو تالا لگانا

سوال کیا رسول اللہ ﷺ کے دور میں رات کے وقت مسجدوں کو تالا لگا دیا جاتا اور ان مسلمانوں کو نکال دیا جاتا تھا یا نہیں جو مقامات مقدسہ کی زیارت کے لیے آتے اور مسجد کی دیواروں کے پاس سوجایا کرتے تھے؟

جواب ہماری معلومات کے مطابق رسول اللہ ﷺ کے دور میں مسجدوں کو تالا نہیں لگایا جاتا تھا اور نہ اس دور میں قالین وغیرہ بچھائے جاتے تھے اور لوگ بھی بے حد متقی اور پرہیز گار تھے کہ وہ نہ مسجدوں میں فساد برپا کرتے تھے اور نہ ہی انہیں گندہ کرتے تھے۔ جب مسجدوں میں قالین بچھا دیئے گئے' ان کی چوری کا خدشہ پیدا ہوا' لوگوں کی جہالت میں اضافہ ہو گیا اور بعض لوگوں نے مسجدوں میں فتنہ و فساد برپا کرنا شروع کر دیا تو ان حالات میں حاکم وقت کے لیے یہ جائز ہو گیا کہ اگر وہ چاہے تو مصلحت کی وجہ سے مسجد کو مقفل کر سکتا ہے تاکہ مسجد کے سازوسامان کو محفوظ کیا جا سکے اور بے وقوفوں کے فتنہ و فساد سے انہیں پاک رکھا جا سکے۔ وصلی اللّٰہ علی نبینا محمد.

——— فتویٰ کمیٹی ———

مسجد میں سگریٹ لانا

سوال ایک شخص مسجد نبوی میں روضہ میں نماز پڑھ رہا تھا کہ اس کی جیب سے سگریٹ کی ڈبیہ گر گئی تو اس کے اس فعل کے بارے میں کیا حکم ہے؟ کیا مسجدوں میں سگریٹ لانا جائز ہے؟

جواب اگر اس سوال سے یہ مقصود ہے کہ اس شخص کے مسجد میں سگریٹ لانے کے بارے میں کیا حکم ہے تو یہ بات مخفی نہیں ہے کہ سگریٹ منکر و خبیث امور میں سے ہے اور اس کا پینا حرام ہے کیونکہ یہ جان' مال اور معاشرہ کے لیے بے حد نقصان دہ ہے۔ سگریٹ چونکہ خبیث ہے لہٰذا ضروری ہے کہ اللہ کے گھروں کو اس سے پاک رکھا جائے' مسجدوں میں اسے لے جانا اللہ کے گھروں کی تعظیم و تکریم کے منافی ہے لہٰذا جائز نہیں ہے اور اگر اس سوال سے مقصود یہ ہے کہ نماز کے حوالہ سے اس فعل کے بارے میں کیا حکم ہے یعنی کیا نمازی کی جیب سے سگریٹ گر جانے سے نماز فاسد و باطل ہو

جائے گی یا نہیں؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ اس صورت میں نماز باطل نہیں ہو گی بلکہ صحیح ہو گی۔ وصلی اللہ علی نبینا محمد۔

_____ فتویٰ کمیٹی _____

پرانی مسجدوں کے پتھروں کو ذاتی مقاصد کے لیے استعمال کرنا

سوال ایک انتہائی قدیم ترین مسجد ہے' وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ آنے والے سیلابوں نے بھی اس کی عمارت کو بے حد شکستہ اور ناقابل استعمال بنا دیا ہے اور ممکن ہے کہ اس میں کوئی قبر بھی ہو تو کیا ایسی صورت میں کسی مسلمان کے لیے یہ جائز ہے کہ اس کے پتھروں کو اپنے گھر منتقل کر کے ذاتی ملکیت بنا لے؟

جواب جب کوئی مسجد سیلاب یا دیگر اسباب کی وجہ سے خراب ہو جائے تو اہل محلہ کے لیے حکم شریعت یہ ہے کہ اس مسجد کو دوبارہ تعمیر کریں اور اس میں اقامت نماز کا اہتمام کریں۔ نبی کریم ﷺ نے فرمایا ہے:

«مَنْ بَنٰی لِلّٰهِ مَسْجِدًا بَنَی اللّٰهُ لَهُ بَيْتًا فِي الْجَنَّةِ»(صحیح ابن خزیمة:۲/۲٦۸، ح:۱۲۹۱ وأصله في الصحیحین انظر صحیح البخاري، ح:٤٥۰ وصحیح مسلم، ح:۵۳۳)

"جو شخص اللہ کے لیے مسجد بنائے گا' اللہ تعالیٰ اس کا گھر جنت میں بنائے گا۔"

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے:

«أَمَرَ رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ، بِبِنَاءِ الْمَسَاجِدِ فِي الدُّورِ، وَأَنْ تُنَظَّفَ وَتُطَيَّبَ» (مسند أحمد:٦/۲۷۹ وسنن أبي داود، الصلاة، باب اتخاذ المساجد في الدور، ح:٤٥٥)

"رسول اللہ ﷺ نے محلوں میں مسجدیں بنانے' انہیں صاف ستھرا رکھنے اور خوشبو لگانے کا حکم دیا ہے۔"

اس حدیث میں "دور" کے لفظ سے مراد قبائل اور محلے وغیرہ ہیں۔ مساجد تعمیر کرنے کی فضیلت کے بارے میں اور بھی بہت سی احادیث ہیں۔ اگر محلہ میں کوئی اور مسجد ہو جس کی وجہ سے اس کی ضرورت نہ رہی ہو تو پھر اس مسجد کی اینٹیں اور پتھر کسی دوسرے محلہ یا شہر کی ضرورت مند مسجد کے لیے استعمال کیے جائیں۔

مذکورہ مسجد جس شہر میں ہے اس کے حاکم' قاضی امیر یا سردار قبیلہ پر فرض ہے کہ وہ اس طرف توجہ دے اور اس کے پتھروں کو دیگر ضرورت والی مساجد میں منتقل کر دے یا انہیں بیچ کر ان کی قیمت کو مسلمانوں کی فلاح و بہبود کے کاموں پر صرف کر دے۔ اہل شہر میں سے کسی کو اس بات کا حق نہیں ہے کہ حاکم کی اجازت کے بغیر اس مسجد کی کسی چیز کو اپنے ذاتی استعمال میں لائے اور اگر اس مسجد میں کوئی قبر ہے تو پھر ضروری ہے کہ اس قبر کو یہاں سے ہٹا دیا جائے اور اس میں موجود ہڈیوں کو ---اگر وہ موجود ہوں--- شہر کے قبرستان میں دفن کر دیا جائے کیونکہ شرعاً یہ جائز نہیں ہے کہ مسجدوں میں قبریں ہوں اور نہ ہی یہ جائز ہے کہ قبروں پر مسجدیں بنائی جائیں کیونکہ یہ شرک کا ذریعہ اور قبروں کی وجہ سے فتنہ میں مبتلا ہونے کا سبب ہے جیسا کہ اصحاب قبور کے بارے میں غلو سے کام لینے کی وجہ سے صدیوں سے اکثر مسلمان ممالک میں ایسا ہو رہا ہے۔ حدیث سے ثابت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ان قبروں کے اکھاڑ پھینکنے کا حکم دیا تھا جو اس جگہ موجود تھیں' جہاں مسجد

نبوی تعمیر کی گئی۔ ① صحیحین میں ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا:

«لَعَنَ اللهُ الْيَهُودَ وَالنَّصَارَى اتَّخَذُوا قُبُورَ أَنْبِيَائِهِمْ مَسَاجِدَ»(صحيح البخاري، الجنائز، باب ما يكره من اتخاذ المساجد على القبور، ح:١٣٣٠ وصحيح مسلم، المساجد، باب النهي عن بناء المسجد على القبور ... الخ، ح:٥٢٩)

”اللہ تعالیٰ یہود و نصاریٰ پر لعنت فرمائے کہ انہوں نے اپنے انبیاء کی قبروں کو مسجدیں بنا لیا تھا۔“

صحیح مسلم میں ابو مرثد غنوی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا:

«لاَ تُصَلُّوا إِلَى الْقُبُورِ، وَلاَ تَجْلِسُوا عَلَيْهَا»(صحيح مسلم، الجنائز، باب النهي عن الجلوس على القبر والصلاة عليه، ح:٩٧٢)

”قبروں کی طرف نماز نہ پڑھو اور نہ ان پر بیٹھو۔“

صحیح مسلم ہی میں جندب بن عبداللہ بجلی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا:

«أَلاَ وَإِنَّ مَنْ كَانَ قَبْلَكُمْ كَانُوا يَتَّخِذُونَ قُبُورَ أَنْبِيَائِهِمْ وَصَالِحِيهِمْ مَسَاجِدَ، أَلاَ فَلاَ تَتَّخِذُوا الْقُبُورَ مَسَاجِدَ، إِنِّي أَنْهَاكُمْ عَنْ ذٰلِكَ» (صحيح مسلم، المساجد، باب النهي عن بناء المساجد على القبور ... الخ، ح:٥٣٢)

”تم سے پہلے لوگ اپنے انبیاء و صلحاء کی قبروں کو مسجدیں بنا لیتے تھے' خبردار تم قبروں کو مسجدیں نہ بنانا' میں تمہیں اس سے منع کرتا ہوں۔“

صحیحین میں حضرت ام سلمہ اور حضرت ام حبیبہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ انہوں نے نبی ﷺ کے سامنے ایک گرجے کا ذکر کیا جو انہوں نے حبشہ میں دیکھا تھا اور اس میں بنی ہوئی تصویروں کو بھی دیکھا تھا تو نبی کریم ﷺ نے فرمایا:

«أُولٰئِكَ إِذَا مَاتَ مِنْهُمُ الرَّجُلُ الصَّالِحُ بَنَوْا عَلٰى قَبْرِهِ مَسْجِدًا وَّصَوَّرُوا فِيهِ تِلْكَ الصُّوَرَ أُولٰئِكَ شِرَارُ الْخَلْقِ عِنْدَ اللهِ»(صحيح البخاري، الجنائز، باب بناء المسجد على المسجد، ح:٤٢٧، ١٣٤١ وصحيح مسلم، المساجد، باب النهي عن بناء المسجد على القبور، ح:٥٢٨)

”ان لوگوں میں سے جب کوئی نیک آدمی فوت ہوتا تو یہ اس کی قبر پر مسجد بنا لیتے اور اس میں اس طرح کی تصویریں بناتے۔ یہ لوگ اللہ تعالیٰ کے ہاں ساری مخلوق میں سے بدترین شمار ہوتے ہیں۔“

حضرت جابر بن عبداللہ انصاری رضی اللہ عنہما سے روایت ہے:

«نَهٰى رَسُولُ اللهِ ﷺ، أَنْ يُّجَصَّصَ الْقَبْرُ، وَأَنْ يُّقْعَدَ عَلَيْهِ وَأَنْ يُّبْنٰى عَلَيْهِ»(صحيح مسلم، الجنائز، باب النهي عن تجصيص القبر ... الخ، ح:٩٧٠)

”رسول اللہ ﷺ نے منع فرمایا ہے کہ قبر کو پختہ بنایا جائے' اس پر بیٹھا جائے اور اس پر عمارت (مقبرہ وغیرہ) بنائی جائے۔“

---

① صحیح بخاری' الصلاۃ' باب ھل نبشت قبور مشرکی الجاھلیۃ' حدیث :428 و صحیح مسلم' المساجد' باب إبتناء مسجد النبی صلی اللہ علیہ وسلم' حدیث :524۔

اور صحیح سند کے ساتھ ترمذی کی روایت میں ان الفاظ کا اضافہ بھی ہے:

«وَأَنْ يُّكْتَبَ عَلَيْهَا»(جامع الترمذي، الجنائز، باب ما جاء في كراهية تجصيص القبور، ح:١٠٥٢)

''آپ نے قبروں پر لکھنے سے بھی منع فرمایا۔''

یہ اور اس مضمون کی دیگر احادیث اس بات پر دلالت کر رہی ہیں کہ قبروں پر عمارتیں بنانا' مسجدیں بنانا' ان میں نماز پڑھنا اور قبروں کو پختہ بنانا حرام ہے کیونکہ یہ اصحاب قبور کے ساتھ شرک کے اسباب میں سے ہے۔ اسی طرح قبروں پر غلاف اور چادریں چڑھانا' ان پر لکھنا' ان پر خوشبو لگانا اور عود سلگانا بھی اسی قبیل سے ہے' کیونکہ یہ سب کچھ غلو اور شرک کے اسباب و وسائل میں سے ہے۔ لہٰذا تمام مسلمانوں پر واجب ہے کہ وہ خود بھی ان تمام کاموں سے بچیں اور دوسروں کو بھی بچائیں' خصوصاً حکمرانوں کو اس طرف ضرور توجہ دینی چاہیے' کیونکہ ان کے فرائض اور ذمہ داریاں دوسروں سے کہیں بڑھ کر ہیں کیونکہ انہیں ان منکرات کے ازالہ کی زیادہ قوت و طاقت حاصل ہے۔ حکمرانوں کی سستی اور بہت سے اہل علم کی خاموشی ہی کا یہ نتیجہ ہے کہ مسلمان ممالک میں ان خرابیوں کی اس قدر کثرت ہو گئی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ شرک کی خوب گرم بازاری ہے اور آج مسلمان بھی اسی طرح شرک میں مبتلا ہو گئے ہیں جس طرح لات' عزیٰ اور منات کے پجاری' اہل جاہلیت مبتلا تھے اور مسلمان بھی آج وہی بات کہتے ہیں جو اہل جاہلیت کہتے تھے جس طرح کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن عظیم میں ان کا قول نقل فرمایا ہے (وہ کہا کرتے تھے):

﴿ هَٰٓؤُلَآءِ شُفَعَٰٓؤُنَا عِندَ ٱللَّهِ ﴾ (یونس١٠/ ١٨)

''یہ اللہ کے پاس ہماری سفارش کرنے والے ہیں۔''

اور فرمایا:

﴿ مَا نَعۡبُدُهُمۡ إِلَّا لِيُقَرِّبُونَآ إِلَى ٱللَّهِ زُلۡفَىٰٓ ﴾ (الزمر٣٩/ ٣)

''ہم ان کی عبادت صرف اس لیے کرتے ہیں کہ وہ ہم کو اللہ کا مقرب بنا دیں۔''

اہل علم نے ذکر فرمایا ہے کہ اگر قبر مسجد میں بنائی گئی ہو تو اس قبر کو اکھاڑنا اور مسجد سے دور کرنا ضروری ہے اور اگر مسجد بعد میں بنائی گئی ہو تو اس مسجد کو منہدم کر دینا ضروری ہے کیونکہ یہ مسجد ایک امر منکر کا باعث بنی ہے اور رسول اللہ ﷺ نے اپنی امت کو قبروں پر مسجدیں بنانے سے منع فرمایا ہے۔ اس وجہ سے یہود و نصاریٰ پر لعنت کی اور امت کو ان کی مشابہت اختیار کرنے سے منع فرمایا ہے اور آپ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو حکم دیتے ہوئے فرمایا تھا:

«لاَ تَدَعْ صُورَةً إِلاَّ طَمَسْتَهَا وَلاَ قَبْرًا مُّشْرِفًا إِلاَّ سَوَّيْتَهُ»(صحيح مسلم، الجنائز، باب الأمر بتسوية القبر، ح:٩٦٩)

''جو تصویر دیکھو اسے مٹا دو اور جو اونچی قبر دیکھو اسے برابر کر دو۔''

اللہ تعالیٰ ہی سے دعا ہے کہ وہ تمام مسلمانوں کے حالات کو درست فرمائے' انہیں دین کی سمجھ بوجھ عطا فرمائے' قائدین کی اصلاح فرمائے' مسلمانوں کو تقویٰ کی بنیاد پر جمع ہونے کی توفیق عطا فرمائے' شریعت کے مطابق حکومت چلانے کی توفیق سے نوازے اور مخالف شریعت امور سے بچائے۔ انه جواد كريم' وصلى الله وسلم على نبينا محمد و آله وصحبه.

—— شیخ ابن باز ——

مکہ کی دیگر مساجد میں نماز مسجد حرام میں نماز کی طرح نہیں ہے

سوال کیا مکہ کی دیگر مساجد میں نماز کا ثواب مسجد حرام ہی کی طرح ہے؟

جواب اس مسئلہ میں اہل علم میں اختلاف ہے لیکن راجح بات یہ ہے کہ دیگر مساجد میں ثواب مسجد حرام کی طرح نہیں ہے کیونکہ نماز کا کئی گنا زیادہ اجروثواب مسجد حرام (یعنی مسجد کعبہ) ہی میں ملتا ہے جیسا کہ صحیح مسلم میں حضرت میمونہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا:

«صَلاَةٌ فِيهِ أَفْضَلُ مِنْ أَلْفِ صَلاَةٍ فِيمَا سِوَاهُ مِنَ الْمَسَاجِدِ، إِلاَّ مَسْجِدَ الْكَعْبَةِ»(صحيح مسلم، الحج، باب فضل الصلاة بمسجدي مكة والمدينة، ح:١٣٩٦)

''اس (مسجد نبوی) میں نماز دیگر مساجد کی ایک ہزار نماز سے افضل ہے ہاں البتہ مسجد الحرام میں اس سے بھی زیادہ افضل ہے۔''

حرم کے اندر کی دیگر مساجد بلاشک و شبہ حرم کے باہر کی مساجد سے افضل ہیں یہی وجہ ہے کہ نبی ﷺ نے جب حدیبیہ میں قیام فرمایا اور اس کا کچھ حصہ حل میں ہے اور کچھ حرم میں تو آپ اس وقت نماز حرم میں ادا فرماتے تھے۔ جب مطلقاً مسجد حرام کا ذکر ہو تو اس سے مراد حرم کی سب مسجدیں نہیں بلکہ خاص مسجد حرام ہی مراد ہوتی ہے' ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ يَـٰٓأَيُّهَا ٱلَّذِينَ ءَامَنُوٓاْ إِنَّمَا ٱلْمُشْرِكُونَ نَجَسٌ فَلَا يَقْرَبُواْ ٱلْمَسْجِدَ ٱلْحَرَامَ بَعْدَ عَامِهِمْ هَـٰذَا ﴾ (التوبة٩/ ٢٨)

''مومنو! مشرک تو یقیناً پلید ہیں سو اس برس کے بعد وہ مسجد الحرام کے پاس نہ جانے پائیں۔''

اگر مسجد حرام سے مراد امیال کے اندر کا علاقہ ہوتا تو مشرکوں کے لیے امیال کے قریب آنا بھی جائز نہ ہوتا بلکہ ان سے دور رہنا ان کے لیے واجب ہوتا حالانکہ وہ امیال کے قریب آ سکتے ہیں' ان کے اندر داخل نہیں ہو سکتے کیونکہ اس آیت میں الفاظ یہ ہیں:

﴿ فَلَا يَقْرَبُواْ ٱلْمَسْجِدَ ٱلْحَرَامَ ﴾ (التوبة٩/ ٢٨)

''وہ خانہ کعبہ کے پاس نہ جانے پائیں۔''

تو اس سے معلوم ہوا کہ مسجد حرام جس کا نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام نے ذکر فرمایا ہے' اس سے مخصوص مسجد حرام ہی مراد ہے' حرم مکہ کی دیگر مساجد نہیں۔ اس کی تائید نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کے اس ارشاد سے بھی ہوتی ہے:

«لاَ تُشَدُّ الرِّحَالُ إِلاَّ إِلَى ثَلاَثَةِ مَسَاجِدَ، الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ، وَمَسْجِدِ الرَّسُولِ ﷺ، وَمَسْجِدِ الْأَقْصٰى»(صحيح البخاري، فضل الصلاة في مسجد مكة والمدينة، باب فضل الصلاة في مسجد مكة والمدينة، ح:١١٨٩)

''شد رحال (بغرض ثواب رخت سفر باندھنا) صرف تین مسجدوں ہی کی طرف کیا جائے مسجد حرام' میری یہ مسجد (مسجد نبوی) اور مسجد اقصیٰ (بیت المقدس۔)''

اور یہ سب جانتے ہیں کہ اگر کوئی شخص مسجد شعب یا مسجد جیزہ کی طرف شد رحال کر کے جائے تو ہم کہیں گے کہ یہ جائز نہیں ہے کیونکہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا ہے کہ شد رحال صرف تین مسجدوں ہی کی طرف کیا جائے۔ اگر حرم کی ہر مسجد

کی طرف شد رحال جائز ہوتا تو پھر دسیوں بلکہ سینکڑوں مسجدوں کی طرف شد رحال جائز ہوتا۔ ہاں البتہ جب حرم نمازیوں سے بھر جائے اور لوگ ایک دوسرے کے ساتھ مل کر کھڑے ہوں اور جگہ نہ ملنے کی وجہ سے کچھ لوگ بازار میں نماز ادا کریں تو ان بازار میں نماز ادا کرنے والوں کے لیے بھی امید ہے کہ انہیں بھی اتنا ہی ثواب ملے گا جتنا حرم کے اند نماز ادا کرنے والو کو' کیونکہ انہوں نے حسب استطاعت عمل کیا ہے اور اس عبادت کے ادا کرنے میں اہل مسجد کے ساتھ شریک ہوئے ہیں۔

——— شیخ ابن عثیمین ———

امام کے گھر کی توسیع کے لیے مسجد کا کچھ حصہ شامل کرنا

سوال ہمارے پاس ایک بہت کشادہ مسجد ہے جو جامع مسجدوں کے بعد شہر کی سب سے بڑی مسجد ہے لیکن اس مسجد میں نمازیوں کی تعداد کم ہے۔ اس مسجد کے جنوبی طرف ایک گھر بھی بنا ہوا ہے جو امام مسجد کے لیے وقف ہے لیکن یہ گھر بہت چھوٹا ہے' اپنی موجودہ حالت میں اس قابل نہیں کہ اس میں رہائش اختیار کی جائے یا اسے کرایہ پر دیا جا سکے۔ کرایہ داروں کی عدم دلچسپی کی وجہ سے گھر اکثر بند ہی رہتا ہے ہاں البتہ یہ ممکن ہے کہ مسجد کے جنوبی حصہ کی طرف سے کچھ حصہ اس گھر میں شامل کر کے اسے توسیع دے دی جائے تاکہ کرایہ داروں کے لیے اس میں دلچسپی پیدا ہو سکے اور اس سے مسجد کو بھی کوئی نقصان نہیں ہو گا بلکہ مسجد کی موجودہ وسعت کی وجہ سے اس کی صفائی کا بھی صحیح انتظام نہیں ہو سکتا۔ یاد رہے کہ اس مسجد اور گھر کو ایک ہی شخص نے وقف کیا ہے اور بلاشک و شبہ وقف کرنے سے مقصد امام کی ضرورت کو پورا کرنا اور اسے پریشانی سے بچانا تھا۔ تو اندریں صورت حال فتویٰ دیجیے کیا مسجد کے کچھ حصہ کو اس گھر کی توسیع کے لیے شامل کیا جا سکتا ہے یا نہیں؟ اللہ تعالیٰ آپ کو جزائے خیر سے نوازے!

جواب یہ جائز نہیں کہ مسجد کے صحن کا کچھ حصہ لے کر مذکورہ بالا گھر میں شامل کر دیا جائے کیونکہ اوقاف کے سلسلہ میں اصول یہ ہے کہ انہیں اسی طرح برقرار رکھا جائے جس طرح وہ اپنی اصلی حالت میں ہوں اور وقف کے رقبہ میں کوئی ایسا تصرف نہ کیا جائے جس سے وہ فاضل کے بجائے مفضول میں بدل جائیں۔ اگر مذکورہ گھر رہائش کے قابل نہیں ہے تو اس سلسلہ میں محکمہ اوقاف کی طرف رجوع کیا جا سکتا ہے تاکہ اس کا جائزہ لے کر اس کے لیے کوئی شرعی حل تجویز کیا جا سکے۔

وباللہ التوفیق' وصلی اللہ وسلم علی نبینا محمد وآلہ وصحبہ وسلم۔

——— فتویٰ کمیٹی ———

مسجدوں کی آبادی نماز سے ہے

سوال ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ إِنَّمَا يَعْمُرُ مَسَٰجِدَ ٱللَّهِ مَنْ ءَامَنَ بِٱللَّهِ وَٱلْيَوْمِ ٱلْءَاخِرِ ﴾ (التوبة۹/ ۱۸)

"اللہ کی مسجدوں کو تو وہ لوگ آباد کرتے ہیں جو اللہ پر اور روز قیامت پر ایمان رکھتے ہیں۔"

اس آیت میں ﴿ يعمر ﴾ (آباد کرتے ہیں) کے کیا معنی ہیں؟ کیا کافروں کا تعمیر مسجد میں مدد کرنا جائز ہے؟ کیا مسجد بنانے

کے لیے عیسائی مزدوروں سے کام لیا جا سکتا ہے؟

جواب حقیقت میں مسجد کی آبادی اس میں نماز' اطاعت' اعتکاف اور دیگر بدنی و قولی عبادتوں کے بجالانے سے ہے۔ اس آیت میں ان لوگوں کی تعریف ہے جو مسجد میں تقرب الٰہی کے حصول کی مختلف صورتوں کو اختیار کر کے اللہ تعالیٰ کی عبادت کرتے ہیں۔ اس آیت میں ان لوگوں کے ایمان کی گواہی بھی دی گئی ہے۔ ایک مرفوع حدیث میں ہے' جسے امام ترمذی رحمہ اللہ نے حسن قرار دیا ہے:

«إِذَا رَأَيْتُمُ الرَّجُلَ يَتَعَاهَدُ الْمَسْجِدَ فَاشْهَدُوا لَهُ بِالإِيمَانِ»(جامع الترمذي، الإيمان، باب ما جاء في حرمة الصلاة، ح:٢٦١٧)

"جب تم کسی آدمی کو کثرت سے مسجد میں آتا جاتا دیکھو تو اس کے ایمان کے گواہ بن جاؤ۔"

آپ نے یہ بات اسی آیت سے استدلال کرتے ہوئے فرمائی۔ یہی وجہ ہے کہ مشرکوں کے اللہ کی مسجدوں کو آباد کرنے کی نفی کی گئی ہے۔

اجروثواب کے حصول کے لیے پاک کمائی کو مسجد بنانے میں خرچ کرنا بھی اس کی آبادی میں داخل ہے' چنانچہ اللہ تعالیٰ کی رضا کے حصول کی خاطر مسجدیں بنانے کی فضیلت بھی احادیث میں آئی ہے۔ اگر کفار مسجدوں کی تعمیر کے لیے مالی مدد کریں تو یہ ان کے لیے منفعت بخش نہ ہو گی' کیونکہ شرک کی وجہ سے ان کے سارے اعمال رائیگاں ہو جاتے ہیں لیکن اگر وہ اپنے مال سے مسجد بنائیں یا اس میں مالی طور پر حصہ ڈالیں تو اس مسجد میں نماز جائز ہو گی۔

——— شیخ ابن جبرین ———

توسیع شدہ حصے کا حکم وہی ہے جو اصل کا ہے

سوال کیا نبی کریم ﷺ کا یہ فرمان کہ "میری اس مسجد میں نماز دوسری مسجدوں کی ایک ہزار نماز سے افضل ہے" مسجد نبوی کی صرف انہی حدود کے ساتھ مخصوص ہے جو عہد نبوی میں تھیں یا یہ ارشاد موجودہ تمام مسجد کے لیے بھی ہے؟

جواب مسجد نبوی نبی ﷺ کے عہد میں موجودہ مسجد سے بہت چھوٹی تھی' اسی طرح مسجد حرام بھی بہت چھوٹی تھی۔ خلفاء راشدین رضی اللہ عنہم اور ان کے بعد کے حکمرانوں نے ان دونوں میں توسیع اور اضافے کیے۔ تمام احکام کے اعتبار سے وسیع شدہ حصوں کا حکم بھی وہی ہے جو اصل کا ہے۔

——— فتویٰ کمیٹی ———

کفار کا مسجدوں میں داخلہ اور تعمیر مساجد کے لیے ان سے استعانت

اَلْحَمْدُ للهِ وَالصَّلٰوةُ وَالسَّلَامُ عَلٰى رَسُوْلِ اللهِ وَعَلٰى آلِهِ وَصَحْبِهِ وَمَنْ وَّالَاهُ ـ وبَعْدُ

کونسل "ھیئۃ کبار العلماء" نے اپنے سولھویں اجلاس میں جو طائف میں ۱۲ شوال سے ۲۱ شوال ۱۴۰۰ ہجری تک منعقد ہوا' کافروں کے مسلمانوں کی مسجدوں میں داخلہ اور تعمیر مساجد کے لیے ان کی اعانت کے مسئلہ پر غور کیا کیونکہ اس مسئلہ میں راہنمائی کے لیے سماحۃ الرئیس العام لادارات البحوث العلمیۃ والافتاء والدعوۃ والارشاد کو وکیل وزارۃ الاشغال

العامة والاسکان لشؤون الاشغال العامة کی طرف سے ٹیلی گرام نمبر ۵۳۳۴/ ۲ مورخہ ۲۹/ ۶/ ۱۴۰۰ ہجری کو موصول ہوا تھا جس کا مضمون یہ ہے:

"گزارش ہے کہ ایک ٹھیکیدار نے ایک مسجد کی تعمیر کا ٹھیکہ لیا ہے اور اس کام کے سرانجام دینے کے لیے اس نے جس انجینئر کو مقرر کیا ہے وہ عیسائی ہے۔ امید ہے آپ راہنمائی فرمائیں گے کیا شرعی طور پر کوئی امر اس بات سے مانع تو نہیں ہے کہ مسجدوں کی تعمیراور ان کے کام کی نگرانی کے لیے غیر مسلموں سے مدد لی جائے؟"

کونسل نے اس موضوع سے متعلق جب اس تحقیقی کام کا جائزہ لیا جسے "بحوث العلمیۃ والافتاء" کی --فتویٰ کمیٹی-- نے تیار کیا تھا اور پھر اس موضوع سے متعلق اہل علم کو بھی سنا تو بالاتفاق یہ رائے قائم کی کہ جب مسلمان یہ کام کر سکتے ہوں تو تعمیر مساجد کا کام کافروں کے سپرد نہیں کرنا چاہیئے' اور اس مقصد یا دیگر مقاصد کے لیے کافروں کو نہیں بلانا چاہیئے تاکہ رسول اللہ ﷺ کی اس وصیت پر عمل کیا جا سکے کہ "جزیرۃ العرب میں دو دین نہیں ہونے چاہئیں" [1]

اس علاقے میں دین' اور امن و استقرار کی حفاظت کا بھی یہی تقاضا ہے کہ یہاں غیر مسلموں کو نہ آنے دیا جائے۔ اسی طریقے ہی سے ہم اپنے ملک کو ان خطرات سے بچا سکتے ہیں جس میں ہمارے کئی پڑوسی ملک کافروں کے مقیم ہونے اور بہت سے امور کی ذمہ داری کی وجہ سے مبتلا ہو چکے ہیں۔ کافروں کی طرف سے مسجدوں کی ڈیزائننگ اور اس کے مطابق تعمیر میں دھوکے کے اس پہلو کو بھی نظرانداز نہیں کیا جا سکتا کہ وہ انہیں گرجوں کی شکل و صورت کے قریب یا مشابہہ بنانے کی کوشش بھی کریں گے جیسا کہ عملی طور پر بعض جگہ ایسا دیکھنے میں آیا ہے نیز وہ مسجدوں کی تعمیر اور کنسٹرکشن میں بھی دھوکا دیں گے کیونکہ وہ تو اسلام اور مسلمانوں کے دشمن ہیں۔

کونسل یہ سفارش کرتی ہے کہ وزارت اشغال' وزارت حج اور وزارت اوقاف وغیرہ میں حکومت کے ان ذمہ دار لوگوں کو متنبہ رہنا چاہیئے جن کی مسجدوں کی تعمیر و نگرانی کے سلسلے میں ذمہ داری ہے کہ وہ اس بات کا بڑی سختی کے ساتھ اہتمام کریں کہ مسجدوں کی تعمیر کے سلسلہ میں جب بھی کسی ٹھیکیدار سے کوئی معاہدہ کریں تو اس میں یہ شرط ضرور لگائیں کہ وہ کسی غیر مسلم کو مسجد کی تعمیر کے سلسلہ میں کسی بھی کام پر نہیں لگائیں گے۔ واللہ ولی التوفیق۔ وصلی اللہ علی نبینا محمد وعلی آلہ وصحبہ وسلم۔

ھیئۃ کبار العلماء' رئیس اجلاس عبدالرزاق عفیفی رحمہ اللہ

اسماء گرامی دیگر علماء کرام: عبداللہ خیاط' عبداللہ بن محمد بن حمید' عبدالعزیز بن عبداللہ بن باز' سلیمان بن عبید' عبدالعزیز بن صالح' محمد بن علی الحرکان' راشد بن خنین' محمد بن جبیر' ابراہیم بن محمد آل شیخ' عبداللہ بن غدیان' صالح بن غصون' عبدالحمید حسن' عبداللہ بن قعود' عبداللہ بن منیع اور صالح بن لحیدان۔

مختلف مواقع پر مساجد کی تزئین و آرائش

سوال بعض مسجدوں میں یہ رواج ہے کہ عیدالفطر یا دیگر دینی مناسبتوں کے موقع پر انہیں بجلی کے رنگ برنگے قمقموں اور پھولوں وغیرہ سے سجایا جاتا ہے کیا اسلام میں یہ عمل جائز ہے؟ اس کے جواز یا ممانعت کی کیا دلیل ہے؟

---

[1] کشف الاستار عن زوائد البزار: 2/94-95' حدیث: 1286۔

جواب مسجدیں اللہ کے گھر اور زمین کے بہترین ٹکڑے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے حکم دیا ہے کہ انہیں اللہ تعالیٰ کی توحید' ذکر الٰہی اور اقامت نماز کے ساتھ رفعت و عظمت بخشی جائے' لوگ مسجدوں میں آ کر دین سیکھیں اور رشد و بھلائی کی وہ دولت حاصل کریں جو ان کے لیے دنیا و آخرت میں سعادت و کامرانی کا ذریعہ بنے۔ اسی طرح ہمیں یہ بھی حکم ہے کہ مسجدوں کو گندگی' بتوں' شرک و بدعت کے اعمال' خرافات' میل کچیل' نجاست' لہو و لعب اور شور و غوغا سے پاک صاف رکھا جائے حتیٰ کہ مسجد میں کسی گم شدہ چیز کا اعلان کرنا بھی ممنوع ہے اور وہ تمام امور بھی منع ہیں جن سے مسجد ایک عام راستہ یا تجارت کا بازار معلوم ہو نیز اس بات سے بھی منع کر دیا گیا کہ مسجد میں کسی مردے کو دفن کیا جائے یا مسجد کو قبروں پر بنایا جائے۔ مسجد کی دیواروں پر تصویریں لٹکانے اور بنانے سے بھی منع کر دیا گیا ہے' الغرض ان تمام امور سے منع کر دیا گیا ہے جو شرک کا ذریعہ ہوں' اللہ تعالیٰ کی عبادت کرنے والے کے دل کو کسی اور طرف مشغول کرنے والے ہوں یا اس مقصد کے منافی ہوں جس کی خاطر مسجد بنائی جاتی ہے۔ نبی کریم ﷺ نے بھی ان تمام امور کو ملحوظ خاطر رکھا جیسا کہ آپ کی سیرت اور آپ کے عمل سے معلوم ہوتا ہے۔ امت کے سامنے بھی آپ نے تمام امور کو واضح فرما دیا تاکہ احترام اور تعمیر مساجد کے مسئلہ میں بھی امت آپ کے نقش قدم پر چلے' آپ کی ہدایت سے فیض یاب ہو اور اللہ کے رسول امین ﷺ کی اقتداء و پیروی کرتے ہوئے مساجد کے ذریعہ اسلامی شعائر کو سربلند کرنے کے لیے سرگرم عمل ہو۔

نبی کریم ﷺ سے یہ ہرگز ثابت نہیں ہے کہ آپ نے مسجد کی عظمت کی خاطر کبھی عیدوں یا دیگر مناسبتوں سے روشنیوں اور پھولوں کا اہتمام کیا ہو حضرات خلفاء راشدین اور ان قرون اولیٰ کے ائمہ مہتدین سے بھی ایسا ثابت نہیں ہے' جن کے بارے میں رسول اللہ ﷺ کی یہ گواہی ہے کہ وہ "خیرالقرون" ہیں حالانکہ پہلی تین صدیوں ہی میں لوگ بہت ترقی کر چکے تھے' مال و دولت کی بھی فراوانی ہو چکی تھی' تہذیب و ثقافت سے بھی وہ خوب آشنا ہو چکے تھے' آرائش و زیبائش اور رنگ و نور کی انواع و اقسام کی چیزیں بھی انہیں میسر تھیں لیکن ان سب باتوں کے باوجود انہوں نے ایسا کوئی کام نہیں کیا تھا اور پھر ہر طرح کی خیر و بھلائی تو صرف اور صرف حضرت محمد ﷺ' آپ کے خلفاء راشدین رضی اللہ عنہم اور ان کے نقش قدم پر چلنے والے ائمہ دین کی اتباع ہی میں ہے۔

پھر مسجدوں میں چراغ جلانے' بجلی کے قمقمے لگانے' جھنڈے لہرانے اور تزئین و آرائش کے لیے عیدوں اور دیگر موقعوں پر پھول سجانے میں کفار کے ساتھ مشابہت بھی تو ہے۔ وہ بھی تو اپنے گرجوں اور مندروں میں ایسا ہی کرتے ہیں اور نبی کریم ﷺ نے ہمیں اس بات سے منع فرمایا ہے کہ ہم کافروں کی عیدوں اور عبادتوں میں ان کے ساتھ مشابہت اختیار کریں۔

——— فتویٰ کمیٹی ———

باب پنجم
کتاب
الجنائز
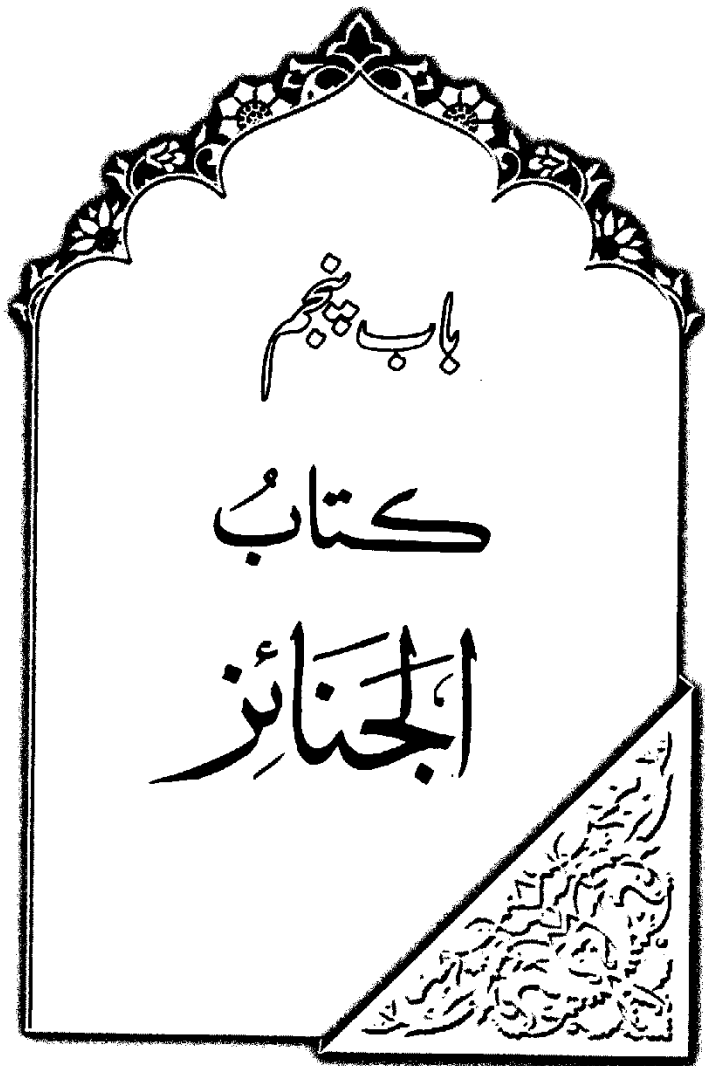
غسل کے احکام

غسل میت کا شرعی طریقہ

سوال حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ سے مروی' میت کو غسل دینے کا صحیح طریقہ کیا ہے؟

جواب میت کو غسل دینے کا شرعی طریقہ یہ ہے کہ سب سے پہلے انسان' میت کی شرم گاہ کو دھوئے' پھر اسے غسل دینا شروع کرے اور پہلے اسے وضو کرائے لیکن اس کے منہ اور ناک میں پانی نہ ڈالے بلکہ کپڑے کو پانی سے تر کر کے اس کے منہ اور ناک کو صاف کر دے' پھر باقی جسم کو ایسے پانی سے دھوئے جس میں بیری کے پتے ملے ہوئے ہوں (وہ اس طرح کہ) بیری کے پتے باریک کوٹ کر پانی میں ملائے جائیں اور پھر پانی میں ہاتھ ڈال کر ہلایا جائے حتیٰ کہ بیری کے پتوں کا جھاگ پیدا ہو جائے تو جھاگ لے کر سر اور داڑھی کو دھو دے اور باقی پتوں کے ساتھ باقی سارے جسم کو اچھی طرح دھو دیا جائے' بیری کے پتوں کے استعمال سے خوب اچھی طرح صفائی ہو جائے گی۔ آخری بار جسم پر پانی بہاتے ہوئے اس میں کافور بھی شامل کر لیا جائے جو کہ ایک معروف خوشبو ہے۔ علماء فرماتے ہیں کہ کافور کے استعمال کے فائدے یہ ہیں کہ اس سے جسم سخت ہو جاتا ہے اور کیڑے مکوڑے بھاگ جاتے ہیں۔

اگر میت کے جسم پر میل زیادہ ہو تو اسے زیادہ بار غسل دیا جائے کیونکہ نبی کریم ﷺ نے ان خواتین سے فرمایا تھا جو آپ کی صاحبزادی کو غسل دے رہی تھیں:

«اِغْسِلْنَهَا ثَلَاثًا أَوْ خَمْسًا أَوْ سَبْعًا أَوْ أَكْثَرَ مِنْ ذٰلِكَ إِنْ رَأَيْتُنَّ ذٰلِكَ» (صحيح البخاري، الجنائز، باب يجعل الكافور في الأخيرة، ح:١٢٥٩ وصحيح مسلم، الجنائز، باب في غسل الميت، ح:٩٣٩)

"اسے تین بار یا پانچ بار یا سات بار غسل دو اور اگر ضرورت محسوس کرو تو اس سے زیادہ بار بھی غسل دے سکتی ہو۔"

غسل کے بعد میت کے جسم سے پانی کو صاف کر دیا جائے اور اسے کفن پہنا دیا جائے۔

——— شیخ ابن عثیمین ———

شوہر کے اپنی بیوی کو غسل دینے میں کوئی حرج نہیں

سوال ہم نے عام لوگوں سے یہ بات بہت سنی ہے کہ وفات کے بعد بیوی اپنے شوہر کے لیے حرام ہو جاتی ہے لہٰذا شوہر کے لیے اس کی طرف دیکھنا اور اسے قبر میں اتارنا جائز نہیں ہے۔ کیا یہ بات صحیح ہے؟ جواب سے نوازیں' اللہ تعالیٰ آپ کو

برکت عطا فرمائے۔

جواب شرعی دلائل سے یہ بات ثابت ہے کہ اس میں کوئی حرج نہیں کہ بیوی اپنے شوہر کو غسل دے اور اسے دیکھے اور شوہر اپنی بیوی کو غسل دے اور اس کی طرف دیکھے۔ حضرت اسماء بنت عمیس نے اپنے شوہر حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو خود غسل دیا تھا [1] اور حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا نے وصیت فرمائی تھی کہ انہیں حضرت علی رضی اللہ عنہ غسل دیں۔ [2]

——— شیخ ابن باز ———

میت کے سونے کے دانت اتارنا

سوال جب کوئی شخص فوت ہو جائے اور اس نے سونے کے دانت لگا رکھے ہوں تو کیا انہیں اتارنا جائز ہے تاکہ اس کا قرض ادا کیا جائے خواہ یہ آسانی سے نہ اتر سکتے ہوں اور اگر اس کے ذمہ قرض نہ ہو تو کیا انہیں نہ اتارا جائے؟

جواب جب کوئی شخص فوت ہو جائے اور اس نے سونے یا چاندی کے دانت لگائے ہوں اور انہیں آسانی سے نہ اتارا جا سکتا ہو تو پھر انہیں نہ اتارنے میں کوئی حرج نہیں' خواہ وہ مقروض ہو یا نہ ہو۔ اور کچھ وقت بعد انہیں اتارنا بھی ممکن ہے تاکہ وارث انہیں لے لیں یا ان سے اس کا قرض ادا کیا جائے اور اگر انہیں آسانی سے اتارنا ممکن ہو تو پھر انہیں اتارنا واجب ہے کیونکہ یہ مال ہے اور قدرت کے ہوتے ہوئے مال کو ضائع کرنا درست نہیں ہے۔

——— شیخ ابن باز ———

میت کے بال کاٹنا

سوال کیا میت کے بال کاٹنا جائز ہے؟

جواب اگر میت کی مونچھوں کے بال بہت لمبے ہوں تو انہیں کاٹنے میں کوئی حرج نہیں' اسی طرح بغل کے بالوں کو بھی صاف کیا جا سکتا ہے لیکن وفات کے بعد زیر ناف اور شرم گاہ کے بالوں کو صاف کرنا جائز نہیں' کیونکہ مرد ہو یا عورت اس کی شرم گاہ کو ہاتھ لگانا جائز نہیں ہے۔ آدمی کے سر کے بالوں میں کنگھی کر دی جائے اور عورت کے بالوں کو گوندھ کر تین لٹیں بنا دی جائیں اور انہیں پیچھے کی طرف ڈال دیا جائے' کاٹا نہ جائے اور انہیں اسی طرح اپنی حالت میں رہنے دیا جائے۔

——— شیخ ابن جبرین ———

[1] موطا امام مالک: 223/1۔

[2] سنن دارقطنی: 78/2' حدیث: 1833 والبیہقی فی الکبری: 396/3۔

نماز جنازہ کی کیفیت

سوال امید ہے کہ آپ نماز جنازہ کی اس کیفیت کو بیان فرما دیں گے جو نبی کریم ﷺ سے ثابت ہے' کیونکہ بہت سے لوگ اس سے ناواقف ہیں؟

جواب نماز جنازہ کی کیفیت کو نبی ﷺ اور حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے بیان فرمایا ہے اور وہ یہ کہ سب سے پہلے اللہ اکبر کہہ کر نماز کو شروع کیا جائے پھر تعوذ' تسمیہ' سورۃ الفاتحہ اور اس کے ساتھ کوئی چھوٹی سورت یا چند آیات پڑھے' پھر اللہ اکبر کہے اور نبی کریم ﷺ پر وہی درود پڑھا جائے جو نماز کے آخر میں پڑھا جاتا ہے' پھر تیسری بار اللہ اکبر کہے اور میت کے لیے دعا کرے' افضل یہ ہے کہ یہ دعا پڑھے:

«اَللّٰهُمَّ! اغْفِرْ لِحَيِّنَا وَمَيِّتِنَا وَشَاهِدِنَا وَغَائِبِنَا، وَصَغِيرِنَا وَكَبِيرِنَا وَذَكَرِنَا وَأُنْثَانَا، اَللّٰهُمَّ! مَنْ أَحْيَيْتَهُ مِنَّا فَأَحْيِهِ عَلَى الإِسْلَامِ، وَمَنْ تَوَفَّيْتَهُ مِنَّا فَتَوَفَّهُ عَلَى الإِيمَانِ، اَللّٰهُمَّ! لاَ تَحْرِمْنَا أَجْرَهُ وَلاَ تُضِلَّنَا بَعْدَهُ»(سنن أبي داود، الجنائز، باب الدعاء للميت، ح:٣٢٠١ وسنن ابن ماجه، الجنائز، باب ما جاء في الدعاء في الصلاة علي الميت، ح:١٤٩٨)

«اَللّٰهُمَّ اغْفِرْ لَهُ وَارْحَمْهُ وَعَافِهِ وَاعْفُ عَنْهُ وَأَكْرِمْ نُزُلَهُ وَوَسِّعْ مُدْخَلَهُ، وَاغْسِلْهُ بِالْمَاءِ وَالثَّلْجِ وَالْبَرَدِ، وَنَقِّهِ مِنَ الْخَطَايَا كَمَا نَقَّيْتَ الثَّوْبَ الأَبْيَضَ مِنَ الدَّنَسِ، وَأَبْدِلْهُ دَارًا خَيْرًا مِّنْ دَارِهِ، وَأَهْلاً خَيْرًا مِّنْ أَهْلِهِ، وَزَوْجًا خَيْرًا مِّنْ زَوْجِهِ وَأَدْخِلْهُ الْجَنَّةَ وَأَعِذْهُ مِنْ عَذَابِ الْقَبْرِ وَمِنْ عَذَابِ النَّارِ»(صحيح مسلم، الجنائز، باب الدعاء للميت في الصلاة، ح:٩٦٣)

«وَافْسَحْ لَهُ فِي قَبْرِهِ وَنَوِّرْ لَهُ فِيهِ»(صحيح مسلم، الجنائز، باب في اغماض الميت والدعاء له . . . الخ، ح:٩٢٠)

"اے اللہ! تو ہمارے زندہ اور مردہ کو' حاضر اور غائب کو' چھوٹے اور بڑے کو' مردوں اور عورتوں کو بخش دے!
اے اللہ! تو ہم میں سے جس کو زندہ رکھے اسے اسلام پر زندہ رکھنا اور جس کو وفات دے اسے ایمان پر فوت کرنا۔
اے اللہ! تو ہمیں اس (پر صبر کرنے) کے اجر سے محروم نہ کرنا اور نہ اس (کی وفات) کے بعد ہمیں گمراہ کرنا۔"

"اے اللہ! تو اسے معاف فرما دے' اس پر رحم فرما' اسے سزا (اور عذاب) سے بچا' اسے عافیت دے اور اس کی کریمانہ مہمانی فرما اور اس کا ٹھکانہ (قبر) کشادہ کر دے اور اسے خطاؤں (اور گناہوں) سے پانی' برف اور اولوں کے ساتھ ایسے دھو دے اور پاک صاف کر دے جیسے تو سفید کپڑے کو میل کچیل سے پاک صاف کر دیتا ہے۔ اور اسے اس کے (دنیا کے) گھر سے بہتر گھر' اور اس کے گھر والوں سے بہتر گھر والے اور اس کی بیوی سے بہتر بیوی بدلہ میں دے دے۔ اور اسے جنت میں داخل فرما دے اور اسے قبر کے عذاب سے اور (جہنم کی) آگ کے عذاب سے پناہ دے دے۔"

"اس کی قبر کو کشادہ فرما دے اور اسے منور کر دے۔"

یہ سب دعائیں نبی کریم ﷺ سے ثابت ہیں' اگر کچھ اور دعائیں پڑھ لے تو پھر بھی کوئی حرج نہیں مثلاً یہ دعا پڑھ سکتا ہے:

«(اَللّٰهُمَّ) إِنْ كَانَ مُحْسِنًا فَزِدْ فِي إِحْسَانِهِ وَإِنْ كَانَ مُسِيئًا فَتَجَاوَزْ عَنْهُ» (المستدرك للحاكم: ١/ ٣٥٩)

"(اے اللہ!) اگر یہ نیک ہے تو تو اس کی نیکی (کے اجروثواب) میں اضافہ فرما اور اگر یہ خطا کار ہے تو اس (کی خطاؤں) سے درگزر فرما۔ اے اللہ تو اسے معاف فرما اور قول ثابت کے ساتھ اسے ثابت قدمی عطا فرما۔"

پھر چوتھی مرتبہ اللہ اکبر کہے اور تھوڑے سے وقفہ سے السلام علیکم ورحمۃ اللہ کہتے ہوئے دائیں طرف ایک بار سلام پھیردے[1] ہر تکبیر کے ساتھ رفع الیدین بھی مستحب ہے کیونکہ یہ نبی کریم ﷺ اور بعض صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے ثابت ہے۔[2] سنت یہ ہے کہ امام' مرد کے سر کے پاس اور عورت کے درمیان میں کھڑا ہو کیونکہ بروایت انس و سمرہ بن جندب رضی اللہ عنہما نبی کریم ﷺ سے اسی طرح ثابت ہے۔ بعض علماء جو یہ فرماتے ہیں کہ مرد کے سینہ کے پاس کھڑا ہونا سنت ہے تو یہ ایک ضعیف قول ہے' ہمارے علم کے مطابق اس کی کوئی دلیل نہیں ہے۔ نماز جنازہ کے وقت میت کو قبلہ رخ رکھا جائے کیونکہ کعبہ کے بارے میں نبی کریم ﷺ کا ارشاد یہ ہے:

«إِنَّهَا قِبْلَةُ الْمُسْلِمِينَ أَحْيَاءً وَأَمْوَاتًا»(لم أجده)

"یہ زندہ اور مردہ سب مسلمانوں کا قبلہ ہے۔" واللہ ولی التوفیق۔

——— شیخ ابن باز ———

فوت شدہ بچہ' جس کی نماز جنازہ بھول جانے کی وجہ سے نہ پڑھی جا سکی

سوال میرا ایک چھ ماہ کی عمر کا بچہ فوت ہو گیا تھا' میں نے اسے قبرستان میں جا کر دفن کر دیا لیکن بھول جانے کی وجہ سے میں اس کی نماز جنازہ نہ پڑھ سکا' اب مجھے بچے کی قبر کا بھی علم نہیں ہے تو کیا کوئی ایسا صدقہ یا کوئی اور ایسا عمل ہے جو نماز جنازہ سے کفایت کر سکے؟

جواب کوئی دوسرا ایسا عمل نہیں جو نماز جنازہ سے کفایت کر سکے' خواہ میت کسی بڑی عمر کے آدمی کی ہو یا بچے کی' صدقہ نماز جنازہ کا بدل ہو سکتا ہے نہ کوئی اور نیکی کا کام' لہٰذا اس قبرستان میں جاؤ جس کی ایک قبر میں اس بچے کو دفن کیا تھا' قبرستان کو اپنے اور قبلہ کے درمیان کر لو اور اس بچے کی نماز جنازہ کو وضو اور نماز کی دیگر تمام شرائط کو ملحوظ رکھتے ہوئے ادا کرو! چونکہ آپ کو متعین طور پر بچے کی قبر کا علم نہیں لہٰذا اس طرح نماز جنازہ پڑھنا کافی ہو گا۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ لَا يُكَلِّفُ اللَّهُ نَفْسًا إِلَّا وُسْعَهَا ﴾ (البقرۃ۲/ ۲۸۶)

"اللہ تعالیٰ کسی شخص کو اس کی طاقت سے زیادہ تکلیف نہیں دیتا۔"

اور فرمایا:

---

[1] مصنف ابن ابی شیبہ' الجنائز' باب فی التسلیم علی الجنازۃ کما ھو' حدیث: 11491۔

[2] اگرچہ یہ مسئلہ علماء کے مابین مختلف فیہ ہے تاہم راجح قول کے مطابق نماز جنازہ میں ہر تکبیر کے ساتھ رفع الیدین کرنا صحیح مرفوع احادیث سے ثابت نہیں بلکہ ابن عمر رضی اللہ عنہما سے موقوفاً منقول ہے۔ (مصنف ابن ابی شیبہ: 296/3 تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو: احکام الجنائز للالبانی)

﴿ فَاتَّقُوا اللَّهَ مَا اسْتَطَعْتُمْ ﴾ (التغابن ٦٤/ ١٦)
''سو جہاں تک ہو سکے اللہ سے ڈرو۔''
اور نبی کریم ﷺ نے فرمایا ہے:
«إِذَا أَمَرْتُكُمْ بِأَمْرٍ فَأْتُوا مِنْهُ مَا اسْتَطَعْتُمْ، وَإِذَا نَهَيْتُكُمْ عَنْ شَيْءٍ فَاجْتَنِبُوهُ»(صحيح البخاري، الاعتصام بالكتاب والسنة، باب الاقتداء بسنن رسول الله ﷺ، ح:٧٢٨٨ وصحيح مسلم، الحج، باب فرض الحج مرة في العمر، ح:١٣٣٧)
''جب میں تمہیں کسی بات کا حکم دوں تو مقدور بھر اس کی اطاعت بجالاؤ اور جب کسی بات سے منع کر دوں تو اس سے اجتناب کرو۔'' واللہ الموفق۔

فتویٰ کمیٹی

جب نماز جنازہ اور فرض نماز جمع ہو جائیں

سوال جب کوئی آدمی مسجد میں داخل ہو اور وہ دیکھے کہ لوگ جنازہ پڑھ رہے ہیں' وقت بھی تنگ ہو مثلاً نماز مغرب کا وقت ہو (ابھی اس نے نماز پڑھنی ہو) تو کیا وہ نماز مغرب پڑھے یا نماز جنازہ؟

جواب اگر فرض نماز کا وقت ختم ہونے کا اندیشہ نہ ہو تو پہلے نماز جنازہ پڑھ لے کیونکہ اس طرح فرض نماز فوت نہیں ہو گی جب کہ پہلے فرض پڑھنے کی صورت میں نماز جنازہ فوت ہو جائے گی اور اس طرح آدمی دونوں فضیلتوں کو حاصل کر سکے گا اور اگر فرض نماز کے وقت کے ختم ہو جانے کا اندیشہ ہو تو پھر فرض نماز شروع کر لے اور نماز جنازہ چھوڑ دے کیونکہ نماز جنازہ فرض کفایہ ہے۔ کچھ لوگوں کے پڑھ لینے کی صورت میں یہ فرض سب کی طرف سے ادا ہو جاتا ہے جب کہ فرض نماز کے لیے وقت شرط ہے جب تک وقت باقی ہو تو اس میں گنجائش ہے لیکن جب وقت تنگ ہو تو اس وقت فرض نماز کا ادا کرنا متعین ہو گا۔ وباللہ التوفیق۔ وصلی اللہ علی نبینا محمد وآلہ وصحبہ وسلم۔

فتویٰ کمیٹی

ممنوع وقت میں نماز جنازہ

سوال کیا ممنوع وقت میں نماز جنازہ پڑھنا جائز ہے؟

جواب نماز جنازہ ممانعت کے ان اوقات میں تو جائز ہے جن میں وسعت ہے مثلاً عصر یا فجر کے بعد لیکن وہ اوقات جو تنگ ہیں ان میں جائز نہیں مثلاً غروب آفتاب کے وقت حتیٰ کہ سورج غروب ہو جائے' طلوع آفتاب کے وقت حتیٰ کہ ایک نیزہ کی مقدار برابر سورج بلند ہو جائے اور دوپہر کے وقت حتیٰ کہ زوال شروع ہو جائے۔ یاد رہے ان اوقات میں میت کو دفن کرنا بھی جائز نہیں ہے۔

شیخ ابن جبرین

عورت کے لیے نماز جنازہ پڑھنا جائز ہے

سوال کیا عورت کے لیے مردوں کے ساتھ شریک ہو کر نماز جنازہ پڑھنا جائز ہے؟

جواب ان عبادات میں اصول یہ ہے جن کا اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں اور رسول اللہ ﷺ نے اپنی سنت میں بیان فرمایا ہے کہ یہ مردوں اور عورتوں کے لیے عام ہیں حتیٰ کہ مردوں یا عورتوں کی تخصیص کی کوئی دلیل موجود ہو۔ نماز جنازہ بھی ان عبادات میں سے ہے جن کا اللہ اور اس کے رسول ﷺ نے حکم دیا ہے سو یہ خطاب عام ہے جو مردوں اور عورتوں سب کو شامل ہے' لہٰذا اس فرض کو اکثر و بیشتر حالتوں میں صرف مرد ہی ادا کرتے ہیں کیونکہ عورتیں تو اکثر اپنے گھروں ہی میں ہوتی ہیں لیکن اگر کبھی ایسا ہو کہ صرف عورتیں ہی کسی میت کی نماز جنازہ پڑھیں تو اس سے فرض ادا ہو جائے گا۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے یہ ثابت ہے کہ آپ نے حکم دیا کہ سعد بن ابی وقاص کا جنازہ لایا جائے تاکہ وہ بھی نماز پڑھیں' [1] چنانچہ حضرات صحابہ کرام میں سے کسی نے بھی اس سے اختلاف نہیں کیا تھا۔ اس سے معلوم ہوا کہ عورت کے لیے مردوں کے ساتھ نماز جنازہ میں شرکت کرنا جائز ہے۔ نماز جنازہ میں بھی عورتوں کی صفیں مردوں کی صفوں سے پیچھے ہوں گی' یہ بھی ثابت ہے کہ عورتوں نے بھی نبی کریم ﷺ پر اسی طرح صلوٰۃ پڑھی [2] تھی جس طرح مردوں نے پڑھی تھی ہاں البتہ عورتیں دفن کے لیے جنازہ کے ساتھ قبرستان نہیں جا سکتیں کیونکہ نبی کریم ﷺ نے انہیں اس سے منع فرما دیا ہے۔

—— فتویٰ کمیٹی ——

کیا عورت نماز جنازہ پڑھ سکتی ہے؟

سوال دیکھنے میں آیا ہے کہ عورت نماز جنازہ نہیں پڑھتی' فضیلۃ الشیخ سے سوال یہ ہے کہ کیا یہ ممنوع ہے؟

جواب نماز جنازہ مردوں اور عورتوں سب کے لیے ہے کیونکہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا ہے:

«مَنْ شَهِدَ الْجَنَازَةَ حَتَّى يُصَلِّيَ فَلَهُ قِيرَاطٌ، وَّمَنْ شَهِدَ حَتَّى تُدْفَنَ كَانَ لَهُ قِيرَاطَانِ قِيلَ: وَمَا الْقِيرَاطَانِ؟ قَالَ: مِثْلُ الْجَبَلَيْنِ الْعَظِيمَيْنِ»(صحيح البخاري، الجنائز، باب من انتظر حتى تدفن، ح:١٣٢٥ وصحيح مسلم، الجنائز، باب فضل الصلاة على الجنازة، ح:٩٤٥)

”جس شخص نے جنازے میں شریک ہو کر نماز جنازہ پڑھی اسے ایک قیراط ثواب ملتا ہے اور جو اس کے دفن تک موجود رہے اسے دو قیراط ثواب ملتا ہے۔ عرض کیا گیا دو قیراط کتنے ہوتے ہیں؟ آپ نے فرمایا دو بڑے پہاڑوں کے برابر۔“

لیکن عورتوں کے لیے جنازہ کے ساتھ قبرستان میں جانا جائز نہیں ہے' کیونکہ انہیں اس سے منع کر دیا گیا ہے جیسا کہ حضرت ام عطیہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے:

---

[1] صحیح مسلم' الجنائز' باب الصلاة علی الجنازة فی المسجد' حدیث: 973-

[2] سنن الکبری: 30/4-

«نُهِينَا عَنِ اتِّبَاعِ الْجَنَائِزِ وَلَمْ يُعْزَمْ عَلَيْنَا»(صحيح البخاري، الجنائز، باب اتباع النساء الجنازة، ح:١٢٧٨ وصحيح مسلم، الجنائز، باب نهي النساء عن اتباع الجنائز، ح:٩٣٨)

”ہمیں جنازوں کے ساتھ جانے سے منع کر دیا گیا اور اسے ہمارے لیے ضروری قرار نہیں دیا گیا۔“

لیکن نماز جنازہ پڑھنے سے عورتوں کو منع نہیں کیا گیا خواہ نماز جنازہ مسجد میں ادا کی جا رہی ہو یا گھر میں یا جنازہ گاہ میں۔ عورتیں مسجد نبوی میں نبی کریم ﷺ کے ساتھ بھی اور آپ کے بعد بھی نماز جنازہ پڑھتی رہی ہیں۔ [1]

جنازہ کے ساتھ قبرستان تک جانے کی طرح زیارت قبور بھی صرف مردوں کے لیے مخصوص ہے کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے قبروں کی زیارت کرنے والی عورتوں پر لعنت فرمائی ہے۔ [2] اس ممانعت میں حکمت یہ ہے کہ جنازوں کے ساتھ قبرستان جانے اور زیارت قبور میں اس بات کا اندیشہ ہے کہ عورتوں کی وجہ سے مرد اور مردوں کی وجہ سے عورتیں فتنہ میں مبتلا ہوں گی۔ واللہ اعلم۔ نیز نبی ﷺ نے فرمایا:

«مَا تَرَكْتُ بَعْدِي فِتْنَةً أَضَرَّ عَلَى الرِّجَالِ مِنَ النِّسَاءِ»(صحيح البخاري، النكاح، باب ما يُتَّقَى من شؤم المرأة ... الخ، ح:٥٠٩٦ وصحيح مسلم، الرقاق، باب أكثر أهل الجنة الفقراء ...، ح:٢٧٤٠)

”میں نے اپنے بعد کوئی ایسا فتنہ نہیں چھوڑا جو مردوں کے لیے عورتوں سے بڑھ کر نقصان دہ ہو۔“

—— شیخ ابن باز ——

غائبانہ نماز جنازہ

سوال ہم غائبانہ نماز جنازہ کس طرح پڑھیں؟

غائبانہ نماز جنازہ بھی حاضر میت کی نماز جنازہ کی طرح ہے۔ یہی وجہ ہے کہ نبی کریم ﷺ نے جب نجاشی کے انتقال کی خبر دی تو آپ نے لوگوں کو حکم دیا کہ عید گاہ میں چلیں۔ وہاں آپ نے لوگوں کی صفیں بنا دیں اور پھر اسی طرح چار تکبیروں کے ساتھ نماز جنازہ پڑھی [3] جس طرح آپ حاضر میت کی نماز جنازہ پڑھا کرتے تھے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ کیا ہر میت کی غائبانہ نماز جنازہ پڑھی جا سکتی ہے یا نہیں؟ اس مسئلہ میں اہل علم میں اختلاف ہے۔ بعض یہ کہتے ہیں کہ ہر ایک میت کی غائبانہ نماز جنازہ پڑھی جا سکتی ہے حتیٰ کہ بعض نے تو یہاں تک کہا ہے کہ آدمی کو چاہیے کہ ہر شام کو نماز جنازہ پڑھے اور نیت یہ کرے کہ یہ ہر اس مسلمان کی نماز جنازہ ہے جو آج زمین کے مشرق یا مغرب میں فوت ہوا ہے۔ کچھ دیگر اہل علم کا یہ کہنا ہے کہ ہر ایک کی تو نہیں بلکہ صرف اس شخص کی غائبانہ نماز جنازہ پڑھی جائے جس کے بارے میں یہ معلوم ہوا ہو کہ اس کی نماز جنازہ نہیں پڑھی گئی۔ ایک تیسرے گروہ کا یہ کہنا ہے کہ ہر اس شخص کی نماز جنازہ غائبانہ پڑھی جائے جس نے علم نافع وغیرہ کی صورت میں مسلمانوں پر احسان کیا ہو۔ ان میں سے راجح قول یہی ہے کہ صرف اسی شخص کی نماز جنازہ غائبانہ پڑھی جائے جس کی نماز جنازہ نہ پڑھی گئی ہو۔

---

[1] صحیح مسلم' الجنائز' باب الصلاة علی الجنازة فی المسجد' حدیث: 973۔

[2] سنن ابی داود' الجنائز' باب فی زیارة النساء القبور' حدیث: 3236 و جامع الترمذی' حدیث: 320 و سنن نسائی' حدیث: 2045۔

[3] صحیح بخاری' الجنائز' باب الصلاة علی الجنائز الخ' حدیث: 1327-1328 و صحیح مسلم' باب فی التکبیر علی الجنازة' حدیث: 951۔

خلفاء راشدین رضی اللہ عنہم کے عہد میں بہت سی ایسی شخصیتیں فوت ہوئیں جن کے مسلمانوں پر بہت احسانات تھے لیکن ان میں سے کسی کی بھی غائبانہ نماز جنازہ ادا نہیں کی گئی۔ عبادات کے سلسلہ میں اصول یہ ہے کہ توقف کیا جائے الا یہ کہ ان کی مشروعیت کی دلیل موجود ہو۔

——— شیخ ابن عثیمین ———

غائبانہ نماز جنازہ پڑھنا' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا خاصہ نہیں ہے

سوال کیا ہمارے لیے بھی اسی طرح غائبانہ نماز جنازہ پڑھنا جائز ہے جس طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے دوست نجاشی کا جنازہ پڑھا تھا یا یہ صرف آپ ہی کا خاصہ تھا؟

جواب غائبانہ نماز جنازہ جائز ہے کیونکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے پڑھا ہے۔ یہ آپ کا خاصہ بھی نہیں کیونکہ حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے بھی تو آپ کے ساتھ نجاشی کا جنازہ غائبانہ پڑھا تھا اور پھر اصل عدم خصوصیت ہی ہے (الا یہ کہ خصوصیت کی کوئی دلیل ہو) لیکن غائبانہ جنازہ ہر ایک کا نہیں بلکہ صرف اس کا پڑھا جائے گا جس کا اسلام میں خاص مقام و مرتبہ ہو گا۔
وصلی اللہ علی نبینا محمد وآلہ وصحبہ وسلم.

——— فتویٰ کمیٹی ———

نماز جنازہ کے بعد دعا

سوال نماز جنازہ کے بعد دعا کا کیا حکم ہے؟

جواب دعا عبادت کی روح ہے۔[1] بندے کا اپنے رب سے اپنے لیے یا کسی اور کے لیے مانگنا اور اپنی ضرورت و حاجت براری کے لیے اپنے مولا کے سامنے عجز و نیاز اور عبودیت کا اظہار کرنا ایک ایسا کام ہے جس کی اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب عزیز میں ترغیب دی ہے' چنانچہ فرمایا:

﴿ وَقَالَ رَبُّكُمُ ادْعُونِي أَسْتَجِبْ لَكُمْ ﴾ (الغافر ۴۰/ ۶۰)
"اور تمہارے پروردگار نے فرمایا ہے کہ تم مجھ سے دعا کرو' میں تمہاری (دعا) قبول کروں گا۔"

اور فرمایا:

﴿ ادْعُوا رَبَّكُمْ تَضَرُّعًا وَخُفْيَةً ﴾ (الأعراف ۷/ ۵۵)
"(لوگو!) اپنے پروردگار سے عاجزی سے اور چپکے چپکے دعائیں مانگا کرو۔"

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی اپنے قول و عمل سے دعا کی تلقین فرمائی ہے اور دعا میں اصل اطلاق ہے الا یہ کہ کسی وقت کے ساتھ اس کی قید ثابت ہو جائے یا کسی حالت یا کسی وقت معین میں کثرت کے ساتھ دعا کی ترغیب ثابت ہو مثلاً نماز میں بحالت سجدہ یا رات کے آخری حصہ میں دعا کی ترغیب موجود ہے لہٰذا اطلاق و تقیید کے بارے میں مسلمان کو صرف اسی کی پابندی کرنا چاہیئے جو نصوص سے ثابت ہو۔ نماز جنازہ کی احادیث میں میت کے لیے دعا کرنا ثابت ہے اسی طرح دفن سے

---

[1] جامع الترمذی' الدعوات' باب ماجاء فی فضل الدعاء' ح: 3371۔

فراغت کے بعد بھی میت کے لیے دعا اور استغفار ثابت ہے۔ چنانچہ رسول اللہ ﷺ کا یہ معمول تھا کہ جب آپ میت کی تدفین سے فارغ ہو جاتے تو قبر کے پاس کھڑے ہو جاتے اور فرماتے:

«اِسْتَغْفِرُوا لأَخِيكُمْ وَاسْأَلُوا لَهُ بِالتَّثْبِيتِ فَإِنَّهُ الآنَ يُسْأَلُ»(سنن أبي داود، الجنائز، باب الاستغفار عند القبر . . . الخ، ح:٣٢٢١)

''اپنے بھائی کے لیے استغفار کرو اور ثابت قدم رہنے کی دعا کرو' کیونکہ اب اس سے سوال کیا جائے گا۔''

رسول اللہ ﷺ سے یہ بھی ثابت ہے کہ آپ جب قبروں کی زیارت کے لیے تشریف لے جاتے تو اہل قبور کے لیے دعا فرماتے [1] اور حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو زیارت قبور کی دعا اس طرح سکھاتے جس طرح آپ قرآن مجید کی سورتیں سکھایا کرتے تھے لیکن نماز جنازہ کے بعد دعا کرنا۔ نبی ﷺ سے ہرگز ہرگز ثابت نہیں ہے۔ نہ آپ کی سنت سے یہ ثابت ہے اور نہ حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی سنت ہی سے اگر نبی ﷺ نے یا صحابہ کرام نے نماز جنازہ کے بعد دعا کی ہوتی تو وہ بھی اسی طرح ثابت ہوتی جس طرح آپ سے نماز جنازہ میں' زیارت قبور کے موقع پر اور دفن سے فراغت کے بعد دعا ثابت ہے' لہذا جب نماز جنازہ کے بعد آپ سے دعا ثابت نہیں ہے تو اسے یقیناً بدعت قرار دیا جائے گا اور کسی بھی مسلمان کو اس موقعہ پر دعا کرنا زیب نہیں دیتا' کیونکہ نبی ﷺ نے ارشاد فرمایا ہے:

«عَلَيْكُمْ بِسُنَّتِي وَسُنَّةِ الْخُلَفَاءِ الرَّاشِدِينَ الْمَهْدِيِّينَ وَإِيَّاكُمْ وَمُحْدَثَاتِ الأُمُورِ . . .»(سنن أبي داود، السنة، باب في لزوم السنة، ح:٤٦٠٧)

''میری سنت اور (میرے بعد کے) ہدایت یافتہ خلفاء راشدین کی سنت کو مضبوطی سے تھام لو اور دین میں نئے نئے کاموں سے بچو.....''

—— فتویٰ کمیٹی ——

کافروں کے جنازوں میں شرکت

سوال کافروں کے جنازوں میں شرکت کے بارے میں کیا حکم ہے جو آج کل ایک سیاسی روایت اور بین الاقوامی عرف بن چکا ہے؟

جواب اگر کافر موجود ہوں جو اپنے مردوں کو خود دفن کر سکیں تو مسلمانوں کو ان کی تدفین کا کام نہیں کرنا چاہیئے بلکہ تدفین میں شرکت اور تعاون بھی نہیں کرنا چاہیئے اور نہ ان کے جنازوں کے ساتھ جانا چاہیئے کیونکہ رسول اللہ ﷺ اور خلفاء راشدین رضی اللہ عنہم سے یہ ثابت نہیں ہے بلکہ اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول ﷺ کو عبداللہ بن ابی ابن سلول کی قبر پر کھڑا ہونے سے منع فرما دیا تھا اور اس کی علت اس کا کفر بیان کی گئی' ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ وَلَا تُصَلِّ عَلَىٰٓ أَحَدٍ مِّنْهُم مَّاتَ أَبَدًا وَلَا تَقُمْ عَلَىٰ قَبْرِهِۦٓ ۖ إِنَّهُمْ كَفَرُوا۟ بِٱللَّهِ وَرَسُولِهِۦ وَمَاتُوا۟ وَهُمْ فَٰسِقُونَ ﴿٨٤﴾ ﴾ (التوبة٩/ ٨٤)

---

[1] صحیح مسلم' الجنائز' باب مایقال عند دخول القبور والدعاء' ح: 974 - 975۔

"اور (اے پیغمبر!) ان میں سے کوئی مرجائے تو آپ کبھی اس پر (نماز جنازہ) نہ پڑھنا اور نہ اس کی قبر پر (جاکر) کھڑے ہونا' بلاشبہ ان لوگوں نے اللہ اور اس کے رسول کا انکار کیا اور مرے بھی ایسی حالت میں کہ وہ نافرمان تھے۔"

اور اگر کوئی کافر انہیں دفن کرنے کے لیے موجود نہ ہو تو پھر مسلمانوں کو چاہیئے کہ انہیں دفن کر دیں جس طرح نبی کریم ﷺ نے غزوۂ بدر میں قتل ہونے والے کافروں کو دفن کروا دیا تھا۔ [1]

فتویٰ کمیٹی

بدعتیوں کے جنازہ میں حاضر ہونا

سوال کیا اہل سنت کے لیے بدعتیوں کے جنازوں میں حاضری اور ان کے مردوں کی نماز جنازہ پڑھنا جائز ہے؟

جواب وہ بدعتی جن کی بدعت اللہ تعالیٰ کے ساتھ شرک تک پہنچ جاتی ہے مثلاً جو مردوں یا غائب جنوں اور فرشتوں وغیرہ اور دیگر مخلوقات سے مدد مانگتے اور فریاد کرتے ہیں تو وہ کافر ہیں' ان کے مردوں کی نماز جنازہ پڑھنا اور ان کے جنازوں میں حاضر ہونا جائز نہیں ہے اور وہ بدعتی جن کی بدعت شرک تک نہیں پہنچتی مثلاً جو میلاد اور اسراء و معراج کی محفلیں منعقد کرتے ہیں تو یہ لوگ گناہ گار ہیں' ان کی نماز جنازہ پڑھی جائے گی اور ان کے جنازوں میں بھی حاضری دی جائے گی اور ان کے لیے بھی مغفرت کی اسی طرح امید ہے جس طرح موحد گناہ گاروں کے لیے امید ہے کیونکہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ إِنَّ اللَّهَ لَا يَغْفِرُ أَن يُشْرَكَ بِهِ وَيَغْفِرُ مَا دُونَ ذَٰلِكَ لِمَن يَشَاءُ ﴾ (النساء٤/ ٤٨)

"یقیناً اللہ اس گناہ کو نہیں بخشے گا کہ کسی کو اسکا شریک بنایا جائے اور اسکے سوا اور گناہ جس کو چاہے معاف کر دے۔"

فتویٰ کمیٹی

میت کو دفن کرنے کے احکام

میت کو اسی شہر میں دفن کیا جائے' جہاں وفات ہوئی ہے

سوال ایک باپ نے اپنے بیٹوں کو یہ وصیت کی ہے کہ اس کی وفات کے بعد اسکی میت کو مدینہ منورہ لے جاکر بقیع الغرقد میں دفن کر دیا جائے' تو سوال یہ ہے کہ ایک شہر سے لے جاکر دوسرے شہر میں میت کو دفن کرنے کے بارے میں کیا حکم ہے؟

جواب نبی کریم ﷺ کے عہد میں اور حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے عہد میں عملی سنت یہ رہی ہے کہ مردوں کو اسی شہر میں دفن کیا جاتا رہا ہے جہاں ان کی وفات ہوئی اور شہداء کو بھی وہیں دفن کیا جاتا رہا ہے جہاں انہوں نے شہادت پائی۔ کسی بھی صحیح حدیث یا اثر سے یہ ثابت نہیں ہے کہ کسی بھی صحابی کو اس شہر کے قبرستان کے علاوہ جہاں اس کی وفات ہوئی' کسی اور شہر' یا اس کے مضافات یا اس کے قریب کسی اور جگہ دفن کیا گیا ہو۔ اسی وجہ سے جمہور فقہاء یہ فرماتے ہیں کہ یہ جائز نہیں ہے کہ کسی صحیح غرض کے بغیر میت کو دفن کرنے کے لیے اس شہر کے علاوہ جہاں اس کی وفات ہوئی ہو کسی اور شہر میں دفن کیا جائے۔ غرض صحیح یہ ہے کہ مثلاً اگر اس شہر میں اسے دفن کیا جائے تو کسی دشمنی اور جھگڑے وغیرہ کی وجہ

---

[1] صحیح بخاری' المغازی' باب قتل أبی جهل' حدیث:3976 و صحیح مسلم' الجنة' باب عرض مقعد المیت.....' حدیث:2874-2875-

سے اس کی قبر کی بے حرمتی اور توہین کیے جانے کا اندیشہ ہو تو اس صورت میں واجب ہے کہ اسے کسی ایسی جگہ منتقل کر دیا جائے جہاں اس طرح کا کوئی ڈر نہ ہو یا اسے اس کے اپنے شہر میں اس لیے منتقل کیا جا سکتا ہے تاکہ اس کے اہل خانہ بھی اس کی زیارت کر سکیں اور اس طرح ان کی دلجوئی بھی کی جا سکے لیکن اس طرح کی جواز کی صورتوں کے باوجود یہ شرط ہے کہ اس میں اتنی تاخیر نہ ہو کہ میت میں تبدیلی کا عمل شروع ہو جائے یا اس کی بے حرمتی کا اندیشہ ہو۔ اگر اس طرح کا کوئی حقیقی سبب موجود نہ ہو یا یہ شرطیں پوری نہ ہوتی ہوں تو پھر میت کو منتقل کرنا جائز نہیں۔

برکت کی امید سے افضل شہر کی طرف منتقل کرنے کی اجازت دینے میں ایک خرابی کا پہلو بھی ہے جسے بعد میں ختم کرنا بہت مشکل ہو جائے گا اور وہ یہ کہ اس طرح تو پھر بہت سے لوگ یہ چاہیں گے کہ اسی غرض سے انہیں بھی یہاں دفن ہونے کی اجازت دی جائے۔ اس لیے کمیٹی کی یہ رائے ہے کہ ہر میت کو اسی شہر کے قبرستان میں دفن کیا جائے جہاں اس کا انتقال ہوا ہو اور کسی صحیح مقصد کے بغیر اسے کسی دوسرے شہر میں منتقل نہ کیا جائے تاکہ سنت کے مطابق عمل ہو سکے' سلف امت کے عمل کی اتباع ہو سکے' سد ذریعہ ہو سکے' شریعت نے میت کو جلد دفن کرنے کا جو حکم دیا ہے اس پر عمل ہو سکے' میت کو خراب ہونے سے بچایا جا سکے' شرعی ضرورت و حاجت کے بغیر خرچ ہونے والے مال میں اسراف سے بچا جا سکے اور اس کی بجائے اس مال سے وارثوں کے حقوق ادا کیے جائیں اور اس مال کو شرعی مصارف اور نیکی کے کاموں میں خرچ کیا جائے۔ اس فتویٰ پر کمیٹی کے تمام ارکان نے دستخط کئے ہیں۔ وصلى الله على نبينا محمد و آله وصحبه.

——— فتویٰ کمیٹی ———

میت کو ایک شہر سے دوسرے شہر میں منتقل کرنا

سوال آپ کی کیا رائے ہے کہ کوئی شخص یہ وصیت کرے کہ بعد از وفات اسے فلاں جگہ لے جا کر دفن کیا جائے تو کیا اس وصیت کے مطابق عمل کیا جائے گا؟

جواب سب سے پہلی بات تو یہ ہے کہ اس سے پوچھا جائے کہ اس نے تدفین کے لیے اس جگہ کو کیوں پسند کیا ہے؟ ہو سکتا ہے کہ وہاں کوئی فرضی قبر ہو یا کوئی ایسی قبر ہو جس پر جا کر لوگ شرک کرتے ہوں یا اس وصیت کا اس طرح کا کوئی اور حرام سبب ہو تو اس صورت میں اس وصیت کے مطابق عمل کرنا جائز نہیں ہو گا۔ لہٰذا وصیت کرنے والا اگر مسلمان ہو تو اسے مسلمانوں کے ساتھ دفن کر دیا جائے۔ اگر ان مذکورہ مقاصد کے علاوہ کسی اور مقصد سے وصیت کی ہو مثلاً یہ کہ اس شہر میں اس نے زندگی بسر کی ہو تو اس صورت میں اس وصیت پر عمل کرنے میں کوئی حرج نہیں بشرطیکہ اس طرح اس پر بہت زیادہ مالی اخراجات نہ ہوتے ہوں اور اگر اس پر بہت زیادہ روپے خرچ ہوتے ہوں تو پھر وصیت پر عمل نہیں کیا جائے گا' کیونکہ اللہ تعالیٰ کی ساری زمین ایک جیسی ہے بشرطیکہ زمین مسلمانوں کی ہو۔

——— شیخ ابن عثیمین ———

میت کو دائیں پہلو پر قبلہ رخ دفن کیا جائے

سوال ہمارے ہاں مصر میں میت کو اس طرح پشت کے بل لٹا کر دفن کیا جاتا ہے کہ دایاں ہاتھ پیٹ پر بائیں ہاتھ کے

اوپر ہوتا ہے لیکن سعودیہ میں میں نے یہ دیکھا ہے کہ یہاں دائیں پہلو پر دفن کیا جاتا ہے۔ امید ہے مستفید فرمائیں گے کہ کون سا طریقہ صحیح ہے؟

جواب صحیح طریقہ یہ ہے کہ میت کو دائیں پہلو پر قبلہ رخ دفن کیا جائے' کیونکہ کعبہ زندوں کا بھی قبلہ ہے اور مردوں کا بھی' جیسے سونے والے کو نبی کریم ﷺ نے یہ حکم دیا ہے کہ وہ دائیں کروٹ لیٹے [1] اسی طرح میت کو بھی دائیں کروٹ ہی پر دفن کیا جائے گا کیونکہ وفات کے اعتبار سے نیند اور موت مشترک ہیں جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ ٱللَّهُ يَتَوَفَّى ٱلْأَنفُسَ حِينَ مَوْتِهَا وَٱلَّتِى لَمْ تَمُتْ فِى مَنَامِهَا ﴾ (الزمر ۳۹/ ۴۲)

"اللہ لوگوں کے مرنے کے وقت ان کی روحیں قبض کر لیتا ہے اور جو مرے نہیں (ان کی روحیں) سوتے میں (قبض کر لیتا ہے۔)"

اور فرمایا:

﴿ وَهُوَ ٱلَّذِى يَتَوَفَّىٰكُم بِٱلَّيْلِ وَيَعْلَمُ مَا جَرَحْتُم بِٱلنَّهَارِ ثُمَّ يَبْعَثُكُمْ فِيهِ لِيُقْضَىٰٓ أَجَلٌ مُّسَمًّى ﴾

(الأنعام ٦/ ٦٠)

"اور وہی تو ہے جو رات کو (سونے کی حالت میں) تمہاری روح قبض کر لیتا ہے اور جو کچھ تم دن میں کرتے ہو اس کو بھی جانتا ہے' پھر تمہیں دن کے وقت اٹھا کھڑا کرتا ہے تاکہ (یہی سلسلہ جاری رکھ کر زندگی کی) مدت معین پوری کر دی جائے۔"

لہذا دفن میت کے بارے میں حکم شریعت یہ ہے کہ اسے دائیں پہلو پر قبلہ رخ لٹایا جائے۔ سائل نے تدفین کے سلسلہ میں اپنے ملک میں جو دیکھا ہے تو ہو سکتا ہے کہ جہالت کی وجہ سے ایسا ہوتا ہو ورنہ مجھے معلوم نہیں کہ اہل علم میں سے کسی نے یہ کہا ہو کہ میت کو چت لٹایا جائے اور اس کے ہاتھ اس کے پیٹ پر رکھ دیئے جائیں۔

——— شیخ ابن عثیمین ———

لکڑی کے صندوق میں مسلمانوں کی تدفین

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ وَحْدَهُ وَالصَّلٰوةُ وَالسَّلَامُ عَلٰى مَنْ لاَّ نَبِيَّ بَعْدَهُ سَيِّدِنَا وَنَبِيِّنَا مُحَمَّدٍ ﷺ

اسلامی فقہی کونسل نے اس سوال کا جائزہ لیا جو اسلامک یوتھ کے نگران اور آسٹریلیا کی ریاست وکٹوریہ کی اسلامی جمعیت کے وفد کے سربراہ کی طرف سے موصول ہوا کہ لکڑی کے صندوق میں مسلمانوں کی اس طرح تدفین کے بارے میں کیا حکم ہے جس طرح عیسائیوں کے ہاں اس کا رواج ہے۔ انہوں نے مزید بتایا کہ بعض مسلمان اس طریقے کو اچھا سمجھتے اور اسی کو اختیار کرتے ہیں' حالانکہ مذکورہ ریاست کی حکومت نے مسلمانوں کو یہ اجازت دے رکھی ہے کہ وہ اپنے مردوں کو اسلامی طریقے کے مطابق شرعی کفن میں دفن کر سکتے ہیں۔ اس مسئلہ پر غور و فکر کرنے اور اس کا جائزہ لینے کے بعد اسلامی فقہی کونسل نے درج ذیل رائے کا اظہار کیا ہے:

---

[1] صحیح بخاری' الوضوء' باب فضل من بات علی وضوء' حدیث: 247 و صحیح مسلم' الذکر والدعاء' حدیث: 2710۔

① ہر وہ عمل و کردار جسے کوئی مسلمان غیر مسلموں کی مشابہت اور تقلید میں اختیار کرے' احادیث صحیحہ کی روشنی میں وہ ممنوع ہے۔

② صندوق میں دفن کرنے سے مقصد اگر غیر مسلموں کے ساتھ تشبیہ ہو تو حرام ہے' اگر تشبیہ مقصود نہ ہو تو بلاضرورت ایسا کرنا مکروہ ہے اور اگر کسی ضرورت کی وجہ سے ایسا کیا جائے تو جائز ہے۔

میت کو رات کے وقت دفن کرنا

سوال اگر کسی میت کا انتقال آدھی رات سے پہلے یا بعد میں ہو تو کیا اسے رات کو دفن کرنا جائز ہے یا ضروری ہے کہ طلوع فجر کے بعد ہی دفن کیا جائے؟

جواب میت کو رات کے وقت دفن کرنا بھی جائز ہے' کیونکہ ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ ایک انسان فوت ہو گیا جس کی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم بھی عیادت فرمایا کرتے تھے' اس کا انتقال رات کو ہوا اور رات ہی میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے اسے دفن کر دیا' صبح ہوئی تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو اس کے بارے میں بتایا تو آپ نے فرمایا:

«مَا مَنَعَكُمْ أَنْ تُعْلِمُونِي»(صحيح البخاري، الجنائز، باب الإذن بالجنازة، ح:١٢٤٧)

"مجھے کیوں نہ بتایا۔"

صحابہ نے عرض کیا "رات کا وقت تھا' اندھیرا بھی تھا' ہم نے پسند نہ کیا کہ آپ کو تکلیف دیں تو آپ اس کی قبر پر تشریف لے گئے اور اس کا جنازہ پڑھا۔"

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ آپ نے اس بات پر اعتراض نہیں کیا کہ اسے رات کے وقت دفن کیوں کیا گیا ہاں البتہ آپ نے اس پر ضرور اعتراض فرمایا کہ آپ کو رات کے وقت ہی کیوں نہ بتایا گیا اور صبح کیوں بتایا ہے؟ جب اس سلسلہ میں صحابہ کرام نے عذر پیش کیا تو آپ نے ان کے عذر کو قبول فرمالیا۔ حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ "کچھ لوگوں نے قبرستان میں آگ دیکھی تو اس کے پاس آگئے اور یہاں آکر کیا دیکھتے ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قبر میں کھڑے فرما رہے ہیں۔"

«نَاوِلُونِي صَاحِبَكُم»(سنن أبي داود، الجنائز، في الدفن بالليل، ح:٣١٦٤)

"یہ اپنا ساتھی مجھے پکڑاؤ۔"

یہ وہ صحابی تھے جو بلند آواز سے ذکر کیا کرتے تھے اور یہ تدفین بھی رات کے وقت عمل میں آئی تھی جیسا کہ حضرت جابر رضی اللہ عنہ کے ان الفاظ سے معلوم ہوتا ہے کہ کچھ لوگوں نے قبرستان میں آگ دیکھی ......" الخ۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی تدفین بھی رات کے وقت عمل میں آئی تھی جیسا کہ امام احمد رحمہ اللہ نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی یہ روایت بیان فرمائی ہے کہ ہمیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تدفین کا علم اس وقت ہوا جب ہم نے (بدھ کی) رات کے آخری پہر "مساحی" کی آواز سنی۔ [1] مساحی ان آلات کو کہتے ہیں' جن کے ساتھ مٹی کو کھودا یا کھرچا جاتا ہے۔ اسی طرح ابوبکر' [2] عثمان' [3] عائشہ [4] اور ابن مسعود رضی اللہ عنہم [5] کو بھی رات ہی کے وقت دفن کیا گیا تھا۔

---

[1] مسند احمد: 6/62-242- [2] صحیح بخاری' الجنائز' باب موت یوم الاثنین' حدیث: 1387 و مصنف ابن ابی شیبة: 3/346-

[3] مصنف ابن ابی شیبة 3/346- [4] اسد الغابة 5/54 والبداية والنهاية 8/97- [5] مصنف ابن ابی شیبة 3/346-

وہ روایت جس سے معلوم ہوتا ہے کہ رات کے وقت دفن کرنا مکروہ ہے' وہ اس پر محمول ہے کہ کسی کو کم حیثیت سمجھتے ہوئے جلد بازی کے ساتھ راتوں رات دفن کر دیا جائے اور صبح تک لوگوں کو بھی نہ بتایا جائے تاکہ وہ اس کے جنازہ میں شریک ہی نہ ہو سکیں یا وہ اس لیے رات کو دفن کے لیے جلد بازی کا مظاہرہ کریں کہ انہوں نے کفن اچھا نہ دیا ہو اور اسے چھپانے کے لیے وہ جلد بازی سے کام لیتے ہوئے اسے رات ہی کو دفن کر دیں' چنانچہ اس سے منع کر دیا گیا ہے۔ یا ممانعت کی روایت کو اس بات پر محمول کیا جائے گا کہ افضل یہ ہے کہ دن کے وقت دفن کیا جائے تاکہ نماز جنازہ میں زیادہ سے زیادہ مسلمان شریک ہو سکیں۔ جنازہ کے ساتھ جانے والوں' تدفین میں شرکت کرنے والوں اور سنت کے مطابق لحد بنانے والوں کے لیے بھی اسی میں زیادہ سہولت ہے کہ تدفین کا عمل دن کے وقت سرانجام دیا جائے بشرطیکہ کوئی ایسی ضرورت نہ ہو جو جلد تدفین کی متقاضی ہو لیکن یاد رہے کہ زیادہ واجب یہی بات ہے کہ تدفین میں جلدی کی جائے خواہ رات کا وقت ہی کیوں نہ ہو۔ وصلی اللہ علی نبینا محمد و آلہ و سلم

—— فتویٰ کمیٹی ——

بوقت ضرورت ایک قبر میں دو میتوں کو دفن کرنا

سوال چھ ماہ کی بچی فوت ہوئی تو اسے ایک ایسے بچے کی قبر میں دفن کر دیا گیا تھا کہ جو اپنی ماں کے پیٹ میں ہی چھٹے مہینے اسقاط ہو گیا تھا۔ کیا اس طرح (دونوں کو ایک قبر میں دفن) کرنا جائز ہے یا نہیں؟ اور جن لوگوں نے ان دونوں کو ایک قبر میں دفن کر دیا ہے ان کے بارے میں کیا حکم ہے؟

جواب حکم شریعت یہ ہے کہ ہر میت کو الگ الگ قبر میں دفن کیا جائے' اسی سنت پر مسلمان نبی کریم ﷺ کے دور سے آج تک عمل کرتے چلے آئے ہیں۔ ہاں اگر دو یا دو سے زیادہ میتوں کو ایک ہی قبر میں دفن کرنے کی کوئی ضرورت و حاجت ہو تو اس میں بھی کوئی حرج نہیں جیسا کہ "صحیحین" اور دیگر کتب حدیث میں ہے کہ ضرورت و حاجت کی وجہ سے نبی کریم ﷺ نے حکم دیا تھا کہ شہداء احد میں سے دو دو یا تین تین آدمیوں کو ایک قبر میں دفن کیا جائے۔[1] اب اس دفن شدہ بچی اور ساقط شدہ جنین کی قبر کھودنے کی ضرورت نہیں کیونکہ اب وقت ختم ہو گیا اور جس نے ازراہ جہالت ایسا کیا اسے کوئی گناہ بھی نہ ہو گا' البتہ ہر اس شخص کے لیے یہ ضروری ہے جو کسی بھی عبادت یا کسی اور کام کو کرنے لگے تو یہ معلوم کرے کہ اس کے لیے احکام الٰہی کیا ہیں تاکہ وہ کسی ایسے امر کا ارتکاب نہ کر بیٹھے جو شرعاً ممنوع ہو۔

—— شیخ ابن عثیمین ——

ایک میت کو دوسری کے ساتھ دفن کرنا

سوال میری والدہ کا قریباً ۸۵ برس کی عمر میں انتقال ہوا' لیکن انہیں میری دوسری والدہ کے ساتھ ہی دفن کر دیا گیا' جن کا تین برس پہلے انتقال ہوا تھا تو اس بارے میں حکم شریعت کیا ہے؟

---

[1] صحیح بخاری' الجنائز' باب دفن الرجلین والثلاثۃ فی قبر' حدیث: 1345-

جواب کسی دوسری میت کے ساتھ دفن کرنا جائز نہیں جب تک کہ اس کے جسم کے کچھ حصے ابھی تک قبر میں باقی ہوں لہٰذا واجب یہ ہے کہ ہر میت کو ایک الگ اور مستقل قبر میں دفن کیا جائے۔ اگر میت کے لیے قبر کھودی جائے اور اس میں سے پہلی میت کے کچھ حصے برآمد ہوں تو ضروری ہے کہ انہیں دوبارہ دفن کر کے قبر کی مٹی اوپر ڈال دی جائے اور نئی میت کے لیے کوئی دوسری قبر کھودی جائے خواہ اس کے لیے جگہ دور ہی کیوں نہ ملے' کیونکہ مسلمان کی حرمت کا یہی تقاضا ہے خواہ وہ فوت شدہ ہی کیوں نہ ہو' چنانچہ حدیث میں وارد ہے کہ "میت کی ہڈی کو توڑنا اسی طرح ہے جیسے کسی زندہ کی ہڈی کو توڑنا۔" [1]

—— شیخ ابن عثیمین ——

قبر میں عورت کے تنگ کو کھولنا

سوال میں ایک مسجد میں امام ہوں اور جمعہ کے خطبہ کے لیے شیخ محمد بن صالح بن عثیمین کی کتاب "الضیاء اللامع من الخطب الجوامع" سے استفادہ کرتا ہوں۔ اس کتاب میں حج کی ترغیب کے سلسلہ میں ایک خطبہ میں یہ عبارت بھی ہے کہ "عورت کے لیے سفرحج میں جو محرم کا ساتھ ہونا ضروری قرار دیا گیا ہے تو یہ اس کی حفاظت و صیانت کے لیے ہے۔ اس سلسلہ میں عوام میں جو یہ بات مشہور ہے کہ یہ اس لیے ہے کہ اگر وہ سفرحج میں فوت ہو جائے تو محرم اس کے تنگ کو کھول سکے تو یہ بات صحیح نہیں ہے کیونکہ عورت جب فوت ہو جائے تو اس کے کفن کے تنگ کو ہر شخص کھول سکتا ہے خواہ وہ محرم ہو یا نہ ہو۔ چنانچہ حدیث سے ثابت ہے کہ نبی کریم ﷺ کی صاحبزادی کو جب دفن کیا جا رہا تھا تو نبی کریم ﷺ قبر کے پاس تشریف فرما تھے' آپ کی آنکھیں اشکبار تھیں تو آپ نے حضرت ابوطلحہ رضی اللہ عنہ کو قبر میں اترنے کا حکم دیا' حالانکہ آپ خود بھی تشریف فرما تھے اور ان کے شوہر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ بھی موجود تھے۔" میں نے جب اسے خطبہ میں بیان کیا تو اس پر ایک طالب علم نے اعتراض کیا کہ یہ صحیح نہیں تو اس سلسلہ میں آپ سے فتویٰ مطلوب ہے کیا یہ بات صحیح ہے یا نہیں؟

جواب جی ہاں شیخ محمد بن صالح العثیمین نے اپنی کتاب "الضیاء اللامع" میں جو یہ لکھا ہے کہ "سفرحج اور دیگر سفروں میں عورت کے ساتھ محرم کا ہونا جو ضروری ہے تو یہ اس لیے نہیں کہ اگر وہ فوت ہو جائے تو وہ اس کے کفن کے تنگ کو کھول سکے" یہ بالکل صحیح ہے اسی طرح انہوں نے جو یہ استدلال کیا ہے کہ نبی کریم ﷺ اپنی صاحبزادی --- حضرت ام کلثوم رضی اللہ عنہا زوجہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ --- کی قبر کے پاس تشریف فرما تھے اور آپ نے حضرت ابوطلحہ رضی اللہ عنہ کو حکم دیا کہ قبر میں اتریں اور دفن کریں [2] جب کہ حضرت ام کلثوم کے والد گرامی اور شوہر نامدار موجود تھے' تو یہ استدلال بھی بالکل صحیح ہے اور یہ بات بھی درست نہیں کہ یہ رسول اللہ ﷺ کی صاحبزادی کا خاصہ تھا' کیونکہ اصول عدم خصوص ہی ہے الا یہ کہ خصوصیت کی کوئی دلیل ہو اور یہاں کوئی ایسی دلیل موجود نہیں ہے۔

---

[1] سنن ابی داود' الجنائز' باب فی الحفار یجد العظم ..... ' حدیث: 3207 و سنن ابن ماجه' حدیث: 1616 - 1617۔

[2] صحیح بخاری' الجنائز' باب من یدخل قبر المرأة' حدیث: 1342۔

—— فتویٰ کمیٹی ——

غیر محرم کا عورت کو قبر میں اتارنا

سوال میں ایک ایسا آدمی ہوں کہ میرا پاؤں کٹا ہوا ہے۔ کچھ عرصہ پہلے میری بیوی بیمار ہو گئی' علاج کے لیے اسے سعودیہ کے ایک ہسپتال میں داخل کروایا گیا' میں بھی اس کے ساتھ ہی تھا کہ اس کا انتقال ہو گیا تو وفات کے بعد اسے ایمبولینس کے ذریعہ قبرستان لے جایا گیا' ہسپتال کے بعض ملازمین بھی میرے ساتھ تھے اور قبر میں بھی اسے ہسپتال کے انہی ملازموں ہی نے اتارا' کیونکہ میں اپنے کٹے ہوئے پاؤں کی وجہ سے عاجز و قاصر تھا' لیکن میں اس کی وجہ سے پریشان ہوں۔ کیا ان اجنبی اور غیر محرم آدمیوں نے میری بیوی کو جو قبر میں اتارا تو اس کا مجھے کوئی گناہ تو نہ ہو گا' کیا اس کا کوئی کفارہ وغیرہ تو نہیں؟

جواب غیر محرم اگر کسی عورت کو اس کی قبر میں اتاریں تو اس میں کوئی حرج نہیں' کیونکہ محرم کی شرط قبر میں اتارنے کے لیے نہیں' بلکہ سفر کے لیے ہے۔ واللہ ولی التوفیق۔

——— شیخ ابن باز ———

بوقت ضرورت مسلمانوں کو کافروں کے قبرستان میں دفن کرنا

سوال کیا مسلمانوں کو کافروں کے قبرستانوں میں دفن کرنا جائز ہے' جبکہ مسلمان اپنے قبرستان سے اس قدر دور ہوں کہ وہاں میت کو لے جانے میں ایک ہفتہ سفر کرنا پڑتا ہو اور سنت یہ ہے کہ میت کو جلد دفن کر دیا جائے؟

جواب مسلمانوں کے لیے یہ جائز نہیں کہ وہ کسی مسلمان کو کافروں کے قبرستان میں دفن کریں۔ نبی کریم ﷺ اور خلفاء راشدین رضی اللہ عنہم کے عہد مبارک سے لے کر اب تک اہل اسلام کا یہی معمول چلا آ رہا ہے کہ مسلمانوں کے قبرستان کافروں کے قبرستان سے الگ ہوتے ہیں اور کبھی بھی کسی مسلمان کو کسی مشرک کے ساتھ دفن نہیں کیا گیا۔ اس بات پر گویا تمام امت کا اجماع ہے کہ مسلمانوں کے قبرستان کافروں کے قبرستان سے الگ تھلگ ہوں۔ چنانچہ بشیر ابن خصاصیہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میں رسول اللہ ﷺ کے ساتھ چل رہا تھا کہ آپ کا مسلمانوں کے قبرستان کے پاس سے گزر ہوا تو آپ نے فرمایا:

«لَقَدْ سَبَقَ هٰؤُلَاءِ شَرًّا كَثِيرًا»

"یہ لوگ بہت زیادہ شر سے محفوظ ہو گئے ہیں۔"

اور پھر آپ کا مشرکوں کے قبرستان کے پاس سے گزر ہوا تو آپ نے فرمایا:

«لَقَدْ سَبَقَ هٰؤُلَاءِ خَيْرًا كَثِيرًا»(سنن النسائي، الجنائز، كراهية المشي بين القبور ... الخ، ح: ٢٠٥٠)

"یہ لوگ بہت زیادہ خیر سے محروم ہو گئے ہیں۔" اس حدیث سے بھی معلوم ہوا کہ مسلمانوں اور کافروں کی قبریں الگ الگ ہونی چاہئیں۔

ہر مسلمان کو چاہیئے کہ وہ کسی بھی غیر مسلم ملک کو اپنا وطن نہ بنائے اور نہ ہی کافروں کے مابین سکونت اختیار کرے۔ فتنوں سے اپنے دین کو بچانے کے لیے فوراً کسی اسلامی ملک میں منتقل ہو جائے تاکہ دین کے شعائر کو قائم کر سکے' نیکی و

تقویٰ کے کاموں میں اپنے مسلمان بھائیوں کے ساتھ تعاون کر سکے اور اس سے مسلمانوں کی آبادی میں بھی اضافہ ہو۔ ہاں البتہ اگر کوئی مسلمان کسی غیر اسلامی ملک میں اسلام کی تبلیغ و اشاعت کے لیے مقیم ہو اور اسے اس بات کی صلاحیت و قدرت بھی حاصل ہو' کافروں پر اثر انداز ہو سکتا ہو اور ان کا اثر قبول نہ کرتا ہو تو اس کے لیے کافر ملک میں سکونت اختیار کرنا جائز ہے۔ اسی طرح اگر کوئی شخص مجبور و مضطر ہو تو وہ بھی رہ سکتا ہے' لیکن ان مسلمانوں کو چاہیئے کہ باہم تعاون اور نصرت و حمایت سے اپنے لیے ایک الگ قبرستان بنائیں جس میں مسلمان مردوں کو دفن کیا جا سکے۔

——— فتویٰ کمیٹی ———

کافر کو مسلمانوں کے قبرستان میں دفن کرنا

سوال ایک مسلمان نے ایک کافر لڑکے کو اپنا متبنیٰ بنایا تھا لیکن وہ بالغ ہونے سے پہلے ہی فوت ہو گیا تو کیا اسے مسلمانوں کے قبرستان میں دفن کرنا جائز ہے؟

جواب کسی کافر کو مسلمانوں کے قبرستان میں دفن کرنا جائز نہیں خواہ وہ کسی مسلمان کا متبنیٰ ہو یا نہ ہو اور خواہ وہ بالغ ہو یا نہ ہو۔ ہاں البتہ اگر کوئی ایسی بات مل جائے جو اس کے اسلام پر دلالت کرتی ہو تو پھر اسے مسلمانوں کے قبرستان میں دفن کرنا جائز ہے۔ یاد رہے اسلام میں متبنیٰ (لے پالک) بنانا حرام ہے کیونکہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ ٱدۡعُوهُمۡ لِأٓبَآئِهِمۡ﴾ (الأحزاب ٣٣/ ٥)

"(مومنو!) ان (لے پالکوں) کو ان کے (اصلی) باپوں (کے نام) سے پکارا کرو۔"

——— فتویٰ کمیٹی ———

قبروں پر سبز شاخیں رکھنا

سوال حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا دو قبروں کے پاس سے گزر ہوا تو آپ نے فرمایا کہ ان دونوں کو عذاب ہو رہا ہے اور عذاب بھی کسی ایسے گناہ کی وجہ سے نہیں ہو رہا کہ (دنیا میں) اس سے بچنا ان کے لیے مشکل اور دشوار تھا' ان میں سے ایک پیشاب سے پرہیز نہیں کرتا تھا اور دوسرا غیبت کرتا تھا۔ پھر آپ نے ایک تر و تازہ ٹہنی لی اور اسے دو حصوں میں کاٹ کر ہر قبر پر ایک ایک حصہ گاڑ دیا تو صحابہ کرام نے عرض کیا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! آپ نے ایسا کیوں کیا ہے؟ آپ نے فرمایا:

«لَعَلَّهُ أَنْ يُخَفَّفَ عَنْهُمَا مَا لَمْ يَيْبَسَا»(صحيح البخاري، الجنائز، باب الجريدة على القبر، ح: ١٣٦١)

"ہو سکتا ہے کہ جب تک یہ خشک نہ ہوں' اللہ تعالیٰ ان سے عذاب میں تخفیف کر دے۔"

سوال یہ ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی اقتداء کرتے ہوئے کیا ہمارے لیے بھی ایسا کرنا صحیح ہے؟ کیا کھجور کی ٹہنی (چھڑی) پر قیاس کرتے ہوئے دیگر تر و تازہ اور سرسبز و شاداب چیزوں کو بھی قبر پر رکھنا جائز ہے؟ کیا یہ جائز ہے کہ قبر پر کوئی درخت لگایا دیا جائے تاکہ وہ ہمیشہ ہی سرسبز رہے اور اس سے یہ مقصد حاصل ہوتا رہے؟

جواب نبی کریم ﷺ کا ان دو قبروں پر تخفیف عذاب کی امید سے کھجور کی ٹہنی رکھنا ایک خاص واقعہ ہے جو کہ عموم کا حامل نہیں' کیونکہ یہ رسول اللہ ﷺ کا خاصہ ہے اور پھر یہ آپ کا معمول بھی نہیں تھا' اگر مختلف واقعات میں بھی ایسا ہوا ہو تو بھی دو تین بار سے زیادہ نہیں ہوا' حضرات صحابہ کرام میں سے بھی کسی نے ایسا نہیں کیا' حالانکہ وہ نبی کریم ﷺ کی اقتداء کرنے اور اپنے مسلمان بھائیوں کو نفع پہنچانے کے بے حد خواہش مند تھے ہاں البتہ اس سلسلہ میں صرف بریدہ اسلمی رضی اللہ عنہ سے یہ ضرور روایت ہے کہ انہوں نے وصیت کی تھی کہ ان کی قبر پر دو شاخوں کو گاڑ دیا جائے[1] لیکن ہمارے علم کی حد تک حضرات صحابہ کرام میں سے کسی اور نے حضرت بریدہ کی اس مسئلہ میں موافقت نہیں کی۔ وصلی اللہ علی نبینا محمد وعلی آله وصحبه وسلم۔

—————— فتویٰ کمیٹی ——————

میت کی قبر پر کھجور کی شاخ رکھنے کا حکم

سوال میت کی قبر پر کھجور کی شاخ یا کوئی اور سرسبز شاخ رکھنے کے بارے میں کیا حکم ہے؟

جواب یہ جائز نہیں ہے۔ نبی کریم ﷺ نے کچھ لوگوں کی قبروں پر دو ٹہنیاں رکھی تھیں'[2] کیونکہ آپ کو معلوم کردایا گیا تھا کہ انہیں عذاب ہو رہا ہے اور یہ نبی کریم ﷺ کا خاصہ ہے لہٰذا ہمارے لیے قبر پر کھجور یا کسی اور درخت کی شاخ رکھنا جائز نہیں ہے۔ وباللہ التوفیق۔

—————— شیخ ابن باز ——————

قبر پر کیا رکھنا جائز ہے

سوال میں نے مختلف قبروں کو دیکھا ہے کہ کسی پر تو قبر کے آغاز میں صرف ایک پتھر رکھا ہوتا ہے۔ بعض پر قبر کے شروع اور آخر میں دو پتھر رکھے ہوتے ہیں اور بعض پر قبر کے شروع' درمیان اور آخر میں تین پتھر رکھے ہوتے ہیں اور انہیں "رکیزہ یا نصیبۃ" کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ میں یہ معلوم کرنا چاہتا ہوں کہ مردوں اور عورتوں کی قبروں پر کیا رکھنا جائز ہے اور کیا جائز نہیں ہے؟

جواب میت کو دفن کرنے کے بعد یہ جائز ہے کہ قبر کے کناروں کی طرف صرف دو اینٹیں کھڑی کر دی جائیں تاکہ یہ معلوم ہو سکے کہ یہ قبر ہے' خواہ یہ قبروں کے درمیان ہی میں کیوں نہ ہو اور اس سلسلہ میں مرد' عورت یا بچے کی قبر میں کوئی فرق نہیں ہے بس دو اینٹوں سے زیادہ اور کوئی چیز نہ رکھی جائے ہاں البتہ اگر قبر کے ایک طرف کوئی پتھر وغیرہ رکھ دیا جائے تاکہ بوقت زیارت قبر معلوم ہو جائے تو اس میں بھی کوئی حرج نہیں۔

—————— شیخ ابن جبرین ——————

---

[1] امام بخاری نے اسے کتاب الجنائز باب الجریدة علی القبر کے تحت معلقا روایت کیا ہے اور ابن سعد نے الطبقات الکبری (8/7) میں موصولاً بیان کیا ہے' دیکھئے: تغلیق التعلیق 492/2۔

[2] صحیح بخاری' الجنائز' باب الجریدة علی القبر' ح: 1361۔

میت کی قبر پر کچھ لکھنا

سوال کیا یہ جائز ہے کہ میت کی قبر پر لوہے یا پتھر وغیرہ کی کوئی ایسی سلیٹ لگا دی جائے کہ جس پر قرآنی آیات بھی لکھی ہوں اور میت کا نام اور تاریخ وفات وغیرہ بھی ......؟

جواب یہ جائز نہیں کہ میت کی قبر پر لوہے' پتھر یا کسی اور چیز پر قرآنی آیات یا کچھ اور لکھ کر لگایا جائے' کیونکہ حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے:

«نَهٰی رَسُولُ اللهِ ﷺ، أَنْ يُجَصَّصَ الْقَبْرُ، وَأَنْ يُقْعَدَ عَلَيْهِ، وَأَنْ يُبْنٰى عَلَيْهِ»(صحيح مسلم، الجنائز، باب النهي عن تجصيص القبر ... الخ، ح:٩٧٠)

"رسول اللہ ﷺ نے منع فرمایا کہ قبر کو پختہ بنایا جائے یا اس پر بیٹھا جائے یا اس پر کوئی عمارت تعمیر کی جائے۔"

صحیح سند کے ساتھ ترمذی کی روایت میں یہ الفاظ بھی ہیں:

«وَأَنْ يُكْتَبَ عَلَيْهَا»(جامع الترمذي، الجنائز، باب ما جاء في كراهية تجصيص القبور والكتابة عليها، ح:١٠٥٢)

"آپ نے قبروں پر لکھنے سے بھی منع فرمایا۔"

——— شیخ ابن باز ———

قبروں پر عمارت بنانا اور کتبے لگانا

سوال میں نے بعض قبروں کو دیکھا ہے کہ انہیں سیمنٹ کے ساتھ پلستر کر کے ایک میٹر لمبا اور آدھا میٹر چوڑا کر دیا جاتا ہے اور پھر اس پر میت کا نام' تاریخ وفات اور اس طرح کی بعض عبارتیں بھی لکھ دی جاتی ہیں کہ "اے اللہ! فلاں بن فلاں پر رحم فرما" تو اس طرح کے کاموں کے بارے میں کیا حکم ہے؟

جواب قبروں پر کسی قسم کی عمارت بنانا اور کچھ لکھنا جائز نہیں ہے' کیونکہ نبی کریم ﷺ سے یہ ثابت ہے کہ آپ نے قبروں پر عمارت بنانے اور لکھنے سے منع فرمایا ہے جیسا کہ صحیح مسلم میں حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے:

«نَهٰی رَسُولُ اللهِ ﷺ، أَنْ يُجَصَّصَ الْقَبْرُ، وَأَنْ يُقْعَدَ عَلَيْهِ، وَأَنْ يُبْنٰى عَلَيْهِ»(صحيح مسلم، الجنائز، باب النهي عن تجصيص القبر ... الخ، ح:٩٧٠)

"رسول اللہ ﷺ نے قبر کو پختہ بنانے' قبر پر بیٹھنے اور عمارت بنانے سے منع فرمایا ہے۔"

امام ترمذی اور کئی دیگر محدثین نے بھی اس حدیث کو روایت کیا اور صحیح سند کے ساتھ یہ بھی بیان کیا ہے:

«وَأَنْ يُكْتَبَ عَلَيْهَا»(جامع الترمذي، الجنائز، باب ما جاء في كراهية تجصيص القبور والكتابة عليها، ح:١٠٥٢)

"آپ نے قبروں پر لکھنے سے بھی منع فرمایا ہے۔

کیونکہ یہ ایک طرح سے غلو ہے' لہٰذا اس سے منع کرنا واجب ہے۔ کتابت و تحریر وغیرہ کے غلو کے بسااوقات ایسے خطرناک نتائج بھی برآمد ہوتے ہیں جو شرعاً ممنوع ہیں لہٰذا حکم شریعت بس یہی ہے کہ قبر کی اپنی ہی مٹی اس پر ڈالی جائے اور اسے تقریباً ایک بالشت برابر اونچا کر دیا جائے تاکہ معلوم ہو سکے کہ یہ قبر ہے' قبروں کے بارے میں یہی وہ سنت ہے جس پر رسول اللہ ﷺ اور حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا عمل تھا۔ اسی طرح قبروں پر مسجدیں بنانا' غلاف اور چادریں چڑھانا اور قبے بنانا بھی جائز نہیں' کیونکہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا ہے:

«لَعَنَ اللهُ الْيَهُودَ وَالنَّصَارٰى اتَّخَذُوا قُبُورَ أَنْبِيَائِهِمْ مَّسَاجِدَ»(صحيح البخاري، الجنائز، باب ما يكره من اتخاذ المساجد على القبور، ح:١٣٣٠ وصحيح مسلم، المساجد، باب النهي عن بناء المسجد على القبور . . . الخ، ح:٥٢٩)

"اللہ تعالیٰ یہود و نصاریٰ پر لعنت فرمائے کہ انہوں نے اپنے نبیوں کی قبروں کو مسجدیں (سجدہ گاہیں) بنالیا تھا۔"

اسی طرح صحیح مسلم میں حضرت جندب بن عبداللہ بجلی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو آپ کی وفات سے پانچ دن پہلے یہ ارشاد فرماتے ہوئے سنا:

«إِنَّ اللهَ قَدِ اتَّخَذَنِي خَلِيلاً، كَمَا اتَّخَذَ اِبْرَاهِيمَ خَلِيلاً، وَلَوْ كُنْتُ مُتَّخِذًا مِّنْ أُمَّتِي خَلِيلاً لَأَتَّخَذْتُ أَبَابَكْرٍ خَلِيلاً، أَلاَ وَإِنَّ مَنْ كَانَ قَبْلَكُمْ كَانُوا يَتَّخِذُونَ قُبُورَ أَنْبِيَائِهِمْ وَصَالِحِيهِمْ مَّسَاجِدَ، أَلاَ فَلاَ تَتَّخِذُوا الْقُبُورَ مَسَاجِدَ، إِنِّي أَنْهَاكُمْ عَنْ ذٰلِكَ»(صحيح مسلم، المساجد، باب النهي عن بناء المسجد على القبور... الخ، ح:٥٣٢)

"بے شک اللہ تعالیٰ نے مجھے بھی اسی طرح اپنا خلیل بنالیا ہے جس طرح حضرت ابراہیم علیہ السلام کو خلیل بنایا تھا' اگر میں اپنی امت میں سے کسی کو اپنا خلیل بناتا تو ابوبکر کو بناتا۔ لوگو! یاد رکھو تم سے پہلے لوگ اپنے انبیاء و صلحاء کی قبروں کو سجدہ گاہیں بنا لیا کرتے تھے' مگر تم قبروں کو سجدہ گاہیں نہ بنانا' میں تمہیں اس بات سے منع کرتا ہوں۔"

——— شیخ ابن باز ———

قبروں پر عمارت بنانا

سوال حضرموت میں ایک بہت ہی قدیم قبرستان ہے اور اس کے بہت قدیمی ہونے کی دلیل یہ بھی ہے کہ اس میں کچھ قبریں بیت المقدس کے رخ بنی ہوئی ہیں۔ سوال یہ ہے کہ کیا ان قدیم قبروں کے اوپر عمارت بنانا جائز ہے؟

جواب جب تک واضح طور پر قبروں کے نشانات باقی ہوں اس وقت تک ان پر عمارت بنانا جائز نہیں اور یہ بات یقینی ہو کہ یہ قبریں ہی ہیں خواہ وہ قدیم ہی کیوں نہ ہوں۔ ان قبروں کا بیت المقدس کے رخ ہونا ان کے قدیمی ہونے کی دلیل نہیں اور نہ یہ اس بات کی دلیل ہے کہ یہ قبریں غیر مسلموں کی ہیں' کیونکہ یہ شہر مسلمانوں کا ہے لہٰذا ان قبروں کے اردگرد ایک دیوار کھینچ دو اور باقی زمین کو کاشت کاری یا عمارت وغیرہ کے لیے استعمال کر لو۔

——— شیخ ابن جبرین ———

دفن کے بعد میت کے لیے دعا و استغفار کی غرض سے قبر پر کھڑا ہونا

سوال کیا میت کو دفن کرنے اور اس پر مٹی ڈال دینے کے بعد قبر کے پاس میت کے لیے استغفار یا دعا کرنے کے لیے کھڑا ہونا جائز ہے؟

جواب ہاں میت کو دفن کرنے اور اس پر مٹی ڈال دینے کے بعد دعا و استغفار کے لیے قبر کے پاس کھڑا ہونا جائز ہی نہیں' بلکہ مستحب ہے' کیونکہ ابوداود اور حاکم نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے صحیح حدیث روایت کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ جب دفن میت سے فارغ ہوتے تو قبر کے پاس کھڑے ہو جاتے اور فرماتے:

«اِسْتَغْفِرُوا لأَخِيكُمْ وَاسْأَلُوا لَهُ بِالتَّثْبِيتِ فَإِنَّهُ الآنَ يُسْأَلُ»(سنن أبي داود، الجنائز، باب الاستغفار عند القبر ... الخ، ح: ٣٢٢١ والمستدرك للحاكم: ١/ ٣٧٠)

"اپنے بھائی کے لیے مغفرت کی دعا کرو اور اس کی ثابت قدمی کے لیے اللہ تعالیٰ سے سوال کرو' کیونکہ اب اس سے سوال کیا جائے گا۔"

فتویٰ کمیٹی

دفن کے بعد میت کے لیے دعا کی کیفیت

سوال میت کو دفن کرنے اور اس پر مٹی ڈال دینے کے بعد میت کے لیے کس طرح دعا کی جائے یعنی بیٹھ کر دعا کرنا افضل ہے یا کھڑے ہو کر؟

جواب جو شخص میت کو دفن کرنے اور اس پر مٹی ڈالنے کے بعد دعا کرنا چاہے تو اس کے لیے سنت یہ ہے کہ وہ کھڑا ہو کر دعا کرے' اس کے لیے دلیل وہ حدیث ہے جسے امام ابوداود نے اپنی سند کے ساتھ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ نبی کریم ﷺ جب دفن میت سے فارغ ہوتے تو قبر کے پاس کھڑے ہو جاتے اور فرماتے:

«اِسْتَغْفِرُوا لأَخِيكُمْ وَاسْأَلُوا لَهُ بِالتَّثْبِيتِ فَإِنَّهُ الآنَ يُسْأَلُ»(سنن أبي داود، الجنائز، باب الاستغفار عند القبر ... الخ، ح: ٣٢٢١ والمستدرك للحاكم: ١/ ٣٧٠)

"اپنے بھائی کے لیے مغفرت کی دعا کرو اور اس کی ثابت قدمی کے لیے اللہ تعالیٰ سے سوال کرو' کیونکہ اب اس سے سوال کیا جائے گا۔"

امام ابوداود اور منذری نے اس حدیث پر سکوت فرمایا۔ امام حاکم نے بھی اسے روایت کیا اور صحیح قرار دیا ہے۔[1] علاوہ ازیں امام بزار نے بھی اسے روایت کیا اور فرمایا ہے کہ یہ حدیث نبی کریم ﷺ سے صرف اسی طریق سے مروی ہے۔ وباللہ التوفیق۔ وصلی اللہ علی نبینا محمد وآلہ وصحبہ وسلم۔

فتویٰ کمیٹی

[1] مستدرک حاکم: 270/1 والمنذری فی الترغیب: 345/4 والبزار فی مسندہ: 91/2' حدیث: 445۔

میت کے لیے مسنون دعائیں

سوال میت کی دعا کے لیے کچھ ایام مثلاً پہلا اور ساتواں اور چالیسواں وغیرہ مقرر کرنے کے بارے میں کیا حکم ہے؟ میت کے لیے کون سی دعائیں مانگنا مسنون ہے؟ میت کو قبر میں رکھتے وقت درود شریف پڑھنے کے بارے میں کیا حکم ہے؟

جواب اولاً : میت کی دعا کے لیے پہلا' ساتواں یا چالیسواں وغیرہ دن مقرر کرنے کے بارے میں کتاب و سنت یا حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم یا ائمہ سلف رحمہم اللہ کے عمل سے کوئی دلیل ثابت نہیں ہے' بلکہ یہ ایک ایسی بدعت ہے جسے اس دور میں ایجاد کر لیا گیا اور صحیح حدیث سے ثابت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

«مَنْ عَمِلَ عَمَلاً لَيْسَ عَلَيْهِ أَمْرُنَا فَهُوَ رَدٌّ»(صحيح مسلم، الأقضية، باب نقض الأحكام الباطلة ... الخ، ح:١٧١٨)

”جس نے کوئی ایسا عمل کیا جس کے بارے میں ہمارا امر نہیں ہے تو وہ (عمل) مردود ہے۔“

ایک اور روایت میں الفاظ یہ ہیں:

«مَنْ أَحْدَثَ فِي أَمْرِنَا هٰذَا مَا لَيْسَ مِنْهُ فَهُوَ رَدٌّ»(صحيح البخاري، الصلح، باب إذا اصطلحوا على صلح جور ... الخ، ح:٢٦٩٧)

”جس نے ہمارے اس دین (اسلام) میں کوئی نئی بات ایجاد کی جو اس میں نہ ہو تو وہ مردود ہے۔“

ثانیاً : میت کو قبر میں رکھتے وقت وہ الفاظ پڑھے جائیں جو حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ سے مروی ہیں کہ نبی کریم ﷺ جب میت کو قبر میں رکھتے تو یہ پڑھتے :

«بِسْمِ اللهِ وَعَلٰى مِلَّةِ رَسُولِ اللهِ ﷺ» (سنن ابن ماجه، الجنائز، باب ما جاء في إدخال الميت القبر، ح:١٥٥٠)

”اللہ کے نام سے اور رسول اللہ کی ملت پر (اس میت کو قبر میں اتارا جاتا ہے۔)“

ایک اور روایت میں یہ الفاظ بھی ہیں :

«بِسْمِ اللهِ وَعَلٰى سُنَّةِ رَسُولِ اللهِ ﷺ» (المصدر المذكور وسنن أبي داود، الجنائز، باب في الدعاء للميت إذا وضع في قبره، ح:٣٢١٣)

”اللہ کے نام سے اور رسول اللہ ﷺ کے طریقے پر (اس میت کو قبر میں اتارا جاتا ہے)“

ثالثاً : یہ بھی مستحب ہے کہ جنازہ کے ساتھ میت کو الوداع کرنے کے لیے آنے والے دفن کے بعد قبر کے پاس کھڑے ہوں اور اس کی مغفرت و ثبات کے لیے دعا کریں' کیونکہ نبی کریم ﷺ نے اس کا حکم دیا ہے [1] اور میت کو قبر میں داخل کرتے وقت درود شریف پڑھنے کی ہمیں کوئی دلیل معلوم نہیں ہے۔

—— فتویٰ کمیٹی ——

[1] سنن ابی داود' الجنائز' باب الاستغفار عندالقبر .....' حدیث : 3221۔

مسائل تعزیت کے بارے میں نصیحت اور یاد دہانی

عبدالعزیز بن عبداللہ بن باز کی طرف سے اپنے ان تمام مسلمان بھائیوں کے نام' جن کی نظر سے میری یہ تحریر گزرے۔ اللہ تعالیٰ مجھے اور میرے ان تمام بھائیوں کو نیک اعمال کے کرنے اور بدعات و منکرات سے بچنے کی توفیق عطا فرمائے! آمین

السلام علیکم ورحمة الله وبرکاته ..... امابعد:

اس تحریر کا سبب ان مسائل تعزیت کے بارے میں نصیحت اور یاددہانی ہے جو مخالف شریعت ہیں اور جن میں بعض لوگ مبتلا ہو چکے ہیں۔ لہٰذا یہ مناسب نہیں کہ ان کے بارے میں خاموشی اختیار کی جائے بلکہ ضروری ہے کہ ان کے بارے میں تنبیہ اور ان سے بچنے کی تلقین کی جائے۔ اللہ تعالیٰ کی توفیق کے ساتھ یہ عرض ہے کہ ہر مسلمان کو اس بات کا پختہ یقین ہو کہ اسے جو تکلیف بھی پہنچے وہ اللہ تعالیٰ کی قضاء و قدر کی وجہ سے ہے' لہٰذا اس پر صبر کرنا اور اللہ تعالیٰ سے ثواب کی امید رکھنا چاہیے۔ مصیبت زدہ کو چاہیے کہ وہ اللہ تعالیٰ ہی سے مدد مانگے' اسی سے اسے برداشت کرنے کا حوصلہ مانگے اور صبرونماز کے ساتھ مدد حاصل کرنے کے لیے اس کے حکم کی اطاعت بجالائے تاکہ اس اجروثواب کا مستحق بن سکے جس کا اللہ تعالیٰ نے صبر کرنے والوں سے وعدہ کرتے ہوئے فرمایا ہے:

﴿ وَبَشِّرِ ٱلصَّٰبِرِينَ ﴿١٥٥﴾ ٱلَّذِينَ إِذَآ أَصَٰبَتْهُم مُّصِيبَةٌ قَالُوٓا۟ إِنَّا لِلَّهِ وَإِنَّآ إِلَيْهِ رَٰجِعُونَ ﴿١٥٦﴾ أُو۟لَٰٓئِكَ عَلَيْهِمْ صَلَوَٰتٌ مِّن رَّبِّهِمْ وَرَحْمَةٌ ۖ وَأُو۟لَٰٓئِكَ هُمُ ٱلْمُهْتَدُونَ ﴿١٥٧﴾﴾ (البقرة٢/ ١٥٥-١٥٧)

”اور (اے پیغمبر)! صبر کرنے والوں کو (اللہ کی خوشنودی کی) بشارت سنا دو' ان لوگوں پر جب کوئی مصیبت واقع ہوتی ہے تو کہتے ہیں کہ ہم اللہ ہی کی ملکیت ہیں اور اسی کی طرف لوٹ کر جانے والے ہیں۔ یہی لوگ ہیں جن پر ان کے پروردگار کی بخشش اور رحمت ہے اور یہی سیدھے راستے پر ہیں۔“

حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ ارشاد فرماتے ہوئے سنا کہ جو شخص مصیبت کے وقت یہ کہے:

«إِنَّا للهِ وَإِنَّا إِلَيْهِ رَاجِعُونَ، اَللَّهُمَّ! أْجُرْنِي فِي مُصِيبَتِي وَأَخْلِفْ لِي خَيْرًا مِّنْهَا»(صحيح مسلم، الجنائز، باب ما يقال عند المصيبة؟، ح:٩١٨)

”ہم اللہ ہی کی ملکیت ہیں اور اسی کی طرف لوٹ کر جانے والے ہیں۔ اے اللہ! میری اس مصیبت کا اجر عطا فرما اور مجھے اس سے بہتر بدلہ عطا فرما۔“

تو اللہ تعالیٰ اس کی مصیبت پر اسے اجروثواب بھی عطا فرماتا ہے اور اس سے چھن جانے والی نعمت سے بہتر چیز بھی عطا فرماتا ہے۔ مصیبت زدہ کو حد درجہ احتیاط کرنی چاہیے کہ زبان پر کوئی ایسا لفظ نہ آنے پائے جس سے اس کا اجر ضائع ہو جائے اور اللہ تعالیٰ ناراض ہو جائے۔ ایسے الفاظ زبان پر ہرگز ہرگز نہیں آنے چاہئیں جن سے معلوم ہو کہ اللہ تعالیٰ نے اس پر کوئی ظلم و غضب ڈھایا ہے' کیونکہ اللہ تعالیٰ کی ذات گرامی تو سراپا عدل ہے' وہ اپنے بندوں پر ہرگز ظلم نہیں فرماتا' جو لے لیتا ہے وہ بھی اسی کا ہے اور جو عطا فرما دیتا ہے وہ بھی اسی کا عطیہ ہے۔ ہر چیز کا اس کے ہاں ایک وقت مقرر ہے اور اس

میں بھی حکمت بالغہ ہے اور وہ اپنے ارادے کے مطابق ہر کام کر گزرنے والا ہے۔ جو شخص ان باتوں کی مخالفت کرے وہ گویا اللہ تعالیٰ کی اس قضاء و قدر پر اعتراض کرتا ہے جو عین مصلحت و حکمت اور عدل و صلاح کی بنیاد ہے۔

مصیبت زدہ کو چاہیے کہ وہ اپنے لیے بددعا بھی نہ کرے' کیونکہ جب حضرت ابو سلمہ رضی اللہ عنہ کا انتقال ہوا تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا۔

«لَا تَدْعُو عَلٰى أَنْفُسِكُمْ إِلاَّ بِخَيْرٍ، فَإِنَّ الْمَلاَئِكَةَ يُؤَمِّنُونَ عَلٰى مَا تَقُولُونَ» (صحيح مسلم، الجنائز، باب في إغماض الميت والدعاء له إذا حضر، ح: ٩٢٠)

"اپنے لیے بھلائی ہی کی دعا کرو' کیونکہ تم جو کچھ بھی کہتے ہو فرشتے اس پر آمین کہتے ہیں۔"

ہر حال میں اللہ تعالیٰ سے ثواب کی امید رکھتے ہوئے اللہ تعالیٰ کی حمد و ثناء کرتے رہنا چاہیے۔ جس شخص کو کسی عزیز کی وفات کی وجہ سے صدمہ پہنچا ہو تو اس سے تعزیت کرنا مستحب ہے۔ چنانچہ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

«مَنْ عَزَّى مُصَابًا فَلَهُ مِثْلُ أَجْرِهِ» (جامع الترمذي، الجنائز، باب ما جاء في أجر من عزى مصابا، ١٠٧٣ وسنن ابن ماجه، ح: ١٦٠٢)

"جس نے کسی مصیبت زدہ کے ساتھ تعزیت کی تو اسے بھی اسی کے برابر ثواب ملے گا۔"

اس سے مقصود یہ ہے کہ مصیبت زدگان کو تسلی دی جائے' ان سے خیرخواہی اور ہمدردی کا اظہار کیا جائے۔

میت پر رونے میں بھی کوئی حرج نہیں' کیونکہ جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے لخت جگر حضرت ابراہیم رضی اللہ عنہ اور آپ کی صاحبزادیوں کا انتقال ہوا تو آپ بھی اشکبار ہو گئے تھے۔[1] ہاں البتہ نوحہ کرنا' رخسار پر طمانچے مارنا' گریبان پھاڑنا' چہرے کو نوچنا' بالوں کو اکھاڑنا' ہائے وائے پکارنا اور اس طرح کے دیگر کام کرنا حرام ہے' کیونکہ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

«لَيْسَ مِنَّا مَنْ ضَرَبَ الْخُدُودَ، وَشَقَّ الْجُيُوبَ، وَدَعَا بِدَعْوَى الْجَاهِلِيَّةِ»(صحيح البخاري، الجنائز، باب ليس منا من ضرب الخدود، ح: ١٢٩٧)

"وہ ہم میں سے نہیں ہے جو رخسار پیٹے' گریبان پھاڑے اور زمانۂ جاہلیت کی طرح بین کرے۔"

حضرت ابو موسیٰ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے:

«إِنَّ رَسُولَ اللهِ ﷺ بَرِيءَ مِنَ الصَّالِقَةِ وَالْحَالِقَةِ وَالشَّاقَّةِ»(صحيح البخاري، الجنائز، باب ما ينهى من الحلق عند المصيبة، ح: ١٢٩٦)

"رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مصیبت کے وقت چیخنے چلانے والی' سر کے بال مونڈنے والی اور گریبان پھاڑنے والی عورت سے بری ہیں۔"

کیونکہ ان میں اور ان سے مشابہہ اس طرح کے دیگر کاموں میں جزع فزع' ناراضی اور عدم تسلیم و رضا کا اظہار ہے!

---

[1] صحیح بخاری' الجنائز' باب قول النبی صلی اللہ علیہ وسلم انابک لمحزونون' حدیث: 1303 و صحیح مسلم' الفضائل' باب رحمتہ صلی اللہ علیہ وسلم الصبیان والعیال' حدیث: 2315۔

اَلصَّالِقَة : وہ عورت جو مصیبت کے وقت چیخ چلاتی ہے' اَلْحَالِقَة : وہ عورت جو مصیبت کے وقت اپنے بال مونڈتی ہے اور اَلشَّاقَّة کہتے ہیں اس عورت کو جو مصیبت کے وقت اپنے کپڑے پھاڑتی ہے۔

یہ مستحب ہے کہ کھانا تیار کر کے میت والوں کے گھر بھیجا جائے تاکہ ان کی اعانت اور دلجوئی ہو سکے' کیونکہ وہ اپنے عزیز کی وفات کے صدمے اور تعزیت کے لیے آنے والے لوگوں سے ملنے کی وجہ سے مشغول ہوتے ہیں اور کھانا وغیرہ تیار نہیں کر سکتے۔ امام احمد' ابوداود' ترمذی اور ابن ماجہ نے صحیح سند کے ساتھ عبداللہ بن جعفر بن ابی طالب رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ جب حضرت جعفر رضی اللہ عنہ کی وفات کی خبر آئی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

«اِصْنَعُوا لآلِ جَعْفَرٍ طَعَامًا فَإِنَّهُ قَدْ أَتَاهُمْ أَمْرٌ يَشْغَلُهُمْ»(سنن أبي داود، الجنائز، باب صنعة الطعام لأهل الميت، ح:٣١٣٢)

”جعفر کے گھر والوں کے لیے کھانا تیار کرو بلاشبہ انہیں ایک ایسی مصیبت درپیش ہے جس نے انہیں (اور کاموں سے) مشغول کر دیا ہے۔“

عبداللہ بن ابی بکر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے:

«فَمَا زَالَتْ سُنَّةً، حَتَّى كَانَ حَدِيثًا فَتُرِكَ» (سنن ابن ماجه، الجنائز، باب ما جاء في الطعام يبعث... الخ، ح:١٦١١)

”یہ سنت (ہم میں) ہمیشہ رہی حتیٰ کہ اسے معمولی بات سمجھتے ہوئے ترک کر دیا گیا۔“

گھر والوں کا لوگوں کے لیے کھانا تیار کرنا خواہ وہ وارثوں کے مال میں سے ہو یا میت کے ثلث مال سے یا کسی اور شخص کی طرف سے تو یہ جائز نہیں' کیونکہ یہ خلاف سنت بھی ہے اور عمل جاہلیت بھی اور پھر اس سے ان کی مصیبت و مشغولیت میں اضافہ بھی ہوتا ہے۔ حضرت جریر بن عبداللہ بجلی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے انہوں نے فرمایا:

«كُنَّا نَعُدُّ الاِجْتِمَاعَ إِلَى أَهْلِ الْمَيِّتِ وَصَنِيعَةَ الطَّعَامِ بَعْدَ دَفْنِهِ مِنَ النِّيَاحَةِ»(سنن ابن ماجة، الجنائز، باب ما جاء في النهي عن الاجتماع ... الخ، ح:١٦١٢ ومسند أحمد:٢/ ٢٠٤ واللفظ له)

”ہم میت کی تدفین کے بعد اہل میت کے پاس اجتماع اور ان کے کھانا تیار کرنے کو نوحہ شمار کرتے تھے۔“

باقی رہا سوگ تو کسی بھی میت پر تین دن سے زیادہ سوگ منانا حرام ہے ہاں البتہ بیوی کے لیے لازم ہے کہ وہ عدت کی ساری مدت سوگ میں گزارے' اس لیے کہ نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کا ارشاد گرامی ہے:

«لاَ يَحِلُّ لامْرَأَةٍ تُؤْمِنُ بِاللهِ وَالْيَوْمِ الآخِرِ أَنْ تُحِدَّ عَلَى مَيِّتٍ فَوْقَ ثَلاَثِ لَيَالٍ إِلاَّ عَلَى زَوْجٍ أَرْبَعَةَ أَشْهُرٍ وَعَشْرًا»(صحيح البخاري، الطلاق، باب تحد المتوفى عنها أربعة اشهر وعشرا، ح:٥٣٣٤ وصحيح مسلم، الطلاق، باب وجوب الإحداد في عدة الوفاة... الخ، ح:١٤٨٦)

”کسی بھی عورت کے لیے جو اللہ تعالیٰ اور یوم آخرت پر ایمان رکھتی ہو یہ حلال نہیں کہ وہ کسی میت پر تین راتوں سے زیادہ سوگ منائے ہاں البتہ بیوی اپنے خاوند کی وفات پر چار ماہ دس دن تک سوگ منائے۔“

عورتوں کا ایک مکمل سال سوگ کا اظہار کرنا تو یہ اسلامی شریعت کے خلاف ہے اور زمانۂ جاہلیت کی وہ عادت ہے جسے اسلام نے باطل قرار دیا ہے اور اس سے بچنے کی تلقین کی ہے لہٰذا ضروری ہے کہ اس رسم کا انکار کر دیا جائے اور لوگوں کو

بھی اس کے ترک کر دینے کی وصیت کی جائے۔ امام ابن قیم رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ ”یہ بات بھی شریعت کے محاسن اور حکمت و مصلحت میں سے ہے کہ اہل جاہلیت موت کی مصیبت کی وجہ سے سوگ منانے میں حد درجہ مبالغہ سے کام لیتے تھے عورت ایک تنگ و تاریک اور وحشت ناک کوٹھڑی میں ایک سال اس طرح گزارتی کہ نہ خوشبو استعمال کرتی' نہ تیل لگاتی اور نہ ہی غسل کرتی اور اس طرح کے کئی اور کام بھی کرتی جس سے اللہ تعالیٰ اور اس کی تقدیر سے ناراضی کا اظہار ہوتا لیکن اللہ تعالیٰ نے اپنی حکمت بالغہ کے ساتھ ہمارے لیے جاہلیت کے اس طریقے کو باطل قرار دے دیا اور اس کی بجائے ہمیں صبر اور اپنی حمد بیان کرنے کی تلقین فرمائی ہے۔“

موت کی مصیبت ہی چونکہ ایسی اندوہناک ہے کہ اس سے مصیبت زدہ کو غم و حزن کا لاحق ہونا ایک طبعی امر ہے لہٰذا اس حکیم و خبیر ہستی نے ہمیں تھوڑے سے سوگ کی اجازت دی ہے یعنی صرف تین دن تک اور اس مدت میں آدمی اپنے غم و حزن کا اظہار کر کے راحت حاصل کر سکتا ہے۔ اگر اس سے زیادہ مدت تک سوگ کا اظہار کیا جائے تو پھر اس میں خرابی کا پہلو راجح ہو گا لہٰذا اس سے شریعت نے منع کر دیا ہے ہاں البتہ تین دن تک مردوں پر سوگ کی اجازت ہے لیکن بیوی اپنے شوہر کی وفات کی وجہ سے عدت کا سارا عرصہ سوگ میں گزار سکتی ہے جبکہ حاملہ عورت کی عدت وضع حمل ہے اور وضع حمل کے ساتھ ہی اس کا سوگ بھی ختم ہو جائے گا۔“

عدت کی تکمیل کے بعد محفل منعقد کرنا بھی بدعت ہے جبکہ وہ نوحہ اور بین وغیرہ حرام امور پر مشتمل ہو' کیونکہ رسول اللہ ﷺ صحابہ کرام اور سلف صالح میں سے کسی سے بھی یہ ثابت نہیں کہ میت کی وفات کے وقت یا ساتویں دن یا چالیسویں دن یا سال بعد برسی کی محفل کا اہتمام کیا جائے بلکہ یہ تو بدعت اور ایک قبیح عادت ہے لہٰذا ان جیسی بدعات سے دور رہنا' ان کا انکار کرنا' ان سے توبہ کرنا اور ان سے اجتناب کرنا ضروری ہے' کیونکہ اس میں مشرکوں کے ساتھ مشابہت ہے اور صحیح حدیث سے ثابت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا:

«بُعِثْتُ بَيْنَ يَدَيِ السَّاعَةِ بِالسَّيْفِ حَتّٰى يُعْبَدَ اللّٰهُ وَحْدَهُ لاَ شَرِيكَ لَهُ، وَجُعِلَ رِزْقِي تَحْتَ ظِلِّ رُمْحِي، وَجُعِلَ الذِّلَّةُ وَالصِّغَارُ عَلٰى مَنْ خَالَفَ أَمْرِي، وَمَنْ تَشَبَّهَ بِقَوْمٍ فَهُوَ مِنْهُمْ»(مسند أحمد: ٢/ ٥٠)

”مجھے قیامت سے پہلے تلوار کے ساتھ بھیجا گیا ہے یہاں تک کہ اللہ وحدہ لاشریک لہ کی عبادت کی جا سکے' میرا رزق میرے نیزہ کے سایہ تلے رکھ دیا گیا ہے' ذلت و رسوائی اس کا مقدر ہے جو میرے حکم کی مخالفت کرے اور جو شخص کسی قوم کی مشابہت اختیار کرتا ہے' وہ اسی میں سے ہے۔“

نبی ﷺ کا یہ بھی ارشاد گرامی ہے:

«مَنْ عَمِلَ عَمَلاً لَيْسَ عَلَيْهِ أَمْرُنَا فَهُوَ رَدٌّ»(صحيح مسلم، الأقضية، باب نقض الأحكام الباطلة ... الخ، ح:١٧١٨)

”جس شخص نے کوئی ایسا عمل کیا جس پر ہمارا امر نہیں ہے تو وہ (عمل) مردود ہے۔“

علاوہ ازیں اور بھی بہت سی احادیث مبارکہ ہیں جن میں مشرکوں کے ساتھ مشابہت اختیار کرنے اور دین میں بدعت پیدا کرنے کی ممانعت ہے۔ واللہ اعلم۔

تعزیت کا حکم' کیفیت' مخصوص وقت اور بچے اور بڑھیا کی تعزیت

سوال کیا تین دن کو اہل میت کی تعزیت کے لیے مخصوص کرنا بدعت ہے؟ کیا وفات کے بعد بچے' بڑھیا اور اس دائمی مریض کی بھی تعزیت کی جائے جس کے صحت یاب ہونے کی کوئی امید نہ ہو؟

جواب تعزیت کرنا سنت ہے' کیونکہ اس میں مصیبت زدہ کے لیے دلجوئی بھی ہے اور دعائے خیر بھی اور اس اعتبار سے کوئی فرق نہیں کہ مرنے والا چھوٹا ہو یا بڑا' تعزیت کے لیے شرعاً کوئی مخصوص الفاظ بھی مقرر نہیں ہیں بلکہ مسلمان اپنے بھائی سے جس طرح چاہے مناسب الفاظ میں تعزیت کر سکتا ہے مثلاً یہ کہہ سکتا ہے کہ "اللہ تعالیٰ آپ کو صبر جمیل کی توفیق بخشے' آپ کی اس مصیبت کا آپ کو اچھا بدلہ عطا فرمائے' مرحوم کی اللہ تعالیٰ مغفرت فرمائے بشرطیکہ وہ مسلمان ہو اور اگر میت کافر ہو تو اس کے لیے دعا نہ کی جائے ہاں البتہ اس کے مسلمان رشتہ داروں سے تعزیت کے مذکورہ الفاظ کہے جا سکتے ہیں۔

تعزیت کرنے کے لیے کوئی وقت یا ایام مخصوص نہیں ہیں۔ میت کی وفات کے وقت' جنازہ سے پہلے' جنازہ کے بعد' دفن سے پہلے اور دفن کے بعد ہر وقت تعزیت کی جا سکتی ہے۔ افضل یہ ہے کہ شدت مصیبت کے وقت جلد تعزیت کی جائے۔ وفات کے تین دن بعد تعزیت کرنا بھی جائز ہے' کیونکہ وقت کے تعین کی کوئی دلیل نہیں ہے۔

———— شیخ ابن باز ————

تعزیت کے لیے سفر کرنا

سوال جو شخص کسی قریبی رشتہ دار یا دوست کی تعزیت کے لیے سفر کر کے جاتا ہے اس کے بارے میں کیا حکم ہے؟ نیز کیا دفن کرنے سے پہلے بھی تعزیت کرنا جائز ہے؟

جواب ہمارے علم میں کسی قریبی رشتہ دار یا دوست کی وفات کی وجہ سے تعزیت کے لیے سفر کرنے میں کوئی حرج نہیں کیونکہ اس میں ہمدردی' غم گساری اور تکلیف صدمہ کی تخفیف ہے۔ تعزیت دفن سے پہلے بھی کی جا سکتی ہے اور بعد میں بھی اس میں کوئی حرج نہیں لیکن مصیبت کے بعد جس قدر قریبی وقت میں تعزیت ہو گی اسی قدر مصیبت کی تخفیف کا ذریعہ ثابت ہو گی۔ وباللہ التوفیق۔

———— شیخ ابن باز ————

تعزیت قبول کرنے کے لیے ایک وقت معین کا مخصوص کرنا

سوال بعض علاقوں میں یہ رواج ہے کہ جب کوئی شخص فوت ہو جاتا ہے تو اہل میت تعزیت وصول کرنے کے لیے نماز مغرب کے بعد تین دن تک بیٹھتے ہیں۔ کیا یہ (اس طرح بیٹھنا) جائز ہے یا بدعت ہے؟

جواب موت کی وجہ سے مصیبت زدہ سے تعزیت کرنا شرعاً جائز ہے' اس میں کوئی اشکال نہیں لیکن تعزیت قبول کرنے

کے لیے وقت معین اور دن مخصوص کرنا بدعت ہے اور رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے:

«مَنْ عَمِلَ عَمَلاً لَيْسَ عَلَيْهِ أَمْرُنَا فَهُوَ رَدٌّ»(صحيح مسلم، الأقضية، باب نقض الأحكام الباطلة ... الخ، ح:١٧١٨)

"جس نے کوئی ایسا عمل کیا جس پر ہمارا امر نہیں ہے تو وہ (عمل) مردود ہے۔" وباللہ التوفیق۔

فتویٰ کمیٹی

تعزیت کے لیے ایک ہفتہ یا اس سے بھی زیادہ عرصہ بیٹھنا

سوال ہمارے شہر کے لوگوں کی یہ عادت ہے کہ کسی شخص کی وفات کے وقت تعزیت کے لیے ایک ہفتہ یا اس سے بھی زیادہ عرصہ بیٹھتے ہیں اور دعوتوں کے لیے جانور ذبح کرنے اور دیگر لوازمات پر بہت مال خرچ کرتے ہیں۔ تعزیت کرنے والے بھی وفدوں کی صورت میں' دور دراز کے سفر طے کر کے آتے ہیں اور جو نہ آسکے اس کے متعلق (بیہودہ) باتیں کرتے اور اسے بخیل اور تارک واجب قرار دیتے ہیں؟

جواب تعزیت کرنا تو جائز ہے' کیونکہ اس میں مصیبت پر صبر کے بارے میں تعاون ہے لیکن تعزیت کے لیے مذکورہ طریقے سے بیٹھنا اور اسے ایک عادت کا روپ دے دینا' نبی کریم ﷺ اور صحابہ کرام کے طرز عمل سے ثابت نہیں ہے لوگوں نے تعزیت کو جو یہ شکل و صورت دے دی ہے اور اس کے لیے بے پناہ مال و دولت کو خرچ کرنا شروع کر دیا ہے حالانکہ ترکہ تو یتیموں کا مال ہے اور اسے خرچ کرنا ان کی مصلحتوں کے خلاف ہے اور پھر تعجب یہ ہے کہ جو لوگ ان محفلوں میں شریک نہ ہوں انہیں یہ اس طرح ملامت کرتے ہیں گویا انہوں نے کوئی شرعی فریضہ ترک کر دیا ہو۔

بلاشک و شبہ تعزیت کی یہ صورت ان بدعات میں سے ہے جن کی رسول اللہ ﷺ نے مذمت فرمائی ہے۔ یہ بدعت آپ کے اس ارشاد کے عموم میں داخل ہے:

«مَنْ أَحْدَثَ فِي أَمْرِنَا هٰذَا مَا لَيْسَ فِيهِ فَهُوَ رَدٌّ»(صحيح البخاري، الصلح، باب إذا اصطلحوا على صلح جور ... الخ، ح:٢٦٩٧)

"جو شخص ہمارے اس امر (دین) میں کوئی ایسی نئی بات پیدا کرے جو اس میں سے نہ ہو تو وہ مردود ہے۔"

نیز آپ نے یہ بھی فرمایا ہے:

«عَلَيْكُمْ بِسُنَّتِي وَسُنَّةِ الْخُلَفَاءِ الرَّاشِدِينَ الْمَهْدِيِّينَ تَمَسَّكُوا بِهَا، عَضُّوا عَلَيْهَا بِالنَّوَاجِذِ، وَإِيَّاكُمْ وَمُحْدَثَاتِ الأُمُورِ، فَإِنَّ كُلَّ مُحْدَثَةٍ بِدْعَةٌ، وَكُلَّ بِدْعَةٍ ضَلَالَةٌ»(سنن أبي داود، السنة، باب في لزوم السنة، ح:٤٦٠٧)

"میری اور میرے بعد کے ہدایت یافتہ خلفاء راشدین کی سنت کو لازم پکڑو اور مضبوطی سے تھام لو اور نئی نئی باتوں کے پیدا کرنے سے اجتناب کرو کیونکہ (دین میں) ہر نئی بات بدعت ہے اور ہر بدعت گمراہی ہے۔"

اس حدیث میں آپ نے اپنی اور اپنے بعد کے خلفاء راشدین کی سنت پر عمل کرنے کا حکم دیا ہے اور ان کی سنت سے تو یہ ثابت ہے کہ وہ ایسا کوئی کام نہیں کرتے تھے۔ اسی طرح پھر یہ عمل بدعت قرار پاتا ہے اور بدعت سے آپ نے منع کیا اور فرمایا کہ یہ ضلالت ہے لہٰذا مسلمانوں کو چاہیئے کہ وہ ان بری عادتوں کے خاتمے کے لیے ایک دوسرے سے تعاون کریں تاکہ ان بدعات کو بیخ و بن سے اکھاڑ دیا جائے' سنت کا اتباع کیا جائے' مال اور وقت کو ضائع ہونے سے بچایا جائے' زیادہ جانور ذبح کرنے' تعزیت کے لیے آنے والوں کی کثرت اور ایسی محفلوں کی طوالت پر فخر سے بچا جاسکے۔ مسلمانوں کو چاہیئے کہ بس اسی پر اکتفاء کریں جس پر حضرات صحابہ کرام اور سلف صالح رحمۃ اللہ علیہم اکتفاء فرمایا کرتے تھے اور وہ یہ کہ میت کے گھر والوں سے تعزیت کی جائے' انہیں تسلی دی جائے' میت کی طرف سے صدقہ کیا جائے اور اس کی مغفرت و رحمت کیلئے دعا کی جائے۔

——— فتویٰ کمیٹی ———

میت کے گھر والوں کے ساتھ لباس اور مال کی صورت میں احسان

سوال نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمان: «اِصْنَعُوا لآلِ جَعْفَرٍ طَعَامًا»
"آل جعفر کے لیے کھانا بناؤ" پر عمل کرنے کے لیے کیا میت کے گھر والوں کے ساتھ کھانے کے بجائے لباس اور مال وغیرہ کی صورت میں احسان جائز ہے یا نہیں؟

جواب میت کے گھر والوں کو لباس یا مال دینا بھی کھانے کے قائم مقام ہو سکتا ہے' کیونکہ حدیث کے آخر میں الفاظ یہ ہیں:

«قَدْ أَتَاهُمْ أَمْرٌ يَّشْغَلُهُمْ»(سنن أبي داود، الجنائز، باب صنعة الطعام لأهل الميت، ح:٣١٣٢)

"ان کو ایسی مصیبت درپیش ہے جس نے انہیں (اور کاموں سے) مشغول کر رکھا ہے۔"

یہ ارشاد اس بارے میں تو واضح ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اہل بیت کے لیے کھانا بنانے کا حکم دیا ہے' کیونکہ اس مصیبت میں مشغولیت کی وجہ سے وہ اپنے لیے کھانا تیار نہیں کر سکتے (لہٰذا تم ان کے لیے کھانا تیار کرو)۔ ہاں اہل میت اگر لباس اور مال کے ضرورت مند ہوں تو یہ تعاون بھی فی نفسہٖ بہتر ہے' اہل میت یا دیگر لوگ ضرورت مند ہوں تو شریعت نے ان کی ضرورت کو پورا کرنے کی ترغیب دی ہے لہٰذا جو شخص کسی کے غم کو دور کرنے اور مشکل کو ختم کرنے کے لیے اس طرح کا کوئی تعاون کرتا ہے تو یہ نیکی کا کام ہے۔

——— فتویٰ کمیٹی ———

زیارت قبور کے احکام

مسلمانوں کی قبروں کی زیارت اور ان کے لیے دعا کرنا سنت ہے

سوال میں ایک ایسے محلے میں رہتا ہوں جس میں قبرستان بھی ہے اور مجھے ہر روز اس راستہ سے ایک بار بلکہ کئی بار گزرنا پڑتا ہے تو اس سلسلہ میں مجھ پر کیا واجب ہے؟ کیا میں جب بھی اس راستہ سے گزروں مردوں کو سلام کروں یا کیا کروں؟ براہ کرم میری رہنمائی فرمائیں' اللہ تعالیٰ آپ کو برکت عطا فرمائیں۔

جواب قبروں کی شرعی زیارت مسنون ہے کیونکہ اس سے آخرت اور موت یاد آتی ہے اور پھر اس سے آدمی مسلمان

مردوں کے لیے مغفرت' رحمت اور جہنم سے عافیت کی دعا بھی کر سکتا ہے۔ نبی کریم ﷺ نے فرمایا ہے:

«زُورُوا الْقُبُورَ فَإِنَّهَا تُذَكِّرُكُمُ الآخِرَةَ»(صحيح مسلم، الجنائز، باب استئذان النبي ﷺ ربه عزوجل ... الخ، ح:٩٧٦ وسنن ابن ماجه، الجنائز، باب ما جاء في زيارة القبور، ح:١٥٦٩ واللفظ له)

"قبروں کی زیارت کیا کرو' کیونکہ یہ تمہیں آخرت یاد دلا دیتی ہیں۔"

نبی کریم ﷺ حضرات صحابہ کرام کو قبروں کی زیارت کے وقت یہ دعا پڑھنے کی تلقین فرماتے:

«اَلسَّلاَمُ عَلَيْكُمْ أَهْلَ الدِّيَارِ مِنَ الْمُؤْمِنِينَ وَالْمُسْلِمِينَ، وَإِنَّا، إِنْ شَآءَ اللهُ، لَلاَحِقُونَ، أَسْأَلُ اللهَ لَنَا وَلَكُمُ الْعَافِيَةَ»(صحيح مسلم، الجنائز، باب ما يقال عند دخول القبور ... الخ، ح:٩٧٥)

"اے اس بستی کے رہنے والے مومنو اور مسلمانو! تم پر سلامتی ہو' ہم بھی ان شاء اللہ (تم سے) عنقریب ملنے والے ہیں۔ میں اللہ تعالیٰ سے اپنے لیے اور تمہارے لیے عافیت کا سوال کرتا ہوں۔"

زیارت قبور کے بارے میں احادیث بہت زیادہ ہیں لہٰذا آپ جب بھی قبروں کے پاس سے گزریں تو ان میں مدفون لوگوں کو سلام کہیں اور ان کی مغفرت و عافیت کی دعا کریں لیکن یاد رہے یہ واجب نہیں' بلکہ مستحب ہے اور اس کا ثواب بھی بہت زیادہ ہے اور اگر گزرتے ہوئے آپ سلام نہ بھی کہہ سکیں تو اس میں کوئی حرج نہیں۔ وباللہ التوفیق۔

——— شیخ ابن باز ———

عورت کا قبرستان میں جانا

سوال عورت کے لیے قبروں کی زیارت کے بارے میں کیا حکم ہے؟

جواب عورتوں کے لیے قبروں کی زیارت جائز نہیں ہے' کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے قبروں کی زیارت کرنے والی عورتوں پر لعنت فرمائی ہے [1] اور پھر اس لیے بھی کہ وہ فتنہ ہیں' ان میں صبر بھی بہت کم ہوتا ہے لہٰذا اللہ تعالیٰ نے ان پر رحمت اور احسان فرماتے ہوئے ان کے لیے قبرستان میں جانا حرام قرار دے دیا تاکہ نہ خود فتنہ میں مبتلا ہوں اور نہ دوسرے لوگوں کو فتنہ میں مبتلا کریں۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو اصلاح احوال کی توفیق بخشے! [2]

——— شیخ ابن باز ———

---

[1] سنن ابی داود' الجنائز' باب فی زیارۃ النساء القبور' حدیث: 3236۔

[2] عورتوں کا زیارت کے نقطۂ نظر سے قبرستان جانے کو علمائے محققین نے جائز قرار دیا ہے بشرطیکہ مردوں کے ساتھ اختلاط اور بے پردگی نہ ہو۔ دوسرے' وہ وہاں جا کر جزع فزع اور اس کی قسم کی غیر شرعی حرکات کا ارتکاب نہ کریں۔ اس لیے ممانعت کی احادیث یا تو ضعیف ہیں' جیسے مذکورہ بالا فتویٰ میں جو تین حدیثیں نقل ہوئی ہیں۔ یہ تینوں سنداً ضعیف ہیں۔ تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو۔ (احکام الجنائز و بدعھا' ص: 236 ضعیف النسائی' حدیث: 1880 و مسند ابویعلی بہ تحقیق حسین سلیم اسد' ج: 7' ص: 109) یا پھر ان کا تعلق زیارت قبور کی اجازت دینے سے پہلے سے ہے' بعد میں جب زیارت قبور کی اجازت دے دی گئی تو اس اجازت میں مردوں کے ساتھ عورتیں بھی مذکورہ شرط کے ساتھ شامل ہوں گی۔ اس لیے جن روایات میں ممانعت ہے' بشرط صحت' ان کا تعلق ان عورتوں سے ہوگا جو جزع فزع کرنے والی ہوں گی۔ دوسری عورتوں کیلئے جواز ہوگا' کیونکہ تذکیر بالآخرۃ کی بھی اسی طرح ضرورت مند ہیں' جس طرح مرد ہیں۔ واللہ اعلم۔

عورتوں کے لیے قبرستان کی زیارت اور بعض خرافات

سوال کیا میں اپنے فوت شدہ بیٹے کی قبر کو دیکھنے کے لیے جا سکتی ہوں؟ میں نے بعض لوگوں کو یہ کہتے ہوئے سنا ہے کہ اگر والدہ طلوع آفتاب سے پہلے قبرستان جائے' سورت فاتحہ پڑھے لیکن روئے نہ تو اس کے لیے اپنے بیٹے کو دیکھنا ممکن ہے' دونوں کے درمیان چھلنی کے سوراخوں کی طرح مسافت ہو گی اور اگر وہ روئے تو پھر دونوں کے درمیان پردہ حائل ہو گا اور وہ دیکھ نہ سکے گی' کیا یہ بات صحیح ہے؟ نیز عورتوں کے لیے قبرستان میں جانے کے بارے میں کیا حکم ہے؟

جواب آپ نے جو یہ بات ذکر کی ہے کہ عورت اگر جمعہ کے دن طلوع آفتاب سے پہلے اپنے بیٹے کی قبر کو دیکھنے جائے اور نہ روئے اور سورت فاتحہ پڑھے تو اس کے لیے کشف ہو جاتا ہے اور وہ اپنے بیٹے کو اس طرح دیکھ سکتی ہے گویا چھلنی کے سوراخوں میں سے دیکھ رہی ہو تو یہ بات صحیح نہیں ہے بلکہ یہ ایک باطل اور ناقابل اعتماد قول ہے۔

باقی رہا عورتوں کے لیے زیارت قبور کا مسئلہ' تو اس میں علماء کا اختلاف ہے۔ بعض نے اسے مکروہ اور بعض نے اس شرط کے ساتھ جائز قرار دیا ہے کہ وہ کسی ممنوع کام کا ارتکاب نہ کرے اور بعض اہل علم نے اسے حرام قرار دیا ہے اور میرے نزدیک بھی اس مسئلہ میں اہل علم کا یہی قول راجح ہے کہ عورتوں کے لیے زیارت قبور حرام ہے' کیونکہ نبی کریم ﷺ نے قبروں کی زیارت کرنے والی عورتوں' ان پر مسجدیں بنانے والوں اور چراغ جلانے والوں پر لعنت فرمائی ہے۔ [1] ظاہر ہے کہ جو فعل مباح یا مکروہ ہو اس پر لعنت نہیں کی جا سکتی کیونکہ لعنت تو اسی کام پر ہوتی ہے جو حرام ہو۔ اہل علم کے ہاں معروف قاعدے کا تقاضا بھی یہ ہے کہ عورتوں کے لیے زیارت قبور کو کبیرہ گناہ قرار دیا جائے' کیونکہ یہ مستحق لعنت ہے اور جو گناہ موجب لعنت ہو وہ کبیرہ ہوتا ہے جیسا کہ اکثر اہل علم کے ہاں یہ ایک مسلم قاعدہ ہے' لہٰذا اس عورت کے لیے جس کا بیٹا فوت ہو گیا ہے' میری نصیحت یہ ہے کہ یہ اپنے گھر میں اپنے بیٹے کے لیے کثرت سے استغفار اور دعا کرے۔ اگر اللہ تعالیٰ نے اس کی دعا اور استغفار کو قبول فرما لیا تو یہ اس کے بیٹے کے لیے نفع بخش ہو گا' خواہ یہ اس کی قبر کے پاس نہ بھی ہو۔

—— شیخ ابن عثیمین ——

عورت کے لیے زیارت قبور کیوں ممنوع ہے؟

سوال عورتوں کو زیارت قبور سے روکنے میں کیا حکمت ہے؟

جواب بلاشبہ عورت کو زیارت قبور کی اجازت نہیں ہے بلکہ اہل علم کے راجح قول کے مطابق حرام بلکہ کبیرہ گناہ ہے کیونکہ نبی کریم ﷺ نے قبروں کی زیارت کرنے والی عورتوں پر لعنت فرمائی ہے [2] اور لعنت کبیرہ گناہ ہی پر ہو سکتی ہے' اسی لیے اہل علم نے کبیرہ گناہ کی ایک یہ علامت بھی بیان کی ہے کہ اس پر لعنت کی گئی ہو' کیونکہ لعنت ایک بڑی سزا ہے اور بڑی سزا بڑے گناہ ہی کی ہوتی ہے۔

عورت قبرستان کے پاس سے گزر رہی ہو اور وہ کھڑی ہو جائے کہ اصحاب قبور کے لیے دعا کر دے تو اس میں کوئی حرج نہیں۔ حرج اس میں ہے کہ وہ زیارت قبور ہی کے ارادہ سے اپنے گھر سے نکلے تو یہ حرام ہے۔

---

[1] سنن ابی داود' الجنائز' باب فی زیارۃ النساء القبور' حدیث: 3236۔ [2] حوالہ سابق

اس میں حکمت یہ ہے کہ عورتوں کے زیارت قبور میں کئی خرابیاں ہیں مثلاً یہ کہ عورت کمزور ارادے مگر شدید جذبات کی حامل (بہت ہی شفیق) ہوتی ہے لہٰذا ہو سکتا ہے کہ وہ جب اپنے کسی قریبی عزیز مثلاً ماں یا باپ کی قبر کی زیارت کرے تو اپنے جذبات پر قابو نہ رکھ سکے اور رونا دھونا' چیخنا پکارنا اور نوحہ کرنا شروع کر دے تو اس سے اس کے ایمان اور جان دونوں کو نقصان پہنچے گا۔

اس میں ایک یہ حکمت بھی ہے کہ قبرستان عموماً لوگوں سے خالی ہوتے ہیں' لہٰذا عورت کے تن تنہا قبرستان میں جانے میں یہ اندیشہ بھی ہے کہ یہ فاسق و فاجر لوگوں کے ہتھے چڑھ کر کسی ایسی حرکت کا شکار نہ ہو جائے جس کا انجام اچھا نہ ہو۔

اس میں ایک حکمت یہ بھی ہے کہ عورت ارادے کی کمزوری اور جذبات کی تیزی کے باعث زیارت قبور کو اپنا معمول بنا لے گی جس کی وجہ سے یہ قبرستان آنے جانے ہی میں مصروف رہے گی اور دین و دنیا کی کئی مصلحتوں اور حکمتوں کو ضائع کر بیٹھے گی۔

اگر اس ممانعت میں اور کوئی حکمت نہ بھی ہو تو بس یہی کافی ہے کہ قبروں کی زیارت کرنے والی عورتوں پر رسول اللہ ﷺ نے لعنت فرمائی ہے اور یہی (لعنت) قبروں کی زیارت سے رکنے اور دور رہنے کے لیے کافی ہے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں جس کام سے اپنی کتاب میں یا اپنے رسول ﷺ کی زبانی منع فرما دیں' تو اس میں ہمارے لیے کوئی خیر و بھلائی نہیں ہوتی۔

شیخ ابن عثیمین

زیارت قبور سے متعلق ایک مسئلہ اور لوگوں کا قول ''اس کی آخری منزل''

سوال ہمارے شہر میں یہ رواج ہے کہ جب کسی مردے کو دفن کر دیا جاتا ہے تو پھر چالیس دن تک اس کے اہل خانہ اس کی قبر کی زیارت کے لیے نہیں جاتے اور پھر اس کے بعد جاتے ہیں اور ان کے نزدیک چالیس دن سے پہلے زیارت جائز نہیں ہے۔ سوال یہ ہے کہ یہ بات کس حد تک صحیح ہے؟

جواب اس سوال کے جواب سے پہلے یہ واضح کر دینا ضروری ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے پہلے تو قبروں کی زیارت سے منع فرما دیا تھا اور پھر بعد میں مردوں کو اس کی اجازت عطا فرما دی اور اب صرف مردوں کے لیے زیارت قبور سنت ہے' لہٰذا جو شخص زیارت قبور کے لیے جائے' وہ اس لیے جائے کہ رسول اللہ ﷺ نے اس کا حکم دیا ہے تاکہ وہ ان مردوں کی حالت کو دیکھ کر عبرت حاصل کر سکے کہ کل تک تو یہ زمین پر چلتے پھرتے تھے اور اب اپنی قبروں میں اپنے اعمال کے رہین منت ہیں' اپنے اعمال کے سوا وہاں ان کا اور کوئی دوست اور ساتھی نہیں ہے۔

قبر انسان کا آخری ٹھکانا نہیں ہے بلکہ اس کے بعد وہ یوم آخر آنے والا ہے کہ جس کے بعد اور کوئی دن نہیں ہو گا' قبروں میں باقی رہنا ہی زیارت ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿ أَلْهَىٰكُمُ ٱلتَّكَاثُرُ ۝١ حَتَّىٰ زُرْتُمُ ٱلْمَقَابِرَ ۝٢ ﴾ (التکاثر ۱۰۲/ ۱۔۲)

''(لوگو!) تم کو (مال کی) بہت سی طلب نے غافل کر دیا' یہاں تک کہ تم نے قبریں جا دیکھیں۔''

بیان کیا گیا ہے کہ ایک اعرابی نے کسی کو یہ آیت پڑھتے ہوئے سنا کہ ﴿ حَتَّىٰ زُرْتُمُ الْمَقَابِرَ ﴾ تو وہ بے ساختہ پکار اٹھا کہ ''زائر مقیم نہیں ہوتا''

اس مناسبت سے میں اس طرف توجہ مبذول کروانا ضروری سمجھتا ہوں کہ بعض لوگ سوچے سمجھے بغیر جو اس قسم کے الفاظ استعمال کرتے ہیں کہ "وہ فلاں شخص کو اس کے آخری ٹھکانے پر پہنچا آئے ہیں۔" ان الفاظ پر ہم اگر غور کریں تو ان میں ایک طرح سے بعثت کا انکار ہے' کیونکہ اگر قبر ہی آخری ٹھکانہ ہو تو اس کے معنی یہ ہیں کہ اس کے بعد بعث و نشر نہ ہو گا اور یہ ایک بہت خطرناک بات ہے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ اور یوم آخرت پر ایمان لانا تو ایمان و اسلام کی شرط ہے۔ لیکن معلوم یوں ہوتا ہے کہ عامۃ الناس اس قسم کے کلمات کو سوچے سمجھے بغیر استعمال کرتے ہیں لیکن اس طرف توجہ دلانا ضروری تھی' کیونکہ اس طرح کے جملوں کو مطلقاً استعمال کرنا حرام ہے اور اگر کسی شخص کا اعتقاد ہی یہی ہے کہ قبر آخری ٹھکانہ یا آخری آرام گاہ ہے تو پھر یہ کفر ہے' کیونکہ اس میں یوم آخرت کا انکار ہے۔

باقی رہا چالیس دن کے بعد زیارت قبور کا مسئلہ تو اس کی کوئی دلیل نہیں' کیونکہ انسان اپنے کسی عزیز کی تدفین کے دوسرے دن بعد بھی اس کی قبر کی زیارت کر سکتا ہے' لیکن جب کسی انسان کا کوئی قریبی عزیز وفات پا جائے تو پھر اسے دل کا روگ نہیں بنا لینا چاہیئے اور اس کی قبر پر کثرت سے نہیں جانا چاہیئے' کیونکہ اس سے غم تازہ رہے گا' وہ اللہ تعالیٰ کے ذکر سے غافل ہو جائے گا اور زیادہ اہمیت اس بات کو دے گا کہ اپنا زیادہ وقت اپنے اس عزیز کی قبر کے پاس ہی گزارے' اس سے انسان کو وسوسوں' برے افکار و خیالات اور خرافات میں مبتلا ہونے کا بھی اندیشہ ہوتا ہے۔

——— شیخ ابن عثیمین ———

بدعات جنائز

میت کے گھر میں اور جنازہ قبرستان لے جاتے وقت بلند آواز سے قرآن پڑھنا

سوال جب کوئی آدمی فوت ہوتا ہے تو اس گھر میں لاؤڈ سپیکر پر قرآن مجید کی تلاوت شروع کر دی جاتی ہے' حتیٰ کہ جب گاڑی پر میت کو قبرستان میں لے جایا جاتا ہے تو اس وقت بھی گاڑی کے ساتھ سپیکر نصب ہوتا ہے' حتیٰ کہ اس طرح تلاوت سنتے ہی لوگ یہ بدشگونی لیتے ہیں کہ کوئی فوت ہو گیا ہے' اور اب صورتحال یہ ہو چکی ہے کہ کسی انسان کی موت پر ہی تلاوت قرآن کی جاتی ہے۔ اس بارے میں کیا حکم ہے؟ اور اس طرح کرنے والوں کے لیے آپ کے کیا پند و نصائح ہیں؟

جواب بلاشک و شبہ یہ عمل بدعت ہے' کیونکہ نبی کریم ﷺ اور حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے عہد میں اس طرح کا کوئی رواج نہ تھا۔ تلاوت قرآن سے بلاشبہ غم و فکر ہلکا ہو جاتا ہے بشرطیکہ آدمی اسے خود خشوع و خضوع سے پڑھے' نہ کہ سپیکروں پر اس طرح پڑھا جائے' اسی طرح اہل میت کا تعزیت کے لیے آنے والوں کے استقبال کے لیے جمع ہونا بھی ان امور میں سے ہے جو عہد نبوی اور عہد صحابہ میں معروف نہ تھے' حتیٰ کہ بعض علماء نے اسے بھی بدعت قرار دیا ہے' لہٰذا ہماری رائے میں اہل میت کو لوگوں کی طرف سے تعزیتیں وصول کرنے کے لیے جمع نہیں ہونا چاہیئے بلکہ انہیں اپنے دروازے بند کر لینے چاہئیں' اگر بازار میں انہیں کوئی ملے یا جاننے والوں میں سے کوئی آئے کہ تعزیت وصول کرنے کا انہوں نے باقاعدہ کوئی اہتمام نہ کیا ہو تو اس میں کوئی حرج نہیں۔

تعزیت وصول کرنے کے لیے لوگوں کے باقاعدہ استقبال کا عہد نبوی اور عہد صحابہ میں کوئی رواج نہیں تھا' حتیٰ کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم تو اہل میت کے جمع ہونے اور کھانا تیار کرنے کو بھی نوحہ شمار کرتے تھے۔ نوحہ کبیرہ گناہ ہے جیسا کہ معروف ہے' کیونکہ نبی کریم ﷺ نے نوحہ کرنے والی اور نوحہ سننے والی عورت پر لعنت فرمائی ہے۔ اور فرمایا ہے:

«اَلنَّائِحَةُ إِذَا لَمْ تَتُبْ قَبْلَ مَوْتِهَا، تُقَامُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ وَعَلَيْهَا سِرْبَالٌ مِّنْ قَطِرَانٍ، وَّدِرْعٌ مِّنْ جَرَبٍ»(صحيح مسلم، الجنائز، باب التشديد في النياحة، ح: ٩٣٤)

"نوحہ کرنے والی عورت اگر موت سے پہلے توبہ نہ کرے تو اسے روز قیامت اس طرح کھڑا کیا جائے گا کہ اس پر تارکول کا کرتہ اور خارشی زرہ ہوگی۔" (اللہ تعالیٰ ہمیں اس سے محفوظ رکھے۔)

میری اپنے بھائیوں کو یہ نصیحت ہے کہ ان بدعت والے کاموں کو ترک کر دیں' کیونکہ ان کا ترک کر دینا' ان کے لیے بھی اور میت کے لیے بھی اللہ کے نزدیک زیادہ بہتر ہے' کیونکہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا ہے کہ "میت کو اس کے گھر والوں کے رونے اور نوحہ کرنے سے عذاب ہوتا ہے۔"[1]

یعنی اسے اس سے تکلیف ہوتی ہے۔ اگرچہ اسے اس کی اتنی سزا نہیں ملے گی جتنا کہ نوحہ کرنے والے کو کیونکہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ وَلَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِزْرَ أُخْرَىٰ ﴾ (الأنعام٦/ ١٦٤)

"اور کوئی بوجھ اٹھانے والا کسی دوسرے (کے گناہ) کا بوجھ نہیں اٹھائے گا۔"

اس حدیث میں عذاب کا لفظ سزا کے معنی میں استعمال نہیں ہوا بلکہ یہ اسی طرح ہے جس طرح نبی کریم ﷺ نے فرمایا:

«اَلسَّفَرُ قِطْعَةٌ مِّنَ الْعَذَابِ»(صحيح البخاري، العمرة، باب السفر قطعة من العذاب، ح: ١٨٠٤)

"سفر عذاب کا ایک ٹکڑا ہے۔"

یعنی دکھ درد اور غم و فکر کو بھی عذاب کہا جاتا ہے۔ مشہور مقولہ ہے کہ عذبنی ضمیری "میرے ضمیر نے مجھے عذاب دیا۔"

حاصل کلام یہ ہے کہ میں اپنے بھائیوں کو یہ نصیحت کرتا ہوں کہ وہ ان باتوں سے دور رہیں جو انہیں اللہ تعالیٰ سے دور کرنے والی اور ان کے مردوں کو عذاب سے قریب کر دینے والی ہیں۔

——— شیخ ابن عثیمین ———

جنازے کے ساتھ بلند آواز سے "لا الہ الا اللہ" پڑھنا

سوال جب جنازہ قبرستان کی طرف لے جایا جارہا ہو تو اسوقت اجتماعی طور پر بلند آواز سے کلمہ طیبہ پڑھنے کا کیا حکم ہے؟

جواب رسول اللہ ﷺ کی سنت یہ ہے کہ جب آپ جنازے کے ساتھ تشریف لے جاتے تو آپ سے نہ کلمہ طیبہ کا ورد سنا جاتا نہ قرآن مجید کی تلاوت اور نہ ہی کچھ اور۔ ہمارے علم کے مطابق تو یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے' جنازہ کے ساتھ

[1] صحیح بخاری' الجنائز' باب قول النبی صلی اللہ علیہ وسلم یعذب المیت ..... الخ' حدیث : 1286' 1287 و صحیح مسلم' الجنائز' باب المیت یعذب ببکاء اھلہ علیہ' حدیث :927-

اجتماعی طور پر کلمہ طیبہ پڑھنے کا حکم نہیں دیا بلکہ آپ سے تو یہ مروی ہے:

«لاَ تُتْبَعُ الْجَنَازَةُ بِصَوْتٍ وَلاَ نَارٍ» (سنن أبي داود، الجنائز، باب في اتباع الميت بالنار، ح:٣١٧١)

"جنازہ کے ساتھ آواز بلند ہو نہ جنازہ کے ساتھ آگ کو لے جایا جائے۔"

قیس بن عباد فرماتے ہیں (جو اکابر تابعین اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کے اصحاب میں سے تھے) کہ "حضرات صحابہ کرام جنازے' ذکر اور جنگ کے وقت آواز پست رکھنا مستحب سمجھتے تھے۔"

شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ جنازہ کے ساتھ آواز کو بلند کرنا خواہ وہ قراءت کی صورت میں ہو' ذکر کی صورت میں یا کسی اور صورت میں' مستحب نہیں ہے' ائمہ اربعہ کا بھی یہی مذہب ہے اور صحابہ و تابعین و سلف سے بھی یہی منقول ہے' کسی نے اس مسئلہ میں مخالفت بھی نہیں کی۔ آپ نے یہ بھی فرمایا ہے کہ حدیث و آثار کا علم جاننے والوں کا اس بات پر اتفاق ہے کہ خیر القرون میں اس کا کوئی رواج نہ تھا۔

اس سے یہ بات واضح ہو گئی ہے کہ بلند آواز سے جنازوں کے ساتھ کلمہ طیبہ یا کلمہ شہادت پڑھنا ایک قبیح بدعت ہے' اسی طرح اس موقع پر لوگوں کا یہ کہنا کہ "بلند آواز سے کلمہ شہادت پڑھو یا اللہ کا ذکر کرو یا قصیدہ بردہ وغیرہ پڑھو' یہ سب بدعت ہے۔"

—— فتویٰ کمیٹی ——

شہداء اور بڑے لوگوں کی وفات پر خاموشی کے ساتھ کھڑا ہونا

سوال اقوام متحدہ میں جب کسی رکن ملک کے سربراہ کی وفات کی خبر آتی ہے تو وہاں سب لوگ مقتول کی وفات پر اظہار غم کے لیے لمحہ بھر خاموش کھڑے ہو جاتے ہیں' تو اس کے بارے میں کیا حکم ہے؟

جواب بعض لوگ شہداء یا اکابر لوگوں کی وفات پر ان کی تعظیم و تکریم کے لیے کچھ دیر کے لیے جو خاموش کھڑے ہو جاتے ہیں' یہ ان بدعات و منکرات میں سے ہے جن کا نبی صلی اللہ علیہ وسلم' حضرات صحابہ کرام' اور سلف صالح کے دور میں قطعاً کوئی رواج نہ تھا۔ یہ بات آداب توحید اور اللہ تعالیٰ ہی کے لیے اخلاص تعظیم کے بھی منافی ہے۔ افسوس کہ بعض جاہل مسلمان بھی اس قسم کی بدعات میں کافروں کی پیروی کرتے' ان کی قبیح عادات کو اختیار کرتے اور اکابر و روسا کی تعظیم میں انہی کی طرح غلو سے کام لیتے ہیں' حالانکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے کافروں کی مشابہت اختیار کرنے سے منع فرمایا ہے۔ [1]

اسلام نے اپنے ماننے والوں کو جن حقوق کی تعلیم دی ہے وہ یہ ہیں کہ جو مسلمان فوت ہو جائیں ان کے لیے دعا کی جائے' ان کی طرف سے صدقہ کیا جائے' ان کی خوبیوں کا تذکرہ کیا جائے اور ان کی برائیوں کو بیان نہ کیا جائے۔ علاوہ ازیں اور بھی بہت سے آداب ہیں جن کی اسلام نے تعلیم دی ہے اور مسلمانوں کے بارے میں خواہ وہ زندہ ہوں یا مردہ انہیں ملحوظ رکھنے کی ترغیب دی ہے۔ اسلام نے اس بات کی ہرگز تعلیم نہیں دی اور نہ یہ ادب سکھایا ہے کہ وہ شہداء یا اکابر کی وفات پر بطور سوگ خاموش کھڑے ہوں بلکہ یہ بات اسلام کے اصولوں کے منافی ہے۔

—— فتویٰ کمیٹی ——

[1] سنن ابی داود' اللباس' باب فی لبس الشھرۃ' ح: 4031-

میت کے پیٹ پر قرآن مجید رکھنا

سوال میت پر قرآن مجید کی تلاوت کرنے اور اس کے پیٹ پر قرآن مجید رکھنے کے بارے میں کیا حکم ہے؟ کیا تعزیت کے ایام مقرر ہیں؟ یہ جو کہا جاتا ہے کہ تعزیت صرف تین دن تک کی جا سکتی ہے' اس کے بارے میں کیا حکم شریعت ہے؟ امید ہے رہنمائی فرمائیں گے! جزاکم اللہ خیرًا۔

جواب میت پر یا قبر پر قرآن مجید پڑھنے کی کوئی صحیح دلیل نہیں ہے' لہٰذا یہ ایک غیر شرعی امر بلکہ بدعت ہے۔ اسی طرح میت کے پیٹ پر قرآن مجید رکھنے کی بھی کوئی صحیح دلیل نہیں ہے' لہٰذا یہ بھی ایک غیر شرعی امر ہے۔ ہاں بعض اہل علم نے یہ ضرور ذکر کیا ہے کہ وفات کے بعد پیٹ پر لوہا یا کوئی وزنی چیز رکھ دی جائے تاکہ پیٹ پھول نہ جائے۔ باقی رہی تعزیت تو اس کے لیے ایام مخصوص اور محدود نہیں ہیں۔ واللہ ولی التوفیق۔

——— شیخ ابن عثیمین ———

مدینہ طیبہ میں دوسرے دروازوں کی بجائے باب رحمت سے میت کا داخلہ

سوال مدینہ منورہ میں بہت سے لوگوں میں یہ رواج ہے کہ وہ دیگر دروازوں کی بجائے صرف باب رحمت سے میت کو داخل کرتے ہیں اور عقیدہ یہ رکھتے ہیں کہ اس سے اللہ سبحانہ وتعالیٰ میت پر رحمت کرتے ہوئے اسے معاف فرما دیتا ہے' کیا یہ بات ہماری شریعت مطہرہ کی روشنی میں صحیح ہے؟

جواب ہماری شریعت مطہرہ میں اس عقیدہ کی کوئی دلیل نہیں۔ لہٰذا یہ ایک خلاف شریعت بات ہے' اس کا اعتقاد رکھنا جائز نہیں' جنازہ کو کسی بھی دروازہ سے داخل کر لیں اس میں کوئی حرج نہیں اور افضل یہ ہے کہ اس دروازے سے داخل کیا جائے جس سے داخل کرنے میں نمازیوں کو تکلیف کم ہو۔

——— شیخ ابن باز ———

میت کی قبر کے پاس اذان و اقامت

سوال میت کو قبر میں رکھتے وقت اذان و اقامت کہنے کے بارے میں کیا حکم ہے؟

جواب بلاشک و شبہ یہ بدعت ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس کی کوئی سند نازل نہیں فرمائی۔ رسول اللہ ﷺ اور حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے بھی ایسا ہرگز ثابت نہیں ہے جب کہ ساری خیر و برکت انہی کے نقش قدم پر چلنے میں ہے جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ وَالسَّٰبِقُونَ ٱلْأَوَّلُونَ مِنَ ٱلْمُهَٰجِرِينَ وَٱلْأَنصَارِ وَٱلَّذِينَ ٱتَّبَعُوهُم بِإِحْسَٰنٍ رَّضِىَ ٱللَّهُ عَنْهُمْ وَرَضُوا۟ عَنْهُ ﴾ (التوبة٩/ ١٠٠)

''وہ مہاجر و انصار جنہوں نے سب سے پہلے دعوت ایمان پر لبیک کہنے میں سبقت کی اور وہ جنہوں نے نیکو کاری کے ساتھ ان کی پیروی کی' اللہ ان سے خوش ہے اور وہ اللہ سے خوش ہیں۔''

اور نبی کریم ﷺ نے فرمایا:

«مَنْ أَحْدَثَ فِي أَمْرِنَا هٰذَا مَا لَيْسَ فِيهِ فَهُوَ رَدٌّ»(صحيح البخاري، الصلح، باب إذا اصطلحوا على صلح جور . . . الخ، ح:٢٦٩٧)

"جو شخص ہمارے اس دین (اسلام) میں کوئی ایسی نئی بات ایجاد کرے جو اس میں سے نہ ہو تو وہ مردود ہے۔"

ایک اور روایت میں الفاظ یہ ہیں کہ نبی ﷺ نے فرمایا:

«مَنْ عَمِلَ عَمَلاً لَيْسَ عَلَيْهِ أَمْرُنَا فَهُوَ رَدٌّ»(صحيح مسلم، الأقضية، باب نقض الأحكام الباطلة . . . الخ، ح:١٧١٨)

"جو کوئی ایسا عمل کرے جس کے بارے میں ہمارا امر نہ ہو تو وہ (عمل) مردود ہے۔"

اسی طرح نبی ﷺ خطبہ جمعہ میں ارشاد فرمایا کرتے تھے:

«أَمَّا بَعْدُ! فَإِنَّ خَيْرَ الْحَدِيثِ كِتَابُ اللهِ، وَخَيْرَ الْهَدْيِ هَدْيُ مُحَمَّدٍ ﷺ، وَشَرَّ الأُمُورِ مُحْدَثَاتُهَا، (وَكُلَّ مُحْدَثَةٍ بِدْعَةٌ) وَكُلَّ بِدْعَةٍ ضَلاَلَةٌ» (صحيح مسلم، الجمعة، باب تخفيف الصلاة والخطبة، ح:٨٦٧، وما بين القوسين لفظ النسائي، العيدين، كيف الخطبة، ح:١٥٧٩)

"امابعد! سب سے بہترین بات اللہ کی کتاب ہے اور سب سے بہترین طریقہ محمد ﷺ کا طریقہ ہے' سب سے بدترین امور وہ ہیں جنہیں (دین میں) نیا ایجاد کر لیا گیا ہو' ایسی ہر نئی بات بدعت ہے اور ہر بدعت گمراہی ہے۔"

——— شیخ ابن باز ———

دفن کے بعد میت کو تلقین کرنا اور وفات کے وقت (سورت) "یٰسٓ" پڑھنا

سوال ایک آدمی نے پوچھا ہے کہ دفن کے بعد میت کو تلقین کرنے کے بارے میں کیا حکم ہے؟ اس کی صورت یہ ہوتی ہے کہ ایک آدمی قبر کے پاس کھڑے ہو کر کہتا ہے کہ اے اللہ کے بندے! اس عہد کو یاد کر جس پر تو دنیا کو چھوڑ کر آخرت کی طرف آیا ہے' یعنی دنیا میں تو یہ گواہی دیتا تھا کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور حضرت محمد ﷺ اس کے رسول ہیں--- جب تیرے پاس دو فرشتے آئیں اور تجھ سے یہ سوال کریں کہ تیرا رب کون ہے؟ تیرا دین کیا ہے؟ تیرا نبی کون ہے؟ تو ان فرشتوں کو یہ جواب دینا کہ اللہ میرا رب ہے' اسلام میرا دین ہے اور محمد رسول اللہ ﷺ میرے نبی ہیں' کعبہ میرا قبلہ ہے اور مسلمان میرے بھائی ہیں--- اس طرح دفن کے بعد اور بھی بہت لمبی گفتگو کی جاتی ہے۔ اس کے علاوہ بوقت وفات سورت یٰسین بھی پڑھی جاتی ہے۔ سوال یہ ہے کہ کیا اس طرح تلقین میت کے بارے میں کوئی صحیح حدیث ہے' کیونکہ جو لوگ جواز کے قائل ہیں وہ اس کے لیے کئی احادیث پیش کرتے ہیں؟

جواب رسول اللہ ﷺ کی سنت سے یہ ثابت ہے کہ دفن میت سے فراغت کے بعد آپ اور حضرات صحابہ کرام قبر کے پاس کھڑے ہو جاتے' میت کے لیے مغفرت اور ثابت قدمی کی دعا کرتے۔[1] آپ صحابہ کرام کو بھی یہی حکم دیتے کہ وہ بھی مغفرت اور ثابت قدمی کی دعا کریں' آپ قبر کے پاس بیٹھ کر نہ تو کچھ پڑھتے اور نہ میت کو تلقین کرتے۔

[1] سنن ابی داود' الجنائز' باب الاستغفار عند القبر' حدیث: 3221۔

شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اس پر تمام امت کا اجماع ہے کہ موت کے بعد تلقین میت واجب نہیں ہے۔ رسول اللہ ﷺ اور خلفاء راشدین کے عہد میں بھی مسلمانوں میں یہ عمل مشہور نہ تھا' البتہ بعض صحابہ مثلاً حضرت ابوامامہ اور واثلہ بن اسقع رضی اللہ عنہما سے یہ منقول ہے' لہٰذا بعض ائمہ مثلاً امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ نے اسے اختیار کیا ہے۔ امام احمد اور امام شافعی کے بعض اصحاب نے اسے مستحب قرار دیا ہے جب کہ بعض علماء نے اسے مکروہ قرار دیا ہے' کیونکہ وہ اسے بدعت قرار دیتے ہیں گویا اس مسئلہ میں تین اقوال ہیں:

(۱) یہ مستحب ہے (۲) مکروہ ہے (۳) جائز ہے۔ سب سے صحیح قول یہ ہے کہ مستحب یہ ہے جس کا نبی کریم ﷺ نے حکم بھی دیا اور ترغیب بھی دی کہ میت کے لیے دعا کی جائے۔" وصلى الله على نبينا محمد وعلى آله وصحبه وسلم۔

——— فتویٰ کمیٹی ———

ایک بدعت

سوال "الترغیب والترہیب" میں ہے کہ جب کوئی شخص فوت ہو جائے تو اس کی قبر کی مٹی کی ایک مٹھی لو اور اس پر یہ آیات پڑھو ---اب مجھے وہ آیات یاد نہیں--- پھر وہ مٹی اس کے کفن پر ڈال دو تو اس سے میت کو عذاب قبر نہیں ہو گا۔ یہ بات کس حد تک صحیح ہے؟

جواب یہ ایک بالکل بے اصل بات بلکہ بہت بری بدعت ہے لہٰذا یہ جائز نہیں اور نہ اس میں کوئی فائدہ ہے' کیونکہ نبی کریم ﷺ نے اپنی امت کو اس کا حکم نہیں دیا بلکہ آپ نے صرف یہ حکم دیا ہے کہ جب کوئی مسلمان فوت ہو جائے تو اسے غسل دیا جائے' کفن پہنایا جائے' اس کی نماز جنازہ پڑھی جائے اور مسلمانوں کے قبرستان میں اسے دفن کر دیا جائے۔ جبکہ اس وقت موجود لوگوں کو حکم یہ ہے کہ تدفین سے فراغت کے بعد میت کی مغفرت اور حق پر ثابت قدمی کے لیے دعا کریں جیسا کہ نبی کریم ﷺ بھی دعا فرمایا کرتے اور دعا کا حکم بھی دیا کرتے تھے۔[1] وباللہ التوفیق

——— شیخ ابن باز ———

قبر کے پاس یٰسٓ پڑھنے اور درخت لگانے کا حکم

سوال بعض لوگ میت کو دفن کرنے کے بعد قبر کے پاس سورت یٰسٓ کی تلاوت کرتے ہیں اور قبر کے پاس املی وغیرہ کی ٹہنی گاڑ دیتے ہیں اور بعض لوگ قبر کی سطح پر جو یا گندم کے دانے اگا دیتے ہیں اور دلیل یہ دیتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے بھی دو قبروں پر ٹہنیاں رکھی تھیں۔ اس کا کیا حکم ہے؟

جواب دفن کرتے وقت یا دفن کے بعد قبر پر سورۂ یٰسٓ یا قرآن مجید کی کوئی اور سورت پڑھنا جائز نہیں۔ قبرستان میں بھی شریعت نے قرآن مجید پڑھنے کا حکم نہیں دیا۔ نبی کریم ﷺ اور خلفاء راشدین سے بھی ایسا ثابت نہیں ہے۔ اسی طرح قبر کے پاس اذان و اقامت کا بھی حکم نہیں بلکہ یہ سب کام بدعت ہیں اور رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے:

«مَنْ عَمِلَ عَمَلاً لَيْسَ عَلَيْهِ أَمْرُنَا فَهُوَ رَدٌّ»(صحيح مسلم، الأقضية، باب نقض الأحكام الباطلة

[1] سنن ابی داود' الجنائز' باب الاستغفار عندالقبر' حدیث: 3221۔

... الخ، ح:۱۷۱۸)

"جس شخص نے کوئی ایسا عمل کیا جس پر ہمارا امر نہیں تو وہ (عمل) مردود ہے۔"

اسی طرح قبروں پر املی وغیرہ کا درخت لگانا' جو اور گندم وغیرہ اگانا بھی جائز نہیں ہے' کیونکہ رسول اللہ ﷺ اور آپ کے خلفاء راشدین رضی اللہ عنہم سے یہ ثابت نہیں ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے جو ان دو قبروں پر ٹہنیاں گاڑیں' [1] جن میں مدفون مردوں کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے آپ کو مطلع فرما دیا تھا' کہ ان کو عذاب ہو رہا ہے' تو یہ رسول اللہ ﷺ کا خاصہ اور یہ عمل انہی دو قبروں کے ساتھ مخصوص تھا کیونکہ ان کے علاوہ اور کسی قبر پر آپ نے کبھی بھی ٹہنی نہیں گاڑی تھی' لہٰذا مذکورہ بالا حدیث کے پیش نظر مسلمانوں کے لیے دین میں کسی ایسی بات کا ایجاد کرنا جائز نہیں ہے جس کا اللہ تعالیٰ نے حکم نہ دیا ہو اور پھر ارشاد باری تعالیٰ بھی ہے:

﴿ أَمْ لَهُمْ شُرَكَٰٓؤُاْ شَرَعُواْ لَهُم مِّنَ ٱلدِّينِ مَا لَمْ يَأْذَنۢ بِهِ ٱللَّهُ ۚ . . الآية﴾ (الشورى۴۲/ ۲۱)

"کیا ان کے وہ شریک ہیں جنہوں نے ان کے لیے ایسا دین مقرر کیا ہے جس کا اللہ نے حکم نہیں دیا---"

——— شیخ ابن باز ———

مُردوں پر سورت فاتحہ پڑھنے کا حکم

سوال کیا مُردوں کے لیے فاتحہ خوانی جائز ہے اور کیا اس کا انہیں ثواب ملتا ہے؟

جواب مُردوں کے لیے فاتحہ خوانی کے بارے میں سنت سے کوئی دلیل نہیں ہے اس لیے اسے نہ پڑھا جائے' کیونکہ عبادات میں اصل ممانعت ہے الا یہ کہ ان کے ثبوت کی کوئی دلیل موجود ہو جس سے معلوم ہو کہ اس کا تعلق اللہ تعالیٰ کی شریعت سے ہے' کیونکہ اللہ تعالیٰ نے ان لوگوں کی تردید فرمائی ہے جنہوں نے اللہ تعالیٰ کے حکم کے بغیر از خود دین میں کچھ چیزوں کو مقرر کر لیا' چنانچہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ أَمْ لَهُمْ شُرَكَٰٓؤُاْ شَرَعُواْ لَهُم مِّنَ ٱلدِّينِ مَا لَمْ يَأْذَنۢ بِهِ ٱللَّهُ ﴾ (الشورى۴۲/ ۲۱)

"کیا ان کے وہ شریک ہیں جنہوں نے ان کے لیے ایسا دین مقرر کیا ہے جس کا اللہ نے حکم نہیں دیا۔"

اور نبی کریم ﷺ نے فرمایا ہے:

«مَنْ عَمِلَ عَمَلاً لَيْسَ عَلَيْهِ أَمْرُنَا فَهُوَ رَدٌّ»(صحيح مسلم، الأقضية، باب نقض الأحكام الباطلة ... الخ، ح:۱۷۱۸)

"جس نے کوئی ایسا عمل کیا جس کے بارے میں ہمارا امر نہیں ہے تو وہ (عمل) مردود ہے۔"

اور جب وہ عمل مردود ہے تو وہ یقیناً باطل اور عبث ہے اور اللہ تعالیٰ کی ذات پاک ہے کہ کسی ایسے عمل کے ذریعے اس کا تقرب حاصل کیا جائے۔ کسی قاری کو اجرت دے کر قرآن پڑھانا تاکہ اس کا ثواب میت کو پہنچے' تو یہ حرام ہے' کیونکہ قرآن پڑھ کر اجرت لینا صحیح نہیں ہے۔ جو شخص قرآن پڑھ کر اجرت لے وہ گناہگار اور ثواب سے محروم ہے' کیونکہ قرآن مجید پڑھنا تو عبادت ہے اور یہ جائز نہیں کہ عبادت کو حصول دنیا کا وسیلہ بنا لیا جائے' ارشاد ربانی ہے:

---

[1] صحیح بخاری' الجنائز' باب الجريدة على القبر' حديث: 1361۔

﴿ مَن كَانَ يُرِيدُ ٱلْحَيَوٰةَ ٱلدُّنْيَا وَزِينَتَهَا نُوَفِّ إِلَيْهِمْ أَعْمَٰلَهُمْ فِيهَا وَهُمْ فِيهَا لَا يُبْخَسُونَ ﴿١٥﴾ ﴾

(هود۱۱/ ۱۵)

"جو لوگ دنیا کی زندگی اور اس کی زیب و زینت کے طالب ہوں ہم ان کے اعمال کا بدلہ انہیں دنیا ہی میں دے دیتے ہیں اور اس میں ان کی حق تلفی نہیں کی جاتی۔"

—————— شیخ ابن عثیمین ——————

قبر کے پاس سورت فاتحہ یا کوئی اور سورت پڑھنا

سوال کیا زیارت قبر کے وقت میت کے لیے سورت فاتحہ یا کوئی اور سورت پڑھنا جائز ہے؟ اور کیا میت کو اس کا کوئی فائدہ ہوتا ہے؟

جواب نبی کریم ﷺ سے یہ ثابت ہے کہ آپ قبروں کی زیارت فرمایا کرتے تھے اور مُردوں کے لیے وہ دعائیں مانگتے جو آپ نے صحابہ کرام کو بھی سکھائیں اور صحابہ کرام نے آپ سے سیکھیں مثلاً انہیں میں سے ایک یہ دعا بھی ہے:

«اَلسَّلَامُ عَلَيْكُمْ أَهْلَ الدِّيَارِ مِنَ الْمُؤْمِنِينَ وَالْمُسْلِمِينَ، وَإِنَّا إِنْ شَاءَ اللهُ، لَلَاحِقُونَ، أَسْأَلُ اللهَ لَنَا وَلَكُمُ الْعَافِيَةَ» (صحيح مسلم، الجنائز، باب ما يقال عند دخول القبور ... الخ، ح: ۹۷۵)

"اے اس لبستی کے رہنے والے مومنو اور مسلمانو! تم پر سلام ہو بے شک ہم بھی ان شاء اللہ (تم سے) عنقریب ملنے والے ہیں۔ میں اللہ تعالیٰ سے اپنے اور تمہارے لیے عافیت کی دعا کرتا ہوں۔"

قبروں کی بکثرت زیارت کے باوجود یہ بات ثابت نہیں کہ نبی کریم ﷺ نے مُردوں کے لیے کبھی سورت فاتحہ یا قرآن مجید کی کچھ آیات پڑھی ہوں۔ اگر یہ جائز ہوتا تو آپ خود بھی یقیناً ایسا کرتے اور صحابہ کرام کے سامنے بھی اس بات کو واضح فرما دیتے تاکہ اس طرح آپ حصول ثواب کی ترغیب دیتے' امت پر رحمت فرماتے اور فریضہ تبلیغ کو بھی ادا فرماتے۔ آپ کی شان تو یہ ہے جیسا کہ فرمان باری تعالیٰ ہے:

﴿ لَقَدْ جَآءَكُمْ رَسُولٌ مِّنْ أَنفُسِكُمْ عَزِيزٌ عَلَيْهِ مَا عَنِتُّمْ حَرِيصٌ عَلَيْكُم بِٱلْمُؤْمِنِينَ رَءُوفٌ رَّحِيمٌ ﴿١٢٨﴾ ﴾ (التوبة۹/ ۱۲۸)

"(لوگو!) تمہارے پاس تم ہی میں سے ایک پیغمبر آئے ہیں' تمہاری تکلیف ان کو گراں معلوم ہوتی ہے اور تمہاری بھلائی کے بہت خواہش مند ہیں اور مومنوں پر نہایت شفقت کرنے والے (اور) مہربان ہیں۔"

اسباب میسر ہونے کے باوجود جب نبی ﷺ نے ایسا نہیں کیا تو معلوم ہوا کہ یہ ایک غیر شرعی عمل ہے۔ حضرات صحابہ کرام کو بھی اس کا علم تھا یہی وجہ ہے کہ انہوں نے بھی محض آپ کے نقش قدم پر چلنے پر اکتفا کیا کہ صرف عبرت اور مُردوں کے حق میں دعا کے لیے قبروں کی زیارت کی اور کبھی بھی زیارت قبور کے موقع پر قرآن مجید نہیں پڑھا' گویا اس موقع پر قرآن مجید کو پڑھنا بدعت ہے اور بدعت کے بارے میں نبی کریم ﷺ نے فرمایا ہے:

«مَنْ أَحْدَثَ فِي أَمْرِنَا هٰذَا مَا لَيْسَ فِيهِ فَهُوَ رَدٌّ»(صحيح البخاري، الصلح، باب إذا اصطلحوا

علی صلح جور ... الخ، ح:۲۶۹۷)

"جس نے ہمارے اس دین میں کوئی ایسی نئی بات ایجاد کی جو دین میں سے نہ ہو تو وہ مردود ہے۔"

—— فتویٰ کمیٹی ——

دفن کے بعد قبر پر قرآن خوانی

سوال میت کو دفن کرنے کے بعد قبر پر قرآن خوانی کے بارے میں کیا حکم ہے؟ اور مُردوں پر رحمت کے لیے ہم جو اپنے گھروں میں لوگوں کو اجرت دے کر پڑھاتے ہیں' اس کے بارے میں کیا حکم ہے؟

جواب اہل علم کا راجح قول یہ ہے کہ دفن کے بعد قبر پر قرآن خوانی بدعت ہے' کیونکہ رسول اللہ ﷺ کے دور میں اس کا کوئی رواج نہ تھا۔ آپ نے اس کا حکم دیا نہ خود ایسا کیا بلکہ زیادہ سے زیادہ جو ثابت ہے وہ یہ کہ نبی علیہ الصلوۃ والسلام دفن کے بعد قبر کے پاس کھڑے ہو کر فرماتے:

«اِسْتَغْفِرُوا لأَخِيكُمْ وَاسْأَلُوا لَهُ بِالتَّثْبِيتِ فَإِنَّهُ الآنَ يُسْأَلُ»(سنن أبي داود، الجنائز، باب الاستغفار عند القبر ... الخ، ح:۳۲۲۱ والمستدرك للحاكم:۱/ ۳۷۰)

"اپنے بھائی کے لیے مغفرت اور ثابت قدمی کی دعا کرو' کیونکہ اب اس سے سوال پوچھے جائیں گے۔"

اگر قبر کے پاس قرآن خوانی حکم شریعت ہوتا تو نبی کریم ﷺ ضرور اس کا حکم دیتے تاکہ امت کو یہ حکم شریعت معلوم ہو جاتا۔ اسی طرح کسی میت کی روح کے ایصال ثواب کے لیے گھروں میں جمع ہو کر قرآن خوانی کی بھی کوئی دلیل نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ سلف صالح رضی اللہ عنہم بھی ایسا نہیں کیا کرتے تھے۔ مسلمان کے لیے حکم شریعت یہ ہے کہ جب اسے کوئی مصیبت پہنچے تو صبر کرے' اللہ تعالیٰ سے اجر و ثواب کی امید رکھے اور زبان سے وہ کلمات کہے جو صبر کرنے والوں کا شعار ہے یعنی یہ کہے:

«إِنَّا للهِ وَإِنَّا إِلَيْهِ رَاجِعُونَ، اَللَّهُمَّ أْجُرْنِي! فِيْ مُصِيبَتِي وَأَخْلِفْ لِي خَيْرًا مِّنْهَا»(صحيح مسلم، الجنائز، باب ما يقال عند المصيبة؟، ح:۹۱۸)

"بے شک ہم سب اللہ ہی کی ملکیت ہیں اور ہم سب اس کی طرف لوٹ کر جانے والے ہیں۔ اے اللہ! میری اس مصیبت کا مجھے اجر دے اور اسکے عوض مجھے بہتر بدل عطا فرما۔"

اہل میت کے ہاں اجتماع کرنا' قرآن خوانی کرنا' کھانے تیار کرنا اور اس طرح کے دیگر تمام امور بدعت ہیں۔

—— شیخ ابن عثیمین ——

ماتم کرنے کے بارے میں حکم شریعت

سوال میت دفن کرنے کے تین دن بعد تک اجتماع کرنا اور قرآن خوانی کرنا' جسے ماتم کہا جاتا ہے' اس کے بارے میں شرعی حکم کیا ہے؟

جواب میت کے گھر میں کھانے پینے یا قرآن خوانی کے لیے جمع ہونا بدعت ہے' اسی طرح جمع ہو کر اجتماعی طور پر دعا کرنا

بھی بدعت ہے جس کی کوئی دلیل نہیں۔ میت کے گھر صرف اس لیے جانا چاہیئے کہ ان سے تعزیت کی جائے' ان کے لیے صبر کی دعا اور میت کی مغفرت کی دعا کی جائے۔ باقی رہا ماتم کے لیے یا اجتماعی خصوصی دعا کے لیے یا قرآن خوانی کے لیے جمع ہونا تو یہ بے اصل ہے۔ اگر یہ نیک کام ہوتا تو سلف صالح یقیناً اسے سرانجام دیتے۔ رسول اللہ ﷺ سے بھی ایسا کرنا ہرگز ہرگز ثابت نہیں ہے۔ غزوۂ موتہ کے موقع پر جب نبی ﷺ کو بذریعہ وحی الٰہی حضرت جعفر بن ابی طالب' حضرت عبداللہ بن رواحہ اور حضرت زید بن حارثہ رضی اللہ عنہم کی شہادت کی خبر ملی تو آپ نے حضرات صحابہ کرام کو بھی ان کی شہادت کی بابت بتایا' ان کے لیے دعا فرمائی کہ "اللہ تعالیٰ ان سے راضی ہو۔"

آپ نے اس موقع پر نہ تو لوگوں کو جمع فرمایا' نہ دسترخوان سجایا اور نہ ماتم کا اہتمام کیا' الغرض اس موقع پر آپ نے قطعاً ایسا کوئی کام نہیں کیا' حالانکہ یہ تینوں بہترین اور افضل صحابہ کرام میں سے تھے' حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کا انتقال ہوا تو ماتم کا اہتمام نہیں کیا گیا حالانکہ آپ تمام صحابہ کرام میں سب سے افضل تھے' حضرت عمر رضی اللہ عنہ شہید ہوئے تو ان کی شہادت پر بھی صحابہ کرام نے ماتم کا اہتمام نہیں کیا' لوگ جمع ہوئے نہ ہی قرآن خوانی کی گئی' اسی طرح جب حضرت عثمان اور حضرت علی رضی اللہ عنہما اپنے اپنے دور میں شہید ہوئے تو ان کی شہادت پر بھی لوگ مخصوص دنوں میں نہ جمع ہوئے اور نہ اجتماعی دعا کا اہتمام کیا گیا اور نہ ہی ان کے لیے کھانوں کے پکانے کا انتظام کیا گیا۔

میت کے قریبی رشتہ داروں یا پڑوسیوں کے لیے یہ ضرور مستحب ہے کہ وہ کھانا پکا کر میت کے اہل خانہ کے پاس بھیجیں جیسا کہ حضرت جعفر رضی اللہ عنہ کی وفات کے موقع پر نبی کریم ﷺ نے یہ فرمایا:

«اِصْنَعُوا لآلِ جَعْفَرٍ طَعَامًا فَإِنَّهُ قَدْ أَتَاهُمْ أَمْرٌ يَشْغَلُهُمْ»(سنن أبي داود، الجنائز، باب صنعة الطعام لأهل الميت، ح:٣١٣٢)

"آل جعفر کے لیے کھانا تیار کرو کیونکہ انہیں ایک ایسی مصیبت درپیش ہے جس نے انہیں (اور کاموں سے) مشغول کر دیا ہے۔"

اہل میت مصیبت کی وجہ سے مشغول ہوتے ہیں لہٰذا اگر کھانا تیار کر کے ان کے ہاں بھیج دیا جائے تو یہ حکم شریعت کے مطابق ہے لیکن یہ طرز عمل کہ وہ پہلے ہی مصیبت میں مبتلا ہیں اور انہیں مزید پریشان کیا جائے کہ وہ لوگوں کو کھانا کھلائیں یہ خلاف سنت بلکہ بدعت ہے۔ حضرت جریر بن عبداللہ بجلی رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں:

«كُنَّا نَعُدُّ الاِجْتِمَاعَ إِلَى أَهْلِ الْمَيِّتِ وَصَنِيعَةَ الطَّعَامِ بَعْدَ دَفْنِهِ مِنَ النِّيَاحَةِ» (سنن ابن ماجه، الجنائز، باب ما جاء في النهي عن الاجتماع ... الخ، ١٦١٢ ومسند أحمد: ٢/ ٢٠٤ واللفظ له)

"ہم دفن کے بعد اہل میت کے پاس جمع ہونے اور کھانا تیار کرنے کو نوحہ شمار کیا کرتے تھے۔"

اور نوحہ حرام ہے' نوحہ کے معنی بلند آواز سے رونا ہے۔ نوحہ کی وجہ سے میت کو قبر میں عذاب ہوتا ہے لہٰذا اس سے اجتناب ضروری ہے البتہ اگر شدت غم سے آنکھیں اشکبار ہو جائیں تو اس میں کوئی حرج نہیں۔ وباللہ التوفیق۔

——— شیخ ابن باز ———

وفات کے بعد کھانے کی دعوتیں

سوال بعض لوگ اپنے اعزہ و اقارب کی وفات کے بعد کھانے کی دعوتوں کا اہتمام کرتے ہیں جن میں جانور ذبح کر کے گوشت وغیرہ خوب پکائے جاتے ہیں۔ ان دعوتوں کے اخراجات بھی متوفی کے مال ہی سے ادا کئے جاتے ہیں' تو اس کے بارے میں کیا حکم ہے؟ اگر فوت ہونے والے نے اس قسم کی دعوتوں کی وصیت کی ہو تو کیا ازروئے شریعت اس طرح کی وصیت پر عمل کرنا لازم ہے؟

جواب وفات کے بعد دعوتوں کے اہتمام کی وصیت کرنا بدعت اور عمل جاہلیت ہے۔ اگر وصیت نہ کی گئی ہو تو اہل میت کا ازخود اس قسم کی دعوتوں کا انتظام کرنا بھی جائز نہیں ہے' کیونکہ حضرت جریر بن عبداللہ بجلی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے:

«كُنَّا نَعُدُّ الاِجْتِمَاعَ إِلٰى أَهْلِ الْمَيِّتِ وَصَنِيعَةَ الطَّعَامِ بَعْدَ دَفْنِهِ مِنَ النِّيَاحَةِ» (سنن ابن ماجه، الجنائز، باب ما جاء في النهي عن الاجتماع ... الخ، ح:١٦١٢ ومسند أحمد: ٢/ ٢٠٤ واللفظ له)

''ہم دفن کے بعد اہل میت کے ہاں جمع ہونے اور کھانا تیار کرنے کو نوحہ شمار کرتے تھے۔''

اس حدیث کو امام احمد رحمۃ اللہ علیہ نے باسناد حسن بیان فرمایا ہے اور پھر یہ بات حکم شریعت کے خلاف بھی ہے' کیونکہ شریعت کا حکم تو یہ ہے کہ اہل میت کے لیے کھانا تیار کر کے ان کی دلجوئی کی جائے اس لیے وہ مصیبت کی وجہ سے مشغول ہیں' چنانچہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس جب حضرت جعفر بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کے غزوہ موتہ میں شہید ہونے کی خبر پہنچی تو آپ نے اپنے اہل خانہ سے فرمایا:

«اِصْنَعُوا لآلِ جَعْفَرٍ طَعَامًا فَإِنَّهُ قَدْ أَتَاهُمْ أَمْرٌ يَشْغَلُهُمْ»(سنن أبي داود، الجنائز، باب صنعة الطعام لأهل الميت، ح: ٣١٣٢)

''جعفر کے گھر والوں کے لیے کھانا تیار کرو کیونکہ انہیں ایک ایسی مصیبت درپیش ہے جس نے انہیں (اور کاموں سے) مشغول کر دیا ہے۔''

——— شیخ ابن باز ———

میت کا ساتواں یا چالیسواں

سوال ایک مسلمان فوت ہوا جس کے بہت سے بچے ہیں اور اس نے ان کے لیے مال بھی بہت چھوڑا ہے تو کیا وہ اس کی طرف سے ساتویں یا چالیسویں دن روٹی اور گوشت وغیرہ کی دعوت کر سکتے ہیں تاکہ اس کے ایصال ثواب کے لیے مسلمانوں کو جمع کر کے کھانا کھلا دیں؟

جواب میت کی طرف سے صدقہ کرنا درست ہے۔ فقرا و مساکین کو کھانا کھلانا' پڑوسیوں کے ساتھ حسن سلوک اور مسلمانوں کی عزت افزائی کرنا بلاشبہ نیکی کے وہ کام ہیں جن کی شریعت نے ترغیب دی ہے لیکن میت کے لیے اس کی وفات کے دن یا کسی معین مثلاً ساتویں یا چالیسویں دن بکری یا گائے یا اونٹ یا پرندوں وغیرہ کو ذبح کر کے دعوت کا اہتمام کرنا

بدعت ہے۔ اسی طرح میت کی طرف سے صدقہ کرنے کے لیے بھی کسی دن یا رات کا معین کرنا مثلاً جمعرات کا دن' جمعہ کا دن یا جمعہ کی رات وغیرہ تو یہ بھی بدعت ہے۔ سلف صالح میں اس طرح کا کوئی رواج نہ تھا' لہٰذا اس قسم کی بدعتوں کو ترک کر دینا واجب ہے' کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے:

«مَنْ أَحْدَثَ فِي أَمْرِنَا هٰذَا مَا لَيْسَ فِيهِ فَهُوَ رَدٌّ»(صحيح البخاري، الصلح، باب إذا اصطلحوا على صلح جور ... الخ، ح:٢٦٩٧)

"جو شخص ہمارے اس دین میں کوئی ایسی نئی چیز پیدا کرے جو اس میں سے نہ ہو تو وہ مردود ہے۔"

اسی طرح آپ نے یہ بھی فرمایا ہے:

«إِيَّاكُمْ وَمُحْدَثَاتِ الْأُمُورِ، فَإِنَّ كُلَّ مُحْدَثَةٍ بِدْعَةٌ، وَكُلَّ بِدْعَةٍ ضَلَالَةٌ» (سنن أبي داود، السنة، باب في لزوم السنة، ح:٤٦٠٧، واصله في صحيح مسلم)

"اپنے آپ کو (دین میں) نئی نئی باتیں پیدا کرنے سے بچاؤ' کیونکہ ہر نئی بات بدعت ہے اور ہر بدعت گمراہی ہے۔"

——— فتویٰ کمیٹی ———

میت کی طرف سے چالیسویں دن صدقہ

سوال کیا یہ جائز ہے کہ وفات کے چالیس دن بعد میت کی طرف سے صدقہ کیا جائے؟

جواب میت کی طرف سے صدقہ کرنا صحیح ہے لیکن کسی دن کی تحدید اور تعیین کرنا بدعت ہے۔ مستقل فتویٰ کمیٹی برائے بحوث علمیہ وافتاء کے پاس میت کی طرف سے چالیسویں دن محفل منعقد کرنے کے سلسلے میں ایک سوال آیا تھا جس کا کمیٹی نے حسب ذیل جواب دیا:

نبی کریم ﷺ' حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اور سلف صالح سے میت کے لیے کسی قسم کی محفل منعقد کرنا ہرگز ثابت نہیں ہے' نہ وفات کے وقت' نہ وفات کے بعد ساتویں یا چالیسویں دن اور نہ ایک سال بعد بلکہ یہ بدعت اور ایک بری عادت ہے۔ یہ قدیم مصریوں اور دیگر کافروں کی رسم ہے لہٰذا جو مسلمان اس قسم کی محفلیں منعقد کرتے ہیں انہیں سمجھانا اور اس سے منع کرنا ضروری ہے۔ ہو سکتا ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں توبہ کر کے ان بدعات اور کفار کی مشابہت سے اجتناب کر لیں۔ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا:

«بُعِثْتُ بَيْنَ يَدَيِ السَّاعَةِ بِالسَّيْفِ حَتَّى يُعْبَدَ اللّٰهُ وَحْدَهُ لَا شَرِيكَ لَهُ وَجُعِلَ رِزْقِي تَحْتَ ظِلِّ رُمْحِي وَجُعِلَ الذِّلَّةُ وَالصِّغَارُ عَلٰى مَنْ خَالَفَ أَمْرِي وَمَنْ تَشَبَّهَ بِقَوْمٍ فَهُوَ مِنْهُمْ»(مسند أحمد: ٢/ ٥٠)

"مجھے قیامت سے پہلے تلوار کے ساتھ مبعوث کیا گیا ہے حتیٰ کہ اللہ وحدہ لاشریک لہ کی عبادت کی جائے اور میرا رزق میرے نیزے کے سایہ تلے رکھا گیا ہے اور ذلت و رسوائی اس کے لیے ہے جو میرے حکم کی مخالفت کرے اور جو کسی قوم کی مشابہت اختیار کرے تو وہ اسی میں سے ہے۔"

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا:

«لَتَرْكَبُنَّ سُنَنَ مَنْ كَانَ قَبْلَكُمْ شِبْرًا بِشِبْرٍ وَذِرَاعًا بِذِرَاعٍ حَتَّى لَوْ أَنَّ أَحَدَهُمْ دَخَلَ جُحْرَ ضَبٍّ لَدَخَلْتُمْ وَحَتَّى لَوْ أَنَّ أَحَدَهُمْ جَامَعَ امْرَأَتَهُ بِالطَّرِيقِ لَفَعَلْتُمُوهُ» (صحيح البخاري، أحاديث الأنبياء، باب ما ذكر عن بني إسرائيل، ح:٣٤٥٦ والمستدرك للحاكم: ٤/ ٤٥٥ واللفظ له)

”تم پہلے لوگوں کے طریقوں کو بالکل اسی طرح مکمل طور پر اختیار کر لو گے جس طرح بالشت بالشت کے اور ہاتھ ہاتھ کے برابر ہوتا ہے حتیٰ کہ اگر ان میں سے کوئی شخص سانڈے کی بل میں داخل ہوا تو تم بھی داخل ہو گے اور اگر ان میں سے کسی نے راہ چلتے اپنی بیوی سے جماع کیا تو تم بھی ایسا کرو گے۔“

——— فتویٰ کمیٹی ———

چہلم اور ماتمی جلسہ

سوال رسم چہلم منانے کی اصل کیا ہے؟ کیا ماتمی جلسہ کرنے کی کوئی شرعی دلیل ہے؟

جواب رسم چہلم منانا فرعونیوں کی رسم ہے۔ اسلام سے قبل فرعون یہ رسم منایا کرتے تھے اور پھر ان سے دیگر قوموں میں یہ رسم پھیل کر عام ہو گئی' لہٰذا یہ ایک بہت بری بدعت ہے' اسلام میں اس کا کوئی تصور نہیں' چنانچہ نبی ﷺ کے اس ارشاد گرامی سے اس کی تردید ثابت ہوتی ہے:

«مَنْ أَحْدَثَ فِي أَمْرِنَا هٰذَا مَا لَيْسَ فِيهِ فَهُوَ رَدٌّ»(صحيح البخاري، الصلح، باب إذا اصطلحوا على صلح جور ... الخ، ح:٢٦٩٧)

”جس نے ہمارے اس دین میں کوئی ایسی نئی بات ایجاد کر لی جو اس میں سے نہ ہو تو وہ مردود ہے۔“

ثانیاً : موجودہ طریقے کے مطابق جمع ہو کر ماتمی جلسہ کرنا اور فوت ہونے والے شخص کی تعریف میں بے حد مبالغہ سے کام لینا جائز نہیں ہے' کیونکہ حضرت عبداللہ بن ابی اوفیٰ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے:

«نَهٰى رَسُولُ اللهِ ﷺ عَنِ الْمَرَاثِي»(سنن ابن ماجه، الجنائز، باب ما جاء في البكاء على الميت، ح:١٥٩٢ ومسند أحمد: ٤/٣٥٦)

”رسول اللہ ﷺ نے مرثیوں سے منع فرمایا ہے۔“

چونکہ میت کے اوصاف بیان کرنے میں اکثر فخر و غرور کا اظہار کیا جاتا ہے اور غم و حزن کی تجدید ہوتی ہے اور اگر میت کے تذکرہ کے وقت یا اس کے جنازہ کے گزرنے کے وقت تعریف کی جائے یا اس کے تعارف کے لیے اس کے کارہائے نمایاں بیان کئے جائیں تو یہ جائز ہے اور یہ ایسے ہی ہے جیسے بعض صحابہ نے شہداء احد یا دیگر صحابہ کرام کے انتقال کے وقت ان کی تعریف کی تھی۔ اسی طرح حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ لوگ ایک جنازہ لے کر گزرے جس کی صحابہ کرام نے تعریف کی تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ”واجب ہو گئی“ پھر لوگ ایک اور جنازہ لے کر گزرے تو صحابہ کرام نے اس کی برائی بیان کی تو رسول اللہ ﷺ نے پھر بھی یہی فرمایا کہ ”واجب ہو گئی“ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے عرض کیا: کیا واجب ہو گئی؟ آپ نے فرمایا:

«هٰذَا أَثْنَيْتُمْ عَلَيْهِ خَيْرًا فَوَجَبَتْ لَهُ الْجَنَّةُ، وَهٰذَا أَثْنَيْتُمْ عَلَيْهِ شَرًّا فَوَجَبَتْ لَهُ النَّارُ، أَنْتُمْ شُهَدَاءُ اللهِ فِي الأَرْضِ»(صحيح البخاري، الجنائز، باب ثناء الناس على الميت، ح:١٣٦٧ وصحيح مسلم، الجنائز، باب فيمن يثنى عليه خير أو شر من الموتى، ح:٩٤٩)

”جس کی تم نے اچھائی بیان کی اس کے لیے جنت واجب ہو گئی اور جس کی تم نے برائی بیان کی اس کے لیے جہنم واجب ہو گئی‘ تم زمین میں اللہ تعالیٰ کے گواہ ہو۔“

——— فتویٰ کمیٹی ———

عید کی رات قبروں کی زیارت

سوال ہماری بستی میں یہ رواج ہے کہ لوگ عیدالفطر اور عیدالاضحیٰ کی رات قبرستان میں جاتے ہیں‘ اپنے مردوں کی قبروں پر چراغ جلاتے اور حفاظ کو بلا کر قرآن پڑھاتے ہیں۔ کیا یہ فعل صحیح ہے؟

جواب یہ فعل باطل‘ حرام اور اللہ تعالیٰ کی لعنت کا سبب ہے‘ کیونکہ نبی کریم ﷺ نے قبروں کی زیارت کرنے والی عورتوں اور قبروں پر مسجدیں بنانے والوں اور ان پر چراغ جلانے والوں پر لعنت فرمائی ہے۔[1] عید کی رات قبروں کی زیارت بدعت ہے کیونکہ نبی کریم ﷺ سے یہ ثابت نہیں کہ آپ نے عید کی رات یا عید کے دن بطور خاص قبروں کی زیارت کی ہو‘ بلکہ آپ نے یہ فرمایا ہے:

«إِيَّاكُمْ وَمُحْدَثَاتِ الأُمُورِ، فَإِنَّ كُلَّ مُحْدَثَةٍ بِدْعَةٌ، وَكُلَّ بِدْعَةٍ ضَلَالَةٌ (وَكُلَّ ضَلَالَةٍ فِي النَّارِ)»(سنن أبي داود، السنة، باب في لزوم السنة، ح:٤٦٠٧ وما بين القوسين لفظ النسائي، صلاة العيدين، كيف الخطبة، ح:١٥٧٩)

”اپنے آپ کو دین میں نئی نئی باتیں ایجاد کرنے سے بچاؤ‘ کیونکہ دین میں ایجاد کی گئی ہر نئی بات بدعت ہے‘ ہر بدعت گمراہی ہے اور ہر گمراہی جہنم میں لے جانے کا سبب بنے گی۔“

آدمی کو چاہیئے کہ وہ اپنی عبادت اور ہر اس کام کے لیے جسے وہ تقرب الٰہی کے حصول کے لیے کرنا چاہتا ہو یہ دیکھے کہ اس کے بارے میں اللہ تعالیٰ کی شریعت میں کیا حکم ہے؟ کیونکہ اصول یہ ہے کہ عبادات میں اصل ممانعت ہے الّا یہ کہ کوئی ایسی دلیل موجود ہو جس سے معلوم ہو کہ شریعت نے اس کا حکم دیا ہے۔ سائل نے عید کی رات قبروں پر چراغ جلانے کے بارے میں جو سوال کیا ہے تو اس کا جواب یہ ہے کہ اس بات کی دلیل موجود ہے کہ یہ ممنوع اور کبیرہ گناہ ہے جیسا کہ میں ابھی بیان کر آیا ہوں کہ نبی کریم ﷺ نے قبروں کی زیارت کرنے والی عورتوں اور قبروں پر مسجدیں بنانے والوں اور ان پر چراغ جلانے والوں پر لعنت فرمائی ہے۔

——— شیخ ابن عثیمین ———

[1] سنن ابی داود‘ الجنائز‘ باب فی زیارۃ النساء القبور‘ حدیث: 3236-

جنازے کے متعلق متفرق احکام

کسی میت کو مغفور و مرحوم کہنا جائز نہیں

اَلْحَمْدُ للهِ وَالصَّلٰوةُ وَالسَّلَامُ عَلٰى عَبْدِهِ وَرَسُوْلِهِ نَبِيِّنَا مُحَمَّدٍ وَّعَلٰى آلِهِ وَصَحْبِهِ ۔ أَمَّا بَعْدُ

آج کل بعض لوگوں کی وفات کے بارے میں اخبارات میں بہت کثرت سے اعلانات شائع کرائے جاتے اور فوت شدگان کے اعزہ و اقارب سے تعزیت کے پیغامات بھی بڑی کثرت سے طبع کرائے جاتے ہیں اور اس طرح کے اعلانات و پیغامات میں میت کے نام کے ساتھ مغفور یا مرحوم یا اس کے مشابہ کچھ ایسے الفاظ استعمال کئے جاتے ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ یقینی طور پر جنتی ہے' حالانکہ جسے احکام و عقائد اسلام کا ادنیٰ سا بھی علم ہو وہ جانتا ہے کہ یہ ان امور میں سے ہے جنہیں اللہ تعالیٰ کے سوا اور کوئی نہیں جانتا۔

اہلسنت و الجماعت کا یہ عقیدہ ہے کہ کتاب اللہ یا سنت رسول اللہ ﷺ کی نص کے بغیر متعین طور پر کسی کو جنتی یا جہنمی کہنا جائز نہیں۔ کتاب اللہ سے مثال جیسے ابولہب کو جہنمی کہا گیا اور سنت رسول اللہ ﷺ سے مثال جیسے عشرہ مبشرہ کو جنتی قرار دیا گیا۔ کسی کو مغفور یا مرحوم کہنے کے بھی یہی معنی ہیں کہ ہم اس کے جنتی ہونے کی شہادت دیتے ہیں' لہٰذا مغفور و مرحوم کے الفاظ کے بجائے یہ الفاظ استعمال کرنے چاہئیں کہ غفر اللّٰه له "اللہ تعالیٰ اسے معاف فرما دے" یا رحمه اللّٰه "اللہ تعالیٰ اس پر رحم فرمائے" یا اس طرح کے دیگر دعائیہ کلمات میت کے لیے استعمال کئے جائیں۔ میں اللہ سبحانہ و تعالیٰ سے دعا کرتا ہوں کہ وہ ہم سب کو سیدھے راستے پر چلنے کی توفیق عطا فرمائے۔ وصلى الله على نبينا محمد وعلى آله وصحبه۔

—————— عبدالعزیز بن عبداللہ بن باز ——————

وفات کے وقت سورۂ یٰس پڑھنا

سوال کیا وفات کے وقت سورۂ یٰس پڑھنا صحیح ہے؟

جواب فقہاء نے وفات کے وقت اس سورت کے پڑھنے کو مستحب قرار دیا ہے۔ بعض اہل علم نے ذکر کیا ہے کہ اس سورت مبارکہ کے پڑھنے سے روح آسانی سے نکل جاتی ہے۔ فوت ہونے والے کے پاس اس سورت کی قراءت کا مستحب ہونا دراصل نبی کریم ﷺ کے حسب ذیل ارشاد پر مبنی ہے:

«اِقْرَءُوا "يٰسٓ" عَلٰى مَوْتَاكُمْ» (سنن أبي داود، الجنائز، باب القراءة عند الميت، ح:٣١٢١)

"تم اپنے مرنے والوں پر یٰس پڑھا کرو۔"

اس حدیث کو بعض اہل علم نے ضعیف قرار دیا ہے اور بعض نے اسے قابل استدلال قرار دیا ہے۔ اگر اس سورت

مبارکہ کو پڑھ لیا جائے تو امید ہے کہ اس میں کوئی حرج نہیں ہو گا اور اگر اسے نہ پڑھا جائے اور میت کو صرف ”لا الہ الا اللہ“ کی تلقین پر اکتفاء کر لیا جائے تاکہ دنیا سے رخصت ہوتے وقت اس کی زبان سے ادا ہونے والے آخری الفاظ لا الہ الا اللہ ہوں تو یہ بھی بہت اچھا ہے۔

——— شیخ ابن عثیمین ———

اخبارات میں وفات کی خبر شائع کرنا

سوال اخبارات میں وفات کی خبر شائع کرنے کے بارے میں کیا حکم ہے' بعض اوقات فوت شدہ کی تصویر بھی شائع کی جاتی ہے؟

جواب خیر و بھلائی اور نیکی کے کاموں میں مشہور لوگوں کی اخبارات میں وفات کی خبر شائع کرنے میں کوئی حرج نہیں تاکہ خبر پڑھنے والے مسلمان اس کے لیے رحمت اور مغفرت کی دعا کر سکیں۔ لیکن فوت شدگان کی ایسی تعریف کرنا جس کے وہ مستحق نہ ہوں جائز نہیں' کیونکہ یہ تو صریحاً جھوٹ ہے اور نہ کسی کے بارے میں یقینی طور پر یہ کہنا جائز ہے کہ وہ قطعی جنتی ہے' کیونکہ اہلسنّت کا یہ عقیدہ ہے کہ کسی متعین آدمی کے بارے یہ کہنا جائز نہیں کہ وہ قطعی جنتی یا جہنمی ہے' ہاں البتہ ہم نیک لوگوں کے بارے میں جنت کی امید رکھتے ہیں اور گناہ گاروں کے بارے میں یہ خوف کہ وہ جہنم رسید ہوں گے۔

——— شیخ ابن جبرین ———

موت کے بعد میت پر نوحہ خوانی

سوال کیا میت پر رونا جائز ہے؟ اگر رونے میں نوحہ کرنا' رخسار پیٹنا اور کپڑے پھاڑنا بھی شامل ہو تو کیا میت پر اس کا کوئی اثر پڑتا ہے؟

جواب میت کی بے جا تعریف کرنا' نوحہ کرنا' کپڑے پھاڑنا' رخساروں کو پیٹنا اور اس طرح کی دوسری باتیں جائز نہیں ہیں' کیونکہ ”صحیحین“ میں ابن مسعود سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا:

«لَيْسَ مِنَّا مَنْ لَطَمَ الْخُدُودَ وَشَقَّ الْجُيُوبَ، وَدَعَا بِدَعْوَى الْجَاهِلِيَّةِ» (صحيح البخاري، الجنائز، باب لَيْسَ مِنَّا مَنْ شَقَّ الجيوب، ح: ١٢٩٤)

”وہ ہم میں سے نہیں ہے جو رخساروں کو پیٹے' گریباں پھاڑے اور زمانۂ جاہلیت کے کلمات کہے۔“

یہ بھی رسول اللہ ﷺ سے ثابت ہے کہ آپ نے نوحہ کرنے والی اور نوحہ سننے والی پر لعنت فرمائی ہے [1] اور یہ بھی آپ نے فرمایا ہے:

«اَلْمَيِّتُ يُعَذَّبُ فِي قَبْرِهِ بِمَا نِيحَ عَلَيْهِ»(صحيح البخاري، الجنائز، باب ما يكره من النياحة على الميت، ح: ١٢٩٢)

”نوحہ کی وجہ سے میت کو قبر میں عذاب ہوتا ہے۔“

اور ایک روایت میں الفاظ یہ ہیں:

---

[1] صحیح مسلم' الجنائز باب التشدید فی النیاحۃ' حدیث: 934-

«إِنَّ الْمَيِّتَ لَيُعَذَّبُ بِبُكَاءِ أَهْلِهِ عَلَيْهِ»(صحيح البخاري، باب قول النبي ﷺ يعذب الميت . . . الخ، ح:١٢٨٦ وصحيح مسلم، الجنائز، باب الميت يعذب ببكاء أهله عليه، ح:٩٢٧)

"میت کو اس کے گھر والوں کے رونے کی وجہ سے عذاب ہوتا ہے۔"

——— فتویٰ کمیٹی ———

میت کو گھر والوں کے رونے سے عذاب ہوتا ہے

سوال کیا میت کو اس کے گھر والوں کے رونے کی وجہ سے عذاب ہوتا ہے؟

جواب ہاں میت کو اس کے گھر والوں کے رونے کی وجہ سے عذاب ہوتا ہے' کیونکہ یہ نبی ﷺ سے ثابت ہے۔[1] علماء رحمهم الله کا اس حدیث کے مفہوم کے بارے میں اختلاف ہے۔ بعض نے کہا کہ اس سے مراد کافر ہے اور بعض نے کہا کہ اس سے مراد وہ ہے جو اپنے گھر والوں کو اپنی موت پر رونے کی وصیت کر جائے اور بعض نے کہا کہ اس سے مراد وہ ہے جسے یہ معلوم ہو کہ اس کے گھر والے اس کی وفات کے بعد روئیں گے اور وہ انہیں منع نہ کر کے جائے' کیونکہ اس کی خاموشی گویا اس کی رضامندی ہے اور جو شخص کسی برائی پر راضی ہو وہ ایسے ہی ہے جیسے گویا خود اسے کر رہا ہو۔ اس حدیث کے مفہوم کے بارے میں یہ تین اقوال ہیں لیکن یہ تینوں ظاہر حدیث کے مخالف ہیں' کیونکہ حدیث میں ان میں سے کوئی بات مذکور نہیں' لہٰذا حدیث کو ظاہر پر محمول کرتے ہوئے ہم یہ کہیں گے کہ میت کو اس کے گھر والوں کے رونے سے عذاب ہوتا ہے لیکن اس عذاب سے مراد سزا نہیں ہے' کیونکہ اس نے گناہ نہیں کیا کہ اسے اس کی سزا دی جائے بلکہ اس عذاب سے مراد رونے کی وجہ سے دکھ اور تکلیف ہے۔ اور دکھ تکلیف کے بارے میں یہ ضروری نہیں کہ سزا ہی ہو جیسا کہ نبی ﷺ نے سفر کے بارے میں فرمایا ہے:

«قِطْعَةٌ مِّنَ الْعَذَابِ»(صحيح البخاري، العمرة، باب السفر قطعة من العذاب، ح:١٨٠٤)

"وہ عذاب کا ایک ٹکڑا ہے۔"

حالانکہ سفر سزا ہے نہ عذاب لیکن غم و فکر اور قلق و اضطراب ضرور ہے۔ رونے کی وجہ سے میت کیلئے قبر میں عذاب بھی اسی قسم کا ہے کہ اس سے اسے غم و فکر اور قلق و اضطراب ہوتا ہے اگرچہ یہ اس کے اپنے کسی گناہ کی سزا نہیں ہے۔

——— شیخ ابن عثیمین ———

بغیر ضرورت کچھ دنوں کے لیے میت کے منہ کو ننگا رکھنا

سوال بغیر ضرورت کے ایک یا دو یا تین یا اس سے بھی زیادہ دنوں تک میت کے منہ کو ننگا رکھنے کے بارے میں کیا حکم ہے تاکہ دور و نزدیک کے سب لوگ اس کا دیدار کر سکیں؟ فوت شدہ' مرد ہو یا عورت' کے چہرہ کو روزانہ دیکھنے کے بارے میں کیا حکم ہے؟ کیا منہ کو ننگا رکھنا اسلامی تعلیمات کے منافی تو نہیں؟

---

[1] صحیح بخاری' الجنائز' باب قول النبی صلی اللہ یعذب المیت ..... الخ' حدیث : 1286 - 1287 و صحیح مسلم' الجنائز' باب المیت یعذب ببکاء اھلہ علیہ' حدیث : 927-

جواب **اولاً** : سنت یہ ہے کہ انسان جب فوت ہو جائے تو چہرے سمیت اس کے سارے جسم کو ڈھانپ دیا جائے چنانچہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے:

«أَنَّ رَسُولَ اللهِ ﷺ حِينَ تُوُفِّيَ سُجِّيَ بِبُرْدٍ حِبَرَةٍ»(صحيح البخاري، اللباس، باب البرود والحبر والشملة، ح:٥٨١٤ وصحيح مسلم، الجنائز، باب تسجية الميت، ح:٩٤٢ ومسند أحمد:٨٩/٦، ١٥٣)

"رسول اللہ ﷺ جب وفات فرما گئے تو آپ کے جسد اطہر کو ایک (یمنی) چادر سے ڈھانپ دیا گیا۔"

صحابہ کرام میں بھی یہی امر معروف تھا اور یہ عہد نبوی کے عمل ہی کا تسلسل تھا' امام نووی شرح مسلم میں فرماتے ہیں کہ "اس پر پوری امت کا اجماع ہے کہ میت کو ڈھانپ دیا جائے اور اس میں حکمت یہ ہے کہ میت کی حفاظت کی جائے اور اس کی صورت میں اگر کوئی تبدیلی رونما ہو تو اسے آنکھوں سے اوجھل رکھا جائے اور میت کا جن کپڑوں میں انتقال ہوا ہو انہیں اتارنے کے بعد اسے ڈھانپا جائے تاکہ ان کپڑوں کی وجہ سے اس کے جسم میں کوئی تبدیلی نہ آئے۔"

اس سے معلوم ہوا کہ مذکورہ سوال میں ایک یا ایک سے زیادہ ایام تک میت کا چہرہ کھلا رکھنے کے بارے میں جو پوچھا گیا ہے تاکہ لوگ اس کا دیدار کر سکیں' تو یہ اسلامی طریقے اور مسلمانوں کے اجماع کے خلاف ہے۔ اگر میت کے گھر والے تجہیز و تدفین میں تاخیر کیے بغیر اس کا چہرہ کھلا رکھ کر دیکھنا چاہیں تو اس میں کوئی حرج نہیں' کیونکہ جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہما سے روایت ہے:

«لَمَّا قُتِلَ أَبِي جَعَلْتُ أَكْشِفُ الثَّوْبَ عَنْ وَجْهِهِ أَبْكِي وَيَنْهَوْنِي عَنْهُ وَالنَّبِيُّ ﷺ لاَ يَنْهَانِي»(صحيح البخاري، الجنائز، باب الدخول علي الميت بعد الموت... الخ، ح:١٢٤٤ وصحيح مسلم، فضائل الصحابة، باب من فضائل عبدالله بن عمرو بن حرام ... الخ، ح:٢٤٧١)

"جب میرے والد شہید ہو گئے تو میں ان کے چہرے سے کپڑے کو ہٹاتا اور روتا تھا' لوگ مجھے اس سے منع کرتے تھے لیکن نبی کریم ﷺ مجھے اس سے منع نہیں فرماتے تھے۔"

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے:

«رَأَيْتُ رَسُولَ اللهِ ﷺ يُقَبِّلُ عُثْمَانَ بْنَ مَظْعُونٍ وَهُوَ مَيِّتٌ حَتَّى رَأَيْتُ الدُّمُوعَ تَسِيلُ»

(سنن أبي داود، الجنائز، باب في تقبيل الميت، ح:٣١٦٣)

"میں نے رسول اللہ ﷺ کو دیکھا کہ آپ حضرت عثمان بن مظعون کو بوسہ دے رہے تھے جب کہ وہ فوت ہو چکے تھے اور میں نے آپ کے آنسو بہتے ہوئے بھی دیکھے۔"

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا ہی سے روایت ہے کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ آئے تو وہ سیدھے وہاں تشریف لے آئے جہاں نبی کریم ﷺ کی میت پاک دھاری دار (یمنی) چادر سے ڈھانپ کر رکھی ہوئی تھی' انہوں نے چہرہ اقدس سے کپڑا ہٹایا اور جھک کر بوسہ دیا اور پھر رونے لگے اور فرمایا:

«بِأَبِي أَنْتَ وَأُمِّي يَا نَبِيَّ اللهِ، لاَ يَجْمَعُ اللهُ عَلَيْكَ مَوْتَتَيْنِ»(صحيح البخاري، الجنائز، باب الدخول على الميت بعد الموت إذا أدرج في أكفانه، ح:١٢٤١، ١٢٤٢)

"اے اللہ کے نبی! میرے ماں باپ آپ پر نثار ہوں اللہ تعالیٰ آپ پر دو موتیں جمع نہیں فرمائے گا۔"

ثانیاً : جب یقین ہو جائے کہ موت واقع ہو چکی ہے تو پھر سنت یہ ہے کہ تجہیز میں جلدی کی جائے' کیونکہ اس طرح میت

میں کوئی تبدیلی بھی رونما نہ ہو گی کہ لوگ اس سے نفرت کریں۔ سنن ابی داود میں روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا:

«إِنِّي لاَ أُرٰى طَلْحَةَ إِلاَّ قَدْ حَدَثَ فِيهِ الْمَوْتُ، فَآذِنُونِي بِهِ وَعَجِّلُوا، فَإِنَّهُ لاَ يَنْبَغِي لِجِيفَةِ مُسْلِمٍ أَنْ تُحْبَسَ بَيْنَ ظَهْرَانَيْ أَهْلِهِ»(سنن أبي داود، الجنائز، باب تعجيل الجنازة ... الخ، ح:٣١٥٩)

"میں دیکھ رہا ہوں کہ طلحہ بن براء رضی اللہ عنہ پر موت طاری ہو چکی ہے' لہٰذا جب وہ وفات پا جائیں تو مجھے اس کی اطلاع کر دینا اور ان کی تیاری میں جلدی کرنا' کیونکہ مسلمان کی میت کو اس کے گھر والوں کے پاس زیادہ دیر تک نہیں رکھنا چاہیے۔"

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

«إِذَا مَاتَ أَحَدُكُمْ فَلاَ تَحْبِسُوهُ وَأَسْرِعُوا بِهِ إِلٰى قَبْرِهِ»(المعجم الكبير للطبراني:١٢/ ٤٤٤، ح:١٣٦١٣)

"جب تم میں سے کوئی فوت ہو جائے تو پھر اسے زیادہ دیر تک نہ روکو بلکہ اسے جلد اس کی قبر میں پہنچا دو۔"

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا:

«أَسْرِعُوا بِالْجَنَازَةِ، فَإِنْ تَكُ صَالِحَةً، فَخَيْرٌ تُقَدِّمُونَهَا إِلَيْهِ، وَإِنْ تَكُ سِوٰى ذٰلِكَ، فَشَرٌّ تَضَعُونَهُ عَنْ رِقَابِكُمْ»(صحيح البخاري، الجنائز، باب السرعة بالجنازة، ح:١٣١٥ وصحيح مسلم، الجنائز، باب الاسراع بالجنازة، ح:٩٤٤)

"جنازے میں جلدی کرو! اس لیے کہ اگر میت نیک ہے تو تم اسے خیر و بھلائی کی طرف لے جاتے ہو اور اگر وہ نیک نہیں ہے تو برائی کو جلد اپنے کندھوں سے اتار پھینکتے ہو۔"

اس حدیث میں بھی یہ تلقین کی گئی ہے کہ تجہیز و تدفین میں جلدی کرنی چاہیے تاکہ میت کو جلد خیرو بھلائی کی طرف لے جایا جائے یا جلد اس سے چھٹکارا حاصل کر لیا جائے' ہاں اس قدر انتظار جائز ہے کہ وہ لوگ جمع ہو جائیں جو جنازہ پڑھیں' اسے الوداع کریں اور اس کے لیے مغفرت و رحمت کی دعا کریں' بشرطیکہ انتظار کی وجہ سے تاخیر نہ ہو۔ اس سے معلوم ہوا کہ بلاضرورت ایک یا ایک سے زیادہ دنوں تک میت کے دفن میں تاخیر کرنا رسول اللہ ﷺ کی سنت کے خلاف ہے لہٰذا ان لوگوں کو نصیحت کرنی چاہیے جو تجہیز و تدفین میں تاخیر کرتے اور لوگوں کے دیدار کے لیے میت کے منہ کو کھلا رکھتے ہیں اور انہیں بتانا چاہیے کہ ان مسائل میں رسول اللہ ﷺ کی سنت اور آپ کا طریقہ کیا ہے؟ ہو سکتا ہے کہ اس طرح سمجھانے سے اللہ تعالیٰ انہیں سیدھے راستے پر چلنے کی توفیق عطا فرما دے۔

—— فتویٰ کمیٹی ——

طبی مقصد کی خاطر مسلمان کا پوسٹ مارٹم کرنا

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ وَحْدَهُ وَصَلَّى اللّٰهُ وَسَلَّمَ عَلٰى مَنْ لاَّ نَبِيَّ بَعْدَهُ، مُحَمَّدٍ وَّعَلٰى آلِهِ وَصَحْبِهِ۔ وَبَعْدُ

کبار علماء کونسل نے اپنے نویں اجلاس میں جو طائف شہر میں' شعبان ۱۳۹۶ھ میں منعقد ہوا' وزیر عدل کے خط حوالہ : ۲/۳۲۲۱خ کا جائزہ لیا جو کہ وکیل وزارت خارجہ کے خط حوالہ : ۲/۱/۳۴ ۳۴۴۶/۲/۱۳۴/۳ مورخہ ۱۳۹۵/۸/۶ھ پر مبنی تھا اور جس کے ساتھ سفارت خانہ مالیزیا جدہ کی یادداشت بھی منسلک تھی جس میں یہ استفسار کیا گیا ہے کہ سعودی عرب کا' مسلمان میت کے پوسٹ مارٹم کے بارے میں کیا رائے اور موقف ہے جو طبی اغراض و مقاصد اور مصالح پر مبنی ہو؟

اس اجلاس میں اس تحقیق کا بھی جائز لیا گیا جو اس موضوع پر بحوث علیہ وافتاء کی فتویٰ کمیٹی نے پیش کی تھی اور جس کے مطالعہ سے معلوم ہوا کہ یہ موضوع تین حصوں میں تقسیم ہے:

(۱) کسی فوجداری دعویٰ کی تحقیق کی غرض سے پوسٹ مارٹم۔

(۲) وبائی امراض کی تحقیق کی غرض سے پوسٹ مارٹم' تاکہ اس کی روشنی میں وبائی امراض سے بچنے کے لیے احتیاطی تدابیر اختیار کی جا سکیں۔

(۳) تعلیم و تعلم یعنی اعلیٰ مقاصد کے لیے پوسٹ مارٹم۔

افکار و آراء اور اس تحقیق کے مطالعہ کے بعد جو کمیٹی نے پیش کی تھی' جس کی طرف اوپر اشارہ کیا جا چکا ہے' کونسل نے طے کیا کہ:

پہلی اور دوسری صورت میں پوسٹ مارٹم جائز ہے' کیونکہ ان صورتوں میں امن و عدل اور معاشرے کو وبائی امراض سے بچانے کی بہت سی مصلحتیں کار فرما ہیں اور اس میں اس میت کی بے حرمتی کا جو پہلو ہے' جس کا پوسٹ مارٹم کیا جا رہا ہو' وہ ان یقینی اور بہت سی مصلحتوں کے مقابلہ میں چھپ جاتا ہے' اس لیے ان دو مقاصد کے لیے کونسل بالاتفاق پوسٹ مارٹم کو جائز قرار دیتی ہے' خواہ وہ لاش جس کا پوسٹ مارٹم کیا جا رہا ہو کسی معصوم انسان کی ہو یا غیر معصوم کی۔

باقی رہی تیسری قسم یعنی تعلیمی مقاصد کے لیے پوسٹ مارٹم' تو شریعت اسلامیہ پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کا مقصد یہ ہے کہ مصالح کو زیادہ سے زیادہ حاصل کیا جائے اور مفاسد کو کم سے کم کیا جائے' خواہ اس کے لیے دو ضرر رساں چیزوں میں سے اس کا ارتکاب کرنا پڑے جس کا ضرر کم ہو اور اسے ختم کیا جا سکے جس کا نقصان زیادہ ہو اور جب مصالح میں تعارض ہو تو اسے اختیار کر لیا جائے گا جو راجح ہو' حیوانی لاشوں کا پوسٹ مارٹم انسانی لاشوں کے پوسٹ مارٹم کا بدل نہیں ہو سکتا اور پوسٹ مارٹم میں چونکہ بہت سی مصلحتیں ہیں جو آج کی علمی ترقی کے باعث مختلف طبی مقاصد کے لیے بہت کار آمد ہیں' لہٰذا کونسل کی رائے میں فی الجملہ انسانی لاش کا پوسٹ مارٹم جائز ہے لیکن اسلامی شریعت نے چونکہ مسلمان کو موت کے بعد بھی اسی طرح عزت و تکریم سے نوازا ہے جس طرح زندگی میں اسے عزت و شرف سے سرفراز ہے۔ جیسا کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے:

«كَسْرُ عَظْمِ الْمَيِّتِ كَكَسْرِهِ حَيًّا» (سنن أبي داود، الجنائز، باب في الحفار يجد العظم ... الخ، ح: ٣٢٠٧)

''مردہ کی ہڈی کو توڑنا ایسا ہی ہے جیسا کہ زندہ کی ہڈی کو توڑنا۔''

اور پوسٹ مارٹم چونکہ عزت و تکریم کے منافی اور اس میں انسانی لاش کی بے حرمتی ہے اور پوسٹ مارٹم کی ضرورت چونکہ غیر معصوم لاشوں کے آسانی سے میسر آ جانے کی وجہ سے پوری ہو جاتی ہے لہٰذا کونسل کی رائے یہ ہے کہ اس مقصد

کے لیے غیر معصوم لاشوں کو استعمال کرنے پر اکتفاء کیا جائے اور معصوم مردوں کی لاشوں کو استعمال نہ کیا جائے۔ واللہ الموفق وصلی اللہ علی نبینا محمد وعلی آلہ وصحبہ وسلم۔

ــــــــــ ہیئۃ کبار العلماء ــــــــــ

تعلیمی مقاصد کے لیے مردہ لاش کا پوسٹ مارٹم

سوال میں نے میڈیکل کالج قاہرہ کے پوسٹ مارٹم والے کمرہ میں مردوں' عورتوں اور بچوں کی کئی لاشیں دیکھی ہیں' تعلیمی مقاصد کے لیے جن کا پوسٹ مارٹم کیا جاتا اور اعضاء کو کاٹا جاتا ہے۔ کیا اس ضرورت کے پیش نظر شرعاً پوسٹ مارٹم جائز ہے؟ کیا مرد عورت کا اور عورت مرد کا پوسٹ مارٹم کر سکتی ہے؟ کیا انسانی اعضاء کو کاٹنا جائز ہے؟

جواب میت اپنی زندگی میں جب معصوم ہو خواہ وہ مسلمان ہو یا کافر اور خواہ وہ مرد ہو یا عورت تو اس کا پوسٹ مارٹم کرنا جائز نہیں' کیونکہ اس میں میت سے بدسلوکی اور اس کی بے حرمتی ہے اور رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے:

«كَسْرُ عَظْمِ الْمَيِّتِ كَكَسْرِهِ حَيًّا» (سنن أبي داود، الجنائز، باب في الحفار يجد العظم ... الخ، ح:٣٢٠٧)

"مردہ کی ہڈی کو توڑنا ایسا ہے جیسا کہ زندہ کی ہڈی کو توڑنا۔"

ہاں البتہ اگر میت غیر معصوم ہو مثلاً مرتد اور حربی وغیرہ تو طبی مصلحت کے لیے اس کے پوسٹ مارٹم میں مجھے کوئی حرج معلوم نہیں ہوتا۔ واللہ سبحانہ وتعالی اعلم۔

ــــــــــ شیخ ابن باز ــــــــــ

مردہ نفع نہیں پہنچا سکتا اور نہ سن کر نفع اٹھا سکتا ہے

سوال کیا مُردہ سلام اور کلام کو سنتا اور اس کے پاس جو کیا جائے اسے سمجھتا ہے؟

جواب اس مسئلہ میں اہل علم و سنت کا اختلاف ہے۔ صحیح حدیث میں ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا:

«إِنَّ الْعَبْدَ إِذَا وُضِعَ فِي قَبْرِهِ، وَتَوَلَّى عَنْهُ أَصْحَابُهُ، إِنَّهُ لَيَسْمَعُ قَرْعَ نِعَالِهِمْ»(صحيح البخاري، الجنائز، باب الميت يسمع خفق النعال، ح:١٣٣٨ وصحيح مسلم، الجنة، باب عرض مقعد الميت من الجنة ... الخ، ح:٢٨٧٠ واللفظ له)

"بلاشبہ بندے کو قبر میں رکھ دیا جاتا ہے (دفن کر دیا جاتا ہے) اور اسے دفن کرنے والے آ رہے ہوتے ہیں تو وہ ان کے جوتوں کی آواز کو سنتا ہے۔"

رسول اللہ ﷺ نے یہ بھی فرمایا ہے:

«مَا مِنْ عَبْدٍ يَمُرُّ عَلَى قَبْرِ رَجُلٍ يَعْرِفُهُ فِي الدُّنْيَا فَيُسَلِّمُ عَلَيْهِ إِلاَّ عَرَفَهُ وَرَدَّ عَلَيْهِ السَّلاَمَ»(العلل المتناهية:٢/ ٤٢٩، ح:١٥٢٣ والاستذكار لابن عبدالبر، ح:١/ ٢٣٤)

"جب کوئی (مسلمان) بندہ کسی ایسے (مسلمان) آدمی کی قبر کے پاس سے گزرتا ہے' جسے وہ دنیا میں جانتا تھا اور

اسے سلام کہتا ہے تو وہ (قبر والا) اسے پہچان لیتا ہے اور اس کے سلام کا جواب دیتا ہے۔"
اس حدیث کو ابن عبدالبر نے صحیح کہا ہے اور ابن قیم نے اسے "کتاب الروح" میں ذکر کیا اور اس پر کوئی تعاقب نہیں کیا..
اس کی تائید اس سے بھی ہوتی ہے کہ رسول اللہ ﷺ جب قبرستان تشریف لے جاتے تو فرماتے:
«اَلسَّلَامُ عَلَيْكُمْ دَارَ قَوْمٍ مُّؤْمِنِينَ» (صحيح مسلم، الجنائز، باب ما يقال عند دخول القبور ... الخ، ح: ٩٧٤)
"اے مومنوں کے گھر والو! تم پر سلامتی ہو۔"
بہرحال میت خواہ سنتی بھی ہو وہ کسی دوسرے کو نفع نہیں پہنچا سکتی یعنی اگر آپ کسی کی قبر کے پاس آکر اللہ تعالیٰ سے دعاء کریں (تو بھی) یہ ناممکن ہے کہ میت آپ کو کوئی نفع پہنچا سکے اور نہ میت اس صورت میں کوئی نفع پہنچا سکتی ہے کہ آپ اس سے دعا کریں..... کسی کی قبر کے پاس اس اعتقاد کے ساتھ اللہ تعالیٰ سے دعا کرنا کہ اس سے اللہ تعالیٰ دعا کو سن لیتا ہے یہ جھوٹ اور بدعت ہے۔ جبکہ کسی صاحب قبر کو پکارنا اور خاص اسی ہی سے دعا کرنا ایسا شرک اکبر ہے کہ جس کا مرتکب ملت اسلامیہ سے خارج ہو جاتا ہے۔

—— شیخ ابن عثیمین ——

خود کشی کرنے والے کو غسل دینا

سوال کیا خود کشی کرنے والے کو بھی غسل دیا جائے گا اور اس کی نماز جنازہ پڑھی جائے گی؟

جواب خود کشی کرنے والے کو غسل دیا جائے گا' اس کا جنازہ بھی پڑھا جائے گا اور اسے مسلمانوں کے ساتھ ہی دفن کیا جائے گا' اس لیے کہ وہ گناہ گار ہے' کافر نہیں' کیونکہ خود کشی معصیت ہے کفر نہیں' لہٰذا جو شخص خود کشی کرے' والعیاذ باللہ اسے غسل دیا جائے گا' اس کی نماز جنازہ پڑھی جائے گی اور اسے کفن دیا جائے گا لیکن معروف عالم دین اور ایسے لوگوں کو جن کی خاص اہمیت ہو' چاہیئے کہ اس کی نماز جنازہ نہ پڑھیں تاکہ یہ گمان نہ ہو کہ وہ اس کے عمل سے راضی ہیں' اس لیے معروف عالم دین' بادشاہ' قاضی' چیئرمین بلدیہ یا امیر شہر اس سے ناراضی کا اظہار کرتے ہوئے جنازہ ترک کر دیں اور یہ اعلان کر دیں کہ خود کشی کرنا غلط ہے تو یہ ایک اچھی بات ہے لیکن بعض نمازیوں کو اس کی نماز جنازہ پڑھ لینی چاہیئے۔

—— شیخ ابن باز ——

ایک جھوٹی کہانی

اخبار "عکاظ" شمارہ ۵۹۷۷ مجریہ ۱۴۰۲/۱۲/۲۴ھ کے ص ۲۰ پر کویتی اخبار "سیاست" کے حوالہ سے محمد مصری نامی ایک شخص کے بارے میں ایک جھوٹی کہانی شائع ہوئی ہے جس کے مطابق اس شخص نے یہ دعویٰ کیا ہے کہ وہ بدھ کے دن بے ہوش ہو گیا جس کی وجہ سے یہ سمجھ لیا گیا کہ وہ فوت ہو گیا ہے اور بدھ کے دن ہی اسے دفن کر دیا گیا لیکن جمعہ کے دن اسے قبر سے باہر نکال لیا گیا اور اس نے بہت سی عجیب و غریب قسم کی چیزیں دیکھیں ..... الخ۔
یہ دیکھتے ہوئے کہ یہ کہانی کہیں بعض لوگوں میں رواج نہ پا جائے اور وہ اسے صحیح نہ سمجھنے لگ جائیں' میں نے مناسب

سمجھا کہ یہ واضح کر دوں کہ یہ کہانی بالکل باطل اور محض جھوٹی ہے جسے کوئی عقل مند آدمی بھی سچی کہانی نہیں سمجھ سکتا۔ معلوم ہوتا ہے کہ اسے خود اس محمد مصری نامی شخص نے یا کسی اور نے اپنے گھٹیا اغراض و مقاصد کے لیے گھڑا ہے۔ ہر شخص جانتا ہے کہ جو اپنے گھر والوں کی بات سن رہا ہو' ڈاکٹر کی بات سن رہا ہو اور اپنے جنازہ کے ساتھ جانے والوں کی بات سن رہا ہو تو ڈاکٹر یا کسی اور سے یہ بات مخفی نہیں رہ سکتی کہ یہ انسان مردہ نہیں بلکہ زندہ ہے' پھر ایک طرف تو یہ بیان کر رہا ہے کہ یہ بے ہوش تھا لیکن پھر اسے وہ سب کچھ یاد بھی ہے جو اس کے گردوپیش میں ہوا اور پھر اپنے بندوں کے بارے میں اللہ تعالیٰ کی یہ بھی سنت ہے کہ جو شخص قبر جیسی بند اور تنگ جگہ میں اتنی مدت گزارے اور وہ زندہ بھی ہو تو اس کے بعد زندہ نہیں رہ سکتا۔ نیز شریعت کی روشنی سے یہ بات واضح ہے کہ اگر کسی زندہ انسان کو قبر میں رکھ دیا جائے تو اس کے پاس دو فرشتے نہیں آتے' کیونکہ یہ دو فرشتے تو اس انسان کے پاس آتے ہیں جو واقعی فوت ہو چکا ہو اور اللہ سبحانہ و تعالیٰ کو تو سب زندوں اور مردوں کا علم ہے اور وہی میت کے پاس سوال کرنے کے لیے دو فرشتے بھیجتا ہے' پھر اس کذاب آدمی نے فرشتوں کے بارے میں جو کچھ بیان کیا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ دو فرشتے نہیں بلکہ دو انسان ہیں اور پھر یہ بھی یاد رہے کہ یہ دو فرشتے انسان کو اس کی نیکیوں اور برائیوں کے بارے میں نہیں بتاتے بلکہ اس سے رب' دین اور نبی ﷺ کے بارے میں سوال کرتے ہیں۔ اگر میت صحیح جواب دے دے تو وہ حصول جنت میں کامیاب ہے اور اگر جواب صحیح نہ دے سکے تو پھر اسے عذاب ہوتا ہے اور پھر اس کے بعد اس نے جو عجیب و غریب مناظر بیان کئے ہیں اس سے وہ صرف اپنی اس باطل اور جھوٹی کہانی کو مشہور کرنا اور لوگوں کو یہ باور کرانا چاہتا ہے کہ وہ نجات یافتہ لوگوں میں سے ہے تاکہ لوگ اس سے محبت و شفقت کا سلوک کریں اور یہ جو کچھ ان سے طلب کرے وہ اس کو دے دیں یا مانگے بغیر ہی اسے دینا شروع کر دیں۔ یہ بھی ممکن ہے کہ اس کا مقصد حصول شہرت ہو تاکہ لوگ اسے اپنے پاس بلا بلا کر اس کے مشاہدات کے بارے میں اس سے پوچھیں اور اس طرح اسے اپنے مقاصد میں کامیابی حاصل ہو۔ اس کی جہالت کی ایک دلیل یہ بھی ہے کہ اس نے اس جھوٹی کہانی کو بیان کرتے ہوئے یہ بھی کہا ہے کہ ''صدف کی مشیت سے میرے گھر والے میری قبر کی زیارت کے لیے آئے۔'' یہ بات جائز نہیں' کیونکہ صدف کی کوئی مشیت نہیں ہوتی' صحیح بات یہ ہے کہ یوں کہا جائے کہ ''اللہ تعالیٰ کی مرضی و مشیت سے۔'' خلاصہء کلام یہ کہ یہ ایک جھوٹی اور من گھڑت کہانی ہے جس میں ذرہ بھر صداقت نہیں جیسا کہ سیاق و سباق سے اور اس کی تفصیل سننے سے واضح ہوتا ہے۔ ہمارے موقر اخبارات و رسائل کو بھی اس طرح کی خرافات شائع کرنے سے پرہیز کرنا چاہیئے۔ ہم اللہ تعالیٰ سے دعا کرتے ہیں کہ وہ ہمارے اخبارات کو ہر قسم کے جھوٹ اور باطل سے پاک کر دے' مکاروں اور فریب کاروں کو ذلیل و رسوا کرے' مسلمانوں کو ان کے شر سے محفوظ رکھے اور تمام مسلمانوں کو دین میں فقاہت و ثابت قدمی عطا فرمائے۔ انه سبحانه خير مسئول' وصلى الله على نبينا محمد و آله وصحبه وسلم۔

—— عبدالعزیز بن عبداللہ بن باز ——

کیا یہ ضروری ہے کہ مسلمانوں کی قبریں الگ ہونی چاہئیں؟

سوال کیا یہ ضروری ہے کہ مسلمانوں کی قبریں عیسائیوں یا دیگر اہل مذاہب کی قبروں سے الگ ہوں یا کسی تمیز کے بغیر سب قبریں ایک جگہ بھی ہو سکتی ہیں؟

جواب یہ ضروری ہے کہ مسلمانوں کی قبریں یہود ونصاریٰ' مشرکین' ملحدین اور دیگر کافروں کی قبروں سے بالکل الگ تھلگ ہوں جیسا کہ عہد نبوی سے آج تک مسلمانوں میں یہی رواج ہے اور یہ اس لیے بھی ضروری ہے کہ کافروں کی قبروں کے مقابلہ میں مسلمانوں کی قبروں کی ایک خاص حرمت بھی ہے۔ مسلمانوں کی قبریں کافروں کی قبروں سے اس لیے الگ ہونا بھی ضروری ہیں تاکہ کافروں کے عذاب سے مسلمانوں کو ایذاء نہ پہنچے اور پھر زیارت کے لیے آنے والے نے چونکہ صرف مسلمانوں ہی کو سلام کہنا اور ان کے لیے دعا کرنا ہوتا ہے اس لیے بھی ان کی قبریں کافروں کی قبروں سے علیحدہ ہونی چاہئیں۔

——— فتویٰ کمیٹی ———

قبروں کی حفاظت کے لیے درختوں کو کاٹ دینا

سوال میرے گاؤں کے قبرستان میں رمث کے بعض درخت ہیں جن کے نیچے چوہوں کی بلیں ہیں۔ جب بارش ہوتی ہے تو ان بلوں کی وجہ سے بارش کا پانی قبروں میں چلا جاتا ہے' لومڑیاں ان بلوں کو مزید چوڑا کر کے مُردوں کی ہڈیاں قبروں سے باہر نکال دیتی ہیں۔ کیا قبروں کے ان سوراخوں اور شگافوں کو بند کرنے کے لیے درختوں کو کاٹ دینا جائز ہے؟

جواب سوال میں مذکور اس صورت حال کے پیش نظر کہ درختوں کے نیچے چوہوں کی بلیں ہیں اور ان سے لومڑیاں قبروں میں داخل ہو کر مُردوں کی بے حرمتی کرتی ہیں' ان درختوں کے کاٹنے اور چوہوں کی بلوں کے بند کرنے میں کوئی حرج نہیں تاکہ قبروں کو بارشوں اور مُردوں کو لومڑیوں کی دست برد سے محفوظ رکھا جاسکے۔ وباللہ التوفیق' وصلی اللہ علی محمد وعلی آلہ وصحبہ وسلم۔

——— فتویٰ کمیٹی ———

اصحاب قبور تم (زندوں) سے زمین کے زیادہ مستحق ہیں

سوال مجھے والدہ کی طرف سے ایک گھر وراثت میں ملا تھا جو کہ گر گیا ہے اور میں نے اسے از سر نو کرنا چاہا۔ اس گھر کے پاس بہت سی قبریں بھی ہیں۔ جب ہم بنیادیں کھود رہے تھے تو ہمیں کئی بوسیدہ ہڈیاں بھی ملیں جن کے بارے میں بظاہر یہی معلوم ہوتا ہے کہ وہ انہیں قبروں کی ہوں گی جو گھر کے پاس ہیں۔ میں نے گھر سے دور ایک جگہ دفن کر دیں' ہمارے سارے گھر قبروں کے پاس ہیں اور یہ گھر ہمیں اپنے آباؤ واجداد سے بطور وراثت ملے ہیں' ان کے علاوہ ہمارے پاس اور گھر نہیں ہیں اور نہ ہی ہمارے پاس کوئی زمین ہے کہ ہم ان قبروں سے دور گھر بنا لیں۔ کیا ہمیں اس گھر میں رہنے کا حق حاصل ہے؟ کیا ہم از سر نو ان ہڈیوں کو ان کی جگہ سے منتقل کر دیں تو اس میں کوئی گناہ ہے یا نہیں؟

جواب اگر یہ مسلمانوں کی قبریں ہیں تو پھر قبروں والے اس زمین کے تمہاری نسبت زیادہ حق دار ہیں' کیونکہ جب وہ اس زمین میں دفن ہو گئے تو اس کے مالک بن گئے اور تمہارے لیے یہ حلال نہیں کہ مسلمانوں کی قبروں پر اپنے گھر بناؤ اور جب تمہیں یہ یقین ہو گیا ہے کہ اس جگہ قبریں ہیں تو پھر تمہارے لیے ضروری ہے کہ گھر بنانا بند کر دو اور قبروں کو عمارت کے بغیر ہی رہنے دو۔ اگر تمہارے پاس گھر نہیں ہیں تو اس کے یہ معنی نہیں کہ دوسروں کے گھروں پر قبضہ جمالو آخر قبریں

بھی تو مُردوں کے گھر ہیں۔ ان گھروں میں رہنا تمہارے لیے حلال نہیں جب کہ تمہیں یہ معلوم ہے کہ یہ قبروں پر بنائے گئے ہیں۔

——— شیخ ابن عثیمین ———

کافروں کے چھوٹے بچوں کا حکم اہل فترت کا ہے

سوال یہ تو ہم سب جانتے ہیں کہ آخرت میں مشرکوں کا ٹھکانا کیا ہو گا؟ لیکن سوال یہ ہے کہ ان کے وہ چھوٹے بچے جو بلوغت سے پہلے فوت ہو جائیں ان کا انجام کیا ہو گا؟

جواب جب کفار کے بچے سن تمیز سے پہلے فوت ہو جائیں اور ان کے والدین کافر ہوں تو دنیا میں ان کا حکم کافروں کا ہو گا کہ انہیں نہ غسل دیا جائے گا نہ کفن دیا جائے گا نہ جنازہ پڑھا جائے گا اور نہ انہیں مسلمانوں کے ساتھ دفن ہی کیا جائے گا' کیونکہ وہ اپنے والدین کے ساتھ کافر ہی ہیں۔ باقی رہا آخرت میں ان کا حال تو یہ اللہ تعالیٰ بہتر جانتا ہے کہ اگر وہ بڑے ہوتے تو دنیا میں کس طرح کے عمل کرتے؟ ان کے بارے میں صحیح ترین قول یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ قیامت کے دن انہیں کوئی حکم دے کر ان کی آزمائش کرے گا اگر وہ اللہ تعالیٰ کے حکم کی اطاعت کر لیں گے تو اللہ تعالیٰ انہیں جنت میں داخل کر دے گا اور اگر وہ نافرمانی کریں گے تو پھر اللہ تعالیٰ انہیں جہنم رسید کر دے گا۔ اہل فترت اور ان لوگوں کے بارے میں بھی یہی قول ہے جن تک اللہ تعالیٰ کا پیغام نہ پہنچ سکا ہو اللہ تعالیٰ ہی بہتر جانتا ہے کہ اگر ان تک (اللہ تعالیٰ کا) پیغام پہنچ جاتا تو وہ دنیا میں کس طرح کے کام کرتے' لہٰذا اللہ تعالیٰ جس طرح چاہے گا ان کی آزمائش کرے گا۔ اگر انہوں نے اطاعت کی تو انہیں جنت میں داخل کر دے گا اور اگر نافرمانی کی تو پھر انہیں جہنم رسید کر دیا جائے گا۔

——— شیخ ابن عثیمین ———

مشرکوں کے بچے جو چھوٹی عمر میں فوت ہو جائیں

سوال وہ بچہ جس کے ماں باپ کافر ہوں اور وہ بالغ اور شریعت کا مکلف ہونے سے پہلے فوت ہو جائے تو کیا وہ عند اللہ مسلمان ہے یا نہیں؟ یاد رہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے:

«كُلُّ مَوْلُودٍ يُولَدُ عَلَى الْفِطْرَةِ»(صحيح البخاري، الجنائز، باب ما قيل في أولاد المشركين، ح: ١٣٨٥)

"ہر بچہ فطرت پر پیدا ہوتا ہے"

اور اگر وہ بچہ مسلمان ہے تو کیا مسلمانوں پر یہ واجب ہے کہ اسے غسل دیں اور اس کا جنازہ پڑھیں؟ راہنمائی فرمائیں' اللہ تعالیٰ آپ کو اجر سے نوازے!

جواب جب کافر ماں باپ کا نابالغ بچہ فوت ہو جائے تو دنیا کے احکام کے اعتبار سے وہ اپنے والدین کے تابع ہے کہ اسے غسل دیا جائے گا نہ جنازہ پڑھا جائے گا اور نہ مسلمانوں کی قبروں میں دفن کیا جائے گا اور آخرت میں اس کا معاملہ اللہ تعالیٰ کے سپرد ہے۔ صحیح حدیث میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ سے جب مشرکوں کے بچوں کے بارے میں پوچھا گیا تو آپ نے فرمایا:

«اَللّٰهُ أَعْلَمُ بِمَا كَانُوا عَامِلِينَ»(صحيح البخاري، القدر، باب الله أعلم بما كانوا عاملين، ح:٦٥٩٧، ٦٥٩٨ وصحيح مسلم، القدر، باب معنى كل مولود يولد على الفطرة ... الخ، ح:٢٦٥٩، ٢٦٦٠)

"اللہ تعالیٰ زیادہ بہتر جانتا ہے کہ وہ کیا عمل کرنے والے تھے؟"

بعض اہل علم کا قول ہے کہ ان کے بارے میں اللہ تعالیٰ کا علم قیامت کے دن ظاہر ہو گا اور ان کا بھی اہل فترت کی طرح امتحان ہو گا اگر انہوں نے اللہ تعالیٰ کے حکم کی فرمانبرداری کی تو جنت میں داخل ہوں گے اور اگر نافرمانی کی تو جہنم رسید ہوں گے۔ صحیح احادیث سے ثابت ہیں کہ اہل فترت کا قیامت کے دن امتحان ہو گا۔ اہل فترت سے مراد وہ لوگ ہیں جن کے پاس انبیاء کرام علیہم السلام کی دعوت نہیں پہنچی ہو گی۔ اسی طرح جو لوگ ان کے حکم میں ہوں گے مثلاً مشرکوں کے بچے' (ان کا بھی امتحان ہو گا) کیونکہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَمَا كُنَّا مُعَذِّبِينَ حَتَّىٰ نَبْعَثَ رَسُولًا ۝١٥﴾ (الإسراء١٧/ ١٥)

"اور جب تک ہم پیغمبر نہ بھیجیں ہم عذاب نہیں دیا کرتے۔"

اہل فترت کے بارے میں سب سے زیادہ صحیح قول یہی ہے۔ شیخ الاسلام ابن تیمیہ' آپ کے شاگرد رشید علامہ ابن القیم اور سلف و خلف کی ایک جماعت رحمہم اللہ نے اسی قول کو اختیار کیا ہے۔ واللہ ولی التوفیق۔

——— شیخ ابن باز ———

باب ششم
کتاب
الزکاۃ

زکوٰۃ کے مسائل

زکوٰۃ کی فرضیت و اہمیت

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ وَحْدَہُ، وَالصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ عَلٰی مَنْ لاَّ نَبِیَّ بَعْدَہُ، وَعَلٰی آلِہِ وَصَحْبِہِ۔ أَمَّا بَعْدُ

اس تحریر کا باعث فریضۂ زکوٰۃ کے بارے میں نصیحت اور یاد دہانی ہے' کیونکہ اس بارے میں بہت سے مسلمان تساہل سے کام لیتے ہیں اور اس طرح زکوٰۃ ادا نہیں کرتے جس طرح شریعت نے حکم دیا ہے' حالانکہ اس کی بڑی اہمیت ہے۔ زکوٰۃ اسلام کے ان ارکان خمسہ میں سے ایک ہے جن کے بغیر اسلام کی عمارت تعمیر ہی نہیں ہو سکتی' کیونکہ نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے:

«بُنِيَ الإِسْلاَمُ عَلٰی خَمْسٍ: شَهَادَةِ أَنْ لاَّ إِلٰهَ إِلاَّ اللهُ، وَأَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُولُ اللهِ، وَإِقَامِ الصَّلاَةِ، وَإِيتَاءِ الزَّكَاةِ، وَصَوْمِ رَمَضَانَ، وَحَجِّ الْبَيْتِ»(صحيح البخاري، الإيمان، باب دعاؤكم إيمانكم، ح:٨ وصحيح مسلم، الإيمان، باب بيان أركان الإسلام ... الخ، ح:١٦)

"اسلام کی بنیاد پانچ باتوں پر رکھی گئی ہے۔ یہ گواہی دینا کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور محمد ﷺ اللہ کے رسول ہیں۔ نماز قائم کرنا' زکوٰۃ ادا کرنا' رمضان کے روزے رکھنا اور بیت اللہ کا حج کرنا۔"

مسلمانوں پر زکوٰۃ فرض قرار دینا اسلام کے نمایاں ترین محاسن میں سے ایک اور کثرت فوائد کی بناء پر اس بات کی دلیل ہے کہ اسلام اپنے ماننے والوں کے حالات کا بھی خیال رکھتا ہے' چنانچہ مسلمان فقراء کی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لیے فریضۂ زکوٰۃ کو عائد کیا گیا ہے سو اس کے فوائد میں سے ہے کہ یہ غنی و فقیر کے درمیان عہد محبت کو پیدا کرتا ہے' کیونکہ اپنے محسن کے ساتھ محبت کرنا انسانی فطرت ہے' اور اس کا یہ فائدہ بھی ہے کہ اس سے نفس کی تطہیر و تزکیہ ہوتا ہے اور نفس بخل اور کنجوسی سے دور ہو جاتا ہے جیسا کہ فرمان الٰہی میں اسی بات کی طرف اشارہ کیا ہے:

﴿ خُذْ مِنْ أَمْوَٰلِهِمْ صَدَقَةً تُطَهِّرُهُمْ وَتُزَكِّيهِم بِهَا ﴾ (التوبة٩/ ١٠٣)

"(اے نبی!) ان کے مال و دولت میں سے صدقہ لے کر اس کے ذریعے ان کے ظاہر و باطن کو پاک کیجئے۔"

اس کا ایک فائدہ یہ بھی ہے کہ اس سے مسلمان میں جود و کرم اور ضرورت مندوں کے لیے محبت و شفقت کے جذبات پیدا ہوتے ہیں۔ اس کا ایک فائدہ یہ بھی ہے کہ یہ باعث خیر و برکت بھی ہے اور اس سے مال میں اضافہ بھی ہوتا ہے جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ وَمَآ أَنفَقْتُم مِّن شَيْءٍ فَهُوَ يُخْلِفُهُۥ ۖ وَهُوَ خَيْرُ ٱلرَّٰزِقِينَ ﴿٣٩﴾ ﴾ (سبأ٣٤/ ٣٩)

"اور تم جو چیز (اللہ کے راستے میں) خرچ کرو گے' تو وہ اس کا (تمہیں) عوض دے گا' وہ سب سے بہتر رزق

دینے والا ہے۔" اور نبی کریم ﷺ کا ایک صحیح حدیث میں ارشاد موجود ہے:

«قَالَ اللّٰهُ عَزَّوَجَلَّ: يَاابْنَ آدَمَ! أَنْفِقْ أُنْفِقْ عَلَيْكَ»(صحيح البخاري، التفسير، باب قوله وكان عرشه على الماء، ح:٤٦٨٤ وصحيح مسلم، الزكاة، باب الحث على النفقة وتبشير المنفق بالخلف، ح:٩٩٣ ومسند أحمد: ٢/ ٢٤٢)

"اللہ عزوجل ارشاد فرماتا ہے کہ اے ابن آدم! تو خرچ کر' میں تجھ پر خرچ کروں گا۔"

علاوہ ازیں زکوٰۃ کے اور بھی بہت سے فائدے ہیں۔ جو شخص بخل سے کام لے اور زکوٰۃ ادا کرنے میں کوتاہی کرے' اس کے بارے میں وعید بھی بہت شدید آئی ہے' ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَٱلَّذِينَ يَكْنِزُونَ ٱلذَّهَبَ وَٱلْفِضَّةَ وَلَا يُنفِقُونَهَا فِى سَبِيلِ ٱللَّهِ فَبَشِّرْهُم بِعَذَابٍ أَلِيمٍ ﴿٣٤﴾ يَوْمَ يُحْمَىٰ عَلَيْهَا فِى نَارِ جَهَنَّمَ فَتُكْوَىٰ بِهَا جِبَاهُهُمْ وَجُنُوبُهُمْ وَظُهُورُهُمْ ۖ هَٰذَا مَا كَنَزْتُمْ لِأَنفُسِكُمْ فَذُوقُوا۟ مَا كُنتُمْ تَكْنِزُونَ ﴿٣٥﴾﴾ (التوبة٩/ ٣٤_٣٥)

"جو لوگ سونا اور چاندی جمع کرتے ہیں اور اس کو اللہ کے رستے میں خرچ نہیں کرتے آپ ان کو اس دن کے درد ناک عذاب کی خبر سنا دیں جس دن وہ (مال) دوزخ کی آگ میں (خوب) گرم کیا جائے گا' پھر اس سے ان (بخیلوں) کی پیشانیاں اور پہلو اور پیٹھیں داغی جائیں گی (اور کہا جائے گا کہ یہ) وہی ہے جو تم نے اپنے لیے جمع کیا تھا' سو جو تم جمع کرتے تھے (اب) اس کا مزہ چکھو۔"

ہر وہ مال جس کی زکوٰۃ ادا نہ کی جائے وہ کنز ہے' اس کی وجہ سے اس کے مالک کو قیامت کے دن عذاب ہو گا جیسا کہ نبی کریم ﷺ کی اس صحیح حدیث سے ثابت ہے جس میں آپ نے فرمایا:

«مَا مِنْ صَاحِبِ ذَهَبٍ وَلَا فِضَّةٍ، لَا يُؤَدِّي مِنْهَا حَقَّهَا، إِلَّا إِذَا كَانَ يَوْمُ الْقِيَامَةِ، صُفِّحَتْ لَهُ صَفَائِحُ مِنْ نَارٍ، فَأُحْمِيَ عَلَيْهَا فِي نَارِ جَهَنَّمَ، فَيُكْوٰى بِهَا جَنْبُهُ وَجَبِينُهُ وَظَهْرُهُ، كُلَّمَا بَرَدَتْ أُعِيدَتْ لَهُ، فِي يَوْمٍ كَانَ مِقْدَارُهُ خَمْسِينَ أَلْفَ سَنَةٍ، حَتّٰى يُقْضٰى بَيْنَ الْعِبَادِ، فَيَرٰى سَبِيلَهُ، إِمَّا إِلَى الْجَنَّةِ، وَإِمَّا إِلَى النَّارِ»(صحيح مسلم، الزكاة، باب إثم مانع الزكاة، ح:٩٨٧)

"سونے اور چاندی کا وہ مالک جو اس کے حق کو ادا نہیں کرتا' قیامت کے دن جہنم کی آگ میں اسے چوڑے چوڑے پتروں کی صورت میں ڈھال کر گرم کیا جائے گا اور اس کے ساتھ اس کے پہلو پیشانی اور کمر کو داغا جائے گا' جب وہ ٹھنڈے ہو جائیں گے تو انہیں دوبارہ گرم کیا جائے گا اور پچاس ہزار سال مقدار کے دن (ان کے ساتھ) اسی طرح ہوتا رہے گا' حتیٰ کہ بندوں کا حساب کتاب مکمل ہو جائے گا' پھر وہ جنت یا جہنم میں اپنا ٹھکانہ دیکھے گا۔"

پھر نبی کریم ﷺ نے اونٹ گائے اور بکری کے اس مالک کا بھی ذکر کیا جو زکوٰۃ ادا نہیں کرتا اور آپ نے فرمایا اسے بھی قیامت کے دن عذاب ہو گا۔ یہ بھی صحیح حدیث میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

«مَنْ آتَاهُ اللّٰهُ مَالًا فَلَمْ يُؤَدِّ زَكَاتَهُ مُثِّلَ لَهُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ شُجَاعًا أَقْرَعَ لَهُ زَبِيبَتَانِ، يُطَوَّقُهُ يَوْمَ

الْقِيَامَةِ، ثُمَّ يَأْخُذُ بِلِهْزِمَتَيْهِ - يَعْنِي شِدْقَيْهِ - ثُمَّ يَقُولُ: أَنَا مَالُكَ، أَنَا كَنْزُكَ»(صحيح البخاري، الزكاة، باب إثم مانع الزكاة، ح:١٤٠٣)

"جسے اللہ تعالیٰ مال عطا فرمائے اور وہ اس کی زکوٰۃ ادا نہ کرے تو قیامت کے دن اس کے مال کو ایک گنجے سانپ کی شکل میں ڈھال دیا جائے گا' جس کی آنکھ کے اوپر دو سیاہ نقطے ہوں گے' اس سانپ کو اس کے گلے میں ڈال دیا جائے گا جو اس کے دونوں جبڑوں کو پکڑ لے گا اور کہے گا کہ میں تیرا مال ہوں' میں تیرا خزانہ ہوں' پھر نبی کریم ﷺ نے یہ آیت کریمہ تلاوت فرمائی:

﴿ وَلَا يَحْسَبَنَّ ٱلَّذِينَ يَبْخَلُونَ بِمَآ ءَاتَىٰهُمُ ٱللَّهُ مِن فَضْلِهِۦ هُوَ خَيْرًا لَّهُم ۖ بَلْ هُوَ شَرٌّ لَّهُمْ ۖ سَيُطَوَّقُونَ مَا بَخِلُوا۟ بِهِۦ يَوْمَ ٱلْقِيَـٰمَةِ ﴾ (آل عمران٣/ ١٨٠)

"جو لوگ اس مال میں جو اللہ نے اپنے فضل سے ان کو عطا فرمایا ہے' بخل کرتے ہیں وہ اس بخل کو اپنے حق میں اچھا نہ سمجھیں (وہ اچھا نہیں) بلکہ ان کے لیے برا ہے' وہ جس مال میں بخل کرتے ہیں' قیامت کے دن اس کا طوق بنا کر ان کی گردنوں میں ڈالا جائے گا۔"

زکوٰۃ چار قسم کے اموال میں واجب ہے

① زمین کی پیداوار یعنی دانوں اور پھلوں میں۔ ② جنگل و صحراء میں چرنے والے چوپایہ جانوروں میں ③ سونے اور چاندی میں اور ④ سامان تجارت میں۔

ان چاروں قسموں کا نصاب مقرر ہے' اس سے کم میں زکوٰۃ واجب نہیں' چنانچہ دانوں اور پھلوں کا نصاب پانچ وسق ہے اور ایک وسق نبی کریم ﷺ کے صاع کے حساب سے ساٹھ صاع کا ہوتا ہے۔ گویا کھجور' کشمش' گندم' چاول اور جو وغیرہ کا نصاب تین سو صاع ہے اور نبی کریم ﷺ کے صاع کا اندازہ ایک معتدل آدمی کے دونوں بھرے ہوئے ہاتھوں کی چار لپوں کے برابر ہے۔

جنگلات میں چرنے والے اونٹ' گائے' بکری اور دیگر جانوروں کا نصاب رسول اللہ ﷺ کی صحیح احادیث میں تفصیل کے ساتھ موجود ہے جنہیں اس سے دلچسپی ہو وہ اہل علم سے پوچھ سکتے ہیں' اگر اختصار مقصود نہ ہوتا تو ہم اس کی تفصیل بھی بیان کر دیتے۔

چاندی کا نصاب ایک سو چالیس مثقال ہے۔ سعودی عرب کی کرنسی کے حساب سے یہ چھپن ریال کے برابر ہے۔ سونے کا نصاب بیس مثقال ہے۔ سعودی گنیوں کے حساب سے اس کی مقدار ۳/۷ ۱۱ گنی ہے' جو شخص سونے اور چاندی یا دونوں میں سے ایک کے نصاب کا مالک ہو اور اس پر ایک سال گزر جائے تو اس کا چالیسواں حصہ بطور زکوٰۃ ادا کرنا واجب ہے۔ نفع اصل زر کے تابع ہوتا ہے' لہٰذا اس کے لیے نئے سال کی ضرورت نہیں ہوتی' جس طرح کہ چوپایوں کے بچے اپنے اصل کے تابع ہوتے ہیں' لہٰذا جب چوپاؤں کا نصاب مکمل ہو تو ان کے بچوں کے لیے نئے سال کی ضرورت نہیں بلکہ وہ انہی کے ساتھ شمار ہوں گے۔

ان تمام کرنسی نوٹوں کا حکم بھی سونے چاندی جیسا ہی ہے جو آج لوگوں میں مروج ہیں' خواہ وہ درہم ہوں یا دینار یا ڈالر یا ان کا کوئی بھی اور نام ہو۔ جب ان کی قیمت سونے یا چاندی کے نصاب کے مطابق ہو اور ان پر ایک سال گزر جائے تو ان میں بھی زکوٰۃ واجب ہوگی۔

عورتوں کے سونے یا چاندی کے زیورات کو بھی نقدی کے ساتھ ملایا جائے گا جب یہ نصاب کو پہنچ جائیں اور ان پر ایک سال گزر جائے تو ان میں بھی زکوٰۃ واجب ہوگی خواہ وہ استعمال کرتی ہوں یا نہ کرتی ہوں۔ اس مسئلہ میں علماء کا صحیح ترین قول یہی ہے' کیونکہ نبی کریم ﷺ کے اس ارشاد کے عموم کا یہی تقاضا ہے:

«مَا مِنْ صَاحِبِ ذَهَبٍ وَّلاَ فِضَّةٍ، لاَ يُؤَدِّي مِنْهَا حَقَّهَا، إِلاَّ إِذَا كَانَ يَوْمُ الْقِيَامَةِ، صُفِّحَتْ لَهُ صَفَائِحُ مِنْ نَّارٍ . . . »(صحيح مسلم، الزكاة، باب إثم مانع الزكاة، ح:٩٨٧)

"سونے اور چاندی کا وہ مالک جو اس کی زکوٰۃ ادا نہیں کرتا' قیامت کے دن جہنم کی آگ میں اسے چوڑے چوڑے پتروں کی صورت میں ڈھال کر گرم کیا جائے گا....."

اسی طرح ایک اور حدیث میں ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ایک عورت کے ہاتھ میں سونے کے دو کنگن دیکھے تو فرمایا:

«أَتُعْطِينَ زَكَاةَ هٰذَا؟ قَالَتْ: لاَ، قَالَ: أَيَسُرُّكِ أَنْ يُّسَوِّرَكِ اللهُ بِهِمَا يَوْمَ الْقِيَامَةِ سِوَارَيْنِ مِنْ نَّارٍ؟ فَأَلْقَتْهُمَا، وَقَالَتْ: هُمَا للهِ وَلِرَسُولِهِ»(سنن أبي داود، الزكاة، باب الكنز ما هو؟ وزكاة الحلي، ح:١٥٦٣)

"کیا تو اس کی زکوٰۃ ادا کرتی ہے؟" اس نے جواب دیا "نہیں" تو آپ نے فرمایا "کیا تجھے یہ بات پسند ہے کہ ان کے بدلے اللہ تعالیٰ قیامت کے دن تجھے جہنم کی آگ کے دو کنگن پہنا دے؟ اس عورت نے وہ دونوں کنگن اتار کر پھینک دیئے اور کہا کہ "وہ اللہ اور اس کے رسول کے لیے ہیں۔"

حضرت ام سلمہ ؓ سے روایت ہے کہ وہ سونے کی پازیب پہنا کرتی تھیں تو انہوں نے عرض کیا "یا رسول اللہ! کیا یہ بھی کنز ہے؟" آپ نے فرمایا:

«مَا بَلَغَ أَنْ تُؤَدَّى زَكَاتُهُ فَزَكِّيَ فَلَيْسَ بِكَنْزٍ»(سنن أبي داود، الزكاة، باب الكنز ما هو؟ وزكاة الحلي، ح:١٥٦٤)

"جو مال نصاب کو پہنچ جائے اور اس کی زکوٰۃ ادا کر دی جائے تو وہ کنز نہیں ہے۔"

اس مضمون کی اور بھی بہت سی احادیث سے یہی ثابت ہوتا ہے کہ ہر طرح کے زیور میں زکوٰۃ واجب ہے۔

سامان تجارت کی سال کے آخر میں قیمت لگائی جائے اور کل قیمت میں سے ڈھائی فی صد بطور زکوٰۃ ادا کر دیا جائے خواہ قیمت اس کی ثمن کے برابر ہو یا اس سے کم و بیش ہو' کیونکہ حدیث سمرہ میں ہے:

«إِنَّ رَسُولَ اللهِ ﷺ كَانَ يَأْمُرُنَا أَنْ نُّخْرِجَ الصَّدَقَةَ مِنَ الَّذِي نُعِدُّ لِلْبَيْعِ» (سنن أبي داود، الزكاة، باب العروض إذا كانت للتجارة . . . الخ، ح:١٥٦٢)

"یقیناً رسول اللہ ہمیں یہ حکم دیا کرتے تھے کہ ہم سامان تجارت میں سے بھی زکوٰۃ نکالیں۔"

ان تمام اراضی' عمارتوں' گاڑیوں اور تمام سامانوں میں بھی زکوٰۃ فرض ہے جو بغرض تجارت ہوں۔ وہ عمارتیں جو بیع کے

لیے نہ ہوں بلکہ کرایہ کے لیے ہوں تو زکوٰۃ ان کی قیمت پر نہیں ہو گی' کیونکہ وہ بغرض تجارت نہیں ہیں' ہاں البتہ سال گزرنے پر ان کے کرایوں پر ضرور زکوٰۃ فرض ہو گی۔

اسی طرح پرائیویٹ گاڑیوں اور ٹیکسیوں پر بھی زکوٰۃ نہیں ہو گی جب کہ وہ تجارت کے لیے نہ ہوں اور انہیں ذاتی استعمال (یا کرایہ پر چلانے) کے لیے خریدا گیا ہو۔ ٹیکسی وغیرہ کے مالک کو کرایہ سے حاصل ہونے والی نقدی اگر نصاب کو پہنچ جائے اور اس پر ایک سال گزر جائے تو اس پر زکوٰۃ واجب ہو گی' خواہ اس نے اس نقدی کو اپنے خرچہ' شادی' جائیداد خریدنے یا قرض ادا کرنے وغیرہ کے مقاصد کی خاطر جمع کیا ہو' کیونکہ ادلۂ شرعیہ کے عموم اسی بات پر دلالت کرتے ہیں کہ اس طرح کے مال میں زکوٰۃ واجب ہے۔ علماء کے صحیح قول کے مطابق قرض بھی مانع زکوٰۃ نہیں ہے۔ جمہور علماء کے نزدیک یتیموں اور مجنونوں کے اموال جب نصاب زکوٰۃ کو پہنچ جائیں اور ان پر ایک سال گزر جائے تو ان میں بھی زکوٰۃ واجب ہے سال گزرنے پر ان کے وارثوں پر فرض ہو گا کہ ان کی طرف سے زکوٰۃ کی نیت کر کے زکوٰۃ ادا کریں' کیونکہ عموم سے یہی ثابت ہوتا ہے' چنانچہ نبی کریم ﷺ نے حضرت معاذ رضی اللہ عنہ کو یمن بھیجتے وقت یہ بھی ارشاد فرمایا تھا:

«إِنَّ اللهَ افْتَرَضَ عَلَيْهِمْ صَدَقَةً فِي أَمْوَالِهِمْ تُؤْخَذُ مِنْ أَغْنِيَائِهِمْ وَتُرَدُّ عَلٰى فُقَرَائِهِمْ»

(صحيح البخاري، الزكاة، باب وجوب الزكاة، ح:١٣٩٥ وصحيح مسلم، الإيمان، باب الدعاء إلى الشهادتين ... الخ، ح:١٩)

''اللہ تعالیٰ نے ان کے اموال پر زکوٰۃ کو فرض قرار دیا ہے' جسے ان کے اغنیاء سے لے کر ان کے فقراء میں تقسیم کر دیا جائے۔''

زکوٰۃ اللہ تعالیٰ کا حق ہے' لہٰذا اسے محض دوستی پالنے کی خاطر غیر مستحق کو نہ دیا جائے اور نہ ہی اسے کوئی ذاتی نفع حاصل کرنے یا نقصان سے بچنے یا مال کو نقصان سے بچانے یا محض لوگوں کے طعن و تشنیع سے بچنے کے لیے ادا نہ کیا جائے بلکہ ہر مسلمان پر یہ فرض ہے کہ وہ زکوٰۃ صرف مستحق لوگوں میں تقسیم کرے' کیونکہ وہ اس کے حق دار ہیں' کسی دوسری غرض کے لیے اسے ہرگز استعمال نہ کرے اور پھر خوش دلی اور اللہ کی رضا کے لیے اخلاص کے ساتھ ادا کرے تاکہ اپنے فرض سے عہدہ برآ ہو کر اللہ تعالیٰ سے بے پایاں اجروثواب اور اس کا بدل حاصل کر سکے۔ اللہ سبحانہ و تعالیٰ نے اپنی کتاب مقدس میں مصارف زکوٰۃ کی وضاحت کرتے ہوئے فرمایا ہے:

﴿ ۞ إِنَّمَا ٱلصَّدَقَٰتُ لِلْفُقَرَآءِ وَٱلْمَسَٰكِينِ وَٱلْعَٰمِلِينَ عَلَيْهَا وَٱلْمُؤَلَّفَةِ قُلُوبُهُمْ وَفِى ٱلرِّقَابِ وَٱلْغَٰرِمِينَ وَفِى سَبِيلِ ٱللَّهِ وَٱبْنِ ٱلسَّبِيلِ فَرِيضَةً مِّنَ ٱللَّهِ وَٱللَّهُ عَلِيمٌ حَكِيمٌ ﴿٦٠﴾ ﴾

(التوبة٩/ ٦٠)

''صدقات (یعنی زکوٰۃ و خیرات) تو مفلسوں اور محتاجوں اور کارکنان صدقات کا حق ہے اور ان لوگوں کا جن کی تالیف قلوب منظور ہے اور غلاموں کے آزاد کرنے میں اور قرض داروں (کے قرض ادا کرنے میں) اور اللہ کی راہ میں مسافروں (کی مدد) میں (یہ مال خرچ کرنا چاہیے' یہ حقوق) اللہ کی طرف سے مقرر کر دیئے گئے ہیں اور اللہ جاننے والا (اور) حکمت والا ہے۔)''

اس آیت کریمہ کے آخر پر اللہ تعالیٰ کے ان دو عظیم ناموں "علیم و حکیم" کو ذکر کیا گیا ہے تو اس میں بندگان الٰہی کے لیے تنبیہ ہے کہ وہ اپنے بندوں کے احوال کو جانتا ہے اور یہ بھی جانتا ہے کہ کون زکوٰۃ کا مستحق ہے اور کون مستحق نہیں ہے اور اس نے شریعت کے جو احکام و قوانین مقرر فرمائے ہیں ان میں وہ حکیم ہے (اس کا کوئی حکم حکمت سے خالی نہیں) خواہ اس کے کچھ بندوں کو اس کی حکمت کے بعض اسرار معلوم نہ ہو سکے ہوں' اس نے تمام احکام کو مبنی بر حکمت اس لیے بنایا ہے تاکہ بندگان الٰہی کو شریعت کے بارے میں اطمینان قلب نصیب ہو اور وہ اس کے حکم کے سامنے سر تسلیم خم کر دیں۔

اللہ تعالیٰ ہی سے دعا ہے کہ وہ ہمیں اور سب مسلمانوں کو دین میں فقاہت' معاملہ میں صداقت' اپنی رضا کے کاموں میں مسابقت اور ایسے کاموں سے بچنے کی توفیق عطا فرمائے جو اس کی ناراضی کا موجب ہوں۔ انه سميع قريب' وصلى الله وسلم على عبده ورسوله' محمد وآله وصحبه۔

سماحۃ الشیخ عبدالعزیز بن عبداللہ بن باز

زکوٰۃ کس پر واجب ہے

زکوٰۃ چھوٹے بڑے ہر شخص کے مال پر واجب ہے

سوال میں سترہ سال کا نوجوان ہوں' اپنے گھر والوں کے ساتھ رہتا ہوں' میرے والد صاحب میرے سارے اخراجات برداشت کرتے ہیں۔ اسلامی بینک میں میں نے اپنا کچھ مال رکھا ہوا ہے' اس پر ایک سال بھی گزر چکا ہے۔ کیا مجھ پر اس مال کی زکوٰۃ واجب ہے؟ کیا منافع پر بھی زکوٰۃ ہے؟ کیا زکوٰۃ سن بلوغت سے شروع ہوتی ہے؟

جواب زکوٰۃ چوپاؤں' سونے چاندی' زمین کی پیداوار اور سامان تجارت پر واجب ہے' خواہ مالک چھوٹی عمر ہی کا ہو۔ یتیم کے مال میں بھی زکوٰۃ اسی طرح واجب ہے جیسے بڑی عمر کے آدمی کے مال پر واجب ہے۔ یتیم کی طرف سے اس کا ولی زکوٰۃ ادا کرے گا۔ زکوٰۃ تجارت کے نفع پر بھی واجب ہے' خواہ نفع نصاب سے کم ہو بشرطیکہ اصل مال نصاب کے مطابق ہو۔

——— شیخ ابن جبرین ———

یتیم اور دیوانے کے مال بھی زکوٰۃ واجب ہے

سوال کیا یتیم اور دیوانے کے مال میں زکوٰۃ واجب ہے؟

جواب ان دونوں میں سے ہر ایک کے مال میں زکوٰۃ واجب ہے جب کہ یہ آزاد مسلمان ہوں اور انہیں پورا پورا حق ملکیت حاصل ہو۔ ایک مرفوع روایت ہے' نبی کریم ﷺ نے فرمایا:

«مَنْ وُلِّيَ مَالَ الْيَتِيمِ فَلْيَتَّجِرْ بِهِ، وَلاَ يَتْرُكْهُ حَتَّى تَأْكُلَهُ الصَّدَقَةُ»(سنن الدارقطني: ٢/ ١٠٩، ح: ١٩٥١)

"جو شخص یتیم کا ولی ہو اسے چاہیئے کہ اس کے مال کے ساتھ تجارت کرے' اسے اسی طرح نہ چھوڑ دے تاکہ اسے زکوٰۃ ہی کھا جائے۔"

امام مالک نے موطا میں عبدالرحمٰن بن قاسم سے روایت کیا ہے اور انہوں نے اپنے باپ سے' کہ میں اور میرا بھائی دونوں یتیم تھے' ہم حضرت عائشہ کی گود میں پرورش پا رہے تھے' وہ ہماری ولیہ تھیں اور ہمارے اموال کی زکوٰۃ ادا فرمایا کرتی تھیں۔ [1] حضرت علی' ابن عمر' جابر' عائشہ اور حسن بن علی رضی اللہ عنہم کا قول ہے کہ "یتیم اور دیوانے کے مال میں بھی زکوٰۃ واجب ہے" جیسا کہ ابن منذر نے بیان کیا ہے۔

—— فتویٰ کمیٹی ——

مال کی زکوٰۃ

ماہانہ تنخواہ کی زکوٰۃ

سوال میں ایک مقامی کمپنی میں ملازم ہوں اور تقریباً چار ہزار سعودی ریال تنخواہ لیتا ہوں جس میں ایک ہزار سعودی ریال مکان کا کرایہ ہے۔ کیا میری اس تنخواہ پر بھی زکوٰۃ واجب ہے؟ اگر واجب ہے تو کتنی؟ یاد رہے کہ اس تنخواہ کے علاوہ میرا کمائی کا اور کوئی ذریعہ نہیں ہے؟

جواب اگر تمہاری اس ماہانہ تنخواہ سے کچھ رقم بچ جائے تو اس پر زکوٰۃ واجب ہو گی بشرطیکہ بچی ہوئی رقم نصاب کے مطابق ہو جو سعودی کرنسی کے مطابق چار سو ریال ہے اور اس پر ایک سال بھی گزر جائے۔ اگر ہر ماہ اپنی تنخواہ میں سے کچھ بچت کر کے جمع کرتے ہیں تو احتیاط اور آسانی اس میں ہے کہ آپ ہر سال زکوٰۃ ادا کرنے کے لیے ایک مہینہ مقرر کر لیں' جس میں اس سال کی اور سابقہ جمع شدہ پونجی کی زکوٰۃ ادا کر دیں مال کا چالیسواں حصہ بطور زکوٰۃ ادا کرنا واجب ہے' یعنی زکوٰۃ کی شرح اڑھائی فی صد سالانہ ہے۔ واللہ الموفق

—— شیخ ابن جبرین ——

شادی کے لیے جمع کیے ہوئے مال کی زکوٰۃ

سوال ایک آدمی اپنے بیٹے کی شادی کے لیے کئی سالوں سے مال جمع کر رہا ہے تو کیا اس پر اس مال کی زکوٰۃ واجب ہے؟ یاد رہے اس مال کے جمع کرنے سے اس کا مقصد صرف اور صرف اپنے بیٹے کی شادی کا انتظام کرنا ہے؟

جواب اس آدمی کو جمع شدہ تمام رقوم کی زکوٰۃ ادا کرنا پڑے گی بشرطیکہ جمع شدہ رقوم پر ایک سال گزر جائے' خواہ وہ بچے کی شادی ہی کیلئے جمع کیا گیا ہو' کیونکہ یہ رقوم جب تک اس کے پاس ہیں' اس کی ملکیت ہیں' لہٰذا اسے ہر سال ان کی زکوٰۃ ادا کرنی چاہیئے تاآنکہ یہ رقوم شادی پر خرچ نہ ہو جائیں۔ کتاب و سنت کے دلائل کے عموم سے یہی بات ثابت ہوتی ہے۔

—— شیخ ابن باز ——

[1] موطا امام مالک (251/1)

سوال میں اس وقت ایک حکومتی ادارے میں ملازم ہوں اور قریباً چار ہزار ریال ماہانہ تنخواہ لیتا ہوں۔ میں نے ایک سال میں سترہ ہزار ریال جمع کیے ہیں جو کہ ایک غیر سودی بینک میں رکھے ہوئے ہیں۔ میں انہیں ان شاء اللہ ماہ شوال میں خرچ کرنا چاہتا ہوں' کیونکہ میں شادی کی تیاری کر رہا ہوں اور شادی کے اخراجات کے لیے اس سے دوگنی رقم مجھے بطور قرض بھی لینا پڑے گی۔ میرا سوال یہ ہے کہ کیا ان سترہ ہزار ریال پر زکوٰۃ واجب ہے' یاد رہے ایک سال کی مدت گزر چکی ہے اور اگر زکوٰۃ واجب ہے تو اس کی مقدار کتنی ہے؟

جواب مذکورہ بالا رقم پر زکوٰۃ واجب ہے' کیونکہ اس پر ایک سال گزر چکا ہے' خواہ اسے شادی کے لیے کیوں نہ جمع کیا گیا ہو۔ زکوٰۃ کی شرح اڑھائی فی صد سالانہ ہے۔ واللہ اعلم۔

——— شیخ ابن باز ———

زکوٰۃ اصل زر اور نفع دونوں پر واجب ہے

سوال یہ بات تو معروف ہے کہ زکوٰۃ وہ ہے جسے آدمی اپنے اموال تجارت' اپنی آمدن اور سونے چاندی کی زکوٰۃ کے طور پر سال بعد ادا کرتا ہے۔ لیکن ہم اسلامی بینک میں رکھے ہوئے مال کے نصاب کے بارے میں یہ معلوم کرنا چاہتے ہیں کہ کیا اس کا بھی وہی نصاب ہے جو دیگر اموال کا ہے یاد رہے اس بینک میں شرح منافع بہت کم ہے؟

جواب اسلامی بینک میں رکھے ہوئے مال کا حکم بھی وہی ہے جو دیگر اموال کا ہے۔ سال گزرنے پر اصل زر اور نفع دونوں کی زکوٰۃ ادا کرنا واجب ہو گی۔ اصل زر اور نفع دونوں میں شرح زکوٰۃ اڑھائی فی صد سالانہ ہے۔

——— شیخ ابن باز ———

سال گزرنے کے بعد نصاب پورا ہونے پر زکوٰۃ کا وجوب

سوال ایک آدمی نے کمائی کے ذریعہ کچھ رقم جمع کی ہے۔ اس رقم کے اکثر حصہ پر ایک سال گزر چکا ہے۔ اس رقم کو اس نے کاروبار میں بھی لگایا جس سے اسے نفع بھی حاصل ہوا ہے۔ کیا اس رقم پر زکوٰۃ واجب ہے؟

جواب جب جمع شدہ مال پر ایک سال گزر جائے اور مال نصاب کے مطابق ہو تو اس پر زکوٰۃ واجب ہے' خواہ وہ بعد میں اسے شادی وغیرہ ہی پر کیوں نہ خرچ کر دے۔ اگر اس نے واجب شدہ زکوٰۃ کو ادا نہ کیا تو اس فریضہ کو ادا کرنا اس کے ذمہ واجب رہے گا۔ جس مال پر ایک سال نہ گزرا ہو اور اسے دوران سال ہی خرچ کر لیا جائے تو اس پر زکوٰۃ واجب نہیں ہے۔

——— فتویٰ کمیٹی ———

جمع کیے ہوئے مال پر زکوٰۃ

سوال کیا ماہانہ تنخواہ سے بچت کر کے جمع شدہ مال پر بھی زکوٰۃ واجب ہے۔ جب کہ اس پر سال گزر چکا ہو؟ یاد رہے اس جمع شدہ مال کو کسی کاروبار میں نہیں لگایا گیا بلکہ اسے صرف گھریلو اخراجات ہی کے لیے جمع کیا گیا ہے۔ تو کیا اس صورت میں بھی اس پر زکوٰۃ واجب ہو گی؟

جواب ہاں سال گزرنے پر اس مال میں بھی زکوٰۃ واجب ہوگی' کیونکہ جس مال پر زکوٰۃ واجب ہو اس کے لیے یہ شرط نہیں ہے کہ اسے تجارت میں لگایا گیا ہو۔ یہی وجہ ہے کہ پھلوں اور دانوں میں بھی زکوٰۃ واجب ہے خواہ وہ تجارت کے لیے نہ ہوں بلکہ محض اپنی ضرورت ہی کے لیے ہوں اگر کسی انسان کے گھر میں کھجوروں کے چند درخت ہوں' ان کا پھل نصاب کے مطابق ہو اور ان درختوں کے پھل کو اس نے صرف اپنے ہی خرچ کے لیے رکھا ہو تو اس میں بھی زکوٰۃ واجب ہو گی۔ کھیتوں کی اس پیداوار کے سلسلہ میں بھی یہی حکم ہے جس میں زکوٰۃ واجب ہو' جنگل میں چرنے والے ان جانوروں کے بارے میں بھی یہی حکم ہے جن میں زکوٰۃ واجب ہو خواہ انہیں انسان نے تجارت کے لیے نہ بھی رکھا ہو۔ اسی طرح ان درہموں کا بھی یہی حکم ہے جن میں زکوٰۃ واجب ہو' خواہ انسان نے انہیں تجارت کے لیے نہ بھی جمع کیا ہو۔ پس تنخواہ سے پس انداز کئے ہوئے سرمایہ پر بھی زکوٰۃ واجب ہے بشرطیکہ نصاب کے مطابق ہو اور اس پر ایک سال کا عرصہ گزر جائے۔ لیکن یہاں ایک مسئلہ قابل غور ہے جس میں لوگوں کو بہت مشکل پیش آتی ہے اور وہ یہ کہ ہر ماہ تنخواہ یا گھر کے کرایہ یا دکان کے کرایہ سے یا اس طرح کی دیگر صورتوں میں آدمی اپنے اکاؤنٹ میں یا کسی دوسری جگہ جمع کرتا ہے اور پھر اس سے حسب ضرورت خرچ بھی کرتا ہے اور پھر اس میں جمع بھی کرتا ہے تو اب یہ اندازہ کرنا مشکل ہوتا ہے کہ کتنی رقم پر سال گزرا ہے اور کتنی رقم ہے جس پر ابھی تک سال نہیں گزرا تو اس سلسلہ میں سب سے بہتر صورت یہ ہے کہ جب اس کے پاس پہلی مرتبہ بقدر نصاب رقم جمع ہو جائے تو اس وقت سے وہ سال کا حساب لگائے اور سال پورا ہونے پر تمام جمع شدہ رقم کی زکوٰۃ ادا کر دے تو جس رقم پر سال مکمل ہو گیا ہے اس کی زکوٰۃ ادا ہو گئی اور جس رقم پر ابھی سال پورا نہیں ہوا اس کی زکوٰۃ بھی ادا ہو گئی' کیونکہ سال پورا ہونے سے پہلے زکوٰۃ ادا کرنا بھی جائز ہے۔ ہر ماہ کی نسبت سے الگ الگ سال کا حساب لگانے کی بجائے یہ صورت آسان ہے جب کہ ہر ماہ کے حساب سے سال کا حساب لگانے میں دشواری ہے۔

——— شیخ ابن عثیمین ———

مال زکوٰۃ کا نصاب

زکوٰۃ کا نصاب

سوال چاندی کا نصاب زکوٰۃ دو سو درہم ہے جو کہ ستاون ریال کے مساوی ہے اور سونے کا نصاب بیس دینار ہے۔ رسول اللہ ﷺ کے عہد میں تو بیس دینار' دو سو درہم کے مساوی تھے لیکن آج کل بیس دینار ستاون ریال کے مساوی نہیں ہیں بلکہ زیادہ ہیں' تو پھر عمل کیسے ہو گا؟

جواب چاندی کا نصاب دو سو درہم ہے جو کہ سعودی عرب کے چاندی کے چھپن ریال یا ان کے مساوی کرنسی نوٹ کی قیمت کے برابر ہے اور سونے کا نصاب بیس مثقال ہے اور اس کا وزن 3/7 11 سعودی گنی کے برابر ہے یا اس کی کرنسی نوٹوں میں جو قیمت بنے' اس کا حکم بھی سونے ہی کا ہے۔

——— فتویٰ کمیٹی ———

مروجہ کرنسی نوٹوں کا نصاب

سوال آپ کی خدمت میں گزارش ہے کہ آج کل مروجہ کرنسی نوٹوں کے نصاب کے بارے میں کچھ لوگوں کی رائے یہ ہے کہ نصاب چھپن ریال ہے' کچھ لوگ یہ کہتے ہیں کہ چاندی کے دو سو درہم کی ریالوں کے حساب سے جو قیمت بنے' وہ نصاب ہے تو اس طرح دو سو درہم چاندی کی قیمت تو قریباً آٹھ سو سعودی ریال بنتی ہے لہٰذا میں اس سلسلہ میں پریشان ہوں' براہ کرم فتویٰ دیجیے کہ مروجہ کرنسی نوٹوں کے حساب سے نصاب زکوٰۃ کیا ہے؟

جواب چاندی کا نصاب زکوٰۃ دو سو درہم ہے جو کہ ایک سو چالیس مثقال کے برابر ہے اور یہ چاندی کے سعودی چھپن ریال کے مساوی ہے یا کرنسی نوٹوں کے حساب سے اس کی جو بھی قیمت ہو' اس کے برابر ہے۔ وباللہ التوفیق' وصلی اللہ وسلم علی عبدہ ورسولہ محمد و آلہ وصحبہ۔

مال کی زکوٰۃ نکالنے کا طریقہ

زکوٰۃ نکالنے کا طریقہ

سوال ایک ملازم اپنی ماہانہ تنخواہ سے کچھ رقم بچا کر جمع کرتا رہتا ہے جو کبھی کم اور کبھی زیادہ ہوتی ہے اور اس میں سے کچھ رقم پر تو سال گزر گیا ہے اور کچھ پر سال نہیں گزرا اور اسے یہ بھی معلوم نہیں کہ ہر مہینے اس نے کتنا جمع کیا ہے۔ تو وہ زکوٰۃ کس طرح ادا کرے؟

سوال ایک دوسرا ملازم ہے جو ہر ماہ اپنی تنخواہ ایک بکس میں ڈال دیتا ہے اور پھر حسب ضرورت اس سے خرچ کرتا رہتا ہے' تو سوال یہ ہے کہ اس طرح بکس میں جو رقم بچے گی اس کی زکوٰۃ وہ کس حساب سے ادا کرے گا جب کہ باقی بچ جانے والی تمام رقم پر سال نہیں گزرا؟

جواب پہلے اور دوسرے دونوں سوالوں کی نوعیت چونکہ ایک جیسی ہے لہٰذا کمیٹی ان دونوں اور ان جیسے دیگر سوالوں کا ایک جامع جواب دینا چاہتی ہے تاکہ سب لوگ اس سے فائدہ اٹھا سکیں اور وہ یہ ہے کہ جو شخص نقدی کی صورت میں نصاب کا مالک ہو اور پھر مختلف اوقات میں اس کے پاس کچھ اور نقدی بھی آتی رہی جو پہلی نقدی کے نفع کی صورت میں نہیں ہے اور نہ ہی پہلی نقدی اس کا سبب ہے بلکہ یہ بھی مستقل ہے مثلاً جیسے کہ کوئی ملازم اپنی ماہانہ تنخواہ سے جمع کرتا ہے یا اسے یہ رقم بطور وراثت یا ہبہ یا جائداد کے کرایہ کی صورت میں ملی ہو اور وہ اس بات کا خواہش مند ہو کہ اپنا حق بھی پورا پورا محفوظ رکھے اور مستحقین زکوٰۃ کو بھی صرف ان کے حق کے مطابق ہی ادا کرے تو اسے چاہیے کہ اپنی آمدنی کے حساب کا باقاعدہ ایک گوشوارہ بنا لے اور ہر مال کے ملکیت میں آنے کے بعد سے لے کر سال مکمل ہونے تک کا حساب رکھے اور جس مال پر سال پورا ہو جائے اس کی زکوٰۃ ادا کر دے اور اگر وہ راحت و سخاوت کو پیش نظر رکھے اور خوش دلی کے ساتھ فقراء اور دیگر مصارف زکوٰۃ کے پہلو کو ترجیح دے تو اس وقت اپنے تمام مال کی زکوٰۃ ادا کر دے' جب اس کی

ملکیت میں آنے والے پہلے مال پر ایک سال مکمل ہو جائے' اس سے اسے اجروثواب بھی زیادہ ملے گا' درجات بلند ہوں گے' راحت و سکون حاصل ہو گا' فقراء و مساکین اور دیگر مصارف زکوٰۃ کے حقوق کی نگہداشت ہو گی اور اپنے فرض سے جو وہ زیادہ ادا کرے' اس کے بارے میں وہ یہ نیت کر لے کہ وہ فقراء و مساکین کے ساتھ احسان کر رہا ہے' اللہ تعالیٰ کی نعمتوں اور مال و دولت کے عطا کرنے پر اس کا شکر ادا کر رہا ہے۔ نیز اللہ تعالیٰ سے یہ بھی امید رکھے کہ وہ اسے اپنے فضل و کرم سے اور بھی زیادہ مال و دولت عطا فرمائے گا کہ اس کا فرمان ہے:

﴿ لَئِن شَكَرْتُمْ لَأَزِيدَنَّكُمْ ﴾ (إبراهيم ١٤/ ٧)

"اگر تم شکر کرو گے تو میں تمہیں زیادہ دوں گا۔"

——— فتویٰ کمیٹی ———

پیشگی زکوٰۃ ادا کرنا جائز ہے

سوال میں ملازم ہوں اور ہر مہینے اپنی تنخواہ سے کچھ بچا کر جمع کرتا ہوں اور اس طرح جمع کی جانے والی رقم کی کوئی معین تعداد نہیں ہے تو سوال یہ ہے کہ میں اپنے اس مال کی زکوٰۃ کس طرح ادا کروں؟

جواب تم پر واجب ہے کہ اپنے مال کی ہر قسم کی زکوٰۃ اس وقت ادا کرو جب اس پر ایک سال مکمل ہو جائے اور اگر پہلی قسط پر سال کی تکمیل کے بعد آپ اپنے تمام مال کی زکوٰۃ ادا کر دیں تو یہ بھی جائز ہے اور اس طرح باقی قسطوں کی آپ نے سال کی تکمیل سے پہلے گویا پیشگی زکوٰۃ ادا کر دی اور سال کی تکمیل سے قبل پیشگی زکوٰۃ ادا کرنا بھی جائز ہے خصوصاً جب کہ ضرورت یا کسی شرعی مصلحت کا تقاضا بھی ہو۔

——— شیخ ابن باز ———

زمین' جائداد' تجارتی مراکز اور سامان تجارت کی زکوٰۃ

عمارت بنانے کے لیے رکھی ہوئی زمین پر زکوٰۃ نہیں

سوال میرے پاس ایک قطعۂ اراضی ہے جو میں نے عمارت بنانے کے لیے خریدا تھا لیکن پھر کچھ مدت بعد ضرورت کی وجہ سے مجھے یہ فروخت کرنا پڑا' تو کیا اس مدت کی مجھے زکوٰۃ ادا کرنا پڑے گی جس میں یہ میرے پاس رہا اور میں نے اسے بیچا نہیں تھا؟

جواب جب امر واقع اسی طرح ہے جس طرح آپ نے سوال میں ذکر کیا ہے تو اس کی بیع سے قبل کی مدت کی آپ پر زکوٰۃ واجب نہیں ہے' کیونکہ وجوب زکوٰۃ کی علت مفقود ہے اور وہ ہے قصد بیع' جب کہ آپ کا ارادہ' بیچنے کا نہیں تھا۔

——— شیخ ابن باز ———

عمارت بنانے کے لیے رکھی ہوئی زمین پر زکوٰۃ نہیں خواہ......

سوال میں ایک مصری نوجوان ہوں سعودیہ میں کام کرتا ہوں اور مصر میں کرایہ کے ایک مکان میں رہتا ہوں یعنی مصر میں ابھی تک میرا کوئی ذاتی مکان نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ نے توفیق عطا فرمائی تو اب میں نے اپنے شہر میں ایک پلاٹ خریدا ہے جس کی قیمت آٹھ ہزار پانچ سو مصری جنیہ ہے اور اس پلاٹ پر رہائش کے لیے گھر بنانے کے لیے میں نے مصر کے اسلامی بینک میں مبلغ سترہ ہزار پانچ سو مصری جنیہ بھی جمع کرا رکھی ہے۔ میرا سوال یہ ہے کیا اس پلاٹ پر زکوٰۃ واجب ہے؟ اگر واجب ہے تو کتنی؟ اس پلاٹ کی تعمیر کے لیے بینک میں جو رقم جمع کی گئی ہے' کیا اس پر زکوٰۃ ہے؟ اگر ہے تو کتنی؟

جواب اس زمین پر زکوٰۃ نہیں ہے جسے عمارت بنانے کے لیے رکھا گیا ہو خواہ یہ عمارت (ذاتی) رہائش کے لیے بنائی جائے یا کرایہ پر دینے کیلئے' کیونکہ زکوٰۃ تو اس زمین پر ہے جو تجارت و بیع کیلئے رکھی ہو۔ جو ذاتی استعمال یا رہائش کے لیے ہو جیسے کہ یہ زمین' تو اس پر زکوٰۃ نہیں لیکن بینک میں رکھی ہوئی رقم پر زکوٰۃ واجب ہو گی خواہ وہ مکان بنانے یا شادی کرنے پر ضرورت کی اشیاء خریدنے کے لیے رکھی ہو اور مقدار زکوٰۃ اڑھائی فی صد یعنی ایک ہزار میں سے صرف پچیس ہیں۔

—— شیخ ابن جبرین ——

زمین کی زکوٰۃ

سوال میرے پاس ایک پلاٹ ہے جسے میں استعمال میں نہیں لا رہا بلکہ اسے میں نے ضرورت کے لیے رکھا ہوا ہے۔ کیا اس پلاٹ پر زکوٰۃ واجب ہے؟ اور جب اس کی زکوٰۃ ادا کروں تو کیا ہر مرتبہ اس کی قیمت کا اندازہ مقرر کروں؟

جواب آپ پر اس پلاٹ کی زکوٰۃ نہیں ہے' کیونکہ سامان کی قیمت پر اس وقت زکوٰۃ واجب ہے جبکہ وہ بغرض تجارت ہو' زمین' جائداد' گاڑیوں اور قالینوں وغیرہ میں زکوٰۃ واجب نہیں ہے۔ اور اگر ان اشیاء سے مال یعنی روپیہ کمانا مقصود ہو بایں طور کہ یہ خرید و فروخت اور تجارت کے لیے ہوں تو پھر ان کی قیمت میں زکوٰۃ واجب ہو گی اور اگر یہ اشیاء بغرض تجارت نہ ہوں جیسا کہ آپ نے سوال میں پوچھا ہے تو ان میں زکوٰۃ نہیں ہے۔

—— شیخ ابن عثیمین ——

تجارتی زمین پر زکوٰۃ

سوال جو اراضی خرید و فروخت (تجارت) کے لیے ہوں ان کی زکوٰۃ کے بارے میں کیا حکم ہے؟

جواب جو زمینیں خرید و فروخت کے لیے ہوں اُن پر زکوٰۃ واجب ہے کیونکہ یہ سامان تجارت ہیں اور کتاب و سنت کے ان دلائل کے عموم میں داخل ہیں جو زکوٰۃ کے وجوب کے بارے میں نازل ہوئے جن میں سے ایک دلیل یہ ہے:

﴿ خُذۡ مِنۡ أَمۡوَٰلِهِمۡ صَدَقَةً تُطَهِّرُهُمۡ وَتُزَكِّيهِم بِهَا﴾ (التوبة٩/ ١٠٣)

"ان کے مالوں میں سے صدقہ لیجئے اور اس کے ذریعے ان کے ظاہر و باطن کو پاک کیجئے۔"

اور دوسری دلیل وہ حدیث ہے جس کو حضرت سمرہ بن جندب رضی اللہ عنہ نے روایت کیا ہے:

«إِنَّ رَسُولَ اللهِ ﷺ، كَانَ يَأْمُرُنَا أَنْ نُخْرِجَ الصَّدَقَةَ مِنَ الَّذِي نُعِدُّ لِلْبَيْعِ»(سنن أبي داود،

الزكاة، باب العروض إذا كانت للتجارة... الخ، ح: ١٥٦٢)

''رسول اللہ ﷺ ہمیں حکم دیا کرتے تھے کہ ہم اس مال کی زکوٰۃ ادا کریں جو ہم نے تجارت کے لیے تیار کیا ہو۔''

جمہور اہل علم کا یہی قول ہے اور یہی بات حق ہے۔ وصلی اللّٰہ وسلم علی نبینا محمد.

—— فتویٰ کمیٹی ——

تجارتی زمین پر زکوٰۃ واجب ہے

سوال بلدیہ نے مجھے ایک ایسی زمین دی ہے جس کی آمدنی بہت محدود ہے۔ یہ زمین میرے پاس تین سال سے ہے اور میرا ارادہ یہ ہے کہ جب بھی اس کی مناسب قیمت ملی میں اسے فروخت کر دوں گا' کیونکہ میرے لیے اس کا محل وقوع مناسب نہیں ہے؟ سوال یہ ہے کہ کیا اس زمین پر زکوٰۃ واجب ہے؟ اگر واجب ہے تو کیا میں گزشتہ تین سالوں کی زکوٰۃ ادا کروں یا ایک سال کی؟ فتویٰ دیجئے' اللہ تعالیٰ تمہیں برکت عطا فرمائے!

جواب اگر آپ نے اس زمین کے فروخت کرنے کا ارادہ کر لیا ہے تو اس کی قیمت پر زکوٰۃ ادا کرنا ہو گی جب کہ آپ کے ارادۂ فروخت کے وقت کے بعد ایک سال ہو جائے۔ حضرت سمرہ بن جندب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے:

«إِنَّ رَسُولَ اللهِ ﷺ، كَانَ يَأْمُرُنَا أَنْ نُخْرِجَ الصَّدَقَةَ مِنَ الَّذِي نُعِدُّ لِلْبَيْعِ»(سنن أبي داود، الزكاة، باب العروض إذا كانت للتجارة... الخ، ح: ١٥٦٢)

''رسول اللہ ﷺ ہمیں حکم دیا کرتے تھے کہ ہم اس مال کی زکوٰۃ ادا کریں جو ہم نے تجارت کے لیے تیار کیا ہو۔''

اور بھی کئی شواہد ہیں' جو اس حدیث کے معنی پر دلالت کر رہے ہیں۔ وباللّٰہ التوفیق۔

—— شیخ ابن باز ——

عمارتوں' مارکیٹوں اور زمینوں کی زکوٰۃ

سوال میرے بھائی کے پاس بہت سا مال ہے جو کہ عمارتوں' تجارتی مارکیٹوں اور زمینوں پر مشتمل ہے اور ان سب چیزوں کی آمدنی بھی ہے۔ میں نے اسے نصیحت کی کہ اپنے اصل مال تجارت کی زکوٰۃ ادا کیا کرو تو اس نے مجھے بتایا کہ اصل مال تجارت پر زکوٰۃ واجب نہیں ہے بلکہ زکوٰۃ تو صرف اس کے وصول ہونے والے کرایہ پر ہے جب کہ اس پر ایک سال گزر جائے اور اگر وہ کرایہ وصول کرنے کے بعد عمارت ہی پر خرچ کر دے تو زکوٰۃ واجب نہ ہو گی۔ کئی اور لوگ بھی ہیں جن کا عمل میرے اس بھائی کے عمل کی طرح ہے۔ تو کیا یہ عمل اسلام کی رو سے جائز ہے؟ کیا ایسا کرنے والا گناہ گار تو نہ ہو گا؟ کون سی جائداد ہے جس کے اصل اور نفع پر زکوٰۃ واجب نہیں ہے' حتیٰ کہ ایک سال گزر جائے؟ اس سلسلہ میں کوئی حد بھی مقرر ہے یا حکم ایک جیسا ہے خواہ جائداد کم ہو یا زیادہ؟

جواب انسان کے مال کی کئی قسمیں ہوتی ہیں مثلاً نقدی تو اس پر زکوٰۃ واجب ہے جب کہ نقدی نصاب کو پہنچ جائے اور اس پر ایک سال گزر جائے۔ زرعی زمین کی پیداوار مثلاً دانوں اور پھلوں کی زکوٰۃ اس دن واجب ہے جس دن پھلوں کو توڑا اور کھیتی کو کاٹا جائے۔ زرعی زمین کی اصل قیمت نہیں بلکہ اس کی پیداوار پر زکوٰۃ ہے۔ جو زمین یا عمارت کرایہ پر دی گئی ہو

تو سال گزرنے کے بعد اس کے کرایہ پر زکوٰۃ ہے بشرطیکہ کرایہ نصاب کے بقدر ہو' اس زمین یا عمارت کی قیمت پر زکوٰۃ نہیں ہے۔ ہاں البتہ وہ زمین یا عمارت یا دیگر سازوسامان جو بغرض تجارت ہو تو اس کی قیمت پر سال مکمل ہونے پر زکوٰۃ واجب ہو گی بشرطیکہ قیمت نصاب کے برابر ہو۔ اس صورت میں نفع کو بھی اصل زر کے ساتھ شامل کر لیا جائے گا۔ اسی طرح چوپائے جانوروں میں بھی زکوٰۃ واجب ہے جب کہ وہ نصاب کے مطابق ہوں اور ان پر ایک سال گزر جائے۔ وباللہ التوفیق۔

——— فتویٰ کمیٹی ———

مکانوں اور مارکیٹوں کے کرایہ کی زکوٰۃ

سوال ایک آدمی کے پاس بہت سے مکانات ہیں جنہیں وہ کرایہ پر دے کر سال میں بہت سامال کماتا ہے۔ کیا اس پر اس مال کی زکوٰۃ واجب ہے؟ زکوٰۃ کب واجب ہو گی؟ اور کس قدر واجب ہو گی؟

جواب جب مکان یا دوکان وغیرہ سے حاصل ہونے والے کرایہ پر ایک سال گزر جائے تو اس میں زکوٰۃ واجب ہے' جب کہ وہ نصاب کے مطابق ہو۔ کرایہ سے حاصل ہونے والی رقم کو اگر سال مکمل ہونے سے پہلے اپنی ضرورتوں پر خرچ کر لیا جائے تو پھر اس میں زکوٰۃ واجب نہیں ہے۔ شرح زکوٰۃ اڑھائی فی صد سالانہ ہے اور اس پر تمام مسلمانوں کا اجماع ہے' سونے کا نصاب بیس مثقال ہے سعودی اور افرنگی گنی کے مطابق اس کی مقدار 3/7 11 گنی ہے۔ چاندی کا نصاب ایک سو چالیس مثقال ہے اور اس کی مقدار چاندی کے چھپن سعودی ریال کے برابر ہے۔

——— شیخ ابن باز ———

کرایہ پر دی ہوئی جائداد کی زکوٰۃ

سوال میرے پاس کچھ جائداد ہے جس سے سالانہ آمدنی نہیں ہوتی بلکہ وہ مدرسین کو نو(۹) ماہ کے لیے کرایہ پر دی جاتی ہے اور کچھ جائداد ایسی ہے جو ایک سال کے لیے کرایہ پر دی جاتی ہے۔ جب مجھے کرایہ وصول ہوتا ہے تو میں چاہتا ہوں کہ فریضہ زکوٰۃ سے بھی عہدہ برآ ہو جاؤں۔ جس جائداد کو ماہوار کرایہ پر دیا ہو کیا اس میں زکوٰۃ واجب ہے؟

جواب جس جائداد کو کرایہ پر دیا گیا ہو اس کے کرایہ پر زکوٰۃ واجب ہے بشرطیکہ وجوب زکوٰۃ کی شرائط موجود ہوں مثلاً کرایہ کی رقم نصاب کے مطابق ہو اور کرایہ وصول ہونے کے بعد اس پر ایک سال گزر گیا ہو' کرایہ پر دی جانے والی جائداد کی قیمت پر زکوٰۃ نہیں ہے الا یہ کہ صاحب جائداد نے اسے خریدا ہی اس لیے ہو کہ وہ زکوٰۃ سے راہ فرار اختیار کر سکے تو پھر اس کے ارادہ کے برعکس اس سے معاملہ کیا جائے گا۔

——— فتویٰ کمیٹی ———

گھروں اور گاڑیوں کی زکوٰۃ

ایک آدمی کے پاس کچھ گاڑیاں اور گھر ہیں اور وہ ان سے حاصل ہونے والی آمدنی اپنے اہل و عیال پر خرچ کر دیتا

ہے اور سال بھر اس میں سے وہ کچھ بھی نہیں بچا سکتا' تو کیا اس مال کی زکوٰۃ اس پر واجب ہے؟ گاڑیوں اور گھروں پر زکوٰۃ کب واجب ہو گی؟ اور اس کی کیا مقدار ہو گی؟

جواب گھر اور گاڑیاں جب ذاتی استعمال کے لیے یا اس لیے ہوں کہ ان سے حاصل ہونے والی آمدنی کو گھریلو ضروریات کے لیے خرچ کیا جائے گا تو ان میں زکوٰۃ نہیں ہے۔ اگر تمام یا بعض گھر اور گاڑیاں بغرض تجارت ہوں تو سال گزرنے کے بعد ان کی قیمت پر زکوٰۃ واجب ہو گی اور اگر سال پورا ہونے سے پہلے آپ انہیں گھریلو ضروریات یا نیکی کے کاموں میں خرچ کر دیں تو آپ پر زکوٰۃ نہیں ہے.....' کیونکہ اس سلسلہ میں وارد آیات و احادیث کے عموم سے یہی معلوم ہوتا ہے۔

امام ابوداود رحمہ اللہ نے حسن سند کے ساتھ نبی کریم ﷺ کی یہ حدیث بیان فرمائی ہے:

«إِنَّ رَسُولَ اللهِ ﷺ، كَانَ يَأْمُرُنَا أَنْ نُخْرِجَ الصَّدَقَةَ مِنَ الَّذِي نُعِدُّ لِلْبَيْعِ»(سنن أبي داود، الزكاة، باب العروض إذا كانت للتجارة. . .الخ، ح: ١٥٦٢)

"رسول اللہ ﷺ ہمیں حکم کرتے تھے کہ ہم اس مال کی زکوٰۃ ادا کریں جو ہم نے بغرض تجارت تیار کیا ہو۔"

—— شیخ ابن باز ——

کرایہ کے لیے استعمال کی جانے والی گاڑیوں کی زکوٰۃ

سوال بسوں' ٹرکوں اور ٹیکسیوں وغیرہ کی زکوٰۃ کس طرح نکالی جائے گی؟ کیا ان کی قیمت پر زکوٰۃ ہو گی یا ان کے کرایہ سے حاصل ہونے والی آمدنی پر؟

جواب جب تک ان گاڑیوں کو کرایہ پر دینے کے لیے استعمال کیا جائے تو زکوٰۃ ان سے وصول ہونے والی آمدنی پر ہو گی' جب کہ سال گزر جائے۔ ان کی قیمت پر زکوٰۃ نہیں ہو گی۔

—— فتویٰ کمیٹی ——

نقل و حمل کے لیے استعمال کی جانے والی گاڑیوں پر زکوٰۃ نہیں

سوال وہ تجارتی گاڑیاں جنہیں سواری اور بار برداری کے لیے استعمال کیا جاتا ہے کیا ان پر زکوٰۃ واجب ہے؟

جواب وہ گاڑیاں اور اونٹ جنہیں ایک شہر سے دوسرے شہر میں سواری اور بار برداری کے لیے استعمال کیا جاتا ہے ان میں زکوٰۃ نہیں کیونکہ وہ تجارت کے لیے نہیں بلکہ نقل و حمل کے لیے استعمال کئے جاتے ہیں اور اگر گاڑیاں یا اونٹ تجارت کے لیے ہوں تو ان میں زکوٰۃ واجب ہے کیونکہ حضرت سمرۃ بن جندب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے:

«إِنَّ رَسُولَ اللهِ ﷺ، كَانَ يَأْمُرُنَا أَنْ نُخْرِجَ الصَّدَقَةَ مِنَ الَّذِي نُعِدُّ لِلْبَيْعِ»(سنن أبي داود، الزكاة، باب العروض إذا كانت للتجارة. . .الخ، ح: ١٥٦٢)

"رسول اللہ ﷺ ہمیں حکم کرتے تھے کہ ہم اس مال کی زکوٰۃ ادا کریں جو ہم نے بغرض تجارت تیار کیا ہو۔"

جمہور اہل علم کا یہی مذہب ہے جیسا کہ امام ابوبکر بن منذر رحمہ اللہ نے بیان کیا ہے۔

—— مستقل کمیٹی ——

پریس کا مالک زکوٰۃ کس طرح ادا کرے؟

سوال ایک پریس کے مالک نے یہ سوال کیا ہے کہ وہ اپنے پریس کی زکوٰۃ کس طرح ادا کرے؟ کچھ لوگوں نے کہا ہے کہ زکوٰۃ پریس کی آمدنی پر ہے جب کہ کچھ لوگوں نے یہ کہا ہے کہ زکوٰۃ پریس کی مشینری اور پرنٹنگ کے سازوسامان پر ہے نیز اس کی آمدنی پر بھی' تو اس سلسلہ میں صحیح بات کیا ہے؟

جواب پریس اور فیکٹری وغیرہ کے مالکان پر زکوٰۃ ان اشیاء میں واجب ہے جو بغرض تجارت ہوں اور وہ اشیاء جو استعمال کے لیے ہوں ان میں زکوٰۃ نہیں ہے۔ اسی طرح ان گاڑیوں' قالینوں اور برتنوں وغیرہ میں بھی زکوٰۃ نہیں ہے جو استعمال کے لیے ہوں' کیونکہ امام ابوداود رحمہ اللہ نے سنن میں حسن سند کے ساتھ حضرت سمرہ بن جندب رضی اللہ عنہ سے روایت بیان کی ہے:

«إِنَّ رَسُولَ اللهِ ﷺ، كَانَ يَأْمُرُنَا أَنْ نُخْرِجَ الصَّدَقَةَ مِنَ الَّذِي نُعِدُّ لِلْبَيْعِ»(سنن أبي داود، الزكاة، باب العروض إذا كانت للتجارة... الخ، ح:١٥٦٢)

"رسول اللہ ﷺ ہمیں حکم دیا کرتے تھے کہ ہم اس مال میں سے زکوٰۃ ادا کریں جو ہم نے بغرض تجارت تیار کیا ہو۔"

نقدی' سونے' چاندی اور کرنسی نوٹوں پر زکوٰۃ واجب ہے خواہ وہ ذاتی اخراجات ہی کے لیے کیوں نہ ہوں لیکن شرط یہ ہے کہ وہ نصاب کے مطابق ہوں اور ان پر ایک سال گزر گیا ہو۔ وباللہ التوفیق۔

——— شیخ ابن باز ———

دکان کے سامان مثلاً کپڑوں وغیرہ کی زکوٰۃ

سوال ایک آدمی کی دوکانیں ہیں جن میں مختلف قسم کے سامان مثلاً کپڑے' جوتے اور عطریات وغیرہ فروخت ہوتے ہیں تو وہ زکوٰۃ کس طرح ادا کرے؟

جواب ہر وہ شخص جس کے پاس سامان تجارت ہو خواہ وہ کپڑے ہوں یا کچھ اور ان کی قیمت پر اور اس کے پاس موجود نقدی پر زکوٰۃ واجب ہے' کیونکہ امام ابوداود رحمہ اللہ نے حسن سند کے ساتھ حضرت سمرۃ بن جندب رضی اللہ عنہ کی یہ روایت بیان کی ہے:

«إِنَّ رَسُولَ اللهِ ﷺ، كَانَ يَأْمُرُنَا أَنْ نُخْرِجَ الصَّدَقَةَ مِنَ الَّذِي نُعِدُّ لِلْبَيْعِ»(سنن أبي داود، الزكاة، باب العروض إذا كانت للتجارة... الخ، ح:١٥٦٢)

"رسول اللہ ﷺ ہمیں حکم دیا کرتے تھے ہم اس مال کی زکوٰۃ ادا کریں جو ہم نے بغرض تجارت تیار کر رکھا ہو۔"

علاوہ ازیں ان دیگر دلائل سے بھی یہی ثابت ہوتا ہے جنہیں اہل علم نے سامان تجارت کی زکوٰۃ کے باب میں ذکر کیا ہے۔

——— شیخ ابن باز ———

پالتو جانوروں کی زکوٰۃ

سوال کیا میرے لیے پالتو جانوروں کے فارم کی زکوٰۃ ادا کرنا بھی ضروری ہے؟

جواب مسلمان کے وہ تمام اموال جو تجارت کے لیے ہوں' خواہ وہ حیوان ہوں یا غیر حیوان' ان میں زکوٰۃ ہے' سال پورا ہونے پر ان کی جو قیمت ہو گی اس میں سے زکوٰۃ ادا کی جائے گی۔ امام ابوداود رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت سمرہ بن جندب رضی اللہ عنہ سے مروی یہ حدیث بیان کی ہے:

«إِنَّ رَسُولَ اللهِ ﷺ كَانَ يَأْمُرُنَا أَن نُّخْرِجَ الصَّدَقَةَ مِنَ الَّذِي نُعِدُّ لِلْبَيْعِ»(سنن أبي داود، الزكاة، باب العروض إذا كانت للتجارة ... الخ، ح:١٥٦٢)

''رسول اللہ ﷺ ہمیں حکم دیا کرتے تھے کہ ہم اس مال کی زکوٰۃ ادا کریں جو ہم نے تجارت کیلئے تیار کر رکھا ہو۔''

اس کے علاوہ اور بھی بہت سے دلائل ہیں' زکوٰۃ ادا کرتے وقت قیمت خرید کو نہیں دیکھا جائے گا بلکہ سال پورا ہونے پر سامان تجارت کی جو قیمت ہو گی اسے دیکھا جائے گا' خواہ (اس وقت) اس کی قیمت' قیمت خرید سے کم ہو یا زیادہ۔

—— شیخ ابن باز ——

حصص کی زکوٰۃ

حصص جائداد کی زکوٰۃ

سوال آپ سے یہ بات مخفی نہیں ہے کہ آج کل لوگ جائداد کے حصص کی صورت میں کاروبار کرتے ہیں اور اس طرح بہت سا سرمایہ جامد ہو جاتا ہے' جس میں کمی بیشی ہوتی رہتی ہے' لیکن سرمایہ چار پانچ سال یا اس سے کم و بیش مدت کے لیے جامد ہو جاتا ہے اور مالک جب اپنے حصص بازار میں فروخت کرنا چاہتا ہے تو کبھی تو ان کی قیمت ان کی قیمت خرید کے مطابق ہوتی ہے اور کبھی اس سے کم اور کبھی کئی سال ایک ہی قیمت رہتی ہے۔ اسی طرح بسااوقات اراضی کی خریداری پر سرمایہ خرچ کر دیا جاتا ہے اور بازار میں جب زمین کی قیمت بڑھ جائے تو پھر اسے فروخت کر دیا جاتا ہے۔ سوال یہ ہے کیا جائداد کے ان حصص کی ہر سال زکوٰۃ ادا کرنا لازم ہے جنہیں ابھی تک فروخت نہیں کیا گیا اور عرصہ دراز سے جن کی قیمت میں بھی ابھی تک کوئی اضافہ نہیں ہوا بلکہ امکان ہے کہ بازار میں ان کی قیمت کم ہو گئی ہو؟ اسی طرح سوال یہ ہے کہ وہ اراضی جسے کمائی کرنے کے لیے خریدا گیا ہو' کیا اس پر بھی ہر سال زکوٰۃ لازم ہے جس طرح دیگر سامان تجارت پر ہر سال زکوٰۃ لازم ہوتی ہے یا مالک اس وقت زکوٰۃ ادا کرے جب اسے فروخت کرے؟ بعض علماء کا یہی قول ہے کہ بسااوقات کئی سال گزرنے کے باوجود اس کی قیمت ایک جیسی ہی رہتی ہے اور اس میں کوئی اضافہ نہیں ہوتا اور اگر اس پر زکوٰۃ ہے تو کیا ہر سال ہے یا صرف ایک بار؟ اور جب وہ اسے فروخت کرے تو کیا گزشتہ تمام سالوں کی زکوٰۃ ادا کرے یا صرف ایک سال کی؟ یاد رہے بسااوقات آدمی کا ان جائدادوں اور حصص کی صورت میں مال تو بہت ہوتا ہے لیکن زکوٰۃ ادا کرنے کے لیے وہ قرض لینے یا جائداد کے کچھ حصے کو فروخت کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے' کیونکہ زکوٰۃ ادا کرنے کے لیے نقد رقم اس کے پاس نہیں ہوتی؟

جواب سوال میں مذکور سامان تجارت کے حصص میں زکوٰۃ واجب ہے۔ ہر سال ان کی قیمت کا تعین کر کے زکوٰۃ ادا کی جائے گی یہ نہیں دیکھا جائے گا کہ ان کی قیمت خرید کیا تھی؟ اگر اس کے پاس مال موجود ہو تو زکوٰۃ ادا کر دے ورنہ انہیں بیچنے کے بعد جب ان کی قیمت حاصل کر لی جائے تو اس میں سے گزشتہ سالوں کی زکوٰۃ ادا کر دی جائے اسی طرح وہ جائدادیں جو تجارت کے لیے تو ہوں لیکن ان میں مذکورہ حصص کی صورت نہ ہو تو ان کی زکوٰۃ کا بھی یہی حکم ہے۔

——— فتویٰ کمیٹی ———

زیورات کی زکوٰۃ

زیورات کی زکوٰۃ کے بارے میں صحیح قول اور زیورات کی زکوٰۃ کا طریقہ

سوال خواتین جو زیورات زینت کے لیے استعمال کرتی ہیں' ائمہ اربعہ ---جزاھم اللہ خیر الجزاء--- کی آراء ان زیورات کی زکوٰۃ کے بارے میں مختلف ہیں۔ کسی نے کہا کہ ان میں زکوٰۃ مشروط طور پر واجب ہے' کسی نے کہا کہ ان میں زکوٰۃ واجب ہی نہیں ہے اور کسی نے یہ کہا ہے کہ ان میں کسی بھی قسم کی شرط کے بغیر زکوٰۃ واجب ہے۔ آپ کے نزدیک ان میں سے کون سی رائے مناسب ہے؟ جزاکم اللہ خیرًا

نیز اگر زیورات میں زکوٰۃ واجب ہے تو کیا وہ بازار کے موجودہ نرخ کے مطابق نکالی جائے؟...... حالانکہ اگر انسان انہیں بازار میں بیچنا چاہے تو اسے وہ قیمت نہیں مل سکتی جس پر اس نے خریدا تھا..... یا اس پرانے نرخ کے مطابق ادا کرے جس پر اس نے خریدا تھا؟

جواب بلاشبہ استعمال ہونے والے زیورات کی زکوٰۃ کے بارے میں قدیم و جدید ہر دور میں بہت اختلاف رہا ہے لیکن میرے نزدیک مختار قول یہ ہے کہ ہر سال زیورات کی زکوٰۃ ادا کرنا لازم ہے' خواہ خواتین انہیں پہنتی ہی کیوں نہ ہوں کیونکہ اس قول کے دلائل بہت قوی ہیں۔ زکوٰۃ ادا کرتے وقت ان کی موجودہ قیمت کا حساب لگایا جائے گا اور اس کے حساب سے زکوٰۃ ادا کی جائے گی' یہ نہیں دیکھا جائے گا کہ ان کی قیمت خرید کیا تھی' خواہ وہ کم تھی یا زیادہ اور پھر کل قیمت کا چالیسواں حصہ (یعنی اڑھائی فی صد) بطور زکوٰۃ ادا کر دیا جائے گا۔ واللہ اعلم

——— شیخ ابن جبرین ———

چاندی کے زیورات کی زکوٰۃ

سوال میرے پاس گردن' ہاتھوں' سر اور سینے کے زیورات کی صورت میں کچھ چاندی ہے۔ میں نے اپنے شوہر سے کئی بار یہ مطالبہ کیا ہے کہ وہ اسے بیچ کر اس کی زکوٰۃ ادا کرے لیکن اس کا کہنا ہے کہ یہ نصاب سے کم ہے اور اب تقریباً ۲۴ برس گزر گئے ہیں کہ میں نے اس کی زکوٰۃ ادا نہیں کی' تو سوال یہ ہے کہ اب مجھے کیا کرنا چاہیے؟

جواب اگر یہ چاندی نصاب سے کم ہے تو اس پر زکوٰۃ نہیں ہے۔ یاد رہے چاندی کا نصاب ایک سو چالیس مثقال ہے جو

کہ چاندی کے چھپن ریال کے برابر ہے' لہٰذا چاندی کے زیورات اگر اس مقدار میں ہوں تو علماء کے صحیح ترین قول کے مطابق ان میں زکوٰۃ واجب ہے بشرطیکہ ایک سال گزر جائے۔ زکوٰۃ کی شرح اڑھائی فی صد سالانہ ہے یعنی سو میں سے اڑھائی ریال اور ایک ہزار ریال میں سے پچیس ریال زکوٰۃ ہے۔

سونے کا نصاب بیس مثقال ہے اور اس کی مقدار ساڑھے گیارہ سعودی گنی یا بانوے گرام ہے' لہٰذا جب سونے کے زیور کا یہ وزن ہو یا اس سے زیادہ ہو تو علماء کے صحیح ترین قول کے مطابق اس میں زکوٰۃ واجب ہو گی اور شرح زکوٰۃ چالیسواں حصہ یعنی ایک سو گنی میں سے اڑھائی گنی ہے یا پیپر کرنسی یا چاندی کے سکوں کی صورت میں اس کی جو قیمت بنے اور زیورات کا وزن اگر اس سے زیادہ ہو تو اسی حساب سے زکوٰۃ ادا کی جائے گی۔ نبی کریم ﷺ نے فرمایا ہے:

«مَا مِنْ صَاحِبِ ذَهَبٍ وَلاَ فِضَّةٍ، لاَ يُؤَدِّي مِنْهَا حَقَّهَا، إِلاَّ إِذَا كَانَ يَوْمُ الْقِيَامَةِ، صُفِّحَتْ لَهُ صَفَائِحُ مِنْ نَارٍ، فَأُحْمِيَ عَلَيْهَا فِي نَارِ جَهَنَّمَ فَيُكْوٰى بِهَا جَنْبُهُ وَجَبِينُهُ وَظَهْرُهُ، كُلَّمَا بَرَدَتْ أُعِيدَتْ لَهُ، فِي يَوْمٍ كَانَ مِقْدَارُهُ خَمْسِينَ أَلْفَ سَنَةٍ، حَتَّى يُقْضٰى بَيْنَ الْعِبَادِ، فَيَرٰى سَبِيلَهُ، إِمَّا إِلَى الْجَنَّةِ، وَإِمَّا إِلَى النَّارِ»(صحيح مسلم، الزكاة، باب إثم مانع الزكاة، ح:٩٨٧)

"سونے اور چاندی کا ہر وہ مالک جو ان کی زکوٰۃ ادا نہیں کرتا' تو قیامت کے دن سونے چاندی کو جہنم کی آگ میں پتروں کی صورت میں ڈھال کر ان کے ساتھ اس کی پیشانی' پہلو اور پشت کو اس دن داغا جائے گا جس کی مقدار پچاس ہزار سال کے برابر ہے اور یہ عذاب اس وقت تک جاری رہے گا جب تک کہ تمام انسانوں کا حساب مکمل نہیں ہو جائے گا' پھر یہ اپنے راستہ کو دیکھے گا کہ وہ جنت کی طرف ہے یا جہنم کی طرف۔!"

حضرت عبداللہ بن عمرو بن عاص ؓ کی روایت میں ہے کہ نبی ﷺ نے اس عورت سے فرمایا جو آپ کے پاس آئی اور اس کی بیٹی کے ہاتھ میں سونے کے دو کنگن تھے "کیا تو اس کی زکوٰۃ ادا کرتی ہے؟" اس نے کہا نہیں تو آپ نے فرمایا:

أَيَسُرُّكِ أَنْ يُسَوِّرَكِ اللهُ بِهِمَا يَوْمَ الْقِيَامَةِ سِوَارَيْنِ مِنْ نَارٍ؟ فَأَلْقَتْهُمَا، وَقَالَتْ: هُمَا للهِ وَلِرَسُولِهِ»(سنن أبي داود، الزكاة، باب الكنز ما هو؟ وزكاة الحلي، ح:١٥٦٣)

"کیا تجھے یہ بات پسند ہے کہ قیامت کے دن اللہ تعالیٰ ان کی بجائے جہنم کی آگ کے دو کنگن پہنا دے؟ اس عورت نے وہ دونوں کنگن اتار پھینکے اور کہا یہ دونوں کنگن اللہ اور اس کے رسول کے لیے ہیں۔"

اور اس مضمون کی اور بھی بہت سی احادیث ہیں۔ واللہ ولی التوفیق۔

—— شیخ ابن باز ——

زیورات' الماس اور قیمتی پتھروں کی زکوٰۃ

سوال میں ایک شادی شدہ عورت ہوں۔ میری عمر تقریباً تیس سال ہے اور قریباً چوبیس سال سے میرے پاس سونے کے ہار ہیں جو بغرض تجارت نہیں بلکہ زیب و زینت کے لیے تیار کیے گئے ہیں۔ کبھی کبھی ان میں سے کچھ فروخت کر کے اور

کچھ رقم مزید خرچ کر کے میں ان سے بھی زیادہ خوبصورت ہار خرید لیتی ہوں۔ اب بھی میرے پاس زیورات ہیں اور میں نے سنا ہے کہ بطور زینت استعمال کئے جانے والے زیورات میں بھی زکوٰۃ واجب ہے۔ امید ہے آپ اس مسئلہ کی وضاحت فرما دیں گے اور اگر مجھ پر زکوٰۃ واجب ہے تو اس گزشتہ مدت کے بارے میں کیا حکم ہے جس میں میں نے زکوٰۃ ادا نہیں کی اور نہ اب مجھے یہ علم ہے کہ گزشتہ سالوں میں میرے پاس کتنا سونا تھا؟

جواب آپ پر زکوٰۃ اس وقت سے واجب ہو گی جب سے آپ کو یہ معلوم ہوا کہ زیورات میں زکوٰۃ واجب ہے۔ وجوب زکوٰۃ کے علم سے پہلے سالوں کی زکوٰۃ واجب نہیں ہے' کیونکہ احکام شرعیہ علم کے بعد لازم ہوتے ہیں۔ شرح زکوٰۃ چالیسواں حصہ ہے بشرطیکہ زیورات کی مقدار نصاب کے مطابق ہو۔ سونے کا نصاب بیس مثقال ہے اور یہ ساڑھے گیارہ سعودی گنی کے برابر ہے' لہٰذا زیورات کا وزن اگر بیس مثقال یا اس سے زیادہ ہو تو زکوٰۃ واجب ہے۔

شرح زکوٰۃ ایک ہزار میں سے پچیس ریال ہیں۔ چاندی کا نصاب ایک سو چالیس مثقال ہے اور یہ چاندی کے چھپن ریال یا اس کی کرنسی نوٹوں میں جو قیمت ہو اس کے برابر ہیں۔ سونے کی طرح چاندی کی جو قیمت ہو اس میں شرح زکوٰۃ چالیسواں حصہ ہے۔

الماس اور دیگر قیمتی پتھر اگر پہننے کے لیے ہوں تو ان میں زکوٰۃ نہیں ہے اور اگر تجارت کے لیے ہوں تو ان میں زکوٰۃ ہے بشرطیکہ ان کی قیمت سونے اور چاندی کے نصاب کے برابر ہو۔ واللہ ولی التوفیق۔

——— شیخ ابن باز ———

خاتون نے جہالت کی وجہ سے زیورات کی زکوٰۃ ادا نہیں کی

سوال ایک عورت کے پاس نصاب کے مطابق سونا ہے اور اسے قریباً پانچ سال بعد یہ علم ہوا کہ اس پر زکوٰۃ واجب ہے اور اب وہ اس کی زکوٰۃ ادا کرنا چاہتی ہے لیکن اس سونے کے علاوہ اس کے پاس اور کچھ نہیں ہے' لہٰذا سوال یہ ہے کہ وہ گزشتہ پانچ سالوں کی زکوٰۃ کے حوالہ سے کیا کرے؟ کیا کچھ سونا بیچ کر زکوٰۃ ادا کر دے یا کیا کرے؟ اور آئندہ سالوں میں وہ کیا کرے؟ اگر وہ اس سونے کی یکبار زکوٰۃ ادا کرنا چاہے تو اس کے بغیر اور کوئی چارہ کار نہیں کہ وہ ہر سال کچھ سونا بیچ دے' کیونکہ اس کے علاوہ اس کے پاس اور کوئی تھوڑا بہت سرمایہ نہیں ہے؟

جواب اس عورت کو مستقبل میں اپنے زیورات کی ہر سال زکوٰۃ ادا کرنا ہو گی بشرطیکہ زیورات نصاب کے بقدر ہوں اور نصاب بیس مثقال ہے جو کہ 3/7 11 مثقال سعودی گنی کے برابر ہے' گرام کے حساب سے یہ بانوے گرام کے برابر ہے' زکوٰۃ ادا کرنا واجب ہے خواہ یہ سونے یا اپنی کسی اور چیز کو بیچ کر ادا کرے اگر اس کی اجازت سے اس کی طرف سے اس کا شوہر یا باپ وغیرہ زکوٰۃ ادا کر دے تو پھر بھی کوئی حرج نہیں ورنہ جب تک یہ ادا نہیں کرے گی زکوٰۃ اس کے ذمہ قرض ہو گی۔ وجوب زکوٰۃ کے علم سے پہلے گزشتہ سالوں کی زکوٰۃ کے حوالے سے اس پر کچھ واجب نہیں ہے' کیونکہ ایک تو اسے وجوب زکوٰۃ کا علم ہی نہیں تھا اور دوسرے یہ کہ اس وجوب میں کچھ شبہ بھی ہے' کیونکہ بعض اہل علم کے نزدیک ان زیورات میں زکوٰۃ واجب نہیں ہے جو پہنے جاتے ہوں یا پہننے کے لیے تیار کئے گئے ہوں لیکن راجح ترین بات یہی ہے کہ زیورات میں زکوٰۃ واجب ہے بشرطیکہ ان کا وزن نصاب کے مطابق ہو اور ایک سال کی مدت گزر جائے۔ کتاب و سنت کے دلائل سے یہی بات صحیح معلوم ہوتی ہے۔ واللہ ولی التوفیق

—————— شیخ ابن باز ——————

زیورات کی زکوٰۃ ان کے مالک پر ہے

سوال میری بیوی کے پاس سونا ہے جسے وہ پہنتی ہے اور وہ نصاب کے مطابق ہے تو کیا اس میں زکوٰۃ ہے؟ کیا ان زیورات کی زکوٰۃ ادا کرنا مجھ پر واجب ہے یا میری بیوی پر؟ کیا وہ زکوٰۃ زیور ہی کی صورت میں نکالے یا اس کی قیمت کا حساب لگا کر کرنسی کی صورت میں بھی زکوٰۃ ادا کر سکتی ہے؟

جواب سونے اور چاندی کے زیورات میں زکوٰۃ واجب ہے جب ان کا وزن نصاب کے مطابق ہو۔ سونے کا نصاب بیس اور چاندی کا ایک سو چالیس مثقال ہے۔ موجودہ پیمانے کے مطابق سونے کے نصاب کی مقدار $11\frac{3}{7}$ سعودی گنی ہے' لہٰذا سونے کی زیورات کا جب یہ یا اس سے زیادہ وزن ہو تو علماء کے صحیح ترین قول کے مطابق ان میں زکوٰۃ واجب ہے' خواہ وہ زیورات پہننے ہی کے لیے ہوں۔

چاندی کے نصاب کی مقدار چھپن سعودی ریال ہے' لہٰذا جب چاندی کے زیورات اس مقدار یا اس سے زیادہ میں ہوں تو ان میں زکوٰۃ واجب ہے۔ سونے' چاندی اور سامان تجارت میں شرح زکوٰۃ چالیسواں حصہ یعنی سو میں اڑھائی اور ہزار میں سے پچیس ہے اور جیسے مالیت زیادہ ہو گی' زکوٰۃ بھی اسی حساب سے ہو گی۔

زکوٰۃ زیورات کی مالکہ پر واجب ہے۔ اگر اس کی اجازت سے اس کا شوہر یا کوئی اور اس کی طرف سے زکوٰۃ ادا کر دے تو کوئی مضائقہ نہیں۔ یہ ضروری نہیں ہے کہ زیورات ہی کی صورت میں زکوٰۃ ادا کی جائے بلکہ یہ بھی جائز ہے کہ سال مکمل ہونے پر بازار میں سونے چاندی کی جو قیمت ہو تو اس کے حساب سے اڑھائی فی صد کی شرح سے زکوٰۃ ادا کر دی جائے...

—————— شیخ ابن باز ——————

کیا الماس میں زکوٰۃ ہے؟

سوال الماس جسے پہننے اور زینت کے لیے استعمال کیا جاتا ہے' کیا اس میں بھی زکوٰۃ ہے؟

الماس جسے زینت اور پہننے کے لیے استعمال کیا جائے اس میں زکوٰۃ نہیں ہے اور اگر تجارت کے لیے ہو تو اس میں زکوٰۃ ہے۔ اسی طرح موتیوں کے بارے میں بھی یہی حکم ہے لیکن سونے اور چاندی میں زکوٰۃ ہے جب کہ وہ نصاب کے مطابق ہوں خواہ پہننے ہی کے لیے ہوں۔ اس مسئلہ میں علماء کا صحیح ترین قول یہی ہے۔

—————— شیخ ابن باز ——————

نگینوں اور قیمتی پتھروں سے مرصع زیورات کی زکوٰۃ نکالنے کا طریقہ

سوال ایسے زیورات کی زکوٰۃ کس طرح نکالی جائے جو خالص سونے کے نہ ہوں بلکہ انواع و اقسام کے نگینوں اور قیمتی پتھروں سے مرصع ہوں؟ کیا ان نگینوں اور پتھروں کا بھی سونے کے ساتھ ہی وزن کیا جائے گا' کیونکہ انہیں سونے سے الگ کرنا تو بہت مشکل ہے؟

جواب زکوٰۃ تو سونے ہی میں ہے' خواہ وہ پہننے کے لیے ہو۔ قیمتی پتھروں' موتیوں اور الماس وغیرہ میں زکوٰۃ نہیں ہے اور ہاروں وغیرہ میں اگر یہ چیزیں لگی ہوں تو پھر عورت یا اس کے شوہر یا وارثوں کو چاہیئے کہ وہ بغور جائزہ لے کر خالص سونے کے وزن کا تعین کریں یا ماہر لوگوں سے پوچھ لیں اور ظن غالب کے مطابق اگر زیور کا وزن نصاب کے مطابق ہو تو اس کی زکوٰۃ ادا کر دی جائے۔ سونے کا نصاب بیس مثقال ہے۔ سعودی اور افرنگی گنی کے حساب سے یہ ساڑھے گیارہ گنی اور گرام کے حساب سے یہ بانوے گرام کے برابر ہے۔ زکوٰۃ ہر سال ادا کی جائے۔ شرح زکوٰۃ چالیسواں حصہ ہے۔ یعنی ہزار میں سے پچیس۔ اہل علم کے اقوال میں سے صحیح ترین قول یہی ہے۔ اگر زیورات تجارت کے لیے ہوں تو ان کی موتیوں اور الماس سمیت ان کے حسب قیمت زکوٰۃ ادا کی جائے گی جس طرح کہ دیگر سامان تجارت کی زکوٰۃ ادا کی جاتی ہے۔ جمہور اہل علم کا یہی مذہب ہے۔

——— شیخ ابن باز ———

وقف شدہ اور اس جیسے مال کی زکوٰۃ

مال وقف میں زکوٰۃ نہیں ہے

سوال ہمارے ہاں "جامعہ ملک سعود" میں طلبہ کے لیے ایک کیش بکس ہے جو مالی تعاون کے لیے رکھا گیا ہے' اس میں کیش جامعہ کی طرف سے مہیا کیا جاتا ہے اور تھوڑا سا حصہ طلبہ کے وظائف میں سے بالاقساط لیا جاتا ہے اور اس فنڈ سے ضرورت مند طلبہ کی اعانت کی جاتی ہے۔ کیا اس بکس میں موجود رقوم پر زکوٰۃ ہے؟

جواب مذکورہ بکس اور اس طرح کے دیگر اموال میں زکوٰۃ نہیں ہے' کیونکہ وہ ایسا مال ہے جس کا کوئی مالک نہیں ہے بلکہ وہ تو نیکی کے کاموں کے لیے وقف ہے اور یہ بھی ایسے تمام اموال ہی کی طرح ہے جنہیں نیکی کے کاموں کے لیے وقف کیا گیا ہوتا ہے۔

——— شیخ ابن باز ———

مال وقف میں زکوٰۃ کا حکم

سوال میرے پاس کچھ مال ہے جو اہل خیر نے مسجد بنانے کے لیے دیا ہے اور یہ میرے پاس ایک سال سے زیادہ عرصہ سے ہے تو کیا اس مال کی مجھ پر زکوٰۃ لازم ہے یا نہیں؟

جواب اس مال کی مطلقاً زکوٰۃ نہیں ہے' کیونکہ اس مال کے مالکوں نے اسے اللہ کی راہ میں خرچ کر دیا ہے۔ آپ کو چاہیئے کہ اس مال کو اس کے مصرف پر جلد خرچ کر دیں۔

——— شیخ ابن باز ———

باہمی تعاون کے لیے جمع کئے ہوئے مال پر زکوٰۃ کا حکم

سوال ایک جماعت کے افراد نے باہمی تعاون اور استفادہ کے لیے کچھ مال جمع کیا ہے کہ اگر کسی کو (اللہ نہ کرے) کوئی حادثہ پیش آ جائے یا عام حالات میں کسی کو کوئی ضرورت پیش آ جائے تو وہ اس سے استفادہ کر سکے۔ اس مال کو جمع کئے ہوئے ایک سال ہو گیا ہے۔ کیا اس پر زکوٰۃ ہے؟

جواب یہ اور ان جیسے دیگر ایسے اموال پر زکوٰۃ نہیں ہے جنہیں لوگوں نے مصالح عامہ اور نیکی و بھلائی کے کاموں میں تعاون کے لیے عطیہ کے طور پر دیئے ہوں' کیونکہ ان کے مالکان نے انہیں اللہ تعالیٰ کی رضا کے حصول کے لیے وقف کر دیا ہے اور ان کے فائدے فقیرودولت مند سب لوگوں کے لیے مشترک ہیں کہ انہیں پیش آمدہ حوادث کی وجہ سے لاحق ہونے والی مشکلات کے ازالہ کے لیے رکھا گیا ہے' لہٰذا انہیں ان کو ذاتی ملکیت سے خارج تصور کر کے ایسے صدقات کے حکم میں سمجھا جائے گا جو انہیں مقاصد کے لیے خرچ کئے جاتے ہیں جن کی خاطر وہ جمع کئے گئے ہوں۔

—— شیخ ابن باز ——

زکوٰۃ اور اموال اوقاف

سوال کیا مساجد کے لیے وقف شدہ اموال میں زکوٰۃ واجب ہے؟

جواب مساجد وغیرہ کے لیے وقف اموال میں زکوٰۃ نہیں ہے کیونکہ یہ اموال کسی کی ذاتی ملکیت نہیں ہوتے اور اس مسئلہ میں کوئی دوسری رائے نہیں ہے۔

—— فتویٰ کمیٹی ——

وقف میں زکوٰۃ نہیں

سوال مغرۃ میں واقع ایک نخلستان ہے جس میں درختوں کی چھ قطاریں ہیں۔ ایک کسان کو اس کی دیکھ بھال کے لیے اس شرط پر مقرر کیا گیا ہے کہ اسے پھل کا تین چوتھائی حصہ ملے گا اور ایک چوتھائی وصیت کرنے والے کو' تو کیا وصیت کرنے والے کے ایک چوتھائی حصہ میں زکوٰۃ ہے یا نہیں؟ یاد رہے وصیت کرنے والے کا ایک چوتھائی حصہ جس کے لیے وصیت کی گئی ہے اس کی ضرورت کے لیے کافی نہیں ہے۔

جواب اگر امر واقع اسی طرح ہے جس طرح سوال میں مذکور ہے تو وصیت کرنے والے کے حصہ میں زکوٰۃ واجب نہیں ہے' کیونکہ یہ وقف ہے اور اس کا سارا مصرف نیکی و بھلائی کا کام ہی ہے۔

—— فتویٰ کمیٹی ——

قرض دیے ہوئے مال کی زکوٰۃ

قرض کی زکوٰۃ

سوال میں نے ایک بھائی سے قرض لینا ہے' کیا اس قرض کی زکوٰۃ بھی مجھ پر لازم ہے؟

جواب اگر قرض ایسے لوگوں کے ذمہ ہو جو خوشحال اور مال خرچ کرنے والے ہوں کہ آپ جب بھی طلب کریں تو وہ آپ کا مال آپ کو دے دیں تو اس صورت میں سال گزرنے پر آپ کے لیے اس کی زکوٰۃ ادا کرنا لازم ہو گی' کیونکہ یہ صورت ایسی ہے کہ گویا مال آپ ہی کے پاس ہے اور ان کے پاس وہ امانت ہے اور اگر مقروض تنگ دست ہو کہ وہ اسے ادا ہی نہ کر سکتا ہو یا تنگ دست تو نہ ہو لیکن وہ ٹال مٹول سے کام لیتا ہو اور آپ اس سے واپس نہ لے سکتے ہوں تو اس صورت میں علماء کا صحیح قول یہ ہے کہ زکوٰۃ ادا کرنا لازم نہیں ہے حتیٰ کہ آپ اس ٹال مٹول سے کام لینے والے یا تنگ دست سے اپنا قرض واپس لے لیں۔ جب آپ اسے اپنے قبضہ میں لے لیں تو ایک سال تک انتظار کریں اور قبضہ میں لینے کے ایک سال بعد زکوٰۃ ادا کریں اور ان سابقہ سالوں کی اگر آپ ایک بار زکوٰۃ ادا کر دیں جن میں یہ مال تنگ دست یا ٹال مٹول کرنے والے کے پاس رہا تو پھر بھی کوئی حرج نہیں جیسا کہ بعض اہل علم نے یہ کہا ہے لیکن لازم مستقبل ہی میں ہو گی جب کہ آپ اپنا مال تنگ دست اور ٹال مٹول کرنے والے سے لیکر اپنے قبضہ میں لے لیں گے اور اس پر ایک سال بھی گزر جائے۔ اس مسئلہ میں یہی مختار قول ہے۔

——— شیخ ابن باز ———

قرض پر دیئے ہوئے مال کی زکوٰۃ

سوال میں نے ایک شخص کو کچھ مال بطور قرض دیا جس پر ایک سال گزر چکا ہے اور اس نے ابھی تک واپس نہیں کیا تو کیا میں اس مال کی زکوٰۃ ادا کر دوں یا اس کی واپسی کا انتظار کروں اور پھر قبضہ میں لینے کے بعد ایک سال کی زکوٰۃ ادا کروں؟

جواب اگر قرض کسی دولت مند اور خوش حال انسان کے پاس ہو کہ آپ جب چاہیں اس سے واپس لے لیں تو اس صورت میں ہر سال زکوٰۃ ادا کرنا لازم ہو گا' کیونکہ اس طرح مال گویا اس کے پاس امانت ہے' خواہ آپ نے اس کی سہولت کے لیے اس کے پاس مال چھوڑ رکھا ہو یا اس لیے کہ آپ کو اس کی ابھی ضرورت ہی نہیں اور اگر قرض کسی تنگ دست یا ٹال مٹول کرنے والے یا ادا نہ کر سکنے والے کے پاس ہو تو مختار اور راجح بات یہ ہے کہ اس میں اس وقت تک زکوٰۃ نہیں ہے جب تک آپ اسے اپنے قبضہ میں نہ لے لیں اور جب آپ اپنے قبضہ میں لے لیں تو پھر ایک سال کی زکوٰۃ ادا کر دیں' اگرچہ وہ مقروض کے پاس کئی سال تک رہا ہو۔ واللہ اعلم۔

——— شیخ ابن جبرین ———

قرض کو زکوٰۃ میں شمار کرنا جائز نہیں

سوال ہمارا ایک قریبی رشتہ دار فقیر و محتاج ہے۔ ہم اسے ہر سال اپنے مال کی زکوٰۃ دیا کرتے ہیں۔ کافی عرصہ قبل ہم نے اسے کچھ رقم بطور قرض دی لیکن وہ ابھی تک ہمیں واپس نہیں کر سکا' حالانکہ کئی سال گزر چکے ہیں۔ کیا یہ جائز ہے کہ ہم اسے یہ قرض معاف کر دیں اور اسے اس زکوٰۃ میں شمار کر لیں جو اسے ہم ان شاء اللہ اس سال دیں گے؟

جواب صحیح بات یہ ہے کہ مقروض کے ذمہ سے مایوسی یا وصولی میں تاخیر کی وجہ سے قرض کو ساقط کرنا اور اسے زکوٰۃ میں شمار کرنا جائز نہیں ہے' کیونکہ زکوٰۃ ایسا مال ہے جو فقراء کو ان کے فقر و ضرورت کی وجہ سے دیا جاتا ہے' ہاں البتہ اگر وہ فقیروں کو زکوٰۃ دے اور وہ اپنے قرض کو ادا کرنے کے لیے اسے واپس کر دیں تو یہ جائز ہے بشرطیکہ انہیں زکوٰۃ دینے سے قصدوارادہ یہ نہ ہو کہ وہ اسے واپس کر دیں گے۔

———— شیخ ابن جبرین ————

زکوٰۃ کی منتقلی اور مستحقین زکوٰۃ

ایک شہر سے دوسرے میں زکوٰۃ منتقل کرنا

سوال میں سعودی عرب میں اجنبی ہوں تو کیا میرے لیے یہ جائز ہے کہ میں یہاں سے اپنے ملک کے مستحق لوگوں کے پاس زکوٰۃ ارسال کر دوں؟ مستفید فرمائیں۔ اللہ تعالیٰ آپ کو برکت عطا فرمائے۔

جواب صحیح قول کے مطابق ایک جگہ سے دوسری جگہ زکوٰۃ منتقل کرنا جائز ہے جب کہ راجح مصلحت کا یہ تقاضا ہو مثلاً اس جگہ فقروفاقہ شدید ہو اور قریبی مسلمان ضرورت مند ہوں اور اس جیسی دیگر مصلحتیں' محض محبت و الفت کی وجہ سے زکوٰۃ کی منتقلی جائز نہیں جب کہ وہاں مستحق لوگ بھی موجود ہوں کہ اس طرح مستحق لوگ محروم ہو جائیں گے۔ اگر اپنے علاقے کے لوگوں کا استحقاق مشکوک ہو اور کسی دور کے علاقے کے اپنے قریبی رشتہ داروں کا استحقاق یقینی ہو تو پھر وہ زکوٰۃ کے زیادہ مستحق ہیں اور انہیں زکوٰۃ دینے میں زکوٰۃ کی ادائی بھی ہے اور صلہ رحمی بھی!

———— شیخ ابن جبرین ————

فقیر بھائی کو زکوٰۃ دینا

سوال میرا ایک شادی شدہ فقیر اور مقروض بھائی ہے اور ایک شادی شدہ بہن ہے جس کا شوہر بھی فقیر و مقروض ہے تو کیا میرے لیے یہ جائز ہے کہ میں اپنی ساری زکوٰۃ ان دونوں ہی کو دے دوں تاکہ ان کے قرض ادا ہو جائیں یا انہیں مال زکوٰۃ کا کچھ حصہ ہی دیا جا سکتا ہے؟

جواب ان دونوں کو زکوٰۃ دینے میں کوئی امر مانع نہیں جب کہ یہ مسلمان اور مقروض ہوں اور آپ کی زکوٰۃ سے ان کا

قرض ادا ہو سکتا ہو جس کے ادا کرنے کی وہ طاقت نہیں رکھتے' کیونکہ یہ دونوں ارشاد باری تعالیٰ میں داخل ہیں:

﴿ إِنَّمَا ٱلصَّدَقَٰتُ لِلۡفُقَرَآءِ وَٱلۡمَسَٰكِينِ﴾ (التوبۃ۹/ ٦٠)

"صدقات (زکوٰۃ و خیرات) تو مفلسوں اور محتاجوں کا حق ہے۔" وباللہ التوفیق۔

—— شیخ ابن باز ——

ماں کو زکوٰۃ دینا

سوال کیا اپنی والدہ کو زکوٰۃ دینا جائز ہے؟

جواب کسی مسلمان کے لیے یہ جائز نہیں کہ اپنے والدین یا اولاد کو زکوٰۃ دے اگر یہ ضرورت مند ہوں تو ان پر اصل مال کو خرچ کرنا چاہیے جب کہ اسے خرچ کرنے کی قدرت بھی ہو۔ وباللہ التوفیق

—— شیخ ابن باز ——

مسکین اور فقیر

سوال اس مسکین کی کیا تعریف ہے جسے زکوٰۃ دی جا سکتی ہے؟ نیز مسکین اور فقیر میں کیا فرق ہے؟

جواب مسکین وہ فقیر ہے جس کے پاس بقدر کفایت مال نہ ہو اور فقیر وہ ہے جو اس سے بھی زیادہ ضرورت مند ہو۔ یہ دونوں ان مستحقین زکوٰۃ میں سے ہیں جن کا حسب ذیل ارشاد باری تعالیٰ میں ذکر ہے:

﴿ إِنَّمَا ٱلصَّدَقَٰتُ لِلۡفُقَرَآءِ وَٱلۡمَسَٰكِينِ وَٱلۡعَٰمِلِينَ عَلَيۡهَا﴾ (التوبۃ۹/ ٦٠)

"صدقات (یعنی زکوٰۃ و خیرات) تو مفلسوں اور محتاجوں اور کارکنان زکوٰۃ کا حق ہے۔"

جس کے پاس اس قدر مال ہو جو اس کے کھانے' پینے' پہننے اور رہنے سہنے کی ضرورت کیلئے کافی ہو' خواہ اسے یہ مال وقف سے حاصل ہوتا ہو یا کاروبار سے یا ملازمت سے' تو اسے فقیر و مسکین نہیں کہا جا سکتا اور نہ ہی اسے زکوٰۃ دینا جائز ہے۔

—— شیخ ابن باز ——

بھائی اور چچا کو زکوٰۃ دینا

سوال کیا ایک بھائی اپنے دوسرے ضرورت مند بھائی کو زکوٰۃ دے سکتا ہے جب کہ وہ شادی شدہ ہو' کام بھی کرتا ہو لیکن اس کی آمدنی اس کی ضرورت کے مطابق کافی نہ ہو؟ کیا فقیر چچا کو زکوٰۃ دی جا سکتی ہے؟ کیا عورت اپنے مال کی زکوٰۃ اپنے بھائی یا پھوپھی یا بہن کو دے سکتی ہے؟

جواب اس میں کوئی حرج نہیں کہ کوئی مرد یا عورت اپنے فقیر بھائی' بہن' چچا' پھوپھی یا کسی دوسرے فقیر رشتہ دار کو زکوٰۃ دے' چنانچہ دلائل کے عموم سے یہی ثابت ہوتا ہے بلکہ انہیں دینا تو زکوٰۃ بھی' ہے اور صلہ رحمی بھی کیونکہ نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے:

«اَلصَّدَقَةُ عَلَى الْمِسْكِينِ صَدَقَةٌ، وَهِيَ عَلَى ذِي الرَّحِمِ ثِنْتَانِ، صَدَقَةٌ، وَصِلَةٌ»(جامع

الترمذي، الزكاة، باب ماجاء في الصدقة على ذي القرابة، ح:٦٥٨)

’’مسکین کو صدقہ دینا صدقہ ہے اور رشتہ دار کو صدقہ دینا دو چیزیں ہیں۔صدقہ بھی اور صلہ رحمی بھی‘‘

ہاں البتہ والدین کو زکوٰۃ دینا جائز نہیں‘ خواہ وہ اوپر کے درجہ (یعنی دادا نانا وغیرہ) ہی میں کیوں نہ ہوں۔ اسی طرح اولاد بیٹوں اور بیٹیوں کو زکوٰۃ دینا بھی جائز نہیں خواہ وہ نچلے درجہ (یعنی پوتے اور نواسے وغیرہ) ہی میں کیوں نہ ہوں اگرچہ وہ فقیر ہی کیوں نہ ہوں‘ کیونکہ ان پر تو اپنے اصل مال سے خرچ کرنا لازم ہے‘ بشرطیکہ اسے خرچ کرنے کی طاقت ہو اور اس کے سوا ان پر خرچ کرنے والا اور کوئی نہ ہو۔

——— شیخ ابن باز ———

بہن کو زکوٰۃ دینا

سوال میری ایک شادی شدہ بہن ہے جس کی مالی حالت کمزور ہے۔ کیا میرے لیے اسے کچھ مال زکوٰۃ دینا جائز ہے تاکہ اس کی مالی حالت بہتر ہو سکے اور بچوں کی تربیت کے سلسلہ میں اس کی اعانت کی جا سکے خاص طور پر اس وجہ سے بھی کہ اس کا شوہر اس کی طرف کوئی توجہ نہیں دیتا اور ہم اسے سمجھا سمجھا کر تھک گئے ہیں مگر اس کی اصلاح احوال نہیں کر سکے؟

جواب اگر وہ فقیر ہے‘ اس کا شوہر اس پر خرچ نہیں کرتا‘ آپ اس کی اصلاح احوال سے عاجز آگئے ہیں اور کوئی بھی نہیں جو اس پر خرچ کر سکے تو اسے بقدر ضرورت زکوٰۃ دینا جائز ہے۔

——— شیخ ابن باز ———

شادی کرنے والے کو زکوٰۃ دینا

سوال ایک تندرست و توانا نوجوان شادی کرنا چاہتا ہے اور بلاشک و شبہ شادی کے سلسلہ میں وہ مدد کا محتاج ہے تو کیا اس سلسلہ میں مدد کے لیے اسے زکوٰۃ دی جا سکتی ہے؟

جواب اس نوجوان کو شادی میں مدد کے لیے زکوٰۃ دی جا سکتی ہے بشرطیکہ وہ خود اخراجات برداشت کرنے سے عاجز ہو۔ واللہ ولی التوفیق

——— شیخ ابن باز ———

فقیر شوہر کو زکوٰۃ دینا

سوال کیا یہ جائز ہے کہ عورت اپنے شوہر کو زکوٰۃ دے جب کہ وہ فقیر ہو؟

جواب عورت اپنے مال کی زکوٰۃ اپنے شوہر کو دے سکتی ہے جب کہ وہ فقیر ہو‘ کیونکہ وہ اس ارشاد باری تعالیٰ:

﴿ إِنَّمَا ٱلصَّدَقَٰتُ لِلۡفُقَرَآءِ وَٱلۡمَسَٰكِينِ﴾ (التوبة٩/ ٦٠)

’’بے شک صدقہ و خیرات فقراء اور مساکین کے لیے ہے۔‘‘ کے عموم میں داخل ہے‘ لہٰذا اس کے فقر کو دور

کرنے کے لیے اسے زکوٰۃ دی جا سکتی ہے۔

فتویٰ کمیٹی

زکوٰۃ سے مسجد میں قالین بچھانا اور مرمت کرنا

سوال کیا مسجد کی مرمت کرنے اور اس میں قالین بچھانے کے لیے زکوٰۃ صرف کی جا سکتی ہے جبکہ مسجد کی کوئی آمدنی نہیں اور اہل مسجد فقیر ہیں؟

جواب واضح رہے کہ مسجد کے امور و معاملات وزارت حج و اوقاف کے سپرد ہیں اور اسی وزارت ہی کی یہ ذمہ داری ہے کہ وہ مساجد کی دیکھ بھال کرے' قالین بچھائے اور مساجد کی دیگر ضروریات کو پورا کرے۔ اگر وزارت کے لیے مساجد کی تمام ضروریات کو پورا کرنا ممکن نہ ہو تو وہ پہلے ان ضروریات کو پورا کرے جو سب سے زیادہ اہم ہوں اور اگر وزارت مساجد کی جلد اصلاح نہ کر سکے اور اہل مساجد انتظار نہ کر سکیں تو انہیں چاہیئے کہ وہ اپنے اموال مساجد کی اصلاح اور ضروریات کے لیے خرچ کریں زکوٰۃ کے مصارف صرف آٹھ ہیں جنہیں حسب ذیل آیت کریمہ میں بیان کیا گیا ہے:

﴿ إِنَّمَا ٱلصَّدَقَٰتُ لِلْفُقَرَآءِ وَٱلْمَسَٰكِينِ وَٱلْعَٰمِلِينَ عَلَيْهَا وَٱلْمُؤَلَّفَةِ قُلُوبُهُمْ وَفِى ٱلرِّقَابِ وَٱلْغَٰرِمِينَ وَفِى سَبِيلِ ٱللَّهِ وَٱبْنِ ٱلسَّبِيلِ ﴾ (التوبة ٩/ ٦٠)

''صدقات (زکوٰۃ و خیرات) تو مفلسوں' محتاجوں اور کارکنان صدقات کا حق ہے اور ان لوگوں کا جن کی تالیف قلوب منظور ہے اور غلاموں کے آزاد کرانے اور قرض داروں کے قرض ادا کرنے میں اور اللہ کی راہ میں اور مسافروں (کی مدد) میں (بھی یہ مال خرچ کرنا چاہیئے)''

اس آیت کریمہ سے معلوم ہوا کہ مساجد ان آٹھ مصارف میں سے نہیں ہیں جنہیں اللہ تعالیٰ نے زکوٰۃ کیلئے مخصوص فرمایا ہے۔ زکوٰۃ صرف انہی مصارف تک منحصر رہنی چاہیئے۔ وباللہ التوفیق' وصلی اللہ علی نبینا محمد' وآلہ وصحبہ وسلم۔

فتویٰ کمیٹی

مجرموں اور مقروضوں کو زکوٰۃ دینا

سوال کیا مقروضوں' مجرموں اور ان لوگوں کو زکوٰۃ دینا جائز ہے جن کے ذمہ دیت لازم ہو اور وہ مدد کے طلب گار ہوں یا انہیں زکوٰۃ دینا جائز نہیں ہے؟

جواب اللہ تبارک و تعالیٰ نے درج ذیل آیت کریمہ میں مصارف زکوٰۃ کو بیان فرمایا ہے۔

﴿ إِنَّمَا ٱلصَّدَقَٰتُ لِلْفُقَرَآءِ وَٱلْمَسَٰكِينِ وَٱلْعَٰمِلِينَ عَلَيْهَا وَٱلْمُؤَلَّفَةِ قُلُوبُهُمْ وَفِى ٱلرِّقَابِ وَٱلْغَٰرِمِينَ وَفِى سَبِيلِ ٱللَّهِ وَٱبْنِ ٱلسَّبِيلِ ﴾ (التوبة ٩/ ٦٠)

''صدقات (زکوٰۃ و خیرات) تو مفلسوں اور محتاجوں اور کارکنان صدقات کا حق ہے اور ان لوگوں کا جن کی تالیف قلوب منظور ہے اور غلاموں کے آزاد کرانے میں اور قرض داروں کے قرض ادا کرنے میں اور اللہ کی راہ میں اور مسافروں (کی مدد) میں (بھی یہ مال خرچ کرنا چاہیئے۔)''

انہی مصارف میں سے مقروض بھی ہیں۔ مقروضوں کی دو قسمیں ہیں ① وہ شخص جو ایک بہت بڑی جماعت کے مابین صلح کرانے کی وجہ سے مقروض ہو گیا ہو وہ اس طرح کہ دو قبیلوں یا دو بستیوں کے باشندوں کے خون یا مال کے تنازعات کی وجہ سے آپس میں عداوت و دشمنی پیدا ہو گئی ہو اور یہ شخص ان دونوں جماعتوں کی عداوت و دشمنی ختم کرانے اور ان کے درمیان صلح کرانے کی ذمہ داری اٹھالے' تو اسے زکوٰۃ دینا جائز ہے تاکہ یہ اپنی ذمہ داری کو پورا کر سکے' خواہ یہ دولت مند تو ہو لیکن اپنے مال کو خرچ نہ کرنا چاہے اور اگر یہ اپنے مال کو خرچ کر دے تو پھر اسے زکوٰۃ دینا جائز نہیں۔ ② وہ مقروض جس نے کفار سے اپنے آپ کو رہائی دلانے کے لیے یا کسی مباح چیز کے خریدنے کے لیے یا کسی ایسی حرام چیز خریدنے کے لیے جس سے اس نے توبہ کر لی ہو' قرض لیا ہو اور وہ فقیر ہو تو اسے اپنا قرض ادا کرنے کے لیے زکوٰۃ دینا جائز ہے۔

———— فتویٰ کمیٹی ————

ساری زکوٰۃ ایک ہی خاندان کو دے دینا

سوال انسان جب اپنے مال کی زکوٰۃ ادا کرلے اور وہ بہت تھوڑی مقدار میں ہو مثلاً دو سو ریال تو کیا افضل یہ ہے کہ وہ ساری زکوٰۃ ایک ہی ضرورت مند و محتاج خاندان کو دے دے یا اسے یہ زکوٰۃ مختلف ضرورت مند گھروں میں تقسیم کرنی چاہیے؟ براہ کرم میری راہنمائی فرمائیں۔

جواب زکوٰۃ اگر کم ہو تو اسے ایک ہی ضرورت مند گھر کو دے دینا زیادہ بہتر اور افضل ہے' کیونکہ زکوٰۃ کی رقم اگر کم ہو تو اسے زیادہ گھروں میں تقسیم کرنے سے اس کی منفعت کم ہو گی۔

———— شیخ ابن باز ————

ماں کو زکوٰۃ نہ دی جائے' تارک نماز' زکوٰۃ کا مستحق نہیں

سوال کیا یہ جائز ہے کہ میں اپنی والدہ کو کچھ مال دوں اور پھر زکوٰۃ میں شمار کر لوں' حالانکہ میرے والد صاحب میری والدہ صاحبہ پر خرچ کرتے اور ان کی مالی حالت بھی الحمد للہ اچھی ہے؟ اسی طرح میرا ایک بھائی بھی ہے جو کام کرتا ہے' اس نے ابھی تک شادی بھی نہیں کی لیکن (اللہ تعالیٰ اسے ہدایت دے) وہ نماز کی زیادہ حفاظت نہیں کرتا' کیا میں اسے کچھ زکوٰۃ دے سکتا ہوں؟ راہنمائی کیجئے اللہ تعالیٰ آپ کی حفاظت فرمائے!

جواب آپ کے لیے اپنی والدہ کو زکوٰۃ دینا جائز نہیں' کیونکہ والدین زکوٰۃ کا مصرف نہیں ہیں اور پھر آپ کے والد صاحب کے خرچ کرنے کی وجہ سے انہیں زکوٰۃ کی ضرورت بھی نہیں ہے۔

باقی رہا آپ کا بھائی تو جب تک وہ تارک نماز ہے اسے بھی زکوٰۃ نہیں دی جا سکتی' کیونکہ شہادتین کے بعد نماز اسلام کا سب سے بڑا رکن ہے اور اسے جان بوجھ کر چھوڑ دینا کفر اکبر ہے اور پھر وہ صحت مند بھی ہے اور کماتا بھی ہے اور اگر اس پر خرچ کرنے کی ضرورت ہو تو اس کے لیے آپ کے والد صاحب زیادہ ذمہ دار ہیں' کیونکہ خرچ کرنے کے اعتبار سے یہ ان کی ذمہ داری ہے بشرطیکہ انہیں اس کی استطاعت ہو۔ اللہ تعالیٰ اسے ہدایت دے اور حق کی طرف اس کی راہنمائی فرمائے اور اسے اپنے نفس' شیطان اور برے ساتھیوں کے شر سے بچائے!

—— شیخ ابن باز ——

قرض اور زکوٰۃ

کیا قرض مانع زکوٰۃ ہے؟

سوال (الف) ایک شخص تجارت کرتا اور غیر ملکی کمپنیوں سے کچھ مدت تک کے لیے ادھار پر معاملہ کرتا ہے۔ ایک سال گزر جاتا ہے اور اس کے ذمہ بہت زیادہ قرض ہے۔ اگر وہ سال گزرنے سے چند دن پہلے ان کمپنیوں کے قرض ادا کر دے تاکہ بطور قرض ادا کی جانے والی رقم کی زکوٰۃ سے بچ سکے تو کیا وہ گناہ گار تو نہ ہو گا؟

(ب) اگر اس کے مال کی تفصیل درج ذیل ہو تو وہ زکوٰۃ کس طرح ادا کرے؟

سال کے اختتام پر سٹور میں موجود مال کی قیمت -- 200,000 ریال
اس کے ذمہ قرض ---------------- 300,000 ریال
اس نے جو قرض لینا ہے ---------------- 200,000 ریال
بینک میں موجود رقم ---------------- 100,000 ریال

(ج) بعض رقوم کے ادا کرنے کا وقت تو آ گیا ہو لیکن اس نے ادا کرنے میں کچھ تاخیر کر دی ہو ہاں البتہ ان رقوم کو ادا کرنے کے لیے اس نے انہیں تجوری سے الگ کر دیا ہو اور ادا کیے جانے والے قرض سے بھی انہیں علیحدہ کر دیا ہو تو کیا ان کی زکوٰۃ اسے معاف ہو گی؟

جواب اگر کوئی شخص سال پورا ہونے سے پہلے اپنے ذمہ قرض ادا کر دے تو اس پر زکوٰۃ نہیں ہے اور اس میں کوئی حرج بھی نہیں' خلیفہ راشد حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ مقروض لوگوں کو حکم دیا کرتے تھے کہ "وہ زکوٰۃ کا وقت آنے سے پہلے پہلے قرض ادا کر دیں۔ صاحب قرض اگر اپنا کچھ قرض معاف کر دے تاکہ اسے باقی قرض وصول ہو جائے تو اس میں بھی علماء کے صحیح قول کے مطابق کوئی حرج نہیں' کیونکہ اس میں مقروض کی بھی مصلحت ہے اور قرض خواہ کی بھی اور پھر اس میں سود بھی نہیں ہے۔

سٹور میں موجود سازوسامان کی قیمت پر سال مکمل ہونے پر زکوٰۃ ادا کرنا ہو گی' اسی طرح بینک میں موجود رقم پر بھی سال مکمل ہونے پر زکوٰۃ ادا کرنا ہو گی۔

آپ نے لوگوں سے جو قرض لینا ہے اس میں تفصیل ہے' کہ جو قرض آپ نے خوش حال لوگوں سے لینے ہیں اور جن کے ملنے کی امید ہے تو ان میں سال مکمل ہونے پر زکوٰۃ ہو گی' کیونکہ اس طرح کے قرض کی مثال بینک میں رکھی ہوئی رقم کی سی ہے اور جو قرض تنگ دست لوگوں سے لینا ہے تو علماء کے صحیح قول کے مطابق اس میں زکوٰۃ نہیں ہے۔

بعض اہل علم کے بقول قرض کی وصولی کے بعد صرف ایک سال کی زکوٰۃ ادا کرنا ہو گی' یہ بہترین قول ہے اور اس میں احتیاط بھی ہے لیکن صحیح قول کے مطابق یہ واجب نہیں ہے' کیونکہ زکوٰۃ ان اموال میں واجب نہیں ہے جن کے بارے میں یہ معلوم نہ ہو کہ وہ وصول ہوں گے یا نہیں؟ اس لیے کہ وہ تنگ دست یا ٹال مٹول سے کام لینے والوں کے ذمہ ہیں اور ان کی مثال مفقود اموال یا گم شدہ جانوروں کی طرح ہے۔

وہ قرض جو آپ کے ذمہ ہے اہل علم کے صحیح قول کے مطابق مانع زکوٰۃ نہیں ہے۔ آپ نے قرض ادا کرنے کے لیے جو مال الگ کیا لیکن اہل قرض کو واپس لوٹانے سے پہلے اس پر ایک سال گزر گیا تو اس کی زکوٰۃ ساقط نہ ہو گی بلکہ اس کی زکوٰۃ آپ کے ذمہ ہو گی' کیونکہ آپ کی ملکیت میں اس پر ایک سال گزر چکا ہے۔ وباللہ التوفیق

——— شیخ ابن باز ———

زکوٰۃ کے متعلق مختلف فتوے

زکوٰۃ میں نیت کا ضروری ہونا

سوال جب کسی فقیر کو کچھ نقدی بطور زکوٰۃ دی جائے تو کیا یہ نیت کرنا چاہیئے کہ یہ زکوٰۃ ہے؟

جواب جب آپ اپنے مال میں سے کچھ نکالیں' اسے فقیر کے ہاتھ پر رکھ دیں اور اسے دیتے وقت یہ نیت کریں کہ یہ آپ کے مال کی زکوٰۃ ہے تو یہ زکوٰۃ ادا ہو جائے گی۔

——— فتویٰ کمیٹی ———

کھانے اور کپڑوں وغیرہ کی صورت میں زکوٰۃ ادا کرنا

سوال کیا زکوٰۃ نقدی کے علاوہ کسی اور صورت مثلاً کھانے' کپڑے یا دیگر اشیاء کی صورت میں بھی ادا کی جا سکتی ہے کہ ضرورت کی ان چیزوں کو خرید کر زکوٰۃ کے مستحقین کو دے دیا جائے؟ کیا زکوٰۃ کا کچھ حصہ قریبی رشتہ داروں کو بھی دیا جا سکتا ہے؟ اگر جواب اثبات میں ہے تو کس قسم کے رشتہ داروں کو زکوٰۃ دی جا سکتی ہے؟

جواب بہتر یہ ہے کہ زکوٰۃ مال کی جنس ہی سے ادا کی جائے' ہاں البتہ اموال تجارت کی قیمت لگا کر ان کی زکوٰۃ نقدی کی صورت میں ادا کر دی جائے۔ زکوٰۃ ادا کرنے والا اگر یہ مناسب خیال کرے کہ فقیر کو ضروری اشیاء مثلاً لباس' کھانے پینے کی اشیاء یا دیگر ایسی چیزیں خرید کر لے دے جن کی اسے ضرورت ہو تو یہ بات بھی جائز معلوم ہوتی ہے۔ زکوٰۃ ان مستحقین ہی کو دینا چاہیئے جن کا اللہ تعالیٰ نے ذکر فرمایا ہے' خواہ وہ قریبی رشتہ دار ہوں بلکہ قریبی رشتہ دار اگر ضرورت مند ہو تو اسے زکوٰۃ دینا افضل ہے بشرطیکہ اس میں محض الفت و محبت کا مظاہرہ نہ ہو اور زیادہ مستحق مگر اجنبی لوگوں کو محروم کرنا لازم نہ آتا ہو۔ ایسے قریبی رشتہ داروں کو زکوٰۃ دینا جائز نہیں جو وارث اور اصول و فروع ہوں مثلاً آباء و اجداد اور بیٹے' پوتے وغیرہ۔

——— شیخ ابن جبرین ———

کیا محض شوق کی خاطر جمع کیے ہوئے مختلف سکوں کی زکوٰۃ ہے؟

سوال ایک آدمی محض شوق کی خاطر عربی اور غیر عربی سکے جمع کرتا ہے ان میں سے کچھ سکے قیمتی ہیں اور کچھ قیمتی نہیں ہیں تو کیا سال گزرنے پر ان کرنسی سکوں میں بھی زکوٰۃ ہو گی؟

جواب جب ان پر ایک سال گزر جائے اور یہ نصاب کے مطابق ہوں تو ان کی زکوٰۃ ادا کرنا لازم ہے' کیونکہ کتاب و سنت کے دلائل کے عموم کا یہی تقاضا ہے اور پھر اس لیے بھی کہ یہ نقدی کے حکم میں ہیں اور کرنسی نوٹوں کی طرح یہ بھی نقدی ہی کے قائم مقام ہیں۔ واللہ اعلم۔

——— شیخ ابن باز ———

ماضی کی زکوٰۃ کس طرح؟

سوال اگر ماضی میں مجھ پر زکوٰۃ کی مقدار مخفی رہی ہو تو اب کس طرح زکوٰۃ ادا کروں؟

جواب یہ بات معلوم ہونی چاہئے کہ زکوٰۃ اسلام کے ارکان میں سے ایک رکن ہے اور صاحب نصاب لوگوں پر فرض ہے۔ اگر زکوٰۃ کی مقدار کا صحیح علم ہو تو اسے ادا کر دے اور اگر صحیح علم نہ ہو تو ظن غالب کے مطابق زکوٰۃ ادا کر دے یعنی اس قدر مال بطور زکوٰۃ مستحقین کو دے دے کہ ظن غالب یہ ہو کہ اس سے وہ زکوٰۃ ادا ہو گئی ہے جو اس کے ذمہ ہے۔ یاد رہے ظن غالب پر انحصار کرنا بھی شریعت کا ایک اصول ہے۔

——— فتویٰ کمیٹی ———

محکمہ زکوٰۃ ریونیو کی معرفت زکوٰۃ ادا کرنا

سوال میں ایک تجارتی فرم کا مالک ہوں اور اپنے سرمایہ سے اڑھائی فی صد محکمہ زکوٰۃ ریونیو کو بطور زکوٰۃ ادا کرتا ہوں اور یہ سمجھتا ہوں کہ یہ میرے مال تجارت کی زکوٰۃ ہے اور اگر میں محکمہ کو یہ زکوٰۃ ادا نہ کروں تو میں کئی فوائد سے بھی محروم ہو جاؤں مثلاً ملازمین کو اپنے پاس باہر سے نہ منگوا سکوں اور اپنے ضروری کاغذات میں کوئی درستی یا تبدیلی نہ کروا سکوں' اس لیے میں اس رقم کے ادا کرنے پر مجبور ہوں لیکن میں نے بعض کتابوں میں یہ پڑھا ہے کہ یہ زکوٰۃ نہیں ہے' لہٰذا مجھ پر لازم ہے کہ میں اس کے علاوہ اور زکوٰۃ ادا کروں۔ امید ہے آپ اس مسئلہ میں راہنمائی فرمائیں گے' کیونکہ یہ میرا ہی نہیں سعودی عرب کی تمام فرموں اور کمپنیوں کا یہی حال ہے۔ اللہ تعالیٰ آپ کو بھلائی کی توفیق دے!

جواب جب تک آپ سے زکوٰۃ کے نام سے لیا جائے اور آپ زکوٰۃ ہی کی نیت سے ادا کریں تو یہ زکوٰۃ ہے کیونکہ حکمران کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ دولت مندوں سے زکوٰۃ طلب کرے تاکہ اسے زکوٰۃ کے مصارف میں خرچ کر سکے۔ آپ نے جب حکومت کو زکوٰۃ ادا کر دی تو اس کے بجائے اور زکوٰۃ ادا کرنا لازم نہیں ہے۔ اگر آپ کے پاس کچھ اور ایسے اموال یا اثاثے ہوں جن کی آپ نے زکوٰۃ حکومت کو ادا نہ کی ہو تو ان کی زکوٰۃ نکال کر مستحق فقراء یا دیگر اہل زکوٰۃ میں تقسیم کر دیں۔ واللہ ولی التوفیق۔

——— شیخ ابن باز ———

بیرون ملک مقیم کس طرح زکوٰۃ ادا کرے؟

سوال جو شخص بیرون ملک مقیم ہو وہ کس طرح زکوٰۃ ادا کرے؟ کیا وہ اپنی زکوٰۃ اپنے ملک میں بھیج دے یا اسی ملک میں

ادا کرے جہاں وہ مقیم ہو؟ یا وہ اپنے گھر والوں سے یہ کہہ دے کہ وہ اس کی طرف سے زکوٰۃ ادا کر دیں؟

جواب وہ یہ دیکھے کہ مستحقین زکوٰۃ کے لیے کون سی صورت بہتر ہے کیا یہ زیادہ بہتر ہے کہ وہ اپنے ملک کے فقراء میں تقسیم کرے یا کسی اور دوسرے ملک میں جہاں فقراء موجود ہوں اور اگر یہ دونوں باتیں برابر ہوں تو پھر وہ اسی ملک میں اپنی زکوٰۃ تقسیم کر دے جہاں وہ مقیم ہو۔

——— شیخ ابن عثیمین ———

سبزیوں میں زکوٰۃ نہیں

سوال سبزیوں مثلاً ٹماٹر' آلو اور پیاز وغیرہ میں بھی زکوٰۃ واجب ہے؟

جواب تمام ایسے غلوں اور پھلوں میں زکوٰۃ واجب ہے جن کو تولا اور ذخیرہ کیا جاتا ہو لیکن سبزیوں میں مطلقاً زکوٰۃ واجب نہیں ہے' کیونکہ اس حدیث میں ہے جسے امام دار قطنی رحمہ اللہ نے اپنی سند کے ساتھ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

«لَيْسَ فِي الْخَضْرَاوَاتِ صَدَقَةٌ» (سنن الدارقطني: ٢/ ٩٤، ح: ١٨٩٠)

"سبزیوں میں زکوٰۃ نہیں ہے۔"

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے بھی اسی طرح روایت ہے نیز اثرم نے روایت کیا ہے کہ "حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے عامل نے آپ کی طرف ایک ایسے باغ کے بارے میں لکھا جس میں اناروں کے بجائے سبزیوں سے آمدنی زیادہ تھی تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے جواب میں لکھا کہ سبزیوں میں زکوٰۃ نہیں کیونکہ یہ گھاس پھوس کے مانند ہیں۔" [1]

——— فتویٰ کمیٹی ———

اپنی طرف سے زکوٰۃ ادا کرنے کے لیے وکیل مقرر کر دیجئے

سوال میرے پاس مصر میں کئی گائیں ہیں' کیا میں ان کی زکوٰۃ ادا کروں جبکہ میں یہاں عراق میں ہوں یا میں اپنے ملک میں واپسی تک کا انتظار کروں؟

جواب آپ پر واجب یہ ہے کہ جب بھی سال مکمل ہو آپ ان گائیوں کی زکوٰۃ ادا کر دیں اور اس بارے میں اپنی طرف سے کسی کو مصر میں اپنا وکیل مقرر کر دیں۔ زکوٰۃ ادا کرنے کے لیے وکیل بنانا جائز ہے جیسا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم زکوٰۃ وصول کرنے کے لیے عمال کو بھیجا کرتے تھے [2] وہ لوگوں سے ان کی زکوٰۃ وصول کر کے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پیش کر دیا کرتے تھے اور یہ بھی ثابت ہے کہ حجۃ الوداع میں قربانی کئے جانے والے جو اونٹ باقی رہ گئے تھے' انہیں ذبح کرنے کے لیے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کو اپنا وکیل مقرر کیا تھا۔ [3]

---

[1] دارقطنی: 94/2' حدیث: 1891۔

[2] صحیح بخاری' الحج' باب یتصدق بجلود الهدی' حدیث: 1717, 1718 و صحیح مسلم' الحج' باب الصدقة بلحوم الهدایا ..... حدیث: 1317۔ [3] المصدر السابق۔

آپ مصر میں کسی قابل اعتماد آدمی کو اپنا وکیل مقرر کر دیں جو آپ کے مویشیوں کی زکوٰۃ ادا کر دے' واپسی تک زکوٰۃ کو مؤخر کرنا جائز نہیں ہے' کیونکہ تاخیر میں مستحقین زکوٰۃ کی محرومی ہے اور پھر آپ کو یہ بھی تو معلوم نہیں کہ مصر واپسی سے پہلے کہیں موت ہی نہ آ جائے اور آپ کے وارث ادا نہ کریں تو یہ فرض آپ کے ذمہ باقی رہے گا۔ لہٰذا بھائی جان! زکوٰۃ ادا کرنے میں جلدی کیجئے اور اس میں تاخیر نہ کیجئے۔

—— شیخ ابن عثیمین ——

غلہ پر زکوٰۃ

سوال میں نے بعض مزارعین سے کچھ غلہ لے کر جمع کر لیا تاکہ حال اور مستقبل میں وہ بچوں کی خوراک کے طور پر استعمال کیا جا سکے' تو کیا اس غلہ پر زکوٰۃ ہے؟

جواب یہ دانے اور اس طرح کی دیگر چیزیں جنہیں انسان اپنی ضرورت کے لیے جمع کرتا ہے ان میں زکوٰۃ نہیں ہے۔ زکوٰۃ تو اس مال میں ہے جو تجارت کے لیے ہو یا سونے چاندی اور اس چیز میں زکوٰۃ ہے جو ان کے قائم مقام ہو مثلاً کرنسی نوٹ وغیرہ۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل و کرم اور لطف و احسان کے ساتھ کھانے پینے اور ضرورت کی دیگر اشیاء سے زکوٰۃ کو معاف کر دیا ہے۔ فللہ الحمد والشکر علی ذلک۔

—— شیخ ابن باز ——

چار اونٹنیوں پر زکوٰۃ نہیں ہے

سوال جب ایک شخص کے پاس چار اونٹنیاں ہوں اور سال مکمل ہونے سے ایک دن پہلے ایک اونٹنی ایک بچے کو جنم دے دے تو کیا اس سے اس سال کا نصاب پورا ہو جائے گا؟

جواب جب انسان کے پاس نصاب سے کم مال ہو مثلاً تیس بکریاں ہوں اور پھر اصل مال پر سال مکمل ہونے سے قبل پیدائش کی وجہ سے بکریوں کی تعداد میں اضافہ ہو جائے تو وہ سال کا آغاز اس دن سے شمار کرے جس دن نصاب پورا ہوا ہو' جمہور کا یہی مذہب ہے اور اسی کے مطابق عمل ہے۔

اس مسئلہ میں امام مالک کی رائے جمہور کے مخالف ہے وہ فرماتے ہیں کہ "پیدائش کی وجہ سے اگر دوران سال بکریوں کی تعداد چالیس ہو جائے اور سال کے باقی حصہ میں یہ تعداد باقی رہے تو ان میں سے ایک بکری بطور زکوٰۃ ادا کرنا ہو گی کیونکہ پیدائش کا سال اصل مال کے سال کے تابع ہے لہٰذا اس صورت میں زکوٰۃ واجب ہو گی۔ امام احمد رحمۃ اللہ علیہ سے بھی ایک روایت یہی ہے' مشہور قول اور جس کے مطابق عمل ہے' وہ یہ کہ چار اونٹنیوں پر زکوٰۃ نہیں ہے اور سال کا آغاز اس وقت سے شمار ہو گا جب ان کی تعداد پانچ ہو جائے۔

—— فتویٰ کمیٹی ——

زکوٰۃ کی نیت سے قرض معاف کرنا

سوال جب میں نے بعض لوگوں کو قرض دیا ہو اور ان کے لیے واپس کرنا مشکل ہو تو کیا یہ جائز ہے کہ میں اس قرض کو معاف کر کے اسے زکوٰۃ میں شمار کر لوں یا یہ جائز نہیں ہے؟

جواب جب کسی شخص پر آپ کا کوئی حق ہو تو یہ جائز نہیں کہ آپ اسے ساقط کر کے زکوٰۃ میں شمار کر لیں کیونکہ اس طرح آپ نے اپنا مال تو بچا لیا کہ وصول نہ ہونے والے مال کو اپنے مال کی زکوٰۃ سمجھ کر ساقط کر دیا اور وہ زکوٰۃ جس کی ادائیگی آپ کے ذمہ تھی' اسے آپ نے اپنا مال سمجھ کر اپنے پاس رکھ لیا' لہٰذا یہ جائز نہیں۔ وباللہ التوفیق۔

——— فتویٰ کمیٹی ———

کیا سونے کے قلم کی زکوٰۃ دی جائے گی؟

سوال مجھے کچھ سونے کے قلم بطور تحفہ ملے ہیں' ان کے استعمال کا کیا حکم ہے؟ کیا ان قلموں کی زکوٰۃ ادا کرنا ہو گی یا نہیں؟ مستفید فرمائیے' اللہ تعالیٰ آپ کو جزائے خیر سے نوازے!

جواب صحیح ترین بات یہ ہے کہ مردوں کے لیے انہیں استعمال کرنا حرام ہے کیونکہ نبی ﷺ کے اس ارشاد کے عموم کا یہی تقاضا ہے:

«أُحِلَّ الذَّهَبُ وَالْحَرِيرُ لِإِنَاثِ أُمَّتِي، وَحُرِّمَ عَلٰى ذُكُورِهَا»(سنن النسائي، الزينة، باب تحريم الذهب على الرجال، ح:٥١٥١)

”سونا اور ریشم میری امت کی عورتوں کے لیے حلال اور مردوں کے لیے حرام قرار دیا گیا ہے۔“

نیز سونے اور ریشم کے بارے میں آپ نے یہ بھی فرمایا ہے:

«هٰذَانِ حِلٌّ لِإِنَاثِ أُمَّتِي حَرَامٌ عَلٰى ذُكُورِهِمْ» (لم أجده بهذا اللفظ بل معناه في سنن النسائي، الزينة، باب تحريم الذهب على الرجال، ح:٥١٤٧ ـ ٥١٥٠ مختصرا وسنن ابن ماجه، اللباس، باب لبس الحرير والذهب للنساء، ح:٣٥٩٥ ـ ٣٥٩٧)

”یہ دونوں چیزیں میری امت کی عورتوں کے لیے حلال اور مردوں کے لیے حرام ہیں۔“

جہاں تک ان کی زکوٰۃ کا تعلق ہے' اگر ان قلموں ہی کا وزن نصاب کے مطابق ہو یا سونے کی دیگر اشیاء کے ساتھ مل کر نصاب مکمل ہو جائے تو سال مکمل ہونے پر زکوٰۃ واجب ہو گی' اسی طرح اگر اس کے پاس چاندی یا سامان تجارت ہو اور ان کے ملانے سے نصاب مکمل ہو جاتا ہو تو پھر بھی علماء کے صحیح قول کے مطابق زکوٰۃ واجب ہو گی کیونکہ سونا چاندی گویا ایک چیز کی طرح ہیں۔

——— شیخ ابن باز ———

صدقۂ فطر

صدقۂ فطر کا حکم اور مقدار

سوال کیا صدقۂ فطر واجب ہے یا سنت؟ نیز یہ کس پر واجب ہے؟

جواب صدقۂ فطر تمام مسلمانوں پر واجب ہے کیونکہ نبی کریم ﷺ نے اسے مرد، عورت، چھوٹے اور بڑے سب پر فرض قرار دیا ہے۔[1] اس کی مقدار کھانا، کھجور، جو، کشمش، پنیر وغیرہ کا ایک صاع ہے اور آپ نے حکم دیا ہے کہ اسے عیدالفطر کی نماز کی طرف نکلنے سے پہلے پہلے ادا کر دیا جائے، یہ فریضۂ نبویہ ہے، رمضان کے اختتام پر اسے ادا کرنے کا حکم ہے تاکہ لغو اور بے ہودہ باتوں سے روزہ پاک ہو جائے اور مسکینوں کو کھانا میسر آسکے اور وہ عید کے دن لوگوں سے مانگنے اور سوال کرنے سے بے نیاز ہو جائیں۔ واللہ الموفق۔

——— شیخ ابن جبرین ———

صدقۂ فطر کن چیزوں سے؟

سوال کھانے کی وہ کون سی اشیاء ہیں جنہیں صدقۂ فطر کے طور پر دیا جا سکتا ہے؟

جواب حدیث میں آیا ہے کہ صدقۂ فطر پانچ چیزوں یعنی گندم، جو، کھجور، کشمش اور پنیر سے ادا کیا جائے۔[2] بعض علماء محققین نے ذکر کیا ہے کہ ان پانچ اشیاء کا ذکر اس لیے آیا ہے کہ اس دور میں کھانے کے طور پر صرف یہی اشیاء مستعمل تھیں اور انہوں نے اس بات کو بھی جائز قرار دیا ہے کہ ان کے علاوہ بھی اگر کوئی چیز کسی علاقے کی اکثر و بیشتر خوراک کے طور پر استعمال ہوتی ہو مثلاً چاول اور مکئی وغیرہ تو اسے بھی صدقۂ فطر کے طور پر دینا جائز ہے۔

——— شیخ ابن جبرین ———

نماز عید سے قبل صدقہ ادا کرنا بھول جانا

سوال میں نے عید سے پہلے صدقۂ فطر ادا کرنے کے لیے تیار کیا تاکہ اسے ایک ایسے فقیر کو دے دوں جس کو میں جانتا تھا لیکن میں بھول گیا اور مجھے نماز میں یاد آیا اور میں نے نماز کے بعد ادا کر دیا تو اس کا کیا حکم ہے؟

جواب کوئی حرج نہیں! سنت یہ ہے کہ صدقۂ فطر نماز عید سے پہلے پہلے ادا کیا جائے جیسا کہ نبی کریم ﷺ نے حکم دیا ہے[3] لیکن جو آپ نے کیا ہے اس میں کوئی حرج نہیں کیونکہ اس صورت میں نماز کے بعد بھی صدقۂ فطر ادا ہو جائے گا

---

[1] صحیح بخاری، الزکاۃ، باب صدقۃ الفطر، حدیث: 1503 - 1504 و صحیح مسلم، الزکاۃ، حدیث: 984۔

[2] صحیح بخاری، الزکاۃ، باب صدقۃ الفطر صاع من طعام، حدیث :1506 و صحیح مسلم، حوالہ سابق۔

[3] صحیح بخاری، الزکاۃ، باب صدقۃ الفطر، حدیث: 1503 - 1504 و صحیح مسلم، الزکاۃ، حدیث: 984۔

اگرچہ حدیث میں آیا ہے کہ یہ ایک عام صدقہ ہو گا لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ یہ صدقہ ہو گا ہی نہیں' لہٰذا امید ہے کہ یہ مقبول ہو گا کیونکہ آپ نے اسے عمداً مؤخر نہیں کیا بلکہ بھول جانے کی وجہ سے مؤخر کیا ہے اور فرمان باری تعالیٰ ہے:

﴿ رَبَّنَا لَا تُؤَاخِذْنَآ إِن نَّسِينَآ أَوْ أَخْطَأْنَا ﴾ (البقرة٢/ ٢٨٦)

"اے پروردگار! اگر ہم سے بھول یا خطا ہو گئی ہو تو ہمیں نہ پکڑنا۔"

اور نبی کریم ﷺ نے اس دعا کے جواب میں فرمایا:

«يَقُولُ اللهُ عَزَّوَجَلَّ قَدْ فَعَلْتُ»(صحيح مسلم، الإيمان، باب بيان تجاوز الله ... الخ، ح:١٢٦)

"اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ میں نے تمہاری دعا کو قبول کر لیا ہے۔"

یعنی اللہ تعالیٰ نے اپنے مومن بندوں کی اس دعا کو قبول فرما لیا ہے کہ وہ بھول چوک کی صورت میں ان سے مؤاخذہ نہیں کرے گا۔

———— شیخ ابن باز ————

زکوٰۃ اور صدقۂ فطر میں تاخیر

سوال کیا یہ جائز ہے کہ انسان اپنے مال کی زکوٰۃ یا صدقۂ فطر کو محفوظ رکھے تاکہ اسے کسی ایسے فقیر کو دے جو ابھی تک اس کے پاس نہیں آیا؟

جواب اگر مدت تھوڑی ہو اور زیادہ نہ ہو تو اس میں کوئی حرج نہیں کہ آپ زکوٰۃ کو محفوظ رکھیں اور اسے بعض فقیر رشتہ داروں کو یا ایسے فقیروں کو دے دیں جن کا فقر اور ضرورت شدید ہو لیکن یہ مدت زیادہ لمبی نہیں ہونی چاہیئے لیکن یہ بات زکوٰۃ کے حوالہ سے ہے۔ جہاں تک صدقۂ فطر کا تعلق ہے تو اسے مؤخر نہیں کرنا چاہیئے بلکہ واجب ہے کہ اسے نماز عید سے پہلے ادا کر دیا جائے جیسا کہ نبی ﷺ نے حکم دیا ہے'[1] ہاں البتہ عید سے ایک دو یا تین دن پہلے ادا کرنے میں بھی کوئی حرج نہیں لیکن اسے نماز سے بعد تک مؤخر نہ کیا جائے۔

———— شیخ ابن باز ————

صدقۂ فطر نقدی کی صورت میں ادا کرنا

سوال صدقۂ فطر نقدی کی صورت میں ادا کرنے کے بارے میں کیا حکم ہے کیونکہ کچھ لوگ اس کے جواز کے قائل ہیں؟

جواب کسی بھی مسلمان سے یہ بات مخفی نہیں رہنی چاہیئے کہ دین حنیف اسلام کا سب سے اہم رکن' یہ گواہی دینا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی معبود نہیں اور حضرت محمد ﷺ اللہ تعالیٰ کے رسول ہیں۔ لا الہ الا اللہ کی شہادت کا تقاضا یہ ہے کہ اللہ وحدہ کے سوا اور کسی کی عبادت نہ کی جائے اور محمد رسول اللہ ﷺ کی شہادت کا تقاضا یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی عبادت اس طرح کی جائے جس طرح رسول اللہ ﷺ نے اس کا طریقہ سکھایا ہے۔ تمام مسلمانوں کا اجماع ہے کہ صدقۂ فطر ادا کرنا ایک عبادت ہے اور عبادات کے بارے میں اصول یہ ہے کہ یہ توقیفی ہیں' لہٰذا کسی کے لیے یہ جائز نہیں کہ وہ کوئی بھی عبادت شارع علیہ السلام کے بتائے ہوئے

[1] صحیح بخاری' الزکاۃ' باب صدقة الفطر' حدیث: 1503 - 1504 و صحیح مسلم' الزکاۃ' باب زکاۃ الفطر' حدیث: 984-

طریقے کے بغیر ادا کرے کہ ان کے بارے میں خود رب کائنات نے یہ فرمایا ہے:

﴿ وَمَا يَنطِقُ عَنِ الْهَوَىٰ ﴿٣﴾ إِنْ هُوَ إِلَّا وَحْيٌ يُوحَىٰ ﴿٤﴾ ﴾ (النجم٥٣/ ٣-٤)

"اور وہ (پیغمبر ﷺ) اپنی خواہش سے نہیں بولتے بلکہ وہ (قرآن تو) وحی ہے جو ان کی طرف بھیجی جاتی ہے۔"

اور خود نبی ﷺ نے یہ فرمایا ہے:

«مَنْ أَحْدَثَ فِي أَمْرِنَا هٰذَا مَا لَيْسَ فِيهِ فَهُوَ رَدٌّ»(صحيح البخاري، الصلح، باب إذا اصطلحوا على صلح جور . . . الخ، ح:٢٦٩٧)

"جو شخص ہمارے اس دین (اسلام) میں کوئی ایسی نئی بات ایجاد کرے جو اس میں سے نہ ہو تو وہ مردود ہے۔"

نیز آپ نے فرمایا:

مَنْ عَمِلَ عَمَلاً لَيْسَ عَلَيْهِ أَمْرُنَا فَهُوَ رَدٌّ»(صحيح مسلم، الأقضية، باب نقض الأحكام الباطلة . . . الخ، ح:١٧١٨)

"جس نے کوئی ایسا عمل کیا جس کے بارے میں ہمارا امر نہیں ہے تو وہ (عمل) مردود ہے۔"

نبی کریم ﷺ نے صدقہ فطر کے بارے میں جو حکم دیا ہے جیسا کہ احادیث صحیحہ سے ثابت ہے وہ یہ کہ کھانے یا جو یا کھجور یا کشمش یا پنیر کا ایک صاع ہو' چنانچہ امام بخاری و مسلم رحمہما اللہ نے حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے:

«فَرَضَ رَسُولُ اللهِ ﷺ زَكَاةَ الْفِطْرِ صَاعًا مِّنْ تَمْرٍ أَوْ صَاعًا مِّنْ شَعِيرٍ عَلَى الْعَبْدِ وَالْحُرِّ، وَالذَّكَرِ وَالأُنْثٰى، وَالصَّغِيرِ وَالْكَبِيرِ مِنَ الْمُسْلِمِينَ، وَأَمَرَ بِهَا أَنْ تُؤَدّٰى قَبْلَ خُرُوجِ النَّاسِ إِلَى الصَّلاَةِ»(صحيح البخاري، الزكاة، باب صدقة الفطر، ١٥٠٣، ١٥٠٤ وصحيح مسلم، الزكاة، باب زكاة الفطر على المسلمين . . . الخ، ح:٩٨٤)

"رسول اللہ ﷺ نے زکوۃ فطر ایک صاع کھجور یا ایک صاع جو ہر غلام' آزاد' عورت' مرد' چھوٹے اور بڑے مسلمان پر فرض قرار دیا اور حکم دیا کہ اسے لوگوں کے نماز عید کے لیے نکلنے سے پہلے ادا کر دیا جائے۔"

امام بخاری و مسلم نے حضرت ابو سعید رضی اللہ عنہ کی اس روایت کو بھی بیان کیا:

«كُنَّا نُعْطِيهَا فِي زَمَانِ النَّبِيِّ ﷺ صَاعًا مِّنْ طَعَامٍ أَوْ صَاعًا مِّنْ تَمْرٍ أَوْ صَاعًا مِّنْ شَعِيرٍ أَوْ صَاعًا مِّنْ زَبِيبٍ - وَفِي رِوَايَةٍ - أَوْ صَاعًا مِّنْ أَقِطٍ» (صحيح البخاري، الزكاة، باب صاع من زبيب، ح:١٥٠٨ وصحيح مسلم، الزكاة، باب زكاة الفطر على المسلمين . . . الخ، ح:٩٨٥)

"ہم نبی کریم ﷺ کے زمانے میں کھانے کا ایک صاع یا کھجور کا ایک صاع یا جو کا ایک صاع یا کشمش کا ایک صاع بطور صدقہ فطر ادا کیا کرتے تھے۔"

ان احادیث سے معلوم ہوا کہ صدقہ فطر کے بارے میں یہ حضرت محمد رسول اللہ ﷺ کی سنت ہے اور یہ بات بھی معلوم ہے کہ اس وقت مسلمانوں میں خاص طور پر مدینہ کے معاشرہ میں دینار اور درہم بھی موجود تھے اور اس وقت یہی کرنسی مروج تھی لیکن صدقہ فطر کے سلسلہ میں آپ نے دینار و درہم کا ذکر نہیں فرمایا۔ اگر انہیں صدقہ فطر میں دینا جائز ہوتا تو آپ یہ ضرور بیان فرما دیتے' کیونکہ ضرورت کے وقت بیان کو مؤخر کرنا جائز نہیں۔ اگر یہ جائز ہوتا تو صحابہ کرام دینار

و درہم کی صورت میں بھی ضرور صدقۂ فطرادا فرماتے۔ جانوروں کی زکوٰۃ میں کمی بیشی کو دینار و درہم سے پورا کرنے کے بارے میں جو آتا ہے تو یہ اس شرط کے ساتھ مشروط ہے جسے ادا کرنا واجب ہو لیکن وہ موجود نہ ہو اور یہ بھی ان صورتوں کے ساتھ مخصوص ہے جن کا احادیث میں ذکر آیا ہے کیونکہ جیسا کہ پہلے بیان کیا گیا ہے کہ عبادات کے سلسلہ میں اصول یہ ہے کہ یہ توقیفی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہمیں کسی صحابی کے بارے میں یہ علم نہیں کہ انہوں نے نقدی کی صورت میں صدقۂ فطرادا کیا ہو جب کہ وہ رسول اللہ ﷺ کی سنت کو سب لوگوں سے زیادہ جانتے بھی تھے اور سنت رسول کے مطابق عمل کرنے کا شوق بھی سب لوگوں سے زیادہ رکھتے تھے۔ اگر انہوں نے نقدی کی صورت میں صدقۂ فطرادا کیا ہوتا تو یہ بھی منقول ہوتا جس طرح ان کے امور شریعت سے متعلق دیگر اقوال و افعال منقول ہیں اور ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ لَّقَدْ كَانَ لَكُمْ فِي رَسُولِ ٱللَّهِ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ ﴾ (الأحزاب۳۳/ ۲۱)

"البتہ تحقیق تمہارے لیے (اے مسلمانو!) رسول اللہ (ﷺ) کی ذات میں عمدہ نمونہ موجود ہے۔" اور فرمایا:

﴿ وَٱلسَّٰبِقُونَ ٱلْأَوَّلُونَ مِنَ ٱلْمُهَٰجِرِينَ وَٱلْأَنصَارِ وَٱلَّذِينَ ٱتَّبَعُوهُم بِإِحْسَٰنٍ رَّضِيَ ٱللَّهُ عَنْهُمْ وَرَضُوا۟ عَنْهُ وَأَعَدَّ لَهُمْ جَنَّٰتٍ تَجْرِي تَحْتَهَا ٱلْأَنْهَٰرُ خَٰلِدِينَ فِيهَآ أَبَدًا ذَٰلِكَ ٱلْفَوْزُ ٱلْعَظِيمُ ۝١٠٠ ﴾ (التوبة۹/ ۱۰۰)

"جن لوگوں نے سبقت کی (یعنی سب سے) پہلے (ایمان لائے) مہاجرین میں سے بھی اور انصار میں سے بھی اور جنہوں نے نیکوکاری کے ساتھ ان کی پیروی کی' اللہ ان سے خوش ہے اور وہ اللہ سے خوش ہیں اور اس نے ان کے لیے باغات تیار کئے ہیں جن کے نیچے نہریں بہہ رہی ہیں (اور) وہ ہمیشہ ان میں رہیں گے۔ یہ بہت بڑی کامیابی ہے۔"

جو کچھ ہم نے ذکر کیا ہے اس سے ایک طالب حق کے سامنے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ نقدی کی صورت میں صدقۂ فطرادا کرنا جائز نہیں ہے' لہٰذا جو شخص نقدی کی صورت میں صدقۂ فطرادا کرے گا تو اس کا یہ صدقہ ادا نہیں ہو گا کیونکہ اس کا یہ عمل مذکورہ ادلہ شرعیہ کے خلاف ہے لہٰذا میں اللہ تعالیٰ سے یہ دعا کرتا ہوں کہ وہ ہمیں اور سب مسلمانوں کو اپنے دین میں فقاہت (سمجھ بوجھ) اور دین پر ثابت قدمی عطا فرمائے اور ہر اس چیز سے بچائے جو اس کی شریعت کے مخالف ہو۔

انه جواد كريم' وصلى الله على نبينا محمد و آله وصحبه.

――― شیخ ابن باز ―――

صدقۂ فطر اپنے شہر کے فقراء میں تقسیم کیا جائے

سوال کیا فطرانہ اپنے ہی شہر کے فقراء میں تقسیم کیا جائے یا دوسروں میں بھی تقسیم کیا جا سکتا ہے؟ اگر ہم نے عید الفطر سے تین دن پہلے سفر کرنا ہو تو پھر کس طرح فطرانہ ادا کریں؟

جواب سنت یہ ہے کہ صدقۂ فطر اپنے ہی شہر کے فقراء میں تقسیم کیا جائے اور یہ نماز عید سے پہلے' عید کے دن کی صبح تقسیم کر دیا جائے۔ عید سے ایک یا دو دن پہلے تقسیم کرنا بھی جائز ہے یعنی رمضان المبارک کی اٹھائیس تاریخ سے تقسیم کرنا شروع کیا جا سکتا ہے۔ اگر کوئی شخص عید سے ایک یا دو دن پہلے سفر کرے تو وہ اسی اسلامی ملک میں تقسیم کرے جہاں سفر کر

کے جا رہا ہو اور اگر وہ غیر اسلامی ملک ہو تو وہاں مسلمان فقراء کو تلاش کر کے ان میں تقسیم کر دے اور اگر سفر اس وقت شروع ہو جب صدقۂ فطر ادا کرنا جائز ہو تو پھر اپنے شہر ہی میں تقسیم کر دے کیونکہ مقصود فقیروں کی ہمدردی و خیر خواہی' ان کے ساتھ نیکی اور انہیں عید کے دن لوگوں سے مانگنے سے روکنا ہے۔

——— شیخ ابن باز ———

فقیہ شہر کے پاس صدقۂ فطر جمع کرانا

سوال ہم صدقۂ فطر اکٹھا کر کے فقیہ شہر کے پاس جمع کرا دیتے ہیں کیونکہ ہم یہ سمجھتے ہیں کہ جو شخص روزہ رکھے اس کے لیے یہ واجب ہے کہ صدقۂ فطر فقیہ شہر کے پاس جمع کرائے' کیا ہمارا یہ موقف صحیح ہے؟

جواب اگر یہ فقیہ امین ہو اور فقراء میں صدقہ تقسیم کر دیتا ہو تو لوگوں کے لیے اس کے پاس اپنا فطرانہ جمع کرانے میں کوئی حرج نہیں تاکہ یہ فقراء میں تقسیم کر دے لیکن فقیہ کے پاس عید سے ایک یا دو دن پہلے جمع کرانا چاہیئے تاکہ وہ اسے عید کے دن تقسیم کر دے۔

——— شیخ ابن عثیمین ———

صدقۂ فطر فقراء ہی کو دیا جائے

سوال ایک شخص جو شہر سے دور کسی جنگل میں رہتا ہو اور اس کے پڑوسی درمیانی حیثیت کے ہوں' یعنی امیر نہ فقیر تو کیا وہ انہیں فطرانہ دے سکتا ہے؟

جواب فطرانہ کی فرضیت میں حکمت یہ ہے کہ عید کے دن فقراء کی ضرورت کو پورا کر دیا جائے تو جو شخص فقیر نہ ہو وہ فطرانے کا مستحق نہیں ہے۔ اگر اپنے ماحول میں کوئی فقیر شخص نہ ہو تو فطرانہ کسی قریب ترین شہر کے فقراء میں تقسیم کے لیے بھیج دینا چاہیئے اور وہاں کسی کو اپنا نائب مقرر کر دینا چاہیئے جو صدقۂ فطر کو وقت مقررہ کے اندر اندر فقراء میں تقسیم کر دے۔

——— فتویٰ کمیٹی ———

باب ہفتم

کتاب الصیام
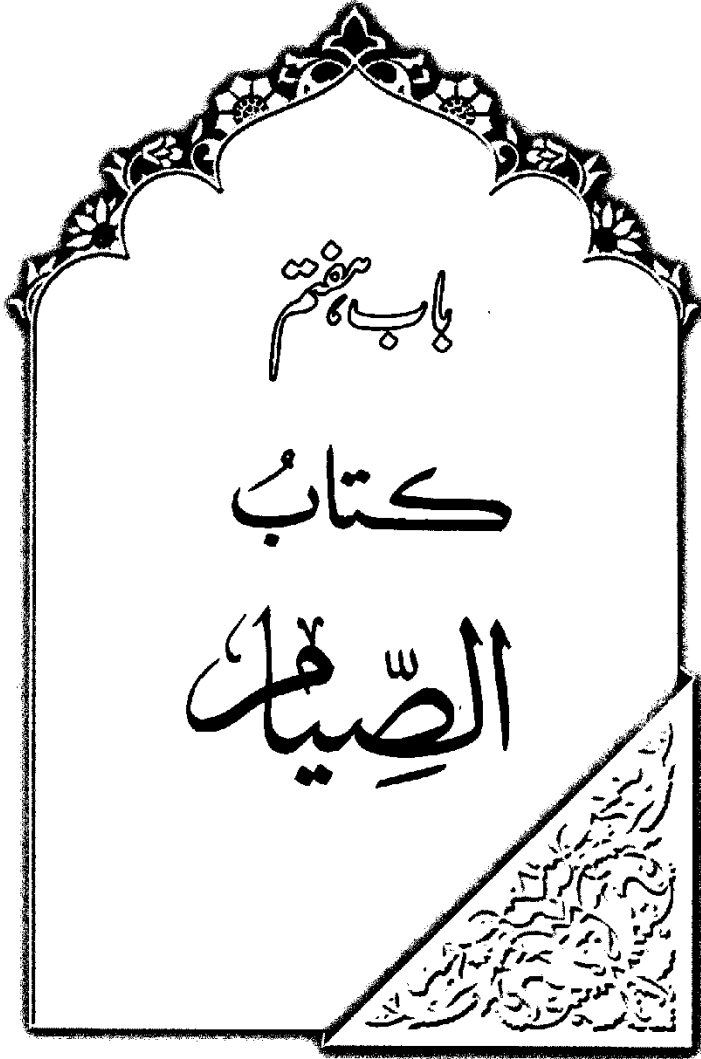
روزوں کے مسائل

رمضان کے روزوں اور قیام کی فضیلت

اَلْحَمْدُ للهِ وَالصَّلَاةُ وَالسَّلَامُ عَلٰى رَسُوْلِ اللهِ، وَعَلٰى آلِهِ وَأَصْحَابِهِ وَمَنِ اهْتَدَى بِهُدَاهُ۔ أَمَّا بَعْدُ

یہ ایک مختصر سی نصیحت ہے جس کا تعلق رمضان کے صیام و قیام کی فضیلت اور اس مہینہ میں اعمال صالحہ میں سبقت کی فضیلت سے ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ کچھ ضروری احکام و مسائل بھی بیان کئے جائیں گے جن سے بعض لوگ ناواقف ہوتے ہیں۔ حدیث سے ثابت ہے کہ رسول اللہ ﷺ حضرات صحابہ کرام کو ماہ رمضان کی آمد کی بشارت سنایا کرتے اور انہیں یہ بتایا کرتے تھے کہ یہ ایک ایسا مہینہ ہے کہ جس میں رحمت اور جنت کے دروازے کھول دیئے جاتے ہیں، جہنم کے دروازے بند کر دیئے جاتے ہیں اور شیطانوں کو بیڑیاں پہنا دی جاتی ہیں، چنانچہ آپ ارشاد فرماتے ہیں:

«إِذَا كَانَتْ أَوَّلُ لَيْلَةٍ مِّنْ رَمَضَانَ صُفِّدَتِ الشَّيَاطِينُ وَمَرَدَةُ الْجِنِّ، وَغُلِّقَتْ أَبْوَابُ النَّارِ، فَلَمْ يُفْتَحْ مِنْهَا بَابٌ وَفُتِحَتْ أَبْوَابُ الْجَنَّةِ فَلَمْ يُغْلَقْ مِنْهَا بَابٌ وَنَادٰى مُنَادٍ: يَا بَاغِيَ الْخَيْرِ أَقْبِلْ وَيَابَاغِيَ الشَّرِّ أَقْصِرْ، وَلِلّٰهِ عُتَقَاءُ مِنَ النَّارِ، وَذٰلِكَ كُلَّ لَيْلَةٍ»(جامع الترمذي، الصوم، باب ما جاء في فضل شهر رمضان، ح:٦٨٢ وسنن ابن ماجه، الصيام، باب ما جاء في فضل شهر رمضان، ح:١٦٤٢)

”جب رمضان کی پہلی رات ہوتی ہے تو شیطانوں اور سرکش جنوں کو پابند زنجیر و سلاسل کر دیا جاتا ہے، اور جہنم کے (سارے) دروازے بند کر دیئے جاتے ہیں اور ان میں سے کسی دروازے کو بھی کھلا نہیں رہنے دیا جاتا اور جنت کے دروازے کھول دیئے جاتے ہیں اور ان میں سے کسی دروازے کو بھی بند نہیں کیا جاتا اور ایک منادی کرنے والا یہ اعلان کرتا ہے کہ اے خیر و بھلائی کے طلب گار! آگے بڑھ اور اے برائی کے خواست گار! اب تو رک جا۔ اللہ تعالیٰ جہنم کی آگ سے لوگوں کو آزادی عطا فرماتا ہے اور ایسا رمضان میں ہر رات ہوتا ہے۔“

آپ نے یہ بھی فرمایا:

«أَتَاكُمْ رَمَضَانُ شَهْرُ بَرَكَةٍ وَيُغْنِيكُمُ اللهُ فِيهِ، فَيُنْزِلُ الرَّحْمَةَ وَيَحُطُّ الْخَطَايَا، وَيَسْتَجِيبُ فِيهِ الدُّعَاءَ، يَنْظُرُ اللهُ إِلٰى تَنَافُسِكُمْ وَيُبَاهِي بِكُمْ مَلَائِكَتَهُ، فَأَرُوا اللهَ مِنْ أَنْفُسِكُمْ خَيْرًا فَإِنَّ الشَّقِيَّ مَنْ حُرِمَ فِيهِ رَحْمَةَ اللهِ»(مجمع الزوائد:٣/ ١٤٢ الصيام، باب في شهور البركة وفضل شهر رمضان، ح:٤٨٨٣ وكنز العمال:٢٣٦٩٢، باختلاف يسير)

"تمہارے پاس رمضان آیا ہے جو کہ برکت کا مہینہ ہے' اللہ تعالیٰ تمہیں اس مہینے میں اللہ تعالیٰ تمہیں (اپنی رحمت سے) غنی کرتا ہے اپنی رحمت نازل فرماتا ہے 'گناہوں کو معاف فرماتا اور دعا کو شرف قبولیت سے نوازتا ہے' اللہ تعالیٰ اس مہینے میں نیکی اور بھلائی کے کاموں میں تمہارے ذوق شوق اور رغبت کو دیکھتا ہے اور اپنے فرشتوں کے سامنے تم پر فخر کرتا ہے سو تم بھی اللہ تعالیٰ کو اپنی طرف سے خیروبھلائی کا مظاہرہ دکھا دو اور وہ شخص تو بڑا ہی بدبخت ہے جو اس مہینے میں بھی اللہ تعالیٰ کی رحمت سے محروم رہا۔"

آپ ﷺ یہ بھی فرماتے:

«مَنْ صَامَ رَمَضَانَ إِيمَانًا وَّاحْتِسَابًا غُفِرَ لَهُ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْبِهِ، وَمَنْ قَامَ رَمَضَانَ إِيمَانًا وَّاحْتِسَابًا غُفِرَ لَهُ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْبِهِ، وَمَنْ قَامَ لَيْلَةَ الْقَدْرِ إِيمَانًا وَّاحْتِسَابًا غُفِرَ لَهُ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْبِهِ»(صحيح البخاري، فضل ليلة القدر، ح:٢٠١٤، وصلاة التراويح، باب فضل من قام رمضان، ح:٢٠٠٩ وصحيح مسلم، صلاة المسافرين، باب الترغيب في قيام رمضان ... الخ، ح:٧٥٩، ٧٦٠)

"جس نے ایمان اور حصول ثواب کی نیت سے رمضان کے روزے رکھے اس کے سابقہ تمام گناہ معاف کر دیئے جاتے ہیں اور جو ایمان اور حصول ثواب کی نیت سے رمضان میں قیام کرے گا تو اس کے بھی سابقہ تمام گناہ معاف کر دیئے جاتے ہیں اور جس نے ایمان اور حصول ثواب کی نیت سے لیلۃ القدر کا قیام کیا اس کے بھی سابقہ تمام گناہ معاف کر دیئے جاتے ہیں۔"

آپ یہ بھی فرماتے کہ اللہ عزوجل نے فرمایا:

«كُلُّ عَمَلِ ابْنِ آدَمَ لَهُ إِلاَّ الصِّيَامَ، فَإِنَّهُ لِي وَأَنَا أَجْزِي بِهِ، يَتْرُكُ شَهْوَتَهُ وَطَعَامَهُ وَشَرَابَهُ مِنْ أَجْلِي لِلصَّائِمِ فَرْحَتَانِ فَرْحَةٌ عِنْدَ فِطْرِهِ وَفَرْحَةٌ عِنْدَ لِقَاءِ رَبِّهِ، وَلَخُلُوفُ فَمِ الصَّائِمِ أَطْيَبُ عِنْدَ اللهِ مِنْ رِّيحِ الْمِسْكِ»(صحيح البخاري، الصوم، باب هل يقول إني صائم إذا شتم، ح:١٩٠٤ وصحيح مسلم، الصيام، باب فضل الصيام، ح:١٦١/١١٥١ بالفاظ مختلفة)

"ابن آدم کا ہر عمل اسی کے لیے ہے سوائے روزے کے اور روزہ میرے لیے ہے اور میں ہی اس کی جزا دوں گا۔ اس نے میری وجہ سے اپنی شہوت اور کھانے پینے کو ترک کر دیا ہے۔ روزے دار کے لیے دو خوشیاں ہیں۔ ایک خوشی افطار کے وقت اور دوسری خوشی اپنے رب کے دیدار کے وقت' روزے دار کے منہ کی بو اللہ تعالیٰ کے ہاں کستوری کی خوشبو سے بھی زیادہ پاکیزہ اور اچھی ہے۔"

رمضان کے صیام و قیام اور عام روزے کی فضیلت کے بارے میں بہت سی احادیث وارد ہیں لہٰذا ہر مومن کو چاہیئے اس فرصت کو غنیمت جانے کہ اللہ تعالیٰ نے اس پر احسان فرماتے ہوئے اسے رمضان سے مستفید ہونے کا موقع عطا فرمایا لہٰذا اسے چاہیئے کہ نیکیوں میں سبقت کا مظاہر کرے' برائیوں سے اجتناب کرے' فرائض ادا کرنے میں خوب کوشش کرے' خصوصاً نماز پنجگانہ کے بارے میں خوب خوب اہتمام کرے کیونکہ نماز اسلام کا ستون اور کلمہ طیبہ کے بعد سب سے عظیم فریضہ ہے لہٰذا ہر مسلمان مرد و عورت پر نماز کی حفاظت کرنا واجب ہے اور تمام نمازوں کو ان کے اوقات میں خشوع و خضوع اور نہایت اطمینان و سکون سے ادا کیا جائے۔

مردوں کے حق میں نہایت اہم فریضہ یہ بھی ہے کہ نماز کو باجماعت اللہ تعالیٰ کے ان گھروں میں ادا کیا جائے جن کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے یہ ارشاد فرمایا ہے کہ وہ بلند کئے جائیں اور ان میں اللہ تعالیٰ کے نام کا ذکر کیا جائے۔ جس طرح کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

﴿ وَأَقِيمُوا۟ ٱلصَّلَوٰةَ وَءَاتُوا۟ ٱلزَّكَوٰةَ وَٱرْكَعُوا۟ مَعَ ٱلرَّٰكِعِينَ ﴿٤٣﴾ ﴾ (البقرة٢/ ٤٣)

"اور نماز قائم کرو اور زکوٰۃ دیا کرو اور (اللہ کے آگے) جھکنے والوں کے ساتھ جھکا کرو۔"

اور فرمایا:

﴿ حَـٰفِظُوا۟ عَلَى ٱلصَّلَوَٰتِ وَٱلصَّلَوٰةِ ٱلْوُسْطَىٰ وَقُومُوا۟ لِلَّهِ قَـٰنِتِينَ ﴿٢٣٨﴾ ﴾ (البقرة٢/ ٢٣٨)

"(مسلمانو!) سب نمازیں' خصوصاً درمیانی نماز (نماز عصر) پورے التزام کے ساتھ ادا کرو اور اللہ کے آگے ادب سے کھڑے رہا کرو۔"

اور فرمایا:

﴿ قَدْ أَفْلَحَ ٱلْمُؤْمِنُونَ ﴿١﴾ ٱلَّذِينَ هُمْ فِى صَلَاتِهِمْ خَـٰشِعُونَ ﴿٢﴾ وَٱلَّذِينَ هُمْ عَنِ ٱللَّغْوِ مُعْرِضُونَ ﴿٣﴾ وَٱلَّذِينَ هُمْ لِلزَّكَوٰةِ فَـٰعِلُونَ ﴿٤﴾ وَٱلَّذِينَ هُمْ لِفُرُوجِهِمْ حَـٰفِظُونَ ﴿٥﴾ إِلَّا عَلَىٰٓ أَزْوَٰجِهِمْ أَوْ مَا مَلَكَتْ أَيْمَـٰنُهُمْ فَإِنَّهُمْ غَيْرُ مَلُومِينَ ﴿٦﴾ فَمَنِ ٱبْتَغَىٰ وَرَآءَ ذَٰلِكَ فَأُو۟لَـٰٓئِكَ هُمُ ٱلْعَادُونَ ﴿٧﴾ وَٱلَّذِينَ هُمْ لِأَمَـٰنَـٰتِهِمْ وَعَهْدِهِمْ رَٰعُونَ ﴿٨﴾ وَٱلَّذِينَ هُمْ عَلَىٰ صَلَوَٰتِهِمْ يُحَافِظُونَ ﴿٩﴾ أُو۟لَـٰٓئِكَ هُمُ ٱلْوَٰرِثُونَ ﴿١٠﴾ ٱلَّذِينَ يَرِثُونَ ٱلْفِرْدَوْسَ هُمْ فِيهَا خَـٰلِدُونَ ﴿١١﴾ ﴾ (المؤمنون٢٣/ ١-١١)

"بے شک ایمان والے کامیاب ہو گئے۔ جو نماز میں عجز و نیاز کرتے ہیں اور جو بے ہودہ باتوں سے منہ موڑے رہتے ہیں اور زکوٰۃ ادا کرتے ہیں اور جو اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کرتے ہیں۔ مگر اپنی بیویوں یا (کنیزوں سے) جو ان کی ملک ہوتی ہیں کہ (ان سے) مباشرت کرنے سے انہیں ملامت نہیں اور جو ان کے سوا اوروں کے طالب ہوں' وہ (اللہ کی مقرر کی ہوئی حد سے) نکل جانے والے ہیں اور جو امانتوں اور اقراروں کو ملحوظ رکھتے ہیں اور وہ لوگ جو نمازوں کی پابندی کرتے ہیں' یہی لوگ میراث حاصل کرنے والے ہیں (یعنی) جو بہشت کی میراث حاصل کریں (اور) اس میں ہمیشہ رہیں گے۔"

اور نبی کریم ﷺ نے فرمایا:

«اَلْعَهْدُ الَّذِي بَيْنَنَا وَبَيْنَهُمُ الصَّلَاةُ فَمَنْ تَرَكَهَا فَقَدْ كَفَرَ»(جامع الترمذي، الإيمان، باب ما جاء في ترك الصلاة، ح:٢٦٢١)

"ہمارے اور ان کے درمیان جو عہد ہے' وہ نماز ہے' جس نے اسے ترک کر دیا وہ کافر ہے۔"

نماز کے بعد سب سے اہم فریضہ زکوٰۃ ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

﴿ وَمَآ أُمِرُوٓا۟ إِلَّا لِيَعْبُدُوا۟ ٱللَّهَ مُخْلِصِينَ لَهُ ٱلدِّينَ حُنَفَآءَ وَيُقِيمُوا۟ ٱلصَّلَوٰةَ وَيُؤْتُوا۟ ٱلزَّكَوٰةَ ۚ وَذَٰلِكَ دِينُ ٱلْقَيِّمَةِ ﴿٥﴾ ﴾ (البينة٩٨/ ٥)

"اور ان کو حکم تو یہی ہوا تھا کہ اخلاص عمل کے ساتھ اللہ کی عبادت کریں (اور یک سو ہو کر) نماز پڑھیں اور

زکوٰۃ دیں اور یہی سچا دین ہے۔"

کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ ﷺ اس بات پر دلالت کناں ہیں کہ جو شخص اپنے مال کی زکوٰۃ ادا نہ کرے اسے قیامت کے دن عذاب ہو گا۔

نماز اور زکوٰۃ کے بعد سب سے اہم فریضہ رمضان کے روزے ہیں۔ روزہ بھی اسلام کے ان ارکان خمسہ میں سے ایک ہے جن کا نبی ﷺ کی اس حدیث میں ذکر ہے' آپ نے ارشاد فرمایا ہے:

«بُنِيَ الإِسْلاَمُ عَلٰى خَمْسٍ: شَهَادَةِ أَنْ لاَ إِلٰهَ إِلاَّ اللهُ، وَأَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُولُ اللهِ، وَإِقَامِ الصَّلاَةِ، وَإِيتَاءِ الزَّكَاةِ، وَصَوْمِ رَمَضَانَ، وَحَجِّ الْبَيْتِ»(صحيح البخاري، الإيمان، باب دعاؤكم إيمانكم، ح:٨ وصحيح مسلم، الإيمان، باب بيان أركان الإسلام ... الخ، ح:١٦)

"اسلام کی بنیاد پانچ باتوں پر رکھی گئی ہے: اس بات کی گواہی دینا کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور حضرت محمد ﷺ اللہ کے رسول ہیں' نماز قائم کرنا' زکوٰۃ ادا کرنا' رمضان کے روزے رکھنا اور بیت اللہ کا حج کرنا۔"

مسلمان کے لیے یہ واجب ہے کہ وہ اپنے روزے کو ان اقوال و اعمال سے بچائے جنہیں اللہ تعالیٰ نے حرام قرار دیا ہے کیونکہ روزے سے مقصود یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی اطاعت و بندگی کی جائے' اس کی محرمات کی تعظیم بجالائی جائے' نفس کے خلاف جہاد کیا جائے اور اللہ تعالیٰ کی اطاعت کے مقابلہ میں اس (نفس) کی خواہشات کی مخالفت کی جائے' اللہ تعالیٰ نے جن باتوں کو حرام قرار دیا ہے ان پر صبر کا نفس کو عادی بنایا جائے کیونکہ روزے سے محض یہ مقصود نہیں ہے کہ کھانا پینا اور دیگر مفطرات کو ترک کر دیا جائے یہی وجہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

«اَلصِّيَامُ جُنَّةٌ، وَإِذَا كَانَ يَوْمُ صَوْمِ أَحَدِكُمْ فَلاَ يَرْفُثْ وَلاَ يَصْخَبْ، فَإِنْ سَابَّهُ أَحَدٌ أَوْ قَاتَلَهُ فَلْيَقُلْ: إِنِّي امْرُؤٌ صَائِمٌ»(صحيح البخاري، الصوم، باب هل يقول: إني صائم، إذا شتم، ح:١٩٠٤ ومسند أحمد:٦/ ٢٤٤)

"روزہ ڈھال ہے جب تم میں سے کسی نے روزہ رکھا ہو تو وہ نہ فحش باتیں کرے اور نہ شوروغوغا مچائے' اگر اسے کوئی گالی دے یا لڑائی جھگڑا کرے تو اس سے کہہ دے کہ میں روزہ دار ہوں۔"

اسی طرح صحیح حدیث میں ہے نبی ﷺ نے یہ بھی فرمایا:

«مَنْ لَّمْ يَدَعْ قَوْلَ الزُّورِ وَالْعَمَلَ بِهِ، وَالْجَهْلَ، فَلَيْسَ لِلّٰهِ حَاجَةٌ فِي أَنْ يَّدَعَ طَعَامَهُ وَشَرَابَهُ»(صحيح البخاري، الصوم، باب من لم يدع قول الزور ... الخ، ح:١٩٠٣ وكتاب الأدب، ح:٦٠٥٧)

"جو شخص جھوٹی بات' اس کے مطابق عمل اور جہالت کو ترک نہ کرے تو اللہ تعالیٰ کو اس بات کی کوئی ضرورت نہیں کہ وہ اپنا کھانا پینا ترک کر لے۔"

مذکورہ بالا اور دیگر نصوص سے یہ معلوم ہوا کہ روزے دار پر یہ واجب ہے کہ وہ ہر اس چیز سے اجتناب کرے جسے اللہ تعالیٰ نے اس پر حرام قرار دیا ہے اور اس چیز کی حفاظت کرے جسے اللہ تعالیٰ نے اس پر واجب قرار دیا ہے کیونکہ اسی عمل ہی سے مغفرت' جہنم سے آزادی اور صیام و قیام کی قبولیت کی امید کی جا سکے گی۔

کچھ امور جو بعض لوگوں کو معلوم نہیں

ہر مسلمان کے لیے یہ واجب ہے کہ وہ ایمان اور حصول ثواب کی نیت سے روزہ رکھے۔ ریاکاری' شہرت' لوگوں کی تقلید یا محض اس وجہ سے روزہ نہ رکھے کہ اس کے گھر والے یا شہر والے چونکہ آج کل روزے رکھ رہے ہیں لہٰذا وہ بھی روزہ رکھ رہا ہے بلکہ روزہ اس لیے رکھنا چاہیئے کہ یہ ایمان ہو کہ اللہ تعالیٰ نے روزہ رکھنا فرض قرار دیا ہے لہٰذا وہ اس فرض کے ادا کرنے اور اپنے رب سے اس کے اجروثواب کو پانے کی امید سے روزہ رکھے' اسی طرح قیام رمضان بھی کسی اور وجہ سے نہیں بلکہ ایمان و حصول ثواب کی نیت سے کرنا چاہیئے کیونکہ نبی ﷺ نے ارشاد فرمایا ہے:

«مَنْ صَامَ رَمَضَانَ إِيمَانًا وَّاحْتِسَابًا غُفِرَ لَهُ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْبِهِ، وَمَنْ قَامَ رَمَضَانَ إِيمَانًا وَّاحْتِسَابًا غُفِرَ لَهُ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْبِهِ، وَمَنْ قَامَ لَيْلَةَ الْقَدْرِ إِيمَانًا وَّاحْتِسَابًا غُفِرَ لَهُ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْبِهِ» (صحيح البخاري، فضل ليلة القدر، ح:٢٠١٤، وصلاة التراويح، باب فضل من قام رمضان، ح:٢٠٠٩ وصحيح مسلم، صلاة المسافرين، باب الترغيب في قيام رمضان ... الخ، ح:٧٥٩، ٧٦٠)

"جو شخص بحالت ایمان ثواب کی نیت سے رمضان کے روزے رکھے۔ اس کے سابقہ گناہ معاف کر دیئے جاتے ہیں' جو شخص بحالت ایمان ثواب کی نیت سے رمضان کا قیام کرے اس کے سابقہ تمام گناہ معاف کر دیئے جاتے ہیں اور جو شخص بحالت ایمان ثواب کی نیت سے لیلۃ القدر کا قیام کرے اس کے بھی سابقہ تمام گناہ معاف کر دیئے جاتے ہیں۔"

وہ امور جن کا حکم بعض لوگوں سے مخفی ہے' ان میں سے ایک یہ بھی ہے کہ روزے دار کو اگر کوئی زخم لگ جائے یا نکسیر پھوٹ جائے یا قے آ جائے یا غیر اختیاری طور پر حلق تک پانی وغیرہ چلا جائے تو ان سے روزہ فاسد نہیں ہوتا' ہاں البتہ اگر کوئی شخص جان بوجھ کر قے کرے تو اس سے روزہ فاسد ہو جائے گا کیونکہ نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے:

«مَنْ ذَرَعَهُ الْقَيْءُ فَلَا قَضَاءَ عَلَيْهِ، وَمَنِ اسْتَقَاءَ، فَعَلَيْهِ الْقَضَاءُ»(سنن أبي داود، الصيام، باب الصائم يستقيء عامدا، ح:٢٣٨٠ وجامع الترمذي، ح:٧٢٠ وسنن ابن ماجه، الصيام، باب ما جاء في الصائم يقيء، ح:١٦٧٦ واللفظ له)

"جسے خود بخود قے آ جائے اس پر قضاء نہیں ہے اور جو شخص جان بوجھ کر قے کرے اس پر قضاء لازم ہے۔"

بعض لوگوں سے اس مسئلہ کا حکم بھی مخفی ہے کہ بسااوقات روزے دار کے غسل جنابت میں طلوع فجر تک تاخیر ہو جاتی ہے یا بعض عورتوں کے غسل حیض و نفاس میں طلوع فجر تک تاخیر ہو جاتی ہے جب کہ وہ طلوع فجر سے قبل پاک ہو گئی ہوں تو اس صورت میں بھی ان کے لیے روزہ لازم ہو گا۔ طلوع فجر کے بعد تک غسل مؤخر ہونے میں کوئی حرج نہیں البتہ غسل میں طلوع آفتاب تک تاخیر نہیں ہونی چاہیئے بلکہ یہ واجب ہے کہ وہ طلوع آفتاب سے پہلے پہلے غسل کر کے نماز پڑھ لیں۔ اسی طرح جنبی کو چاہیئے کہ وہ غسل میں اس قدر تاخیر نہ کرے کہ سورج طلوع ہو جائے بلکہ ضروری ہے کہ طلوع آفتاب سے پہلے غسل کر کے نماز فجر ادا کرے۔ مرد کو چاہیئے کہ وہ جلد از جلد غسل جنابت کرے تاکہ نماز فجر باجماعت ادا کر

سکے۔

وہ امور جن سے روزہ فاسد نہیں ہوتا (ان میں سے ایک) کیمیائی تجزیہ کے لیے خون نکالنا ہے' اسی طرح اس ٹیکے سے بھی روزہ فاسد نہیں ہوتا جو غذائی مقصد کے لیے نہ ہو لیکن زیادہ بہتری اور احتیاط اس میں ہے کہ ٹیکہ دن کی بجائے رات کو لگوالیا جائے بشرطیکہ ایسا ممکن ہو کیونکہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا:

«دَعْ مَا يَرِيبُكَ إِلٰى مَا لاَ يَرِيبُكَ» (صحيح البخاري، البيوع، باب تفسير الشبهات [تعليقا موقوفًا] وجامع الترمذي، صفة القيامة، باب حديث اعقلها وتوكل ... الخ، ح:٢٥١٨)

''اس کو چھوڑ دو جس میں شک ہو اور اس کو اختیار کرو جس میں شک نہ ہو۔''

نیز آپ نے فرمایا ہے:

«مَنِ اتَّقَى الشُّبُهَاتِ اسْتَبْرَأَ لِدِينِهِ وَعِرْضِهِ»(صحيح البخاري، الإيمان، باب فضل من استبرأ لدينه، ح:٥٢ وصحيح مسلم، المساقاة، باب أخذ الحلال وترك الشبهات، ح:١٥٩٩ واللفظ له)

''جو شبہات سے بچ گیا اس نے اپنے دین اور عزت کو بچالیا۔''

وہ امور جن کا حکم بعض لوگوں سے مخفی ہے' (ان میں سے ایک) نماز میں عدم اطمینان کا مسئلہ بھی ہے۔ نماز خواہ فرض ہو یا نفل' چنانچہ رسول اللہ ﷺ کی احادیث صحیحہ اس بات پر دلالت کرتی ہیں کہ اطمینان نماز کے ارکان میں سے ایک ایسا رکن ہے کہ اس کے بغیر نماز صحیح نہیں ہوتی۔ اطمینان سے مراد یہ ہے کہ نماز نہایت آرام و سکون اور خشوع و خضوع کے ساتھ ادا کی جائے اور عجلت (جلد بازی) کا مظاہرہ نہ کیا جائے بلکہ اس طرح سکون کے ساتھ نماز ادا کی جائے کہ ہر جوڑ اپنی جگہ واپس آ جائے۔ بہت سے لوگ رمضان میں نماز تراویح اس طرح پڑھتے ہیں کہ انہیں کچھ معلوم نہیں ہوتا کہ وہ کیا پڑھ رہے ہیں؟ اور اطمینان و سکون کے بغیر اس طرح جلد جلد پڑھتے ہیں جس طرح ٹھونگیں مار رہے ہوں حالانکہ اس طرح نماز پڑھنا باطل ہے۔ اس طرح نماز پڑھنے سے گناہ ہوتا ہے اور قطعاً کوئی ثواب نہیں ملتا۔

وہ امور جن کا حکم بعض لوگوں سے مخفی ہے (ان میں سے ایک یہ بھی ہے) کہ بعض لوگ یہ گمان کرتے ہیں کہ نماز تراویح بیس رکعات سے کم پڑھنا جائز نہیں ہے جیسا کہ بعض کا یہ گمان ہے کہ گیارہ یا تیرہ رکعات سے زیادہ پڑھنا جائز نہیں ہے یہ سب باتیں نامناسب' غلط اور دلائل کے خلاف ہیں کیونکہ رسول اللہ ﷺ کی احادیث صحیحہ سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ رات کی نماز میں بہت گنجائش ہے۔ اس کی کوئی ایسی حد متعین نہیں ہے کہ جس کی مخالفت جائز نہ ہو بلکہ ثابت ہے کہ نبی ﷺ رات کو گیارہ اور کبھی تیرہ رکعات پڑھتے [1] اور کبھی رمضان و غیر رمضان میں اس سے کم و بیش بھی پڑھتے تھے اور جب آپ ﷺ سے رات کی نماز کے بارے میں پوچھا گیا تو آپ نے فرمایا:

«صَلَاةُ اللَّيْلِ مَثْنٰى مَثْنٰى، فَإِذَا خَشِيَ أَحَدُكُمُ الصُّبْحَ، صَلّٰى رَكْعَةً وَّاحِدَةً، تُوتِرُ لَهُ مَا قَدْ صَلّٰى»(صحيح البخاري، الوتر، باب ماجاء في الوتر، ح:٩٩٠ وصحيح مسلم، صلاة المسافرين، باب صلاة الليل مثنٰى مثنٰى ... الخ، ح:٧٤٩)

---

[1] صحیح بخاری' التہجد' باب قیام النبی صلی اللّٰہ علیہ وسلم باللیل فی رمضان' حدیث: 1147 و صحیح مسلم' صلاۃ المسافرین' باب صلاۃ اللیل و عدد رکعات النبی صلی اللّٰہ علیہ وسلم ..... الخ' حدیث: 738۔

"رات کی نماز دو دو رکعت ہے اور جب تم میں سے کسی کو یہ خدشہ ہو کہ صبح طلوع ہونے والی ہے تو وہ ایک رکعت پڑھ لے اس سے اس کی ساری پڑھی ہوئی نماز وتر ہو جائے گی۔"

رمضان اور غیر رمضان میں رات کی نماز کی رکعات کی تعداد معین نہیں ہے یہی وجہ ہے کہ حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے عہد اور بعض دیگر اوقات میں تئیس رکعتیں بھی پڑھی ہیں اور بعض روایات میں ہے کہ انہوں نے گیارہ رکعات پڑھیں۔ یہ سب کچھ حضرت عمر فاروق اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے عمل سے عہد فاروقی میں ثابت ہے۔ بعض سلف رمضان میں چھتیس رکعات اور تین وتر پڑھتے اور بعض سے اکتالیس رکعات پڑھنا بھی ثابت ہے' چنانچہ سلف کے حوالہ سے شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ نے ذکر فرمایا ہے "اس مسئلہ میں کافی گنجائش ہے۔" انہوں نے یہ بھی ذکر فرمایا ہے کہ "افضل یہ ہے کہ جس کی قراءت' رکوع اور سجود لمبے ہوں وہ تعداد کم کر دے اور جس کی قراءت' رکوع اور سجدے چھوٹے ہوں' وہ رکعات کی تعداد میں اضافہ کر لے۔" یہ شیخ الاسلام رحمۃ اللہ علیہ کے کلام کا مفہوم ہے۔

جو شخص اس مسئلہ میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت پر غور کرے گا تو اسے یہ معلوم ہو جائے گا کہ سب سے افضل صورت یہ ہے کہ رمضان و غیر رمضان میں گیارہ یا تیرہ رکعات پڑھی جائیں کیونکہ اکثر و بیشتر حالات میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا یہی معمول تھا' نمازیوں کے لیے بھی اسی میں سہولت ہے اور خشوع و خضوع اور اطمینان و سکون بھی اسی میں زیادہ ہے اور اگر کوئی اس سے زیادہ رکعات پڑھنا چاہے تو اس میں بھی کوئی حرج نہیں جیسا کہ پہلے بیان کیا جا چکا ہے۔

امام کے ساتھ قیام رمضان کرنے والے کے لیے افضل یہ ہے کہ وہ امام کے ساتھ آخر تک قیام میں شرکت کرے کیونکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے:

«إِنَّ الرَّجُلَ إِذَا قَامَ مَعَ الإِمَامِ حَتَّى يَنْصَرِفَ حُسِبَ لَهُ قِيَامُ لَيْلَةٍ» (سنن أبي داود، شهر رمضان، باب في قيام شهر رمضان، ح:١٣٧٥ وجامع الترمذي، ح:٨٠٦ وسنن النسائي، ح:١٣٦٥ وسنن ابن ماجه، ح:١٣٢٧ ومسند أحمد:٥/ ١٥٩ واللفظ له)

"آدمی جب آخر تک امام کے ساتھ قیام کرے تو اس کے لیے پوری رات کا قیام شمار کیا جاتا ہے۔"

تمام مسلمانوں کو چاہیے کہ وہ اس مہینے میں تمام اقسام کی عبادات خوب محنت اور کوشش سے سرانجام دیں' زیادہ سے زیادہ نوافل ادا کریں' تدبر اور غور و فکر کے ساتھ قرآن مجید کی زیادہ سے زیادہ تلاوت کریں' کثرت کے ساتھ تسبیح' تہلیل' تحمید' تکبیر' استغفار اور شرعی دعائیں کریں' امر بالمعروف' نہی عن المنکر اور دعوت الی اللہ کا کام بھی خوب کریں' فقراء و مساکین کے ساتھ ہمدردی و غم گساری کریں' والدین کی اطاعت و فرماں برداری میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہ کریں' صلہ رحمی' مہمان نوازی' مریض کی عیادت اور اس طرح کے نیکی کے دیگر کاموں میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھیں کیونکہ مذکورہ بالا بیان کردہ حدیث میں آپ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد گرامی پڑھ آئے ہیں:

«يَنْظُرُ اللّٰهُ إِلَى تَنَافُسِكُمْ وَيُبَاهِي بِكُمْ مَلَائِكَتَهُ، فَأَرُوا اللّٰهَ مِنْ أَنْفُسِكُمْ خَيْرًا فَإِنَّ الشَّقِيَّ مَنْ حُرِمَ فِيهِ رَحْمَةَ اللّٰهِ» (مجمع الزوائد: ٣/ ١٤٢، الصيام، باب في شهور البركة وفضل شهر رمضان، ح: ٤٨٨٣ وكنز العمال: ٢٣٦٩٢، باختلاف يسير)

اللہ تعالیٰ' (اس مہینے میں) نیکی اور بھلائی کے کاموں میں' تمہارے ذوق شوق اور رغبت کو دیکھتا ہے اور اپنے

فرشتوں کے سامنے تم پر فخر کرتا ہے' سو تم بھی اللہ تعالیٰ کو اپنی طرف سے خیروبھلائی کا مظاہرہ دکھا دو اور وہ شخص تو بڑا ہی بدبخت ہے جو اس مہینے میں بھی اللہ تعالیٰ کی رحمت سے محروم رہا۔"

اس مہینے میں نیکی و تقویٰ کے کاموں میں سبقت کا مظاہرہ اس لیے بھی ہونا چاہیئے کہ نبی ﷺ کا ارشاد گرامی ہے:

«مَنْ تَقَرَّبَ فِيهِ بِخَصْلَةٍ مِّنَ الْخَيْرِ، كَانَ كَمَنْ أَدَّى فَرِيضَةً فِيمَا سِوَاهُ، وَمَنْ أَدَّى فِيهِ فَرِيضَةً كَانَ كَمَنْ أَدَّى سَبْعِينَ فَرِيضَةً فِيمَا سِوَاهُ»(صحيح ابن خزيمة، الصيام، باب فضائل شهر رمضان . . . الخ، ح:١٨٨٧)

"جو شخص اس مہینے میں کوئی نفل کام کرتا ہے تو اسے اس قدر ثواب ملتا ہے جیسے دوسرے مہینوں میں اس نے کوئی فرض سرانجام دیا ہو اور جو اس مہینے میں کوئی فرض سرانجام دیتا ہے تو اسے دوسرے مہینوں کے ستر فرائض کے بقدر ثواب ملتا ہے۔"

اسی طرح صحیح حدیث میں رسول اللہ ﷺ کا یہ فرمان بھی موجود ہے:

«عُمْرَةٌ فِي رَمَضَانَ تَعْدِلُ حَجَّةً أَوْ قَالَ حَجَّةً مَعِي»(صحيح البخاري، جزاء الصيد، باب حج النساء، ح:١٨٦٣ وصحيح مسلم، الحج، باب فضل العمرة في رمضان، ح:١٢٥٦)

"رمضان میں عمرہ حج کے برابر ہے یا آپ نے یہ فرمایا کہ میرے ساتھ حج کے برابر ہے۔"

ایسی احادیث و آثار تو بہت ہی زیادہ ہیں جو اس امر پر دلالت کرتی ہیں کہ حکم شریعت یہ ہے کہ اس ماہ مقدس میں نیکی و تقویٰ کے کاموں میں خوب بڑھ چڑھ کر حصہ لیا جائے اور نیکی و بھلائی کے کاموں میں خوب خوب سبقت کا مظاہرہ کیا جائے۔ اللہ تعالیٰ سے یہ دعا ہے کہ وہ تمام مسلمانوں کو ہر اس کام کی توفیق عطا فرمائے جس میں اس کی رضا ہو۔ وہ ہمارے صیام و قیام کو شرف قبولیت سے نوازے' ہمارے حالات کی اصلاح فرما دے' ہمیں گمراہ کن فتنوں سے محفوظ رکھے! ہم اللہ سبحانہ و تعالیٰ سے یہ دعا بھی کرتے ہیں کہ وہ مسلمانوں کے حکمرانوں کی اصلاح فرمائے اور حق پر ان سب کو جمع ہونے کی توفیق عطا فرمائے۔ بے شک وہی قادر و کارساز ہے۔ والسلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ!

سماحۃ الشیخ عبدالعزیز بن عبداللہ بن باز

الرئيس العام

لادارات البحوث العلمية والافتاء والدعوة والارشاد

مہینے کی ابتداء و انتہاء اور رؤیت ہلال کے احکام

رمضان اور شوال کا چاند دیکھنا

سوال وہ کیا طریقہ ہے جس سے معلوم ہو کہ قمری مہینہ شروع ہو گیا ہے؟

جواب نبی کریم ﷺ کی صحیح احادیث اس امر پر دلالت کناں ہیں کہ جب ایک ثقہ آدمی غروب آفتاب کے بعد شعبان کی تیسویں رات کو اور دو ثقہ آدمی رمضان کی تیسویں رات کو چاند دیکھ لیں تو یہ رؤیت معتبر ہو گی اور اسی سے مہینے کا آغاز معلوم ہو جائے گا۔ اس بات کی ضرورت نہیں ہے کہ یہ دیکھا جائے کہ غروب آفتاب کے بعد چاند کتنے منٹ تک باقی رہا ہے یعنی بیس منٹ یا اس سے کم و بیش کیونکہ صحیح احادیث سے یہ قطعاً ثابت نہیں کہ غروب آفتاب کے کتنے منٹ بعد چاند غروب ہوا ہو تو نیا چاند نظر آتا ہے۔

—— فتویٰ کمیٹی ——

اثبات ہلال کے لیے حساب پر اعتماد جائز نہیں

سوال بعض اسلامی ملکوں میں لوگ رمضان کے لیے چاند دیکھنے کی بجائے کیلنڈر پر اعتماد کرتے ہیں تو اس کا کیا حکم ہے؟

جواب نبی کریم ﷺ نے مسلمانوں کو یہ حکم دیا ہے کہ ”وہ چاند دیکھ کر روزے رکھیں اور چاند دیکھ کر ہی روزے چھوڑیں اور اگر مطلع ابر آلود ہو تو مہینے کے تیس دن پورے کر لیں۔“ [1]

نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام نے یہ بھی فرمایا ہے:

«إِنَّا أُمَّةٌ أُمِّيَّةٌ لاَ نَكْتُبُ وَلاَ نَحْسُبُ، اَلشَّهْرُ هٰكَذَا وَهٰكَذَا وَهٰكَذَا وَخَنَسَ إِبْهَامَهُ فِي الثَّالِثَةِ وَقَالَ: اَلشَّهْرُ هٰكَذَا وَهٰكَذَا وَهٰكَذَا وَأَشَارَ بِأَصَابِعِهِ كُلِّهَا يَعْنِي بِذٰلِكَ أَنَّ الشَّهْرَ يَكُونُ تِسْعًا وَّعِشْرِينَ وَيَكُونُ ثَلاَثِينَ»(صحيح البخاري، الصوم، باب قول النبي ﷺ "لا نكتب ولا نحسب" ح:١٩١٣، والطلاق، باب اللعان... الخ، ح:٥٣٠٢ وصحيح مسلم، الصيام، باب وجوب صوم رمضان لرؤية الهلال ... الخ، ح:١٠٨٠)

”ہم ایک امی امت ہیں۔ ہم حساب کتاب نہیں جانتے۔ مہینہ اس طرح‘ اس طرح اور اس طرح ہوتا ہے اور دونوں ہاتھوں کی انگلیوں سے اشارہ کرتے وقت تیسری بار آپ نے انگوٹھے کو بند کر لیا تھا پھر فرمایا مہینہ اس طرح‘ اس طرح اور اس طرح ہوتا ہے اور دونوں ہاتھوں کی تمام انگلیوں سے اشارہ کیا اس سے مقصود یہ تھا کہ قمری مہینہ کبھی انتیس اور کبھی تیس دن کا ہوتا ہے۔“

---

[1] صحیح بخاری‘ الصوم‘ باب قول النبی صلی اللّٰہ علیه وسلم إذارأیتم الهلال فصوموا ..... حدیث: 1909 و صحیح مسلم‘ الصیام‘ باب وجوب صوم رمضان لرویته ..... حدیث: 1081-

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

«صُومُوا لِرُؤْيَتِهِ وَأَفْطِرُوا لِرُؤْيَتِهِ، فَإِنْ غُمِّيَ عَلَيْكُمْ فَأَكْمِلُوا عِدَّةَ شَعْبَانَ ثَلاَثِينَ»(صحيح البخاري، الصوم، باب قول النبي ﷺ إذا رأيتم الهلال فصوموا ... الخ، ح:١٩٠٩ وصحيح مسلم، الصيام، باب وجوب صوم رمضان لرؤية الهلال ... الخ، ح:١٠٨١)

"چاند دیکھ کر روزے رکھو اور چاند دیکھ کر روزے چھوڑو اور اگر مطلع ابر آلود ہو تو شعبان کے تیس دن پورے کر لو۔" رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ ارشاد بھی فرمایا ہے۔

«لاَ تَصُومُوا حَتَّى تَرَوُا الْهِلاَلَ، وَلاَ تُفْطِرُوا حَتَّى تَرَوْهُ»(صحيح البخاري، الصوم، باب قول النبي ﷺ إذا رأيتم الهلال فصوموا ... الخ، ح:١٩٠٦ وصحيح مسلم، الصيام، باب وجوب صوم رمضان لرؤية الهلال ... الخ، ح:١٠٨٠)

"جب تک چاند نہ دیکھ لو روزے نہ رکھو اور جب تک چاند نہ دیکھ لو روزے نہ چھوڑو۔"

اس باب میں اور بھی بہت سی احادیث ہیں جو سب اس بات پر دلالت کرتی ہیں کہ رؤیت کے مطابق عمل واجب ہے اور عدم رؤیت کی صورت میں واجب ہے کہ مہینے کے تیس دن مکمل کر لیے جائیں۔ ان احادیث سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ چاند کے لیے اعتماد رؤیت پر کرنا چاہیئے کسی حساب وغیرہ پر نہیں۔ شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ "اس بات پر تمام اہل علم کا اجماع ہے کہ اثبات ہلال کے لیے حساب پر اعتماد کرنا جائز نہیں ہے اور بے شک اس مسئلہ میں یہی بات حق ہے۔" واللہ ولی التوفیق

——— شیخ ابن باز ———

صوم و افطار رؤیت ہلال کے مطابق ہونا

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ وَالصَّلاَةُ وَالسَّلاَمُ عَلٰى رَسُولِ اللهِ، وَعَلٰى آلِهِ وَأَصْحَابِهِ وَمَنِ اهْتَدٰى بِهُدَاهُ أَمَّا بَعْدُ:

بہت سے بھائیوں نے مجھ سے یہ سوال پوچھا ہے کہ روزہ رکھنے اور نہ رکھنے کے بارے میں ریڈیو کے اعلان کے مطابق عمل کرنے کے بارے میں کیا حکم ہے؟ کیا یہ اس صحیح حدیث کے مطابق ہے کہ صُوْمُوْالِرُوْيَتِهِ وَأَفْطِرُوْالِرُؤْيَتِهِ کیا جب ایک اسلامی ملک میں عادل آدمی کی شہادت کے ساتھ رؤیت ثابت ہو جائے تو اس کے پڑوسی ملک کے لیے بھی اس کے مطابق عمل واجب ہے؟ اور اگر جواب اثبات میں ہو تو اس کی دلیل کیا ہے نیز کیا اختلاف مطالع کا اعتبار ہے یا نہیں؟

جواب ان تمام سوالوں کا جواب یہ ہے کہ بہت سی سندوں کے ساتھ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ حدیث ثابت ہے جس میں آپ نے ارشاد فرمایا:

«صُومُوا لِرُؤْيَتِهِ وَأَفْطِرُوا لِرُؤْيَتِهِ فَإِنْ أُغْمِيَ عَلَيْكُمْ فَاقْدُرُوا لَهُ ثَلاَثِينَ» (صحيح مسلم، الصيام، باب وجوب صوم رمضان لرؤية الهلال... الخ، ح:١٠٨٠)

"چاند دیکھ کر روزہ رکھو اور چاند دیکھ کر چھوڑ دو اور اگر مطلع ابر آلود ہو تو تیس دن پورے کر لو۔"

ایک روایت میں یہ الفاظ ہیں:

«فَأَكْمِلُوا الْعِدَّةَ ثَلاَثِينَ»(صحيح البخاري، الصوم، باب قول النبي ﷺ إذا رأيتم الهلال فصوموا . . . الخ، ح:١٩٠٧)

”پھر تیس دن کی گنتی پوری کر لو۔“

ایک اور حدیث میں الفاظ ہیں:

«فَأَكْمِلُوا عِدَّةَ شَعْبَانَ ثَلاَثِينَ»(صحيح البخاري، الصوم، باب قول النبي ﷺ إذا رأيتم الهلال فصوموا . . . الخ، ح:١٩٠٩)

”پھر شعبان کی تیس دن کی گنتی پوری کر لو۔“

اسی طرح نبی ﷺ نے یہ بھی فرمایا ہے:

«لاَ تَقَدَّمُوا الشَّهْرَ حَتَّى تَرَوُا الْهِلاَلَ أَوْ تُكْمِلُوا الْعِدَّةَ ثُمَّ صُومُوا حَتَّى تَرَوُا الْهِلاَلَ أَوْ تُكْمِلُوا الْعِدَّةَ»(سنن أبي داود، الصيام، باب إذا أغمي الشهر، ح:٢٣٢٦ وسنن النسائي، ح:٢١٢٨)

”مہینے سے آگے نہ بڑھو حتیٰ کہ چاند دیکھ لو یا گنتی پوری کر لو اور جب چاند دیکھ لو یا گنتی پوری کر لو تو روزے رکھو۔“

اس مفہوم کی اور بھی بہت سی احادیث ہیں جو اس بات پر دلالت کرتی ہیں کہ اعتبار اس بات کا ہے کہ چاند دیکھ لیا جائے یا گنتی پوری کر لی جائے۔

اس مسئلہ میں حساب کتاب پر انحصار نہیں کیا جا سکتا اور یہی حق بات ہے' قابل اعتماد اہل علم کا اسی بات پر اجماع ہے۔ لیکن یاد رہے کہ احادیث سے مراد یہ نہیں کہ ہر ہر انسان خود چاند دیکھے بلکہ اس سے مراد یہ ہے کہ عادل شہادت کے ساتھ یہ ثابت ہو جائے کہ چاند نظر آ گیا ہے۔ امام ابو داود رحمہ اللہ نے صحیح سند کے ساتھ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کی یہ روایت بیان کی ہے:

«تَرَاءَى النَّاسُ الْهِلاَلَ فَأَخْبَرْتُ رَسُولَ اللهِ ﷺ أَنِّي رَأَيْتُهُ، فَصَامَ وَأَمَرَ النَّاسَ بِصِيَامِهِ»

(سنن أبي داود، الصيام، باب في شهادة الواحد على رؤية هلال رمضان، ح:٢٣٤٢)

”لوگوں نے جب (رمضان کا) چاند دیکھنے کی کوشش کی (تو مجھے نظر آ گیا) اور میں نے رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں عرض کیا کہ میں نے چاند دیکھ لیا ہے تو آپ نے روزہ رکھا اور لوگوں کو بھی اس (رمضان) کے روزے رکھنے کا حکم دیا۔“

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ ایک اعرابی نبی کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا اور اس نے عرض کیا کہ میں نے چاند دیکھا ہے تو نبی کریم ﷺ نے فرمایا:

«أَتَشْهَدُ أَنْ لاَ إِلٰهَ إِلاَّ اللهُ وَأَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُولُ اللهِ قَالَ نَعَمْ، قَالَ يَابِلاَلُ! أَذِّنْ فِي النَّاسِ فَلْيَصُومُوا غَدًا»(سنن أبي داود، الصيام، باب في شهادة الواحد على رؤية هلال رمضان، ح:٢٣٤٠ وجامع الترمذي، ح:٦٩١ وسنن نسائي، ح:٢١١٥ وسنن ابن ماجه، ح:١٦٥٢ وصحيح ابن خزيمة،

ح:١٩٢٣، ١٩٢٤ وصحيح ابن حبان، ح:٨٧٠)

"کیا تو یہ گواہی دیتا ہے کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور محمد ﷺ اللہ کے رسول ہیں؟ اس نے جب اثبات میں جواب دیا تو آپ نے فرمایا "بلال! لوگوں میں یہ اعلان کر دو کہ وہ کل کا روزہ رکھیں۔"

عبدالرحمٰن بن زید بن خطاب سے روایت ہے کہ انہوں نے شک کے دن خطبہ دیتے ہوئے فرمایا: میں رسول اللہ ﷺ کے صحابہ کرام کے پاس بیٹھا تھا اور میں نے ان سے پوچھا اور انہوں نے مجھے یہ بتایا کہ رسول اللہ ﷺ نے یہ فرمایا:

«صُومُوا لِرُؤْيَتِهِ، وَأَفْطِرُوا لِرُؤْيَتِهِ، وَانْسُكُوا لَهَا فَإِنْ غُمَّ عَلَيْكُمْ فَأَتِمُّوا ثَلاَثِينَ وَإِنْ شَهِدَ شَاهِدَانِ مُسْلِمَانِ فَصُومُوا وَأَفْطِرُوا»(مسند أحمد: ٤/ ٣٢١ وسنن النسائي، الصيام، باب قبول شهادة الرجل الواحد ... الخ، ح:٢١١٨)

"چاند دیکھ کر روزہ رکھو' اسے دیکھ کر روزہ چھوڑو اور اسی کو دیکھ کر قربانی کرو' اگر مطلع ابر آلود ہو تو تیس (دن) پورے کر لو اور اگر دو مسلمان گواہ (چاند دیکھنے کی) گواہی دے دیں تو روزہ رکھو اور افطار کر دو۔"

اس حدیث کو امام احمد نے روایت کیا ہے اور نسائی نے بھی مگر نسائی کی روایت میں "مسلمان" کا لفظ نہیں ہے۔ امیر مکہ حارث بن حاطب سے روایت ہے:

«عَهِدَ إِلَيْنَا رَسُولُ اللهِ ﷺ أَنْ نَنْسُكَ لِلرُّؤْيَةِ، فَإِنْ لَّمْ نَرَهُ وَشَهِدَ شَاهِدَا عَدْلٍ نَسَكْنَا بِشَهَادَتِهِمَا»(سنن أبي داود، الصيام، باب شهادة رجلين على رؤية هلال شوال، ح:٢٣٣٨ وسنن الدارقطني: ٢/ ١٦٧، ح: ٢١٧٢)

"رسول اللہ ﷺ نے ہم سے عہد لیا کہ ہم حج اور قربانی رؤیت (ہلال) کے مطابق سرانجام دیں اور اگر ہم نے چاند نہ دیکھا ہو اور دو عادل گواہ (چاند دیکھنے کی) گواہی دے دیں تو ہم ان کی گواہی کے مطابق حج اور قربانی کریں۔"

یہ اور اس کے ہم معنی دیگر احادیث اس بات پر دلالت کرتی ہیں کہ رمضان کا چاند دیکھنے کے لیے ایک عادل شاہد کی گواہی کافی ہے لیکن رمضان کے اختتام اور دیگر مہینوں کے لیے دو عادل گواہوں کی شہادت ضروری ہے اور اسی طرح ہی اس مسئلہ میں وارد مختلف احادیث میں تطبیق ممکن ہو گی۔ اکثر اہل علم کا یہی قول ہے اور یہی حق ہے کیونکہ دلائل سے یہی واضح ہوتا ہے۔ نیز اس سے یہ بھی واضح ہوتا ہے کہ رؤیت سے مراد چاند کا شرعی طریقے سے ثبوت ہے۔ اس سے یہ مراد نہیں ہے کہ ہر شخص خود چاند دیکھے۔ جب کوئی ایسا مسلمان ملک جس میں شریعت کے مطابق فیصلہ ہوتا ہو (مثلاً سعودی عرب) یہ اعلان کرے کہ رمضان یا شوال یا ذوالحج کا چاند نظر آ گیا ہے تو تمام رعایا کے لیے یہ فرض ہو جاتا ہے کہ اس اعلان کی پابندی کرے' بلکہ اہل علم کی ایک بہت بڑی جماعت کے نزدیک دیگر تمام مسلمانوں کے لیے بھی اس کی پابندی فرض ہو جاتی ہے کیونکہ نبی ﷺ کے اس ارشاد کے عموم کا یہی تقاضا ہے:

«اَلشَّهْرُ تِسْعٌ وَّعِشْرُونَ لَيْلَةً فَلاَ تَصُومُوا حَتَّى تَرَوْهُ، فَإِنْ غُمَّ عَلَيْكُمْ فَأَكْمِلُوا الْعِدَّةَ ثَلاَثِينَ»(صحيح البخاري، الصوم، باب قول النبي ﷺ إذا رأيتم الهلال فصوموا ... الخ، ح:١٩٠٧)

"مہینہ انتیس کا ہوتا ہے' لہٰذا اس وقت تک روزہ نہ رکھو جب تک چاند کو دیکھ نہ لو اور اگر مطلع ابر آلود ہو تو

تیس دن کی گنتی پوری کر لو۔" اور ایک روایت میں الفاظ یہ ہیں:

«صُومُوا لِرُؤْيَتِهِ، وَأَفْطِرُوا لِرُؤْيَتِهِ، فَإِنْ أُغْمِيَ عَلَيْكُمْ فَاقْدُرُوا لَهُ ثَلَاثِينَ» (صحيح مسلم، الصيام، باب وجوب صوم رمضان لرؤية الهلال ... الخ، ح: ۱۰۸۰)

"چاند دیکھ کر روزہ رکھو اور چاند دیکھ کر چھوڑ دو۔ اگر مطلع ابر آلود ہو تو تیس دن کا اندازہ پورا کر لو۔"

اور مسلم کی ایک دوسری روایت میں ہے:

«فَإِنْ غُمِّيَ عَلَيْكُمُ الشَّهْرُ، فَعُدُّوا ثَلَاثِينَ»(صحيح مسلم، الصيام، باب وجوب صوم رمضان لرؤية الهلال ... الخ، ح: ۱۰۸۱)

"اگر مطلع ابر آلود ہونے کی وجہ سے تمہیں مہینے (کے اختتام) کا پتہ نہ چل سکے تو پھر (وہ مہینہ) تیس (دنوں کا شمار کرو۔"

یہ احادیث اور ان کے ہم معنی دیگر احادیث سے بظاہر یوں معلوم ہوتا ہے کہ یہ حکم ساری امت کے لیے ہے۔ امام نووی نے "شرح المہذب" میں امام ابن منذر سے نقل کیا ہے کہ لیث بن سعد' امام شافعی اور امام احمد رحمہم اللہ کا بھی یہی قول ہے۔ نیز وہ فرماتے ہیں کہ امام مدینہ و کوفہ یعنی امام مالک اور امام ابو حنیفہ رحمہما اللہ کا بھی یہی قول ہے۔

اہل علم کی ایک اور جماعت کا یہ قول ہے کہ یہ حکم اس صورت میں ہے جب مطالع ایک ہوں اور اختلاف مطالع کی صورت میں ہر اہل مطلع کے لیے ان کی اپنی اپنی رؤیت کا اعتبار ہو گا۔ اس قول کو امام ترمذی نے اہل علم سے روایت کیا ہے اور ان کی دلیل وہ حدیث ہے جسے امام مسلم نے اپنی "صحیح" میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ ان کے پاس کریب' شام سے مدینہ میں' رمضان کے آخر میں آئے تو انہوں نے بتایا کہ شام میں جمعہ کی رات چاند نظر آیا ہے اور حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ اور دیگر لوگوں نے روزہ رکھا ہے' حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا لیکن ہم نے تو چاند ہفتہ کی رات دیکھا ہے لہٰذا ہم تو روزے رکھتے رہیں گے حتیٰ کہ (شوال کا) چاند دیکھ لیں یا گنتی پوری کر لیں۔ میں نے عرض کیا' کیا آپ معاویہ کی رؤیت اور ان کے روزہ رکھنے پر اعتماد نہیں کرتے؟ انہوں نے فرمایا: نہیں کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں اسی طرح حکم دیا ہے۔[1] ان اہل علم کا کہنا ہے کہ یہ حدیث اس بات کی دلیل ہے کہ ابن عباس رضی اللہ عنہما رؤیت کو عام نہیں سمجھتے بلکہ وہ سمجھتے تھے کہ یہ اہل بلد کے لیے ان کی اپنی رؤیت ہے جبکہ مطالع مختلف ہوں۔ ان اہل علم کا یہ بھی کہنا ہے کہ مدینہ کا مطلع' شام کے مطلع سے مختلف ہے جب کہ بعض دیگر اہل علم کا یہ کہنا ہے کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے اہل شام کی رؤیت کے مطابق شاید اس لیے عمل نہ کیا ہو کہ اس کی شہادت کریب ہی نے دی تھی اور رمضان کے اختتام کے لیے ایک گواہ کی گواہی کے مطابق عمل نہیں کیا جا سکتا ہاں البتہ رمضان کے آغاز کے لیے ایک گواہ کی گواہی کے مطابق عمل کیا جا سکتا ہے۔

یہ مسئلہ سعودی عرب کی مجلس کبار علماء کے اجلاس دوم منعقدہ شعبان ۱۳۹۲ھ میں بھی پیش کیا گیا تو ان علماء کی رائے یہ تھی کہ اس مسئلہ میں راجح بات یہ ہے کہ اس میں کافی گنجائش ہے' اپنے ملک کے علماء کی رائے کے مطابق ان اقوال سے اگر کسی ایک کے مطابق عمل کر لیا جائے تو یہ جائز ہے۔ میری رائے میں یہ ایک معتدل رائے ہے اور اس سے اہل علم کے

---

[1] صحیح مسلم' الصیام' باب بیان ان لکل بلد رؤیتھم ..... الخ' حدیث: 1087۔

مختلف اقوال و دلائل میں تطبیق بھی ہو جاتی ہے۔ ہر ملک کے اہل علم پر بھی یہ واجب ہے کہ ماہ کے آغاز و اختتام کے موقع پر اس مسئلہ کی طرف خصوصی توجہ مبذول کریں اور اس ایک بات پر متفق ہو جائیں جوان کے اجتہاد کے مطابق حق کے زیادہ قریب ہو پھر اسی کے مطابق عمل کریں اور لوگوں تک بھی اپنی بات پہنچا دیں' ان کے ملک کے حکمرانوں اور عام مسلمانوں کو بھی چاہیئے کہ اس سلسلہ میں اپنے علماء کی پیروی کریں اور اس مسئلہ میں اختلاف نہ کریں کیونکہ اس سے لوگ مختلف گروہوں میں تقسیم ہو جائیں گے اور کثرت سے قیل و قال ہونے لگے گی۔ یہ اس صورت میں ہے جب ملک غیر اسلامی ہو اور اگر اسلامی ملک ہو تو اس کے لیے واجب یہ ہے کہ اپنے اہل علم کی بات پر اعتماد کرے اور علماء کی رائے کے مطابق رمضان کے آغاز و اختتام کی اپنے عوام سے پابندی کروائے تاکہ مذکورہ بالا احادیث پر عمل ہو سکے' فرض کو ادا کیا جا سکے اور رعایا کو ان امور سے بچایا جا سکے جو اللہ تعالیٰ نے اس کے لیے حرام قرار دیئے ہیں اور سبھی جانتے ہیں کہ بسااوقات اللہ تعالیٰ سلطان سے وہ کام لے لیتے ہیں جو قرآن سے نہیں لیا جا سکتا۔

اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ ہمیں اور سب مسلمانوں کو توفیق بخشے کہ ہمیں دین میں فقاہت اور ثابت قدمی نصیب ہو' دین کے مطابق ہی ہم فیصلہ کریں' دین ہی کی طرف تنازعات کے حل کے لیے رجوع کریں اور دین کی مخالفت سے اجتناب کریں۔ انه جواد کریم وصلی اللّٰہ وسلم علی عبدہ ورسولہ' نبینا محمد وآلہ وصحبہ۔

—— شیخ ابن باز ——

اثبات ہلال' رؤیت سے ہونا چاہیئے فلکیات کے حساب سے نہیں

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ وَحْدَہُ وَالصَّلاَۃُ وَالسَّلاَمُ عَلٰی مَنْ لاَّ نَبِیَّ بَعْدَہُ ۔ أَمَّا بَعْدُ

اسلامی فقہی کونسل نے اپنے اجلاس چہارم میں جو کہ سیکرٹریٹ رابطہ عالم اسلام مکہ مکرمہ میں ۷ سے ۱۷ ربیع الآخر ۱۴۰۱ھ تک منعقد ہوا' جمعیت دعوت اسلامیہ سنگاپور کے خطبہ مورخہ ۱۶ شوال ۱۳۹۹ھ مطابق ۱۸ اگست ۱۹۷۹ء پر غور کیا جو کہ سنگاپور میں سعودی عرب کے سفیر کو بھیجا گیا تھا اور جس میں لکھا تھا' سنگاپور کی اس جمعیت اور وہاں کی اسلامی کونسل کے درمیان ۱۳۹۹ء بمطابق ۱۹۷۹ء کے رمضان کے ابتداء اور اختتام کے بارے میں اختلاف ہوا۔ جمعیت کی رائے میں ماہ رمضان کی ابتدا و انتہاء ادلہ شرعیہ کے عموم کے مطابق شرعی رؤیت کے مطابق ہونی چاہیئے جب کہ سنگاپور کی اسلامی کونسل کی رائے یہ ہے کہ رمضان کی ابتدا و انتہا فلکیات کے حساب کے مطابق ہونی چاہیئے' کیونکہ اس وقت ایشیا کے ممالک کا مطلع عموماً اور سنگاپور کا مطلع خصوصاً ابر آلود تھا لہٰذا اکثر ممالک میں رؤیت کے مقامات ابر آلود ہونے کی وجہ سے یہ ایک ایسا عذر ہے کہ جس کی وجہ سے فلکیات کے حساب پر انحصار کے بغیر چارۂ کار نہیں۔

اسلامی فقہی کونسل کے ارکان نے نصوص شرعیہ کی روشنی میں اس موضوع کا خوب مطالعہ کیا اور اس مطالعہ کی روشنی میں جمعیت دعوت اسلامی کی تائید کی' کیونکہ اس موقف کی تائید میں ادلہ شرعیہ واضح طور پر دلالت کناں ہیں۔

اسلامی فقہی کونسل کی یہ بھی رائے ہے کہ سنگاپور اور ایشیا کے بعض دیگر ممالک جہاں عموماً مطلع ابر آلود ہوتا ہے اور ان جیسے علاقوں میں مسلمانوں کے لیے چاند کو دیکھنا ممکن نہیں ہوتا' انہیں چاہیئے کہ اس سلسلہ میں ان اسلامی ملکوں پر اعتماد

کر لیں جو چاند کے سلسلہ میں کسی حساب کے بجائے صرف اور صرف رؤیت بصری پر انحصار کرتے ہیں تاکہ نبی ﷺ کے اس ارشاد پر عمل ہو سکے:

«صُومُوا لِرُؤْيَتِهِ وَأَفْطِرُوا لِرُؤْيَتِهِ، فَإِنْ غُمِّيَ عَلَيْكُمُ الشَّهْرُ، فَعُدُّوا ثَلَاثِينَ» (صحيح البخاري، الصوم، باب قول النبي ﷺ إذا رأيتم الهلال فصوموا الخ، ح:١٩٠٩ وصحيح مسلم، الصيام، باب وجوب صوم رمضان لرؤية الهلال ... الخ، ح:١٠٨١ واللفظ له)

"چاند دیکھ کر روزہ رکھو اور اسے دیکھ کر چھوڑو اور اگر مطلع ابر آلود ہونے کی وجہ سے مہینے کا پتہ نہ چل سکتا تو (وہ مہینہ) تیس (دنوں کا) شمار کرو۔"

نیز آپ ﷺ نے فرمایا ہے:

«لَا تَصُومُوا حَتَّى تَرَوُا الْهِلَالَ، وَلَا تُفْطِرُوا حَتَّى تَرَوْهُ» (صحيح البخاري، الصوم، باب قول النبي ﷺ إذا رأيتم الهلال فصوموا ... الخ ح:١٩٠٦ وصحيح مسلم، الصيام، باب وجوب صوم رمضان لرؤية الهلال ... الخ، ح:١٠٨٠)

"روزہ نہ رکھو حتیٰ کہ چاند دیکھ لو اور روزہ نہ چھوڑو حتیٰ کہ چاند دیکھ لو۔"

نیز اس مضمون کی دیگر احادیث کا بھی یہی تقاضا ہے۔

ایک ملک کی رؤیت ہلال تمام ممالک کے لیے لازم نہیں ہے

سوال رمضان اور شوال کے چاند اسلامی ملکوں میں مختلف دنوں میں نظر آتے ہیں۔ کیا کسی ایک ملک میں چاند نظر آنے پر تمام مسلمانوں کو روزہ رکھنا چاہیئے؟

جواب رؤیت ہلال کے مسئلہ میں اہل علم میں اختلاف ہے۔ کچھ اہل علم کی رائے یہ ہے کہ اگر کسی بھی جگہ رمضان کے چاند کی شرعی طریقے سے رؤیت ثابت ہو جائے تو تمام مسلمانوں کے لیے روزہ رکھنا لازم ہو جاتا ہے اور اگر اسی طرح کسی بھی جگہ شوال کے چاند کی رؤیت ثابت ہو جائے تو تمام مسلمانوں کے لیے روزہ چھوڑنا لازم ہو جاتا ہے۔ امام احمد کے مذہب میں مشہور قول یہی ہے۔ اس قول کے مطابق اگر مثلاً سعودی عرب میں چاند نظر آ جائے تو دنیا بھر کے تمام مسلمانوں پر یہ واجب ہو جاتا ہے کہ وہ رمضان اور شوال کے احکام اس رؤیت کے مطابق ادا کریں۔ اس سلسلہ میں استدلال حسب ذیل ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ فَمَن شَهِدَ مِنكُمُ ٱلشَّهْرَ فَلْيَصُمْهُ ﴾ (البقرة٢/ ١٨٥)

"سو جو کوئی تم میں سے اس مہینے میں موجود ہو تو اسے چاہیے کہ پورے مہینے کے روزے رکھے۔"

اور نبی ﷺ کے ارشاد:

«إِذَا رَأَيْتُمُوهُ فَصُومُوا، وَإِذَا رَأَيْتُمُوهُ فَأَفْطِرُوا» (صحيح البخاري، الصوم، باب هل يقال رمضان ... الخ، ح:١٩٠٠ وصحيح مسلم، الصيام، باب وجوب صوم رمضان لرؤية الهلال ... الخ، ح:١٠٨٠)

"جب تم چاند دیکھو تو روزہ رکھو اور جب چاند دیکھو تو روزہ رکھنا چھوڑ دو" کے عموم سے ہے۔

بعض علماء کی یہ رائے ہے کہ رمضان کے روزے اور شوال کی عید کے احکام ان لوگوں کے لیے واجب ہوں گے جو خود چاند دیکھ لیں یا چاند دیکھنے والوں کا مطلع ایک ہو' کیونکہ اہل معرفت کا اتفاق ہے کہ ہلال کے مطالع مختلف ہیں لہٰذا ضروری ہے کہ ہر ملک اپنی رؤیت کے مطابق عمل کرے اور اس رؤیت کے مطابق عمل ان ملکوں کے لیے بھی واجب ہو گا جن کا مطلع اس کے مطابق ہو۔ اور جن ممالک کا مطلع اس کے مطابق نہ ہو گا وہ اس کے تابع نہ ہوں گے۔ یہ قول شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ کا ہے۔ آپ کا استدلال بھی اسی آیت اور اسی حدیث ہی سے ہے جس سے پہلے گروہ نے استدلال کیا ہے لیکن وجہ استدلال مختلف ہے اور وہ یہ کہ اس آیت میں حکم کو شاہد اور حدیث میں رائی (دیکھنے والے) کے ساتھ معلق کیا گیا ہے تو اس کا تقاضا یہ ہے کہ جو شاہد اور رائی نہ ہو اس کے لیے حکم لازم نہ ہو گا..... اس قول کے مطابق مطالع مختلف ہونے کی صورت میں محض عموم کی وجہ سے احکام ہلال ثابت نہ ہوں گے۔ بلاشبہ استدلال کے اعتبار سے یہی قول قوی ہے اور نظر و قیاس سے بھی اسی کی تائید ہوتی ہے۔

——— شیخ ابن عثیمین ———

رمضان کے اٹھائیس روزے

سوال کیا ماہ رمضان کے صرف اٹھائیس روزے رکھنا بھی جائز ہے؟

جواب رسول اللہ ﷺ کی صحیح اور مستفیض (مشہور) احادیث سے یہ ثابت ہے کہ مہینہ انتیس دن سے کم نہیں ہوتا اور اگر رمضان المبارک کے اٹھائیس روزے رکھنے کے بعد شرعی شہادت کے ساتھ شوال کا آغاز ثابت ہو جائے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ رمضان کا ایک روزہ رہ گیا ہے لہٰذا اس ایک روزے کی قضا لازم ہو گی' کیونکہ یہ ممکن نہیں کہ قمری مہینہ اٹھائیس دن کا ہو' یقیناً یہ مہینہ انتیس یا تیس دن کا ہوتا ہے۔

——— شیخ ابن باز ———

کیا ہم اکتیس روزے رکھیں

سوال اگر ہم نے سعودی عرب میں رمضان کے روزے رکھنے شروع کئے ہوں اور پھر ہم نے مشرقی ایشیا کے اپنے ممالک کی طرف سفر شروع کر لیا ہو جہاں عام طور پر قمری مہینہ سعودیہ سے ایک دن پیچھے ہوتا ہے تو کیا اس صورت میں ہم اکتیس روزے رکھیں؟

جواب اگر تم نے سعودیہ وغیرہ میں روزے رکھنے شروع کئے اور پھر باقی روزے اپنے ملکوں میں جا کر رکھے تو باقی روزوں کے سلسلہ میں اپنے ممالک کے لوگوں کے ساتھ ہی روزے رکھو اور ان کے ساتھ ہی چھوڑو خواہ اس طرح روزوں کی تعداد تیس سے زیادہ ہی کیوں نہ ہو جائے کیونکہ نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے:

«الصَّوْمُ يَوْمَ تَصُومُونَ، وَالْفِطْرُ يَوْمَ تُفْطِرُونَ»(جامع الترمذي، الصوم، باب ما جاء أن الصوم يوم تصومون ... الخ، ح:٦٩٧)

"روزے کا وہ دن ہے جس میں تم سب روزہ رکھتے ہو اور افطار کا وہ دن ہے جس میں تم سب روزہ نہیں رکھتے۔"

اور اگر اس صورت میں روزے انتیس نہ ہوں تو انتیس کی تعداد پوری کرنی ضروری ہو گی کیونکہ قمری مہینہ انتیس دن سے کم نہیں ہوتا۔

——— شیخ ابن باز ———

رمضان کے ہمیشہ تیس روزے رکھنا

سوال ان لوگوں کے بارے میں کیا حکم ہے جو ہمیشہ رمضان کے تیس روزے ہی رکھتے ہیں؟

جواب رسول اللہ ﷺ کی صحیح اور متواتر احادیث اور حضرات صحابہ کرام' تابعین عظام اور علماء امت کے اجماع سے یہ بات ثابت ہے کہ قمری مہینہ کبھی تیس اور کبھی انتیس دن کا ہوتا ہے لہذا جو شخص چاند کا اعتبار کیے بغیر ہمیشہ تیس روزے ہی رکھتا ہے تو اس کا یہ عمل نہ صرف سنت اور اجماع کے مخالف ہے بلکہ یہ دین میں ایک ایسی نئی بدعت ہے جس کا اللہ تعالیٰ نے حکم نہیں دیا' ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ اتَّبِعُوا مَا أُنزِلَ إِلَيْكُم مِّن رَّبِّكُمْ وَلَا تَتَّبِعُوا مِن دُونِهِ أَوْلِيَاءَ ﴾ (الأعراف٧/ ٣)

"(لوگو!) تمہارے رب کی جانب سے تمہاری طرف جو کچھ نازل کیا گیا ہے اس کی پیروی کرو اور اللہ تعالیٰ کو چھوڑ کر اور رفیقوں کے پیچھے مت چلو۔"

اور فرمایا:

﴿ قُلْ إِن كُنتُمْ تُحِبُّونَ اللَّهَ فَاتَّبِعُونِي يُحْبِبْكُمُ اللَّهُ وَيَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوبَكُمْ ﴾ (آل عمران٣/ ٣١)

"(اے پیغمبر لوگوں سے) کہہ دیجیے کہ اگر تم اللہ کو دوست رکھتے ہو تو میری پیروی کرو اللہ بھی تمہیں دوست رکھے گا اور تمہارے گناہ معاف کر دے گا۔"

اور فرمایا:

﴿ وَمَا آتَاكُمُ الرَّسُولُ فَخُذُوهُ وَمَا نَهَاكُمْ عَنْهُ فَانتَهُوا ۚ وَاتَّقُوا اللَّهَ ۖ إِنَّ اللَّهَ شَدِيدُ الْعِقَابِ ﴿٧﴾ ﴾

(الحشر٥٩/ ٧)

"جو چیز تم کو پیغمبر دیں وہ لے لو اور جس سے منع کریں (اس سے) باز رہو اور اللہ سے ڈرتے رہو۔ بے شک اللہ تعالیٰ سخت عذاب دینے والا ہے۔"

اور اللہ عزوجل نے فرمایا:

﴿ تِلْكَ حُدُودُ اللَّهِ ۚ وَمَن يُطِعِ اللَّهَ وَرَسُولَهُ يُدْخِلْهُ جَنَّاتٍ تَجْرِي مِن تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ خَالِدِينَ فِيهَا ۚ وَذَٰلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِيمُ ﴿١٣﴾ وَمَن يَعْصِ اللَّهَ وَرَسُولَهُ وَيَتَعَدَّ حُدُودَهُ يُدْخِلْهُ نَارًا خَالِدًا فِيهَا وَلَهُ عَذَابٌ مُّهِينٌ ﴿١٤﴾ ﴾ (النساء٤/ ١٣-١٤)

"یہ (احکام) اللہ کی حدیں ہیں اور جو شخص اللہ اور اس کے رسول کی فرماں برداری کرے گا اللہ اس کو ایسے

باغات میں داخل کرے گا جن میں نہریں بہہ رہی ہیں' وہ ان میں ہمیشہ رہیں گے اور (یہ) بہت بڑی کامیابی ہے اور جو شخص اللہ اور اس کے رسول کی نافرمانی کرے گا اور اس کی حدوں سے نکل جائے گا' اس کو اللہ تعالیٰ دوزخ میں ڈالے گا جہاں وہ ہمیشہ رہے گا اور اس کے لیے رسوا کن سزا ہوگی۔"

اس مضمون کی اور بھی بہت سی آیات ہیں' چنانچہ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

«صُومُوا لِرُؤْيَتِهِ وَأَفْطِرُوا لِرُؤْيَتِهِ، فَإِنْ غُمَّ عَلَيْكُمْ فَاقْدُرُوا لَهُ»(صحيح البخاري، الصوم، باب قول النبي ﷺ إذا رأيتم الهلال فصوموا ... الخ، ح:١٩٠٦ وصحيح مسلم، الصيام، باب وجوب صوم رمضان لرؤية الهلال...الخ، ح:١٠٨٠)

"چاند دیکھ کر روزہ رکھو اور چاند دیکھ کر چھوڑ دو اور اگر مطلع ابر آلود ہو تو اس کے لیے اندازہ کرلو۔"

اور "صحیح مسلم" کی روایت میں الفاظ یہ ہیں:

«فَاقْدُرُوا لَهُ ثَلَاثِينَ»(صحيح مسلم، الصيام، باب وجوب صوم رمضان لرؤية الهلال ... الخ، ح:١٠٨٠)

"تیس کا اندازہ پورا کرلو۔"

اور ایک روایت میں یہ الفاظ ہیں:

«إِذَا رَأَيْتُمُ الْهِلَالَ فَصُومُوا، وَإِذَا رَأَيْتُمُوهُ فَأَفْطِرُوا، فَإِنْ غُمَّ عَلَيْكُمْ فَاقْدُرُوا لَهُ»(صحيح مسلم، الصيام، باب وجوب صوم رمضان لرؤية الهلال ... الخ، ح:١٠٨٠)

"جب تم چاند دیکھو تو روزہ رکھو' اور جب تم اسے دیکھو تو افطار کرو اور اگر مطلع ابر آلود ہو تو اس کے لیے اندازہ کرلو۔"

اور حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی حدیث کے الفاظ یہ ہیں:

«فَعُدُّوا ثَلَاثِينَ»(صحيح مسلم، الصيام، باب وجوب صوم رمضان لرؤية الهلال ... الخ، ح:١٠٨١)

"تو تیس دن شمار کرو۔"

صحیح بخاری میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

«صُومُوا لِرُؤْيَتِهِ، وَأَفْطِرُوا لِرُؤْيَتِهِ، فَإِنْ غُبِّيَ عَلَيْكُم فَأَكْمِلُوا عِدَّةَ شَعْبَانَ ثَلَاثِينَ» (صحيح البخاري، الصوم، باب قول النبي ﷺ إذا رأيتم الهلال ... الخ، ح:١٩٠٩)

"چاند دیکھ کر روزہ رکھو اور (عید کا) چاند دیکھ کر روزہ چھوڑو اور اگر مطلع ابر آلود ہو تو شعبان کے تیس دن مکمل کرو۔" اور ابن عمر رضی اللہ عنہ کی روایت میں الفاظ یہ ہیں:

«فَأَكْمِلُوا الْعِدَّةَ ثَلَاثِينَ»(صحيح البخاري، الصوم، باب قول النبي ﷺ إذا رأيتم الهلال فصوموا ... الخ، ح:١٩٠٧)

"پھر تیس کی گنتی پوری کرلو۔"

اور ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت میں یہ الفاظ ہیں:

«فَصُومُوا ثَلاَثِينَ يَوْمًا»(صحيح مسلم، الصيام، باب وجوب صوم رمضان لرؤية الهلال ... الخ، ح:١٠٨١)

"تو تیس دن کے روزے رکھو۔"

حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

«لاَ تَقَدَّمُوا الشَّهْرَ حَتَّى تَرَوُا الْهِلاَلَ أَوْ تُكْمِلُوا الْعِدَّةَ ثُمَّ صُومُوا حَتَّى تَرَوُا الْهِلاَلَ أَوْ تُكْمِلُوا الْعِدَّةَ»(سنن أبي داود، الصيام، باب إذا أغمي الشهر، ح:٢٣٢٦ وسنن النسائي، ح:٢١٢٨)

"روزہ رکھنے کے لیے پیش قدمی نہ کرو حتی کہ چاند دیکھ لو یا (شعبان کی) گنتی پوری کر لو پھر روزہ رکھو حتی کہ (شوال کا) چاند دیکھ لو یا (رمضان کی) گنتی پوری کر لو۔"

اور بہت سی احادیث میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد بھی ہے:

«اَلشَّهْرُ تِسْعٌ وَّعِشْرُونَ فَلاَ تَصُومُوا حَتَّى تَرَوْهُ، فَإِنْ غُمَّ عَلَيْكُمْ فَأَكْمِلُوا الْعِدَّةَ ثَلاَثِينَ»

(صحيح البخاري، الصوم، باب قول النبي ﷺ إذا رأيتم الهلال فصوموا ... الخ، ح:١٩٠٧)

"مہینہ انتیس دن کا ہوتا ہے لہٰذا روزہ نہ رکھو حتیٰ کہ چاند دیکھ لو اور اگر مطلع ابر آلود ہو تو تیس کی گنتی مکمل کر لو۔"

نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ بھی ثابت ہے کہ آپ نے فرمایا: "مہینہ اس طرح' اس طرح اور اس طرح ہوتا ہے' آپ نے اپنی انگلیوں سے اشارہ کرتے ہوئے تیسری مرتبہ انگوٹھے کو بند کر لیا اور پھر فرمایا کہ مہینہ اس طرح' اس طرح اور اس طرح ہوتا ہے آپ نے سب انگلیوں کے ساتھ اشارہ کیا اور اس طرح گویا آپ نے اشارہ یہ فرمایا کہ مہینہ کبھی انتیس اور کبھی تیس دنوں کا ہوتا ہے۔" [1]

اہل علم و ایمان یعنی حضرات صحابہ کرام اور تابعین عظام نے ان احادیث صحیحہ کو قبول کیا' ان کے سامنے سر تسلیم خم کیا اور انہی کے مطابق عمل کیا ہے۔ وہ شعبان' رمضان اور شوال کے چاندوں کو دیکھتے اور مہینے کے تمام یا کم ہونے کے بارے میں جو شہادت سے ثابت ہوتا' اسی کے مطابق کرتے تھے لہٰذا تمام مسلمانوں پر بھی یہی واجب ہے کہ وہ اسی سچے اور صحیح انداز کو اختیار کریں اور اس کے خلاف لوگوں کی جو آراء ہیں یا انہوں نے جو بدعات ایجاد کر لی ہیں' ان کو چھوڑ دیں کیونکہ وہ صرف اسی سے اس سلک مروارید میں داخل ہو سکتے ہیں جس سے اللہ تعالیٰ نے جنت اور اپنی رضا کا وعدہ فرما رکھا ہے' چنانچہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَالسَّٰبِقُونَ ٱلۡأَوَّلُونَ مِنَ ٱلۡمُهَٰجِرِينَ وَٱلۡأَنصَارِ وَٱلَّذِينَ ٱتَّبَعُوهُم بِإِحۡسَٰنٖ رَّضِيَ ٱللَّهُ عَنۡهُمۡ وَرَضُواْ عَنۡهُ وَأَعَدَّ لَهُمۡ جَنَّٰتٖ تَجۡرِي تَحۡتَهَا ٱلۡأَنۡهَٰرُ خَٰلِدِينَ فِيهَآ أَبَدٗاۚ ذَٰلِكَ ٱلۡفَوۡزُ ٱلۡعَظِيمُ ۝١٠٠﴾ (التوبة ٩/ ١٠٠)

---

[1] صحیح بخاری' الصوم' باب قول النبی صلی اللہ علیہ وسلم لانکتب ولا نحسب ..... الخ' حدیث: 1913 و صحیح مسلم' الصیام باب وجوب صوم رمضان لرؤیہ الھلال ..... الخ' حدیث: 1080۔

"وہ مہاجرین اور انصار جنہوں نے سب سے پہلے دعوت ایمان قبول کرنے میں سبقت کی نیز وہ لوگ جنہوں نے اخلاص کے ساتھ ان کی پیروی کی اللہ ان سے خوش ہیں اور وہ اللہ سے خوش ہیں اور اس نے ان کے لیے ایسے باغات تیار کئے ہیں جن کے نیچے نہریں بہہ رہی ہیں (اور) وہ ہمیشہ ان میں رہیں گے۔ یہ بہت بڑی کامیابی ہے۔"

——— شیخ ابن باز ———

رمضان کے آغاز کا طلوع فجر کے بعد علم ہوا

سوال اس شخص کے روزے کے بارے میں کیا حکم ہے جسے نیند وغیرہ کی وجہ سے رمضان کے آغاز کا طلوع فجر کے بعد علم ہوا؟

جواب جس شخص کو طلوع فجر کے بعد رمضان کے آغاز کا علم ہوا ہو تو اسے چاہیئے کہ دن کے باقی حصہ میں ان چیزوں کے استعمال سے رک جائے جن سے روزہ ٹوٹ جاتا ہے کیونکہ یہ دن رمضان کا دن ہے اور کسی مقیم اور صحیح آدمی کے لیے یہ جائز نہیں کہ دن کو کوئی ایسی چیز استعمال کرے جس سے روزہ ٹوٹ جاتا ہے لیکن اسے اس دن کے روزہ کی قضا دینا ہو گی کیونکہ اس نے فجر سے پہلے روزے کی نیت نہیں کی تھی اور نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے:

«مَنْ لَّمْ يُبَيِّتِ الصِّيَامَ قَبْلَ الْفَجْرِ فَلاَ صِيَامَ لَهُ»(سنن النسائي، الصيام، باب ذكر اختلاف الناقلين لخبر حفصة في ذلك، ح: ٢٣٣٣)

"جو شخص فجر سے پہلے روزے کی نیت نہ کرے' اس کا روزہ نہیں ہے۔"

اس حدیث کو موفق ابن قدامہ رحمہ اللہ نے "المغنی" میں نقل کیا ہے اور اکثر فقہاء کا بھی یہی قول ہے۔ یاد رہے اس روزے سے مراد فرض روزہ ہے کیونکہ نفل روزہ کی نیت تو دن کو بھی جائز ہے بشرطیکہ طلوع فجر کے بعد کوئی ایسی چیز استعمال نہ کی ہو جس سے روزہ ٹوٹ جاتا ہے جیسا کہ نبی کریم ﷺ کی سنت سے یہ ثابت ہے۔ ہم اللہ تعالیٰ سے یہ دعا کرتے ہیں کہ وہ مسلمانوں کو اپنی رضا کے مطابق عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے اور ان کے صیام و قیام کو شرف قبولیت سے نوازے۔ انہ سمیع قریب۔

——— شیخ ابن باز ———

روزہ اس ملک کی رؤیت کے مطابق ہو گا جس میں آپ مقیم ہوں

سوال جب یہ ثابت ہو جائے کہ کسی اسلامی ملک مثلاً سعودی عرب میں رمضان کا آغاز ہو گیا ہے اور اس کا باقاعدہ اعلان بھی کر دیا گیا ہو لیکن جس ملک میں کوئی آدمی مقیم ہو وہاں ابھی رمضان کے آغاز کا اعلان نہ کیا گیا ہو تو اس صورت میں کیا حکم ہے؟ کیا سعودی عرب میں رمضان کے آغاز کی وجہ سے ہم بھی روزے رکھنا شروع کر دیں یا اس ملک کے مطابق رمضان کا آغاز و اختتام کریں جہاں مقیم ہوں؟ اور اسی طرح عید کا پروگرام بھی اسی ملک کے مطابق ہی بنائیں یعنی جب دونوں ملکوں میں چاند کی تاریخیں مختلف ہوں تو اس صورت میں کیا حکم ہے؟ جزاکم اللہ عنا وعن المسلمین خیرالجزاء۔

جواب مسلمان کو چاہیئے کہ وہ روزہ اور عید کو اس ملک کے مطابق سرانجام دے جہاں وہ مقیم ہو کیونکہ نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے:

«اَلصَّوْمُ يَوْمَ تَصُومُونَ، وَالْفِطْرُ يَوْمَ تُفْطِرُونَ، وَالأَضْحٰى يَوْمَ تُضَحُّونَ»(جامع الترمذي، الصوم، باب ما جاء أن الصوم يوم تصومون ... الخ، ح:٦٩٧)

"روزے کا وہ دن ہے جس دن تم روزہ رکھتے ہو اور افطار کا وہ دن ہے جس میں تم روزہ نہیں رکھتے اور عیدالاضحیٰ کا وہ دن ہے جس میں تم قربانیاں کرتے ہو۔" وباللہ التوفیق۔

———— شیخ ابن باز ————

فرضیت روزہ کی عمر

بالغ پر روزہ فرض ہے

سوال میں تیئس سال کی عمر کا ایک جوان ہوں۔ میری عمر تقریباً پندرہ سال تھی جب میرے والد صاحب نے مجھے روزہ رکھنے کی تلقین کی۔ اس وقت میں کبھی روزہ رکھ لیتا تھا اور کبھی چھوڑ دیتا تھا کیونکہ اس وقت میں روزے کے حقیقی معنی و مفہوم سے آشنا نہیں تھا لیکن بالغ ہونے اور روزہ کے معنی و مفہوم سے آگاہ ہونے کے بعد میں نے ہر رمضان کے روزے رکھنا شروع کر دیئے تھے اور پھر کبھی ایک روزہ بھی ترک نہیں کیا۔ میرا سوال یہ ہے کہ کیا مجھ پر گزشتہ سالوں کے ان روزوں کی قضا واجب ہے جو میں نے نہیں رکھے تھے' یاد رہے میں نے اٹھارہ سال کی عمر میں باقاعدہ روزے رکھنے شروع کر دیئے تھے؟

جواب جب انسان کی عمر پندرہ سال ہو جائے تو وہ شرعی احکام کا مکلف ہو جاتا ہے کیونکہ یہ عمر بلوغت کی عمر ہے' لہٰذا سائل نے بالغ ہونے کے بعد جو روزے ترک کئے ہیں ان کی قضا لازم ہے۔ روزہ کی حکمت سے ناواقفیت ترک روزہ کے لیے عذر نہیں بن سکتی' لہٰذا اسے چاہیئے کہ جو روزے اس نے رکھے نہیں یا رکھ کر پورے نہیں کیے تو ان کی قضا بھی دے اور کفارہ بھی یعنی ہر دن کے عوض ایک مسکین کو کھانا کھلائے اور اگر ان روزوں کی صحیح تعداد معلوم نہ ہو جو اس نے نہیں رکھے تو احتیاط کے ساتھ اتنے دن روزے رکھ لے کہ یقین ہو جائے کہ اس نے اپنے ذمہ روزوں کی قضا کو پورا کر دیا ہے۔ واللہ اعلم۔

——— شیخ ابن جبرین ———

تیرہ سال عمر کی لڑکی نے روزے نہیں رکھے

سوال ایک لڑکی نے' جس کی عمر بارہ یا تیرہ سال ہے' رمضان المبارک کے روزے نہیں رکھے تو کیا اسے یا اس کے گھر والوں کو کوئی کفارہ دینا چاہیئے؟ اور اگر وہ روزے رکھ لے تو کیا پھر بھی کوئی کفارہ ہے؟

جواب عورت اسلام' عقل اور بلوغت کی شروط کے ساتھ مکلف قرار پاتی ہے اور بلوغت کی علامت حیض یا احتلام یا شرم گاہ کے اردگرد سخت کھردرے بالوں کا اگنا ہے یا پندرہ سال کی عمر کو پہنچ جانا ہے۔ اگر اس لڑکی میں یہ شروط موجود ہیں تو اس پر روزہ واجب ہے اور جو روزے نہیں رکھے ان کی قضا لازم ہے اور اگر ان میں سے کوئی شرط موجود نہ ہو تو وہ مکلف (احکام شریعت کی پابند) ہو گی نہ اس پر کوئی کفارہ ہو گا۔

——— فتویٰ کمیٹی ———

وجوب روزہ کی عمر

 لڑکی پر روزہ کب فرض ہوتا ہے؟

جواب لڑکی پر روزہ اس وقت فرض ہوتا ہے جب وہ شرعی امور کی مکلف ہونے کی عمر کو پہنچ جائے یعنی جب اس کی عمر پندرہ سال ہو جائے یا اس کی شرم گاہ کے گرد کھردرے بال اگ آئیں یا انزال منی یا حیض یا حمل ہو جائے۔ جب ان میں سے کوئی چیز موجود ہو تو اس کے لیے روزہ رکھنا لازم ہو گا' خواہ اس کی عمر دس سال ہو۔ بہت سی لڑکیاں دس یا گیارہ سال کی عمر ہی میں حیض آنے کی وجہ سے بالغ ہو جاتی ہیں مگر ان کے گھر والے تساہل سے کام لیتے اور سمجھتے ہیں کہ لڑکی ابھی چھوٹی ہے لہذا وہ اسے روزے نہیں رکھنے دیتے تو یہ غلطی ہے کیونکہ لڑکی کو جب حیض آنا شروع ہو جائے تو وہ بالغ اور شرعی احکام کی مکلف ہے۔ واللہ اعلم۔

——— شیخ ابن جبرین ———

روزہ کے فوائد و آداب اور تارک اور کاہل نماز کا روزہ

روزے کے معاشرتی فوائد

سوال کیا روزے کا کوئی معاشرتی فائدہ بھی ہے؟

جواب ہاں روزے کے بہت سے معاشرتی فائدے ہیں' مثلاً اس سے مسلمانوں میں یہ شعور اجاگر ہوتا ہے کہ وہ سب ایک ہی امت کے افراد ہیں سب ایک ہی وقت میں کھاتے اور ایک ہی وقت میں روزے رکھتے ہیں۔ دولت مند اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کا شکر ادا کرتے ہوئے فقیروں کے ساتھ حسن سلوک کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ رمضان میں اولاد آدم کے لیے شیطان کی دسیسہ کاریوں میں بھی بہت کمی واقع ہو جاتی ہے۔ روزے سے تقویٰ پیدا ہوتا ہے اور اس کی وجہ معاشرہ کے افراد میں الفت و محبت اور اخوت کے جذبات پروان چڑھتے ہے۔

——— شیخ ابن عثیمین ———

روزے دار کے کرنے کے کام

سوال روزے دار کو کیا کام کرنے چاہئیں یعنی اس کے لیے کون سے کام واجب ہیں؟

جواب روزہ دار کو چاہیئے کہ وہ اطاعت الٰہی کے کام کثرت سے بجا لائے اور ایسے کاموں سے اجتناب کرے' جن سے اللہ تعالیٰ نے منع فرمایا ہے۔ واجبات کی پابندی کرے۔ محرمات سے بچے۔ نماز پنجگانہ بروقت باجماعت ادا کرے۔ جھوٹ' غیبت' دھوکا' سودی معاملات اور ہر اس قول و فعل سے اجتناب کرے جسے شریعت نے حرام قرار دیا ہے کیونکہ نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے:

«مَنْ لَّمْ يَدَعْ قَوْلَ الزُّورِ وَالْعَمَلَ بِهِ، وَالْجَهْلَ فَلَيْسَ للهِ حَاجَةٌ فِي أَنْ يَدَعَ طَعَامَهُ وَشَرَابَهُ»(صحيح البخاري، الصوم، باب من لم يدع قول الزور ... الخ، ح:١٩٠٣، وكتاب الأدب، ح:٦٠٥٧)

"جو شخص جھوٹی بات' اس کے مطابق عمل اور جہالت کو ترک نہ کرے تو اللہ تعالیٰ کو اس بات کی کوئی ضرورت نہیں کہ وہ اپنا کھانا پینا چھوڑے۔"

———— شیخ ابن عثیمین ————

افطاری میں اسراف

سوال افطاری کے کھانوں کی تیاری میں اگر اسراف سے کام لیا جائے تو کیا اس سے روزے کا ثواب کم ہو جاتا ہے؟

جواب نہیں اس سے روزے کا ثواب کم نہیں ہوتا۔ روزہ ختم ہونے کے بعد اگر کسی حرام کام کا ارتکاب کیا جائے تو اس سے بھی روزے کا ثواب کم نہیں ہوتا۔ ہاں البتہ افطاری میں اسراف حسب ذیل ارشاد باری تعالیٰ میں داخل ہے:

﴿ وَكُلُوا وَاشْرَبُوا وَلَا تُسْرِفُوا إِنَّهُ لَا يُحِبُّ الْمُسْرِفِينَ ﴿٣١﴾ ﴾ (الأعراف٧/ ٣١)

"اور کھاؤ اور پیو اور بے جا نہ اڑاؤ کہ اللہ بے جا اڑانے والوں کو دوست نہیں رکھتا۔"

لہٰذا اسراف بجائے خود ممنوع ہے جب کہ کھانے پینے میں اعتدال اختیار کرنا تو نصف معیشت ہے۔ اگر کسی کے پاس رزق کی فراوانی ہو تو اسے چاہیئے کہ اسراف کے بجائے صدقہ کر دے کیونکہ یہ ایک افضل عمل ہے۔

———— شیخ ابن عثیمین ————

جو شخص روزہ تو رکھتا ہے لیکن نماز میں سستی کرتا ہے

سوال بعض نوجوان (اللہ تعالیٰ انہیں ہدایت عطا فرمائے) رمضان وغیرہ میں نماز میں تو سستی کرتے ہیں لیکن رمضان کے روزے بہت اہتمام سے رکھتے اور بھوک پیاس کو برداشت کرتے ہیں۔ آپ انہیں کیا نصیحت فرمائیں گے؟ ایسے نوجوانوں کے روزے کے بارے میں کیا حکم ہے؟

جواب میری ان نوجوانوں کو یہ نصیحت ہے کہ وہ اپنے بارے میں تھوڑا سا غور کریں اور اس حقیقت کو خوب جان لیں کہ نماز شہادتین کے بعد اسلام کا سب سے اہم رکن ہے۔ جو شخص نماز نہ پڑھے اور محض سستی کی وجہ سے چھوڑ دے تو میرے نزدیک راجح قول کے مطابق' جس کی کتاب و سنت کے دلائل سے تائید ہوتی ہے' وہ کافر' ملت اسلامیہ سے خارج اور اسلام سے مرتد ہے' لہٰذا یہ معاملہ کوئی معمولی معاملہ نہیں۔ جو شخص کافر اور مرتد ہو جائے تو پھر اس کا روزہ' صدقہ یا کوئی اور عمل بھی مقبول نہیں کیونکہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ وَمَا مَنَعَهُمْ أَن تُقْبَلَ مِنْهُمْ نَفَقَاتُهُمْ إِلَّا أَنَّهُمْ كَفَرُوا بِاللَّهِ وَبِرَسُولِهِ وَلَا يَأْتُونَ الصَّلَاةَ إِلَّا وَهُمْ كُسَالَىٰ وَلَا يُنفِقُونَ إِلَّا وَهُمْ كَارِهُونَ ﴿٥٤﴾ ﴾ (التوبة٩/ ٥٤)

"اور ان لوگوں کے خرچ (صدقات) صرف اس لیے قبول نہیں کیے جاتے کہ وہ اللہ اور اس کے رسول کے منکر ہیں اور نماز کو آتے ہیں تو محض ست و کاہل ہو کر اور خرچ کرتے ہیں تو ناخوشی سے۔"

اس آیت کریمہ میں اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے یہ بیان فرمایا ہے کہ ان لوگوں کا اپنے مال کو خرچ کرنا بھی ان کے کفر کی وجہ سے قبول نہیں ہوتا حالانکہ اس سے دوسروں کو فائدہ پہنچتا ہے' نیز فرمان باری تعالیٰ ہے:

﴿ وَقَدِمْنَآ إِلَىٰ مَا عَمِلُوا۟ مِنْ عَمَلٍ فَجَعَلْنَـٰهُ هَبَآءً مَّنثُورًا ﴿٢٣﴾ ﴾ (الفرقان ۲۵/ ۲۳)

"اور جو انہوں نے عمل کئے ہوں گے، ہم ان کی طرف متوجہ ہوں گے تو ان کو اڑتی خاک کی مانند کر دیں گے۔"

یہ لوگ جو روزہ تو رکھتے ہیں لیکن نماز نہیں پڑھتے تو ان کا روزہ بھی مقبول نہیں بلکہ مردود ہے کیونکہ ہم یہ کہتے ہیں کہ نماز نہ پڑھنے کی وجہ سے وہ کافر ہیں جیسا کہ کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ ﷺ سے یہ ثابت ہے، لہٰذا میری ان نوجوانوں کو نصیحت یہ ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ سے ڈریں، نماز کی پابندی کریں اور نماز کو بروقت اور باجماعت ادا کریں۔ اللہ کی توفیق سے میں انہیں اس بات کی ضمانت دیتا ہوں کہ جب وہ نماز کی پابندی کریں گے تو اس سے اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے رمضان اور رمضان کے بعد بھی اپنے دلوں میں نماز کی رغبت اور شوق محسوس کریں گے اور نماز کو بروقت اور باجماعت ادا کریں گے کیونکہ انسان جب اپنے رب کی طرف رجوع کرتا ہے اور اس کی بارگاہ قدس میں سچے دل سے توبہ کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ توبہ کے بعد کے اعمال کو یقیناً شرف قبولیت سے نوازتا ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ الصلوٰۃ والسلام کے حوالہ سے ذکر فرمایا ہے کہ درخت کا پھل کھانے کے بعد جب انہوں نے پکی سچی توبہ کر لی تو:

﴿ ثُمَّ ٱجْتَبَـٰهُ رَبُّهُۥ فَتَابَ عَلَيْهِ وَهَدَىٰ ﴿١٢٢﴾ ﴾ (طٰہٰ ۲۰/ ۱۲۲)

"پھر ان کے پروردگار نے انہیں برگزیدہ کیا پس ان کی توبہ قبول فرمائی اور انہیں سیدھی راہ بتائی۔"

—— شیخ ابن عثیمین ——

جو شخص روزہ رکھتا ہے لیکن نماز نہیں پڑھتا

سوال میں نے بعض مسلمان نوجوانوں کو دیکھا ہے کہ وہ روزہ تو رکھتے ہیں لیکن نماز نہیں پڑھتے تو سوال یہ ہے کہ اس شخص کا روزہ قبول ہو جاتا ہے جو نماز نہ پڑھے؟ میں نے بعض واعظوں کو ایسے نوجوانوں سے کہتے ہوئے بھی سنا ہے کہ روزہ توڑ دو، روزہ نہ رکھو کیونکہ جو نماز نہ پڑھے اس کا روزہ بھی نہیں ہے؟

جواب جس شخص پر نماز واجب ہو اور وہ جان بوجھ کر وجوب نماز کا انکار کرتے ہوئے نماز ترک کر دے تو علما کا اجماع ہے کہ وہ کافر ہے اور جو شخص محض کاہلی اور سستی کی وجہ سے نماز ترک کر دے تو اہل علم کے صحیح قول کے مطابق وہ بھی کافر ہے اور جب وہ کافر ہے تو پھر اس کا روزہ اور دیگر تمام عبادات رائیگاں ہیں کیونکہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ وَلَوْ أَشْرَكُوا۟ لَحَبِطَ عَنْهُم مَّا كَانُوا۟ يَعْمَلُونَ ﴿٨٨﴾ ﴾ (الأنعام ٦/ ٨٨)

"اور اگر وہ لوگ (انبیاء) شرک کرتے تو جو وہ عمل کرتے تھے، سب ضائع ہو جاتے۔"

لیکن جو نماز نہ پڑھے اسے یہ حکم نہیں دیا جا سکتا کہ وہ روزہ بھی ترک کر دے کیونکہ روزہ اسے نیکی اور دین کے قریب کرے گا اور اگر وہ اللہ تعالیٰ کے خوف کی وجہ سے روزہ رکھتا ہے تو پھر تو اس بات کی بہت امید ہے کہ وہ نماز بھی پڑھنے لگے گا اور جو نمازیں اس نے نہیں پڑھیں ان کی وجہ سے وہ توبہ بھی کرے گا۔ وباللہ التوفیق وصلی اللہ وسلم علی نبینا محمد و آلہ وصحبہ۔

—— فتویٰ کمیٹی ——

جو شخص روزہ رکھتا اور صرف رمضان میں نماز پڑھتا ہے

سوال جو شخص رمضان کے روزے رکھتا اور صرف رمضان ہی میں نماز پڑھتا ہے اور رمضان ختم ہونے کے ساتھ ہی نماز چھوڑ دیتا ہے تو کیا اس کا روزہ قبول ہو جاتا ہے؟

جواب نماز اسلام کا رکن ہے بلکہ شہادتین کے بعد اسلام کا سب سے بڑا رکن اور فرض عین ہے۔ جو شخص نماز کے وجوب کے انکار کی وجہ سے یا محض سستی و کوتاہی کی وجہ سے نماز ترک کرتا ہے تو وہ کافر ہے۔ جو لوگ رمضان کے روزے رکھتے اور صرف رمضان ہی میں نماز پڑھتے ہیں تو یہ گویا اللہ تعالیٰ کو دھوکا دینا چاہتے ہیں۔ وہ بہت برے لوگ ہیں جو صرف رمضان ہی میں اللہ تعالیٰ کو پہچانتے ہیں۔ اگر وہ رمضان کے علاوہ باقی دنوں میں نماز نہیں پڑھتے تو ان کا روزہ بھی قبول نہ ہو گا۔

——— فتویٰ کمیٹی ———

رمضان میں دن کے وقت عورت سے بات کرنا اور اس کے ہاتھ کو چھونا

سوال روزے دار اگر رمضان میں دن کے وقت کسی عورت سے بات کرے یا اس کے ہاتھ کو چھوئے تو اس کے بارے میں کیا حکم ہے؟ یاد رہے بعض کاروباری مراکز اور مارکیٹوں میں ایسا ہوتا ہے؟

جواب اگر مرد کی عورت کے ساتھ بات چیت کسی شک یا اس کے ساتھ گفتگو سے لطف اندوز ہونے کے قصد کے بغیر ہو یعنی کسی تجارتی مقصد یا راستہ وغیرہ پوچھنے کے لیے ہو یا قصد و ارادہ کے بغیر ہاتھ لگ گیا ہو تو یہ رمضان و غیر رمضان میں جائز ہے' لیکن اگر عورت کے ساتھ گفتگو تلذذ کے ارادہ سے ہو تو یہ رمضان میں جائز ہے نہ غیر رمضان میں۔ رمضان میں یہ زیادہ سختی کے ساتھ منع ہے۔

——— فتویٰ کمیٹی ———

اس شخص کا روزہ جو رمضان کی راتوں میں شراب پیتا ہے

سوال ایک شخص شراب نوشی کا عادی ہے حتیٰ کہ وہ رمضان کی راتوں میں بھی شراب پیتا لیکن دن کو روزہ بھی رکھ لیتا ہے' تو ایسے شخص کے روزے کے بارے میں کیا حکم ہے؟

جواب شراب پینا اکبر الکبائر میں سے ہے کیونکہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿يَٰٓأَيُّهَا ٱلَّذِينَ ءَامَنُوٓاْ إِنَّمَا ٱلْخَمْرُ وَٱلْمَيْسِرُ وَٱلْأَنصَابُ وَٱلْأَزْلَٰمُ رِجْسٌ مِّنْ عَمَلِ ٱلشَّيْطَٰنِ فَٱجْتَنِبُوهُ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ ﴿٩٠﴾ إِنَّمَا يُرِيدُ ٱلشَّيْطَٰنُ أَن يُوقِعَ بَيْنَكُمُ ٱلْعَدَٰوَةَ وَٱلْبَغْضَآءَ فِى ٱلْخَمْرِ وَٱلْمَيْسِرِ وَيَصُدَّكُمْ عَن ذِكْرِ ٱللَّهِ وَعَنِ ٱلصَّلَوٰةِ فَهَلْ أَنتُم مُّنتَهُونَ ﴿٩١﴾﴾ (المائدۃ٥/ ٩٠۔٩١)

"اے ایمان والو! شراب اور جوا اور بت اور پانسے (یہ سب) ناپاک کام اعمال شیطان سے ہیں' سو ان سے بچتے رہنا تاکہ نجات پاؤ۔ شیطان تو یہ چاہتا ہے کہ شراب اور جوئے کے سبب تمہارے درمیان دشمنی اور رنجش ڈلوا دے اور تمہیں اللہ کی یاد سے اور نماز سے روک دے تو تم کو (ان کاموں سے) باز رہنا چاہیے۔"

شراب اگرچہ رمضان و غیر رمضان میں ہر وقت حرام ہے لیکن رمضان میں اس کی حرمت اور بھی زیادہ شدید ہے۔ شراب پینے والے کو چاہیئے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں توبہ کرے' شراب نوشی سے اجتناب کرے' شراب نوشی کے جرم کی وجہ سے جو کوتاہی ہوئی اس پر افسوس اور ندامت کا اظہار کرے اور یہ پختہ عزم کرے کہ رمضان و غیر رمضان میں آئندہ شراب نہیں پیئے گا۔

جو شخص رات کو شراب پی لے تو اس کا روزہ صحیح ہے جب تک وہ اللہ تعالیٰ کے لیے روزے کی نیت سے طلوع فجر سے لے کر غروب آفتاب تک کھانے پینے اور ان تمام چیزوں سے رک جائے جن سے روزہ ٹوٹ جاتا ہے۔

—— فتویٰ کمیٹی ——

روزے کی حالت میں تمام دن سویا رہنا

سوال ایک شخص روزے کی حالت میں تمام دن سویا رہتا ہے اور صرف فرض نمازوں کے لیے بیدار ہوتا ہے (نماز پڑھ کر) پھر سو جاتا ہے تو اس کے روزے کے بارے میں کیا حکم ہے؟

جواب یہ سوال دو حالتوں پر مشتمل ہے:

ایک حالت تو یہ ہے کہ ایک آدمی سارا دن سویا رہتا ہے اور وہ دن کو بیدار ہی نہیں ہوتا تو بے شک یہ شخص گناہ گار اور اللہ تعالیٰ کا نافرمان ہے کہ نماز کو اوقات کے مطابق ادا نہیں کرتا اور پھر باجماعت ادا نہیں کرتا کہ ترک جماعت حرام ہے اور اس سے روزے کا اجر وثواب کم ہو جائے گا۔ اس کی مثال ایسے ہے جیسے کوئی شخص محل تو بنائے مگر شہر تباہ و برباد کر دے۔ ایسے شخص کو چاہیئے کہ اللہ تعالیٰ کی جناب میں توبہ کرے اور نیند سے بیدار ہو کر اللہ تعالیٰ کے حکم کے مطابق نمازوں کو ان کے اوقات میں ادا کرے۔

دوسری حالت یہ ہے کہ آدمی دن کو سوئے مگر فرض نمازوں کو ان کے اوقات میں باجماعت بھی ادا کرے تو یہ آدمی گناہ گار تو نہیں ہو گا لیکن زیادہ سونے کی وجہ سے اپنے آپ کو خیر کثیر سے محروم کرے گا' کیونکہ روزے دار کو چاہیئے کہ وہ دن کے وقت نماز' ذکر الٰہی' دعا اور قرآن مجید کی تلاوت میں مشغول رہے تاکہ اس روزے میں بہت سی عبادتیں یکجا ہو جائیں' انسان جب روزے کی حالت میں عبادت کا اپنے آپ کو عادی بنا لے تو اس کے لیے دیگر ایام میں بھی عبادت کرنا آسان ہو جاتا ہے اور اگر وہ روزے کی حالت میں بھی سستی' کوتاہی اور آرام پسندی کا عادی بن جائے تو دیگر ایام میں بھی اس کی یہی عادت ہو گی' روزے کی حالت میں بھی اسے عبادت اور اعمال صالحہ بہت دشوار محسوس ہوں گے۔ لہٰذا اس شخص کو میری نصیحت یہ ہے کہ روزے کی حالت میں سارا دن سو کر نہ گزارے بلکہ اس وقت کو غنیمت جانے اور عبادت میں گزارے۔ الحمدللہ آج کل تو اللہ تعالیٰ نے ہمیں ائیر کنڈیشنرز اور اس طرح کی اور بھی بہت سی سہولتیں عطا فرما رکھی ہیں جن کی وجہ سے روزے رکھنا بہت آسان ہو گیا ہے۔

—— شیخ ابن عثیمین ——

رمضان میں افطار و امساک

اذان کے دوران یا تھوڑا عرصہ بعد تک کھانا

سوال ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ وَكُلُوا۟ وَٱشْرَبُوا۟ حَتَّىٰ يَتَبَيَّنَ لَكُمُ ٱلْخَيْطُ ٱلْأَبْيَضُ مِنَ ٱلْخَيْطِ ٱلْأَسْوَدِ ﴾ (البقرۃ ۲/ ۱۸۷)

"اور کھاؤ اور پیو یہاں تک کہ تمہارے لیے صبح کی سفید دھاری (رات کی) سیاہ دھاری سے واضح ہو جائے۔"

تو اس شخص کے بارے میں کیا حکم ہے جو اذان کے وقت اپنے سحری کے کھانے پینے کو مکمل کرتا یا اذان فجر کے بھی پندرہ منٹ بعد تک کھاتا پیتا رہتا ہے؟

جواب اگر سوال میں مذکورہ شخص یہ جانتا ہے کہ وہ صبح طلوع ہونے سے پہلے کھا پی رہا ہے تو اس پر قضا نہیں اور اگر وہ جانتا ہے کہ صبح طلوع ہو چکی ہے تو پھر اسے قضا دینا ہوگی اور اگر اسے علم نہیں کہ وہ طلوع فجر سے پہلے کھا پی رہا ہے یا بعد میں تو پھر بھی اس کے ذمہ قضا نہیں ہوگی کیونکہ اصل تو بقاء لیل ہے لیکن مومن کو چاہیئے کہ وہ روزے کے بارے میں احتیاط سے کام لے اور جب اذان سنے تو کھانے پینے سے رک جائے الا یہ کہ اسے معلوم ہو کہ یہ اذان صبح سے پہلے تھی۔

——— فتویٰ کمیٹی ———

اس شخص کا روزہ جو اذان کے وقت کھائے

سوال جو شخص اذان فجر کو سن کر بھی کھانا پینا جاری رکھے اس کے روزے کے بارے میں کیا حکم ہے؟

جواب مومن کے لیے ضروری ہے کہ جب طلوع فجر واضح ہو جائے تو وہ کھانے پینے اور دیگر مفطرات سے رک جائے جب کہ روزہ فرض ہو مثلاً یہ کہ رمضان کا یا نذر کا یا کفارہ وغیرہ کا روزہ ہو' کیونکہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ وَكُلُوا۟ وَٱشْرَبُوا۟ حَتَّىٰ يَتَبَيَّنَ لَكُمُ ٱلْخَيْطُ ٱلْأَبْيَضُ مِنَ ٱلْخَيْطِ ٱلْأَسْوَدِ مِنَ ٱلْفَجْرِ ۖ ثُمَّ أَتِمُّوا۟ ٱلصِّيَامَ إِلَى ٱلَّيْلِ ۚ﴾ (البقرۃ ۲/ ۱۸۷)

"اور کھاؤ اور پیو یہاں تک کہ تمہارے لیے صبح کی سفید دھاری (رات کی) سیاہ و دھاری سے واضح ہو جائے پھر روزہ (رکھ کر) رات تک پورا کرو۔"

جب کوئی شخص اذان سنے اور اسے معلوم ہو کہ یہ اذان فجر ہے تو اس پر واجب ہے کہ وہ کھانے پینے سے رک جائے۔ اگر موذن طلوع فجر سے قبل اذان دے رہا ہو تو پھر رک جانا واجب نہیں بلکہ کھانا پینا جائز ہے' حتیٰ کہ فجر واضح ہو جائے اور اگر یہ معلوم نہ ہو کہ اذان فجر سے پہلے ہے یا بعد میں تو پھر افضل اور زیادہ محتاط بات یہ ہے کہ رک جائے اور اگر اذان کے وقت کچھ کھا پی لیا تو اس سے کچھ نقصان نہیں ہوگا کیونکہ اسے طلوع فجر کا علم نہیں ہے۔

یہ معلوم امر ہے کہ جو لوگ شہروں میں رہتے ہیں' جہاں بجلی کی روشنیاں ہوتی ہیں وہ عین صحیح وقت پر طلوع فجر کو معلوم

نہیں کر سکتے لہٰذا احتیاط اسی میں ہے کہ وہ اذان اور ان کیلنڈروں کے مطابق عمل کریں جن میں گھنٹوں اور منٹوں کے حساب سے طلوع فجر کا تعین کیا گیا ہوتا ہے تاکہ نبی کریم ﷺ کے اس ارشاد پر عمل ہو سکے:

«دَعْ مَا يَرِيبُكَ إِلَى مَالاَ يَرِيبُكَ» (جامع الترمذي، صفة القيامة، [باب حديث اعقلها توكل...]، ح:٢٥١٨)

"جو چیز تجھے شک میں مبتلا کرتی ہو اس کو چھوڑ کر ایسی چیز کو اختیار کر جو شک میں مبتلا کرنے والی نہ ہو۔"

نیز آپ کے اس فرمان پر عمل ہو سکے:

«مَنِ اتَّقَى الشُّبُهَاتِ اسْتَبْرَأَ لِدِينِهِ وَعِرْضِهِ»(صحيح البخاري، الإيمان، باب فضل من استبرأ لدينه، ح:٥٢، صحيح مسلم، المساقاة، باب أخذ الحلال وترك الشبهات، ح:١٥٩٩)

"جو شخص شبہات سے بچ گیا اس نے اپنے دین اور اپنی عزت کو بچا لیا۔" واللہ ولی التوفیق۔

——— شیخ ابن باز ———

جب روزے دار اذان فجر کے بعد کچھ پی لے

سوال جب روزے دار اذان فجر سننے کے بعد کچھ پی لے تو کیا اس کا روزہ صحیح ہو گا؟

جواب جب روزے دار اذان فجر کو سننے کے بعد پیے تو اس کی صورت یہ ہے کہ اگر مؤذن نے طلوع صبح کے بعد اذان کہی ہے تو پھر اذان کے بعد کھانا پینا جائز نہیں اور اگر اذان طلوع صبح سے پہلے کہی ہے تو پھر کھانے پینے میں کوئی حرج نہیں کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ فَالْـَٔـٰنَ بَـٰشِرُوهُنَّ وَٱبْتَغُوا۟ مَا كَتَبَ ٱللَّهُ لَكُمْ ۚ وَكُلُوا۟ وَٱشْرَبُوا۟ حَتَّىٰ يَتَبَيَّنَ لَكُمُ ٱلْخَيْطُ ٱلْأَبْيَضُ مِنَ ٱلْخَيْطِ ٱلْأَسْوَدِ مِنَ ٱلْفَجْرِ ۖ﴾ (البقرة٢/ ١٨٧)

"اب (تم کو اختیار ہے کہ) ان سے مباشرت کرو اور اللہ نے جو چیز تمہارے لیے لکھ رکھی ہے (یعنی اولاد) اس کو (اللہ سے) طلب کرو اور کھاؤ اور پیو یہاں تک کہ صبح کی سفید دھاری (رات کی) سیاہ دھاری سے الگ نظر آنے لگے۔"

اور نبی کریم ﷺ نے فرمایا تھا:

«إِنَّ بِلاَلاً يُؤَذِّنُ بِلَيْلٍ فَكُلُوا وَاشْرَبُوا حَتَّى تَسْمَعُوا أَذَانَ ابْنِ أُمِّ مَكْتُومٍ فَإِنَّهُ لاَ يُؤَذِّنُ حَتَّى يَطْلُعَ الْفَجْرُ»(صحيح البخاري، الصوم، باب قول النبي ﷺ لا يمنعنكم من سحوركم ... الخ، ح:١٩١٨، ١٩١٩ وصحيح مسلم، الصيام، باب بيان أن الدخول في الصوم ... الخ، ح:١٠٩٢ وما بين القوسين لفظ البخاري)

"بلال رات کو اذان کہتے ہیں لہٰذا تم کھاؤ پیو' حتیٰ کہ ابن اُم مکتوم کی اذان کو سن لو کیونکہ وہ اذان نہیں کہتے حتیٰ کہ فجر طلوع ہو جائے۔"

مؤذنوں کو بھی چاہیئے کہ وہ احتیاط سے کام لیں اور اس وقت تک اذان نہ کہیں جب تک صبح نمودار نہ ہو جائے یا صبح

وقت دینے والی گھڑیوں کے ذریعہ طلوع فجر کا یقین نہ ہو جائے تاکہ وہ لوگوں کو دھوکا نہ دے سکیں' اللہ تعالیٰ کی حلال کردہ اشیاء کو حرام نہ قرار دے سکیں اور نماز فجر کو قبل ازوقت حلال نہ قرار دے سکیں۔ وقت سے قبل اذان دینے کے اور بھی بہت سے نقصانات ہیں۔

———— شیخ ابن عثیمین ————

جو شخص طلوع فجر کے بعد کھائے پیئے اس کا روزہ نہیں

سوال میں نے سوموار کے دن نفلی روزہ کی نیت کی لیکن اذان فجر کے بعد میں نے پی لیا تو کیا یہ روزے مجھے مکمل کرنا چاہیئے؟ کیا اس کا ثواب ملے گا یا نہیں؟ جو شخص نفلی روزے میں اذان فجر کے بعد کھا پی لے تو کیا اسے یہ روزہ مکمل کرنا چاہیئے؟ رہنمائی فرمائیں۔ جزاکم اللہ خیرًا۔

جواب روزے دار کے لیے ضروری ہے کہ جب اس کا روزہ فرض ہو تو وہ اس وقت کھانے پینے اور دیگر تمام ایسی اشیاء سے رک جائے جن سے روزہ ٹوٹ جاتا ہے' جب اسے یقین ہو جائے کہ فجر طلوع ہو گئی ہے یا وہ کسی ایسے موذن کی اذان سن لے جس کی عادت یہ ہے کہ طلوع فجر کے بعد اذان دیتا ہے یا اذان دینے کے لیے ایسے کیلنڈر کو سامنے رکھتا ہے جس میں طلوع فجر کے اوقات بے حد احتیاط کے ساتھ درج کیے گئے ہوں' ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ وَكُلُوا۟ وَٱشْرَبُوا۟ حَتَّىٰ يَتَبَيَّنَ لَكُمُ ٱلْخَيْطُ ٱلْأَبْيَضُ مِنَ ٱلْخَيْطِ ٱلْأَسْوَدِ مِنَ ٱلْفَجْرِ ﴾

(البقرة۲/ ۱۸۷)

"اور کھاؤ اور پیو یہاں تک کہ تمہارے لیے صبح کی سفید دھاری (رات کی) سیاہ دھاری سے واضح ہو جائے۔"

اور نبی کریم ﷺ نے فرمایا تھا:

«إِنَّ بِلَالاً يُؤَذِّنُ بِلَيْلٍ، فَكُلُوا وَاشْرَبُوا حَتَّى يُنَادِيَ ابْنُ أُمِّ مَكْتُومٍ» (صحيح البخاري، الأذان، باب آذان الأعمٰى إذا . . . الخ، ح:٦١٧).

"بلال رات کو اذان دیتا ہے تم کھاؤ پیو حتیٰ کہ ابن ام مکتوم اذان دے۔"

ابن ام مکتوم ایک نابینا آدمی تھے وہ اس وقت تک اذان نہ دیتے جب تک ان سے یہ نہ کہا جاتا کہ صبح ہو گئی ہے' صبح ہو گئی ہے۔

اگر طلوع فجر کے بعد اس نے کچھ کھا پی لیا یا کوئی مفطر چیز استعمال کر لی تو اس کا روزہ باطل ہو جائے گا' اسی طرح نفلی روزہ رکھنے والے نے بھی اگر طلوع فجر کے بعد کچھ کھا پی لیا یا کوئی مفطر چیز استعمال کر لی تو اس کا روزہ بھی نہیں ہو گا ہاں البتہ فرض اور نفل روزے میں اس اعتبار سے ضرور فرق ہے کہ نفلی روزہ کی نیت دن کو بھی کی جا سکتی ہے بشرطیکہ طلوع فجر کے بعد سے روزہ کی نیت کرنے تک کچھ کھایا پیا نہ ہو اور نہ کسی اور ایسی چیز کو استعمال کیا ہو جس سے روزہ ٹوٹ جاتا ہے۔ اس کی دلیل حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی یہ روایت ہے کہ ایک دن نبی ﷺ میرے ہاں تشریف لائے اور آپ نے فرمایا:

«هَلْ عِنْدَكُمْ شَيْءٌ؟ فَقُلْنَا: لاَ، قَالَ: فَإِنِّي إِذَنْ صَائِمٌ ثُمَّ أَتَانَا يَوْمًا آخَرَ فَقُلْنَا: يَارَسُولَ اللهِ! أُهْدِيَ لَنَا حَيْسٌ، فَقَالَ: أَرِينِيهِ، فَلَقَدْ أَصْبَحْتُ صَائِمًا فَأَكَلَ»(صحيح مسلم، الصيام،

باب جواز صوم النافلة بنية من النهار ... الخ، ح:١١٥٤)

"کیا تمہارے پاس کھانے کے لیے کچھ ہے؟" ہم نے عرض کیا' نہیں! تو آپ نے فرمایا "پھر میں روزہ رکھ لیتا ہوں" ایک دن آپ پھر تشریف لائے تو ہم نے عرض کیا اے اللہ کے رسول! ہمارے پاس حلوے کا تحفہ آیا ہے تو آپ نے فرمایا مجھے بھی دکھاؤ (آپ نے فرمایا) میں نے تو روزہ رکھا ہوا تھا۔ پھر آپ نے کھالیا۔"

نیت کے بارے میں تو نبی کریم ﷺ کا یہ ارشاد ہے:

«إِنَّمَا الأَعْمَالُ بِالنِّيَّاتِ، وَإِنَّمَا لِكُلِّ امْرِیءٍ مَّا نَوٰی»(صحيح البخاري، بدء الوحی، باب كيف كان بدء الوحی ... الخ، ح:١ وصحيح مسلم، الإمارة، باب قوله ﷺ إنما الأعمال بالنية ... الخ، ح:١٩٠٧)

"تمام اعمال کا انحصار نیتوں پر ہے اور ہر آدمی کے لیے صرف وہی کچھ ہے جس کی وہ نیت کرے۔"

——— شیخ ابن باز ———

جو روزے دار طلوع فجر یا غروب آفتاب میں شک کی وجہ سے کھالے

سوال اس شخص کے بارے میں کیا حکم ہے جو طلوع فجر یا غروب آفتاب میں شک کی وجہ سے کچھ کھا پی لے؟ راہنمائی فرمائیں۔ اللہ تعالیٰ آپ کو اجروثواب سے نوازے!

جواب جو شخص طلوع فجر میں شک کی وجہ سے کھا پی لے تو اس پر کوئی کفارہ وغیرہ نہیں اس کا روزہ صحیح ہے کیونکہ اصل بقاء لیل ہے لیکن مومن کے لیے حکم شریعت یہ ہے کہ وہ دین میں احتیاط اور کمال صوم کے پیش نظر شک کے وقت سے پہلے پہلے سحری کھالے۔

جو شخص غروب آفتاب میں شک کی وجہ سے کھاپی لے تو اس نے غلطی کی ہے' اسے اس کی قضا دینا ہو گی کیونکہ اصل بقاء دن ہے اور کسی مسلمان کے لیے یہ جائز نہیں کہ وہ غروب آفتاب کا یقین کئے بغیر روزہ افطار کرلے یا کم از کم ظن غالب یہ ہو کہ سورج غروب ہو گیا ہے۔ واللہ ولی التوفیق!

——— شیخ ابن باز ———

ریڈیو سے اعلان سن کر روزہ افطار کر دیا

سوال رمضان میں ایک دن اناؤنسر نے ریڈیو سے یہ اعلان کیا کہ اب سے دو منٹ بعد اذان مغرب ہو گی لیکن محلہ کی مسجد کے مؤذن نے اسی لمحہ میں اذان دینا شروع کر دی تو ان دونوں میں سے کس کی اتباع کرنا زیادہ بہتر ہے؟

جواب اگر مؤذن غروب آفتاب کا مشاہدہ کرنے کے بعد اذان کہتا ہو اور وہ قابل اعتماد ہو تو ہم مؤذن کی پیروی کریں گے کیونکہ وہ واقع محسوس یعنی غروب آفتاب کا مشاہدہ کر کے اذان کہتا ہے اور اگر وہ سورج دیکھنے کے بجائے محض گھڑی دیکھ کر اذان کہتا ہو تو پھر ظن غالب یہ ہے کہ ریڈیو کا اعلان زیادہ صحیح ہے کیونکہ گھڑیوں کے اوقات مختلف ہوتے ہیں' لہٰذا ریڈیو کے اعلان کی پیروی زیادہ بہتر ہے۔

شیخ ابن عثیمین

جن ممالک میں سورج بہت تاخیر سے غروب ہوتا ہے

ہمارے ملک میں سورج شام کو ساڑھے نو یا ساڑھے دس بجے غروب ہوتا ہے' تو ہم کس وقت افطار کریں؟

جواب آپ اسی وقت افطار کریں گے جب سورج غروب ہو گا۔ جب تک آپ کے ہاں دن رات کا دورانیہ چوبیس گھنٹوں پر مشتمل ہو گا روزہ فرض ہو گا خواہ دن کتنا ہی لمبا ہو۔

شیخ ابن عثیمین

لیل و نہار کی طوالت

سوال اسکنڈے نیویا۔ اوراس سے اوپر کے شمالی علاقوں میں مسلمانوں کو رات اور دن کے طول واختصار کی وجہ سے مشکل پیش آتی ہے کیونکہ یہاں دن بائیس گھنٹے کا اور رات صرف دو گھنٹے کی ہوتی ہے اور اگلے موسم میں صورتحال اس کے برعکس ہوتی ہے جیسا کہ ایک سائل کو یہ صورت حال پیش آئی' جب اس کا رمضان میں یہاں سے گزر ہوا۔ اس کا کہنا ہے کہ بعض علاقوں میں دن اور رات چھ چھ ماہ کے بھی ہوتے ہیں تو سوال یہ ہے کہ ان علاقوں میں روزہ کس طرح رکھا جائے گا یا جو لوگ کام اور تعلیم کے لیے یہاں مقیم ہیں وہ کس طرح روزے رکھیں گے؟

جواب ان علاقوں میں مشکل صرف روزہ کے حوالہ ہی سے نہیں بلکہ یہ مشکل نماز کے حوالے سے بھی ہے لیکن اگر ان علاقوں میں رات اور دن ہے تو اس کے مطابق عمل ہو گا خواہ دن لمبا ہو یا چھوٹا اور اگر یہاں دن رات نہ ہو جس طرح کے قطبی علاقوں میں دن اور رات چھ چھ ماہ کے ہوتے ہیں تو یہ لوگ اپنے روزوں اور نمازوں کے اوقات کے اندازے مقرر کر لیں گے لیکن سوال یہ ہے کہ یہ اندازہ کس حساب سے لگایا جائے گا؟ بعض اہل علم یہ کہتے ہیں کہ مکہ مکرمہ کے اوقات کو معیار بنایا جائے کیونکہ مکہ مکرمہ ام القریٰ ہے اور ام وہ چیز ہوتی ہے جس کی اقتدا کی جائے' جس طرح امام کی اقتدا کی جاتی ہے' جس طرح کہ شاعر نے کہا ہے۔ ع

«عَلٰى رَأْسِهِ أُمٌّ لَهُ يَقْتَدِي بِهَا»

بعض اہل علم نے یہ کہا ہے کہ ان علاقوں میں بارہ گھنٹے کا دن اور بارہ گھنٹے کی رات شمار کی جائے گی کیونکہ رات دن کے لیے معتدل وقت یہی ہے۔ بعض اہل علم نے کہا ہے کہ ان علاقوں کے اس قریب ترین ملک کے اوقات کو معیار مقرر کیا جائے گا جہاں دن رات معمول کے مطابق ہوں یہی قول زیادہ راجح ہے کیونکہ قریب ترین علاقے اس بات کے زیادہ حق دار ہیں کہ ان کی اتباع کی جائے' جغرافیائی اعتبار سے بھی ان کا موسم ان کے قریب ترین ہے' لہٰذا وہ ایسے قریب ترین علاقے کے اوقات کو اپنے لیے معیار قرار دیں جہاں دن رات معمول کے مطابق ہو اور انہی اوقات کے مطابق نماز اور روزے کو ادا کریں۔

شیخ ابن عثیمین

وہ امور جن سے روزہ ٹوٹ جاتا ہے

توبہ کفارہ ہے

سوال میں یہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ رمضان کے مہینہ میں دن کے وقت مشت زنی کرنے کا کیا کفارہ ہے؟ مجھے یہ معلوم ہے کہ یہ جائز نہیں' لیکن سوال یہ ہے کہ اس کا کفارہ کیا ہے' اگر کوئی کفارہ ہے تو اسے وضاحت سے بیان فرما دیں؟

جواب مشت زنی رمضان اور غیر رمضان میں جائز نہیں بلکہ یہ گناہ اور جرم ہے۔ اس کا کفارہ یہ ہے کہ سچی توبہ کی جائے اور ایسے نیک عمل کئے جائیں جو برائیوں کا کفارہ بن جاتے ہیں۔ چونکہ اس فعل بد کا ارتکاب رمضان میں دن کے وقت ہوا ہے اس لیے اس کے گناہ میں اور بھی اضافہ ہو گیا۔ لہٰذا ضرورت اس امر کی ہے کہ سچی پکی توبہ کی جائے' کثرت کے ساتھ اعمال صالحہ اور اللہ تعالیٰ کی اطاعت و بندگی کے کام کئے جائیں اور نفس کو حرام شہوت سے روکا جائے۔ اس دن کے روزے کی قضا بھی ضروری ہے جسے مشت زنی کی وجہ سے خراب کر دیا گیا تھا۔ اگر صدق دل سے توبہ کر لی جائے تو اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کی توبہ کو شرف قبولیت سے نواز کر ان کے گناہوں کو معاف فرما دیتا ہے۔ واللہ اعلم۔

—————— شیخ ابن جبرین ——————

روزے دار کا لعاب کا نگلنا

سوال روزے دار اگر لعاب کو نگل لے تو اس کا کیا حکم ہے؟

جواب لعاب روزے کو نقصان نہیں دیتا' اسے نگلنے میں کوئی حرج نہیں' تھوک دیا جائے تو پھر بھی کوئی حرج نہیں' ہاں البتہ سینہ سے خارج ہونے والے کھنکھار یا ناک سے خارج ہونے والے رینٹ کو جو در حقیقت جما ہوا بلغم ہوتا ہے اور کبھی سینہ سے خارج ہوتا ہے اور کبھی سر کی طرف سے آتا ہے' واجب ہے کہ تھوک دیا جائے' باہر نکال دیا جائے اور اسے نہ نگلا جائے۔ ہاں البتہ لعاب میں کوئی حرج نہیں اس سے مرد یا عورت کے روزے کو کوئی نقصان نہیں پہنچتا۔

—————— شیخ ابن باز ——————

اگر کلی کرتے ہوئے پانی حلق تک چلا جائے

سوال جب روزے دار کلی کرے یا ناک صاف کرے اور غیر ارادی طور پر پانی حلق تک چلا جائے تو کیا اس سے روزہ فاسد ہو جائے گا؟

جواب جب روزے دار کلی کرے یا ناک میں پانی ڈالے اور پانی اندر تک چلا جائے تو اس سے روزہ نہیں ٹوٹے گا کیونکہ اس نے قصد و ارادہ سے ایسا نہیں کیا اور ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَلَٰكِن مَّا تَعَمَّدَتْ قُلُوبُكُمْ﴾ (الأحزاب۳۳/ ۵)

"لیکن جو کام تم دلی ارادے سے کرو (اس پر مؤاخذہ اور گناہ ہے۔)"

——— شیخ ابن عثیمین ———

میں نے کلی کرتے ہوئے پانی نگل لیا

سوال میں نے ایک دن کلی کے بعد پانی نگل لیا اور جب ایک عالم سے فتویٰ پوچھا تو انہوں نے فرمایا کہ آپ پر کوئی کفارہ وغیرہ نہیں ہے' یاد رہے کہ میں نے قصد و ارادہ سے یہ پانی نہیں نگلا تھا۔ تو سوال یہ ہے کیا مجھ پر کوئی کفارہ وغیرہ ہے؟

جواب اس وجہ سے آپ پر کوئی کفارہ نہیں ہو گا اور مذکورہ مفتی نے آپ کو جو فتویٰ دیا ہے وہ صحیح ہے' اس لیے کہ اولاً تو یہ آپ سے جہالت اور عدم معرفت حکم کی وجہ سے ہوا۔ ثانیاً: اس طرح حلق تک آنے والا پانی بہت ہی کم ہوتا ہے اور ثالثاً: ایسا عموماً غیر اختیاری طور پر ہوتا ہے۔

——— شیخ ابن جبرین ———

رمضان میں مسواک کرنا

سوال کچھ لوگ رمضان میں مسواک نہیں کرتے تاکہ روزہ خراب نہ ہو جائے۔ کیا یہ بات صحیح ہے؟ نیز یہ فرمائیں کہ رمضان میں مسواک کرنے کے لیے افضل وقت کون سا ہے؟

جواب رمضان میں دن کے وقت یا دیگر ایسے ایام میں جب روزہ رکھا ہو مسواک سے پرہیز کرنے کی کوئی وجہ نہیں کیونکہ مسواک کرنا تو سنت ہے اور جیسا کہ صحیح حدیث میں ہے:

«اَلسِّوَاكُ مَطْهَرَةٌ لِّلْفَمِ مَرْضَاةٌ لِلرَّبِّ»(سنن النسائي، الطهارة، باب الترغيب في السواك، ح:٥)

"مسواک کرنا منہ کی صفائی و پاکیزگی اور رب کے راضی ہونے کا سبب ہے۔"

ہر وضو اور نماز کے وقت مسواک کرنے کی بہت تاکید آئی ہے' اسی طرح نیند سے بیدار ہونے کے بعد اور گھر میں داخل ہوتے وقت مسواک کرنا بھی سنت ہے۔ مسواک کرنے سے روزہ فاسد نہیں ہوتا ہاں البتہ اگر مسواک کا لعاب میں ذائقہ اور اثر ہو تو پھر اس لعاب کو نہ نگلیں۔ اسی طرح مسواک کرتے ہوئے اگر مسوڑھوں سے خون نکل آئے تو اسے بھی نہ نگلیں' ان چیزوں کے نگلنے سے اگر آپ پرہیز کریں تو محض مسواک کرنے سے روزے پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔

——— شیخ ابن عثیمین ———

روزے دار کے لیے ٹوتھ پیسٹ کا استعمال

سوال کیا روزے دار کے لیے رمضان میں دن کے وقت روزے کی حالت میں ٹوتھ پیسٹ استعمال کرنا جائز ہے؟

جواب اس میں کوئی حرج نہیں بشرطیکہ یہ احتیاط کی جائے کہ اسے نگلنے نہ پائے۔ جس طرح روزہ دار کے لیے دن کے ابتدائی اور آخری حصہ میں مسواک کرنا جائز ہے اسی طرح ٹوتھ پیسٹ یا منجن وغیرہ استعمال کرنا بھی جائز ہے۔ بعض اہل علم نے زوال کے بعد مسواک کرنے کو مکروہ قرار دیا ہے مگر یہ ایک مرجوح قول ہے اور صحیح بات یہی ہے کہ کسی وقت بھی

مسواک کرنا مکروہ نہیں ہے کیونکہ نبی ﷺ کے اس ارشاد کے عموم کا یہ تقاضا ہے:

«اَلسِّوَاكُ مَطْهَرَةٌ لِّلْفَمِ مَرْضَاةٌ لِلرَّبِّ» (سنن النسائي، الطهارة، باب الترغيب في السواك، ح:٥)

"مسواک کرنا منہ کی صفائی و پاکیزگی اور رب کے راضی ہونے کا سبب ہے۔"

اسی طرح رسول اللہ ﷺ نے یہ بھی فرمایا ہے:

«لَوْلَا أَنْ أَشُقَّ عَلٰى أُمَّتِي لَأَمَرْتُهُمْ بِالسِّوَاكِ مَعَ كُلِّ صَلَاةٍ»(صحيح البخاري، الجمعة، باب السواك يوم الجمعة، ح:٨٨٧ وصحيح مسلم، الطهارة، باب السواك، ح:٢٥٢)

"اگر امت کے مشقت میں پڑ جانے کا اندیشہ نہ ہوتا تو میں ہر نماز کے ساتھ مسواک کرنے کا حکم دیتا۔"

ہر نماز میں تو ظہر اور عصر بھی شامل ہیں اور یہ زوال کے بعد ہیں۔ (لہٰذا معلوم ہوا کہ زوال کے بعد مسواک کرنا بھی مکروہ نہیں)

——— شیخ ابن باز ———

روزے کی حالت میں ٹوتھ برش کا استعمال؟

سوال کیا روزہ کی حالت میں پیسٹ کے ساتھ ٹوتھ برش استعمال کرنا جائز ہے؟ ٹوتھ برش استعمال کرنے سے مسوڑھوں سے تھوڑی سی مقدار میں اگر خون نکل آئے تو کیا اس سے روزہ ٹوٹ جائے گا؟

جواب روزہ کی حالت میں دانتوں کو پانی، مسواک اور ٹوتھ برش وغیرہ سے صاف کرنے میں کوئی حرج نہیں۔ بعض اہل علم نے روزہ دار کے لیے زوال کے بعد مسواک کرنے کو مکروہ سمجھا ہے، کیونکہ اس سے روزہ دار کے منہ کی بو زائل ہو جاتی ہے لیکن صحیح بات یہ ہے کہ مسواک کرنا مستحب ہے خواہ دن کا ابتدائی حصہ ہو یا آخری۔ اور اس کے استعمال سے منہ کی وہ بو زائل نہیں ہوتی جسے حدیث میں "خلوف" کہا گیا ہے۔ ہاں البتہ اس سے دانت اور منہ بدبو، بخارات اور کھانے کے ریزوں سے ضرور پاک صاف ہو جاتے ہیں۔ پیسٹ کا استعمال بظاہر مکروہ معلوم ہوتا ہے کیونکہ پیسٹ میں خوشبو اور ذائقہ ہوتا ہے۔ لہٰذا خدشہ ہے کہ لعاب دہن کے ساتھ ملنے کی وجہ سے آدمی اسے نگل نہ لے، لہٰذا جسے پیسٹ کے استعمال کی ضرورت ہو تو وہ اسے اذان فجر سے پہلے استعمال کرلے اور اگر وہ دن کو استعمال کرلے اور نگلنے کا کوئی اندیشہ نہ ہو تو پھر (دن کو بھی استعمال کرنے میں) کوئی حرج نہیں۔ اگر برش یا مسواک کرنے سے تھوڑی سی مقدار میں مسوڑھوں سے خون نکل آئے تو اس سے روزہ نہیں ٹوٹتا۔ واللہ اعلم

——— شیخ ابن جبرین ———

(روزے دار کے لیے) تیل کا استعمال

سوال کیا کسی ایسے تیل وغیرہ کا استعمال روزے کے لیے نقصان دہ تو نہیں ہے جو جلد کو چکنا تو کرے لیکن جلد تک پانی پہنچنے میں رکاوٹ نہ بنے؟

جواب روزے کی حالت میں بوقت ضرورت جسم پر تیل لگانے میں کوئی حرج نہیں کیونکہ تیل سے جلد کا صرف اوپر کا حصہ تر ہوتا ہے اور تیل جسم کے اندر داخل نہیں ہوتا اور اگر یہ مساموں سے اندر داخل ہو بھی جائے تو اس سے روزہ نہیں ٹوٹتا۔

——— شیخ ابن جبرین ———

روزہ دار کے لیے مہندی کا استعمال

سوال کیا نماز و روزہ کی حالت میں بالوں کو مہندی لگانا جائز ہے؟ میں نے سنا ہے مہندی کے استعمال سے روزہ ٹوٹ جاتا ہے؟

جواب یہ بات صحیح نہیں ہے۔ روزہ کی حالت میں مہندی کے استعمال سے روزہ نہیں ٹوٹتا۔ جس طرح سرمہ کے استعمال سے اور کان یا آنکھ میں دوائی کا قطرہ ڈالنے سے روزہ نہیں ٹوٹتا اسی طرح سر پر مہندی لگانے سے بھی روزہ نہیں ٹوٹتا اور اس سے روزے کو قطعاً کوئی نقصان نہیں پہنچتا۔

دوران نماز مہندی کے بارے میں جو پوچھا گیا ہے تو معلوم نہیں کہ اس سوال سے کیا مراد ہے؟ کیونکہ جس عورت نے نماز پڑھنا ہو گی اس کے لیے تو یہ ممکن نہیں کہ وہ مہندی لگائے (کیونکہ اس طرح اس کا سر ننگا ہو گا)۔ شاید سوال سے یہ مراد ہو کہ اگر مہندی لگی ہو تو کیا اس سے وضو ہو جائے گا؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ مہندی کے استعمال سے وضو کی صحت پر کوئی اثر نہیں پڑتا کیونکہ مہندی کے استعمال سے جسم پر کوئی ایسی تہہ نہیں بیٹھتی جو جلد تک پانی پہنچنے میں حائل ہو کیونکہ مہندی کے استعمال سے جسم پر صرف رنگ ظاہر ہوتا ہے‘ جبکہ وضو پر وہ چیز اثر انداز ہوتی ہے جس کا ایسا وجود ہو جو جلد تک پانی کے پہنچنے میں رکاوٹ بنے‘ لہٰذا اگر کوئی ایسی چیز استعمال کی ہو تو ضروری ہے کہ اسے وضو کرنے سے پہلے دور کر دیا جائے تاکہ وضو صحیح ہو سکے۔

——— شیخ ابن عثیمین ———

رمضان میں دن کے وقت خوشبو کا استعمال

سوال روزے دار کے لیے رمضان میں دن کے وقت عطریات کے استعمال کے بارے میں کیا حکم ہے؟

رمضان میں دن کے وقت عطریات کے استعمال کرنے اور انہیں سونگھنے میں کوئی حرج نہیں‘ ہاں البتہ بخور (خوشبودار دھونی) کو نہیں سونگھنا چاہیئے کیونکہ اسے سونگھنے سے دھواں معدے تک پہنچ جاتا ہے۔

——— شیخ ابن عثیمین ———

رمضان میں خوشبو اور دھونی کا استعمال

سوال کیا رمضان میں دن کے وقت خوشبو مثلاً عطر‘ عود‘ کولون اور صندل وغیرہ کی دھونی کا استعمال جائز ہے؟

ہاں خوشبو کا استعمال جائز ہے بشرطیکہ (صندل وغیرہ کی) دھونی کو نہ سونگھے۔

——— شیخ ابن باز ———

کھانے کو چکھنا

سوال کیا روزہ کی حالت میں کھانا پکانے والے کیلئے اسے چکھنا جائز ہے تاکہ وہ یہ معلوم کر سکے کہ کھانا پک گیا ہے یا نہیں؟

جواب بوقت ضرورت کھانا چکھنے میں کوئی حرج نہیں اور وہ اس طرح کہ زبان کے کنارے کے ساتھ کھانے کی شیرینی اور

نمکینی وغیرہ کو چکھ لیا جائے لیکن اسے نگلا نہ جائے بلکہ فوراً منہ سے نکال دیا جائے۔ ان شاء اللہ اس سے روزہ فاسد نہیں ہو گا۔

——— شیخ ابن جبرین ———

بھول کر کھا لینا

سوال جو شخص بھول کر کھا پی لے اس کے بارے میں کیا حکم ہے؟ جو شخص کسی کو بھول کر کھاتے پیتے ہوئے دیکھے تو کیا اس پر یہ واجب ہے کہ اسے روزے کے بارے میں یاد دلا دے؟

جواب جو روزے دار بھول کر کچھ کھا یا پی لے اس کا روزہ صحیح ہے لیکن اس کے لیے یہ واجب ہے کہ اسے جب یاد آ جائے تو فوراً کھانے پینے سے رک جائے حتیٰ کہ اگر کھانے کا کوئی لقمہ یا کسی مشروب کا کوئی گھونٹ اس کے منہ میں ہو تو ضروری ہے کہ اسے بھی منہ سے نکال کر پھینک دے۔ اس کے روزے کے صحیح ہونے کی دلیل رسول اللہ ﷺ کی یہ حدیث ہے جو حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے:

«مَنْ نَّسِيَ وَهُوَ صَائِمٌ، فَأَكَلَ أَوْ شَرِبَ، فَلْيُتِمَّ صَوْمَهُ، فَإِنَّمَا أَطْعَمَهُ اللهُ وَسَقَاهُ» (صحيح البخاري، الصوم، باب الصائم إذا أكل أو شرب ناسيا، ح:١٩٣٣ وكتاب الأيمان والنذور، ح:٦٦٦٩ وصحيح مسلم، الصيام، باب أكل الناسي وشربه ... الخ، ح:١١٥٥ واللفظ له)

"جو روزے دار بھول جائے اور کھا پی لے تو اسے چاہیئے کہ وہ اپنا روزہ مکمل کر لے' اسے اللہ تعالیٰ نے کھلایا پلایا ہے۔"

کوئی آدمی اگر بھول کر کسی ممنوع فعل کا ارتکاب کر بیٹھے تو وہ قابل مواخذہ نہیں ہے' ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿رَبَّنَا لَا تُؤَاخِذْنَآ إِن نَّسِينَآ أَوْ أَخْطَأْنَا﴾ (البقرة٢/ ٢٨٦)

"اے ہمارے رب! اگر ہم سے بھول چوک میں جو قصور ہو جائیں تو ہم سے مواخذہ نہ کرنا۔"

اس کے جواب میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

«قَدْ فَعَلْتُ»(صحيح مسلم، الإيمان، باب بيان تجاوز الله تعالى عن حديث النفس ... الخ، ح:١٢٦)

"میں نے ایسے ہی کیا۔"

جو شخص کسی کو اس طرح بھول کر کھاتے پیتے ہوئے دیکھے تو اس کے لیے واجب ہے کہ اسے یاد دلا دے کیونکہ یہ منکر کو مٹا دینے کے قبیل سے ہے اور رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے:

«مَنْ رَّأَى مِنْكُمْ مُّنْكَرًا فَلْيُغَيِّرْهُ بِيَدِهِ، فَإِنْ لَّمْ يَسْتَطِعْ فَبِلِسَانِهِ، فَإِنْ لَّمْ يَسْتَطِعْ فَبِقَلْبِهِ»(صحيح مسلم، الإيمان، باب بيان كون النهي عن المنكر ... الخ، ح:٤٩)

"تم میں سے جو شخص کسی برائی کو دیکھے تو اسے چاہیئے کہ اپنے ہاتھ سے مٹا دے' اگر اس کی استطاعت نہ ہو تو زبان سے (سمجھائے) اور اگر اس کی بھی استطاعت نہ ہو تو پھر اپنے دل میں (اسے برا سمجھے)"

اور لاریب! روزہ کی حالت میں کھانا پینا ایک امر منکر ہے۔ ہاں البتہ یہ الگ بات ہے کہ بھولنے کی وجہ سے وہ قابل معافی ہے اور اس سے مواخذہ نہیں ہو گا لیکن جو شخص اسے دیکھے تو اس کے بارے میں اسے بتانے میں چونکہ کوئی عذر

نہیں ہے' لہٰذا اسے چاہیئے کہ اسے فوراً بتا دے۔

——— شیخ ابن عثیمین ———

آنکھ میں دوائی کا قطرہ ڈالنا

سوال رمضان میں دن کے وقت اگر آنکھوں میں دوائی کا قطرہ ڈال لیا جائے تو کیا اس سے روزہ ٹوٹ جاتا ہے یا نہیں؟

جواب صحیح بات یہ ہے کہ دوائی کے اس قطرے سے روزہ نہیں ٹوٹتا' اس مسئلہ میں اگرچہ اہل علم میں اختلاف ہے۔ اور بعض نے کہا ہے کہ اگر اس قطرے کا ذائقہ حلق تک پہنچ جائے تو اس سے روزہ ٹوٹ جائے گا۔ لیکن صحیح بات یہ ہے کہ اس سے مطلقاً روزہ نہیں ٹوٹتا کیونکہ آنکھ کا معدہ کی طرف راستہ نہیں ہے۔ ہاں اگر کوئی شخص حلق میں ذائقہ آ جانے کی وجہ سے احتیاطاً اور اختلاف سے بچنے کے لیے قضا دے لے تو پھر بھی کوئی حرج نہیں لیکن صحیح بات یہی ہے کہ اس سے روزہ نہیں ٹوٹتا خواہ دوائی کا قطرہ آنکھ میں ڈال لیا جائے یا کان میں۔

——— شیخ ابن باز ———

دوائی کے قطرہ سے روزہ فاسد نہیں ہوتا

سوال کتاب "الضیاء اللامع" میں ایک خطبہ رمضان اور روزہ کے احکام سے متعلق ہے اور اس میں یہ بھی لکھا ہے کہ "اگر ازخود قے آ جائے یا آنکھوں اور کانوں میں دوائی کے قطرے ڈالے تو اس سے روزہ نہیں ٹوٹتا۔" آپ کی اس مسئلہ میں کیا رائے ہے؟

جواب اس میں جو یہ لکھا ہے کہ آنکھوں یا کانوں میں دوائی کے قطرے ڈالنے سے روزہ فاسد نہیں ہوتا تو یہ صحیح ہے کیونکہ اسے عرف عام یا اصطلاح شریعت میں کھانا پینا نہیں کہتے اور نہ اس حالت میں دوائی کھانے پینے کے راستہ ہی میں داخل کی جاتی ہے' ہاں البتہ اگر دن کے بجائے رات کو آنکھوں یا کانوں میں دوائی استعمال کر لی جائے تو اس میں زیادہ احتیاط بھی ہے اور اس میں کوئی اختلاف بھی نہیں ہے۔ اسی طرح اگر کسی کو خودبخود قے آ جائے تو اس سے بھی روزہ فاسد نہیں ہوتا کیونکہ اللہ تعالیٰ کسی انسان کو اس کی طاقت سے بڑھ کر تکلیف نہیں دیتا اور پھر شریعت کی بنیاد رفع حرج (تنگی ختم کرنے یعنی آسانی) پر ہے' ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ وَمَا جَعَلَ عَلَيْكُمْ فِي ٱلدِّينِ مِنْ حَرَجٍ ﴾ (الحج ٢٢/ ٧٨)

"اور (اللہ تعالیٰ نے) تم پر دین کی کسی بات میں تنگی نہیں کی۔"

اور بھی کئی دلائل سے یہی ثابت ہوتا ہے' نیز رسول اللہ ﷺ نے بھی یہ فرمایا:

«مَنْ ذَرَعَهُ الْقَيْءُ، فَلَا قَضَاءَ عَلَيْهِ، وَمَنِ اسْتَقَاءَ، فَعَلَيْهِ الْقَضَاءُ» (سنن أبي داود، الصيام، باب الصائم يستقيء عامدا، ح: ٢٣٨٠ وجامع الترمذي، ح: ٧٢٠ وسنن ابن ماجه، الصيام، باب ما جاء في الصائم يقيء، ح: ١٦٧٦ واللفظ له)

"جس شخص کو خودبخود قے آ جائے اس پر قضا نہیں ہے اور جو شخص خود قے کرے اس پر قضا ہے۔"

——— فتویٰ کمیٹی ———

رمضان میں دن کے وقت ٹیکہ لگانا

سوال کیا رمضان میں دن کے وقت ٹیکہ لگانا' روزے پر اثر انداز ہوتا ہے؟

جواب ٹیکے کی دو قسمیں ہیں (۱) جو غذائی مقصد کے لیے استعمال کیا جاتا ہے اور کھانے پینے سے بے نیاز کر دیتا ہے کیونکہ یہ کھانے پینے کے معنی ہی میں ہوتا ہے' اس سے روزہ ٹوٹ جاتا ہے کیونکہ نصوص شریعت جس معنی پر مشتمل ہوں وہ معنی جس صورت میں بھی پایا جائے تو اس پر ان نصوص کے مطابق حکم لگایا جاتا ہے (۲) وہ ٹیکہ جو غذائی مقصد کے لیے استعمال نہیں کیا جاتا اور نہ وہ کھانے پینے سے بے نیاز کرتا ہے تو اس سے روزہ نہیں ٹوٹتا کیونکہ اس پر نص کا لفظی یا معنوی طور پر اطلاق نہیں ہوتا یعنی نہ یہ کھانا پینا ہے اور نہ کھانے پینے کے معنی میں ہے اور اصول یہ ہے کہ روزہ اس وقت تک صحیح ہے جب تک کوئی ایسی بات سرزد نہ ہو جائے جس سے شرعی دلیل کے تقاضے کے مطابق روزہ ٹوٹ جاتا ہو۔

——— شیخ ابن عثیمین ———

روزے دار کا کثرت سے غسل کرنا

سوال رمضان میں دن کے وقت ایک سے زیادہ بار غسل کرنے اور طویل وقت تک ایسے ائرکنڈیشنر کے پاس بیٹھے رہنے کے بارے میں کیا حکم ہے جو رطوبت خارج کرتا ہو؟

جواب یہ جائز ہے' اس میں کوئی حرج نہیں کیونکہ رسول علیہ الصلوۃ والسلام روزے کی حالت میں گرمی یا پیاس کی وجہ سے اپنے سر مبارک پر پانی ڈال لیا کرتے تھے'[1] ابن عمر رضی اللہ عنہما حرارت یا پیاس کی شدت کم کرنے کے لیے اپنے کپڑے کو گیلا کر لیا کرتے تھے۔[2] رطوبت روزے پر اثرانداز نہیں ہوتی کیونکہ یہ پانی تو نہیں ہے جو معدے تک پہنچتا ہو۔

——— شیخ ابن عثیمین ———

کیا دوا سونگھنے سے روزہ ٹوٹ جاتا ہے؟

سوال دمہ کے مریض ناک کے ذریعے دوائی سونگھ کر استعمال کرتے ہیں کیا اس سے روزہ ٹوٹ جاتا ہے یا نہیں؟

جواب دمہ کی دوا جسے مریض ناک کے ذریعہ سونگھ کر استعمال کرتا ہے' وہ دوا ہوا کی نالی کے ذریعہ پھیپھڑوں تک پہنچ جاتی ہے' معدہ تک نہیں پہنچتی۔ دوا کا اس طرح استعمال نہ کھانا پینا ہے اور نہ یہ کھانے پینے کے مشابہ ہے بلکہ یہ تو دوا کے اس قطرہ کے مشابہ ہے جسے آلہء تناسل میں ڈالا جاتا ہو' نیز یہ مختلف زخموں پر رکھی جانے والی دوا' سرمہ اور اس ٹیکہ وغیرہ کے مشابہہ ہے' جس سے دوا دماغ یا بدن میں منہ اور ناک کے راستہ کے علاوہ کسی اور طریقہ سے پہنچتی ہے۔ ان اشیاء کے بارے میں علماء میں اختلاف ہے کہ ان کے استعمال سے روزہ ٹوٹتا ہے یا نہیں؟ بعض نے کہا ہے کہ ان میں سے کسی بھی چیز

---

[1] سنن ابی داود' الصیام' باب الصائم یصب علیه الماء ..... الخ' حدیث: 2365-

[2] صحیح بخاری' الصوم' باب اغتسال الصائم۔

کے استعمال سے روزہ نہیں ٹوٹتا اور بعض نے کہا ہے کہ ان میں سے بعض سے روزہ ٹوٹ جاتا ہے اور بعض سے نہیں ٹوٹتا جب کہ اس بات پر تمام علماء کا اتفاق ہے کہ ان میں سے کسی بھی چیز کا نام کھانا پینا نہیں ہے لیکن جو لوگ اس بات کے قائل ہیں کہ ان اشیاء سے روزہ ٹوٹ جاتا ہے وہ ان کو کھانے پینے کے حکم میں سمجھتے ہیں کیونکہ ان میں سے ہر ایک چیز اپنے اختیار سے پیٹ میں جاتی ہے اور رسول اللہ ﷺ کا ارشاد گرامی ہے:

«بَالِغْ فِي الاِسْتِنْشَاقِ إِلاَّ أَنْ تَكُونَ صَائِمًا» (سنن أبي داود، الصيام، باب الصائم يصب عليه الماء ... الخ، ح:٢٣٦٦ وجامع الترمذي، ح:٧٨٨ وسنن ابن ماجه، ح:٤٠٧ وسنن النسائي، ح:٨٧)

"خوب مبالغہ کے ساتھ ناک صاف کرو الا یہ کہ تم روزے دار ہو۔"

تو اس حدیث میں روزہ دار کو مبالغہ کے ساتھ ناک صاف کرنے سے اسی لیے تو منع کیا گیا ہے کہ پانی اس کے حلق یا معدہ تک نہ چلا جائے کیونکہ اس سے اس کا روزہ فاسد ہو جائے گا۔ اس سے معلوم ہوا کہ ہر وہ چیز جو اپنے اختیار سے پیٹ میں جائے' اس سے روزہ ٹوٹ جاتا ہے۔

جن علماء کی یہ رائے ہے کہ ان اشیاء کے استعمال سے روزہ فاسد نہیں ہوتا ان میں شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ اور ان کے ہم نوا شامل ہیں۔ یہ فرماتے ہیں کہ ان اشیاء کا کھانے پینے پر قیاس کرنا صحیح نہیں ہے اور کوئی ایسی دلیل بھی نہیں ہے جس سے معلوم ہو کہ ہر اس چیز سے بھی روزہ ٹوٹ جاتا ہے جو دماغ یا بدن تک پہنچے یا کسی بھی جسمانی راستے (مساموں) سے اندر داخل ہو پیٹ تک پہنچ جائے' شریعت نے ان اوصاف میں سے کسی وصف کے بارے میں بھی یہ حکم بیان نہیں کیا کہ اس سے روزہ ٹوٹ جاتا ہے' اسی طرح اسے مبالغہ کے ساتھ ناک صاف کرتے ہوئے پانی کے حلق یا معدہ تک پہنچ جانے کے ہم معنی قرار دینا بھی صحیح نہیں ہے کیونکہ ان دونوں صورتوں میں فرق ہے' پانی تو غذا ہے لہٰذا جب وہ حلق یا معدہ تک پہنچے تو اس سے روزہ فاسد ہو جائے گا خواہ وہ منہ کے راستہ داخل ہو یا ناک کے کیونکہ ان میں سے ہر ایک راستہ ہے یہی وجہ ہے کہ مبالغہ کے بغیر محض کلی کرنے یا ناک میں پانی ڈالنے سے روزہ نہیں ٹوٹتا اور نہ منہ اور ناک میں پانی ڈالنے سے منع کیا گیا ہے۔ منہ کا راستہ ہونا تو ایک عام وصف ہے جس کی کوئی تاثیر نہیں' لہٰذا جب پانی وغیرہ ناک سے پہنچ جائے تو اس کا حکم یہی ہے جس طرح منہ سے پہنچنے کا حکم ہے پھر ناک اور منہ برابر ہیں اور بظاہر یوں معلوم ہوتا ہے کہ ناک کے ذریعہ اس دوا کے استعمال سے روزہ نہیں ٹوٹتا جیسا کہ قبل ازیں بیان کیا جا چکا ہے' کیونکہ یہ کسی طرح بھی کھانے پینے کے حکم میں نہیں ہے۔ وصلى الله على نبينا محمد وعلى آله وصحبه وسلم۔

———— فتویٰ کمیٹی ————

روزے کی حالت میں احتلام' خون اور قے آنا

سوال میں روزے کی حالت میں مسجد میں سویا ہوا تھا' جب بیدار ہوا تو دیکھا کہ مجھے احتلام ہو گیا ہے۔ سوال یہ ہے کیا احتلام روزے پر اثرانداز ہوتا ہے یاد رہے کہ میں نے غسل بھی نہیں کیا اور غسل کے بغیر ہی نماز پڑھ لی تھی؟ ایک مرتبہ میرے سر پر پتھر لگ گیا تھا جس کی وجہ سے خون نکل آیا۔ کیا خون نکل آنے کی وجہ سے روزہ ٹوٹ جاتا ہے؟ نیز قے کے بارے میں بھی بتائیے کہ اس سے روزہ ٹوٹ جاتا ہے یا نہیں؟

جواب احتلام سے روزہ نہیں ٹوٹتا کیونکہ یہ آدمی کے اپنے اختیار سے نہیں ہوتا' ہاں البتہ اگر منی خارج ہو جائے تو غسل جنابت واجب ہو گا۔ نبی کریم ﷺ سے جب یہ مسئلہ پوچھا گیا تھا تو آپ نے فرمایا تھا کہ "محتلم پر غسل واجب ہے' جب وہ یہ دیکھے کہ منی خارج ہوئی ہے" آپ نے جو غسل کئے بغیر نماز پڑھ لی تو یہ بہت بڑی غلطی اور منکر عظیم ہے' للذا اس نماز کو دوبارہ پڑھیے اور اللہ سبحانہ کی بارگاہ قدس میں توبہ بھی کیجئے۔

پتھر لگنے سے جو خون نکلا تو اس سے روزہ فاسد نہیں ہوا' اسی طرح غیر اختیاری طور پر جو قے آ جائے اس سے بھی روزہ باطل نہیں ہوتا کیونکہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا ہے:

«مَنْ ذَرَعَهُ الْقَيْءُ، فَلاَ قَضَاءَ عَلَيْهِ، وَمَنِ اسْتَقَاءَ، فَعَلَيْهِ الْقَضَاءُ»(سنن أبي داود، الصيام، باب الصائم يستقيء عامدا، ح:٢٣٨٠ وجامع الترمذي، ح:٧٢٠ وسنن ابن ماجه، الصيام، باب ما جاء في الصائم يقيء، ح:١٦٧٦ واللفظ له)

"جسے خود بخود قے آ جائے اس پر قضا نہیں ہے اور جو شخص خود قے کرے اس پر قضا ہے۔"

——— شیخ ابن باز ———

وہ خون جس سے روزہ فاسد ہو جاتا ہے

سوال خون کے بارے میں کیا ضابطہ ہے یعنی جسم سے خارج ہونے والا وہ کون سا خون ہے جس سے روزہ فاسد ہو جاتا ہے؟ اور روزہ کس طرح فاسد ہوتا ہے؟

جواب روزے کو فاسد کرنے والا وہ خون ہے جو سینگی لگانے سے خارج ہو کیونکہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا:

«أَفْطَرَ الْحَاجِمُ وَالْمَحْجُومُ»(سنن أبي داود، الصيام، باب في الصائم يحتجم، ح:٢٣٦٧)

"سینگی لگانے والے اور لگوانے والے کا روزہ ٹوٹ گیا۔"

ہر اس کام کو بھی سینگی پر قیاس کیا جائے گا جو اس کے ہم معنی ہو' جسے انسان اپنے اختیار سے سرانجام دے اور جس کی وجہ سے بہت سا خون خارج ہو کر جسم کمزور ہو جائے تو اس سے بھی روزہ فاسد ہو جائے گا جس طرح سینگی سے فاسد ہو جاتا ہے کیونکہ اسلامی شریعت متماثل (ملتی جلتی اور ایک جیسی) چیزوں کو جدا جدا نہیں کرتی' جس طرح دو متفرق چیزوں کو جمع نہیں کرتی..... وہ خون جو انسان کے قصد و ارادہ کے بغیر نکل آئے مثلاً نکسیر کا خون یا گوشت کاٹتے ہوئے چھری لگ جانے سے یا شیشے وغیرہ پر پاؤں آ جانے سے جو خون نکل آئے تو اس سے روزہ نہیں ٹوٹتا خواہ خون زیادہ مقدار ہی میں نکل آئے اسی طرح اگر خون تھوڑی مقدار میں نکلا ہو جیسے کیمیائی تجزیہ کے لیے بہت تھوڑی سی مقدار میں خون نکالا جاتا ہے تو اس سے سینگی کی طرح روزہ فاسد نہیں ہو گا۔

——— شیخ ابن عثیمین ———

روزے دار کا سینگی لگوانا اور اس سے خون نکلنا

حدیث میں ہے "أَفْطَرَ الْحَاجِمُ وَالْمَحْجُوْمُ" (سینگی لگانے والے اور لگوانے والے کا روزہ ٹوٹ گیا) کیا یہ حدیث

صحیح ہے؟ اگر صحیح ہے تو اس کا مفہوم کیا ہے؟

جواب یہ حدیث صحیح ہے۔ اسے امام احمد اور کئی دیگر محدثین نے صحیح قرار دیا ہے۔ اس کا معنی یہ ہے کہ روزے دار جب کسی دوسرے کو سینگی لگائے تو اس کا روزہ ٹوٹ گیا اور اگر اسے کوئی سینگی لگائے تو اس کا روزہ بھی ٹوٹ گیا کیونکہ سینگی میں دو ہی آدمی ہوتے ہیں ایک سینگی لگانے والا اور دوسرا لگوانے والا۔ محجوم اس کو کہتے ہیں جس کا خون نکالا گیا ہو اور حاجم اسے کہتے ہیں جس نے خون نکالا ہو۔ اگر روزہ فرض ہو تو پھر سینگی لگوانا جائز نہیں الاّ یہ کہ اس کی شدید ضرورت ہو مثلاً فشار خون (خون کا دباؤ) بڑھ جانے کی وجہ سے بہت تکلیف ہو تو پھر سینگی لگوانے میں کوئی حرج نہیں کیونکہ یہ ایک اضطراری صورت ہو گی' اس دن کی اسے قضا دینا ہو گی' سینگی لگوانے سے روزہ ٹوٹ گیا' لہٰذا وہ دن کے باقی حصہ میں کھا پی سکتا ہے کیونکہ جو شخص کسی شرعی عذر کی وجہ سے روزہ توڑے اس کے لیے دن کے باقی حصہ میں کھانا پینا جائز ہے کیونکہ اس دن روزہ توڑ دینے کی شریعت نے اجازت دی ہے اور شرعی دلائل کے تقاضا کے مطابق اب اس کے لیے کھانے پینے سے رک جانا واجب نہیں ہے۔

میں چاہتا ہوں کہ اس مسئلہ کی مناسبت سے یہاں یہ بھی ذکر کر دوں کہ بعض لوگ معمولی خراش کی وجہ سے بہت تھوڑا سا خون نکل آنے کی وجہ سے بھی یہ سمجھتے ہیں کہ ان کا روزہ باطل ہو گیا حالانکہ یہ بات صحیح نہیں ہے بلکہ ہم یہ عرض کریں گے کہ اگر انسان کے لیے اپنے فعل کے بغیر خون نکلتا ہے خواہ وہ تھوڑا ہو یا زیادہ اس سے روزہ نہیں ٹوٹتا مثلاً اگر کسی کی نکسیر پھوٹ گئی اور اس کی وجہ سے بہت سا خون نکل گیا تو اس سے روزے کو کوئی نقصان نہیں پہنچے گا یا مثلاً کسی زخم کے پھٹ جانے کی وجہ سے اگر بہت سا خون بہہ جائے تو اس سے بھی روزہ نہیں ٹوٹے گا مثلاً کسی حادثہ کی وجہ سے بہت سا خون بہہ جائے تو اس سے بھی روزہ نہیں ٹوٹے گا کیونکہ ان سب صورتوں میں غیر اختیاری طور پر خون نکلا ہے لیکن اگر خون اپنے ارادہ و اختیار سے نکالا جائے اور اس سے سینگی لگوانے کی وجہ سے بدن میں ضعف اور قوت میں کمی آ جائے تو اس سے روزہ ٹوٹ جائے گا کیونکہ معنوی طور پر اس میں اور سینگی لگوانے میں کوئی فرق نہیں ہے اور اگر خون اس قدر معمولی مقدار میں ہو کہ اس سے جسم متاثر نہ ہوتا ہو تو اس سے روزہ نہیں ٹوٹے گا۔ بہرحال ہر انسان کو چاہیئے کہ وہ ان احکام و حدود کو جانتا ہو جنہیں اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول ﷺ پر نازل فرمایا ہے تاکہ وہ علی وجہ البصیرت اپنے رب کی عبادت کر سکے۔ واللہ الموفق۔

——— شیخ ابن عثیمین ———

روزے دار کے جسم سے خون لینا

سوال جب رمضان میں روزے دار کے دائیں ہاتھ سے کیمیائی تجزیہ کے لیے معمولی مقدار میں خون لیا جائے تو اس کا کیا حکم ہے؟

جواب کیمیائی تجزیہ کے لیے اس طرح معمولی مقدار میں خون لینے سے روزہ فاسد نہیں ہوتا بلکہ ضرورت و حاجت کی وجہ سے یہ عمل قابل معافی ہے اور اس کا تعلق ان امور میں سے نہیں ہے جن کی وجہ سے شریعت مطہرہ کے احکام کی روشنی میں روزہ ٹوٹ جاتا ہے۔

——— شیخ ابن باز ———

روزے دار کا خون کا عطیہ دینا

سوال کیا رمضان میں دن کے وقت خون کا عطیہ دینا جائز ہے یا اس سے روزہ ٹوٹ جاتا ہے؟

جواب جب کوئی شخص خون کا عطیہ دے اور اس سے بہت زیادہ خون لیا جائے تو سینگی پر قیاس کی وجہ سے روزہ باطل ہو جائے گا۔ یاد رہے خون صرف اسی صورت میں لیا جا سکتا ہے جب کسی مریض کو دے کر اس کی جان بچانا مقصود ہو یا ہنگامی حالات کے لیے اسے محفوظ رکھنا مقصود ہو اور اگر خون کی مقدار کم ہو مثلاً صرف اس قدر ہو جتنا کہ کیمیائی تجزیہ کے لیے انجکشن اور امتحانی نالی وغیرہ میں لیا جاتا ہے تو اس سے روزہ نہیں ٹوٹتا۔

——— شیخ ابن جبرین ———

خود بخود آنے والی قے سے روزہ نہیں ٹوٹتا

سوال کیا قے سے روزہ فاسد ہو جاتا ہے؟

جواب روزے دار کو بہت سے ایسے امور پیش آتے ہیں جن کا اس نے اپنے قصد و ارادہ سے ارتکاب نہیں کیا ہوتا مثلاً زخم لگ جانا' نکسیر پھوٹنا' قے آ جانا یا پانی وغیرہ کا غیر اختیاری طور پر گلے میں چلے جانا تو ان سے روزہ فاسد نہیں ہوتا کیونکہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا ہے:

«مَنْ ذَرَعَهُ الْقَيْءُ، فَلاَ قَضَاءَ عَلَيْهِ، وَمَنِ اسْتَقَاءَ، فَعَلَيْهِ الْقَضَاءُ»(سنن أبي داود، الصيام، باب الصائم يستقيء عامدا، ح:٢٣٨٠ وجامع الترمذي، ح:٧٢٠ وسنن ابن ماجه، الصيام، باب ما جاء في الصائم يقيء، ح:١٦٧٦ واللفظ له)

”جسے خود بخود قے آ جائے اس پر قضا نہیں ہے اور جو شخص خود قے کرے اس پر قضا ہے۔“

——— شیخ ابن باز ———

روزے کی حالت میں بوسہ لینا

جواب جب کوئی جوان یا بوڑھا شخص روزے کی حالت میں اپنی بیوی کا بوسہ لے تو کیا اسے گناہ ہو گا؟

سوال اپنی بیوی کا بوسہ لینے کی وجہ سے روزے دار کو گناہ نہیں ہو گا خواہ وہ جوان ہو یا بوڑھا کیونکہ صحیح مسلم میں روایت ہے کہ عمر بن ابی سلمہ نے نبی کریم ﷺ سے پوچھا' کیا روزے دار بوسہ لے سکتا ہے؟ تو آپ نے فرمایا ام سلمہ سے پوچھو تو انہوں نے بتایا کہ نبی کریم ﷺ بوسہ لیتے ہیں' تو انہوں نے عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ! اللہ تعالیٰ نے آپ کے تو اگلے پچھلے تمام گناہ معاف فرما دیئے ہیں تو نبی کریم ﷺ نے فرمایا:

«أَمَا وَاللهِ! إِنِّي لأَتْقَاكُمْ للهِ، وَأَخْشَاكُمْ لَهُ»(صحيح مسلم، الصيام، باب بيان أن القبلة في الصوم ... الخ، ح:١١٠٨)

"اللہ کی قسم! میں تم سب سے زیادہ اللہ تعالیٰ سے ڈرنے والا اور اس کی خشیت رکھنے والا ہوں۔"

——— شیخ ابن عثیمین ———

شہوت سے خارج ہونے والی مذی سے روزہ باطل نہیں ہوتا

سوال جب کوئی انسان روزے کی حالت میں بوسہ لے یا بعض عریاں فلموں کو دیکھے اور مذی خارج ہو جائے تو کیا وہ روزے کی قضا دے؟ اور اگر متفرق دنوں میں ایسا ہو تو قضا مسلسل دے یا متفرق؟ جزاکم اللہ عن امة الاسلام خیرالجزاء

جواب علماء کے صحیح قول کے مطابق مذی نکلنے سے روزہ باطل نہیں ہوتا خواہ اس کا سبب بیوی کا بوسہ یا فلموں کو دیکھنا یا کوئی اور شہوت انگیز بات ہو، لیکن مسلمان کے لیے یہ جائز نہیں کہ وہ عریاں فلمیں دیکھے اور ایسے گانے بجانے کو سنے جنہیں اللہ تعالیٰ نے حرام کیا ہے۔

شہوت سے اگر منی خارج ہو تو اس سے روزہ باطل ہو جاتا ہے خواہ یہ مباشرت، بوسہ، نظربازی یا دیگر شہوت انگیز اسباب مثلاً مشت زنی وغیرہ کی وجہ سے ہو۔ احتلام اور محض سوچ بچار کی وجہ سے روزہ باطل نہیں ہوتا خواہ منی خارج ہو جائے۔ قضا رمضان میں یہ لازم نہیں کہ روزے مسلسل رکھے جائیں بلکہ الگ الگ دنوں میں رکھنا بھی جائز ہے۔ کیونکہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ فَمَن كَانَ مِنكُم مَّرِيضًا أَوْ عَلَىٰ سَفَرٍ فَعِدَّةٌ مِّنْ أَيَّامٍ أُخَرَ ﴾ (البقرة۲/ ۱۸٤)

"جو شخص تم میں سے بیمار ہو یا سفر میں ہو تو دوسرے دنوں میں روزوں کی گنتی پوری کرے۔"

——— شیخ ابن باز ———

مذی خارج ہونے سے روزہ فاسد نہیں ہوتا

سوال ایک آدمی نے پوچھا ہے کہ جب وہ اپنی بیوی سے خوش طبعی کرے یا اسے چومے تو وہ محسوس کرتا ہے کہ آلۂ تناسل سے کچھ خارج ہو رہا ہے تو اس سے طہارت اور روزے کی صحت وعدم صحت پر کیا اثر پڑتا ہے؟

جواب سائل نے اپنے سوال میں یہ ذکر نہیں کیا کہ بیوی سے خوش طبعی کے نتیجہ میں منی خارج ہوتی ہے یا مذی، اس نے صرف اس قدر ذکر کیا ہے کہ وہ اپنی شلوار میں صرف رطوبت محسوس کرتا ہے بظاہر یوں معلوم ہوتا ہے کہ مذی خارج ہوتی ہے نہ کہ منی۔ مذی پلید ہے، اس مقام کو دھونا واجب ہے جہاں یہ لگی ہو، اس سے وضو بھی ٹوٹ جاتا ہے، اس کے ناپاک ہونے کی وجہ سے آلۂ تناسل اور خصیتین کو دھونا بھی فرض ہے اور پھر اس کے بعد وضو کرنا فرض ہے تاکہ طہارت حاصل ہو جائے۔ علماء کے صحیح قول کے مطابق مذی خارج ہونے سے روزہ فاسد ہوتا ہے نہ غسل واجب ہوتا ہے۔

مذکورہ صورت میں اگر منی خارج ہوتی ہے تو اس سے غسل واجب ہو گا اور روزہ بھی ٹوٹ جائے گا۔ منی پاک ہے لیکن اسے مکروہ سمجھا جاتا ہے۔ کپڑے یا شلوار وغیرہ کے جس حصے کو منی لگی ہو اسے دھونا چاہیئے۔ روزے دار کو چاہیئے کہ وہ روزے میں محتاط رہے اور خوش طبعی اور دیگر شہوت انگیز امور ترک کر دے۔

——— فتویٰ کمیٹی ———

رمضان میں دن کے وقت احتلام

 جب روزے دار کو رمضان میں دن کے وقت احتلام ہو جائے تو کیا اس سے روزہ باطل ہو جائے گا یا نہیں؟ کیا اس حالت میں فوراً غسل کرنا واجب ہے؟

جواب احتلام سے روزہ باطل نہیں ہوتا کیونکہ یہ روزے دار کے اپنے اختیار میں نہیں ہوتا' ہاں البتہ اس صورت میں غسل جنابت کرنا فرض ہو گا۔ اگر کسی کو نماز فجر کے بعد احتلام ہو اور اس نے نماز ظہر کے وقت تک غسل کو مؤخر کر دیا تو اس میں کوئی حرج نہیں۔ اسی طرح اگر کسی نے رات کو اپنی بیوی سے مباشرت کی اور اس نے طلوع فجر کے بعد غسل کیا تو اس میں بھی کوئی حرج نہیں' کیونکہ نبی کریم ﷺ سے یہ ثابت ہے کہ آپ بحالت جنابت صبح کرتے اور پھر غسل فرما کر روزہ رکھ لیتے [1] اسی طرح حیض و نفاس والی عورتیں اگر رات کو پاک تو ہو جائیں لیکن غسل طلوع فجر کے بعد کریں تو اس میں بھی کوئی حرج نہیں۔ ان کا روزہ صحیح ہو گا۔ لیکن حیض و نفاس اور جنابت والوں کے لیے یہ جائز نہیں کہ وہ غسل اور نماز کو طلوع آفتاب تک مؤخر کریں بلکہ ان سب کے لیے یہ ضروری ہے کہ وہ جلدی کریں اور طلوع آفتاب سے پہلے غسل کریں تاکہ نماز فجر بروقت ادا کر سکیں۔

خصوصاً مرد کو چاہیئے کہ وہ نماز فجر سے پہلے غسل جنابت کرے تاکہ نماز باجماعت ادا کر سکے۔ واللہ ولی التوفیق

——— شیخ ابن باز ———

رمضان میں دن کے وقت بیوی سے مباشرت

سوال جو شخص ماہ رمضان میں حرام کا ارتکاب کر بیٹھے اسکا کیا حکم ہے اور جو رات کے وقت اسکا ارتکاب کرے اسکا کیا کفارہ ہے؟

جواب جو شخص ماہ رمضان میں رات کے وقت یعنی غروب آفتاب سے لے کر طلوع فجر کے درمیان اپنی بیوی سے مباشرت کرے تو اس میں کوئی حرج نہیں اور اگر وہ دن کے وقت یعنی طلوع فجر سے غروب آفتاب کے درمیان مباشرت کرے اور وہ روزے دار اور مکلف ہو تو وہ گناہ گار اور اللہ اور اسکے رسول ﷺ کا نافرمان ہو گا۔ اس پر قضا اور کفارہ لازم ہو گا اور وہ ہے ایک غلام آزاد کرنا اور اگر یہ میسر نہ ہو تو دو ماہ کے مسلسل روزے رکھنا اور اگر اسکی بھی استطاعت نہ ہو تو ساٹھ مسکینوں کو کھانا کھلانا کہ ہر مسکین کو اس طرح کا نصف صاع کھانا دیا جائے جس طرح کے کھانا کھانے کا اس علاقے میں رواج ہو۔

——— فتویٰ کمیٹی ———

روزے دار کی اپنی بیوی سے زبردستی مباشرت

سوال جب کوئی شخص روزے کی حالت میں دن کے وقت اپنی بیوی کو مجبور کر کے اس سے مباشرت کرے اور وہ گردن آزاد کر سکتے ہوں نہ کاروباری مصروفیت کی وجہ سے روزے رکھ سکتے ہوں تو کیا ان کے لیے کھانا کھلا دینا کافی ہو گا؟ کھانے کی مقدار اور نوعیت کیا ہونی چاہیئے؟

---

[1] صحیح بخاری' الصوم' باب اغتسال الصائم' حدیث: 1930-1931 و صحیح مسلم' الصیام' حدیث: 1108۔

جواب جب کوئی مرد اپنی بیوی کو مباشرت پر مجبور کرے جب کہ دونوں روزے سے ہوں تو عورت کا روزہ صحیح ہو گا اور اس پر کفارہ بھی نہیں ہو گا۔ ہاں البتہ مرد پر کفارہ ہو گا اور وہ یہ کہ ایک گردن آزاد کرے۔ اگر یہ میسر نہ ہو تو دوماہ کے مسلسل روزے رکھے اور اگر اس کی بھی استطاعت نہ ہو تو ساٹھ مسکینوں کو کھانا کھلائے جیسا کہ "صحیحین" میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث میں ہے۔[1] نیز اسے اس روزے کی قضا بھی دینا ہو گی۔

—————— شیخ ابن عثیمین ——————

روزے دار کا کام کے دوران سو جانا

سوال ایک ملازم نے یہ سوال پوچھا ہے کہ وہ فیکٹری میں کام کے دوران کئی بار سو گیا ہے۔ کیا ڈیوٹی کے دوران کام نہ کرنے کی وجہ سے اسکا روزہ تو فاسد نہ ہو گا؟

جواب اس سے روزہ تو فاسد نہیں ہو گا کیونکہ ترک عمل اور روزے میں کوئی تعلق نہیں لیکن انسان پر یہ واجب ہے کہ جس کام کا اس نے ذمہ اٹھایا ہے اسے پورا پورا سرانجام دے کیونکہ اس کام کی اسے تنخواہ ملتی ہے۔ لہٰذا جس طرح وہ تنخواہ پوری وصول کرتا ہے اسی طرح اس پر پورا کام کرنا بھی فرض ہے تاکہ اپنے ذمہ سے عہدہ برآ ہو سکے۔ اپنے ذمہ کام کو چھوڑ کر سو جانا حرام ہے اور اس حرام فعل کے ارتکاب کی وجہ سے اس کے روزے کا ثواب کم ہو جائے گا۔

—————— شیخ ابن عثیمین ——————

رمضان کے روزے کون لوگ چھوڑ سکتے ہیں

جس مریض کو روزہ رکھنے کی طاقت نہ ہو

سوال سل کے ایک مریض کے لیے رمضان کے روزے رکھنا بہت مشکل ہے۔ وہ گزشتہ رمضان میں بھی روزے نہیں رکھ سکا تھا تو کیا وہ فدیہ کے طور پر کھانا کھلا دے؟ یاد رہے کہ اب اس کے صحت یاب ہونے کی امید نہیں ہے؟

جواب جب اس مریض کو رمضان کے روزے رکھنے کی طاقت نہیں ہے اور اس کے صحت یاب ہونے کی امید بھی نہیں ہے تو اس سے روزے ساقط ہو جائیں گے اور اس کے لیے واجب یہ ہے کہ ہر ایک روزے کے بجائے ایک مسکین کو گندم یا کھجور یا چاول وغیرہ جسے گھر میں کھانے کا معمول ہو' نصف صاع دے دے بشرطیکہ اسے اس کی طاقت ہو جیسے کہ اس بے حد بوڑھے مرد اور عورت کے لیے بھی یہی حکم ہے جس کے لیے روزہ رکھنا مشکل ہو!

—————— فتویٰ کمیٹی ——————

[1] صحیح بخاری' الصوم' باب اذا جامع فی رمضان' .....الخ' حدیث 1936 و صحیح مسلم' الصیام' حدیث: 1111۔

جس مریض کے لیے روزہ رکھنا مشکل ہو

سوال میں ایک بیمار عورت ہوں' گزشتہ رمضان میں کچھ روزے نہیں رکھ سکی تھی اور بیماری کی وجہ سے ان کی قضا بھی نہیں دے سکی تو اس کا کفارہ کیا ہے؟ اسی طرح اس رمضان کے روزے بھی نہیں رکھ سکوں گی تو اس کا کیا کفارہ ہے؟ جزاکم اللہ خیراً۔

جواب جس مریض کے لیے روزہ رکھنا مشکل ہو اس کے لیے اجازت ہے کہ روزہ چھوڑ دے اور جب اللہ تعالیٰ اسے شفا دے تو اس کی قضا دے لے جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ وَمَن كَانَ مَرِيضًا أَوْ عَلَىٰ سَفَرٍ فَعِدَّةٌ مِّنْ أَيَّامٍ أُخَرَ ﴾ (البقرۃ۲/ ۱۸۵)

''جو شخص تم میں سے بیمار ہو یا سفر میں ہو تو دوسرے دنوں میں روزوں کا شمار پورا کر لے۔''

اے خاتون! آپ کے لیے رمضان کے روزے چھوڑنے میں کوئی حرج نہیں جب تک کہ بیماری باقی ہو کیونکہ مریض اور مسافر کو اللہ تعالیٰ نے روزہ چھوڑ دینے کی اجازت دی ہے۔ اور اللہ تعالیٰ اس بات کو پسند فرماتا ہے کہ اس کی عطا کردہ رخصتوں کو قبول کر لیا جائے' جس طرح وہ اس کو ناپسند کرتا ہے کہ اس کی معصیت و نافرمانی کے کام کئے جائیں۔ آپ کے ذمہ کفارہ نہیں لیکن جب اللہ تعالیٰ شفا عطا فرمائے تو آپ کو ان روزوں کی قضا دینا ہوگی۔ اللہ تعالیٰ آپ کو ہر بیماری سے شفا عطا فرمائے اور ہمارے اور آپ کے گناہوں کو معاف فرما دے۔

——— شیخ ابن باز ———

جو شخص بڑھاپے یا بیماری کی وجہ سے روزہ نہ رکھ سکے

سوال میری والدہ رمضان سے چند دن پہلے بیمار ہو گئیں اور بیماری نے اس کو لاغر کر دیا کیونکہ وہ بہت عمر رسیدہ ہیں' انہوں نے رمضان کے پندرہ روزے رکھے ہیں اور باقی روزے نہیں رکھ سکیں' انہیں ان کی قضا کی بھی طاقت نہیں ہے تو کیا وہ صدقہ کر سکتی ہے؟ ایک دن کے عوض کتنا صدقہ کافی ہو گا؟ یاد رہے کہ اپنی والدہ پر میں خرچ کرتا ہوں۔ لہٰذا اگر ان کے پاس صدقہ کرنے کے لیے کچھ نہ ہو تو کیا میں ان کی طرف سے صدقہ کر سکتا ہوں؟

جواب جو شخص بڑھاپے یا ایسی کمزوری کی وجہ سے روزہ رکھنے سے عاجز و قاصر ہو جس سے صحت یاب ہونے کی امید نہ ہو تو وہ روزہ چھوڑ دے اور ہر دن کے عوض ایک مسکین کو کھانا کھلا دے' ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ وَعَلَى الَّذِينَ يُطِيقُونَهُ فِدْيَةٌ طَعَامُ مِسْكِينٍ ﴾ (البقرۃ۲/ ۱۸۴)

''اور جو لوگ روزہ رکھنے کی طاقت رکھیں (لیکن رکھیں نہیں) وہ روزے کے بدلے محتاج کو کھانا کھلا دیں۔''

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ یہ رخصت اس بوڑھے مرد اور عورت کے لیے نازل ہوئی جنہیں روزہ رکھنے کی طاقت نہ ہو تو وہ ہر دن کے عوض ایک مسکین کو کھانا کھلا دیں۔[1]

آپ کی والدہ پر واجب ہے کہ وہ ہر دن کے عوض ایک مسکین کو نصف صاع کے حساب سے وہ کھانا کھلا دیں جو

---

[1] صحیح بخاری' التفسیر' سورۃ البقرۃ' باب: 25 حدیث: 4505۔

آپ کے علاقے میں کھانے کا معمول ہو۔ اگر مسکینوں کو کھانا کھلانے کے لیے ان کے پاس کچھ نہ ہو تو ان پر کچھ واجب نہیں ہے اور اگر آپ ان کی طرف سے کھانا کھلا دیں تو یہ نیکی ہو گی اور اللہ تعالیٰ نیکو کاروں کو پسند فرماتا ہے۔

——— فتویٰ کمیٹی ———

درد گردہ کا مریض اور روزہ

سوال میں درد گردہ کا مریض ہوں۔ مجھے ڈاکٹروں نے کہا ہے کہ روزے نہ رکھوں لیکن میں ان کی بات تسلیم نہیں کرتا اور روزے رکھ لیتا ہوں تو اس سے میرے درد میں اور اضافہ ہو جاتا ہے۔ اگر میں روزے چھوڑ دوں تو کیا اس میں کوئی حرج ہے؟ نیز روزے چھوڑ دینے کی صورت میں کفارہ کیا ہے؟

جواب اگر آپ کے لیے روزہ رکھنا مشکل ہے' اس سے بیماری میں اضافہ ہو جاتا ہے' مسلمان اور تجربہ کار ڈاکٹر کا بھی یہی کہنا ہے کہ روزہ رکھنے سے آپ کی صحت کو نقصان پہنچے' درد میں اضافہ ہونے اور زندگی کو خطرہ لاحق ہونے کا خدشہ ہے' تو آپ کے لیے یہ جائز ہے کہ روزہ چھوڑ دیں اور ہر دن کے عوض ایک مسکین کو کھانا کھلا دیں۔ آپ پر قضا نہیں ہو گی کیونکہ صحت کی خرابی اور اس بیماری کی وجہ سے آپ کے لیے قضا ممکن ہی نہیں ہے' ہاں البتہ اگر بیماری زائل ہو جائے اور آپ کو تندرستی حاصل ہو جائے تو پھر آپ کے لیے آئندہ رمضان کے روزے رکھنا واجب ہو گا اور ان گزشتہ برسوں کی قضا لازم نہ ہو گی' جن کے روزے آپ نے نہیں رکھے اور ان کا کفارہ ادا کر دیا ہے۔

——— شیخ ابن جبرین ———

مریض کے لیے روزہ چھوڑنا جائز ہے

سوال میری عمر سولہ سال ہے' میں بیمار ہوں اور گزشتہ پانچ سالوں سے ہسپتال میں زیر علاج ہوں' گزشتہ سال ماہ رمضان میں ڈاکٹر نے میرے لیے ورید میں کیمیاوی علاج تجویز کیا جب کہ میں نے روزہ رکھا ہوا تھا۔ یہ علاج بہت قوی اور معدہ اور تمام جسم پر بہت اثر انداز ہوا تھا' جس دن میں نے علاج شروع کیا اس دن (اس کی وجہ سے) مجھے بہت سخت بھوک لگ گئی حالانکہ فجر کے بعد سے اب تک صرف سات گھنٹے گزرے تھے اور عصر کے وقت تک تو میری تکلیف اور بھوک اس قدر بڑھ گئی کہ میں مرنے کے قریب ہو گیا لیکن میں نے اذان مغرب سے پہلے روزہ افطار نہ کیا ان شاء اللہ اس رمضان میں بھی ڈاکٹر میرا اسی طرح علاج کرے گا تو کیا میں اس دن روزہ رکھوں یا نہ رکھوں؟ اور اگر نہ رکھوں تو کیا اس روزے کی قضا دینا ہو گی؟ کیا ورید سے خون لینے سے روزہ ٹوٹ جاتا ہے یا نہیں؟ کیا مذکورہ بالا علاج سے روزہ ٹوٹ جاتا ہے یا نہیں؟

جواب مریض کے لیے شریعت میں یہ رخصت ہے کہ وہ روزہ نہ رکھے بشرطیکہ روزہ اس کے لیے نقصان دہ ہو یا اسے برداشت کرنا مشکل ہو یا علاج کے لیے دن کے وقت اسے گولیاں' سیرپ یا دیگر دوائیاں استعمال کرنے کی ضرورت ہو' ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ وَمَن كَانَ مَرِيضًا أَوْ عَلَىٰ سَفَرٍ فَعِدَّةٌ مِّنْ أَيَّامٍ أُخَرَ ﴾ (البقرة۲/ ۱۸۵)

"جو شخص تم میں سے بیمار ہو یا سفر میں ہو تو دوسرے دنوں میں روزوں کی گنتی پوری کرے۔"

اور نبی کریم ﷺ نے فرمایا:

«إِنَّ اللهَ يُحِبُّ أَنْ تُؤْتَى رُخَصُهُ كَمَا يَكْرَهُ أَنْ تُؤْتَى مَعْصِيَتُهُ»(مسند أحمد: ۲/ ۱۰۸)

"اللہ تعالیٰ اس بات کو پسند فرماتا ہے کہ اس کی عطا کردہ رخصتوں کو اختیار کر لیا جائے جس طرح وہ اس بات کو ناپسند کرتا ہے کہ اس کی معصیت و نافرمانی کے کاموں کو اختیار کیا جائے۔"

ایک روایت میں یہ الفاظ ہیں:

«كَمَا يُحِبُّ أَنْ تُؤْتَى عَزَائِمُهُ»(صحیح ابن حبان، ح: ۹۱۳، ۹۱٤)

"جس طرح وہ اس بات کو پسند کرتا ہے کہ اس کے مقرر کردہ فرائض کی بجا آوری کی جائے۔"

کیمیائی تجزیہ وغیرہ کے لیے ورید سے خون لینے کے بارے میں صحیح بات یہ ہے کہ اس سے روزہ نہیں ٹوٹتا اور اگر خون زیادہ مقدار میں لینا مقصود ہو تو پھر بہتر یہ ہے کہ دن کے بجائے رات کے وقت لے لیا جائے اور اگر زیادہ مقدار میں خون دن کے وقت لیا گیا ہو تو پھر زیادہ احتیاط اس میں ہے کہ اس روزے کی قضا دے لی جائے کیونکہ یہ عمل سینگی سے مشابہت رکھتا ہے۔

———— شیخ ابن باز ————

انتہائی بڑھاپے میں تکلیف (شرعی ذمہ داری) ساقط ہو جاتی ہے

سوال میری دادی بہت معمر تھی۔ اس نے عدم استطاعت کی وجہ سے گزشتہ دس سالوں سے روزے نہیں رکھے تھے اور اس سال ان کا انتقال ہو گیا ہے اور ان کے وارثوں نے جہالت کی وجہ سے ان کے روزوں کا کفارہ بھی ادا نہیں کیا۔ یاد رہے کہ انہیں معاشرتی کفالت کے ادارے کی طرف سے امداد بھی ملتی تھی۔ تو سوال یہ ہے کہ کیا ان وارثوں کے لیے یہ ضروری ہے کہ وہ گزشتہ تمام سالوں کے روزوں کا کفارہ ادا کریں اور کیا وہ کفارہ ادا نہ کرنے کی صورت میں گناہ گار ہوں گے؟ راہنمائی فرمائیں۔ جزاکم اللہ خیرًا۔

جواب اگر وہ مدت مذکورہ میں سلیم العقل تھیں اور کفارہ ادا کرنے کی استطاعت بھی رکھتی تھیں تو ان کے ترکہ میں سے ان دنوں کا کفارہ ادا کیا جائے گا جن میں انہوں نے روزے نہیں رکھے اور کفارہ بھی ادا نہیں کیا۔ کفارہ یہ ہے کہ ہر دن کے عوض ایک مسکین کو نصف صاع کے حساب سے وہ کھانا دے دیا جائے جو آپ کے علاقے میں کھایا جاتا ہے۔

اگر بے انتہا بڑھاپے کی وجہ سے ان کی عقل جاتی رہی تھی یا وہ اپنی زندگی میں فقر کے باعث کفارہ ادا نہیں کر سکتی تھیں کہ انہیں معاشرتی کفالت کے ادارے سے صرف بقدر ضرورت ہی ملتا تھا اور کفارہ ادا کرنے کے لیے اس میں سے کچھ نہیں بچتا تھا تو پھر ان پر یا ان کے وارثوں پر کچھ لازم نہیں کیونکہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ فَاتَّقُوا اللَّهَ مَا اسْتَطَعْتُمْ ﴾ (التغابن٦٤/ ١٦)

"سو جہاں تک ہو سکے اللہ سے ڈرو۔"

اور نبی کریم ﷺ نے فرمایا ہے:

«إِذَا نَهَيْتُكُمْ عَنْ شَيْءٍ فَاجْتَنِبُوهُ، وَإِذَا أَمَرْتُكُمْ بِشَيْءٍ فَأْتُوا مِنْهُ مَا اسْتَطَعْتُمْ»(صحيح البخاري، الاعتصام بالكتاب والسنة، باب الاقتداء بسنن رسول الله ﷺ، ح:٧٢٨٨ وصحيح مسلم، الحج، باب فرض الحج مرة ... الخ، ح:١٣٣٧)

"جب میں تمہیں کسی چیز سے منع کر دوں تو اس سے اجتناب کرو اور جب کسی چیز کا حکم دوں تو اسے مقدور بھر بجالاؤ۔"

بے حد بڑھاپے کے باعث اگر ان کی عقل زائل ہو گئی تھی تو ان سے روزہ' نماز اور دیگر تمام شرعی فرائض ساقط ہیں۔ وباللہ التوفیق۔

—— شیخ ابن باز ——

معدوم العقل پر روزہ واجب نہیں

سوال میری بیٹی کی عمر تیس سال ہے' اس کے بچے بھی ہیں لیکن چودہ سال سے اس کا ذہنی توازن درست نہیں ہے۔ پہلے تو اس طرح ہوتا کہ اس بیماری کی وجہ سے کچھ عرصہ ذہنی توازن درست نہ رہتا اور پھر درست ہو جاتا لیکن اب خلاف عادت تین ماہ سے مسلسل بیمار ہے اور کسی دوسرے انسان کی راہنمائی کے بغیر نہ صحیح طور پر وضو کر سکتی اور نہ نماز پڑھ سکتی ہے۔ اس رمضان المبارک میں اس نے صرف ایک روزہ رکھا اور وہ بھی صحیح طریقے سے نہیں رکھا اور باقی روزے بھی نہیں رکھے۔ براہ کرم اس مسئلہ میں رہنمائی فرمائیں کہ سرپرست ہونے کی وجہ سے مجھ پر کیا واجب ہے اور میری بیٹی کے لیے کیا حکم ہے؟

جواب اگر صورت حال اسی طرح ہے جیسے آپ نے ذکر کی ہے تو اس پر نماز واجب ہے نہ روزہ جب تک یہ اسی طرح مریض رہے ادا لازم ہے نہ قضا اور اس سلسلہ میں آپ پر یہ لازم ہے کہ اس کی حفاظت اور نگہداشت کریں کیونکہ آپ اس کے ولی ہیں اور نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے:

«كُلُّكُمْ رَاعٍ، وَكُلُّكُمْ مَسْؤُولٌ عَنْ رَعِيَّتِهِ ... الحديث»(صحيح البخاري، الجمعة، باب الجمعة في القرى والمدن، ح:٨٩٣ وصحيح مسلم، الإمارة، باب فضيلة الأمير العادل ... الخ، ح:١٨٢٩)

"تم میں سے ہر ایک نگہبان ہے اور اس سے اس کی رعایا کے بارے میں باز پرس ہو گی....." (الحديث)

جب انہیں مرض سے اِفاقہ ہو تو صرف اسی وقت کی نمازیں واجب ہوں گی جس میں یہ صحت یاب ہوں گی' اسی طرح اگر رمضان میں یہ صحت یاب ہوں تو صحت کے دنوں کے روزے فرض ہوں گے۔ لہٰذا جن دنوں اِفاقہ سے ہوں صرف انہی دنوں کے روزے رکھیں گی۔

—— فتویٰ کمیٹی ——

کیا مزدور کے لیے روزہ چھوڑنا جائز ہے؟

سوال میں نے رمضان المبارک کے دوسرے جمعہ کے خطبہ میں خطیب سے سنا کہ اس مزدور کے لیے روزہ چھوڑ دینا جائز ہے جسے کام کی وجہ سے بہت محنت مشقت اٹھانا پڑتی ہو اور اس کام کے علاوہ وہ کوئی اور کام بھی نہ کر سکتا ہو تو وہ رمضان کے ہر دن کے عوض ایک مسکین کو کھانا دے دے جس کی قیمت انہوں نے پندرہ درہم بیان کی۔ کیا اس فتویٰ کی کتاب و سنت سے کوئی صحیح دلیل ہے؟

جواب مزدور کے لیے محض کام کاج کی وجہ سے روزہ چھوڑ دینا جائز نہیں ہے۔ ہاں البتہ اگر اس کام کی وجہ سے اسے بہت ہی زیادہ مشقت اٹھانا پڑتی ہو جس کی وجہ سے وہ دن کے وقت روزہ افطار کر دینے کے لیے مجبور و مضطر ہو جائے تو وہ اس مشقت کے ازالہ کے لیے روزہ توڑ دے اور پھر غروب آفتاب تک کچھ نہ کھائے پیے اور پھر لوگوں کے ساتھ افطار کرے اور اس دن کے روزہ کی بعد میں قضا دے لے اور آپ نے جو فتویٰ ذکر کیا ہے وہ صحیح نہیں ہے۔

——— فتویٰ کمیٹی ———

کیا چرواہوں کے لیے رمضان کے روزے چھوڑنا جائز ہے؟

سوال رمضان المبارک بسا اوقات گرمی کے موسم میں آتا ہے چرواہوں کو ایسے لوگ نہیں ملتے جو اجرت لے کر اونٹوں اور بکریوں کو چرا دیں اور شدید پیاس کی وجہ سے انہیں بہت تکلیف ہوتی ہے' تو کیا ان کے لیے روزے چھوڑ دینا جائز ہے یا نہیں؟

جواب اگر روزے دار دن کے وقت روزہ چھوڑ دینے کے لیے اس قدر مجبور ہو جائے کہ اگر وہ روزہ نہ چھوڑے تو اس کے لیے جان کی ہلاکت کا خطرہ ہو تو اس کے لیے اس قسم کی ضرورت کے وقت اس قدر کھانا پینا جائز ہے جس سے اس کی جان بچ جائے اور پھر غروب آفتاب تک رک جائے اور رمضان کے بعد اس روزے کی قضا دے' کیونکہ ارشاد باری تعالیٰ کے عموم سے یہی معلوم ہوتا ہے۔

﴿ لَا يُكَلِّفُ اللَّهُ نَفْسًا إِلَّا وُسْعَهَا ﴾ (البقرة۲/ ۲۸۶)

"اللہ کسی شخص کو اس کی طاقت سے زیادہ تکلیف نہیں دیتا۔"

اور فرمایا:

﴿ مَا يُرِيدُ اللَّهُ لِيَجْعَلَ عَلَيْكُم مِّنْ حَرَجٍ ﴾ (المائدة۵/ ٦)

"اللہ تم پر کسی طرح کی تنگی نہیں کرنا چاہتا۔"

——— فتویٰ کمیٹی ———

جو شخص جان بوجھ کر رمضان کا روزہ توڑ دے

سوال ایک شخص نے رمضان کا روزہ رکھا ہوا تھا' اسے شدید پیاس لگی تو اس نے پانی پی لیا۔ اس کے بارے میں کیا حکم ہے؟

جواب علما کے صحیح قول کے مطابق ایسے شخص پر قضا تو لازم ہے مگر کفارہ لازم نہیں اور اگر اس نے محض تساہل کی وجہ سے ایسا کیا ہے تو پھر قضا کے ساتھ ساتھ اسے اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں توبہ بھی کرنی چاہیئے۔ کفارہ صرف اس شخص پر ہے جس پر روزہ واجب ہو اور جب پھر وہ روزے کی حالت میں دن کے وقت مباشرت کرے کیونکہ صحیح قول کے مطابق کفارہ کے بارے میں حدیث صرف اسی صورت سے متعلق ہے۔

——— شیخ ابن باز ———

کیا مجاہدین روزہ چھوڑ دیں؟

سوال وہ لوگ جو دشمن سے جنگ کر رہے ہوں کیا ان کے لیے یہ جائز ہے کہ وہ رمضان میں روزے نہ رکھیں اور پھر بعد میں ان کی قضا دے لیں؟

جواب جب کافروں سے جنگ کرنے والے مسلمان مسافر ہوں کہ ان کے لیے نماز قصر کرنا جائز ہو تو پھر ان کے لیے یہ بھی جائز ہے کہ وہ رمضان میں روزے نہ رکھیں اور رمضان کے بعد ان کی قضا دے لیں اور اگر وہ مسافر نہ ہوں بایں طور کہ دشمن نے ان کے شہروں پر حملہ کر دیا ہو تو اس صورت میں جہاد کے ساتھ ساتھ جس شخص کو روزہ رکھنے کی بھی استطاعت ہو تو اس کے لیے روزہ رکھنا واجب ہے اور جو شخص روزے اور جہاد ---جب یہ فرض عین ہو--- دونوں سے بیک وقت عہدہ برآ ہونے کی طاقت نہ رکھتا ہو تو اس کے لیے یہ جائز ہے کہ روزے نہ رکھے اور رمضان کے بعد اتنے دنوں کے روزوں کی قضا دے جتنے دن اس نے روزے نہیں رکھے۔

——— فتویٰ کمیٹی ———

مسافر اور روزہ

سفر میں روزہ

سوال جس مسافر کو رمضان میں روزہ چھوڑ دینے کی اجازت ہے' کیا اس کے لیے ایسی کوئی شرط ہے کہ وہ سفر پیدل کرے یا سواری پر؟ کیا جانور کی سواری یا گاڑی اور ہوائی جہاز کی سواری کے اعتبار سے کوئی فرق ہے؟ کیا سفر کے لیے یہ بھی شرط ہے کہ اس میں مسافر کے لیے ناقابل برداشت تھکاوٹ وغیرہ ہو؟ مسافر کو اگر روزہ رکھنے کی طاقت ہو تو اس کے لیے روزہ رکھنا زیادہ بہتر ہے یا روزہ چھوڑ دینا؟

جواب جس سفر میں نماز قصر کرنا جائز ہے اس میں مسافر کے لیے روزہ چھوڑنا بھی جائز ہے' خواہ سفر پیدل ہو یا سواری پر اور سواری خواہ گاڑی ہو یا ہوائی جہاز وغیرہ اور خواہ سفر میں ایسی تھکاوٹ لاحق ہوتی ہو جس میں روزہ مشکل ہو یا تھکاوٹ لاحق نہ ہوتی ہو' خواہ سفر میں بھوک پیاس لگتی ہو یا نہ لگتی ہو۔ کیونکہ شریعت نے اس سفر میں نماز قصر کرنے اور روزہ چھوڑنے کی مطلقاً اجازت دی ہے اور اس میں سواری کی نوعیت یا تھکاوٹ اور بھوک پیاس وغیرہ کی کوئی قید نہیں لگائی۔

حضرات صحابہ کرام نے رمضان میں جہاد کے سلسلہ میں آپ کے ساتھ سفر کیا تو بعض نے روزہ رکھا اور بعض نے روزہ نہیں رکھا تھا۔ اور اس کے بارے میں کسی ایک نے بھی دوسرے پر کوئی اعتراض نہیں کیا تھا۔ ہاں البتہ اگر گرمی کی شدت' راستہ کی دشواری' دوری اور مسلسل سفر کی وجہ سے روزہ میں تکلیف ہو تو پھر مسافر کے لیے تاکید کے ساتھ حکم یہ ہے کہ وہ سفر میں روزہ نہ رکھے جیسا کہ حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ایک سفر میں تھے' ہم میں سے بعض لوگوں نے روزہ رکھا اور بعض نے روزہ نہیں رکھا تھا' روزہ نہ رکھنے والے ہشاش بشاش تھے اور انہوں نے کام کیا جب کہ روزہ رکھنے والے کمزور ہو گئے تھے اور وہ بعض کام نہ کر سکے تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

«ذَهَبَ الْمُفْطِرُونَ الْيَوْمَ بِالأَجْرِ» (صحيح البخاري، الجهاد، باب فضل الخدمة في الغزو، ح: ٢٨٩٠ وصحيح مسلم، الصيام، باب أجر المفطر في السفر ... الخ، ح: ١١١٩)

"آج تو روزہ نہ رکھنے والوں نے اجر وثواب حاصل کر لیا۔"

کبھی کسی ہنگامی حالت کی وجہ سے یہ واجب بھی ہو جاتا ہے کہ سفر میں روزہ نہ رکھا جائے جیسا کہ حدیث ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے یہ ثابت ہے کہ ہم نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ مکہ کی طرف سفر کیا اور جب ایک جگہ پڑاؤ ڈالا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

«إِنَّكُمْ قَدْ دَنَوْتُمْ مِنْ عَدُوِّكُمْ، وَالْفِطْرُ أَقْوٰى لَكُمْ»

"تم اپنے دشمن کے بہت قریب ہو گئے ہو اور روزہ چھوڑ دینا تمہارے لیے باعث تقویت ہو گا۔"

یہ ایک رخصت تھی اس لیے ہم میں سے کچھ لوگوں نے روزہ رکھا اور کچھ نے نہ رکھا' پھر ہم نے جب ایک دوسری منزل پر پڑاؤ ڈالا تو آپ نے فرمایا:

«إِنَّكُمْ مُصَبِّحُو عَدُوِّكُمْ، وَالْفِطْرُ أَقْوٰى لَكُمْ، فَأَفْطِرُوا»(صحيح مسلم، الصيام، باب أجر المفطر في السفر إذا تولى العمل، ح: ١١٢٠)

"تمہاری دشمن سے مڈبھیڑ ہونے والی ہے' روزہ نہ رکھنا تمہارے لیے باعث تقویت ہو گا' لہٰذا روزہ چھوڑ دو۔"

چونکہ آپ کی طرف سے یہ ایک تاکیدی حکم تھا اس لیے ہم سب نے روزہ چھوڑ دیا' راوی کا بیان ہے کہ اس کے بعد ہم نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ سفر میں روزے رکھے بھی تھے۔

اسی طرح حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہما سے مروی حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک سفر میں ایک آدمی کو دیکھا جس پر لوگ جمع ہوئے تھے اور اس پر سایہ کیا گیا تھا تو آپ نے فرمایا کیا ماجرا ہے؟ لوگوں نے بتایا کہ یہ ایک روزے دار ہے' تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

«لَيْسَ مِنَ الْبِرِّ أَنْ تَصُومُوا فِي السَّفَرِ»(صحيح مسلم، الصيام، باب جواز الصوم والفطر في شهر رمضان ... الخ، ح: ١١١٥)

"یہ کوئی نیکی نہیں ہے کہ تم سفر میں روزہ رکھو۔"

——— فتویٰ کمیٹی ———

سفر میں روزے

سوال جیسا کہ آنجناب کے علم میں ہے کہ آج کل بحمداللہ اسباب و وسائل سفر بہت آرام دہ ہیں جن کی وجہ سے مسافر کو روزے سے کوئی تکلیف نہیں ہوتی تو کیا مسافر کے لیے روزہ رکھنا افضل ہے یا روزہ نہ رکھنا افضل ہے؟

جواب مسافر کو روزہ رکھنے یا نہ رکھنے کا اختیار ہے۔ ادلہ شرعیہ سے بظاہر یوں معلوم ہوتا ہے کہ مسافر کے لیے افضل یہ ہے کہ وہ روزہ نہ رکھے، خصوصاً جب کہ روزہ رکھنے میں مشقت بھی ہو کیونکہ نبی کریم ﷺ کا فرمان ہے:

«لَيْسَ مِنَ الْبِرِّ الصَّوْمُ فِي السَّفَرِ» (صحيح البخاري، الصوم، باب قول النبي ﷺ لمن ظلل عليه... الخ، ح:١٩٤٦)

"سفر میں روزہ رکھنا نیکی نہیں ہے۔"

نیز آپ نے فرمایا:

«إِنَّ اللهَ يُحِبُّ أَنْ تُؤْتَى رُخَصُهُ كَمَا يَكْرَهُ أَنْ تُؤْتَى مَعْصِيَتُهُ»(مسند أحمد: ٢/ ١٠٨)

"اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ اس کی عطا کردہ رخصتوں کو قبول کر لیا جائے جس طرح وہ اس بات کو ناپسند کرتا ہے کہ اس کی معصیت و نافرمانی کا ارتکاب کیا جائے۔"

اگر روزہ رکھنے میں کوئی تکلیف نہ ہو اور کوئی روزہ رکھ لے تو اس میں بھی کوئی حرج نہیں اور اگر تکلیف ہو تو پھر روزہ رکھنا مکروہ ہے۔ واللہ ولی التوفیق۔

——— شیخ ابن باز ———

کیا مسافر شہر میں پہنچ کر کھانے پینے سے رک جائے؟

سوال جب میں رمضان میں مسافر ہوں، سفر کی وجہ سے روزہ نہ رکھا ہو اور کسی ایسے شہر میں پہنچ کر جس میں کئی دن قیام کا ارادہ ہے، دن کے باقی حصہ میں کھانے پینے سے رک جاؤں اور اس قیام کے دوران باقی دنوں میں مجھے روزے نہ رکھنے کی اجازت ہے یا نہیں؟

جواب جب مسافر کا گزر اپنے شہر کے علاوہ کسی اور شہر کے پاس سے ہو اور اس نے روزہ نہ رکھا ہوا ہو تو اس کے لیے کھانے پینے سے رکنا واجب نہیں ہے جب کہ اس شہر میں اس کی اقامت چار دن یا اس سے کم ہو۔ اور اگر اس کا ارادہ چار دن سے زیادہ مقیم رہنے کا ہو تو وہ اپنی آمد کے دن کے اس بقیہ حصے میں بھی کھانے پینے سے پرہیز کرے گا، اس دن کی قضا دے گا اور قیام کے باقی دنوں میں روزہ رکھنا لازم ہو گا کیونکہ اپنی مذکورہ نیت کی وجہ سے وہ مقیم لوگوں کے حکم میں ہے، مسافروں کے حکم میں نہیں ہے جیسا کہ جمہور علماء کا یہی قول ہے۔ واللہ ولی التوفیق۔

——— شیخ ابن باز ———

غیر مقیم کے روزے کا حکم

سوال جب تجارتی مقاصد کی خاطر سفر کر کے میں شعبان کے آخر میں ایک شہر میں پہنچ جاؤں اور نصف شوال تک وہاں قیام کروں تو کیا اس صورت میں مجھے روزے نہ رکھنے کی اجازت ہے یا نہیں؟

جواب رمضان میں روزہ نہ رکھنے کی اجازت صرف اسی صورت میں ہے جب سفر کی مشقت یا مرض وغیرہ کا کوئی عذر ہو' جب کہ مسافر کے لیے بھی افضل یہ ہے کہ وہ روزہ رکھ لے کیونکہ نبی کریم ﷺ کا اکثر عمل یہی تھا' ہاں البتہ اگر سفر میں مشقت ہو تو پھر روزہ نہ رکھے تاکہ اللہ تعالیٰ کی عطا کردہ رخصت سے فائدہ اٹھایا جا سکے اور اگر وہ حالت سفر میں ہو تو اس کے لیے قصر کرنا اور روزہ نہ رکھنا جائز ہے۔ اسی طرح جب وہ کسی شہر میں مقیم نہ ہو بلکہ شہر سے باہر کسی خیمہ میں مقیم ہو یا گاڑی ہی میں رہا ہو اور گرمی' دھوپ اور گرم ہوا کی وجہ سے اسے تکلیف ہوتی ہو اور اپنی ضرورتوں کی تکمیل کے لیے بھی اسے آنا جانا پڑتا ہو تو اس صورت میں بھی اسے اجازت ہے کہ روزہ نہ رکھے۔ اور اگر صورت حال یہ ہو کہ وہ کسی شہر میں مقیم ہو' ایئر کنڈیشنڈ ہوٹل' عالی شان محل یا کسی بلڈنگ میں سکونت پذیر ہو' ضروریات بلکہ آرام و راحت کے تمام سامان میسر ہوں کہ بستر' بیڈ' کھانے پینے کی اشیا ائرکنڈیشنر اور دیگر تمام سہولتوں سے مستفید ہو رہا ہو تو اس حالت میں یہ مقیم شمار ہو گا اور اسے حالت سفر قرار نہیں دیا جائے گا کہ سفر تو عذاب کا ایک ٹکڑا ہوتا ہے' لہٰذا میری رائے میں ایسے شخص کو نہ نماز قصر کے ساتھ پڑھنی چاہیئے اور نہ روزہ ہی چھوڑنا چاہیئے بلکہ یہ مقیم لوگوں کے حکم میں ہے۔ واللہ اعلم

——— شیخ ابن جبرین ———

سبب ختم ہونے کے بعد کھانے پینے سے رک جانا واجب ہے

سوال جب میں سفر میں ہوں' سفر کی وجہ سے روزہ نہ رکھا ہوا ہو اور کسی دن عصر سے پہلے اپنے گھر پہنچ جاؤں تو کیا اس صورت میں کھا پی سکتا ہوں یا نہیں؟

جواب ہاں جب وہ سبب ختم ہو جائے جس کی وجہ سے روزہ نہیں رکھا تھا تو پھر کھانے پینے سے رک جانا واجب ہے مثلاً اگر دن کے وقت سفر ختم ہو جائے تو دن کے باقی حصہ میں کھانے پینے سے باز رہنا واجب ہے کیونکہ ارشاد باری تعالیٰ ہے ﴿ أَوْ عَلَىٰ سَفَرٍ ﴾ (البقرہ ۲/ ۱۸۴) تو اب تو سفر ختم ہو گیا ہے۔ اسی طرح جس مریض نے بیماری کی وجہ سے روزہ نہ رکھا ہو اور وہ دن کو کسی وقت شفایاب ہو جائے تو اس کے لیے بھی یہ ضروری ہے کہ دن کے باقی حصہ میں کچھ نہ کھائے پیے کیونکہ ان صورتوں میں روزہ نہ رکھنے کا عذر زائل ہو گیا ہے لیکن یاد رہے کہ اس دن کی دوسرے دنوں کی طرح مکمل قضا دینا واجب ہے۔

——— شیخ ابن جبرین ———

ڈرائیوروں کا روزہ

سوال کیا گاڑیوں اور ٹرکوں وغیرہ کے ڈرائیور بھی جو ایام رمضان میں شہروں سے باہر مسلسل گاڑیاں چلانے کے کام میں مصروف رہتے ہیں' مسافر کے حکم میں ہیں؟

جواب ہاں یہ حالت سفر میں ہیں' ان کے لیے اجازت ہے کہ نماز قصر اور جمع کی صورت میں ادا کریں اور روزہ نہ رکھیں۔ اگر کوئی یہ کہے کہ ان کا تو ہمیشہ یہی کام ہے' لہٰذا وہ روزے کب رکھیں؟ تو ہم اسے کہیں گے کہ یہ لوگ سردیوں کے دنوں میں روزے رکھ لیں جب کہ دن چھوٹے اور ٹھنڈے ہوتے ہیں۔ جو ڈرائیور شہروں کے اندر گاڑیاں چلاتے ہیں وہ مسافروں کے حکم میں نہیں ہیں' لہٰذا ان کے لیے روزے رکھنا واجب ہے۔

——— شیخ ابن عثیمین ———

حیض و نفاس والی عورتیں اور روزہ

حائضہ کے لیے روزہ رکھنا جائز نہیں

سوال کیا عورت جب رمضان میں حائضہ ہو جائے تو وہ روزے چھوڑ دے اور پھر اپنے ایام کے دنوں کے مطابق بعد روزے رکھ لے؟

جواب ہاں حائضہ عورت کا روزہ رکھنا صحیح نہیں ہے اور نہ اس کے لیے یہ جائز ہے کہ وہ اپنے ایام میں روزے رکھے بلکہ جوں ہی ایام شروع ہوں' اسے روزے چھوڑ دینے چاہئیں اور پھر رمضان کے بعد اتنے دنوں کے روزے رکھنے چاہئیں جتنے دن وہ حیض کی وجہ سے روزے نہیں رکھ سکی۔

——— فتویٰ کمیٹی ———

رمضان میں مانع حیض گولیوں کا استعمال

سوال بعض عورتیں رمضان میں مانع حیض گولیاں استعمال کرتی ہیں تاکہ انہیں رمضان کے بعد روزوں کی قضا نہ دینا پڑے۔ سوال یہ ہے کیا ان گولیوں کا استعمال جائز ہے؟ اور کیا اس سلسلہ میں کچھ قیود بھی ہیں' جن کی عورتوں کے لیے پابندی لازم ہے؟

جواب اس مسئلہ میں میری رائے یہ ہے کہ عورت کو مانع حیض گولیاں استعمال نہیں کرنا چاہئیں بلکہ اسے ایسی حالت میں رہنا چاہیئے جو اللہ تعالیٰ نے اس کے لیے اور دیگر تمام بنات آدم کے لیے مقرر فرما رکھی ہے۔ ماہواری کے اس نظام میں بھی اللہ تعالیٰ نے حکمت رکھی ہے۔ یہ حکمت عورت کی طبیعت کے مناسب ہے۔ لہٰذا عورت اگر اپنی ماہواری کی عادت روکے گی تو یقیناً اس کا ایک ردعمل بھی ہو گا جو عورت کی جسمانی صحت کے لیے نقصان دہ ہو گا اور نبی کریم ﷺ نے فرمایا ہے:

«لاَ ضَرَرَ وَلاَ ضِرَارَ»(سنن ابن ماجه، الأحكام، باب من بنى في حقه ما يضر بجاره، ح: ۲۳٤۰)

”نہ نقصان اٹھاؤ اور نہ نقصان پہنچاؤ۔“

جیسا کہ اطبا نے ذکر کیا ہے' ان گولیوں کا استعمال رحم کے لیے بھی نقصان دہ ثابت ہوتا ہے' لہٰذا میری رائے یہ ہے کہ

خواتین کو یہ گولیاں استعمال نہیں کرنا چاہئیں۔ اللہ تعالیٰ کے مقرر کردہ نظام اور اس میں موجود حکمت و مصلحت پر ہم اس کی تعریف کرتے ہیں۔ عورت کو جب حیض شروع ہو جائے تو اسے نماز اور روزہ سے رک جانا چاہیئے' جب پاک ہو جائے تو پھر نماز اور روزہ شروع کر دے اور جب رمضان ختم ہو جائے تو اپنے ان روزوں کی قضا دے جو حیض کی وجہ سے نہیں رکھ سکی تھی۔

——— شیخ ابن عثیمین ———

جب عورت فجر کے بعد پاک ہو!

سوال جب عورت فجر کے فوراً بعد پاک ہو تو کیا وہ اس دن کا روزہ رکھے یا نہ رکھے؟ کیا اس پر اس دن کے روزے کی قضا واجب ہے؟

جواب جب عورت کا خون طلوع فجر کے وقت یا اس سے تھوڑی دیر پہلے بند ہو جائے تو اس کا روزہ صحیح ہے اور فرض ادا ہو جائے گا خواہ وہ غسل صبح کے بعد کرے اور اگر اس کا خون صبح طلوع ہونے کے بعد بند ہوا ہو تو پھر اس دن کا روزہ جائز نہیں بلکہ اسے رمضان کے بعد اس روزے کی قضا دینا ہوگی۔ واللہ اعلم۔

——— شیخ ابن جبرین ———

نفاس والی عورت کا روزہ

سوال اگر رمضان سے ایک ہفتہ پہلے میرے ہاں بچے کی ولادت ہو اور میں چالیس دنوں سے پہلے پاک ہو جاؤں تو کیا رمضان کے ان باقی دنوں کے روزے رکھنا مجھ پر واجب ہے؟

جواب ہاں جب نفاس والی عورت پاک ہو جائے اور طہارت کی علامت یعنی پانی کی سفیدی یا مکمل صفائی کو دیکھ لے تو وہ نماز روزہ شروع کر دے خواہ وہ ولادت کے ایک دن یا ایک ہفتہ بعد ہی پاک ہو جائے کیونکہ نفاس کی کم از کم کوئی حد نہیں ہے بلکہ بعض عورتوں کو تو ولادت کے بعد بالکل خون نہیں آتا لہٰذا اس سلسلہ میں چالیس دن کی کوئی شرط نہیں ہے۔

——— شیخ ابن جبرین ———

جب روزے کی حالت میں دوبارہ نفاس شروع ہو جائے

سوال جب نفاس والی عورت ایک ہفتہ میں پاک ہو جائے اور رمضان کے روزے رکھنا شروع کر دے لیکن کچھ دنوں بعد دوبارہ خون جاری ہو جائے تو کیا وہ اس حالت میں روزہ چھوڑ دے؟ اور کیا اسے ان تمام دنوں کی قضا دینا پڑے گی جن میں اس نے روزے رکھے ہیں یا چھوڑے ہیں؟

جواب جب زچہ چالیس دنوں کے اندر پاک ہو جائے اور روزے رکھنا شروع کر دے لیکن چالیس دنوں کی تکمیل سے قبل دوبارہ پھر خون جاری ہو جائے تو اس نے جو روزے رکھے ہیں وہ صحیح ہیں البتہ اب خون جاری ہونے کے بعد وہ نماز روزہ چھوڑ دے حتیٰ کہ وہ پاک ہو جائے یا چالیس دن پورے ہو جائیں کیونکہ چالیس دن کے اندر اندر جو خون آئے وہ

زچگی کا خون ہے۔ جب چالیس دن پورے ہو جائیں تو اس کے لیے غسل کرنا واجب ہے خواہ وہ طہارت کی علامت نہ دیکھے' کیونکہ علماء کے صحیح ترین قول کے مطابق نفاس کی زیادہ سے زیادہ حد چالیس دن ہے۔ اگر چالیس دنوں کے بعد بھی خون جاری رہے تو اسے ہر نماز کے وقت میں وضو کر کے اسے ادا کرنا ہو گا حتیٰ کہ خون منقطع ہو جائے جیسا کہ نبی کریم ﷺ نے مستحاضہ کو حکم دیا تھا۔ [1] چالیس دنوں کے بعد خاوند اپنی بیوی سے ازدواجی تعلقات قائم کر سکتا ہے خواہ اس نے ابھی تک طہارت کی علامت نہ بھی دیکھی ہو کیونکہ چالیس دنوں کے بعد خون زچگی کا خون نہیں بلکہ یہ ایک فاسد خون ہے جو نماز روزہ اور جنسی تعلق سے مانع نہیں ہے۔ ہاں البتہ اگر نفاس کے چالیس دنوں کے بعد کسی عورت کے حیض کے ایام شروع ہو جائیں تو پھر وہ نماز روزہ ترک کر دے گی' (جنسی تعلق بھی جائز نہ ہو گا) کیونکہ یہ حیض کا خون ہو گا۔

——— شیخ ابن باز ———

غسل حیض کو طلوع فجر تک مؤخر کرنا

سوال کیا غسل جنابت میں طلوع فجر تک تاخیر کرنا جائز ہے؟ کیا خواتین کے لیے حیض یا نفاس کا غسل کو طلوع فجر تک مؤخر کرنا جائز ہے؟

جواب جب عورت فجر سے پہلے پاک ہو جائے تو اس کے لیے روزہ رکھنا لازم ہے۔ طلوع فجر کے بعد تک غسل مؤخر کرنے میں کوئی حرج نہیں لیکن تاخیر اس قدر نہیں ہونی چاہیئے کہ سورج طلوع ہو جائے بلکہ طلوع آفتاب سے پہلے غسل کرنا اور نماز پڑھنا واجب ہے۔ اسی طرح جنبی مرد اور عورت کو بھی سورج طلوع ہونے سے پہلے پہلے غسل کر کے نماز ادا کرنا چاہیئے خصوصاً مرد کے لیے ضروری ہے کہ وہ جلد غسل کرے تاکہ نماز فجر باجماعت ادا کر سکے۔

——— شیخ ابن باز ———

حاملہ اور دودھ پلانے والی عورت اور روزہ

حاملہ اور دودھ پلانے والی خواتین جب رمضان کے روزے نہ رکھ سکیں

سوال حاملہ اور دودھ پلانے والی خواتین جب رمضان کے روزے نہ رکھ سکیں تو انہیں کیا کرنا چاہیئے؟ اور اگر وہ چاولوں کی صورت میں فدیہ دینا چاہیں تو کتنا فدیہ دیں؟

جواب حاملہ اور دودھ پلانے والی خواتین کے لیے یہ حلال نہیں ہے کہ وہ کسی عذر کے بغیر ایام رمضان کے روزے چھوڑیں اور اگر کسی عذر کی وجہ سے انہیں رمضان کے روزے چھوڑنا پڑیں تو ان دنوں کی قضا لازم ہو گی جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے مریض کے بارے میں فرمایا ہے:

﴿ فَمَن كَانَ مِنكُم مَّرِيضًا أَوْ عَلَىٰ سَفَرٍ فَعِدَّةٌ مِّنْ أَيَّامٍ أُخَرَ ﴾ (البقرة۲/ ۱۸٤)

---

[1] سنن ابی داود' الطھارۃ' باب ماروی أن المستحاضة تغتسل لکل صلاۃ ' حدیث: 292۔

"پس سو جو شخص تم میں سے بیمار ہو یا سفر میں ہو تو دوسرے دنوں میں روزوں کا شمار پورا کرے۔"
اور یہ دونوں قسم کی عورتیں مریض کے حکم میں ہیں اور اگر ان کا عذر یہ ہو کہ وہ روزے کی وجہ سے بچے کی صحت کے بارے میں خائف ہوں تو پھر قضا کے ساتھ ساتھ ان پر فدیہ بھی لازم ہے' فدیہ یہ ہے کہ ہر روز ایک مسکین کو گندم یا چاول یا کھجور یا جو لوگوں کی خوراک ہو' سو وہ دی جائے۔ بعض علما کے بقول حاملہ اور مرضعہ پر ہر حال میں صرف قضا ہی لازم ہے کیونکہ وجوب فدیہ کی کتاب و سنت سے کوئی دلیل نہیں ہے اور اصول یہ ہے کہ جب تک وجوب کی دلیل نہ ہو اس وقت تک آدمی بری الذمہ ہے۔ امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ کا بھی یہی مذہب ہے اور یہی مذہب قوی ہے۔

——— شیخ ابن عثیمین ———

حاملہ اور مرضعہ کو جب اپنے یا اپنے بچے کے بارے میں خطرہ ہو

سوال حاملہ یا مرضعہ کو جب رمضان میں روزے رکھنے کی وجہ سے اپنے یا اپنے بچے کے بارے میں نقصان کا خطرہ ہو اور وہ روزے نہ رکھے تو کیا وہ فدیہ اور قضا دے یا صرف قضا دے اور فدیہ نہ دے یا صرف فدیہ دے اور قضا نہ دے' ان تینوں صورتوں میں سے کون سی صورت صحیح ہے؟

جواب حاملہ عورت کو اگر رمضان میں روزہ رکھنے کی وجہ سے اپنے یا اپنے بچے کے بارے میں نقصان کا اندیشہ ہو تو وہ روزہ نہ رکھے اور اس کے ذمہ صرف قضا ہو گی' کیونکہ اس کی حالت اس انسان جیسی ہے جسے روزے کی طاقت ہی نہ ہو یا روزہ رکھنے سے اسے نقصان ہوتا ہو' ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ وَمَن كَانَ مَرِيضًا أَوْ عَلَىٰ سَفَرٍ فَعِدَّةٌ مِّنْ أَيَّامٍ أُخَرَ ﴾ (البقرة۲/ ۱۸۵)

"اور جو شخص تم میں سے بیمار ہو یا سفر میں ہو تو دوسرے دنوں میں روزوں کی گنتی پوری کرے۔"
اسی طرح مرضعہ عورت کو اگر رمضان میں بچے کو دودھ پلانے کی وجہ سے نقصان کا اندیشہ ہو یا روزہ رکھنے کی وجہ سے بچے کو نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہو تو وہ بھی روزہ چھوڑ دے اور رمضان کے بعد صرف قضا دے لے۔ وباللہ التوفیق

——— فتویٰ کمیٹی ———

حاملہ عورت پر صرف قضا لازم ہے

سوال میں رمضان میں حاملہ تھی۔ میں نے روزے چھوڑ دیئے اور پھر رمضان کے بعد ایک پورے مہینے کے روزے بھی رکھے اور صدقہ بھی کیا۔ اگلے رمضان میں' میں پھر حاملہ تھی میں نے روزے چھوڑ دیئے اور رمضان کے بعد ایک دن چھوڑ کر ایک روزہ رکھ لیا اور اس طرح دو ماہ میں روزے مکمل کر لیے لیکن صدقہ نہیں کیا' تو سوال یہ ہے کہ اس سلسلہ میں مجھ پر کوئی صدقہ واجب ہے؟

جواب جب حاملہ عورت کو روزے کی وجہ سے اپنے یا اپنے بچے کی صحت کے بارے میں کوئی خطرہ ہو تو وہ روزہ نہ رکھے اور اس پر صرف قضا واجب ہے کیونکہ اس کی حالت اس مریض جیسی ہے جسے روزے کی طاقت نہ ہو یا روزہ رکھنے کی صورت میں جان کا خطرہ ہو' ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ وَمَن كَانَ مَرِيضًا أَوْ عَلَىٰ سَفَرٍ فَعِدَّةٌ مِّنْ أَيَّامٍ أُخَرَ ﴾ (البقرة٢/ ١٨٥)

"اور جو شخص تم میں سے بیمار ہو یا سفر میں ہو تو دوسرے دنوں میں روزوں کی گنتی کو پورا کرے۔"

——— فتویٰ کمیٹی ———

شیر خوار بچے کی وجہ سے قضا نہ دی

سوال ایک عورت نے رمضان میں بچے کو جنم دیا اور پھر رمضان کے بعد شیر خوار بچے کی وجہ سے قضا نہ دی اور پھر حاملہ ہو گئی اور دوسرے رمضان میں پھر بچے کو جنم دیا۔ کیا اس کے لیے یہ جائز ہے کہ وہ روزے رکھنے کی بجائے رقم تقسیم کر دے؟

جواب اس عورت پر یہ واجب ہے کہ جتنے دن اس نے روزے نہیں رکھے اتنے دنوں کی قضا دے خواہ دوسرے رمضان کے بعد' کیونکہ اس نے پہلے اور دوسرے رمضان قضا کو عذر کی وجہ سے ترک کیا ہے۔ مجھے نہیں معلوم کیا اسے اس میں بھی مشقت ہے کہ وہ سردیوں کے موسم میں ایک دن چھوڑ کر روزہ رکھ لے؟ اگر وہ بچے کو دودھ پلاتی ہے تو اللہ تعالیٰ اسے قوت عطا فرما دے گا اور روزہ اس کی صحت یا اس کے دودھ پر اثر انداز نہ ہو گا۔ لہٰذا اسے چاہیئے کہ اگلے رمضان کی آمد سے قبل مقدور بھر کوشش کر کے پہلے رمضان کی قضا دے لے اور اگر اس کے لیے قضا دینا ممکن نہ ہو تو پھر اسے دوسرے رمضان تک مؤخر کرنے میں بھی کوئی حرج نہیں۔

——— شیخ ابن عثیمین ———

روزوں کی قضا

بیماری سے شفا کے بعد روزے کی قضا ضروری ہے

سوال ایک عورت نفسیاتی بیماری' بخار' ڈیپریشن اور اعصابی کمزوری میں مبتلا تھی جس کی وجہ سے وہ تقریباً چار سال تک روزے نہ رکھ سکی' تو اس حالت میں کیا وہ روزے کی قضا دے یا نہ دے اس کے روزوں کا کیا حکم ہو گا؟

جواب اگر اس نے عدم قدرت کی وجہ سے روزے ترک کئے ہیں تو جب اسے قدرت حاصل ہو جائے تو ان تمام روزوں کی قضا واجب ہو گی جو اس نے گزشتہ چار سالوں میں نہیں رکھے' ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ وَمَن كَانَ مَرِيضًا أَوْ عَلَىٰ سَفَرٍ فَعِدَّةٌ مِّنْ أَيَّامٍ أُخَرَ يُرِيدُ اللَّهُ بِكُمُ الْيُسْرَ وَلَا يُرِيدُ بِكُمُ الْعُسْرَ وَلِتُكْمِلُوا الْعِدَّةَ وَلِتُكَبِّرُوا اللَّهَ عَلَىٰ مَا هَدَاكُمْ وَلَعَلَّكُمْ تَشْكُرُونَ ﴿١٨٥﴾ ﴾ (البقرة٢/ ١٨٥)

"اور جو شخص بیمار ہو یا سفر میں ہو تو دوسرے دنوں میں (روزے رکھ کر) ان کی گنتی پورا کرے۔ اللہ تمہارے حق میں آسانی چاہتا ہے اور سختی نہیں چاہتا اور (یہ آسانی کا حکم) اس لیے (دیا گیا ہے) تاکہ تم روزوں کا شمار

پورا کر لو اور اس احسان کے بدلے کہ اللہ نے تم کو ہدایت بخشی ہے، تم اس کو بزرگی سے یاد کرو اور اس کا شکر کرو۔"

ڈاکٹروں کی رپورٹ کے مطابق اگر عورت اپنی بیماری اور عاجزی کی وجہ سے روزہ رکھنے سے قاصر ہو تو وہ ہر دن کے عوض ایک مسکین کو نصف صاع گندم یا کھجور یا چاول وغیرہ جو وہاں کے لوگوں کی خوراک ہو، کھلا دے کیونکہ اس عورت کی مثال اس بے حد بوڑھے مرد اور عورت کی طرح ہے جنہیں روزے کی وجہ سے شدید مشقت ہو اور وہ روزے نہ رکھ سکتے ہوں، لہٰذا اس صورت میں اس کے لیے قضا نہیں ہو گی۔

——— فتویٰ کمیٹی ———

نفلی روزے رمضان کی قضا نہیں بن سکتے

سوال میں بیمار ہو گئی اور مرض جب شدت اختیار کر گیا تو میرے بھائی نے مجھے مکہ مکرمہ میں ہسپتال میں داخل کرا دیا۔ ہسپتال میں داخلہ کے دوران دوبارہ رمضان آیا اور پھر اس کے بعد مجھے ریاض منتقل کر دیا گیا اور میں وہاں دوبارہ پھر ہسپتال میں داخل ہو گئی اور جب پھر رمضان آ گیا تو میں پہلے سے بہتر تھی، لہٰذا میں نے روزے رکھ لیے۔ کیا روزے رکھنا میرے لیے لازم ہے جبکہ میں ہر ماہ تین روزے رکھتی ہوں؟ یا میرے لیے صدقہ کرنا لازم ہے؟ کیا میں اپنے اکلوتے بیٹے سے کہوں کہ وہ صدقہ کر لے جب کہ وہ تنگدست ہے، ملازمت بھی نہیں کرتا اور ایک کرایہ کے مکان میں رہتا ہے اور میں ایک کمزور حالت والی عورت ہوں۔ میں کوئی کام کر کے صدقہ کرنے کی استطاعت بھی نہیں رکھتی۔ لہٰذا اس مسئلہ کا کیا حل ہے؟

جواب سائلہ پر مذکورہ دو مہینوں کی قضا واجب ہے کیونکہ (درج ذیل) ارشاد باری تعالیٰ کے عموم کا یہی تقاضا ہے:

﴿ وَمَن كَانَ مَرِيضًا أَوْ عَلَىٰ سَفَرٍ فَعِدَّةٌ مِّنْ أَيَّامٍ أُخَرَ ﴾ (البقرۃ۲/ ۱۸۵)

"تو جو شخص تم میں سے بیمار ہو یا سفر میں ہو تو دوسرے دنوں میں روزوں کی گنتی کو پورا کر لے۔"

سائلہ نے جو یہ ذکر کیا ہے کہ وہ ہر مہینے تین روزے رکھتی ہے، اگر ان روزوں کے رکھنے سے سائلہ کی نیت مذکورہ دو مہینوں کے روزوں کی قضا دینا ہے تو یہ نیت صحیح ہے، لہٰذا اسے باقی روزے بھی رکھ لینے چاہئیں اور اگر ان تین روزوں کے بارے میں اس کی نیت نفل روزوں کی تھی تو اس سے فرض ساقط نہیں ہوں گے اور اسے مکمل دو ماہ کے روزے رکھنا ہوں گے۔ روزوں کے بجائے مسکینوں کو کھانا کھلانا اس کے لیے واجب نہیں ہے کیونکہ یہ معذور تھی اور بیماری کی وجہ سے اس نے روزے مؤخر کئے ہیں۔

——— فتویٰ کمیٹی ———

بیماری کی وجہ سے روزے نہ رکھنا

سوال چند سال پہلے میں نے ایک پورے رمضان کے روزے نہیں رکھے کیونکہ میں ہسپتال میں داخل تھا اور ڈاکٹروں نے مجھے روزے رکھنے سے منع کر دیا تھا۔ یہ دیکھتے ہوئے کہ میری صحت روزہ رکھنے کی اجازت نہیں دیتی، میں نے اگلا

رمضان آنے سے پہلے مکمل مہینے کا فدیہ ادا کر دیا لیکن اس کے بعد میں نے مسلسل کئی سالوں کے رمضان کے روزے رکھے ہیں۔ جس رمضان کے روزے میں نے چھوڑے تھے اس کے بھی ۲۳ روزوں کی قضا دے لی ہے اور اب صرف سات باقی ہیں' تو کیا سابقہ مہینے کا کفارہ ادا کر دیا جائے تو یہ کافی ہو گا یا میرے لیے ان سات دنوں کی قضا واجب ہے میری صحت اکثر و بیشتر صورتوں میں روزہ رکھنے کی اجازت نہیں دیتی؟

جواب آپ پر واجب یہ ہے کہ سات دنوں کی قضا بھی دیں اور کفارہ بھی۔ کفارہ یہ ہے کہ ہر دن کے عوض شہر میں کھائی جانے والی خوراک کے مطابق ایک مسکین کو نصف صاع کھانا دیں کیونکہ آپ نے جس رمضان کے روزے چھوڑے تھے' انہیں اگلے رمضان تک مؤخر کر دیا جبکہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ وَمَن كَانَ مَرِيضًا أَوْ عَلَىٰ سَفَرٍ فَعِدَّةٌ مِّنْ أَيَّامٍ أُخَرَ ﴾ (البقرۃ۲/ ۱۸۵)

"تو جو شخص تم میں سے بیمار ہو یا سفر میں ہو تو دوسرے دنوں میں روزوں کی گنتی کو پورا کرے۔"

حضرات صحابہ کرام کی ایک جماعت کا بھی یہی فتویٰ ہے کہ جو شخص رمضان کی قضا کو مؤخر کر دے تو اس پر یہ لازم ہے کہ ہر دن کے عوض ایک مسکین کے کھانے کے فدیہ کے ساتھ ساتھ قضا بھی دے۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو توفیق سے نوازے۔ والسلام۔

—————— شیخ ابن باز ——————

بیماری کی وجہ سے روزے نہ رکھے اور پھر.........

سوال ایک شخص کا عیدالفطر کے دن انتقال ہوا۔ رمضان کی پہلی یا دوسری تاریخ کو وہ بیمار ہوا تھا جس کی وجہ سے وہ رمضان کا کوئی روزہ نہ رکھ سکا تو کیا اب اس کے وارث اس کی طرف سے روزے رکھیں یا فدیہ ادا کریں یا اس سلسلہ میں میت اور اس کے وارثوں پر کچھ بھی لازم نہیں ہے؟

جواب اس مریض نے اگر روزے اس لیے نہیں رکھے کہ اسے روزہ رکھنے کی طاقت نہ تھی اور قضا اس لیے نہیں دے سکا کہ عیدالفطر کے دن اس کا انتقال ہو گیا تو اس کے لیے روزہ رکھنا واجب نہ تھا۔ کیونکہ بیماری کی وجہ سے اسے اس کی طاقت نہ تھی اور اس پر قضا بھی واجب نہیں کیونکہ عیدالفطر کے دن فوت ہو جانے کی وجہ سے اسے اس کا موقع ہی نہیں ملا تھا۔ اس کے وارثوں پر بھی اس کی طرف سے روزہ رکھنا یا فدیہ ادا کرنا واجب نہیں ہے۔

—————— فتویٰ کمیٹی ——————

متوفی کے ذمہ ایک دن کے روزے کی قضا تھی

سوال میرے اٹھارہ سال کی عمر کے بیٹے کا پانچ دن پہلے انتقال ہو گیا تھا۔ اس نے رمضان کا ایک روزہ نہیں رکھا تھا۔ یہ رمضان کا پہلا دن ہی تھا اور پھر اس کے بعد اس نے سارے روزے رکھے تھے تو اس ایک روزے کے بارے میں کیا حکم ہے؟ اس نے اس دن کے روزے کی قضا اس لیے نہیں دی کہ ڈاکٹر نے تو اسے یہ کہا تھا کہ وہ بالکل روزے نہ رکھے تاکہ اس کی ہڈی جڑ جائے اور اس کے لیے اسے بہت اچھی خوراک کی ضرورت تھی؟ جزاکم اللہ خیرًا۔

جواب اگر امر واقع اسی طرح ہے کہ آپ کے بیٹے کی گاڑی کا ایکسیڈنٹ ہوا اور وہ کمزوری کی وجہ سے روزہ نہ رکھ سکا اور پھر قضا دینے سے پہلے فوت ہو گیا تو اس پر یا اس کے وارثوں پر قضا یا کفارہ کوئی چیز واجب نہیں ہے کیونکہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ لَا يُكَلِّفُ اللَّهُ نَفْسًا إِلَّا وُسْعَهَا ﴾ (البقرۃ۲/ ۲۸۶)

"اللہ تعالیٰ کسی شخص کو اس کی طاقت سے زیادہ تکلیف نہیں دیتا۔"

——— فتویٰ کمیٹی ———

عذر کی وجہ سے روزہ چھوڑنے کا کفارہ

سوال میں نے رمضان ۱۳۹۵ھ میں دو روزے چھوڑے لیکن ان کی قضا نہ دی حتیٰ کہ ۹۶ھ کا رمضان آگیا اور پھر ۹۶ھ کے رمضان کے بھی تین روزے نہ رکھے اور پھر محرم ۹۷ھ میں مسلسل پانچ دن قضا دے لی کیا اس صورت میں فدیہ ادا کرنے کی ضرورت تو نہیں؟

جواب اگر آپ نے مذکورہ روزے کسی عذر کی وجہ سے چھوڑے ہیں تو آپ پر اس قضا کے علاوہ اور کچھ لازم نہیں ہے جو آپ نے سر انجام دے دی ہے کیونکہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ فَمَن كَانَ مِنكُم مَّرِيضًا أَوْ عَلَىٰ سَفَرٍ فَعِدَّةٌ مِّنْ أَيَّامٍ أُخَرَ ﴾ (البقرۃ۲/ ۱۸٤)

"پس جو شخص تم میں سے بیمار ہو یا سفر میں ہو تو دوسرے دنوں میں روزوں کی گنتی کو پورا کرے۔"

اور اگر آپ نے روزے کسی (شرعی) عذر کے بغیر ترک کئے ہیں تو پھر مذکورہ قضا کے ساتھ ساتھ توبہ بھی لازم ہے کیونکہ کسی عذر کے بغیر رمضان کا روزہ چھوڑنا جائز نہیں ہے۔ ۹۶ھ کے رمضان کے آپ نے جو روزے چھوڑے ان کا کوئی کفارہ نہیں۔ ہاں البتہ آپ نے ۹۵ھ کے رمضان کے جو دو روزے چھوڑے ہیں قضا کے ساتھ ساتھ ان کا کفارہ بھی ہے اور وہ یہ کہ ہر دن کے عوض ایک مسکین کو کھانا کھلا دیا جائے کیونکہ آپ نے کسی عذر کے بغیر ان کو اس قدر مؤخر کیا کہ ۱۳۹۶ھ کا رمضان آگیا۔ کھانے کی مقدار یہ ہے کہ ہر مسکین کو نصف صاع وہ کھانا کھلا دیں جو آپ کے شہر میں کھایا جاتا ہے، لیکن یاد رہے کہ یہ اس صورت میں جب آپ کے روزے چھوڑنے کا سبب جنسی عمل نہ ہو اور اگر اس کا سبب جنسی عمل ہے تو پھر قضا کے ساتھ ساتھ اس کا کفارہ بھی لازم ہے۔ کفارہ یہ ہے کہ ہر دن کے عوض ایک ایک مومن گردن آزاد کریں، وہ میسر نہ ہو تو دو ماہ کے مسلسل روزے رکھیں اور اگر روزے رکھنے سے بھی آپ عاجز و قاصر ہوں تو ساٹھ مسکینوں کو کھانا کھلائیں۔ واللہ الموفق

——— فتویٰ کمیٹی ———

ایک رمضان کی قضا دوسرے رمضان تک مؤخر کرنا

سوال اس شخص کے بارے میں اسلامی شریعت کا کیا حکم ہے جو کسی عذر کی وجہ سے یا عذر کے بغیر ایک رمضان کی قضا کو دوسرے رمضان تک مؤخر کر دیتا ہے؟

جواب جو شخص کسی شرعی عذر مثلاً بیماری کی وجہ سے روزوں کی قضا مؤخر کر دے تو کوئی حرج نہیں کیونکہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ وَمَن كَانَ مَرِيضًا أَوْ عَلَىٰ سَفَرٍ فَعِدَّةٌ مِّنْ أَيَّامٍ أُخَرَ ﴾ (البقرة۲/ ۱۸۵)

"اور جو شخص تم میں سے بیمار ہو یا سفر میں ہو تو وہ دوسرے دنوں میں روزوں کی گنتی کو پورا کرے۔"

نیز ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ فَاتَّقُوا اللَّهَ مَا اسْتَطَعْتُمْ ﴾ (التغابن ٦٤/ ١٦)

"سو جہاں تک ہو سکے تم اللہ تعالیٰ سے ڈرو۔"

ہاں البتہ جو شخص بغیر عذر کے اس قدر تاخیر کرے تو اس نے اپنے رب کی نافرمانی کی۔ اسے چاہیئے کہ توبہ کرے' ان روزوں کی قضا دے اور ہر دن کے عوض ایک مسکین کو کھانا بھی دے۔ کھانے کی مقدار چاول وغیرہ یا جو اس علاقے کی خوراک ہو وہ نصف صاع فی دن کے حساب سے دی جائے نصف صاع کا وزن تقریباً ڈیڑھ کلو ہے۔ یہ کھانا بعض فقراء یا کسی ایک فقیر کو روزوں سے پہلے یا بعد میں دے دیا جائے۔ واللہ ولی التوفیق۔

——— شیخ ابن باز ———

قضا اگلے رمضان تک مؤخر کر دی

سوال اس شخص کے بارے میں کیا حکم ہے جو رمضان کا ایک روزہ چھوڑ دے اور پھر قضا نہ دے حتی کہ اگلا رمضان آجائے؟

جواب اگر چھوڑے ہوئے روزے کی قضا میں کسی عذر مثلاً بیماری وغیرہ کی وجہ سے تاخیر ہوئی ہو تو اس پر بوقت قدرت صرف قضا لازم ہو گی اور اگر اس نے کسی عذر کے بغیر قضا میں تاخیر کی ہے تو اس نے بہت برا کیا ہے۔ اس صورت میں قضا بھی لازم ہو گی اور ایک مسکین کو کھانا بھی کھلانا ہو گا۔

سوال اس شخص کے بارے میں کیا حکم ہے جس کے ذمہ ۱۳۹۲ھ کے رمضان کا ایک روزہ تھا اور اس نے قضا نہ دی حتیٰ کہ ۹۳ھ کا رمضان آگیا؟

جواب جب کوئی انسان رمضان کے ایک یا ایک سے زیادہ روزوں کی قضا میں اس قدر سستی کرے کہ اگلا رمضان آ جائے تو پھر وہ قضا بھی دے اور نصف صاع کے حساب سے ہر دن کے عوض مسکین کو گندم وغیرہ بھی دے یا کوئی اور ایسی جنس جو اس علاقے میں کھانے کا معمول ہو بشرطیکہ اس نے قضا میں کسی عذر کے بغیر تاخیر کی ہو اور اگر اس نے کسی عذر کی وجہ سے قضا میں تاخیر کی ہو مثلاً بیماری یا اس قدر کمزوری ہو کہ وہ فوت شدہ روزوں کی قضا دینے کی طاقت نہ رکھتا ہو تو پھر اس پر فدیہ لازم ہو گا۔

——— فتویٰ کمیٹی ———

عذر کے بغیر قضا میں تاخیر

سوال پانچ سال پہلے میں رمضان میں شدید بیمار ہو گیا جس کی وجہ سے روزے نہ رکھ سکا اور ان روزوں کی آج تک

قضا بھی نہ دے سکا تو کیا یہ جائز ہے کہ ان روزوں کی اب قضا دے لوں؟ کیا اس سلسلہ میں مجھے گناہ ہو گا؟ رہنمائی فرمائیں۔ اللہ تعالیٰ آپ کی حفاظت فرمائے اور اجر وثواب سے نوازے۔

جواب اس بہت زیادہ تاخیر کی وجہ سے آپ کو اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی بارگاہ میں توبہ کرنی چاہیئے کیونکہ آپ پر واجب یہ تھا کہ جس رمضان کے آپ نے روزے نہیں رکھے تھے اس کے روزوں کی قضا اگلے رمضان کی آمد سے پہلے پہلے دے لیتے۔ اب آپ پر واجب ہے کہ توبہ کے ساتھ ساتھ ہر دن کے عوض نصف صاع شہر کی خوراک از قسم کھجور یا چاول وغیرہ کا فدیہ بھی ادا کریں۔ نصف صاع کا وزن تقریباً ڈیڑھ کلو ہے۔ یہ تمام فدیہ فقیروں کو یا کسی ایک فقیر کو دے دیا جائے۔ ہم اللہ سے دعا کرتے ہیں کہ وہ آپ کی توبہ کو شرف قبولیت سے نوازے اور ہمیں اور آپ کو معاف فرماوے۔ انه خیر مسئوول!

——— شیخ ابن باز ———

چوبیس سال پہلے کے رمضان کے روزوں کی قضا

سوال ایک عورت نے ۱۳۸۲ھ کے رمضان کے روزے ایک حقیقی عذر یعنی اپنے بچے کو دودھ پلانے کی وجہ سے چھوڑے تھے۔ وہ بچہ اب بڑا ہو کر چوبیس سال کا ہو گیا ہے لیکن اس عورت نے اب تک روزوں کی قضا نہیں دی۔ اللہ عظیم کی قسم! قضا نہ دینے کا سبب سستی اور قصد وارادہ نہیں بلکہ جہالت ہے تو رہنمائی فرمائیں کہ اس بارے میں کیا حکم ہے؟

جواب اس عورت کے لیے یہ واجب ہے کہ جس قدر جلد ممکن ہو اس سال کے رمضان کے دنوں کے بقدر روزے رکھے خواہ متفرق طور پر رکھ لے اور اس تاخیر کی وجہ سے کفارہ بھی ادا کرنا ہو گا۔ کفارہ یہ ہے کہ ہر دن کے عوض ایک مسکین کو کھانا کھلائے کیونکہ جو شخص قضا میں اس قدر تاخیر کر دے کہ اگلا رمضان آ جائے تو اس کے لیے قضا کے ساتھ ساتھ کفارہ بھی لازم ہوتا ہے۔ پورے مہینے کے کفارہ کے طور پر پینتالیس کلو چاول کافی ہوں گے۔ اس عورت کے لیے یہ واجب تھا کہ اگر اسے معلوم نہ تھا تو دین کے اس مسئلہ کے بارے میں پوچھ کر تحقیق کر لیتی کیونکہ یہ مسئلہ مشہور ومعروف ہے۔ سب لوگ جانتے ہیں کہ جو شخص کسی عذر کی وجہ سے روزہ چھوڑ دے تو اس کے لیے فوری طور پر قضا لازم ہے اور کسی عذر کے بغیر قضا میں تاخیر کرنا جائز نہیں ہے۔

——— شیخ ابن جبرین ———

قضا لازم ہے خواہ الگ الگ دنوں میں دے لو

سوال میں سترہ برس کی ایک لڑکی ہوں۔ روزے فرض ہونے کے بعد کے ابتدائی دو سال میں نے رمضان کے جو روزے چھوڑے تھے ان کی اب تک قضا نہیں دی لہٰذا اب مجھے کیا کرنا چاہیئے؟

جواب ان دنوں کی فوراً قضا دو' خواہ الگ الگ دنوں میں دے لو اور ایک سال سے زیادہ تاخیر کی وجہ سے قضا کے ساتھ ساتھ کفارہ بھی لازم ہے۔ کفارہ یہ ہے کہ ہر دن کے عوض ایک مسکین کو کھانا کھلایا جائے جیسا کہ جمہور علماء کی یہی رائے ہے۔

شیخ ابن جبرین

جس نے جان بوجھ کر روزے چھوڑے پھر توبہ کی؟

سوال اس مسلمان کے بارے میں کیا حکم ہے جس نے گزشتہ کئی سالوں میں رمضان کے روزے نہیں رکھے' ہاں البتہ دیگر فرائض ادا کئے تھے۔ وہ اپنے ملک سے باہر تھا لیکن کسی عذر کے بغیر اس نے روزے چھوڑ دیئے تھے۔ اب اگر وہ توبہ کر لے یا اپنے ملک واپس آ جائے تو کیا اس کے لیے قضا لازم ہے؟

جواب رمضان کے روزے ارکان اسلام میں سے ایک اہم رکن ہیں لہٰذا اس شخص کا جان بوجھ کر روزے چھوڑ دینا جس پر فرض ہوں بہت بڑا گناہ ہے۔ بعض اہل علم کے نزدیک ایسا شخص کافر و مرتد ہو جاتا ہے۔ لہٰذا اسے سچی اور خالص توبہ کرنی چاہیئے' کثرت کے ساتھ نفل اعمال صالح ادا کرنے چاہئیں اور اسے نماز' روزہ' حج' زکوٰۃ اور دیگر احکام شریعت کی پابندی کرنی چاہیئے۔ علماء کے صحیح قول کے مطابق ایسے شخص پر قضا لازم نہیں ہے کیونکہ اس کا جرم اس سے کہیں بڑا ہے کہ قضا سے اس کی تلافی ہو سکے۔ وباللّٰہ التوفیق وصلی اللّٰہ وسلم علی نبینا محمد وآلہ وصحبہ۔

فتویٰ کمیٹی

پہلے فوت شدہ روزوں کی قضا دیجئے

سوال کیا رمضان کے روزوں کی قضا سے پہلے شوال کے چھ روزے رکھنا جائز ہے؟ کیا ماہ شوال کے سوموار کے دن کا روزہ اس نیت سے جائز ہے کہ رمضان کی قضا بھی ہو جائے اور سوموار کے دن کے روزے کا اجر و ثواب بھی حاصل ہو جائے؟

جواب شوال کے چھ روزوں کا ثواب اسی صورت میں حاصل ہو گا کہ پہلے ماہ رمضان کے روزے مکمل کر لیے گئے ہوں۔ جس کے ذمہ رمضان کے روزوں کی قضا ہو تو وہ قضا کے بعد ہی شوال کے چھ روزے رکھے کیونکہ نبی کریم ﷺ نے یہ فرمایا:

«مَنْ صَامَ رَمَضَانَ ثُمَّ أَتْبَعَهُ سِتًّا مِّنْ شَوَّالٍ . . . . »(صحيح مسلم، الصيام، باب استحباب صوم ستة أيام . . . الخ، ح:١١٦٤)

"جس نے رمضان کے روزے رکھے اور پھر اس کے بعد شوال کے چھ روزے رکھے........"

لہٰذا جس کے ذمہ قضا ہو اس سے ہم یہ کہیں گے کہ پہلے رمضان کے روزوں کی قضا دو پھر اس کے بعد شوال کے چھ روزے رکھو۔ اتفاق سے ان چھ دنوں میں سوموار یا جمعرات کا جو دن آئے گا تو چھ دن کی نیت کا بھی اجر و ثواب ملے گا کیونکہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا:

«إِنَّمَا الأَعْمَالُ بِالنِّيَّاتِ وَإِنَّمَا لِكُلِّ امْرِئٍ مَّا نَوٰى»(صحيح البخاري، بدء الوحي، باب كيف كان بدء الوحي . . . الخ، ح:١ وصحيح مسلم، الإمارة، باب قوله ﷺ انما الأعمال بالنية . . . الخ، ح:١٩٠٧)

"اعمال کا انحصار نیتوں پر ہے اور ہر آدمی کے لیے صرف وہی کچھ ہے جو اس نے نیت کی ہو۔"

———— شیخ ابن عثیمین ————

رمضان کے روزوں کی قضا موسم سرما تک مؤخر کرنا

سوال کیا یہ جائز ہے کہ رمضان کے روزوں کی قضا موسم سرما تک مؤخر کر دی جائے؟

جواب جونہی قدرت حاصل ہو اور عذر زائل ہو جائے تو رمضان کے روزوں کی قضا واجب ہے اور کسی سبب کے بغیر تاخیر جائز نہیں مبادا کہ بعد میں بیماری یا سفر یا موت کی وجہ سے رکاوٹ پیدا ہو جائے لیکن اگر کسی نے اس قدر تاخیر کر دی کہ سردیوں کے چھوٹے دن آ گئے اور ان دنوں میں قضا دے لی تو یہ قضا بھی صحیح ہوگی۔

———— شیخ ابن جبرین ————

نماز تراویح اور قیام

نماز تراویح سنت مؤکدہ ہے

سوال کیا نماز تراویح صرف سنت ہے یا سنت مؤکدہ؟ ہم اسے کس طرح ادا کریں؟

جواب یہ سنت مؤکدہ ہے۔ نبی کریم ﷺ نے اس کی ترغیب دیتے ہوئے فرمایا:

«مَنْ قَامَ رَمَضَانَ إِيمَانًا وَّاحْتِسَابًا غُفِرَ لَهُ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْبِهِ»(صحيح البخاري، صلاة التراويح، باب فضل من قام رمضان، ح:٢٠٠٩ وصحيح مسلم، صلاة المسافرين، باب الترغيب في قيام رمضان ... الخ، ح:٧٥٩)

"جو شخص ایمان اور حصول ثواب کی نیت سے رمضان میں قیام کرے تو اللہ تعالیٰ اس کے سابقہ تمام گناہ معاف فرما دے گا۔"

یہ بھی حدیث سے ثابت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے چند راتیں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو یہ نماز پڑھائی اور پھر اس خدشہ سے نہ پڑھائی کہ یہ فرض ہی نہ کر دی جائے [1] لیکن صحابہ کرام کو آپ نے یہ ترغیب دی کہ وہ اپنے طور پر اس نماز کو ضرور پڑھیں لہٰذا کوئی اکیلا پڑھ لیتا' کوئی دو مل کر اور کوئی تین مل کر جماعت سے ادا کر لیتے۔ پھر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنے دور میں (جب کہ تراویح کی فرضیت کا خطرہ دور ہو گیا تھا) یہ مناسب سمجھا کہ تمام لوگ ایک امام کی اقتدا میں نماز باجماعت ادا کریں [2] کیونکہ اس طرح سب کو نماز باجماعت ادا کرنے اور قرآن مجید سننے کا موقع نصیب ہوگا اور تب سے اب تک یہ سنت باجماعت ادا کرنے کا مسلمانوں میں معمول جاری ہے۔ اس زمانے میں اس نماز کی تیئیس رکعتیں ادا کی جاتی تھیں'

---

[1] صحیح بخاری' التراویح' باب فضل من قام رمضان' حدیث: 2012 و صحیح مسلم' صلاۃ المسافرین' باب الترغیب فی قیام رمضان..... الخ' حدیث: 761۔

[2] صحیح بخاری' صلاۃ التراویح' باب فضل من قام رمضان' حدیث: 2010۔

لوگ اس قدر لمبی قراءت کرتے کہ سورۃ البقرہ کو بارہ اور کبھی آٹھ رکعتوں میں پڑھ لیتے تھے۔ نبی کریم ﷺ نے نماز تراویح کی رکعات کی تعداد چونکہ معین نہیں فرمائی لہٰذا اس سلسلہ میں کافی گنجائش ہے کہ جو چاہے رکعات کی تعداد کم کر لے اور ارکان کو طول دے لے اور جو چاہے رکعات کی تعداد کو بڑھا لے۔

—— شیخ ابن جبرین ——

تراویح سنت ہے واجب نہیں

سوال میں ایک تجارتی ادارے میں کام کرتا ہوں اور نماز تراویح مسجد میں ادا نہیں کر سکتا کیونکہ کام کے اوقات مغرب کے بعد سے لے کر سحری کے قریب تک ہیں تو کیا اس کی وجہ سے مجھے گناہ ہو گا؟ اس ثواب سے محروم رہنے کی تلافی کی کیا صورت ہو سکتی ہے؟

جواب ترک تراویح کی وجہ سے آپ کو گناہ نہیں ہوتا کیونکہ تراویح سنت ہے' اگر انسان ادا کرے تو اسے ثواب ملتا ہے اور اگر یہ ادا نہ کرے تو کوئی گناہ نہیں ہوتا۔ جب اللہ تعالیٰ کو آپ کی اس نیت کا علم ہے کہ اگر اس ملازمت کی وجہ سے آپ کی مشغولیت نہ ہوتی تو آپ ضرور تراویح پڑھتے۔ اس لیے اپنے بے پایاں فضل و کرم سے آپ کی نیت کے مطابق وہ آپ کو ضرور اجر وثواب سے نوازے گا۔

نماز تراویح میں قرآن مجید دیکھ کر قراءت

سوال کیا نماز تراویح اور نماز کسوف میں قرآن مجید سے دیکھ کر قراءت کی جا سکتی ہے یا نہیں؟ رہنمائی فرمائیں۔ اللہ تعالیٰ آپ کو اجر وثواب سے نوازیں۔

جواب قیام رمضان میں قرآن مجید سے دیکھ کر قراءت کرنے میں کوئی حرج نہیں کیونکہ اس طرح مقتدیوں کو تمام قرآن مجید کے سنانے کا موقع ملے گا۔ کتاب و سنت کے دلائل سے ثابت ہے کہ نماز میں قرآن مجید کی قراءت مشروع ہے اور یہ حکم عام ہے خواہ قرآن مجید دیکھ کر قراءت کی جائے یا زبانی' چنانچہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ انہوں نے اپنے آزاد کردہ غلام ذکوان کو حکم دیا کہ وہ قیام رمضان میں امامت کے فرائض سرانجام دیں' چنانچہ ذکوان قرآن مجید سے دیکھ کر پڑھتے تھے۔ امام بخاری رحمہ اللہ نے اسے اپنی "صحیح" میں تعلیقاً مگر صحت کے وثوق کے ساتھ ذکر فرمایا ہے۔ [1]

—— شیخ ابن باز ——

رات کی نماز دو دو رکعت ہے

سوال بعض امام نماز تراویح پڑھاتے ہوئے چار یا اس سے بھی زیادہ رکعتیں ایک ہی سلام کے ساتھ پڑھا دیتے ہیں۔ دو رکعتوں کے درمیان بیٹھتے بھی نہیں اور دعویٰ یہ کرتے ہیں کہ یہ سنت ہے۔ سوال یہ ہے کہ کیا اس عمل کی شریعت مطہرہ میں کوئی اصل ہے؟

---

[1] امام بخاری نے اس کو کتاب الاذان' باب امامة العبد والموالی میں تعلیقاً ذکر کیا ہے۔ فتح الباری 185/2۔

جواب اکثر اہل علم کے نزدیک یہ عمل غیر مشروع بلکہ مکروہ یا حرام ہے کیونکہ نبی کریم ﷺ کا ارشادگرامی یہ ہے:

«صَلاَةُ اللَّيْلِ مَثْنٰى مَثْنٰى»(صحيح البخاري، أبواب الوتر، باب ماجاء في الوتر، ح:٩٩٠ وصحيح مسلم، صلاة المسافرين، باب صلاة الليل مثنى مثنى ... الخ، ح:٧٤٩)

"رات کی نماز دو دو رکعت ہے۔"

نیز حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے:

«كَانَ رَسُولُ اللهِ ﷺ يُصَلِّي فِيمَا بَيْنَ أَنْ يَفْرُغَ مِنْ صَلاَةِ الْعِشَاءِ إِلَى الْفَجْرِ، إِحْدٰى عَشْرَةَ رَكْعَةً، يُسَلِّمُ بَيْنَ كُلِّ رَكْعَتَيْنِ وَيُوتِرُ بِوَاحِدَةٍ» (صحيح مسلم، صلاة المسافرين، باب صلاة الليل وعدد ركعات النبي ﷺ ... الخ، ح:٧٣٦)

"رسول اللہ ﷺ نماز عشاء سے فارغ ہونے سے فجر تک کے درمیانی وقفے میں گیارہ رکعت پڑھا کرتے۔ ہر دو رکعتوں کے بعد سلام پھیر دیا کرتے اور ایک رکعت وتر پڑھا کرتے تھے۔" (اس مضمون کی اور بھی بہت سی احادیث ہیں۔)

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی یہ جو مشہور حدیث ہے:

«[كَانَ] يُصَلِّي [مِنَ اللَّيْلِ] أَرْبَعًا فَلاَ تَسْأَلْ عَنْ حُسْنِهِنَّ وَطُولِهِنَّ، ثُمَّ يُصَلِّي أَرْبَعًا فَلاَ تَسْأَلْ عَنْ حُسْنِهِنَّ وَطُولِهِنَّ»(صحيح البخاري، التهجد، باب قيام النبي ﷺ بالليل ... الخ، ح:١١٤٧ وصحيح مسلم، صلاة المسافرين، باب صلاة الليل وعدد ركعات النبي ﷺ ... الخ، ح:٧٣٨)

"(نبی کریم ﷺ رات کو) چار رکعتیں پڑھا کرتے تھے' ان کی خوبصورتی اور لمبائی کے بارے میں مت پوچھئے۔ آپ پھر چار رکعتیں اور پڑھتے اور ان کے حسن اور طول کے بارے میں بھی مت پوچھئے۔"

تو اس سے مراد بھی یہی ہے کہ آپ ہر دو رکعتوں کے بعد سلام پھیر دیتے تھے۔ اس سے یہ مراد نہیں ہے کہ آپ ایک ہی سلام سے چار رکعتیں اکٹھی پڑھتے تھے کیونکہ آپ سے مروی سابقہ حدیث سے یہ ثابت ہے کہ آپ دو دو رکعتیں پڑھا کرتے تھے۔ نیز آپ نے خود یہ فرمایا ہے:

«صَلاَةُ اللَّيْلِ مَثْنٰى مَثْنٰى»(صحيح البخاري، أبواب الوتر، باب ما جاء في الوتر، ح:٩٩٠ وصحيح مسلم، صلاة المسافرين، باب صلاة الليل مثنى مثنى ... الخ، ح:٧٤٩)

"رات کی نماز دو رکعت ہے۔"

جیسا کہ قبل ازیں بیان کیا جا چکا ہے' نیز اصول یہ ہے کہ بعض احادیث بعض کی تصدیق اور تفسیر بیان کرتی ہیں' لہذا مسلمان کے لیے واجب یہ ہے کہ وہ تمام احادیث کو قبول کرلے اور مبین کے ساتھ مجمل کی تفسیر کرے۔ واللہ ولی التوفیق۔

——— شیخ ابن باز ———

نماز کو اطمینان سے پڑھنا فرض ہے

 ہماری مسجد کا امام نماز تراویح اس قدر جلدی پڑھاتا ہے کہ اس عظیم فرصت سے استفادہ کرتے ہوئے ہم دعا

مانگ سکتے ہیں نہ تسبیح پڑھ سکتے ہیں اور نہ نماز خشوع سے ادا کر سکتے ہیں۔ وہ صرف تشہد اول پر اکتفا کرتا یعنی "اَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلاَّ اللّٰهُ وَاَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُهُ وَرَسُوْلُهُ" تک پڑھتا اور کہتا ہے کہ بس اس قدر تشہد کافی ہے۔ یعنی درود شریف نہیں پڑھتا اور کہتا ہے کہ یہ اضافہ ہے اور قراءت بھی صرف ایک یا دو آیتوں کی کرتا ہے۔ امید ہے آپ رہنمائی فرمائیں گے۔

جزاکم اللہ خیرًا

جواب ائمہ کے لیے حکم شریعت یہ ہے کہ نماز خواہ تراویح ہو یا فرض اسے نہایت اطمینان و سکون سے پڑھائیں۔ قراءت ترتیل کے ساتھ کریں۔ رکوع و سجود خشوع کے ساتھ کریں اور رکوع کے بعد اور دونوں سجدوں کے درمیان کامل اعتدال سے کام لیں اور تمام نمازیں خواہ وہ فرض ہوں یا نفل نہایت اطمینان و سکون سے پڑھائیں کیونکہ طمانیت فرض ہے اور اس کے بغیر چارہ کار ہی نہیں۔ جو شخص نماز میں طمانیت کو ترک کر دے اس کی نماز باطل ہو جاتی ہے کیونکہ "صحیحین" میں حدیث موجود ہے [1] کہ نبی کریم ﷺ نے ایک آدمی کو نماز پڑھتے ہوئے دیکھا جو کہ اطمینان کے ساتھ نماز نہیں پڑھ رہا تھا تو آپ نے اسے دوبارہ نماز پڑھنے کا حکم دیا اور اس کی رہنمائی کرتے ہوئے اسے بتایا کہ رکوع و سجدہ میں طمانیت واجب ہے' نیز رکوع کے بعد اور دو سجدوں کے درمیان اعتدال واجب ہے لہٰذا ائمہ مساجد کو چاہیئے کہ ترتیل اور خشوع کے ساتھ قراءت کیا کریں تاکہ قراءت سے خود بھی استفادہ کریں اور ان کی اقتدا میں نماز ادا کرنے والے مقتدی بھی استفادہ کر سکیں۔ ترتیل اور خشوع سے کی گئی قراءت سن کر ہی دلوں میں تحریک' خشوع اور اللہ تعالیٰ کی طرف انابت اور توجہ پیدا ہوتی ہے۔

امام اور مقتدیوں پر یہ بھی واجب ہے کہ تشہد میں شہادتین کے بعد سلام سے پہلے نبی کریم ﷺ کی ذات گرامی پر درود ابراہیمی پڑھیں [2] کیونکہ یہ ثابت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے اس کا حکم دیا ہے [2] لہٰذا اہل علم کی ایک بہت بڑی جماعت نماز میں درود شریف کی فرضیت کی قائل ہے۔ امام اور مقتدیوں کے لیے یہ جائز نہیں ---خواہ نماز کا مسئلہ ہو یا کوئی اور--- کہ وہ شریعت مطہرہ کی مخالفت کریں۔ امام' مقتدی اور انفرادی طور پر نماز ادا کرنے والے سب لوگوں کے لیے یہ بھی حکم شریعت ہے کہ وہ نماز میں درود شریف کے بعد اور سلام پھیرنے سے پہلے اللہ تعالیٰ سے عذاب جہنم' عذاب قبر' فتنۂ موت و حیات اور فتنۂ مسیح دجال سے پناہ بھی طلب کریں کیونکہ رسول اللہ ﷺ کا اپنا بھی یہ عمل تھا اور آپ نے امت کو اس دعا کے مانگنے کا حکم بھی دیا ہے۔ [3] اسی طرح سلام سے پہلے کوئی اور دعا ساتھ ملا لینا بھی مستحب ہے' مثلاً اس موقع پر وہ مشہور دعا بھی مانگی جا سکتی ہے جس کے بارے میں رسول اللہ ﷺ نے حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ کو یہ وصیت فرمائی کہ وہ ہر نماز کے آخری حصہ میں یہ دعا ضرور مانگیں:

---

[1] صحیح بخاری' الاذان' باب وجوب القراءۃ للامام والمأموم ..... الخ' حدیث : 757 و صحیح مسلم' الصلاۃ' باب وجوب قراءۃ الفاتحۃ فی کل رکعۃ ..... الخ' حدیث 397۔

[2] صحیح بخاری' التفسیر' باب قولہ ان اللّٰہ و ملائکتہ یصلون علی النبی' حدیث : 4797 و صحیح مسلم' الصلاۃ' باب الصلاۃ علی النبی صلی اللّٰہ علیہ وسلم بعد التشہد' حدیث 407۔

[3] صحیح مسلم' المساجد' باب ما یستعاذ منہ فی الصلاۃ' حدیث : 588۔

[4] سنن ابی داود' الصلاۃ باب فی الاستغفار' حدیث : 1522۔

«اَللّٰهُمَّ أَعِنِّي عَلٰى ذِكْرِكَ وَشُكْرِكَ وَحُسْنِ عِبَادَتِكَ»(سنن أبي داود، الوتر، باب في الاستغفار، ح:١٥٢٢)

"اے اللہ! تو اپنا ذکر کرنے اور اپنا شکر ادا کرنے پر اور اپنی بہترین عبادت کرنے پر میری مدد فرما۔"

———— شیخ ابن باز ————

تراویح میں لمبی قراءت

سوال ایک مسجد کے امام نماز تراویح پڑھاتے ہوئے ہر رکعت میں قرآن کا ایک پورا صفحہ یعنی قریباً پندرہ آیات تلاوت کرتے ہیں جس کی وجہ سے بعض لوگ یہ کہتے ہیں کہ یہ بہت لمبی قراءت ہے جب کہ بعض کی رائے اس کے برعکس ہے۔ سوال یہ ہے کہ نماز تراویح میں سنت کیا ہے؟ کیا نبی کریم ﷺ سے کوئی ایسی حد منقول ہے جس سے طوالت و عدم طوالت کو معلوم کیا جا سکے؟

جواب صحیح حدیث سے ثابت ہے کہ نبی کریم ﷺ رمضان و غیر رمضان میں رات کو گیارہ رکعات پڑھا کرتے تھے [1] اور قراءت اور ارکان کو آپ بہت طول دیتے حتیٰ کہ ایک بار تو آپ نے ایک رکعت میں پانچ پاروں سے بھی زیادہ کی تلاوت فرمائی اور پھر نہایت ترتیل اور سکون کے ساتھ یہ تلاوت فرمائی اور یہ بھی صحیح حدیث سے ثابت ہے [2] کہ آپ نصف رات کے وقت یا تھوڑا سا نصف سے پہلے یا بعد میں اٹھتے اور طلوع فجر کے قریب تک نماز میں مصروف رہتے اور اس طرح قریباً پانچ گھنٹوں میں کل تیرہ رکعات ادا فرماتے، جس کے معنی یہ ہیں کہ آپ کی قراءت اور ارکان بہت طویل ہوتے تھے۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے جب حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو نماز تراویح باجماعت ادا کرنے کا حکم دیا تو وہ بیس رکعتیں پڑھا کرتے تھے اور ہر رکعت میں سورت بقرہ کی تیس آیات کے قریب یعنی چار پانچ صفوں کے بقدر تلاوت کرتے تھے اور اس طرح آٹھ رکعتوں میں وہ سورۂ بقرہ پڑھ لیا کرتے تھے اور اگر وہ بارہ رکعتوں میں سورۂ بقرہ ختم کرتے تھے تو اس قراءت کو وہ تخفیف پر محمول کرتے تھے۔ تو یہ ہے نماز تراویح کے بارے میں سنت کہ اگر قراءت میں تخفیف ہو تو رکعات کی تعداد میں اضافہ کر دیا جائے حتیٰ کہ بعض ائمہ کے بقول اکتالیس تک رکعات پڑھی جا سکتی ہیں اور اگر کوئی شخص گیارہ یا تیرہ رکعات پر اکتفاء کرے تو قراءت اور ارکان کی طوالت میں اضافہ کر دے۔ نماز تراویح کی تعداد متعین نہیں ہے بلکہ مطلوب و مقصود یہ ہے کہ اسے نہایت اطمینان و سکون کے ساتھ ادا کیا جائے اور کم از کم ایک گھنٹہ تو اس نماز پر ضرور صرف کیا جائے۔ جو شخص اس قدر قیام کو طویل سمجھتا ہے تو خلاف منقول ہونے کی وجہ سے اس کی یہ بات ناقابل التفات ہے۔

---

[1] صحیح بخاری، التهجد، باب قیام النبی صلی اللہ علیه وسلم باللیل فی رمضان، حدیث: 1147 و صحیح مسلم، صلاة المسافرین، باب صلاة اللیل وعدد رکعات النبی صلی اللہ علیه وسلم ..... الخ، حدیث: 738۔

[2] صحیح بخاری، الوتر، باب ساعات الوتر، حدیث: 996 و صحیح مسلم، صلاة المسافرین، باب صلاة اللیل وعدد رکعات النبی صلی اللہ علیه وسلم، حدیث: 745۔

——— شیخ ابن جبرین ———

مقتدیوں کو تمام قرآن مجید تراویح میں ترتیب کے ساتھ سننا چاہیے

سوال اگر میں تراویح میں امامت کے فرائض انجام دوں تو کیا یہ لازم ہے کہ میں تمام سورتوں کو ترتیب کے ساتھ پڑھوں یا جہاں دن کو میں نے اپنی تلاوت کو چھوڑا ہو وہاں سے بھی قراءت شروع کر سکتا ہوں؟

جواب ائمہ کرام کو چاہیے کہ اگر انہیں استطاعت ہو تو قیام رمضان میں مقتدیوں کو سارا قرآن سنائیں کہ پہلی رات جن آیات اور سورتوں کو تلاوت کیا ہو تو اگلی رات اس سے آگے کا حصہ تلاوت کریں تاکہ نمازی اپنے رب کی کتاب پاک کو مکمل اور ترتیب کے ساتھ سن سکیں۔ للذا اگر استطاعت ہو تو یہ بہت افضل ہے کہ نماز تراویح میں ایک بار مکمل قرآن مجید ختم کیا جائے بشرطیکہ نمازیوں کے لیے بھی یہ گراں نہ ہو۔ اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی بہت ضروری ہے کہ تلاوت ترتیل' خشوع اور اطمینان کے ساتھ کی جائے کیونکہ نماز سے مقصود یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کا تقرب حاصل کیا جائے اور اس کے سامنے اس کے عذاب سے ڈرا جائے۔ نماز سے یہ ہرگز مقصود نہیں کہ خشوع اور حضور قلب کے بغیر محض رسمی طور پر رکعات کی گنتی پوری کر دی جائے۔ اللہ تعالیٰ مسلمانوں کو اصلاح احوال اور دنیا و آخرت کی نجات کی توفیق عطا فرمائے۔

——— شیخ ابن باز ———

دعائے قنوت

سوال رمضان کی راتوں میں وتر میں دعائے قنوت پڑھنے کے بارے میں کیا حکم ہے؟ کیا اسے ترک کرنا بھی جائز ہے؟

جواب وتر میں دعائے قنوت پڑھنا سنت ہے۔ کبھی کبھی اسے ترک بھی کر دیا جائے تو کوئی حرج نہیں۔

——— شیخ ابن باز ———

وتر میں قنوت سنت ہے

سوال بعض ائمہ ہر رات وتر میں قنوت کرتے ہیں۔ کیا یہ سلف سے منقول ہے؟

جواب اس میں کوئی حرج نہیں بلکہ یہ سنت ہے کیونکہ نبی کریم ﷺ نے جب حضرت حسن بن علی رضی اللہ عنہما کو وتر کی دعائے قنوت سکھائی [1] تو یہ حکم نہیں دیا تھا کہ اسے کبھی کبھی چھوڑ دیا جائے اور نہ یہ حکم دیا تھا کہ اسے ہمیشہ پڑھا جائے للذا اس سے معلوم ہوا کہ دونوں طرح جائز ہے۔ یہی وجہ ہے کہ حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ سے یہ ثابت ہے [2] کہ وہ جب مسجد نبوی میں حضرات صحابہ کرام کو نماز پڑھاتے تو بعض راتوں میں قنوت ترک کر دیتے تھے اور شاید یہ اس لیے تاکہ آپ لوگوں کو یہ معلوم کرا دیں کہ قنوت واجب نہیں ہے۔ واللہ ولی التوفیق۔

——— شیخ ابن باز ———

---

[1] سنن ابی داود' الصلاۃ' باب القنوت فی الوتر' حدیث: 1425' جامع ترمذی' حدیث 464 و سنن نسائی' حدیث: 1747۔

[2] سنن ابی داود' الصلاۃ' باب القنوت فی الوتر' حدیث: 1428 - 1429۔

قیام اللیل رمضان ہی کے ساتھ خاص نہیں ہے

سوال کیا رات کا قیام صرف ماہ رمضان المبارک ہی کے ساتھ خاص ہے یا سارا سال قیام کیا جا سکتا ہے؟ رات کا قیام کس وقت شروع اور کس وقت ختم کیا جائے؟ کیا قیام صرف نماز کا نام ہے یا نماز اور قرآن کریم کی قراءت کا نام قیام ہے؟

جواب نماز اور تہجد کے ساتھ قیام اللیل سنت اور فضیلت ہے۔ نبی کریم ﷺ اور آپ کے صحابہ کرام نے ہمیشہ قیام فرمایا جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ إِنَّ رَبَّكَ يَعْلَمُ أَنَّكَ تَقُومُ أَدْنَىٰ مِن ثُلُثَيِ ٱلَّيْلِ وَنِصْفَهُۥ وَثُلُثَهُۥ وَطَآئِفَةٌ مِّنَ ٱلَّذِينَ مَعَكَ ﴾ (المزمل ۷۳/ ۲۰)

"تمہارا پروردگار خوب جانتا ہے کہ تم اور تمہارے ساتھ کے لوگ (کبھی) دو تہائی رات کے قریب اور (کبھی) آدھی رات اور (کبھی) تہائی رات قیام کیا کرتے ہو۔"

رات کا قیام رمضان کے ساتھ خاص نہیں بلکہ سارا سال کیا جا سکتا ہے۔ اس کا وقت عشاء اور فجر کے درمیان ہے لیکن رات کے آخری حصہ میں نماز پڑھنا زیادہ افضل ہے۔ رات کے درمیانی حصہ میں پڑھ لے تو پھر بھی اجر وثواب ملے گا۔ بہتر یہ ہے کہ یہ قیام سو کر اٹھنے کے بعد ہو یا رات کے آخری نصف حصہ میں ہو۔ واللہ اعلم

—— شیخ ابن جبرین ——

عورتوں کی بہترین صف

سوال جب مسجد میں مردوں اور عورتوں کی صف کے درمیان (مضبوط و مستحکم) پردہ حائل ہو تو کیا پھر بھی نبی ﷺ کا یہ ارشاد صفوں پر منطبق ہو گا کہ "مردوں کی سب سے بہتر پہلی صف ہے اور....." یا اس ارشاد کا حکم زائل ہو جائے گا؟ اور اس طرح کے پردہ کی وجہ سے عورتوں کی سب سے بہتر صف بھی پہلی صف ہو گی؟ رہنمائی فرمائیں۔

جواب بظاہر یوں معلوم ہوتا ہے کہ اس حدیث میں عورتوں کی آخری صف کو بہترین قرار دینے کا سبب مردوں سے دوری ہے عورت جس قدر مردوں سے دور ہو گی اسی قدر اپنی عزت و آبرو کی حفاظت کرنے والی اور اخلاقی خرابی کی طرف میلان سے اپنے آپ کو دور رکھنے والی ہو گی۔ لیکن جب عورتوں کی جائے نماز مردوں سے دور ہو اور دونوں کے درمیان دیوار یا مضبوط و مستحکم پردہ حائل ہو اور وہ لاؤڈ سپیکر کی آواز کے ذریعہ امام کی متابعت کرتی ہوں تو پھر راجح بات یہی ہے کہ سبقت اور قبلہ کے قرب کی وجہ سے عورتوں کی بھی پہلی صف افضل ہو گی۔

—— شیخ ابن جبرین ——

مختلف فتوے

جس نے رمضان کا ایک روزہ چھوڑا اور پھر توبہ کر لی

سوال اس شخص کے بارے میں کیا حکم ہے جس نے رمضان میں ایک دن جان بوجھ کر کھانا کھالیا اور پھر بعد میں توبہ کر لی، تو کیا اس کی توبہ قبول ہو گی؟

جواب ہاں توبہ قبول ہو گی کیونکہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ وَإِنِّي لَغَفَّارٌ لِّمَن تَابَ وَءَامَنَ وَعَمِلَ صَٰلِحًا ثُمَّ ٱهۡتَدَىٰ ﴿٨٢﴾ ﴾ (طہ ۲۰/ ۸۲)

"اور بلاشبہ جو شخص توبہ کرے اور ایمان لائے اور عمل نیک کرے' پھر سیدھی راہ چلے' میں اس کو بخش دینے والا ہوں۔"

علاوہ ازیں کتاب و سنت کے دیگر دلائل سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ توبہ کرنے والے کا گناہ اللہ تعالیٰ معاف فرمادیتا ہے۔

فتویٰ کمیٹی

میں نے امتحانات کی وجہ سے روزہ چھوڑا

سوال میں ایک نوجوان لڑکی ہوں۔ میں نے حالات کی وجہ سے مجبور ہو کر عمدا رمضان المبارک کے چھ روزے چھوڑ دیے تھے اور اس کا سبب یہ تھا کہ رمضان میں امتحانات شروع ہو گئے تھے اور مضامین بہت مشکل تھے۔ اگر میں روزے نہ چھوڑتی تو ان مضامین کے مشکل ہونے کی وجہ سے ان کی تیاری نہ کر سکتی تھی۔ امید ہے آپ رہنمائی فرمائیں گے کہ اب مجھے کیا کرنا چاہیئے تاکہ اللہ تعالیٰ مجھے معاف فرمادے؟ جزاکم اللہ خیرًا۔

جواب آپ توبہ کیجئے اور جتنے روزے چھوڑے ہیں ان کی قضا دیجئے جو شخص توبہ کرے تو اللہ تعالیٰ اس کی توبہ قبول فرما لیتا ہے لیکن توبہ کی حقیقت یہ ہے کہ ماضی کی غلطی کا ارتکاب نہیں کرنا۔ غلطی کا تعلق اگر حقوق العباد سے ہو تو توبہ کی تکمیل کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ متعلقہ بندوں سے اسے معاف کروا لیا جائے' ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ وَتُوبُوٓاْ إِلَى ٱللَّهِ جَمِيعًا أَيُّهَ ٱلۡمُؤۡمِنُونَ لَعَلَّكُمۡ تُفۡلِحُونَ ﴿٣١﴾ ﴾ (النور ۲۴/ ۳۱)

"اور مومنو تم سب اللہ کے آگے توبہ کرو تاکہ فلاح پاؤ۔"

اور فرمایا:

﴿ يَٰٓأَيُّهَا ٱلَّذِينَ ءَامَنُواْ تُوبُوٓاْ إِلَى ٱللَّهِ تَوۡبَةً نَّصُوحًا ﴾ (التحریم ۶۶/ ۸)

"مومنو! اللہ کے آگے صاف دل سے خالص توبہ کرو۔"

اور نبی کریم ﷺ نے فرمایا:

«اَلتَّوْبَةُ تَجُبُّ مَا قَبْلَهَا»

"توبہ سے سابقہ تمام گناہ معاف ہو جاتے ہیں۔"

نیز نبی کریم ﷺ نے فرمایا ہے:

«مَنْ كَانَتْ لَهُ مَظْلَمَةٌ لأَخِيهِ مِنْ عِرْضِهِ أَوْ شَيْءٍ فَلْيَتَحَلَّلْهُ مِنْهُ الْيَوْمَ قَبْلَ أَنْ لاَ يَكُونَ دِينَارٌ وَّلاَ دِرْهَمٌ، إِنْ كَانَ لَهُ عَمَلٌ صَالِحٌ أُخِذَ مِنْهُ بِقَدْرِ مَظْلَمَتِهِ، وَإِنْ لَّمْ يَكُنْ لَّهُ حَسَنَاتٌ أُخِذَ مِنْ سَيِّئَاتِ صَاحِبِهِ فَحُمِلَ عَلَيْهِ. . . الحديث»(صحيح البخاري، المظالم، باب من كانت له مظلمة . . . الخ، ح:۲۴۴۹)

"جس کسی نے اپنے بھائی پر ظلم کر کے اس کی عزت و آبرو یا کسی اور چیز کو نقصان پہنچایا ہو تو اس سے آج ہی

معاف کروالے پہلے اس کے کہ (وہ دن آئے کہ) اس کے پاس کوئی دینار یا درہم نہ ہو اگر اس کے پاس اعمال صالحہ ہوئے تو اس کے ظلم کے بقدر وہ (اعمال صالحہ) اس سے لے لیے جائیں گے اور اگر اس کے پاس نیکیاں نہ ہوئیں تو مظلوم کی برائیاں لے کر اس پر لادی جائیں گی....“

——— شیخ ابن باز ———

سحری کی برکت

سوال رسول اللہ ﷺ کا ارشاد گرامی ہے:

«تَسَحَّرُوا فَإِنَّ فِي السَّحُورِ بَرَكَةً»

”سحری کھاؤ‘ سحری میں برکت ہے۔“

تو سوال یہ ہے کہ سحری کی برکت سے کیا مراد ہے؟

جواب سحری کی برکت سے شرعی اور بدنی برکت مراد ہے۔ شرعی برکت تو یہ ہے کہ اس میں رسول اللہ ﷺ کے ارشاد کی فرماں برداری اور آپ کی اقتدا ہے اور بدنی برکت سے مراد یہ ہے کہ سحری سے بدن کو غذا ملتی اور روزہ کے لیے تقویت نصیب ہوتی ہے۔

——— شیخ ابن عثیمین ———

روزے کی نیت

سوال اس حدیث سے کیا مقصود ہے کہ ”جو شخص رات کو نیت نہ کرے اس کا روزہ نہیں۔“؟

جواب نیت یہ ہے کہ روزہ رکھنے کے لیے دل میں ارادہ کیا جائے۔ یہ نیت کرنا ہر اس مسلمان کے لیے ضروری ہے جسے یہ معلوم ہو کہ اللہ تعالیٰ نے ماہ رمضان کے روزے فرض قرار دیئے ہیں۔ اس فرضیت کو پہچاننا اور اس پر عمل کرنا نیت کے لیے کافی ہے۔ نیز یہ بھی کافی ہے کہ دل میں یہ ارادہ کرے کہ وہ کل روزہ رکھے گا جب کہ ترک روزہ کا کوئی عذر نہ ہو۔ روزے کی نیت سے سحری کھانا بھی نیت کے لیے کافی ہے۔ یاد رہے روزہ یا دیگر عبادات کے لیے زبان سے نیت کے الفاظ ادا کرنے کی ضرورت نہیں ہے کیونکہ نیت کا مقام دل ہے زبان نہیں۔ یہ بھی ضروری ہے کہ سارے دن کے روزے کی نیت ہو یعنی یہ نیت نہ کرے کہ دن کو روزہ توڑ دے گا یا اسے باطل کر دے گا۔

——— شیخ ابن جبرین ———

اسے یاد دلانا جو بھول کر دن کے وقت کھا رہا ہو

سوال اگر میں کسی روزہ دار کو دیکھوں کہ وہ رمضان میں دن کے وقت بھول کر کھا یا پی رہا ہے تو کیا مجھ پر یہ لازم ہے کہ میں اسے متنبہ کر دوں کیونکہ میں نے بعض لوگوں سے یہ سنا ہے کہ یہ لازم نہیں ہے کیونکہ اسے تو اللہ کھلا اور پلا رہا ہے؟

جواب جو شخص کسی مسلمان کو دیکھے کہ وہ رمضان میں کھا پی رہا یا کوئی اور ایسا کام کر رہا ہو جس سے روزہ ٹوٹ جاتا ہو تو ضروری ہے کہ اسے اس سے منع کیا جائے کیونکہ رمضان میں دن کے وقت اس کا اظہار منکر ہے' خواہ ایسا کرنے والا فی نفسہ معذور ہی کیوں نہ ہو تاکہ لوگ رمضان میں دن کے وقت ان امور کے اظہار میں دلیر نہ ہو جائیں جن سے روزہ ٹوٹ جاتا ہے اور پھر بہانہ یہ کریں کہ وہ بھول گئے تھے۔ ہاں البتہ اگر کوئی شخص واقعی بھول گیا ہو تو اس پر قضا نہیں ہے کیونکہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا ہے:

«مَنْ نَسِيَ وَهُوَ صَائِمٌ، فَأَكَلَ أَوْ شَرِبَ، فَلْيُتِمَّ صَوْمَهُ، فَإِنَّمَا أَطْعَمَهُ اللهُ وَسَقَاهُ» (صحيح البخاري، الصوم، باب الصائم إذا أكل أو شرب ناسيا، ح:١٩٣٣ وكتاب الأيمان والنذور، ح:٦٦٦٩ وصحيح مسلم، الصوم، باب أكل الناسي وشربه ... الخ، ح:١١٥٥ واللفظ له)

''جو روزے دار بھول کر کھا پی لے تو اسے اپنا روزہ پورا کرنا چاہیئے کیونکہ اسے تو اللہ نے کھلایا پلایا ہے۔''

اسی طرح مسافر کو بھی ان مقیم لوگوں میں جو اسے نہیں جانتے' کھلم کھلا نہیں کھانا پینا چاہیئے بلکہ اسے چھپ کر کھانا پینا چاہیئے تاکہ اس پر یہ الزام عائد نہ ہو کہ یہ حرام امور کا ارتکاب کر رہا ہے اور نہ اسے دیکھ کر دوسرے بھی اس کی جرأت کریں۔ اسی طرح مسلمانوں کے مابین مقیم کافروں کو بھی اس سے منع کیا جائے گا تاکہ تساہل کا دروازہ بند کر دیا جائے۔ ویسے بھی کفار کے لیے یہ ممنوع ہے کہ مسلمانوں میں رہتے ہوئے اپنے باطل دین کے شعائر کا اظہار کریں۔ واللہ ولی التوفیق

——— شیخ ابن باز ———

چھوٹے بچے پر روزہ واجب نہیں ہے

سوال میرا چھوٹا سا بچہ رمضان کے روزے رکھنے پر اصرار کرتا ہے حالانکہ صغر سنی اور صحت کی کمزوری کی وجہ سے روزہ اس کے لیے نقصان دہ ہے تو کیا میں سختی سے اسے روزہ رکھنے سے منع کر دوں؟

جواب اگر بچہ اس قدر چھوٹا ہے کہ ابھی بالغ نہیں ہوا تو اس پر روزہ لازم نہیں ہے اور اگر وہ مشقت کے بغیر روزہ رکھ سکتا ہو تو اسے اس کا حکم دیا جائے گا۔ حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اپنے چھوٹے بچوں سے بھی روزے رکھوایا کرتے تھے حتیٰ کہ اگر کوئی چھوٹا بچہ رونے لگتا تو اسے کھلونا دے کر بہلاتے لیکن جب یہ ثابت ہو کہ چھوٹے بچے کے لیے روزہ نقصان دہ ہو گا تو پھر اسے روزہ رکھنے سے منع کیا جائے۔ اللہ سبحانہ و تعالیٰ نے جب ہمیں اس بات سے منع فرمایا ہے کہ چھوٹے بچوں کو ان کے اموال نہ دیں تاکہ وہ خراب نہ ہو جائیں تو ان امور سے انہیں ضرور روکنا چاہیئے جن سے ان کے ابدان پر نقصان دہ اثرات مرتب ہوں لیکن اولاد کی تربیت کے معاملہ میں سختی سے کام نہیں لینا چاہیئے۔

——— شیخ ابن عثیمین ———

چھوٹے بچے کے روزے کی صحت کی شروط

سوال چھوٹے بچے کے روزے کے صحیح ہونے کی کیا شروط ہیں؟ کیا یہ صحیح ہے کہ چھوٹے بچے کے روزے کا اس کے والدین کو ثواب ملتا ہے؟

جواب والدین کو چاہیئے کہ اپنے چھوٹے بچوں کو روزے کا عادی بنائیں بشرطیکہ انہیں اس کی طاقت ہو خواہ ان کی عمر دس سال سے بھی کم ہو اور بچے جب بالغ ہو جائیں تو پھر انہیں روزہ رکھنے کے لیے مجبور کریں۔ بالغ ہونے سے پہلے اگر کوئی بچہ روزہ رکھے تو اسے بھی بڑوں کی طرح کھانے پینے اور ہر اس چیز کو چھوڑنا پڑے گا جس سے روزہ فاسد ہو جاتا ہے۔ چھوٹے بچے کو بھی روزے کا ثواب ملے گا اور اس کے والدین کو بھی۔

——— شیخ ابن جبرین ———

صوم وصال

سوال صوم وصال کیا مراد ہے؟ کیا یہ سنت ہے؟

جواب صوم وصال (سے مراد) یہ ہے کہ انسان دو دن تک افطار ہی نہ کرے اور مسلسل دو دن تک روزہ رکھے رہے۔ اس سے نبی کریم ﷺ نے منع کیا ہے اور فرمایا:

«أَيُّكُمْ أَرَادَ أَنْ يُوَاصِلَ فَلْيُوَاصِلْ حَتَّى السَّحَرِ»(صحيح البخاري، الصوم، باب الوصال إلى السحر، ح:١٩٦٧)

”تم میں سے جو شخص وصال کرنا چاہے وہ سحری تک کر لے۔“

سحری تک وصال جائز ہے۔ یہ حکم شریعت نہیں ہے کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے جلد افطار کی ترغیب دی ہے اور فرمایا:

«لاَ يَزَالُ النَّاسُ بِخَيْرٍ مَّا عَجَّلُوا الْفِطْرَ» (صحيح البخاري، الصوم، باب تعجيل الإفطار، ح:١٩٥٧ وصحيح مسلم، الصيام، باب فضل السحور . . . الخ، ح:١٠٩٨)

”لوگ اس وقت تک خیر پر رہیں گے جب تک افطار میں جلدی کریں گے۔“

سحری تک وصال کی آپ نے صرف اجازت دی ہے اور جب صحابہ کرام نے عرض کیا یا رسول اللہ! آپ بھی تو وصال کرتے ہیں؟ تو آپ نے فرمایا:

«إِنِّي لَسْتُ كَهَيْئَتِكُمْ»(صحيح البخاري، الصوم، باب الوصال، ح:١٩٦٤ وصحيح مسلم، الصيام، باب النهي عن الوصال، ح:١١٠٥)

”میں تمہاری طرح نہیں ہوں۔“

——— شیخ ابن عثیمین ———

رمضان میں وفات

سوال نبی ﷺ نے فرمایا ”جب رمضان آتا ہے تو جنت کے دروازے کھول دیئے جاتے ہیں اور جہنم کے دروازے بند کر دیئے جاتے ہیں۔“ تو کیا اس کے یہ معنی ہیں کہ جو شخص رمضان میں فوت ہو وہ بغیر حساب کے جنت میں جائے گا؟

جواب نہیں یہ بات نہیں! بلکہ اس حدیث کا معنی یہ ہے کہ جنت کے دروازے عمل کرنے والوں میں نشاط پیدا کرنے کے لیے کھول دیئے جاتے ہیں تاکہ ان کے لیے داخلہ میں آسانی ہو اور جہنم کے دروازے اس لیے بند کر دیئے جاتے ہیں

تاکہ اہل ایمان گناہوں سے رک جائیں اور ان دروازوں سے داخل نہ ہوں۔ اس کا یہ معنی نہیں کہ جو شخص رمضان میں فوت ہو وہ بغیر حساب جنت میں داخل ہو گا۔ بغیر حساب کے تو جنت میں وہ لوگ داخل ہوں گے' جن کے رسول اللہ ﷺ نے یہ اوصاف بیان فرمائے ہیں:

«هُمُ الَّذِينَ لاَ يَسْتَرْقُونَ، وَلاَ يَتَطَيَّرُونَ وَلاَ يَكْتَوُونَ، وَعَلٰى رَبِّهِمْ يَتَوَكَّلُونَ»(صحيح مسلم، الإيمان، باب الدليل على دخول طوائف المسلمين . . . الخ، ح:٢١٨)

''وہ دم جھاڑ نہیں کراتے' پیشانیوں وغیرہ پر داغ نہیں لگاتے' فال نہیں پکڑتے اور اپنے رب پر توکل کرتے ہیں۔''

علاوہ ازیں دیگر اعمال صالحہ جو ان پر واجب ہیں' ان کو بھی بجالاتے ہیں۔

—— شیخ ابن عثیمین ——

اعتکاف اور اس کی شرطیں

سوال کیا رمضان المبارک میں اعتکاف سنت مؤکدہ ہے؟ غیر رمضان میں اعتکاف کے لیے کیا شروط ہیں؟

جواب رمضان میں اعتکاف سنت ہے۔ نبی کریم ﷺ نے اپنی حیات پاک میں اعتکاف فرمایا اور آپ کے بعد ازواج مطہرات بھی اعتکاف فرماتی رہی تھیں۔ [1] اہل علم نے بیان کیا ہے کہ اس بات پر علما کا اجماع ہے کہ اعتکاف مسنون ہے لیکن ضروری ہے کہ اعتکاف اس مقصد سے ہو جس کے لیے اسے مشروع قرار دیا گیا ہے اور وہ یہ کہ انسان مسجد میں اللہ سبحانہ و تعالیٰ کی اطاعت کے لیے گوشہ نشین ہو' دنیا کے کاموں کو خیرباد کہہ کر اطاعت الٰہی کے لیے کمر ہمت باندھ لے اور دنیوی امور سے بالکل دست کش ہو کر انواع و اقسام کی اطاعت و بندگی بجا لائے' نماز اور ذکر الٰہی کا کثرت سے اہتمام کرے۔ رسول اللہ ﷺ لیلۃ القدر کی تلاش و جستجو کے لیے اعتکاف فرمایا کرتے تھے۔ معتکف کو چاہیئے کہ وہ دنیوی مشاغل سے بالکل دور رہے' خرید و فروخت کا بالکل کوئی کام نہ کرے' مسجد سے باہر نہ نکلے' جنازہ کے لیے بھی نہ جائے اور نہ کسی مریض کی بیمار پرسی کے لیے جائے۔ بعض لوگوں میں جو یہ رواج پا گیا ہے کہ اعتکاف کرنے والوں کے پاس دن رات آنے جانے والوں کا تانتا بندھا رہتا ہے اور ان ملاقاتوں کے دوران ایسی گفتگو بھی ہو جاتی ہے جو حرام ہے تو یہ سب کچھ اعتکاف کے مقصود کے منافی ہے۔

ہاں اعتکاف کے دوران گھر کا کوئی فرد ملنے کے لیے آئے اور باتیں کرے تو اس میں کوئی حرج نہیں۔ حدیث میں ہے کہ نبی ﷺ اعتکاف میں تھے تو حضرت صفیہ رضی اللہ عنہا ملاقات کیلئے تشریف لائیں اور انہوں نے آپ سے کچھ باتیں بھی کیں۔ [2]

خلاصۂ کلام یہ کہ انسان کو چاہیئے وہ اپنے اعتکاف کو تقرب الٰہی کے حصول کا ذریعہ بنا لے۔

—— شیخ ابن عثیمین ——

---

[1] صحیح بخاری' الاعتکاف' باب الاعتکاف فی العشر الاواخر' حدیث: 2026 و صحیح مسلم' الاعتکاف' باب اعتکاف العشر الاواخر ..... الخ' حدیث 1172۔

[2] صحیح بخاری' الاعتکاف' باب ھل یخرج المعتکف لحوائجه ..... الخ' حدیث: 2035 و صحیح مسلم' السلام' باب بیان انه یستحب لمن رئي خاليا بامرأة ...الخ' حدیث :5712۔

والدین کی طرف سے صدقہ

سوال بعض لوگ رمضان میں جانور وغیرہ ذبح کر کے دعوتوں کا اہتمام کرتے اور انہیں اپنے والدین کی طرف سے صدقہ کا نام دیتے ہیں' اس کے بارے میں کیا حکم ہے؟

جواب فوت شدہ والدین کی طرف سے صدقہ کرنا جائز ہے اور اس میں کوئی حرج نہیں لیکن صدقہ کے بجائے دعا کرنا افضل ہے کیونکہ نبی ﷺ نے اپنے اس ارشاد میں ہماری اسی طرف رہنمائی فرمائی ہے:

«إِذا مَاتَ الإِنْسَانُ انقَطَعَ عَنْهُ عَمَلُهُ إِلاَّ مِنْ ثَلاَثَةٍ: إِلاَّ مِنْ صَدَقَةٍ جَارِيَةٍ، أَوْ عِلْمٍ يُنْتَفَعُ بِهِ، أَوْ وَلَدٍ صَالِحٍ يَدْعُو لَهُ»(صحيح مسلم، الوصية، باب ما يحلق الانسان من الثواب بعد وفاته، ح:١٦٣١)

"انسان جب فوت ہو جاتا ہے تو اس کا عمل منقطع ہو جاتا ہے ہاں البتہ تین طرح کا عمل باقی رہتا ہے (۱) صدقہ جاریہ (۲) وہ علم جس سے فائدہ اٹھایا جا رہا ہو اور (۳) وہ نیک اولاد جو اس کے لیے دعا کرتی ہو۔"

تو اس حدیث میں آپ نے یہ نہیں فرمایا کہ وہ نیک اولاد جو اپنے والدین کی طرف سے صدقہ کرتی یا نماز پڑھتی ہو۔ تاہم اگر کوئی شخص اپنی کسی میت کی طرف سے صدقہ دے تو یہ بھی صحیح ہے کیونکہ رسول اللہ ﷺ سے جب اس کے بارے میں پوچھا گیا تو آپ نے اسے جائز قرار دیا تھا۔ [1]

لیکن بعض لوگ رمضان کی راتوں میں جانور ذبح کر کے بہت سی ایسی دعوتوں کا اہتمام کرتے ہیں جن میں سرمایہ دار ہی شرکت کرتے ہیں تو یہ مشروع نہیں ہے اور نہ سلف صالح سے اس طرح ثابت ہے۔ لہٰذا اس سے اجتناب کرنا چاہیے کیونکہ یہ تو درحقیقت محض کھانے پینے اور مل بیٹھنے کے بہانے ہیں۔ بعض لوگوں کا جو یہ تصور ہے کہ تقرب الٰہی کے لیے ضروری ہے کہ جانور خود ذبح کیا جائے اور وہ بازار سے گوشت خرید کر پکانے کی نسبت خود (اپنے ہاتھ سے) ذبح کرنے کو افضل قرار دیتے ہیں تو یہ خلاف شرع ہے کیونکہ تقرب الٰہی کے حصول کے لیے شریعت نے جن ذبیحوں کا حکم دیا ہے وہ صرف قربانی' ہدی اور عقیقہ ہیں' لہٰذا رمضان میں تقرب الٰہی کے حصول کی نیت سے جانور ذبح کرنا سنت نہیں ہے۔

——— شیخ ابن عثیمین ———

رمضان میں زکوٰۃ ادا کرنا

سوال زکوٰۃ جو ارکان اسلام میں سے ایک اہم رکن ہے' کیا اسے رمضان میں ادا کرنا افضل ہے؟

جواب دیگر اعمال صالحہ کی طرح زکوٰۃ بھی فاضل زمانہ میں ادا کرنا افضل ہے لیکن جب زکوٰۃ ادا کرنا واجب ہو جائے تو رمضان تک مؤخر نہ کیا جائے مثلاً اگر رجب میں سال پورا ہو جائے تو رمضان تک انتظار نہ کرے بلکہ اسے رجب ہی میں ادا کر دے۔ اسی طرح اگر سال محرم میں پورا ہو رہا ہو تو زکوٰۃ بھی محرم میں ادا کر دے اور رمضان تک اسے مؤخر نہ کرے۔ ہاں البتہ اگر سال کی تکمیل رمضان ہی میں ہو رہی ہو تو پھر رمضان میں زکوٰۃ ادا کرنی چاہیے۔

---

[1] صحیح بخاری' الجنائز' باب موت الفجأة البغتة' حدیث : 1388 و صحیح مسلم' الزکاۃ' باب وصول ثواب الصدقة ..... الخ' حدیث : 1004-

شیخ ابن عثیمین

جس شخص کے ذمہ مسلسل دو ماہ کے روزے ہوں؟

سوال مجھ پر کفارہ کے مسلسل دو ماہ کے روزے فرض تھے۔ الحمدللہ میں نے وہ رکھ لیے ہیں لیکن میں نے ایک مکمل ماہ کے روزے رکھنے کے بعد دو دن روزے نہیں رکھے اور پھر اس کے بعد دوسرے مہینے کے روزوں کی تکمیل شروع کر دی' لیکن مہینے کی تکمیل سے پہلے میں بیمار ہوگیا اور تین دن تک روزہ نہ رکھ سکا اور ان کو میں نے بعد میں رکھ لیا ہے۔ بعض لوگوں نے مجھ سے یہ کہا ہے کہ آپ کو دوبارہ مسلسل دو ماہ کے روزے اس طرح رکھنے چاہئیں کہ ان میں ایک دن کا بھی ناغہ نہ ہو' لہٰذا رہنمائی فرمائیں کہ مجھے اب کیا کرنا چاہیئے؟

جواب اگر درمیان میں آپ کے روزے چھوڑنے کا سبب بیماری یا کوئی اور شرعی عذر تھا اور عذر کے زائل ہونے کے فوراً بعد آپ نے دو ماہ پورے کرنے کے لیے روزے رکھ لیے تو اعادہ کی ضرورت نہیں اور آپ کے روزے صحیح ہیں اور اگر آپ نے کسی شرعی عذر کے بغیر درمیان میں روزے چھوڑے ہیں تو پھر آپ کو دوبارہ مسلسل دو ماہ کے یعنی ساٹھ روزے رکھنا ہوں گے جیسا کہ آیات اور احادیث سے معلوم ہوتا ہے۔

روزے ساٹھ سے کم نہیں ہونے چاہئیں الاّ یہ کہ شرعی دلیل سے یہ ثابت ہو جائے کہ مہینہ انتیس دنوں کا ہے۔ وباللّٰہ التوفیق۔

شیخ ابن باز

نفلی روزے

شوال کے چھ روزے اور موطا مالک میں وارد مسئلہ

سوال رمضان کے بعد شوال کے چھ روزے رکھنے کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے؟ موطا مالک میں ہے کہ امام مالک بن انس نے رمضان کے بعد شوال کے ان چھ روزوں کے بارے میں کہا ہے کہ میں نے اہل علم و فقہ میں سے کسی کو نہیں دیکھا جو ان روزوں کو رکھتا ہو۔ سلف میں سے بھی کسی کے بارے میں مجھے یہ خبر نہیں ملی' بلکہ اہل علم ان روزوں کو مکروہ سمجھتے اور ڈرتے تھے کہ کہیں یہ بدعت ہی نہ ہوں اور کہیں ایسا نہ ہو کہ اس طرح رمضان کے ساتھ ایسی چیز کا اضافہ کر دیا جائے جو اس میں سے نہیں ہے۔ موطا امام مالک' حدیث: 228۔

جواب حضرت ابو ایوب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

«مَنْ صَامَ رَمَضَانَ ثُمَّ أَتْبَعَهُ سِتًّا مِنْ شَوَّالٍ فَذٰلِكَ صِيَامُ الدَّهْرِ»(صحيح مسلم، الصيام، باب استحباب صوم ستة ايام ... الخ، ح:١١٦٤ وجامع الترمذي، الصوم، باب ماجاء في صيام ستة ... الخ، ح:٧٥٩ واللفظ له)

”جس نے رمضان کے روزے رکھے پھران کے بعد شوال کے چھ روزے رکھ لیے تو یہ ایسے ہے جیسے اس نے سال بھر کے روزے رکھ لیے۔“

یہ حدیث صحیح ہے جو اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ شوال کے چھ روزے رکھنا سنت ہے۔ امام شافعی' امام احمد اور ائمہ علما کی ایک جماعت نے اس سنت کے مطابق عمل کیا ہے۔ یہ صحیح نہیں ہے کہ اس حدیث کے مقابلہ میں بعض علما کی یہ بات پیش کی جائے کہ شوال کے یہ روزے مکروہ ہیں کیونکہ جاہل یہ سمجھیں گے کہ شاید یہ بھی رمضان کے روزے ہیں یا شاید وہ یہ سمجھیں کہ یہ روزے بھی واجب ہیں یا کوئی یہ کہے کہ اسے سابقہ اہل علم میں سے کسی کے بارے میں یہ معلوم نہیں جو یہ روزے رکھتا ہو۔ یہ سب باتیں محض ظنون و اوہام ہیں۔ صحیح سنت کے مقابلہ میں ان کی کوئی حیثیت نہیں اور جس شخص کو کسی سنت کا علم ہوگیا' وہ اس کے مقابلہ میں حجت ہے جس کو اس کا علم نہ ہو سکا۔

——— فتویٰ کمیٹی ———

شوال کے روزوں کے لیے یہ شرط نہیں کہ مسلسل رکھے جائیں

سوال کیا شوال کے چھ روزوں کے لیے یہ لازمی ہے کہ مسلسل رکھے جائیں یا پورے مہینے میں الگ الگ رکھنے میں بھی کوئی حرج نہیں؟

جواب شوال کے چھ روزے رسول اللہ ﷺ کی سنت سے ثابت ہیں' ان کو مسلسل اور متفرق دونوں طرح رکھنا جائز ہے کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے ان روزوں کا مطلقاً ذکر فرمایا ہے اور اس بات کا کوئی ذکر نہیں کیا کہ انہیں مسلسل رکھا جائے یا الگ الگ۔ چنانچہ اس سلسلہ میں آپ کا فرمان ہے:

«مَنْ صَامَ رَمَضَانَ ثُمَّ أَتْبَعَهُ سِتًّا مِنْ شَوَّالٍ، كَانَ كَصِيَامِ الدَّهْرِ»(صحيح مسلم، الصيام، باب استحباب صوم ستة ايام ... الخ، ح:١١٦٤)

”جس نے رمضان کے روزے رکھے اور پھر اس کے بعد شوال کے چھ روزے رکھے تو وہ اس طرح ہے جیسے سال بھر کے روزے رکھے ہوں۔“

——— شیخ ابن باز ———

شوال کے بعد چھ روزوں کی قضا

سوال ایک عورت ہر سال شوال کے چھ روزے رکھا کرتی ہے لیکن ایک سال رمضان کی ابتدا ہی میں اس کے ہاں بچے کی ولادت ہوئی اور پھر جب وہ رمضان کے بعد پاک ہوئی تو اس نے رمضان کے روزوں کی قضا شروع کر دی' تو کیا رمضان کے روزوں کی قضا کے بعد شوال کے چھ روزوں کی قضا بھی لازم ہے' خواہ یہ شوال کا مہینہ نہ بھی ہو یا صرف رمضان ہی کے روزوں کی قضا لازم ہے؟ کیا شوال کے یہ چھ روزے ہمیشہ رکھنا لازم ہیں یا نہیں؟

جواب شوال کے یہ چھ روزے سنت ہیں' فرض نہیں کیونکہ نبی کریم نے فرمایا ہے:

«مَنْ صَامَ رَمَضَانَ ثُمَّ أَتْبَعَهُ سِتًّا مِنْ شَوَّالٍ كَانَ كَصِيَامِ الدَّهْرِ»(صحيح مسلم، الصيام، باب استحباب ستة ايام ... الخ، ح:١١٦٤)

"جس نے رمضان کے روزے رکھے پھر اس کے بعد شوال کے چھ روزے رکھ لیے تو وہ اس طرح ہے جیسے سال بھر کے روزے رکھے ہوں۔"

یہ حدیث اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ اس میں کوئی حرج نہیں۔ یہ روزے مسلسل رکھ لیے جائیں یا متفرق کیونکہ حدیث کے الفاظ مطلق ہیں ہاں البتہ انہیں جلد رکھنا افضل ہے کیونکہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ وَعَجِلْتُ إِلَيْكَ رَبِّ لِتَرْضَىٰ ﴿٨٤﴾ ﴾ (طه٢٠/ ٨٤)

"اور اے میرے پروردگار! میں نے تیری طرف (آنے کی) جلدی اس لیے کی کہ تو خوش ہو۔"

علاوہ ازیں دیگر بہت سی آیات قرآنیہ اور احادیث نبویہ بھی اس بات پر دلالت کناں ہیں کہ نیکی کے کاموں میں مسابقت و مسارعت افضل ہے۔ ان روزوں کو ہمیشہ رکھنا واجب تو نہیں ہے ہاں البتہ افضل ضرور ہے کیونکہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا ہے:

«أَحَبُّ الْعَمَلِ إِلَى اللهِ مَادَاوَمَ عَلَيْهِ صَاحِبُهُ، وَإِنْ قَلَّ»(صحيح البخاري، الإيمان، باب احب الدين ... الخ، ح:٤٣ وصحيح مسلم، الصيام، باب صيام النبي ﷺ في غير رمضان ... الخ، ح:٧٨٢ (قبل الحديث:١١٥٧) واللفظ له)

"اللہ تعالیٰ کو وہ عمل بہت پسند ہے جسے عمل کرنے والا ہمیشہ سرانجام دے خواہ وہ عمل کم ہی ہو۔"

شوال کے ختم ہونے کے بعد ان روزوں کی قضا نہیں ہے کیونکہ یہ روزے سنت ہیں اور اب ان کا وقت ختم ہو گیا ہے خواہ وقت کسی عذر کی وجہ سے ختم ہوا یا بغیر عذر کے۔ واللہ ولی التوفیق۔

——— شیخ ابن باز ———

پہلے رمضان کی قضا دی جائے

سوال جس شخص کے ذمہ رمضان کے کچھ روزے باقی ہوں اور وہ شوال کے چھ روزے بھی رکھنا چاہتا ہو تو کیا وہ رمضان کے روزوں کی قضا سے پہلے شوال کے روزے رکھ سکتا ہے کیونکہ رمضان کے روزوں کی قضا تو سارا سال کسی بھی وقت ممکن ہے جبکہ یہ چھ روزے شوال ہی کے ساتھ مخصوص ہیں؟ امید ہے رہنمائی فرمائیں گے۔ اللہ تعالیٰ آپ کو اجر و ثواب سے نوازے۔

جواب مشروع یہ ہے کہ شوال کے چھ روزوں سے پہلے رمضان کے روزوں کی قضا دی جائے کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے:

«مَنْ صَامَ رَمَضَانَ ثُمَّ أَتْبَعَهُ سِتًّا مِنْ شَوَّالٍ»(صحيح مسلم، الصيام، باب استحباب صوم ستة ايام ... الخ، ح:١١٦٤)

"جس نے رمضان کے روزے رکھے پھر اس کے بعد شوال کے چھ روزے رکھے۔"

اور اگر رمضان کے روزوں کی قضا سے پہلے شوال کے روزے رکھ لیے تو وہ رمضان کے بعد نہ ہوئے بلکہ رمضان کے

بعض روزوں سے پہلے ہوئے اور پھر یہ کہ رمضان کے روزے تو فرض ہیں' لہذا انہیں پہلے مکمل کرنا افضل ہے۔

——— شیخ ابن باز ———

کفارہ کے روزوں سے پہلے شوال کے چھ روزے رکھنا جائز نہیں

سوال ایک آدمی کے ذمہ مسلسل دو ماہ کے روزوں کا کفارہ لازم ہے اور وہ شوال کے چھ روزے بھی رکھنا چاہتا ہے تو کیا اس کے لیے یہ روزے رکھنا جائز ہے؟

جواب واجب یہ ہے کہ جلدی سے پہلے کفارہ کے روزے رکھے جائیں۔ کفارہ کے روزوں سے پہلے شوال کے چھ روزے رکھنا جائز نہیں ہے کیونکہ یہ روزے نفل ہیں اور کفارہ کے روزے فرض ہیں اور انہیں فورا رکھنا فرض ہے۔ لہذا ضروری ہے کہ انہیں شوال کے چھ روزوں یا دیگر نفل روزوں سے پہلے رکھا جائے۔

——— شیخ ابن باز ———

نفل روزے کو توڑنا

سوال کیا نفل روزے میں یہ جائز ہے کہ روزے دار جب چاہے روزہ توڑ دے؟

جواب ہاں یہ جائز ہے لیکن افضل یہ ہے کہ روزہ پورا کیا جائے الا یہ کہ مہمان کی عزت افزائی' گرمی کی شدت یا اس طرح کے کسی اور سبب کی وجہ سے روزہ توڑنے کی ضرورت پیش آ جائے۔ یہ مسائل جو ہم نے ذکر کیے ہیں نبی ﷺ کی فرمودہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی حدیث سے ثابت ہیں۔[1] واللہ ولی التوفیق۔

——— شیخ ابن باز ———

نفلی روزے شوہر کی اجازت سے

سوال (شرعاً) مجھے یہ حق حاصل ہے کہ میں اپنی بیوی کو نفلی روزے مثلاً شوال کے چھ روزے رکھنے سے منع کر دوں؟ اگر منع کروں تو مجھے گناہ تو نہ ہو گا؟

جواب حدیث میں اس بات کی ممانعت آئی ہے کہ کوئی عورت اپنے شوہر کی موجودگی میں اس کی اجازت کے بغیر نفل روزے رکھے کیونکہ شوہر کو اس سے فائدہ اٹھانے کی ضرورت پیش آ سکتی ہے۔ اگر کسی عورت نے شوہر کی اجازت کے بغیر نفلی روزہ رکھا اور شوہر کو مباشرت کی ضرورت محسوس ہوئی تو اس کے لیے اس کے روزے کو توڑ دینا جائز ہے۔ اگر شوہر کو کوئی ایسی ضرورت درپیش نہ ہو تو پھر اس کے لیے یہ مکروہ ہے کہ اپنی بیوی کو روزے سے منع کرے بشرطیکہ روزہ بیوی کے لیے نقصان دہ نہ ہو یا روزے سے بچوں کی تربیت اور رضاعت میں کوئی فرق نہ آتا ہو۔ ان مسائل میں شوال کے چھ روزوں اور دیگر نفل روزوں کا حکم یکساں ہے۔

——— شیخ ابن جبرین ———

[1] صحیح مسلم' الصیام' باب جواز صوم النافلة بنية من النهار ..... الخ' حدیث: 1154۔

نفل روزوں کی قضا نہیں

سوال میں ہر ماہ تین روزے رکھتا ہوں۔ ایک ماہ بیماری کی وجہ سے میں روزے نہ رکھ سکا تو کیا ان کی قضا یا کفارہ لازم ہے؟

جواب نفل روزوں کی قضا نہیں' خواہ انہیں اپنے اختیار ہی سے کیوں نہ ترک کیا ہو' ہاں البتہ ایک مسلمان کے لیے یہ افضل ضرور ہے کہ جس عمل صالح کا معمول ہو اسے ہمیشہ سرانجام دے کیونکہ حدیث میں ہے:

«أَحَبُّ الْعَمَلِ إِلَى اللهِ أَدْوَمُهُ وَإِنْ قَلَّ»(صحيح البخاري، الرقاق، باب القصد والمداومة على العمل، ح:٦٤٦٤ وصحيح مسلم، صفات المنافقين، باب لن يدخل أحد الجنة بعمله ... الخ، ح:٢٨١٨ واللفظ له)

"اللہ تعالیٰ کو وہ عمل سب سے زیادہ پسند ہے جسے ہمیشہ سرانجام دیا جائے خواہ وہ تھوڑا ہو۔"

مذکورہ روزے نہ رکھنے کی وجہ سے آپ پر کوئی قضا یا کفارہ نہیں ہے۔ یاد رہے کہ انسان کا اگر کسی عمل صالح کا معمول ہو اور وہ بیماری یا کسی عذر یا سفر وغیرہ کی وجہ سے اسے سرانجام نہ دے سکے تو پھر بھی اس کے لیے اس کا اجروثواب لکھ دیا جاتا ہے۔ کیونکہ حدیث میں ہے:

«إِذَا مَرِضَ الْعَبْدُ أَوْ سَافَرَ كُتِبَ لَهُ مِثْلُ مَا كَانَ يَعْمَلُ مُقِيمًا صَحِيحًا» (صحيح البخاري، الجهاد والسير، باب يكتب للمسافر مثل ما كان يعمل ... الخ، ح:٢٩٩٦)

"جب (مومن) بندہ بیمار ہوتا ہے یا سفر کرتا ہے تو وہ جس قدر عبادات بحالت اقامت اور دوران صحت کرتا تھا اس کے لیے وہ سب لکھی جاتی ہیں۔"

——— فتویٰ کمیٹی ———

وہ ایام جن میں روزہ رکھنا منع ہے

سوال وہ کون سے ایام ہیں جن میں روزہ رکھنا مکروہ ہے؟

جواب وہ ایام جن میں روزہ رکھنے کی ممانعت ہے ان میں سے ایک تو جمعے کا دن ہے کہ یہ جائز نہیں کہ محض جمعے کے دن کا نفل روزہ رکھا جائے کیونکہ نبی ﷺ نے اس سے منع فرمایا ہے' [1] اسی طرح صرف ہفتے کے دن کا روزہ رکھنا بھی منع ہے لیکن اگر جمعے کے دن کے ساتھ ہفتے یا جمعرات کا بھی روزہ رکھ لے تو پھر کوئی حرج نہیں جیسا کہ نبی ﷺ کی احادیث سے ثابت ہے۔ اسی طرح عیدالفطر' عیدالاضحیٰ اور ایام تشریق کے روزے رکھنا بھی حرام ہے۔ نبی ﷺ نے ان دنوں کے روزوں سے منع فرمایا ہے۔ [2] ہاں البتہ یہ ثابت ہے کہ اس شخص کیلئے ایام تشریق میں (حج) تمتع اور قران کی ہدی کے بجائے روزے رکھنا جائز ہے جس کے پاس ہدی کی استطاعت نہ ہو کیونکہ صحیح بخاری میں حضرت عائشہ اور ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے:

---

[1] صحیح بخاری' الصوم' باب صوم یوم الجمعة ..... الخ' حدیث: 1985 و صحیح مسلم' الصیام' حدیث: 1144۔

[2] صحیح بخاری' الصوم' باب صوم یوم الفطر' حدیث: 1990- 1991 و صحیح مسلم' الصیام' باب تحریم صوم یومي العیدین' حدیث: 1137۔

«لَمْ يُرَخَّصْ فِي أَيَّامِ التَّشْرِيقِ أَنْ يُصَمْنَ إِلاَّ لِمَنْ لَّمْ يَجِدِ الْهَدْيَ» (صحيح البخاري، الصوم، باب صيام أيام التشريق، ح:١٩٩٧، ١٩٩٨)

"ایام تشریق میں روزے رکھنے کی اجازت نہیں سوائے اس شخص کے جس کے پاس ہدی نہ ہو۔"

لیکن محض نفل یا دیگر اسباب کی وجہ سے روزے رکھنا جائز نہیں جس طرح عید کے دن روزہ رکھنا جائز نہیں اسی طرح رؤیت ہلال ثابت نہ ہو تو شعبان کی تیس بھی روزہ رکھنا جائز نہیں کیونکہ یہ یوم شک ہے۔ اور علما کے صحیح قول کے مطابق اس دن کا روزہ رکھنا جائز نہیں خواہ مطلع صاف ہو یا ابر آلود' کیونکہ احادیث صحیحہ اس دن کے روزے کی ممانعت پر دلالت کرتی ہیں۔ واللہ ولی التوفیق

——— شیخ ابن باز ———

تیرہ ذوالحج کا روزہ جائز نہیں

سوال ایام بیض' اگر تشریق میں آجائیں تو کیا ان دنوں کے روزے رکھنا جائز ہے یا نہیں؟

جواب ذوالحج کی تیرہ تاریخ کو کوئی نفل یا فرض روزہ رکھنا جائز نہیں کیونکہ اس کا شمار ایام اکل و شرب اور ذکر الٰہی میں ہے اور ان دنوں میں نبی کریم ﷺ نے روزے رکھنے سے منع فرمایا ہے اور کسی کو ان دنوں میں روزے رکھنے کی اجازت نہیں سوائے اس شخص کے جس کے پاس حج تمتع کی ہدی نہ ہو تو وہ ہدی کے بجائے تینوں ایام تشریق کے روزے رکھ سکتا ہے اور باقی سات روزے اپنے گھر واپس لوٹ کر رکھ لے کیونکہ صحیح بخاری میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا اور ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے:

«لَمْ يُرَخَّصْ فِي أَيَّامِ التَّشْرِيقِ أَنْ يُصَمْنَ إِلاَّ لِمَنْ لَّمْ يَجِدِ الْهَدْيَ» (صحيح البخاري، الصوم، باب صيام أيام التشريق، ح:١٩٩٧، ١٩٩٨)

"ایام تشریق میں روزے رکھنے کی اجازت نہیں سوائے اس شخص کے جس کے پاس ہدی نہ ہو۔"

ذوالحجہ کی چودہ اور پندرہ تاریخ کو روزہ رکھنے میں کوئی حرج نہیں کیونکہ ان کا شمار ایام تشریق میں نہیں ہے۔ وباللہ التوفیق۔

——— شیخ ابن باز ———

شعبان کی پندرھویں رات عبادت کی خاص رات نہیں ہے

سوال میں نے ایک کتاب میں پڑھا ہے کہ پندرہ شعبان کا روزہ (دوسری) بدعات میں سے ایک بدعت ہے جب کہ ایک دوسری کتاب میں پڑھا ہے کہ اس دن کا روزہ مستحب ہے۔ تو سوال یہ ہے کہ اس مسئلہ میں قطعی حکم کیا ہے؟

جواب شعبان کی پندرھویں رات کی فضیلت کے بارے میں کوئی ایک بھی صحیح اور مرفوع روایت ثابت نہیں ہے جس کے مطابق حتیٰ کہ فضائل اعمال میں بھی عمل کیا جا سکے۔ اس سلسلہ میں جو کچھ وارد ہے وہ یا تو بعض تابعین سے مقطوع آثار ہیں یا پھر ایسی احادیث ہیں جن میں صحیح ترین کے بارے میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ وہ موضوع یا بے حد ضعیف ہیں۔ یہ روایت بہت سے ایسے علاقوں میں مشہور ہے جن میں جہالت کا غلبہ ہے اور وہ لوگ از راہ جہالت یہ سمجھتے ہیں کہ اس رات

موت اور حیات کا فیصلہ ہوتا ہے....... الخ۔ لہٰذا اس رات کا قیام کیا جائے نہ دن کا روزہ رکھا جائے اور نہ کسی بھی معین عبادت کے لیے اس رات کو مخصوص کیا جائے۔ جاہلوں کی ایک کثیر تعداد اس رات کو جو اعمال سرانجام دیتی ہے اس کا کوئی اعتبار نہیں۔ واللہ اعلم

—————— شیخ ابن جبرین ——————

شب عاشوراء کی تلاش کا حکم

سوال بہت سے لوگ یوم عاشوراء کا روزہ رکھتے اور اس کا خاص اہتمام کرتے ہیں کیونکہ وہ اس کی ترغیب کے بارے میں مبلغین سے سنتے رہتے ہیں۔ تو لوگوں کو اس طرف کیوں توجہ نہیں دلائی جاتی کہ وہ ہلال محرم کو خاص اہتمام سے دیکھیں اور پھر ریڈیو یا دیگر ذرائع ابلاغ سے اس کا باقاعدہ اعلان کر دیا جائے؟

جواب یوم عاشوراء کا روزہ سنت اور مستحب ہے۔ نبی کریم ﷺ اور حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے اس دن کا روزہ رکھا ہے [1] اور اس سے پہلے اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرنے کی نیت سے حضرت موسیٰ علیہ السلام نے بھی اس دن کا روزہ رکھا تھا کیونکہ اس دن اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام اور ان کی قوم کو نجات دی اور فرعون اور اس کی قوم کو تباہ و برباد کر دیا تھا۔ تو اس نجات کی خوشی میں موسیٰ علیہ السلام اور بنی اسرائیل نے اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرتے ہوئے روزہ رکھا تھا۔ پھر نبی کریم ﷺ نے بھی اللہ تعالیٰ کا شکر اور اللہ کے نبی موسیٰ علیہ السلام کے اسوہ کے پیش نظر اس دن کا روزہ رکھا بلکہ اہل جاہلیت بھی اس دن کا روزہ رکھا کرتے تھے۔ رسول اللہ ﷺ نے بھی اپنی امت کو اس روزے کی کافی تاکید فرمائی تھی لیکن جب اللہ تعالیٰ نے رمضان کے روزے فرض کر دیئے تو آپ نے اس روزے کے بارے میں فرمایا:

«مَنْ شَاءَ صَامَ وَمَنْ شَاءَ أَفْطَرَ»(صحيح البخاري، الصوم، باب صوم يوم عاشوراء، ح:٢٠٠١)

"اب جو چاہے رکھ لے اور جو چاہے نہ رکھے۔"

نبی ﷺ نے ہمیں یہ بھی بتایا ہے کہ اس ایک دن کے روزے کی وجہ سے اللہ تعالیٰ گزشتہ سال کے گناہ معاف فرما دیتا ہے۔ افضل یہ ہے کہ یہودیوں کی مخالفت کی وجہ سے اس سے ایک دن پہلے یا ایک دن بعد کا بھی روزہ رکھ لیا جائے کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے یہ فرمایا:

«صُومُوا يَوْمًا قَبْلَهُ أَوْ يَوْمًا بَعْدَهُ» (مسند أحمد:١/ ٢٤١ واللفظ له،السنن الكبرى للبيهقي:٤/ ٢٨٧ وصحيح ابن خزيمة، الصيام، جماع ابواب صوم التطوع، باب الأمر بأن يصام قبل عاشوراء ... الخ، ح:٢٠٩٥)

"اس سے پہلے یا بعد بھی ایک دن کا روزہ رکھ لو۔"

ایک روایت میں الفاظ یہ ہیں:

«صُومُوا يَوْمًا قَبْلَهُ وَيَوْمًا بَعْدَهُ» (مسند أحمد:١/ ٢٤١ واللفظ له والسنن الكبرى للبيهقي:٤/ ٢٨٧

[1] صحیح بخاری' الصوم' باب صوم یوم عاشوراء' حدیث : 2001 ' 2007 و صحیح مسلم' الصیام' باب صوم یوم عاشوراء' حدیث : 1125' وما بعدہ۔

وصحيح ابن خزيمة، الصيام، جماع ابواب صوم التطوع، باب الأمر بأن يصام قبل عاشوراء ... الخ، ح: ٢٠٩٥)

"اس سے پہلے ایک دن اور اس کے بعد ایک دن کا بھی روزہ رکھ لو۔"

لہذا اگر کوئی شخص دو یا تین روزے رکھ لے تو یہ سب صورتیں بہتر ہیں اور اس میں اللہ کے دشمن یہودیوں کی مخالفت بھی ہے۔ شب عاشوراء کی تلاش و جستجو، تو یہ کوئی ضروری چیز نہیں کیونکہ یہ نفل ہے، فرض نہیں۔ لہذا ہلال محرم کی تلاش اور جستجو کی دعوت لازم نہیں ہے۔ کیونکہ مومن اگر غلطی کی وجہ سے ایک دن پہلے یا ایک دن بعد روزہ رکھ لے تو اس میں کوئی حرج نہیں بلکہ اسے ہر حال میں اجر عظیم ملے گا۔ لہذا محض اس وجہ سے مہینے کی ابتدا کا خاص خیال رکھنا ضروری نہیں کیونکہ ان سب عبادتوں کی حیثیت فقط نفل کی ہے۔

——— شیخ ابن باز ———

یوم عاشوراء کا روزہ

سوال یوم عاشوراء کے روزے کے بارے میں کیا حکم ہے؟ کیا اس کے ساتھ اس سے پہلے دن کا روزہ رکھنا افضل ہے یا بعد والے دن کا؟ یا ان سب دنوں کا روزہ رکھا جائے یا صرف یوم عاشوراء کا؟ امید ہے وضاحت فرمائیں گے۔ جزاکم اللہ خیرًا

جواب یوم عاشوراء کا روزہ رکھنا سنت ہے کیونکہ رسول اللہ ﷺ کی صحیح احادیث سے یہ ثابت ہے۔[1] یہودی بھی اس دن کا روزہ رکھا کرتے تھے کیونکہ اس دن اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام اور آپ کی قوم کو نجات عطا فرمائی اور فرعون اور اس کی قوم کو ہلاک کر دیا تھا۔ ہمارے نبی حضرت محمد ﷺ نے اس پر اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرنے کے لیے روزہ رکھا اور ہمیں روزہ رکھنے کا حکم بھی دیا اور فرمایا: "اس سے ایک دن پہلے یا بعد بھی روزہ رکھ لو۔"

افضل یہ ہے کہ دس کے ساتھ نو تاریخ کا بھی روزہ رکھا جائے۔ اگر دس کے ساتھ گیارہ تاریخ کا روزہ رکھ لیا جائے تو یہودیوں کی مخالفت کی وجہ سے یہ بھی صحیح ہے۔ اگر دس کے ساتھ نو اور گیارہ یعنی تین روزے رکھ لیے جائیں تو اس میں بھی کوئی حرج نہیں کیونکہ بعض روایت میں الفاظ یہ ہیں:

«صُومُوا يَوْمًا قَبْلَهُ وَيَوْمًا بَعْدَهُ»(مسند أحمد: ١/٢٤١ واللفظ له والسنن الكبرى للبيهقي: ٤/٢٨٧ وصحيح ابن خزيمة، الصيام، جماع ابواب صوم التطوع، باب الأمر بأن يصام قبل عاشوراء ... الخ، ح: ٢٠٩٥)

"اس سے ایک دن پہلے اور ایک دن بعد کا بھی روزہ رکھ لو۔"

ہاں البتہ صرف دس محرم کا روزہ رکھنا مکروہ ہے۔ واللہ ولی التوفیق۔

---

[1] صحیح بخاری، الصوم، باب صوم یوم عاشوراء حدیث: 2001، 2007 و صحیح مسلم، الصیام باب صوم یوم عاشوراء حدیث 1125، وما بعدہ۔

شیخ ابن باز

یوم عاشوراء کے روزے کے متعلق فتویٰ

سوال جس نے نو اور دس تاریخ کا روزہ رکھا لیکن بعد میں معلوم ہوا کہ یہ تو محرم کی آٹھ اور نو تاریخ تھی تو اس کے بارے میں کیا حکم ہے؟ کیا اس کی قضا لازم ہے؟

جواب اس کی قضا نہیں ہے۔ حسب نیت ان شاء اللہ اجر و ثواب بھی پورا ملے گا کیونکہ اس نے تو ان کو نواں اور دسواں دن سمجھا تھا جیسا کہ ڈائریوں اور کیلنڈروں میں لکھا ہوا تھا۔ لہٰذا اسے اجر و ثواب ملے گا' دو دنوں کا اجروثواب اور اس صورت میں قضا بھی نہیں۔

سوال اگر نو تاریخ کو معلوم ہو کہ کل دس تاریخ ہے تو کیا پھر بھی تین دنوں کے مسلسل روزے رکھے؟

جواب ہاں افضل یہ ہے کہ وہ مسلسل روزے رکھے تاکہ محرم کی دس تاریخ کا یقینی طور پر روزہ رکھ سکے۔ افضل یہی ہے اور اگر روزہ نہ رکھے تو پھر بھی کوئی حرج نہیں اور اس طرح اس کا دسویں تاریخ کا روزہ فوت ہو جائے گا۔

شیخ ابن باز

باب ہشتم
کتاب
المناسک

حج کے مسائل

بیت اللہ الحرام کے حجاج کے لیے نصیحت

اَلْحَمْدُ للهِ وَحْدَهُ وَالصَّلٰوةُ وَالسَّلَامُ عَلٰى عَبْدِهِ وَرَسُوْلِهِ نَبِيِّنَا مُحَمَّدٍ وَعَلٰى آلِهِ وَأَصْحَابِهِ وَمَنْ تَبِعَهُمْ بِإِحْسَانٍ إِلٰى يَوْمِ الدِّينِ

اے مسلمانو! بیت اللہ الحرام کے حاجیو!

میں اللہ تعالیٰ سے اپنے لیے اور آپ کے لیے دعا کرتا ہوں کہ وہ ہمیں ان اعمال کی توفیق بخشے جو اس کی رضا کا موجب ہوں' وہ ہمیں گمراہ کن فتنوں سے محفوظ رکھے۔ میں اللہ تعالیٰ سے یہ دعا بھی کرتا ہوں کہ وہ آپ سب کو مناسک حج اس طرح ادا کرنے کی توفیق عطا فرمائے جس سے وہ راضی ہو جائے۔ اللہ تعالیٰ تمہارے حج کو شرف قبولیت سے نوازے اور تمہیں اپنے وطنوں کی طرف سلامتی و عافیت کے ساتھ واپس لوٹائے۔ انہ خیر مسؤول۔

اے مسلمانو! میری تم سب کے لیے وصیت یہ ہے کہ تمام حالات میں اللہ سبحانہ و تعالیٰ کے تقویٰ کو اختیار کرو' اس کے دین سے استقامت کے ساتھ وابستہ رہو اور ان اسباب سے بچو جو اس کی ناراضی کا باعث بنتے ہوں۔ سب سے اہم فرض اور سب سے عظیم واجب اللہ تعالیٰ کی توحید اور تمام عبادات میں اس کے لیے اخلاص ہے اور اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی ازبس ضروری ہے کہ تمام اقوال و اعمال میں رسول اللہ ﷺ کی اتباع کو بھی پیش نظر رکھا جائے۔ تمام مناسک حج اور دیگر تمام عبادات کو اس طرح سرانجام دیا جائے جس طرح اللہ تعالیٰ نے انہیں اپنے بندوں کو اپنے رسول و خلیل' سرور کائنات' ہمارے نبی و امام اور سردار حضرت محمد بن عبداللہ ﷺ کی زبانی حکم دیا ہے۔

اسی طرح سب سے بڑا گناہ اور سب سے خطرناک جرم اللہ سبحانہ و تعالیٰ کی ذات گرامی کے ساتھ شرک کرنا ہے۔ شرک یہ ہے کہ عبادت یا عبادت کا کچھ حصہ غیر اللہ کے لیے ادا کیا جائے۔ یہ اتنا بڑا گناہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اسے ہرگز ہرگز معاف نہیں فرمائے گا۔ جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ إِنَّ ٱللَّهَ لَا يَغْفِرُ أَن يُشْرَكَ بِهِۦ وَيَغْفِرُ مَا دُونَ ذَٰلِكَ لِمَن يَشَآءُ ﴾ (النساء ٤/ ٤٨)

"یقیناً اللہ اس گناہ کو نہیں بخشے گا کہ کسی کو اس کا شریک بنایا جائے اور اس کے سوا اور گناہ جس کو چاہے معاف فرما دے۔"

اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی حضرت محمد ﷺ سے مخاطب ہوتے ہوئے فرمایا:

﴿ وَلَقَدْ أُوحِىَ إِلَيْكَ وَإِلَى ٱلَّذِينَ مِن قَبْلِكَ لَئِنْ أَشْرَكْتَ لَيَحْبَطَنَّ عَمَلُكَ وَلَتَكُونَنَّ مِنَ ٱلْخَٰسِرِينَ ﴿٦٥﴾ ﴾ (الزمر ٣٩/ ٦٥)

"اور (اے محمد!) تمہاری طرف اور ان (پیغمبروں) کی طرف جو تم سے پہلے ہو چکے ہیں یہی وحی بھیجی گئی ہے کہ

اگر تم نے شرک کیا تو تمہارے عمل برباد ہو جائیں گے اور تم زیاں کاروں میں سے ہو جاؤ گے۔"

بیت اللہ الحرام کے حاجیو! مدینہ منورہ کی طرف ہجرت کے بعد ہمارے نبی ﷺ نے صرف ایک حج کیا ہے اور یہ وہی حج ہے جو آپ نے اپنی حیات پاک کے آخری دور میں کیا ہے اور یہ حجۃ الوداع کے نام سے معروف ہے' اس حج میں آپ نے لوگوں کو اپنے قول و عمل سے مناسک حج کی تعلیم دی اور ان سے فرمایا:

«خُذُوْا عَنِّي مَنَاسِكَكُمْ»(السنن الكبرى للبيهقي: ٥/ ١٢٥)

"لوگو! مجھ سے مناسک حج سیکھ لو۔"

لہٰذا تمام مسلمانوں پر یہ واجب ہے کہ فریضہ حج ادا کرتے ہوئے آپ کے اسوۂ حسنہ کو اپنے سامنے رکھیں اور مناسک حج اس طرح ادا کریں جس طرح آپ نے انہیں سکھایا ہے کیونکہ آپ وہ معلم و مرشد ہیں' جنہیں اللہ تعالیٰ نے رحمۃ للعالمین بنا کر مبعوث فرمایا ہے اور آپ تمام بندگان الٰہی کے لیے حجت ہیں' اس لیے تو اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کو یہ حکم دیا ہے کہ وہ آپ کی اطاعت کریں اور اللہ تعالیٰ نے یہ بھی بیان فرمایا ہے کہ آپ کی اطاعت ہی جنت میں داخلہ اور جہنم کی آگ سے نجات کا ذریعہ ہوگی اور یہ اس بات کی دلیل بھی ہے کہ بندے کو اپنے رب سے اور رب تعالیٰ کو اپنے بندے سے سچی محبت ہے جس طرح کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ وَمَآ ءَاتَىٰكُمُ ٱلرَّسُولُ فَخُذُوهُ وَمَا نَهَىٰكُمْ عَنْهُ فَٱنتَهُوا۟ ﴾ (الحشر٥٩/ ٧)

"اور جو چیز تم کو پیغمبر دیں وہ لے لو اور جس سے منع کریں (اس سے) باز رہو۔"

اور فرمایا:

﴿ وَأَقِيمُوا۟ ٱلصَّلَوٰةَ وَءَاتُوا۟ ٱلزَّكَوٰةَ وَأَطِيعُوا۟ ٱلرَّسُولَ لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُونَ ﴿٥٦﴾ ﴾ (النور٢٤/ ٥٦)

"اور نماز پڑھتے رہو اور زکوٰۃ دیتے رہو اور (اللہ کے) رسول (ﷺ) کے فرمان پر چلتے رہو تاکہ تم پر رحمت کی جائے۔"

اور فرمایا:

﴿ لَّقَدْ كَانَ لَكُمْ فِى رَسُولِ ٱللَّهِ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ لِّمَن كَانَ يَرْجُوا۟ ٱللَّهَ وَٱلْيَوْمَ ٱلْءَاخِرَ وَذَكَرَ ٱللَّهَ كَثِيرًا ﴿٢١﴾ ﴾

(الأحزاب٣٣/ ٢١)

"رسول اللہ کی ذات میں بہترین اور عمدہ نمونہ موجود ہے (یعنی) اس شخص کے لیے جسے اللہ (سے ملنے) اور روز قیامت (کے آنے) کی امید ہو اور وہ اللہ کا ذکر کثرت سے کرتا ہو۔"

اور فرمایا:

﴿ وَمَن يُطِعِ ٱللَّهَ وَرَسُولَهُۥ يُدْخِلْهُ جَنَّٰتٍ تَجْرِى مِن تَحْتِهَا ٱلْأَنْهَٰرُ خَٰلِدِينَ فِيهَا ۚ وَذَٰلِكَ ٱلْفَوْزُ ٱلْعَظِيمُ ﴿١٣﴾ وَمَن يَعْصِ ٱللَّهَ وَرَسُولَهُۥ وَيَتَعَدَّ حُدُودَهُۥ يُدْخِلْهُ نَارًا خَٰلِدًا فِيهَا وَلَهُۥ عَذَابٌ مُّهِينٌ ﴿١٤﴾ ﴾ (النساء٤/ ١٣۔١٤)

"اور جو شخص اللہ اور اس کے رسول کی فرماں برداری کرے گا' اللہ تعالیٰ اس کو ایسے باغات میں داخل فرمائیں گے جس میں نہریں بہہ رہی ہیں' وہ ان میں ہمیشہ رہیں گے اور یہ بہت بڑی کامیابی ہے اور جو شخص اللہ اور اس کے رسول کی نافرمانی کرے گا اور اس کی حدوں سے نکل جائے گا اس کو اللہ تعالیٰ دوزخ میں

ڈالیں گے جہاں وہ ہمیشہ رہے گا اور اس کو رسوا کن عذاب ہو گا۔"

اور فرمایا:

﴿ قُلْ يَٰٓأَيُّهَا ٱلنَّاسُ إِنِّى رَسُولُ ٱللَّهِ إِلَيْكُمْ جَمِيعًا ٱلَّذِى لَهُۥ مُلْكُ ٱلسَّمَٰوَٰتِ وَٱلْأَرْضِ ۖ لَآ إِلَٰهَ إِلَّا هُوَ يُحْىِۦ وَيُمِيتُ ۖ فَـَٔامِنُوا۟ بِٱللَّهِ وَرَسُولِهِ ٱلنَّبِىِّ ٱلْأُمِّىِّ ٱلَّذِى يُؤْمِنُ بِٱللَّهِ وَكَلِمَٰتِهِۦ وَٱتَّبِعُوهُ لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُونَ ﴿١٥٨﴾ ﴾ (الأعراف۷/ ۱۵۸)

"(اے محمد!) کہہ دیجئے اے لوگو! میں تم سب کی طرف اللہ کا (بھیجا ہوا رسول ہوں (وہ اللہ) جس کے لیے آسمانوں اور زمین کی بادشاہت ہے۔ اس کے سوا کوئی معبود نہیں۔ وہی زندگانی بخشتا اور وہی موت دیتا ہے۔ سو تم اللہ پر ایمان لاؤ اور اس کے رسول نبی امی پر' جو اللہ پر اور اس کے تمام کلام (خود بھی) پر ایمان رکھتے ہیں۔ اور ان کی پیروی کرو تاکہ ہدایت پاؤ۔"

اور فرمایا:

﴿ قُلْ إِن كُنتُمْ تُحِبُّونَ ٱللَّهَ فَٱتَّبِعُونِى يُحْبِبْكُمُ ٱللَّهُ وَيَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوبَكُمْ ﴾ (آل عمران۳/ ۳۱)

"(اے پیغمبر! لوگوں سے) فرما دیجئے کہ اگر تم اللہ کو دوست رکھتے ہو تو میری پیروی کرو' اللہ بھی تمہیں دوست رکھے گا اور تمہارے گناہ معاف کر دے گا۔" (اس مضمون کی اور بھی بہت سی آیات ہیں۔)

تو آپ سب کے لیے اور اپنے لیے بھی میری وصیت یہ ہے کہ تمام حالات میں اللہ تعالیٰ کے تقویٰ کو پیش نظر رکھا جائے اور صدق دل سے تمام اقوال و افعال میں حضرت محمد ﷺ کی اطاعت و فرماں برداری کی جائے کہ اس میں دنیا و آخرت کی سعادت اور نجات کا راز مضمر ہے۔

اے بیت اللہ الحرام کے حجاج کرام!

ہمارے نبی محمد ﷺ آٹھ ذوالحج کو مکہ مکرمہ سے منیٰ کی طرف لبیک کہتے ہوئے روانہ ہوئے۔[1] آپ نے حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو بھی یہ حکم دیا کہ وہ اپنی اپنی رہائش گاہوں سے احرام باندھ لیں اور منیٰ کی طرف چل پڑیں۔ اس موقع پر آپ نے انہیں طواف وداع کا حکم نہیں دیا تھا۔ تو اس سے معلوم ہوا کہ سنت یہ ہے کہ جو شخص حج کا ارادہ کرے خواہ اس کا تعلق اہل مکہ سے ہو یا وہ باہر سے آ کر یہاں مقیم ہوا ہو یا وہ عمرہ سے حلال ہوا ہو تو وہ آٹھ ذوالحج کو لبیک کہتے ہوئے منیٰ کی طرف روانہ ہو۔ اس موقع پر حجاج کے لیے یہ حکم نہیں ہے کہ وہ مسجد حرام میں جا کر کعبہ کا طواف وداع کریں۔

حج کا احرام باندھتے وقت بھی مسلمان کے لیے یہ مستحب ہے کہ اسی طرح کے کام کرے جس طرح اس نے میقات پر احرام باندھتے ہوئے کئے تھے یعنی غسل کرے' خوشبو استعمال کرے اور صفائی وغیرہ کر لے جیسا کہ نبی ﷺ نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کو اس کا حکم دیا تھا جب انہوں نے حج کا احرام باندھنے کا ارادہ کیا تھا۔[2] انہوں نے عمرہ کا احرام باندھا تھا کہ دخول مکہ کے وقت ماہانہ معمول شروع ہو گیا جس کی وجہ سے منیٰ کی طرف جانے سے پہلے ان کے لیے طواف مشکل تھا' اس لیے آپ نے حکم دیا کہ غسل کر لیں اور حج کا احرام باندھ لیں چنانچہ انہوں نے ایسا ہی کیا جس کی وجہ سے ان کا حج

---

[1] صحیح مسلم' الحج' باب حجة النبی ﷺ' حدیث: 1218۔

[2] صحیح بخاری' الحج' کیف تهل الحائض و النفساء' حدیث: 1556۔

قران ہو گیا یعنی ان کا حج اور عمرہ یکجا ہو گیا۔

رسول اللہ ﷺ اور آپ کے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے منیٰ میں فجر' ظہر' عصر' مغرب اور عشاء کی نمازیں قصر کر کے ادا فرمائیں اور انہیں جمع نہیں کیا تھا۔ [1] لہٰذا رسول اللہ ﷺ کے اسوہ کے پیش نظر سنت یہی ہے۔ نیز اس مرحلہ پر حجاج کے لیے یہ بھی سنت ہے کہ وہ تلبیہ' ذکر الٰہی' قرآن مجید کی تلاوت اور نیکی کے دیگر کاموں مثلاً دعوت الی اللہ' امر بالمعروف' نہی عن المنکر اور فقراء کے ساتھ احسان وغیرہ میں مشغول رہیں۔

عرفہ کے دن جب سورج طلوع ہوا تو رسول اللہ ﷺ اور آپ کے صحابہ رضی اللہ عنہم عرفات کی طرف روانہ ہوئے' [2] اس وقت کچھ لوگ تلبیہ اور کچھ تکبیر پڑھ رہے تھے۔ عرفات پہنچ کر رسول اللہ ﷺ بالوں کے بنے ہوئے ایک قبہ میں فروکش ہوئے جو بطور خاص آپ کے لیے بنایا گیا تھا اس قبہ کے سایہ سے بھی رسول اللہ ﷺ نے استفادہ فرمایا۔ اس سے معلوم ہوا کہ حاجیوں کے لیے خیموں اور درختوں کا سایہ استعمال کرنا جائز ہے۔

جب سورج ڈھل گیا تو نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام اپنی سواری پر جلوہ افروز ہوئے' آپ نے خطبہ ارشاد فرمایا' لوگوں کو وعظ و نصیحت فرمائی اور انہیں مناسک حج سکھائے۔ نیز انہیں سود اور اعمال جاہلیت سے ڈرایا اور فرمایا کہ ان کے خون' مال اور عزتیں ان کے لیے حرام ہیں۔ آپ نے کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ ﷺ کے دامن کو مضبوطی سے تھام لینے کا حکم دیا اور فرمایا کہ جب تک کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ ﷺ کو مضبوطی سے تھامے رکھو گے کبھی گمراہ نہیں ہو گے! [3]

لہٰذا تمام مسلمانوں پر یہ واجب ہے کہ وہ آپ کی اس وصیت پر عمل کریں' جہاں کہیں بھی ہوں اس پر استقامت کے ساتھ ڈٹ جائیں۔ تمام مسلمان حکمرانوں پر بھی یہ واجب ہے کہ وہ کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ کو مضبوطی سے تھام لیں' تمام معاملات میں انہی کے مطابق عمل کریں' اپنی اپنی رعایا کو بھی ان کے مطابق عمل کا پابند بنائیں کیونکہ دنیا و آخرت میں صرف یہی عزت و کرامت اور سعادت و نجات کا راستہ ہے۔ اللہ تعالیٰ تمام مسلمانوں کو کتاب و سنت کے مطابق عمل پیرا ہونے کی توفیق عطا فرمائے۔

پھر نبی ﷺ نے لوگوں کو ظہر و عصر کی نمازیں قصر اور جمع کے ساتھ جمع تقدیم کی صورت میں پڑھائیں' اذان ایک بار لیکن اقامت دوبار یعنی ہر نماز کے لیے الگ الگ اقامت کہی گئی تھی [4] اور آپ موقف کی طرف متوجہ ہوئے' قبلہ کی طرف رخ انور کیا' سواری پر جلوہ افروز ہو کر اللہ کے ذکر اور دعا میں مشغول ہو گئے' دعا دونوں ہاتھ اٹھا کر کی اور ذکر و دعا کا یہ سلسلہ غروب آفتاب تک جاری رہا۔ اس دن آپ نے روزہ بھی نہیں رکھا ہوا تھا۔ اس سے معلوم ہوا کہ حجاج کرام کو چاہیئے کہ عرفات میں تمام افعال اسی طرح سرانجام دیں جس طرح رسول اللہ ﷺ نے سرانجام دیئے تھے یعنی ذکر الٰہی' دعا اور تلبیہ میں غروب آفتاب تک مشغول رہیں' دعا دونوں ہاتھ اٹھا کر کریں اور یہاں روزہ بھی نہ رکھیں۔ صحیح حدیث میں ہے' رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

---

[1] صحیح مسلم' الحج' باب حجۃ النبی ﷺ ' حدیث: 1218۔

[2] صحیح بخاری' الحج' باب التلبیۃ والتکبیر ..... الخ' حدیث: 1659 و باب التھجیر بالرواح' یوم عرفۃ' حدیث: 1660۔

[3] صحیح مسلم' الحج' باب حجۃ النبی ﷺ ' حدیث: 1218۔

[4] صحیح مسلم' الحج' باب حجۃ النبی ﷺ ' حدیث: 1218۔

«مَا مِنْ يَوْمٍ أَكْثَرَ مِنْ أَنْ يُعْتِقَ اللهُ عَزَّوَجَلَّ فِيهِ عَبْدًا مِّنَ النَّارِ، مِنْ يَوْمِ عَرَفَةَ، وَإِنَّهُ "سُبْحَانَهُ" لَيَدْنُو ثُمَّ يُبَاهِي بِهِمُ الْمَلَائِكَةَ» (صحيح مسلم، الحج، باب فضل يوم عرفة، ح:١٣٤٨)

"جس کثرت کے ساتھ اللہ تعالیٰ بندوں کو عرفہ کے دن جہنم سے آزادی عطا کرتا ہے اور کسی دن اس کثرت سے نہیں۔ اللہ سبحانہ و تعالیٰ اپنے بندوں کے قریب ہو کر ان پر اپنے فرشتوں کے سامنے فخر کرتا ہے۔"

رسول اللہ ﷺ نے یہ بھی بیان کیا کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

«أُنْظُرُوا إِلَى عِبَادِي أَتَوْنِي شُعْثًا غُبْرًا يَرْجُونَ رَحْمَتِي أُشْهِدُكُمْ أَنِّي قَدْ غَفَرْتُ لَهُمْ» (صحيح ابن خزيمة، الحج، باب تباهي الله أهل السماء بأهل عرفات، ح:٢٨٤٠ وصحيح ابن حبان، الحج، باب ما جاء في الوقوف بعرفة والمزدلفة، ح:١٠٠٦)

"میرے بندوں کی طرف ذرا دیکھو تو سہی' میرے پاس پراگندہ حال اور غبار آلود ہو کر آئے ہیں۔ یہ میری رحمت کے طلب گار ہیں۔ میں تمہیں گواہ بنا کر یہ اعلان کرتا ہوں کہ میں نے انہیں معاف کر دیا ہے۔"

یہ بھی صحیح حدیث سے ثابت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

«وَقَفْتُ هَاهُنَا وَعَرَفَةُ كُلُّهَا مَوْقِفٌ» (صحيح مسلم، الحج، باب ما جاء أن عرفة كلها موقف، ح:١٤٩/١٢١٨)

"میں نے یہاں وقوف کیا ہے لیکن سارا عرفہ موقف ہے۔"

رسول اللہ ﷺ بعد ازاں غروب آفتاب کے بعد لبیک کہتے ہوئے مزدلفہ کی طرف روانہ ہوئے' وہاں آپ نے نماز مغرب کی تین اور عشاء کی دو رکعتیں ایک اذان اور دو اقامتوں کے ساتھ ادا فرمائیں' رات بھی یہیں بسر فرمائی اور صبح کی نماز سنتوں سمیت ایک اذان اور ایک اقامت کے ساتھ ادا فرمائی۔ [1] پھر آپ مشعر کے پاس تشریف لے آئے اس کے پاس اللہ کا ذکر کیا' تکبیر اور تہلیل میں مصروف رہے اور دونوں ہاتھ اٹھا کر دعا کی اور فرمایا:

«وَقَفْتُ هَاهُنَا وَجَمْعٌ كُلُّهَا مَوْقِفٌ» (صحيح مسلم، الحج، باب ما جاء أن عرفة كلها موقف، ح:١٤٩/١٢١٨)

"میں نے یہاں وقوف کیا ہے جب کہ سارا مزدلفہ موقف ہے۔"

اس سے معلوم ہوا کہ حجاج کے لیے سارا مزدلفہ موقف ہے۔ ہر حاجی اپنی اپنی جگہ پر رات بسر کرے' اپنی جگہ ہی پر اللہ تعالیٰ کا ذکر اور استغفار کرے اور یہ ضروری نہیں کہ صرف اسی جگہ وقوف کیا جائے جہاں رسول اللہ ﷺ نے وقوف فرمایا تھا۔ نبی ﷺ نے کمزور لوگوں کو مزدلفہ کی رات ہی رخصت دے دی تھی کہ وہ رات کے وقت ہی منیٰ روانہ ہو جائیں [2] تو اس سے معلوم ہوا کہ کمزوروں یعنی عورتوں' بیماروں اور بوڑھوں وغیرہ کے لیے اس رخصت پر عمل کرتے ہوئے

---

[1] صحیح مسلم' الحج' باب حجة النبي ﷺ' حدیث: 1218۔

[2] صحیح بخاری' الحج' باب من قدم ضعفة اهله بليل ..... الخ' حدیث: 1676 و صحیح مسلم' الحج' باب استحباب تقديم دفع الضعفة ..... الخ' حدیث: 1295۔

رات کے آخری حصہ میں مزدلفہ سے منیٰ کی طرف چلے جانے میں کوئی حرج نہیں تاکہ وہ بھیڑ کی مشقت سے بچ سکیں۔ ان کے لیے رات کو جمرہ کو رمی کرنا بھی جائز ہے جیسا کہ حضرت ام سلمہ اور حضرت اسماء بنت ابی بکر رضی اللہ عنہم سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے عورتوں کو اس کی اجازت دے دی تھی‘ (1) پھر جب خوب اچھی طرح دن روشن ہوگیا تو نبی ﷺ تلبیہ پڑھتے ہوئے منیٰ کی طرف روانہ ہوئے‘ (2) جمرہ عقبہ کا قصد فرمایا‘ اسے سات کنکریاں ماریں اور ہر کنکری کے ساتھ اللہ اکبر کہا‘ پھر آپ نے اپنی ہدی کو نحر کیا اور پھر سر مبارک کے بال منڈوا دیئے‘ پھر حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے آپ کو خوشبو لگائی‘ پھر آپ بیت اللہ شریف تشریف لے گئے اور طواف فرمایا۔ نبی ﷺ سے قربانی کے دن یہ پوچھا گیا کہ جو شخص رمی سے پہلے قربانی کر دے‘ یا قربانی سے پہلے بال منڈوا دے یا رمی سے پہلے طواف افاضہ کر لے...... تو اس طرح کے تمام سوالوں کے جواب میں آپ نے فرمایا ”کوئی حرج نہیں۔“ (3)

راوی کا بیان ہے کہ اس دن جس چیز کے بھی مقدم یا مؤخر کر دینے کی بابت پوچھا گیا تو آپ نے فرمایا ”وہ کر لو کوئی حرج نہیں۔“ (4) ایک آدمی نے آپ سے یہ پوچھا کہ میں نے طواف سے پہلے سعی کر لی ہے۔ تو آپ نے فرمایا کوئی حرج نہیں۔“

اس سے معلوم ہوا کہ حاجیوں کے لیے سنت یہ ہے کہ وہ عید کے دن رمی جمرہ سے آغاز کریں پھر نحر کریں جب کہ ان پر ہدی لازم ہو اور پھر سر کے بالوں کو منڈوایا کترا دیں‘ لیکن بالوں کو منڈوا دینا کترا دینے سے افضل ہے کیونکہ نبی کریم ﷺ نے بال منڈوانے والوں کے لیے مغفرت و رحمت کی تین بار اور بال کتروانے والوں کے لیے ایک بار دعا فرمائی تھی...... (5)

اس سے حجاج کو تحلل اول حاصل ہو جاتا ہے یعنی وہ سلے ہوئے کپڑے پہن سکتے اور خوشبو استعمال کر سکتے ہیں اور ان کے لیے عورتوں کے سوا ہر اس چیز کا استعمال مباح ہو جاتا ہے جو احرام کی وجہ سے حرام ہوا تھا۔ پھر حجاج بیت اللہ جائیں اور عید کے دن یا اس کے بعد طواف کریں اور اگر حج تمتع ہے تو صفا و مروہ کی سعی بھی کریں‘ اس سے ان کے لیے عورتوں سمیت ہر وہ چیز حلال ہو جائے گی جو احرام کی وجہ سے حرام ہوئی تھی۔

حاجی اگر مفرد یا قارن ہو تو اس کے لیے وہ سعی اول ہی کافی ہے جو اس نے طواف قدوم کے ساتھ کی تھی اور اگر طواف قدوم کے ساتھ سعی نہ کی ہو تو ضروری ہے کہ طواف افاضہ کے ساتھ سعی کر لی جائے۔

پھر رسول اللہ ﷺ منیٰ واپس تشریف لے آئے اور آپ عید کے دن کا باقی حصہ اور گیارہ‘ بارہ اور تیرہ تاریخ تک یہیں مقیم رہے۔ ان ایام تشریق میں ہر دن آپ زوال کے بعد جمرات کو رمی کرتے رہے‘ ہر جمرہ کو سات کنکریاں مارتے‘ (6)

---

(1) صحیح بخاری‘ الحج‘ من قدم ضعفة اهله بليل ..... الخ‘ ح: 1679- و صحیح مسلم‘ الحج‘ باب استحباب تقديم دفع الضعفة ..... الخ‘ حدیث: 1291-

(2) صحیح بخاری‘ الحج‘ باب متى يدفع من جمع‘ حدیث: 1684 و باب التلبية والتكبير غداة النحر ..... الخ‘ حدیث: 1685-

(3) صحیح بخاری‘ الحج‘ باب الذبح قبل الحلق‘ حدیث: 1722 و صحیح مسلم‘ الحج‘ باب جواز تقديم الذبح على الرمى ..... الخ‘ حدیث: 1306 - 1307-

(4) حوالہ سابق-

(5) صحیح بخاری‘ الحج‘ باب الحلق والتقصير عند الاحلال‘ حدیث: 1727 - 1728 و صحیح مسلم‘ الحج‘ باب تفضيل الحلق على التقصير ..... الخ‘ حدیث: 1301 - 1302-

(6) سنن ابی داود‘ المناسک‘ باب فی رمی الجمار‘ حدیث: 1973-

ہر کنکری کے ساتھ اللہ اکبر پڑھتے اور جمرہ اولیٰ اور ثانیہ سے فراغت کے بعد ہاتھ اٹھا کر دعا کرتے۔ دعا کے وقت آپ جمرہ اولیٰ کو اپنی دائیں طرف اور دوسرے کو بائیں طرف کر لیتے لیکن تیسرے کے پاس وقوف نہ فرماتے۔ تیرہ تاریخ کو رمی جمرات کے بعد آپ روانہ ہوئے اور مقام ابطح میں تشریف لے آئے اور یہاں آپ نے ظہر' عصر' مغرب اور عشاء کی نمازیں ادا فرمائیں۔ [1]

پھر آپ رات کے آخری حصہ میں مکہ مکرمہ تشریف لے آئے' لوگوں کو نماز فجر پڑھائی' طواف وداع فرمایا اور پھر چودہ تاریخ کی صبح نماز فجر کے بعد آپ سوئے مدینہ رواں دواں ہو گئے۔ علیه من ربه افضل الصلاة والتسليم۔

اس سے معلوم ہوا کہ حاجی کے لیے سنت یہ ہے کہ ہر ہر عمل کو اس طرح سرانجام دے جس طرح نبی کریم ﷺ نے سرانجام دیا تھا۔ ایام منیٰ میں ہر دن تینوں جمروں کو زوال کے بعد رمی کرے' ہر جمرے کو سات کنکریاں مارے' ہر کنکری کے ساتھ اللہ اکبر کہے۔ جمرہ اولیٰ کو رمی کرنے کے بعد رک جائے اور قبلہ رخ ہو کر ہاتھ اٹھا کر دعا کرے۔ جمرہ اولیٰ کو اپنی بائیں طرف کر لے' جمرہ ثانیہ کو رمی کے بعد بھی وقوف کرے' اسے اپنی دائیں طرف کر لے' لیکن یاد رہے یہ مستحب ہے واجب نہیں ہے' تیسرے جمرے کی رمی کے بعد وقوف نہ کرے۔ اگر زوال کے بعد اور غروب آفتاب سے پہلے رمی کرنا ممکن نہ ہو تو علماء کے صحیح ترین قول کے مطابق آنے والی رات کے آخری حصہ تک رمی کر سکتا ہے۔ یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے اپنے بندوں پر رحمت اور وسعت ہے۔ جو شخص بارہ تاریخ ہی کو رمی جمار کے بعد جلدی کر لے اور چل دے تو اس میں کوئی حرج نہیں اور جو شخص یہ پسند کرے کہ وہ ٹھہرا رہے تاکہ تیرہ تاریخ کو بھی رمی جمار کر لے تو یہ افضل ہے کیونکہ یہ نبی کریم ﷺ کے عمل کے موافق ہے۔

حاجی کیلئے سنت یہ ہے کہ وہ گیارہ اور بارہ کی رات منیٰ میں بسر کرے' بہت سے اہل علم کے نزدیک یہ راتیں منیٰ میں بسر کرنا واجب ہے۔ اگر آسانی سے رات کا اکثر حصہ بسر کرنا ممکن ہو تو یہ بھی کافی ہے اگر کوئی شرعی عذر ہو جیسا کہ کارکنوں اور بکریوں کے چرواہوں وغیرہ کا عذر ہوتا ہے تو ان کے لیے یہاں رات بسر کرنا ضروری نہیں ہے۔ حجاج کیلئے تیرہ تاریخ کی رات منیٰ میں بسر کرنا واجب نہیں ہے جب کہ وہ جلدی کر کے غروب آفتاب سے قبل منیٰ سے رخصت ہو جائیں اور اگر رات منیٰ میں آ جائے تو پھر تیرہ تاریخ کی رات بھی منیٰ ہی میں بسر کی جائے اور تیرہ تاریخ کو زوال کے بعد رمی جمار کی جائے اور پھر وہاں سے رخصت ہو جائے۔ تیرہ تاریخ کے بعد کسی کیلئے رمی کا حکم نہیں ہے خواہ وہ منیٰ ہی میں مقیم ہو۔

حاجی جب اپنے وطن کی طرف واپسی کا ارادہ کرے تو اس کے لیے یہ ضروری ہے کہ طواف وداع کے لیے بیت اللہ شریف کے گرد سات چکر لگائے کیونکہ نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے:

«لاَ يَنْفِرَنَّ أَحَدٌ مِّنْكُمْ حَتَّى يَكُونَ آخِرُ عَهْدِهِ بِالْبَيْتِ»(صحيح مسلم، الحج، باب وجوب طواف الوداع ... الخ، ح: ١٣٢٧ ومسند أحمد: ١/ ٢٢٢)

”اس وقت تک کوئی شخص روانہ نہ ہو جب تک اپنا آخری وقت بیت اللہ میں نہ گزار لے۔“

ہاں البتہ حیض اور نفاس والی خواتین کیلئے طواف وداع نہیں ہے کیونکہ ابن عباس رضی اللہ عنہما سے یہ ثابت ہے [2] کہ لوگوں

---

[1] السنن الكبرى: 5/160 - 161۔

[2] صحیح بخاری' الحج' باب طواف الوداع' حديث: 1755 و صحيح مسلم' الحج' حديث: 1328۔

کو یہ حکم دیا گیا کہ وہ اپنا آخری وقت بیت اللہ میں گزاریں۔ ہاں البتہ حائضہ عورت سے تخفیف کر دی گئی (یعنی اسے اس سے مستثنیٰ قرار دے دیا گیا ہے۔)

جس شخص نے طواف افاضہ کو مؤخر کیا ہو اور وہ اب سفر شروع کرنے سے پہلے یہ طواف کرنا چاہتا ہو تو مذکورہ دونوں حدیثوں کے پیش نظر طواف افاضہ' طواف وداع سے بھی کفایت کرے گا یعنی ایک ہی طواف کافی ہو گا۔

میں اللہ تعالیٰ سے یہ دعا کرتا ہوں کہ وہ ہم سب کو اپنی رضا کے مطابق عمل کی توفیق عطا فرمائے' ہمارے اور آپ کے تمام اعمال کو شرف قبولیت سے نوازے' بے شک وہی قادر و کارساز ہے۔ وصلی اللّٰہ علی نبینا محمد و آلہ وصحبہ وسلم۔

فضیلۃ الشیخ کی حجاج کرام کو ایک اور نصیحت

عبدالعزیز بن عبداللہ بن باز کی طرف سے ہر اس مسلمان کے لیے جو اس تحریر کو دیکھے۔ اللہ تعالیٰ انہیں اپنی رضا کے مطابق عمل کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔

السلام علیکم ورحمۃ اللّٰہ وبرکاتہ' امابعد:

اللہ تعالیٰ نے یہ واجب قرار دیا ہے کہ ہر مسلمان کے ساتھ نیکی اور تقویٰ کے کاموں میں تعاون کیا جائے۔ مجھے بعض بھائیوں نے یہ بات بتائی ہے کہ منیٰ میں موجود بعض حاجی اپنے پڑوسیوں کے لیے سگریٹ نوشی اور گانوں کے ذریعے ایذاء رسانی کا سبب بنتے ہیں اور بلا شبہ دین کا یہ حکم سب کو معلوم ہے کہ مسلمانوں کو ایذاء پہنچانا حرام ہے کیونکہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ وَٱلَّذِينَ يُؤْذُونَ ٱلْمُؤْمِنِينَ وَٱلْمُؤْمِنَٰتِ بِغَيْرِ مَا ٱكْتَسَبُوا۟ فَقَدِ ٱحْتَمَلُوا۟ بُهْتَٰنًا وَإِثْمًا مُّبِينًا ﴿٥٨﴾ ﴾ (الأحزاب ٣٣/ ٥٨)

''اور جو لوگ مومن مردوں اور مومن عورتوں کو ایسے کام سے جو انہوں نے نہ کیا ہو' ایذاء دیں تو انہوں نے بہتان اور صریح گناہ کا بوجھ اپنے سر پر رکھا۔''

اگر یہ ایذاء رسانی سگریٹ نوشی یا ریڈیو یا گانوں کی کیسٹوں کی صورت میں ہو تو یہ ایذاء بہت بڑی اور یہ گناہ بہت عظیم ہو گا کیونکہ گانا سننا حرام ہے اور اسی طرح سگریٹ نوشی بھی دین و دنیا اور صحت کے لیے نقصان دہ اور حرام ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ وَمِنَ ٱلنَّاسِ مَن يَشْتَرِى لَهْوَ ٱلْحَدِيثِ لِيُضِلَّ عَن سَبِيلِ ٱللَّهِ ﴾ (لقمان ٣١/ ٦)

''اور لوگوں میں بعض ایسا ہے جو بے ہودہ حکایتیں خریدتا ہے تاکہ (لوگوں کو) اللہ کے راستے سے گمراہ کرے۔''

اکثر علماء کے بقول اس آیت کریمہ میں ''لھوالحدیث'' سے مراد گانا بجانا اور آلات موسیقی کا استعمال ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ يَسْـَٔلُونَكَ مَاذَآ أُحِلَّ لَهُمْ ۖ قُلْ أُحِلَّ لَكُمُ ٱلطَّيِّبَٰتُ ﴾ (المائدۃ ٥/ ٤)

"(اے پیغمبر!) لوگ آپ سے پوچھتے ہیں کہ کون کون سی چیزیں ان کے لیے حلال ہیں؟ (ان سے) کہہ دیجئے کہ سب پاکیزہ چیزیں تمہارے لیے حلال ہیں۔"

اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کے اوصاف ذکر کرتے ہوئے یہ بھی فرمایا ہے:

﴿ وَيُحَرِّمُ عَلَيْهِمُ ٱلْخَبَٰٓئِثَ ﴾ (الأعراف ٧/ ١٥٧)

"اور وہ ناپاک چیزوں کو ان پر حرام ٹھہراتے ہیں۔"

اللہ سبحانہ و تعالیٰ نے یہ واضح فرمادیا ہے کہ اس نے اپنے بندوں کے لیے صرف پاک چیزوں ہی کو حلال قرار دیا ہے اور اللہ کے نبی ﷺ نے بھی اپنی امت کے لیے صرف پاک چیزوں ہی کو حلال قرار دیا ہے۔ پاک چیزیں منفعت بخش ہوتی ہیں اور ان کے استعمال سے کوئی نقصان نہیں ہوتا جب کہ تمباکو نوشی نقصان دہ اور ناپاک چیزوں میں سے ہے۔ تمام اطباء اور دیگر سب باخبر لوگوں کا بھی اس بات پر اجماع ہے کہ تمباکو نوشی صحت کے لیے بے حد نقصان دہ' اس کا انجام بہت برا اور اس کی بدبو بہت خبیث ہے (لہٰذا اس سے اجتناب واجب ہے)۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو دین کی سمجھ بوجھ عطا فرمائے' استقامت کے ساتھ عمل کی توفیق بخشے اور ہم سب کو شیطان کے وسوسوں سے محفوظ رکھے۔

والسلام علیکم ورحمة اللہ وبرکاتہ۔

عبدالعزیز بن عبداللہ بن باز

الرئيس العام

لادارات البحوث العلمية والافتاء والدعوة والارشاد

حج فوری طور پر واجب ہے

سوال حج کب فرض ہوا تھا اور اس بات کی کیا دلیل ہے کہ حج فوری طور پر واجب ہے یا یہ تاخیر سے واجب ہوتا ہے؟

جواب صحیح قول کے مطابق حج ۹ ھ میں فرض ہوا تھا۔ یہ وہی سال ہے جس میں مختلف وفود رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے تھے اور اسی سال سورۂ آل عمران نازل ہوئی جس میں یہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ وَلِلَّهِ عَلَى ٱلنَّاسِ حِجُّ ٱلْبَيْتِ مَنِ ٱسْتَطَاعَ إِلَيْهِ سَبِيلًا ﴾ (آل عمران ٣/ ٩٧)

"اور لوگوں پر اللہ کا حق (یعنی فرض) ہے کہ جو اس گھر تک جانے کا مقدور رکھے' وہ اس کا حج کرے۔"

یہ آیت اس بات کی دلیل ہے کہ حج فوری طور پر واجب ہے کیونکہ امر (یعنی حکم) کا تقاضا یہ ہے کہ اسے فورا ادا کیا جائے۔ امام احمد رحمہ اللہ اور اہل سنن نے یہ روایت بیان کی ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا:

«تَعَجَّلُوا إِلَى الْحَجِّ ـ يَعْنِي الْفَرِيضَةَ ـ فَإِنَّ أَحَدَكُمْ لاَ يَدْرِي مَا يَعْرِضُ لَهُ»(مسند أحمد: ١/ ٣١٣)

"حج یعنی فرض کو جلد ادا کرو کیونکہ تم میں سے کوئی یہ نہیں جانتا کہ اسے کل کیا حالات درپیش ہوں۔"

ایک اور روایت میں الفاظ یہ ہیں:

«مَنْ أَرَادَ الْحَجَّ فَلْيَتَعَجَّلْ فَإِنَّهُ قَدْ يَمْرَضُ الْمَرِيضُ، وَتَضِلُّ الرَّاحِلَةُ، وَتَعْرِضُ الْحَاجَةُ»(سنن ابن ماجه، المناسك، باب الخروج إلى الحج، ح:٢٨٨٣ ومسند أحمد:١/ ٣٥٥ واللفظ له)

”جو شخص حج کا ارادہ کرے تو اسے جلدی کرنا چاہیئے کیونکہ اسے کوئی مرض لاحق ہو سکتا ہے' سواری گم ہو سکتی ہے اور کوئی ضرورت و حاجت پیش آ سکتی ہے۔“

امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کا مذہب یہ ہے کہ حج فوری طور پر نہیں بلکہ تاخیر سے ادا کیا جائے کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے اسے دس ہجری تک مؤخر کر کے ادا فرمایا تھا لیکن اس کا جواب یہ دیا جا سکتا ہے کہ آپ نے اسے صرف ایک سال مؤخر کیا ہے کیونکہ آپ کا ارادہ یہ تھا کہ پہلے بیت اللہ کو مشرکوں' برہنہ ہو کر حج کرنے والوں اور بدعات سے پاک فرما دیں۔ چنانچہ جب ان سب سے آپ نے بیت اللہ کو پاک کر دیا تو پھر اس کے بعد والے سال حج ادا فرمایا۔ حج فوری طور پر ادا کرنا اس لیے بھی واجب ہے' کہیں ایسا نہ ہو کہ اس کے ادا کرنے سے پہلے موت آ جائے اور دانستہ تاخیر کرنے کی وجہ سے انسان اللہ تعالیٰ کی رحمت سے دور ہو جائے کیونکہ حدیث میں ہے:

«مَنْ مَلَكَ زَادًا وَرَاحِلَةً تُبَلِّغُهُ إِلٰى بَيْتِ اللهِ وَلَمْ يَحُجَّ فَلَا عَلَيْهِ أَنْ يَمُوتَ يَهُودِيًّا أَوْ نَصْرَانِيًّا»(جامع الترمذي، الحج، باب ما جاء من التغليظ في ترك الحج، ح:٨١٢)

”جو شخص زاد راہ اور ایسی سواری کا مالک ہو جو اسے بیت اللہ تک پہنچا سکتی ہو اور پھر حج نہ کرے تو اس میں کوئی مضائقہ نہیں کہ وہ یہودی یا عیسائی کی حیثیت میں مر جائے۔“

——— شیخ ابن جبرین ———

وجوب حج کی شرطیں

سوال وجوب حج کی کیا شرطیں ہیں؟

جواب وجوب حج کی یہ پانچ شرطیں ہیں ① اسلام ② عقل ③ بلوغت ④ آزادی اور ⑤ استطاعت۔ کافر کا حج صحیح نہیں اور نہ قبول ہی ہوتا ہے کیونکہ اس میں بنیادی شرط ہی مفقود ہے جو حج اور دیگر تمام عبادات کے لیے شرط ہے یعنی اسلام۔ اسی طرح دیوانے پر بھی حج لازم نہیں ہے اور اگر وہ کر بھی لے تو اس کا حج ادا نہ ہو گا' ہاں البتہ بلوغت سے پہلے بچے کا حج صحیح ہے' اس کے ولی کو ثواب ملے گا اور اسے بھی اجر ملے گا لیکن بلوغت سے پہلے کے اس حج سے فرض ادا نہ ہو گا بلکہ بلوغت کے بعد اس پر فرض حج ادا کرنا لازم ہو گا۔ غلام پر بھی حج لازم نہیں ہے کیونکہ وہ اپنے آقا کی خدمت میں مشغول ہوتا ہے اور اگر وہ حج کر لے تو اس کا حج ہو جائے گا اور اسے ثواب ملے گا۔

جہاں تک شرط استطاعت کا تعلق ہے تو اللہ تعالیٰ نے حج کو اس کے لیے واجب قرار دیا ہے جسے راستہ کی استطاعت ہو۔ استطاعت سے مراد زاد راہ اور سواری ہے یعنی زاد راہ اس کی اصلی حاجتوں اور اہل و عیال کی ضرورتوں سے زائد اور حج کی واپسی تک کے لیے کافی ہو۔ یہ عام شرطیں ہیں۔ اور بعض لوگوں نے ایک چھٹی شرط کا بھی اضافہ کیا ہے اور وہ ہے راستہ کا پر امن ہونا لیکن یہ شرط تو استطاعت میں داخل ہے اور ایک شرط عورتوں کے حوالے سے مخصوص ہے اور وہ ہے

ان کے ساتھ محرم کا موجود ہونا۔

——— شیخ ابن جبرین ———

حج اور عمرہ کرنے والے کے لیے کیا ضروری ہے؟

سوال حج اور عمرہ ادا کرنے والے کے لیے کیا ضروری ہے؟

جواب جو شخص حج وغیرہ کے لیے طویل سفر کا ارادہ کر لے تو اسے چاہیئے کہ پہلے اپنے قرض ادا کرے یا قرض والوں سے اجازت لے لے جب کہ وہ حریص ہوں اور ان کی طرف سے تقاضا شدید ہو' پھر اپنی وصیتوں اور اپنے فرائض و حقوق کو لکھ دے' پھر نماز استخارہ پڑھے اور اللہ تعالیٰ سے یہ دعا کرے کہ اس کی توفیق عطا فرمائے جس میں اس کی بہتری ہو اور پھر اپنے شرح صدر کے مطابق عمل کرے۔ اہل علم و دین اور نیک رفقاء کی رفاقت اختیار کرے۔ کچھ علمی کتابیں بھی اپنے ساتھ رکھ لے جن سے اعمال حج اور دیگر مسائل کے بارے میں استفادہ کرے اور اپنے رفقاء سفر کو بھی فائدہ پہنچائے۔ نفقہ اور زاد راہ بھی کثیر مقدار میں ساتھ لے لے تاکہ بوقت ضرورت اپنے اور اپنے بھائیوں پر خرچ کر سکے۔ سفر کے وقت اپنے اہل و عیال اور دوست احباب کو الوداع کہے اور ہر ایک سے یہ کہے:

«اَسْتَوْدِعُ اللهَ دِينَكَ وَأَمَانَتَكَ وَخَوَاتِيمَ عَمَلِكَ»(جامع الترمذي، الدعوات، باب ما جاء ما يقول إذا ودع إنسانا، ح: ٣٤٤٣ ومسند أحمد: ٢/ ٧)

''میں اللہ کے سپرد کرتا ہوں تمہارے دین کو' امانت (و دیانت) کو اور تمہارے عمل کے خاتموں کو۔''

کوشش کرے کہ اس کا یہ عمل خالص ہو۔ حج اور عمرہ کے ادا کرنے سے محض اللہ تعالیٰ کی رضا مقصود ہو' کسی کے تعریف کرنے یا نہ کرنے کا اس کی صحت پر کوئی اثر نہ ہو اور پھر یہ بھی کوشش کرے کہ اس کا نفقہ حلال اور پاک کمائی سے ہو۔ سفر میں آتے جاتے ہوئے واجبات دین کی ادائیگی کے ساتھ ساتھ نوافل عبادات کا بھی اہتمام کرے۔ اپنے ساتھیوں کو فائدہ پہنچائے اور اہل علم سے استفادہ کرے۔ حج اور عمرہ کے واجبات کی تکمیل کے لیے مقدور بھر سنن اور اعمال صالحہ بھی سرانجام دے تاکہ تمام اعمال کا اسے دوگنا اجر و ثواب ملے۔ واللہ اعلم

——— شیخ ابن جبرین ———

حج کے حوالہ سے مسلمان کے واجبات

سوال فریضہ حج ادا کرتے ہوئے مسلمان پر کیا واجب ہے؟ کیا دوران حج عبادت کے علاوہ دیگر بیرونی کاموں میں بھی مشغولیت جائز ہے؟

جواب مسلمان کے لیے واجب ہے کہ اللہ تعالیٰ نے نمازوں کو بروقت اور باجماعت ادا کرنے کا جو حکم دیا ہے' اس حکم کی اطاعت کا خصوصی اہتمام کرے۔ علاوہ ازیں دوران حج امر بالمعروف' نہی عن المنکر اور حکمت و موعظت حسنہ کے ساتھ دعوت الی اللہ کا کام کرے اور ان تمام امور سے اجتناب کرے جن کو اللہ تعالیٰ نے حرام قرار دیا ہے کیونکہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ فَرَضَ فِيهِنَّ ٱلْحَجَّ فَلَا رَفَثَ وَلَا فُسُوقَ وَلَا جِدَالَ فِى ٱلْحَجِّ ﴾ (البقرة۲/ ۱۹۷)

"پس جو شخص ان (مہینوں) میں حج کی نیت کر لے تو حج (کے دنوں) میں عورتوں سے اختلاط کرے نہ کوئی برا کام کرے اور نہ کسی سے جھگڑے۔"

اور نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا ہے:

«مَنْ حَجَّ لله فَلَمْ يَرْفُثْ وَلَمْ يَفْسُقْ رَجَعَ كَيَوْمِ وَلَدَتْهُ أُمُّهُ»(صحيح البخاري، الحج، باب فضل الحج المبرور، ح:۱۵۲۱ وصحيح مسلم، الحج، باب فضل الحج والعمرة، ح:۱۳۵۰)

"جو شخص اللہ (کی رضا جوئی) کے لیے حج کرے اور حج کے دنوں میں عورتوں سے اختلاط کرے نہ کوئی برا کام کرے تو وہ اس طرح گناہوں سے پاک صاف ہو جاتا ہے گویا اس کی ماں نے اسے آج ہی جنم دیا ہے۔"

اس آیت اور حدیث میں جو "رفث" اور "فسوق" کے الفاظ آئے ہیں تو رفث سے مراد حالت احرام میں عورتوں سے اختلاط اور اس سلسلہ کے قول و فعل کی صورت میں اسباب و دواعی ہیں اور فسوق' (فسق کی جمع ہے اور اس) کے معنی گناہوں کے ہیں۔ ہر مسلمان کے لیے یہ واجب ہے کہ وہ ہر وقت اور ہر جگہ اللہ تعالیٰ سے ڈرے' واجبات کو ادا کرے اور محرمات سے اجتناب کرے لیکن جب وہ بلد اللہ الحرام میں ہو اور مناسک حج ادا کر رہا ہو تو پھر یہ واجب اور بھی عظیم اور شدید ہو جاتا ہے اور کسی حرام کام کا گناہ بھی بہت بڑا اور بہت سخت ہو جاتا ہے' ہاں البتہ دوران حج خرید و فروخت اور دیگر مباح اقوال و اعمال جائز ہیں کیونکہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ لَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ أَن تَبْتَغُوا فَضْلًا مِّن رَّبِّكُمْ ﴾ (البقرة۲/ ۱۹۸)

"اس کا تمہیں کچھ گناہ نہیں کہ (حج کے دنوں میں بذریعۂ تجارت) اپنے پروردگار سے روزی طلب کرو۔"

ابن عباس رضی اللہ عنہما اور کئی دیگر اہل علم اس آیت کریمہ کی تفسیر میں فرماتے ہیں کہ موسم حج میں بھی تجارت کی جا سکتی ہے' یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے فضل و رحمت اور اپنے بندوں پر تخفیف و احسان ہے کہ حاجی کو دوران حج اس کی ضرورت پیش آ سکتی ہے۔ واللہ ولی التوفیق۔

——— شیخ ابن باز ———

رفث' فسوق اور جدال کا معنی

سوال ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ ٱلْحَجُّ أَشْهُرٌ مَّعْلُومَٰتٌ فَمَن فَرَضَ فِيهِنَّ ٱلْحَجَّ فَلَا رَفَثَ وَلَا فُسُوقَ وَلَا جِدَالَ فِى ٱلْحَجِّ ﴾
(البقرة۲/ ۱۹۷)

"حج کے مہینے (مقرر ہیں جو) معلوم ہیں پس جو شخص ان (مہینوں) میں حج کی نیت کر لے تو حج (کے دنوں) میں عورتوں سے اختلاط کرے نہ کوئی برا کام کرے اور نہ کسی سے جھگڑے۔"

تو سوال یہ ہے کہ رفث' فسوق اور جدال سے کیا مراد ہے جن سے اس آیت میں منع کیا گیا ہے؟ کیا جو شخص حج کے دوران لڑائی جھگڑا کرتا یا کوئی عبث کام کرتا ہے تو اس کا حج باطل ہو جاتا ہے؟

جواب اہل علم نے "رفث" کی تفسیر میں فرمایا ہے کہ اس سے مراد عورتوں سے اختلاط اور اس سلسلہ کے اسباب و وسائل ہیں۔ فسوق سے مراد گناہ ہیں اور جدال سے مراد فضول لڑائی جھگڑا ہے یا جس بات کو اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کے لیے واضح فرما دیا ہے تو اس میں جھگڑے کی کوئی گنجائش نہیں۔ "جدال" میں ایسے تمام تنازعات شامل ہیں جو حاجیوں کے لیے ایذاء کا باعث بنیں یا امن عامہ میں خلل ڈالیں یا جن سے مراد باطل کی دعوت دینا اور حق سے روکنا ہو اور وہ جدال جو احسن انداز سے ہو اور حق کو ثابت کرنے اور باطل کو مٹانے کے لیے ہو تو وہ شرعاً جائز ہے اور اس جدال میں داخل نہیں ہے جو ممنوع ہے۔

فسوق اور جدال سے حج باطل نہیں ہوتا لیکن ان سے حج، اجروثواب اور ایمان میں نقص ضرور آ جاتا ہے جب کہ تحلل اوّل سے قبل عورتوں سے اختلاط کی صورت میں حج باطل ہو جاتا ہے۔

حج اور عمرہ کرنے والے کے لیے یہ ضروری ہے کہ وہ اللہ سبحانہ و تعالیٰ کی اطاعت اور اپنے حج و عمرہ کی تکمیل کے لیے ان مذکورہ بالا امور سے اجتناب کرے۔

——— شیخ ابن باز ———

جو شخص حج میں رفث اور تمام گناہ ترک کر دے اس کے گناہ معاف کر دیئے جاتے ہیں

سوال حدیث میں آیا ہے:

«مَنْ حَجَّ لِلّٰهِ فَلَمْ يَرْفُثْ وَلَمْ يَفْسُقْ رَجَعَ كَيَوْمِ وَلَدَتْهُ أُمُّهُ»(صحيح البخاري، الحج، باب فضل الحج المبرور، ح:١٥٢١ وصحيح مسلم، الحج، باب فضل الحج والعمرة، ح:١٣٥٠)

"جو شخص اللہ (کی رضا جوئی) کے لیے حج کرے اور پھر نہ عورتوں سے اختلاط کرے اور نہ کوئی گناہ کا کام کرے تو وہ اس طرح واپس لوٹتا ہے جیسے اس کی ماں نے اسے آج ہی جنم دیا ہو۔"

سوال یہ ہے کیا اس حدیث کے پیش نظر حج کرنے والے کے حج سے پہلے کے تمام گناہ معاف ہو جاتے ہیں؟

جواب یہ حدیث رسول اللہ ﷺ کی صحیح ترین احادیث میں سے ہے۔ اس میں مومن کے لیے بشارت ہے کہ جب وہ صفت مذکورہ کے مطابق حج ادا کرے تو یقیناً اللہ تعالیٰ اس کے تمام گناہ معاف فرما دے گا کیونکہ رفث اور فسوق کے ترک کا معنی یہ ہے کہ اس نے صدق دل سے توبہ کر لی ہے اور جو شخص توبہ کرے اس کے گناہ معاف کر دیئے جاتے ہیں۔ رفث سے مراد حالت احرام میں عورتوں سے اختلاط اور وہ قول و عمل ہے جو اس کا سبب بنے۔ فسوق سے مراد تمام گناہ ہیں، تو جو شخص حج میں رفث اور تمام معاصی چھوڑ دے تو اس کے سارے گناہ معاف کر دیئے جاتے ہیں۔ معصیت پر اصرار کرنا بھی فسوق میں شامل ہے جو شخص معصیت پر ڈٹا رہے تو وہ فسوق کو ترک کرنے والا نہیں ہے۔ لہٰذا اس کے لیے یہ وعدہ نہیں ہے۔ یہ حدیث اسی طرح ہے جیسے ایک دوسری حدیث میں ہے:

«وَالْحَجُّ الْمَبْرُورُ لَيْسَ لَهُ جَزَاءٌ إِلاَّ الْجَنَّةُ»(صحيح البخاري، العمرة، باب وجوب العمرة وفضلها، ح:١٧٧٣ وصحيح مسلم، الحج، باب فضل الحج والعمرة، ح:١٣٤٩)

"حج مبرور کی جزا جنت کے سوا اور کچھ نہیں۔"

مبرور سے مراد وہ حج ہے جس میں واجبات کو مکمل طور پر ادا کیا گیا ہو' گناہوں کو ترک کر دیا گیا ہو اور کسی بھی گناہ پر اصرار نہ کیا گیا ہو۔ حج اور عمرہ کرنے والے تمام مومنوں پر واجب ہے کہ وہ تمام گناہوں سے اجتناب کریں' پہلے کئے ہوئے تمام گناہوں سے اللہ تعالیٰ کے حضور توبہ کریں اور اللہ تعالیٰ کی عظمت اور اس کے ہاں جو اجروثواب ہے' اس کی رغبت کے پیش نظر یہ سچا عزم کریں کہ آئندہ ان گناہوں کا ارتکاب نہیں کریں گے۔

تکمیل توبہ میں سے یہ بات بھی ہے کہ گناہ کا تعلق اگر حقوق العباد سے ہے تو اس حق کو ادا کرے یا متعلقہ آدمی سے اسے معاف کروا لے' ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ وَتُوبُوٓاْ إِلَى ٱللَّهِ جَمِيعًا أَيُّهَ ٱلْمُؤْمِنُونَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ ﴿٣١﴾ ﴾ (النور۲۴/ ۳۱)

"اور مومنو! تم سب اللہ کے آگے توبہ کرو تاکہ فلاح پاؤ۔"

اور فرمایا:

﴿ يَٰٓأَيُّهَا ٱلَّذِينَ ءَامَنُواْ تُوبُوٓاْ إِلَى ٱللَّهِ تَوْبَةً نَّصُوحًا عَسَىٰ رَبُّكُمْ أَن يُكَفِّرَ عَنكُمْ سَيِّـَٔاتِكُمْ وَيُدْخِلَكُمْ جَنَّٰتٍ تَجْرِى مِن تَحْتِهَا ٱلْأَنْهَٰرُ ﴾ (التحریم۶۶/ ۸)

"مومنو! اللہ کے آگے صاف دل سے (خالص اور سچی) توبہ کرو' امید ہے کہ وہ تمہارے گناہ تم سے دور کر دے گا اور تم کو باغ ہائے بہشت میں جن کے نیچے نہریں بہہ رہی ہیں' داخل کرے گا۔"

جو شخص صدق دل سے سچی پکی توبہ کرے وہ کامیاب ہو جائے گا' اور اللہ تعالیٰ اس کے گناہوں کو معاف فرما کر اسے جنت میں داخل فرما دے گا۔ ہم اللہ تعالیٰ سے یہ دعا کرتے ہیں کہ وہ حاجیوں اور غیر حاجیوں تمام مسلمانوں کو سچی توبہ اور حق پر استقامت کی توفیق عطا فرمائے۔ انه سميع قريب۔

—— شیخ ابن باز ——

حج میں مزاحمت

سوال لوگ بعض مشاعر حج کو ادا کرتے ہوئے قصداً مزاحمت کرتے ہیں۔ کیا ایسے لوگوں کا حج صحیح ہے یا باطل؟

جواب مزاحمت سے حج باطل تو نہیں ہوتا لیکن جو لوگ بغیر ضرورت قصد و ارادہ سے ایسا کریں وہ گناہ گار ضرور ہوں گے کیونکہ اس میں حاجیوں کے لیے ظلم' ایذاء رسانی اور انہیں حج سے متنفر کرنا ہے۔

اگر انسان قصد و ارادہ کے بغیر کسی دوسرے انسان کی وجہ سے ازدحام کا سبب بنے تو اس میں ان شاء اللہ کوئی حرج نہیں کیونکہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ فَٱتَّقُواْ ٱللَّهَ مَا ٱسْتَطَعْتُمْ ﴾ (التغابن۶۴/ ۱۶)

"سو جہاں تک ہو سکے تم اللہ تعالیٰ سے ڈرو۔"

اور فرمایا:

﴿ لَا يُكَلِّفُ ٱللَّهُ نَفْسًا إِلَّا وُسْعَهَا ﴾ (البقرة۲/ ۲۸۶)

"اللہ تعالیٰ کسی شخص کو اس کی طاقت سے زیادہ تکلیف نہیں دیتا۔"

——— شیخ ابن باز ———

مشروط حج!

 جب محرم کو یہ خدشہ ہو کہ وہ بیماری یا خوف کی وجہ سے مناسک حج ادا نہیں کر سکے گا تو پھر وہ کیا کرے؟

جواب اس صورت میں اسے احرام باندھتے وقت یہ کہنا چاہیئے کہ: "اگر کسی روکنے والے نے مجھے روک دیا تو میں وہاں حلال ہو جاؤں گا جہاں تو مجھے روک دے گا۔"

لیکن جب کسی رکاوٹ کی وجہ سے خدشہ ہو مثلاً بیماری (وغیرہ) تو پھر سنت یہ ہے کہ احرام باندھتے وقت مذکورہ شرط ذکر کر دی جائے جیسا کہ نبی ﷺ سے ثابت ہے کہ جب ضباعہ بنت زبیر بن عبدالمطلب نے آپ سے اپنی بیماری کا تذکرہ کیا تو رسول اللہ ﷺ نے انہیں احرام کے وقت مذکورہ بالا شرط کے ذکر کا حکم دیا تھا۔ [1]

بچے کا حج

بچے کا احرام

 جب چھوٹا بچہ ازخود طواف نہ کر سکتا ہو تو کیا اسے اٹھا کر طواف کرانا صحیح ہے؟ چھوٹا بچہ حج کی اگر کسی شرط کو پورا نہ کر سکے تو کیا اس پر کوئی کفارہ لازم ہو گا؟

جواب بچے کا احرام باندھنا صحیح ہے تو اس کا ولی اس کا ذمہ دار ہے۔ ولی بچے کو کپڑے پہنا کر اوپر احرام باندھ دے اور اس کی طرف سے حج کی نیت بھی کرے۔ اس کی طرف سے لبیک بھی کہے۔ اس کا ہاتھ پکڑ کر طواف و سعی کرا دے۔ اور اگر بچہ طواف و سعی کرنے سے عاجز ہو کہ وہ بہت چھوٹا یا شیر خوار ہو تو اسے اٹھانے میں کوئی حرج نہیں۔ اور صحیح قول کے مطابق دونوں (بچے اور اس کو اٹھانے والے) کی طرف سے ایک طواف ہی کافی ہو گا۔ اگر بچہ ازراہ جہالت کوئی ممنوع کام کر لے یعنی سلا ہوا لباس پہن لے یا سر کو ڈھانپ لے تو اس پر کوئی فدیہ نہ ہو گا کیونکہ اس نے قصد و ارادہ سے ایسا نہیں کیا اور اگر ایسا قصد و ارادہ سے کیا ہو یعنی مثلاً سردی وغیرہ کی وجہ سے لباس پہن لیا ہو تو پھر بچے کے ولی کو فدیہ ادا کرنا پڑے گا۔

——— شیخ ابن جبرین ———

[1] صحیح بخاری، النکاح، باب الاکفاء فی الدین، حدیث: 5089 و صحیح مسلم، الحج، باب جواز اشتراط المحرم التحلل بعذر المرض و نحوہ، حدیث: 1217۔

جب بچہ دوران حج بالغ ہو جائے

سوال میں نے اپنے گھر والوں کے ساتھ اس وقت حج کیا کہ میں ابھی چھوٹا تھا لیکن آٹھ ذوالحج کو مجھے احتلام ہو گیا تو میں نے غسل کر کے اپنا احرام پہن لیا اور اپنا حج مکمل کر لیا۔ پھر میں نے سات سال بعد اپنے اس حج کے بارے میں پوچھا کہ اس سے فرض ادا ہو گیا یا نہیں؟ تو میں نے سنا کہ اس سے فرض ادا نہیں ہوا۔ اب میں اپنی فوت شدہ والدہ کی طرف سے حج کرنا چاہتا ہوں جنہوں نے صرف ایک ہی حج کیا تھا تو کیا مجھے اپنی طرف سے حج کرنا ہو گا یا اس صورت میں اگر اپنی والدہ کی طرف سے حج کروں تو وہ ہو جائے گا؟

جواب بچہ اگر دوران حج عرفہ میں یا اس سے پہلے اور عمرہ میں طواف سے پہلے بالغ ہو جائے تو اس کا فرض ادا ہو جائے گا۔ سائل چونکہ آٹھ ذوالحج کو بلوغ ہوا جب کہ وہ محرم تھا اور اس کے بعد اس نے عرفہ میں وقوف کیا لہٰذا اسے وہ اپنا حج قرار دے اور اب اپنی والدہ یا کسی اور کی طرف سے وہ حج کر سکتا ہے اور اس کے بعد بھی وہ ان شاء اللہ اپنی طرف سے' اپنے والدین کی طرف سے اور جن کی طرف سے چاہے بار بار حج کر سکتا ہے۔

——— شیخ ابن جبرین ———

عورت کا حج

جس عورت کے ساتھ محرم نہ ہو اس پر حج واجب نہیں

سوال سباء کی ایک عورت جو نیکی اور تقویٰ میں مشہور ہے وہ ادھیڑ عمر کی ہے بلکہ بڑھاپے کی طرف مائل ہے۔ وہ فرض حج کرنا چاہتی ہے لیکن اس کے ساتھ کوئی محرم نہیں ہے' ہاں البتہ معززین شہر میں سے ایک شخص جو نیکی و تقویٰ میں مشہور ہے اور اس کے ہمراہ محرم عورتیں بھی ہیں تو کیا اس عورت کے لیے یہ صحیح ہے کہ اس آدمی کے ہمراہ عورتوں کے ساتھ مل کر حج کرے جبکہ آدمی اس کی بھی نگہداشت کرے گا؟ یا اس عورت سے فریضۂ حج ساقط ہو جائے گا کیونکہ اسے اگرچہ مالی استطاعت تو ہے لیکن اس کے ساتھ محرم نہیں ہے؟ براہ کرم اس مسئلہ میں ہمیں فتویٰ دیجئے کیونکہ ہمارا بعض بھائیوں کا اس مسئلہ میں اختلاف ہے۔ بارک اللہ فیکم

جواب وہ عورت جس کے ساتھ محرم نہ ہو' اس پر حج واجب نہیں ہے کیونکہ عورت کے لیے محرم بمنزلہ سبیل کے ہے اور استطاعت سبیل وجوب حج کے لیے شرط ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

﴿وَلِلَّهِ عَلَى ٱلنَّاسِ حِجُّ ٱلْبَيْتِ مَنِ ٱسْتَطَاعَ إِلَيْهِ سَبِيلًا﴾ (آل عمران ٣/ ٩٧)

"اور لوگوں پر اللہ کا حق (یعنی فرض) ہے کہ جو اس گھر تک جانے کا مقدور رکھے وہ اس کا حج کرے۔"

اس عورت کے لیے یہ جائز نہیں کہ وہ حج یا کسی اور مقصد کے لیے اپنے شوہر یا محرم کے بغیر سفر کرے کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے:

«لَا يَحِلُّ لِامْرَأَةٍ تُؤْمِنُ بِاللهِ وَالْيَوْمِ الآخِرِ، تُسَافِرُ مَسِيرَةَ يَوْمٍ وَلَيْلَةٍ، إِلَّا مَعَ ذِي مَحْرَمٍ

عَلَيْهَا»(صحيح البخاري، التقصير، باب في كم يقصر الصلاة، ح:١٠٨٨ وصحيح مسلم، الحج، باب سفر المرأة مع محرم... الخ، ح:١٣٣٩)

"اللہ تعالیٰ اور روز آخرت پر ایمان رکھنے والی کسی عورت کے لیے یہ حلال نہیں کہ وہ ایک دن اور رات کا سفر محرم کے بغیر کرے۔"

بخاری و مسلم میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ انہوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ ارشاد فرماتے ہوئے سنا:

«لاَ يَخْلُوَنَّ رَجُلٌ بِامْرَأَةٍ إِلاَّ وَمَعَهَا ذُومَحْرَمٍ، وَلاَ تُسَافِرِ الْمَرْأَةُ إِلاَّ مَعَ ذِي مَحْرَمٍ»

"کوئی مرد کسی عورت کے ساتھ خلوت اختیار نہ کرے الا یہ کہ اس کا محرم اس کے ساتھ ہو اور نہ کوئی عورت محرم کے بغیر سفر کرے۔" یہ ارشاد سن کر ایک آدمی نے کھڑے ہو کر عرض کیا یا رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) میری بیوی حج کے لیے جا رہی ہے اور میرا نام فلاں فلاں غزوہ کے لیے لکھا جا چکا ہے تو آپ نے فرمایا:

«اِنْطَلِقْ فَحُجَّ مَعَ امْرَأَتِكَ»(صحيح البخاري، النكاح، باب لا يخلون رجل بامرأة... الخ، ح:٥٢٣٣، وجزاء الصيد، باب حج النساء، ح:١٨٦٢ وصحيح مسلم، الحج، باب سفر المرأة مع محرم... الخ، ح:١٣٤١)

"تم جاؤ اور اپنی بیوی کے ساتھ حج کرو۔"

امام حسن بصری' نخعی' احمد' اسحاق' ابن منذر اور اصحاب الرائے کا بھی یہی قول ہے اور عموم احادیث کے موافق ہونے کی وجہ سے یہی قول صحیح ہے کہ عورت کے لیے شوہر اور محرم کے بغیر سفر کرنا منع ہے۔ امام مالک' شافعی اور اوزاعی رحمہم اللہ کا قول اس کے خلاف ہے کہ انہوں نے ایسی شرط ذکر کی ہے جس کی کوئی دلیل نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ابن منذر فرماتے ہیں انہوں نے ظاہر حدیث کے مطابق قول کو ترک کر دیا ہے اور ان میں سے ہر ایک نے ایک ایسی شرط ذکر کی ہے جس کی کوئی دلیل نہیں ہے۔ وصلی اللہ علی نبینا محمد وعلی آلہ وصحبہ وسلم

——— فتویٰ کمیٹی ———

اکیلی عورت کا محرم کے بغیر سفر حج کرنا

سوال ایک عورت یہ کہتی ہے کہ میری والدہ مغرب میں ہے اور میں سعودیہ میں کام کرتی ہوں۔ میں انہیں فریضۂ حج ادا کرنے کے لیے یہاں بلانا چاہتی ہوں لیکن ان کے ساتھ کوئی محرم نہیں ہے کیونکہ میرے والد فوت ہو چکے ہیں اور میرے بھائی فریضۂ حج ادا کرنے کی استطاعت نہیں رکھتے؟

جواب اس (یعنی آپ کی والدہ) کیلئے یہ جائز نہیں کہ وہ حج ادا کرنے کیلئے اکیلی آئے کیونکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے:

«لاَ تُسَافِرِ الْمَرْأَةُ إِلاَّ مَعَ ذِي مَحْرَمٍ»

"کوئی عورت محرم کے بغیر سفر نہ کرے۔"

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بات لوگوں کو خطبہ دیتے ہوئے ارشاد فرمائی تو ایک آدمی نے کھڑے ہو کر عرض کیا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! میری بیوی حج کے لیے جا رہی ہے اور میرا فلاں فلاں غزوہ میں نام لکھا جا چکا ہے تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

«اِنْطَلِقْ فَحُجَّ مَعَ امْرَأَتِكَ»(صحيح البخاري، جزاء الصيد، باب حج النساء، ح:١٨٦٢ وصحيح مسلم، الحج، باب سفر المرأة مع محرم ... الخ، ح:١٣٤١)

"تم جاؤ اور اپنی بیوی کے ساتھ حج کرو۔"

عورت کے ساتھ جب محرم نہ ہو تو اس پر حج واجب نہیں ہے کیونکہ یا تو اس سے یہ فریضہ ساقط ہے کہ محرم کی عدم موجودگی کی وجہ سے اسے مکہ مکرمہ پہنچنے کی قدرت ہی نہیں ہے اور عدم قدرت شرعی عذر ہے یا اس پر حج کی ادئیگی ہی واجب نہیں ہے' لہٰذا اس کے فوت ہونے کی صورت میں اس کے ترکہ میں سے حج کرا دیا جائے۔

بہرحال میں اس سائل خاتون سے یہ کہوں گا کہ اگر عورت فوت ہو جائے اور وہ محرم کی عدم موجودگی کی وجہ سے حج نہ کر سکے تو اسے کوئی گناہ ہو گا نہ کوئی نقصان کیونکہ یہ عورت شرعاً معذور اور غیر مستطیع ہے اور فرمان باری تعالیٰ ہے:

﴿ وَلِلَّهِ عَلَى ٱلنَّاسِ حِجُّ ٱلْبَيْتِ مَنِ ٱسْتَطَاعَ إِلَيْهِ سَبِيلًا ﴾ (آل عمران۳/ ۹۷)

"اور لوگوں پر اللہ کا حق (یعنی فرض) ہے کہ جو اس گھر تک جانے کا مقدور رکھے' وہ اس کا حج کرے۔"

——— شیخ ابن عثیمین ———

ایک عورت کو اس کا شوہر حج سے منع کرتا ہے

سوال میں ایک بڑی عمر کی مالدار خاتون ہوں۔ میں نے کئی دفعہ اپنے شوہر سے یہ کہا ہے کہ ہم حج کریں لیکن اس نے کسی وجہ کے بغیر میری اس خواہش کو رد کر دیا ہے۔ میرا بڑا بھائی اس سال حج کرنا چاہتا ہے تو کیا میں اس کے ساتھ حج کے لیے جا سکتی ہوں خواہ میرا شوہر اجازت نہ دے یا اپنے شوہر کی اطاعت کروں اور حج ترک کر دوں؟ براہ کرم فتویٰ دیجئے۔ جزاکم اللہ خیرًا

جواب حج اپنی تمام شروط کے ساتھ فوری طور پر واجب ہے۔ یہ خاتون چونکہ مکلف ہے' اسے قدرت بھی حاصل ہے اور اس کے لیے محرم بھی ہے' لہٰذا اس پر یہ واجب ہے کہ فوراً حج کرے اور اس کے شوہر کے لیے بغیر کسی سبب کے اسے حج سے منع کرنا حرام ہے۔

مذکورہ صورتحال کے مطابق اس عورت کے لیے یہ جائز ہے کہ وہ اپنے بھائی کے ساتھ حج کرے خواہ اس کا شوہر اس کی اجازت نہ دے' کیونکہ حج بھی اسی طرح فرض ہے جیسے نماز اور روزہ فرض ہے اور اللہ تعالیٰ کے حق کو مقدم سمجھنا زیادہ افضل ہے اور اس عورت کے شوہر کو اس بات کا قطعاً کوئی حق حاصل نہیں ہے کہ وہ کسی سبب کے بغیر اسے حج سے روکے۔ واللہ الموفق والھادی الی سواء السبیل۔

——— شیخ ابن جبرین ———

شوہر کی اجازت کے بغیر عورت کا حج

سوال کیا شوہر کی اجازت کے بغیر بیوی کا حج صحیح ہے؟ کیا شوہر بیوی کو حج کی اجازت دے کر رجوع کر سکتا ہے؟ کیا شوہر اپنی بیوی کو حج کرنے سے منع کر سکتا ہے؟

جواب شوہر کے لیے یہ جائز نہیں ہے کہ وہ اپنی بیوی کو حج سے منع کرے جبکہ حج کی شروط مکمل ہوں اور بیوی کے لیے حج کرنا ممکن ہو کیونکہ حج علی الفور واجب ہے۔ قدرت ہو تو اسے مؤخر کرنا جائز نہیں۔ بیوی کے لیے مستحب ہے کہ اپنے شوہر سے اجازت طلب کرے اگر وہ اجازت دے دے تو ٹھیک ورنہ بغیر اجازت ہی کے چلی جائے۔ شوہر اجازت دے دے تو پھر اس کے لیے رجوع کرنا جائز نہیں ہے۔ حج اگر نفل ہو تو پھر شوہر اپنی بیوی کو منع کر سکتا ہے۔ نفل حج بیوی اپنے شوہر کی اجازت کے بغیر نہیں کر سکتی کیونکہ وہ فرض نہیں ہے۔ واللہ اعلم۔

——— شیخ ابن جبرین ———

محرم کے بغیر عورتوں کے ساتھ مل کر حج کرنا

سوال میں نے اپنی خواتین کے ساتھ حج کیا اور ان کے ساتھ ایک ایسی بڑھیا بھی شامل ہو گئی جس کے ساتھ کوئی محرم نہیں تھا۔ میں نے اس بڑھیا پر بھی خرچ کیا حتیٰ کہ اس نے سارے مناسک حج ادا کر لیے اور پھر اپنے شہر میری خواتین کے ساتھ ہی واپس لوٹ آئی۔ کیا مجھے اس سلسلہ میں کوئی گناہ تو نہیں ہو گا؟

جواب یہ عورت چونکہ عمر رسیدہ تھی اور سائل نے ذکر کیا ہے کہ اس کے ہمراہ اس کی اپنی خواتین بھی تھیں اور یہ بڑھیا ان کے ساتھ شامل ہو گئی تو کیونکہ اس کے ہمراہ اپنا کوئی ساتھی نہ تھا اور پھر یہ مناسک حج ادا کرنے سے بھی واقف نہ تھی تو اس طرح سائل نے اس کے ساتھ احسان کیا اور احسان کرنے والوں پر کوئی الزام نہیں۔

——— فتویٰ کمیٹی ———

عورت کے لیے ایام حج میں مانع حیض گولیوں کا استعمال

سوال عورت کے لیے ایام حج میں اپنے ماہانہ معمول کو روکنے کے لیے گولیوں کے استعمال کے بارے میں کیا حکم ہے؟

جواب اس میں کوئی حرج نہیں کیونکہ اس میں فائدہ و مصلحت بھی ہے اور اس طرح یہ لوگوں کے ساتھ مل کر طواف بھی کر سکے گی اور شرکاء سفر سے بھی پیچھے نہیں رہے گی۔

——— شیخ ابن باز ———

تارک نماز کا حج

بے نماز کا حج اور ---؟

سوال جو شخص تارک نماز ہو' خواہ وہ جان بوجھ کر ترک کرتا ہو یا محض سستی کی وجہ سے کیا اس کا فریضۂ حج ادا ہو جائے گا؟

جواب جو شخص حج کرے مگر وہ تارک نماز ہو تو اگر اس کا ترک وجوب کے انکار کی وجہ سے ہے تو وہ بالاجماع کافر ہے اور اس کا حج صحیح نہیں اور اگر وہ محض سستی اور غفلت کی وجہ سے ترک کرتا ہے تو اس میں اہل علم کا اختلاف ہے۔ بعض کے نزدیک اس کا حج صحیح ہے اور بعض کے نزدیک صحیح نہیں ہے اور یہی بات زیادہ درست ہے کہ اس کا حج صحیح نہیں ہے

کیونکہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا ہے:

«اَلْعَهْدُ الَّذِي بَيْنَنَا وَبَيْنَهُمُ الصَّلَاةُ فَمَنْ تَرَكَهَا فَقَدْ كَفَرَ»(جامع الترمذي، الإيمان، باب ما جاء في ترك الصلاة، ح: ٢٦٢١ ومسند أحمد: ٥/ ٣٤٦)

''وہ عہد جو ہمارے اور ان کے مابین ہے وہ نماز ہے جس نے اسے ترک کر دیا اس نے کفر کیا۔''

اسی طرح رسول اللہ ﷺ نے یہ بھی ارشاد فرمایا ہے:

«بَيْنَ الرَّجُلِ وَبَيْنَ الشِّرْكِ وَالْكُفْرِ تَرْكُ الصَّلَاةِ»(صحيح مسلم، الإيمان، باب بيان إطلاق اسم الكفر... الخ، ح: ٨٢)

''آدمی اور شرک و کفر کے درمیان (فرق) ترک نماز (سے) ہے۔''

یہ حکم عام ہے اور جو شخص نماز کے وجوب کا منکر ہو' اسے بھی شامل ہے اور جو محض غفلت اور سستی کی وجہ سے تارک ہو اسے بھی شامل ہے۔ واللہ ولی التوفیق۔

—— شیخ ابن باز ——

حج اور ترک نماز

سوال فضیلۃ الشیخ! بغیر رغبت اور خواہش کے محض حالات کی مجبوری کی وجہ سے مجھے نصف رمضان کے وقت ایک اجنبی ملک کی طرف سفر کرنا پڑا۔ اپنے ملک میں رمضان کے نصف اول کے میں نے روزے رکھے تھے لیکن جب میں نے سفر کیا تو اس ملک میں قیام کے دوران جو پندرہ دن پر مشتمل تھا میں نے نماز اور روزہ دونوں کو ترک کر دیا۔ میں یہ سمجھتی تھی کہ یہ لوگ ناپاک ہیں' ان کی اشیاء ضرورت کو استعمال کرنا جائز نہیں' مجھے قبلہ کی جہت کا بھی علم نہیں تھا' میں نے ان کے کھانے پینے کی کوئی چیز بھی استعمال نہیں کی۔ میرا سوال یہ ہے کہ ان پندرہ دنوں میں میں نے جو نماز اور روزہ ترک کیا تو کیا اس کا میرے اس حج پر تو کوئی اثر نہیں پڑے گا جو میں نے کئی سال پہلے ادا کیا تھا؟ اس نماز اور روزہ کے ترک کی وجہ سے میرے لیے کیا حکم ہے یا اس کی کیا دیت ہے تاکہ اللہ تعالیٰ میرے گناہوں کو معاف فرما دے؟ رہنمائی فرمائیں۔ بارک اللہ فیکم۔

جواب اس مدت میں ترک نماز و روزہ کا اس حج پر کوئی اثر نہیں پڑے گا جو آپ نے کئی سال پہلے ادا کیا تھا کیونکہ سابقہ عمل صالح جس چیز سے باطل ہو جاتا ہے وہ یہ ہے کہ انسان مرتد ہو کر فوت ہو جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَمَن يَرْتَدِدْ مِنكُمْ عَن دِينِهِۦ فَيَمُتْ وَهُوَ كَافِرٌ فَأُو۟لَٰٓئِكَ حَبِطَتْ أَعْمَٰلُهُمْ فِى ٱلدُّنْيَا وَٱلْءَاخِرَةِ ۖ وَأُو۟لَٰٓئِكَ أَصْحَٰبُ ٱلنَّارِ ۖ هُمْ فِيهَا خَٰلِدُونَ ﴿٢١٧﴾﴾ (البقرة٢/ ٢١٧)

''اور جو کوئی تم میں سے اپنے دین سے پھر (کر کافر ہو) جائے گا اور کافر ہی مرے گا تو ایسے لوگوں کے اعمال دنیا و آخرت دونوں میں برباد ہو جائیں گے اور یہی لوگ دوزخ میں جانے والے ہیں جس میں وہ ہمیشہ رہیں گے۔''

گناہوں سے سابقہ اعمال صالحہ باطل نہیں ہوتے' لیکن بسا اوقات یہ دیگر جہات سے اعمال صالحہ کو باطل کرنے کا سبب بن جاتے ہیں اور وہ اس طرح کہ جب یہ گناہ بہت زیادہ ہوں اور گناہوں اور نیکیوں میں وزن کے وقت گناہوں کا پلڑا بھاری ہو جائے تو پھر گناہوں کی وجہ سے انسان کو عذاب ہو گا' لہٰذا اب آپ پر واجب ہے کہ مذکورہ دنوں میں ترک نماز کی

وجہ سے اللہ کی بارگاہ میں توبہ کریں، اعمال صالحہ کثرت سے بجالائیں اور راجح قول کے مطابق ان نمازوں کی قضاء واجب نہیں ہے۔ ان مذکورہ دنوں میں آپ کے لیے روزہ ترک کرنا جائز تھا کیونکہ آپ مسافر تھیں اور مسافر کے لیے روزہ لازم نہیں ہے کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ وَمَن كَانَ مَرِيضًا أَوْ عَلَىٰ سَفَرٍ فَعِدَّةٌ مِّنْ أَيَّامٍ أُخَرَ ﴾ (البقرۃ۲/ ۱۸۵)

"اور جو شخص بیمار ہو یا سفر میں ہو تو دوسرے دنوں میں (روزے رکھ کر) ان کا شمار پورا کر لے۔"

لہٰذا ان روزوں کی آپ کو قضاء دینا ہوگی۔ نماز ترک کرنے کا آپ نے جو یہ سبب بتایا ہے کہ آپ کو قبلہ کا علم نہیں تھا اور آپ ان کے کھانے پینے کی کسی چیز کو بھی استعمال نہیں کرتی تھیں، تو یہ بات درست نہیں اور نہ اس وجہ سے نماز ترک کرنا درست ہے کیونکہ آپ پر واجب تھا کہ آپ بقدر استطاعت نماز ضرور ادا کرتیں کیونکہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ لَا يُكَلِّفُ اللَّهُ نَفْسًا إِلَّا وُسْعَهَا ﴾ (البقرۃ۲/ ۲۸۶)

"اللہ تعالیٰ کسی شخص کو اس کی طاقت سے زیادہ تکلیف نہیں دیتے۔"

اور ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ فَاتَّقُوا اللَّهَ مَا اسْتَطَعْتُمْ ﴾ (التغابن۶۴/ ۱۶)

"سو جہاں تک ہو سکے تم اللہ سے ڈرو۔"

اور نبی کریم ﷺ نے فرمایا ہے:

«إِذَا أَمَرْتُكُمْ بِشَيْءٍ فَأْتُوا مِنْهُ مَا اسْتَطَعْتُمْ»(صحيح البخاري، الاعتصام بالكتاب والسنة، باب الاقتداء بسنن رسول الله ﷺ، ح:۷۲۸۸ وصحيح مسلم، الحج، باب فرض الحج مرة في العمر، ح:۱۳۳۷)

"جب میں تمہیں کسی چیز کا حکم دوں تو مقدور بھر اسے بجالاؤ۔"

لہٰذا انسان جب کسی ایسی جگہ میں ہو جہاں اسے قبلے کا علم نہ ہو، کوئی جہت قبلہ بتانے والا قابل اعتماد آدمی بھی نہ ہو تو وہ کوشش کر کے جہت قبلہ کا تعین کرے اور جس جہت کے بارے میں ظن غالب ہو کہ قبلہ اس طرف ہے تو ادھر منہ کر کے نماز پڑھ لے۔ ان نمازوں کا اعادہ بھی لازم نہ ہو گا۔

—— شیخ ابن عثیمین ——

بے نماز کی طرف سے حج نہ کیا جائے

سوال میرا ایک قریبی رشتہ دار ماہ رمضان میں فوت ہو گیا۔ وفات سے پہلے وہ نماز اور زکوٰۃ کے ادا کرنے میں کوتاہی کرتا تھا۔ اس نے اپنی زندگی میں کبھی حج نہیں کیا تھا تو کیا میرے لیے اس کی طرف سے حج کرنا اور زکوٰۃ ادا کرنا جائز ہے؟

جواب اگر یہ شخص کبھی نماز پڑھتا اور کبھی چھوڑ دیتا تھا تو اس کی طرف سے حج کیا جائے نہ زکوٰۃ ادا کی جائے۔ اس کے مسلمان قریبی رشتہ دار اس کے ترکہ کے وارث بھی نہیں ہوں گے بلکہ اس کے ترکہ کو مسلمانوں کے بیت المال میں جمع کرا دیا جائے کیونکہ ترک نماز کفر اکبر ہے جیسا کہ نبی ﷺ کے اس ارشاد سے ثابت ہے:

«اَلْعَهْدُ الَّذِي بَيْنَنَا وَبَيْنَهُمُ الصَّلَاةُ فَمَنْ تَرَكَهَا فَقَدْ كَفَرَ»(جامع الترمذي، الإيمان، باب ما جاء في ترك الصلاة، ح: ٢٦٢١ ومسند أحمد: ٥/ ٣٤٦)

"وہ عہد جو ہمارے اور ان کے مابین ہے' وہ نماز ہے۔ جس نے اسے ترک کر دیا اس نے کفر کیا۔"

اسی طرح نبی ﷺ نے یہ بھی فرمایا ہے:

«بَيْنَ الرَّجُلِ وَبَيْنَ الشِّرْكِ وَالْكُفْرِ تَرْكُ الصَّلَاةِ»(صحيح مسلم، الإيمان، باب بيان إطلاق اسم الكفر... الخ، ح: ٨٢)

"آدمی اور شرک و کفر کے درمیان (فرق) ترک نماز (سے) ہے۔"

اسی طرح کتاب و سنت کے اور بھی دلائل ہیں جو ہماری بات پر دلالت کرتے ہیں۔ ہم اللہ تعالیٰ سے یہ دعا کرتے ہیں کہ وہ مسلمانوں کے حالات کی اصلاح فرما دے۔ سب کو نماز کی حفاظت و اس پر استقامت اور ترک نماز کے اسباب سے بچنے کی توفیق عطا فرمائے۔ انه جواد کریم۔

—— شیخ ابن باز ——

حج کی استطاعت

حج کی استطاعت کا معنی

سوال حج کے حوالے سے استطاعت کے کیا معنی ہیں؟ کیا مکہ مکرمہ کی طرف جاتے ہوئے زیادہ ثواب ملتا ہے یا واپسی پر؟ اور کیا اللہ تعالیٰ کے نزدیک اس کا اجر و ثواب مکہ سے اپنے وطن واپسی کے وقت زیادہ ہو گا یا اس وقت کہ جب وہاں اس نے پہلا نیک عمل کیا؟

جواب حج کے حوالہ سے استطاعت کے معنی یہ ہیں کہ آدمی صحیح البدن ہو۔ آدمی کے پاس ہوائی جہاز یا گاڑی یا ایسی سواری ہو جو بیت اللہ شریف تک پہنچا دے یا حسب حال اس کے پاس سواری وغیرہ کا کرایہ موجود ہو۔ آنے جانے کے لیے زادِ راہ بھی موجود ہو اور حج سے واپسی تک اہل و عیال کے لیے بھی نفقہ و خرچہ وغیرہ موجود ہو اور اگر عورت حج یا عمرہ کے لیے جا رہی ہو تو اس کے لیے شوہر یا کسی اور محرم کا ساتھ ہونا بھی ضروری ہے۔

جہاں تک حج کے ثواب کا تعلق ہے تو وہ اسے اللہ تعالیٰ کے لیے اخلاص کے مطابق ملے گا اور اس کے مطابق کہ اس نے مناسک کو کس طرح ادا کیا ہے اور ان امور سے کس قدر اجتناب کیا ہے جو کمال حج کے منافی ہیں۔ نیز اس نے اللہ تعالیٰ کے راستہ میں مال کتنا خرچ کیا ہے؟ مشقت کس قدر برداشت کی ہے؟ اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ وہ واپس لوٹ آئے یا وہاں مقیم ہو جائے یا حج مکمل کرنے سے پہلے یا بعد میں وفات پا جائے کہ اللہ تعالیٰ اس کے حال کو خوب جانتا اور اسے جزاء سے نوازتا ہے۔

ہر مکلف شخص کے لیے یہ ضروری ہے کہ وہ عمل کو خوب اچھی طرح کرے' ظاہری و باطنی ہر حال میں اسلامی شریعت کی پابندی کرے اور عبادت اس طرح کرے گویا اپنے رب تعالیٰ کا دیدار کر رہا ہے اور اگر یہ کیفیت پیدا نہ ہو تو پھر وہ اس

حقیقت کو یاد رکھے کہ اللہ تعالیٰ اسے دیکھ رہا اور اس کے تمام حالات سے باخبر ہے۔ اور اللہ تعالیٰ کے حوالے سے کرید نہ کرے کہ اللہ سبحانہ و تعالیٰ اپنے بندوں پر بے حد رحم فرمانے والا ہے' وہ نیکیوں کا کئی گنا زیادہ اجروثواب عطا فرماتا اور گناہ معاف فرمادیتا ہے اور تمہارا رب کسی پر کبھی ظلم نہیں فرماتا۔ تم اپنے نفس کی حفاظت کرو اور اللہ تعالیٰ کے معاملہ کو اللہ کے سپرد کر دو جو حکیم و عادل اور رؤف رحیم ہے۔ واللہ الموفق

—— فتویٰ کمیٹی ——

حج کی استطاعت

سوال حج کے حوالے سے استطاعت کیا ہے اور اس کی شروط کیا ہیں؟

جواب حدیث میں استطاعت کی تفسیر زاد راہ اور سواری سے کی گئی ہے لیکن استطاعت کا لفظ شاید اس سے بھی زیادہ عام ہے کہ جو شخص کسی طرح بھی مکہ مکرمہ پہنچ جائے اس کے لیے حج اور عمرہ لازم ہے اگر کوئی شخص پیدل چلنے اور اپنا سامان اٹھانے کی قدرت رکھتا ہو یا اس کا سامان اٹھانے والا کوئی موجود ہو تو اس کے لیے بھی حج لازم ہے اور اگر وہ جدید وسائل حمل و نقل مثلاً بحری جہازوں' گاڑیوں اور ہوائی جہازوں وغیرہ کا کرایہ ادا کر سکتا ہو تو اس کے لیے بھی حج لازم ہے۔ اگر کسی شخص کے پاس زادراہ اور سواری تو ہو لیکن اس کے سامان اور اہل و عیال کی حفاظت کرنے والا کوئی نہ ہو یا مدت حج میں اس کے اہل و عیال کے نفقہ و خرچہ کا انتظام نہ ہو تو مشقت کی وجہ سے اس پر حج لازم نہ ہو گا۔ اسی طرح اگر راستہ خطرناک ہو یا راستہ میں قزاقوں اور راہزنوں کا خدشہ ہو یا حکومت کی طرف سے عائد کردہ مالی ٹیکس ناقابل برداشت ہو یا وقت اس قدر کم ہو کہ مکہ مکرمہ پہنچنا ممکن نہ ہو یا بیماری یا ضرر (تکلیف) کی وجہ سے وہ سواری پر سوار ہونے کی قدرت نہ رکھتا ہو تو ان تمام صورتوں میں حج ساقط ہو جائے گا اور اگر اس کے پاس مالی استطاعت ہو تو اس کیلئے یہ لازم ہو گا کہ اپنی طرف سے کسی کو نائب بنا کر حج کیلئے بھیج دے اور اگر مالی استطاعت بھی نہیں تو پھر اس پر حج فرض نہیں ہے۔

—— شیخ ابن جبرین ——

کیا بیٹے کا اپنے باپ کے مال سے فرض حج ادا کرنا جائز ہے؟

سوال میرے بیٹے کی عمر تقریباً بیس سال ہے۔ میرے پاس گاڑی ہے لیکن میں گاڑی چلانا نہیں جانتا۔ میرا بیٹا گاڑی چلاتا ہے اور میں نے اپنی گاڑی میں حج کرنے کا ارادہ کیا ہے۔ میرا بیٹا ابھی سکول میں پڑھتا ہے اور اس نے کسی سے یہ سنا ہے کہ بیٹے نے اگر ابھی تک فرض حج ادا نہ کیا ہو تو اس کے لیے یہ جائز نہیں کہ وہ اپنے باپ کے مال سے حج کرے بلکہ اسے خود مال کما کر حج کرنا چاہیے۔ میرے پاس اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے کافی مال ہے' تو رہنمائی فرمائیں کیا میرا بیٹا میرے مال سے حج کر سکتا ہے؟ اللہ تعالیٰ آپ کو اجروثواب سے نوازے۔

جواب بیٹا اگر اپنا فرض حج اپنے باپ کے مال سے کرے تو اس کا حج صحیح ہے بلکہ اس کے لیے افضل یہ ہے کہ وہ اپنے والد کے ساتھ جلد حج کرے اور گاڑی چلانے میں اپنے باپ کی مدد کرے کیونکہ یہ بھی اپنے باپ کے ساتھ نیکی ہے۔

—— فتویٰ کمیٹی ——

میں نے ہر سال حج کرنے کا اللہ تعالیٰ سے عہد کیا تھا

سوال میں نے اللہ تعالیٰ سے ہر سال حج کرنے کا عہد کیا تھا کیونکہ پہلے میں ملازم نہیں تھا پھر بعد میں حالات کی مجبوری کی وجہ سے مجھے فوج میں ملازمت کرنا پڑی اور اب محکمہ کی طرف سے مجھے ہر سال حج کرنے کے لیے رخصت نہیں ملتی۔ لہٰذا امید ہے کہ رہنمائی فرمائیں گے کہ ان حالات میں حج نہ کرسکنے کی وجہ سے مجھے گناہ تو نہیں ہو گا؟

جواب اگر بعض برسوں میں کوئی ایسی رکاوٹ پیش آجائے جس کی وجہ سے آپ کو حج کی استطاعت نہ ہو اور آپ اس رکاوٹ پر غلبہ نہ پاسکیں تو کوئی گناہ نہ ہو گا کیونکہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ لَا يُكَلِّفُ اللَّهُ نَفْسًا إِلَّا وُسْعَهَا ﴾ (البقرۃ۲/ ۲۸۶)

"اللہ کسی شخص کو اس کی طاقت سے زیادہ تکلیف نہیں دیتا۔"

نیز فرمان باری تعالیٰ ہے:

﴿ مَا يُرِيدُ اللَّهُ لِيَجْعَلَ عَلَيْكُم مِّنْ حَرَجٍ ﴾ (المائدۃ۵/ ۶)

"اللہ تم پر کسی طرح کی تنگی نہیں کرنا چاہتا۔"

وباللّٰہ التوفیق و صلی اللّٰہ علی سیدنا محمد و صحبه و سلم

—— فتویٰ کمیٹی ——

ضروری کام کی وجہ سے حج کو مؤخر کرنا جائز ہے

سوال گزشتہ تین سالوں سے میں اپنے محکمہ میں فریضۂ حج ادا کرنے کے لیے چھٹی کی درخواست دے رہا ہوں لیکن میرے سپرد کام کی اہمیت کی وجہ سے مجھے چھٹی نہیں مل رہی' تو کیا حج نہ کرنے کی وجہ سے مجھے گناہ ہو گا؟ اگر میں محکمہ کے علم اور اجازت کے بغیر حج کر لوں تو کیا اس میں گناہ ہو گا؟

جواب ہاں جب تک آپ دوسرے کے ساتھ مقید ہوں تو اس کی اجازت کے بغیر آپ حج پر نہیں جاسکتے اور اگر ضرورت کا تقاضا ہو کہ آپ کام کی جگہ پر موجود رہیں تو ضرورت پوری ہونے تک موجود رہنے میں کوئی حرج نہیں' الا یہ کہ کوئی شخص آپ کے قائم مقام کام کرسکے یا کسی اور طریقے سے ضرورت پوری ہو سکے۔

—— شیخ ابن عثیمین ——

مزدور اور سپاہی کا اجازت کے بغیر حج

سوال کیا سپاہی کے لیے اپنے محکمہ کی اجازت کے بغیر حج کرنا جائز ہے؟

جواب مزدور اور سپاہی کو اپنے محکمہ کی اجازت کے بغیر مطلقاً حج نہیں کرنا چاہیے' بلکہ محکمہ کی اجازت کے بغیر ان کے لیے حج کرنا جائز ہی نہیں ہے۔ خواہ حج فرض ہو یا نفل کیونکہ ان کے اوقات کے مستحق ان کے محکمے ہیں اور پھر اعمال حج کی وجہ سے یہ اپنے محکمانہ فرائض بھی تو سرانجام نہیں دے سکیں گے۔

—— شیخ ابن باز ——

سپاہی کا محکمہ کی اجازت کے بغیر اپنی والدہ کے ساتھ حج

سوال میں محکمہ پولیس میں سپاہی ہوں اور اپنی والدہ کے ساتھ حج کرنا چاہتا ہوں لیکن محکمہ کی طرف سے مجھے اجازت نہیں ملی۔ اگر میں محکمہ کی اجازت کے بغیر اپنی والدہ کے ساتھ حج کر لوں تو کیا مجھے گناہ ہو گا؟

جواب آپ ملازم ہیں اور اپنی ڈیوٹی سرانجام دینے کے عوض آپ کو تنخواہ ملتی ہے' لٰہذا محکمہ کی اجازت کے بغیر کام ترک کر کے والدہ کے ساتھ حج کرنا بے جا تصرف ہو گا کیونکہ آپ کی یہ ذمہ داری ہے کہ محکمہ کی طرف سے سپرد کی گئی ڈیوٹی سرانجام دیں' لٰہذا کوئی ایسا کام نہ کیجئے جو اس ذمہ داری میں رکاوٹ بنے الاّ یہ کہ آپ نے پہلے فرض حج نہ کیا ہو تو فرض حج بغیر اجازت کے ادا کرنے میں کوئی امر مانع نہیں ہے کیونکہ حکومت کے کام میں مشغولیت سے پہلے یہ فریضہ آپ کے ذمہ عائد ہے' لٰہذا معلوم ہوا کہ اپنے محکمہ کی اجازت کے بغیر آپ اپنی والدہ کے ساتھ حج نہیں کر سکتے۔ اگر آپ نے پہلے فرض حج نہیں کیا تو پھر بھی احتیاط اسی میں ہے کہ آپ محکمہ سے اجازت لیں۔ آپ کی والدہ کے حوالے سے یہ بھی ممکن ہے کہ ان کے ہمراہ آپ کے علاوہ کوئی اور محرم چلا جائے اور خرچہ وغیرہ آپ ادا کر دیں۔ وصلی اللہ وسلم علی نبینا محمد و آلہ وصحبہ۔

——— فتویٰ کمیٹی ———

قرض اور حج

مقروض کا حج

سوال کیا مقروض کے لیے یہ جائز ہے کہ وہ فریضۂ حج ادا کرے جب کہ اس نے پہلے حج نہ کیا ہو؟ یا کیا ہو اور اب وہ نفل حج کرنا چاہتا ہو؟

جواب اگر انسان پر اس قدر قرض ہو کہ ادا کرنے پر تمام مال ہی ختم ہو جائے تو اس پر حج واجب نہیں ہے کیونکہ حج تو اللہ تعالیٰ نے اس پر واجب قرار دیا ہے جسے اس کی استطاعت ہو' ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ وَلِلَّهِ عَلَى ٱلنَّاسِ حِجُّ ٱلْبَيْتِ مَنِ ٱسْتَطَاعَ إِلَيْهِ سَبِيلًا ﴾ (آل عمران۳/ ۹۷)

"اور لوگوں پر اللہ کا حق (یعنی فرض) ہے کہ جو اس گھر تک جانے کا مقدور رکھے' وہ اس کا حج کرے۔"

اور جس پر اس کے سارے مال کے بقدر قرض ہو تو اسے حج کی استطاعت نہیں ہے' لٰہذا اسے پہلے اپنا قرض ادا کرنا چاہیئے اور اگر بعد میں ممکن ہو تو حج کر لے اور اگر قرض کم ہو کہ وہ قرض ادا کرنے کے بعد حج بھی کر سکتا ہو تو وہ پہلے قرض ادا کرے اور پھر حج کر لے' خواہ حج فرض ہو یا نفل۔ لیکن حج اگر فرض ہو تو اسے ادا کرنے میں جلدی کرنی چاہیئے اور اگر اس نے فرض حج پہلے ادا کر لیا ہو تو اسے اختیار ہے کہ نفل حج اگر چاہے تو کرے اور اگر نہ چاہے تو اسے کوئی گناہ نہیں ہو گا۔

——— شیخ ابن عثیمین ———

قرض ادا کرنے سے پہلے حج کرنا

سوال میں کام کے دو سال کے معاہدہ پر سعودی عرب میں آیا ہوں۔ میں نے اپنے کچھ دوستوں کا قرض دینا ہے۔ قرض ادا کرنے کے لیے کسی مدت کا تعین نہیں ہے بلکہ مجھے اجازت ہے کہ جب آسانی سے ممکن ہو تو میں قرض ادا کر دوں۔ میری نیت اس سال اپنے والدین کے ساتھ حج کرنے کی ہے لیکن میں نے پڑھا ہے کہ حج سے پہلے قرض ادا کرنا ضروری ہے تو سوال یہ ہے کیا اس صورت میں میرے لیے حج کرنا جائز ہے جب کہ میں اپنے وطن واپس لوٹ کر اپنے قرض ادا کر دوں گا؟

جواب آپ کے لیے قرض ادا کرنے سے پہلے حج کرنا جائز ہے۔ آپ کا حج صحیح ہو گا کیونکہ قرض ادا کرنے کے لیے وقت کا تعین نہیں ہے بلکہ آپ کو یہ سہولت دی گئی ہے کہ آپ جب چاہیں آسانی سے ادا کر دیں اور پھر قرض دہندہ یہاں موجود نہیں ہیں' وہ آپ کے دوست بھی ہیں۔ اگر انہیں معلوم ہو کہ آپ حج کر رہے ہیں تو وہ آپ کو منع بھی نہیں کریں گے' ہاں البتہ جب قرض دہندہ سختی سے اپنے قرض کی وصولی کا مطالبہ کریں تو پھر پہلے قرض ادا کرنا لازم ہوتا ہے اور اگر وہ درگزر کریں اور آپ ان کو قائل اور مطمئن کر سکیں کہ حج سے واپس آنے کے بعد آپ انہیں قرض ادا کر دیں گے تو پھر حج سے ان شاء اللہ تعالیٰ کوئی امر مانع نہیں ہے۔

——— شیخ ابن جبرین ———

اس شخص کا حج جس کے ذمے چوری کا مال ہو

سوال میں نے اپنے والد کی پھوپھی کا کچھ مال ان کے علم کے بغیر لے لیا تھا۔ اس مال کی واپسی سے پہلے ان کا انتقال ہو گیا۔ میں نے گزشتہ سال حج بھی کیا ہے جب کہ اس مال کی واپسی میرے ذمہ تھی۔ سوال یہ ہے کہ اس صورت میں میرا حج صحیح ہے؟ بری الذمہ ہونے کے لیے اب میں اس مال کو کیا کروں کیونکہ اس خاتون کے وارث اب صرف میرے والد اور ان کے بھائی ہیں؟ امید ہے رہنمائی فرمائیں گے۔ جزاکم اللہ خیرًا

جواب آپ کا حج ان شاء اللہ صحیح ہے بشرطیکہ آپ نے ان تمام امور کو ادا کیا ہو جن کو اللہ تعالیٰ نے حج میں واجب قرار دیا ہے اور ان تمام امور کو ترک کر دیا ہو جن سے حج فاسد ہو جاتا ہے۔ آپ نے ناحق اپنے والد کی پھوپھی کا جو مال لیا ہے تو اس سے اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں توبہ کیجئے اور اگر آپ کے والد ان کے وارث ہیں تو وہ مال انہیں دے دیجئے۔ ہم اللہ تعالیٰ سے یہ دعا کرتے ہیں کہ وہ ہمیں' آپ کو اور ہر ایک مسلمان کو معاف فرما دے۔

——— شیخ ابن باز ———

حج اور قرض

سوال میں اس سال فریضۂ حج ادا کرنا چاہتا ہوں لیکن میں نے بینک سے قرض لے رکھا ہے جسے ماہانہ قسطوں کی صورت میں ادا کر رہا ہوں اور یہ قسطیں اب سے چھ ماہ بعد ختم ہوں گی' تو کیا اس صورت میں میرے لیے فریضۂ حج ادا کرنا جائز ہے' یاد رہے کہ یہ قرض میں نے کسی اور مقصد کے لیے لیا تھا اس وقت فریضۂ حج ادا کرنا میرے پیش نظر نہ تھا؟

جواب اگر آپ کے پاس حج کے اخراجات اور قرض کے بروقت ادا کرنے کی طاقت ہے تو آپ پر حسب ذیل ارشاد باری تعالیٰ کے عموم کے پیش نظر حج واجب ہے:

﴿ وَلِلَّهِ عَلَى ٱلنَّاسِ حِجُّ ٱلْبَيْتِ مَنِ ٱسْتَطَاعَ إِلَيْهِ سَبِيلًا ﴾ (آل عمران ۳/ ۹۷)

"اور لوگوں پر اللہ کا حق (یعنی فرض) ہے کہ جو اس گھر تک جانے کا مقدور رکھے' وہ اس کا حج کرے۔"

اور اگر قرض ادا کرنے کے ساتھ ساتھ حج کے اخراجات کی آپ کو استطاعت نہیں ہے تو پھر مذکورہ آیت کریمہ اور اس کے ہم معنی رسول اللہ ﷺ کی احادیث شریفہ کی رو سے آپ پر حج واجب نہیں ہے۔

——— شیخ ابن باز ———

قرض لے کر حج کرنا

سوال میں بیت اللہ شریف کا حج کرنا چاہتا ہوں۔ میرے پاس مالی استطاعت نہیں ہے لیکن میں جس ادارے میں کام کرتا ہوں اس نے مجھے حج کے لیے قرض دینے کا اس شرط پر وعدہ کر لیا ہے کہ وہ میری تنخواہ سے یہ قرض وصول کرتا رہے گا' تو کیا اس صورت میں میرا یہ حج مقبول ہو گا؟

جواب آپ اس طرح حج کر لیں تو حج مقبول ہو گا۔ قرض لیے ہوئے مال سے حج کیا جائے تو مقبول ہے لیکن بہتر اور افضل یہ ہے کہ آپ ایسا نہ کریں کیونکہ اللہ تعالیٰ نے حج اس پر واجب قرار دیا ہے جسے استطاعت ہو اور آپ کو اس وقت استطاعت نہیں ہے۔ آپ کو قرض نہیں لینا چاہیئے کیونکہ آپ کو علم نہیں کہ شاید آپ قرض نہ اتار سکیں۔ بسااوقات انسان بیمار ہو جاتا ہے' فوت ہو جاتا ہے یا ممکن ہے کہ بعد میں آپ اس ادارے میں کام ہی نہ کریں' لہٰذا آپ کو چاہیئے کہ قرض نہ لیں۔ جب اللہ تعالیٰ آپ کو مالی وسائل عطا فرما دے تو حج کر لیں ورنہ نہ کریں۔

——— شیخ ابن باز ———

حج بدل

اجرت لے کر حج بدل کرنا

سوال جو شخص ہدی کے بغیر تین ہزار ریال حج کی اجرت لے لے اور صحیح طریقے سے حج کر لے تو کیا اسے حج کا ثواب ملے گا؟ کیا اس سے متوفی کا بھی حج ہو جائے گا؟ اور اس کا بھی جس نے اجرت ادا کی ہے؟ یا جس نے حج کیا ہے وہ محروم رہے گا؟ کیونکہ بعض لوگ ایسا فتویٰ دینے لگے ہیں جسے ہم نہیں جانتے یعنی وہ یہ کہتے ہیں کہ حج کرنے والے کو حج کا ثواب نہیں ملے گا کیونکہ اس نے حج کی بجائے اجرت لے لی ہے۔ ہم اس مسئلہ میں صحیح صورتحال معلوم کرنا چاہتے ہیں۔

جواب اگر اس شخص نے حج کی اجرت محض دنیا کے حصول کی خاطر لی ہے تو یہ بہت خطرناک صورتحال ہے اور خطرہ ہے کہ شاید اس کا حج مقبول ہی نہ ہو کیونکہ اس شخص نے آخرت پر دنیا کو ترجیح دی ہے۔ اور اگر اس نے اجرت اس لیے لی

ہے کہ فریضۂ حج ادا کر کے وہ اللہ سبحانہ و تعالیٰ کی رضا حاصل کر سکے' اپنے مسلمان بھائی کی طرف سے حج کر کے اسے نفع پہنچا سکے' مشاعر حج میں مسلمانوں کے ساتھ شریک ہو سکے' طواف' مسجد حرام کی نمازوں اور علمی محفلوں میں شرکت کر کے اجر و ثواب حاصل کر سکے تو وہ یقیناً بہت زیادہ خیر و برکت حاصل کر کے حج کا بھی اسی قدر ثواب حاصل کرے گا جس قدر اسے ثواب ملے گا جس کی طرف سے اس نے حج کیا ہو گا۔

فتویٰ کمیٹی

تندرست آدمی کی طرف سے حج بدل

سوال ایک صحیح سالم (تندرست) آدمی یہ چاہتا ہے کہ وہ اپنی طرف سے کسی کو حج پر بھیج دے تو کیا اس کا حج صحیح ہو گا؟

جواب علماء کا اس بات پر اجماع ہے کہ جو شخص خود حج کرنے کی قدرت رکھتا ہو اس کے لیے یہ جائز نہیں کہ فرض حج کے لیے کسی اور کو اپنی طرف سے نائب بنا کر بھیجے۔ ابن قدامہ رحمہ اللہ "المغنی" میں فرماتے ہیں کہ اس بات پر اجماع ہے کہ جو شخص خود حج کرنے کی قدرت رکھتا ہو اس کے لیے یہ جائز نہیں کہ کسی کو نائب بنا کر بھیج دے۔ اسی طرح صحیح قول کے مطابق نفل حج کی نیابت بھی جائز نہیں ہے کیونکہ حج عبادت ہے اور عبادات میں اصل یہ ہے کہ یہ توقیفی ہیں اور ہمارے علم کے مطابق شریعت میں ایسی کوئی دلیل نہیں ہے جس سے یہ معلوم ہو کہ تندرست آدمی بھی اپنی طرف سے کسی کو حج پر بھیج سکتا ہے اور نبی کریم ﷺ سے یہ ثابت ہے کہ آپ نے فرمایا:

«مَنْ أَحْدَثَ فِي أَمْرِنَا هٰذَا مَا لَيْسَ مِنْهُ فَهُوَ رَدٌّ»(صحيح البخاري، الصلح، باب إذا اصطلحوا على صلح جور ... الخ، ح:٢٦٩٧ وصحيح مسلم، الأقضية، باب نقض الأحكام الباطلة ... الخ، ح:١٧١٨)

"جو شخص ہمارے اس دین میں کوئی ایسی بات پیدا کرے جو اس میں سے نہ ہو تو وہ (بات) مردود ہے"

ایک اور روایت میں الفاظ یہ ہیں:

«مَنْ عَمِلَ عَمَلاً لَّيْسَ عَلَيْهِ أَمْرُنَا فَهُوَ رَدٌّ»(صحيح مسلم، الأقضية، باب نقض الأحكام الباطلة... الخ، ح:١٧١٨)

"جس شخص نے کوئی ایسا عمل کیا جس کے بارے میں ہمارا حکم نہ ہو تو وہ (عمل) مردود ہے۔"

اسی طرح سماحۃ الشیخ عبدالعزیز بن باز رحمہ اللہ سے یہ سوال پوچھا گیا: "جو شخص پہلے فریضۂ حج ادا کر چکا ہو تو کیا وہ نفل حج کے لیے کسی کو اپنا نائب مقرر کر سکتا ہے' جبکہ وہ خود بھی حج کر سکتا ہو؟ تو سماحۃ الشیخ نے اس سوال کا یہ جواب دیا:

اس مسئلہ میں اگرچہ اہل علم میں اختلاف ہے لیکن زیادہ نمایاں بات یہ ہے کہ یہ جائز نہیں کیونکہ حج بدل کی اجازت کا تعلق میت اور اس بے حد بوڑھے انسان سے ہے جو خود حج کرنے سے عاجز و قاصر ہو اور اس دائمی مریض کا بھی یہی حکم ہے جس کے صحت یاب ہونے کی امید نہ ہو اور عبادات کے سلسلہ میں اصل عدم نیابت ہے' لہٰذا واجب ہے کہ اس اصول کو باقی رہنے دیا جائے۔ واللہ ولی التوفیق

شیخ ابن باز

اسی موضوع سے متعلق حسب ذیل سوال سماحۃ الشیخ محمد بن عثیمین رحمہ اللہ سے پوچھا گیا: "ایک عورت یہ چاہتی ہے کہ وہ کسی کو اپنا وکیل بنا کر حج کے لیے بھیج دے کیونکہ اس شخص کو حج کے مسائل کا علم ہے اور اس عورت کو بھی اس پر اعتماد ہے کہ وہ تمام مناسک حج مکمل طور پر ادا کرے گا جب کہ اس عورت کو مناسک حج کا بہت کم علم ہے اور پھر ماہانہ معمول وغیرہ کی وجہ سے بھی حج میں خلل آنے کا اندیشہ ہے۔ نیز یہ عورت یہ بھی چاہتی ہے کہ وہ اپنے بچوں کی تربیت اور گھر میں ان کی نگہداشت میں مصروف رہے۔ تو کیا اندریں صورت حال اس کے لیے شرعاً یہ جائز ہے کہ کسی کو اپنا وکیل بنا کر حج پر بھیج دے؟ سماحۃ الشیخ نے اس کا یہ جواب دیا:

انسان جب کسی کو حج کے لیے اپنا وکیل بناتا ہے تو اس کی حسب ذیل دو حالتیں ہوتی ہیں:

① فرض حج کے لیے وکالت!

② نفل حج کے لیے وکالت!

حج اگر فرض ہو تو پھر یہ جائز نہیں کہ انسان کسی کو اپنا وکیل بنائے تاکہ وہ اس کی طرف سے حج اور عمرہ کرے الاّ یہ کہ دائمی مرض ہو جس سے صحت یاب ہونے کی امید نہ ہو یا بڑھاپے وغیرہ کی وجہ سے بیت اللہ تک پہنچنا ممکن ہی نہ ہو۔ اگر بیماری سے صحت یاب ہونے کی امید ہو تو پھر انتظار کرے حتیٰ کہ اللہ تعالیٰ اسے صحت و عافیت عطا فرما دے تو اپنا حج خود کرے اور اگر حج ادا کرنے میں کوئی رکاوٹ نہ ہو بلکہ آدمی خود حج کر سکتا ہو تو پھر اس کیلئے یہ حلال نہیں کہ حج کیلئے کسی اور کو اپنا وکیل بنائے کیونکہ خود اس سے ذاتی طور پر مطالبہ ہے کہ یہ خود حج کرے' ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ وَلِلَّهِ عَلَى ٱلنَّاسِ حِجُّ ٱلْبَيْتِ مَنِ ٱسْتَطَاعَ إِلَيْهِ سَبِيلًا ﴾ (آل عمران ۳/۹۷)

"اور لوگوں پر اللہ کا حق (یعنی فرض) ہے کہ جو اس گھر تک جانے کا مقدور رکھے' وہ اس کا حج کرے۔"

عبادات میں مقصود ہی یہ ہے کہ انسان انہیں خود سرانجام دے تاکہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ کے سامنے وہ خود بندگی اور عاجزی و انکساری کا اظہار کر سکے اور ظاہر ہے کہ جو شخص کسی اور کو اپنا وکیل بناتا ہے تو وہ اس عظیم مقصد کو حاصل نہیں کر سکتا جس کے لیے عبادات کا حکم دیا گیا ہے۔

حج اگر نفل ہو یعنی وہ شخص فرض حج پہلے ادا کر چکا ہو اور اب وہ حج یا عمرہ کے لیے کسی کو اپنا وکیل مقرر کرنا چاہتا ہو تو اس مسئلہ میں اہل علم میں اختلاف ہے۔ بعض نے اسے جائز اور بعض نے ناجائز قرار دیا ہے۔ میرے نزدیک صحیح بات یہ ہے کہ یہ بھی ناجائز ہے کہ انسان کسی کو نفل حج اور عمرہ میں اپنا وکیل بنائے کیونکہ عبادات میں اصول یہ ہے کہ انسان انہیں خود سرانجام دے جس طرح انسان روزوں کے سلسلہ میں کسی کو اپنا وکیل نہیں بنا سکتا اسی طرح حج میں بھی نہیں بنا سکتا' ہاں البتہ اگر کوئی انسان فوت ہو جائے اور اس کے ذمہ فرض روزے ہوں تو پھر وہ روزے اس کی طرف سے اس کے وارث کو رکھنے چاہئیں' اسی طرح اگر کوئی فوت ہو جائے اور وہ فرض حج ادا نہ کر سکتا ہو تو پھر اس کا وارث اس کی طرف سے حج کر سکتا ہے۔ حج چونکہ ایک بدنی عبادت ہے جسے انسان خود ہی سرانجام دیتا ہے اور جب یہ بدنی عبادت ہے تو پھر کسی اور کا اس کی طرف سے اس عبادت کو ادا کرنا صحیح نہیں ہے' سوائے ان صورتوں کے جن کا سنت میں ذکر آ گیا ہے اور نفل حج کے بارے میں سنت میں کوئی ذکر نہیں ہے۔ امام احمد سے بھی ایک روایت یہ ہے کہ انسان کے لیے نفل حج یا عمرہ میں کسی کو وکیل بنانا صحیح نہیں ہے خواہ وہ خود قادر ہو یا نہ ہو' لہٰذا اس قول کی بنیاد پر صاحب ثروت و قدرت لوگوں کو چاہیئے کہ وہ خود

حج ادا کریں۔ بعض اوقات یوں بھی ہوتا ہے کہ کئی سال گزر جاتے ہیں اور بعض لوگ وسائل کے باوجود حج کے لیے مکہ مکرمہ نہیں جاتے کیونکہ وہ یہ سوچتے رہتے ہیں کہ کسی کو وکیل بنا کر بھیج دیں گے اور اس طرح کئی سال گزر جاتے ہیں اور نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ حج فوت ہو جاتا ہے۔ واللہ اعلم۔

——— شیخ ابن عثیمین ———

والدین کی طرف سے حج کرو تمہیں ثواب ملے گا

سوال ہمارے والدین فوت ہو چکے ہیں اور انہوں نے فریضۂ حج ادا نہیں کیا تھا اور نہ اس کی وصیت ہی کی تھی' تو کیا ہم ان کی طرف سے حج کر سکتے ہیں؟

جواب اگر وہ اپنی زندگی میں خوش حال تھے اور حج کی مالی استطاعت رکھتے تھے تو آپ پر واجب ہے کہ ان کے مال سے ان کی طرف سے حج کریں اور اگر آپ اپنے مال سے ان کی طرف سے حج کریں تو آپ کو اس کا اجر و ثواب ملے گا۔ اور اگر وہ تنگ دست تھے تو پھر آپ کیلئے ان کی طرف سے حج کرنا لازم نہیں ہے یا ان میں سے اگر کوئی ایک تنگ دست تھا تو تنگ دست کی طرف سے حج کرنا لازم نہیں ہے' ہاں البتہ اگر آپ ان کی طرف سے حج کرلیں تو یہ نیکی ہوگی اور آپ کو اس کا اجر عظیم ملے گا۔

——— شیخ ابن باز ———

والدہ کی طرف سے حج میں ان کی طرف سے تلبیہ بھول گیا

سوال اس شخص کے بارے میں کیا حکم ہے جس نے اپنی والدہ کی طرف سے حج کیا اور میقات پر حج کے لیے لبیک تو کہا لیکن اپنی والدہ کی طرف سے تلبیہ کہنا بھول گیا؟

جواب اگر اس کا مقصود اپنی والدہ کی طرف سے حج کرنا تھا اور وہ ان کی طرف سے تلبیہ کہنا بھول گیا تو یہ حج ان کی والدہ ہی کے لیے ہو گا کیونکہ اس میں زیادہ قوی دخل نیت کا ہے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے:

«إِنَّمَا الأَعْمَالُ بِالنِّيَّاتِ»(صحيح البخاري، بدء الوحي، باب كيف كان بدء الوحي ... الخ، ح:١ وصحيح مسلم، الإمارة، باب قوله ﷺ إنما الأعمال بالنية... الخ، ح:١٩٠٧)

"اعمال کا انحصار صرف نیتوں پر ہے۔"

لہٰذا جب قصد و ارادہ ماں یا باپ کی طرف سے حج کا ہو اور پھر احرام کے وقت آدمی ان کی طرف سے تلبیہ کہنا بھول جائے تو یہ حج ماں یا باپ یا ان کے علاوہ اسی کے لیے ہو گا جس کے لیے نیت کی تھی۔

——— شیخ ابن باز ———

حج میں نیابت

سوال ایک آدمی اپنے ماں باپ کی طرف سے حج بدل کرانا چاہتا تھا تو اس نے اپنے باپ کی طرف سے حج کا خرچ ایک عورت کے سپرد کر دیا تاکہ وہ یہ خرچہ اپنے شوہر کو حج کے لیے دے دے اور اس نے اپنی ماں کی طرف سے حج کا خرچ اس

عورت کو دے دیا' تو اس کے بارے میں کیا حکم ہے؟

جواب آپ کا اپنے ماں باپ پر حج کا صدقہ کرنا نیکی اور احسان ہے۔ اللہ تعالیٰ آپ کو اس نیکی اور احسان کا یقیناً اجروثواب عطا فرمائے گا۔

آپ نے اپنے والد کی طرف سے حج کا خرچہ جو اس عورت کے سپرد کر دیا تاکہ وہ اپنے شوہر کو دے دے تو یہ وکالت ہے اور اس کام میں وکالت جائز ہے اور حج میں نیابت بھی جائز ہے بشرطیکہ نائب خود حج کر چکا ہو۔ اسی طرح آپ نے عورت کو جو خرچ دیا تاکہ وہ آپ کی امی کی طرف سے حج کرے تو عورت کی بھی' عورت اور مرد کی طرف سے حج میں نیابت جائز ہے جیسا کہ نبی ﷺ کی احادیث سے ثابت ہے۔[1] حج کیلئے کسی کو نائب بنانے والے کیلئے یہ ضروری ہے کہ وہ نیابت کیلئے کسی ایسے شخص کا انتخاب کرے جو اہل دین و امانت میں سے ہو تاکہ یہ اطمینان رہے کہ اس نے فرض کو صحیح طور پر ادا کیا ہے۔

——— فتویٰ کمیٹی ———

فوت شدہ نے حج کیا ہو نہ اس کی وصیت کی ہو؟

سوال جب کوئی شخص فوت ہو جائے اور اس نے کسی کو اپنی طرف سے حج کرنے کی وصیت بھی نہ کی ہو پھر اگر اس کا بیٹا اس کی طرف سے حج کر لے تو کیا اس کی طرف سے فریضۂ حج ادا ہو جائے گا؟

جواب جب اس کا مسلمان بیٹا اس کی طرف سے حج کرے' جب کہ وہ خود اپنا حج کر چکا ہو تو اس کی طرف سے فریضۂ حج ادا ہو جائے گا۔ اسی طرح بیٹے کے سوا اگر کوئی اور مسلمان بھی جس نے پہلے اپنا حج کیا ہوا ہو' اس کی طرف سے حج کرے تو پھر بھی فرض ساقط ہو جائے گا کیونکہ "صحیحین" میں ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ ایک عورت نے عرض کیا یا رسول اللہ! میرا باپ بہت بوڑھا ہے۔ اللہ نے اپنے بندوں پر جو فریضۂ حج عائد کیا ہے' وہ اس پر فرض ہے لیکن وہ حج کی اور سواری پر سوار ہونے کی استطاعت نہیں رکھتا' تو کیا میں اس کی طرف سے حج کر سکتی ہوں؟ فرمایا:

«نَعَمْ، فَحُجِّي عَنْهُ»(صحيح البخاري، الحج، باب وجوب الحج وفضله... الخ، ح:١٥١٣ وصحيح مسلم، الحج، باب الحج عن العاجز... الخ، ح:١٣٣٤ ـ ١٣٣٥)

"ہاں! ان کی طرف سے حج کرو۔" اس مسئلے کے بارے میں اور بھی بہت سی احادیث ہیں جو اس بات پر دلالت کرتی ہیں جو ہم نے ذکر کی ہے۔

——— شیخ ابن باز ———

فوت شدہ کے مال سے حج کیا جائے

سوال ایک شخص فوت ہو گیا۔ اس نے فریضۂ حج ادا نہیں کیا تھا۔ اور وصیت کی کہ اس کے مال سے حج کیا جائے تو کیا غیر کا حج کرنا اسی طرح ہے جس طرح بذات خود اس کا حج کرتا؟

---

[1] صحیح بخاری' جزاء الصید' باب الحج عمن لا یستطیع الثبوت ..... الخ' حدیث: 1854 و صحیح مسلم' الحج' باب الحج عن العاجز ..... الخ' حدیث: 1335-

جواب جب کوئی مسلمان شخص فوت ہو جائے اور وہ فریضۂ حج ادا نہ کر سکے جبکہ وہ وجوب حج کی شرطوں کو پورا کرتا ہو تو ضروری ہے کہ اس کے ترکہ سے حج کیا جائے خواہ اس نے وصیت کی ہو یا نہ کی ہو۔ اور جب کوئی دوسرا شخص فوت شدہ کی طرف سے حج کرے' جو پہلے خود اپنا حج کر چکا ہو تو یہ حج صحیح ہے۔ اس سے فرض ساقط ہو جائے گا۔ باقی رہا یہ مسئلہ کہ کسی غیر کا حج کرنا' کیا خود حج کرنے کی طرح ہے یا اس کا ثواب کم یا زیادہ؟ تو یہ معاملہ اللہ تعالیٰ کے سپرد ہے لیکن اس میں کوئی شک نہیں کہ جب استطاعت ہو تو ہر شخص کو چاہیئے کہ وہ جلدی کرے اور فوت ہونے سے پہلے پہلے فریضۂ حج ادا کرے جیسا کہ ادلہ شرعیہ سے معلوم ہوتا ہے۔ نیز اس سلسلہ میں تاخیر کرنے میں گناہ کا بھی اندیشہ ہے۔

——— فتویٰ کمیٹی ———

بالغ بیٹا فوت ہو گیا اور اس نے حج نہیں کیا تھا

سوال میرا سولہ سال کا بیٹا فوت ہو گیا ور اس نے حج نہیں کیا تھا۔ تو کیا مجھ پر لازم ہے کہ میں اس کی طرف سے حج کروں؟

جواب جب بیٹا یا بیٹی بالغ ہو جائے یا ان کی عمر پندرہ سال ہو جائے تو حج واجب ہو جاتا ہے بشرطیکہ استطاعت ہو۔ بلوغت سے پہلے کیے ہوئے حج سے فرض ادا نہیں ہو گا۔ اگر کوئی شخص بلوغت اور استطاعت کے بعد فوت ہو تو اس کے مال سے حج کیا جائے یا اس کا وارث اس کی طرف سے حج کرے۔

——— شیخ ابن جبرین ———

معمر والدہ کی طرف سے حج کرنا

سوال ایک شخص کی والدہ کی عمر قریباً ستر سال ہے اور اس کی طبیعت یہ ہے کہ وہ گاڑیوں پر سفر نہیں کر سکتی خواہ مسافت قریب ہی ہو کیونکہ وہ ایسے مرض میں مبتلا ہے کہ جب وہ گاڑی پر سوار ہوتی ہے تو اپنی یادداشت کھو بیٹھتی ہے' لہٰذا وہ فریضۂ حج ادا نہیں کر سکی' تو کیا میرے لیے یہ جائز ہے کہ اپنے مال میں سے اس کی طرف سے حج کروں' یاد رہے کہ میں ہی اپنی والدہ کا اکلوتا بیٹا ہوں؟

جواب اگر صورت حال اسی طرح ہے جس طرح سوال میں مذکور ہے تو آپ کے لیے اپنی والدہ کی طرف سے حج کرنا اور اس سلسلہ میں اپنا کچھ مال خرچ کرنا بھی جائز ہے بلکہ والدہ کے ساتھ نیکی اور احسان کے پیش نظر آپ کے لیے ان کی طرف سے حج کرنے کی تاکید مزید بڑھ جاتی ہے کیونکہ انہیں استطاعت نہیں ہے اور اس مذکورہ حالت میں حج میں نیابت جائز ہے۔
وباللہ التوفیق۔ وصلی اللہ علی نبینا محمد وآلہ وصحبہ وسلم۔

——— فتویٰ کمیٹی ———

کیا میں والدہ کی طرف سے خود حج کروں یا .....؟

سوال میری والدہ فوت ہو گئیں جبکہ میں چھوٹا ہی تھا' لہٰذا میں نے ایک قابل اعتماد شخص کو اجرت پر حج کے لیے بھیجا۔ اسی طرح میرے والد کا بھی انتقال ہو چکا ہے اور ان میں سے میں کسی کے بارے میں کچھ نہیں جانتا۔ میں نے بعض رشتہ

داروں سے یہ سنا ہے کہ میرے والد نے حج کیا تھا۔ کیا کسی کو والدہ کی طرف سے حج کے لیے اجرت پر بھیجنا جائز ہے یا ضروری ہے کہ میں خود ان کی طرف سے حج کروں؟ کیا میرے لیے اپنے والد کی طرف سے حج کرنا بھی لازم ہے جبکہ میں نے سنا ہے کہ انہوں نے حج کیا تھا؟ امید ہے رہنمائی فرما کر شکریہ کا موقع بخشیں گے۔

جواب اگر آپ اپنے والدین کی طرف سے خود حج کریں اور شرعی طریقے سے حج کی تکمیل کے لیے کوشش کریں تو یہ افضل ہے اور اگر آپ دین دار اور امانت دار لوگوں میں سے کسی کو اجرت پر بھیج دیں تو اس میں بھی کوئی حرج نہیں۔ لیکن افضل یہ ہے کہ آپ خود اپنے والدین کی طرف سے حج اور عمرہ کریں اور اگر کسی کو نائب بنا کر بھیجیں تو آپ اسے حکم دیں کہ وہ ان کی طرف سے حج اور عمرہ کرے۔ آپ کا یہ اپنے ماں باپ کے ساتھ نیکی اور حسن سلوک ہو گا۔ تقبل اللہ منا و منک۔

——— شیخ ابن باز ———

فوت شدہ والدین کی طرف سے حج کرنا

سوال کیا میں اپنے فوت شدہ والدین کی طرف سے حج کر سکتا ہوں؟ کیونکہ فقر کی وجہ سے وہ فریضۂ حج ادا نہیں کر سکے لہٰذا میں ان کی طرف سے حج کرنا چاہتا ہوں تو اس کے لیے کیا حکم ہے؟

جواب آپ کے لیے یہ جائز ہے کہ آپ اپنے والدین کی طرف سے حج کریں بشرطیکہ آپ نے خود پہلے حج کیا ہو۔ اسی طرح ان کے حج کے لیے کسی ایسے شخص کو نائب بنا کر بھیجنا بھی درست ہے جو خود پہلے اپنا حج کر چکا ہو۔ سنن ابی داود میں عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک شخص کو یہ کہتے ہوئے سنا:

«لَبَّيْكَ عَنْ شُبْرُمَةَ»

"میں شبرمہ کی طرف سے حاضر ہوں۔"

تو آپ نے فرمایا:

«مَنْ شُبْرُمَةُ؟ قَالَ: أَخٌ لِي - أَوْ قَرِيبٌ لِي»

"شبرمہ کون ہے؟" اس نے کہا کہ وہ میرا بھائی یا کوئی رشتہ دار ہے۔"

آپ نے فرمایا:

«حَجَجْتَ عَنْ نَفْسِكَ؟ قَالَ لاَ»

"کیا تم نے خود حج کر لیا ہے؟" اس نے جواب دیا نہیں۔

تو آپ نے فرمایا:

«حُجَّ عَنْ نَفْسِكَ، ثُمَّ حُجَّ عَنْ شُبْرُمَةَ» (سنن أبي داود، المناسك، باب الرجل يحج عن غيره، ح: ١٨١١ والسنن الكبرى للبيهقي: ٤/ ٣٣٦)

"پہلے خود حج کرو پھر شبرمہ کی طرف سے حج کرو۔"

امام بیہقی فرماتے ہیں کہ اس حدیث کی سند صحیح ہے اور اس باب (مسئلہ مذکورہ) میں اس سے زیادہ اور کوئی صحیح حدیث نہیں ہے۔

——— فتویٰ کمیٹی ———

ایسے اشخاص کی طرف سے حج کرنا جن کے نام معلوم نہ ہوں

سوال میرے چچاؤں اور دادوں میں سے چار مرد اور عورتیں ایسے ہیں جن میں سے بعض کے میں نام بھی نہیں جانتا لیکن ان میں سے ہر ایک کیلئے میں ایک ایک شخص کو اپنے خرچ پر حج کیلئے بھیجنا چاہتا ہوں تو اس کے لیے کیا حکم ہے؟

جواب اگر امرواقع اسی طرح ہے جس طرح سوال میں مذکور ہے تو جن مردوں اور عورتوں کے آپ کو نام معلوم ہیں تو ان کے بارے میں کوئی اشکال نہیں ہے اور جن چچاؤں' ماموؤں' مردوں اور عورتوں کے آپ کو نام معلوم نہیں ہیں تو ان کی عمروں اور اوصاف کی ترتیب سے ان کے بارے میں نیت کر لینا ہی کافی ہے خواہ نام نہ بھی معلوم ہو۔ وباللہ التوفیق۔

وصلی اللہ وسلم علی نبینا محمد و آلہ وصحبہ وسلم۔

——— فتویٰ کمیٹی ———

حج کی نیت میں تبدیلی

سوال ایک شخص نے خود اپنے لیے حج ادا کرنے کی نیت کی تھی' پھر عرفہ میں اسے خیال آیا کہ یہ حج وہ اپنے کسی عزیز کی طرف سے کرے تو اس بارے میں کیا حکم ہے؟ کیا یہ جائز ہے یا نہیں؟

جواب انسان جب اپنے لیے حج کا احرام باندھ لے تو پھر راستہ میں یا عرفہ میں تبدیلی کرنا جائز نہیں ہے بلکہ اس کے لیے یہ لازم ہے کہ وہ اس حج کو اپنے لیے مکمل کرے' تبدیلی کر کے اسے اپنے باپ یا ماں یا کسی اور کے لیے نہ بنائے کیونکہ اب یہ حج اسی کے لیے متعین ہے کیونکہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ وَأَتِمُّوا۟ ٱلْحَجَّ وَٱلْعُمْرَةَ لِلَّهِ ۚ ﴾ (البقرۃ۲/ ۱۹۶)

"اور اللہ (کی خوشنودی) کے لیے حج اور عمرے کو پورا کرو۔"

اب جبکہ اس نے اپنے لیے احرام باندھا ہے تو ضروری ہے کہ اسے اپنے لیے ہی پورا کرے اور اگر اس نے کسی اور کے لیے احرام باندھا ہو تو پھر اسی کے لیے اسے پورا کرنا چاہئے اور احرام کے بعد اس میں تبدیلی نہیں کرنی چاہئے۔

——— فتویٰ کمیٹی ———

وکیل جب حج کرنے سے عاجز و قاصر ہو؟

سوال چار سال قبل ایک شخص نے ایک طواف کرنے والے سے حج بدل کا خرچہ وصول کیا تاکہ وہ بیرون ملک مقیم ایک شخص کی طرف سے حج کرے لیکن مالی ضرورت اور سستی کی وجہ سے یہ شخص حج نہیں کر سکا اور اب وہ یہ چاہتا ہے کہ حج کر کے بری الذمہ ہو جائے لیکن بیماری کی وجہ سے حج نہیں کر سکتا' ہاں البتہ اس کیلئے تیار ہے کہ خرچ ادا کر دے۔ یاد رہے جس طواف کرنے والے نے اسے حج کیلئے وکیل بنایا تھا وہ اب موجود نہیں ہے اور نہ اس کی جگہ کے بارے میں کچھ معلوم ہے؟

جواب اگر امرواقع اسی طرح ہے جس طرح سائل نے ذکر کیا ہے تو اسے چاہئے کہ حج کا خرچ کسی ایسے شخص کو دے دے جو دین اور امانت کے اعتبار سے قابل اطمینان ہو تاکہ وہ اس کی طرف سے حج کر سکے جس کی طرف سے حج کرنے کے لیے اسے مال دیا گیا تھا' ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ فَاتَّقُوا اللَّهَ مَا اسْتَطَعْتُمْ ﴾ (التغابن ٦٤/ ١٦)

"سو جہاں تک ہو سکے تم اللہ تعالیٰ سے ڈرو۔"

اللہ تعالیٰ ہم سب کو اپنی رضا کے لیے عمل کی توفیق عطا فرمائے۔ والسلام

—— شیخ ابن باز ——

عمرہ دو کی طرف سے نہیں ہو سکتا

سوال الحمد للہ ہم ہر سال عمرہ ادا کرنے کے لیے رمضان المبارک میں مکہ مکرمہ جاتے ہیں تو ایک سال میں اپنے باپ کی طرف سے اور دوسرے سال اپنی والدہ کی طرف سے عمرہ کی نیت کر لیتا ہوں لیکن آخری عمرہ جو میں نے کیا ہے تو اس میں دونوں کی طرف سے نیت کی تھی اور جب میں نے اس عمرے کے بارے میں پوچھا تو مجھے بتایا گیا کہ یہ عمرہ آپ ہی کے لیے ہو گا' آپ کے ماں باپ کے لیے نہیں ہو گا تو کیا یہ بات صحیح ہے؟

جواب ہاں یہ بات صحیح ہے۔ اہل علم کہتے ہیں کہ حج اور عمرہ دو کی طرف سے نہیں بلکہ صرف ایک ہی شخص کی طرف سے ہو سکتا ہے۔ یعنی اپنے لیے یا صرف اپنے باپ یا ماں کے لیے اور یہ ممکن نہیں کہ آدمی دو کی طرف سے لبیک کہے اور اگر کسی نے ایسا کیا تو یہ دو کی طرف سے نہیں بلکہ خود اسی کی طرف سے ہو گا۔

میں یہ بھی کہوں گا کہ ہر انسان کو چاہیئے کہ وہ عمرہ' حج' صدقہ' نماز' تلاوت قرآن اور دیگر تمام اعمال صالحہ اپنی طرف سے ادا کرے کیونکہ ہر انسان ان اعمال صالحہ کا خود محتاج ہے۔ ایک دن آنے والا ہے کہ انسان ایک ایک نیکی کی تمنا کرے گا نبی کریم ﷺ نے امت کی یہ رہنمائی نہیں فرمائی کہ لوگ اپنے اعمال صالحہ کو اپنے باپ' ماں' یا کسی زندہ یا مردہ انسان کی طرف منسوب کر دیں' ہاں البتہ آپ نے یہ ضرور رہنمائی فرمائی ہے کہ فوت شدگان کے لیے دعا کی جائے' چنانچہ آپ کا ارشاد گرامی ہے:

«إِذَا مَاتَ الإِنْسَانُ انْقَطَعَ عَنْهُ عَمَلُهُ إِلاَّ مِنْ ثَلاَثَةٍ: إِلاَّ مِنْ صَدَقَةٍ جَارِيَةٍ، أَوْ عِلْمٍ يُنْتَفَعُ بِهِ أَوْ وَلَدٍ صَالِحٍ يَدْعُو لَهُ»(صحيح مسلم، الوصية، باب ما يلحق الإنسان من الثواب بعد وفاته، ح: ١٦٣١)

"جب انسان فوت ہو جاتا ہے تو اس کا عمل منقطع ہو جاتا ہے' ہاں البتہ تین طرح کا عمل باقی رہتا ہے (۱) صدقہ جاریہ (۲) علم جس سے نفع اٹھایا جا رہا ہوں اور (۳) نیک بچہ جو اس کے لیے دعا کرتا ہو۔"

نبی ﷺ کے ان الفاظ پر غور فرمائیے کہ "نیک بچہ جو اس کے لیے دعا کرتا ہو۔" آپ نے یہ نہیں فرمایا کہ نیک بچہ جو اس کے لیے قرآن پڑھتا ہو یا اس کے لیے دو رکعتیں پڑھتا ہو یا اس کی طرف سے حج اور عمرہ کرتا ہو یا اس کی طرف سے روزہ رکھتا ہو بلکہ آپ نے یہ فرمایا ہے کہ "نیک بچہ جو اس کے لیے دعا کرتا ہو۔" حالانکہ سیاق میں عمل صالح کا ذکر ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ افضل یہ ہے کہ انسان اپنے والدین کے لیے کوئی اور عمل صالح کرنے کی بجائے دعا کرے لیکن اگر کوئی شخص عمل صالح کر کے اسے اپنے والدین یا کسی ایک کی طرف منسوب کر دے تو اس میں کوئی حرج نہیں لیکن حج اور عمرہ میں بیک وقت دونوں کی طرف سے لبیک نہ کہے۔

——— شیخ ابن عثیمین ———

مواقیت

زمانی اور مکانی مواقیت

سوال حج و عمرہ کے حوالے سے زمانی اور مکانی مواقیت کیا ہیں؟

جواب حج کے لیے زمانی مواقیت تو ماہ شوال' ذوالقعدہ اور ذوالحجہ کے ابتدائی دس دن ہیں للذا حج کا احرام صرف انہی دنوں میں باندھا جا سکتا ہے' ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ اَلْحَجُّ اَشْهُرٌ مَّعْلُوْمٰتٌ فَمَنْ فَرَضَ فِيْهِنَّ الْحَجَّ فَلَا رَفَثَ وَلَا فُسُوْقَ وَلَا جِدَالَ فِي الْحَجِّ ﴾ (البقرۃ۲/ ۱۹۷)

"حج کے مہینے (معین ہیں جو) معلوم ہیں تو جو شخص ان مہینوں میں حج کی نیت کرے تو حج کے دنوں میں عورتوں سے اختلاط کرے نہ کوئی برا کام کرے اور نہ کسی سے جھگڑے۔"

عرفہ کے دن میدان عرفہ میں وقوف تک محرم رہنا ہو گا۔ عمرہ کے لیے کوئی وقت مخصوص نہیں ہے بلکہ اسے سارا سال ادا کرنا صحیح ہے۔ ہاں البتہ رمضان میں عمرہ ادا کرنا افضل ہے کیونکہ یہ حج کے برابر ہے۔

مکانی مواقیت حسب ذیل ہیں:

(ا) اہل مدینہ کے لیے ذوالحلیفہ ہے جو کہ مدینہ سے چھ میل کے فاصلہ پر ہے اور مکہ مکرمہ سے اونٹ کے سفر کے حساب سے سولہ مراحل پر ہے۔ عوام اس جگہ کو ابیار علی کے نام سے موسوم کرتے ہیں۔

(۲) جحفہ مکہ سے تین مراحل کے فاصلہ پر ہے اور آج کل یہ خراب ہو چکا ہے' اس لیے لوگ اس سے تھوڑا سا پہلے مقام رابغ سے احرام باندھ لیتے ہیں۔ یہ اہل شام' مصر اور مغرب کیلئے میقات ہے جب کہ وہ مدینہ کی طرف سے نہ گزریں۔

(۳) قرن المنازل' یہ مکہ سے دو مرحلوں کے فاصلہ پر ہے۔ آج کل یہ مقام "السیل الکبیر" کے نام سے معروف ہے اور مغربی جانب سے بالائی علاقہ وادی محرم کے نام سے مشہور ہے۔ یہ اہل نجد طائف اور اس راستہ سے گزرنے والے دیگر لوگوں کے لیے میقات ہے۔

(۴) یلملم' یہ بھی مکہ سے دو یا دو سے زیادہ مرحلوں پر ہے اور اب سعدیہ کے نام سے معروف ہے۔ اہل یمن اور اس راستہ سے گزرنے والے لوگ یہاں سے احرام باندھتے ہیں۔[1] جس کے راستہ میں میقات نہ ہو تو وہ اس کے قریب ترین مقام کے جب برابر ہو تو احرام باندھ لے خواہ وہ بری' بحری یا فضائی کسی بھی راستہ سے سفر کر رہا ہو۔ ہوائی جہاز کے مسافر کو بھی چاہیئے کہ وہ میقات کے برابر پہنچ کر احرام باندھ لے یا احتیاط کے طور پر پہلے ہی باندھ لے تاکہ وہ احرام باندھنے سے پہلے میقات سے نہ گزرے۔ اگر کسی نے میقات سے گزرنے کے بعد احرام باندھا ہو تو اس کوتاہی کے کفارہ کے لیے اس پر دم لازم ہو گا۔ واللہ اعلم۔

---

[1] اہل پاکستان کے لیے بھی یہی میقات ہے۔

——— شیخ ابن جبرین ———

میقات سے احرام باندھنا واجب ہے

سوال ماہ رجب ۱۴۰۵ھ میں میں نے عمرہ کی نیت کی اور میں میقات یلملم سے جو کہ اہل یمن کا میقات ہے' بغیر احرام کے گزر گیا اور جب میری ایک بھائی سے ملاقات ہوئی' اللہ تعالیٰ اسے جزائے خیر سے نوازے اس نے میری رہنمائی فرمائی کہ میرے لیے ضروری ہے کہ میں واپس جاؤں اور میقات سے احرام باندھ کر آؤں کیونکہ مکہ مکرمہ میں معمول کے کپڑوں میں داخل ہونا جائز نہیں ہے' چنانچہ میں تیس کلو میٹر کا فاصلہ طے کر کے واپس آیا اور میں نے میقات سے احرام باندھا۔ امید ہے رہنمائی فرمائیں گے کیا بغیر احرام کے مکہ مکرمہ میں داخل ہونے سے دم لازم ہو جاتا ہے؟ کیا اس جگہ سے احرام باندھنا بھی جائز تھا جہاں میری اس بھائی سے ملاقات ہوئی یا میرے لیے میقات پر واپس جانا ضروری تھا؟

جواب جو شخص حج یا عمرہ کے لیے مکہ مکرمہ جانا چاہے تو اس کے لیے واجب ہے کہ اس میقات سے احرام باندھے جس کے پاس سے وہ گزر رہا ہو۔ بغیر احرام کے میقات سے گزرنا جائز نہیں ہے کیونکہ نبی کریم ﷺ نے جب مواقیت کا تعین کیا تو فرمایا:

«هُنَّ لَهُنَّ، وَلِمَنْ أَتَى عَلَيْهِنَّ مِنْ غَيْرِ أَهْلِهِنَّ، مِمَّنْ أَرَادَ الْحَجَّ وَالْعُمْرَةَ، فَمَنْ كَانَ دُونَهُنَّ فَمِنْ أَهْلِهِ، حَتَّى أَهْلُ مَكَّةَ يُهِلُّونَ مِنْهَا» (صحيح البخاري، الحج، باب مهل اهل مكة للحج والعمرة، ح: ١٥٢٤ وصحيح مسلم، الحج، باب مواقيت الحج، ح: ١١٨١)

"یہ مواقیت ان علاقوں کے لوگوں کے لیے ہیں' نیز ان لوگوں کے لیے بھی جو ان کے باشندے تو نہ ہوں لیکن یہاں سے ان کا گزر ہو اور ان کا حج و عمرہ کا ارادہ ہو اور جو لوگ مواقیت کے اندر ہوں تو وہ اپنی اپنی جگہ سے احرام باندھ لیں حتیٰ کہ اہل مکہ' مکہ ہی سے احرام باندھیں۔"

لہٰذا یمن کا کوئی باشندہ جب یلملم کے راستہ سے گزرے تو اس پر واجب ہے کہ وہ یلملم سے احرام باندھے۔ اسی طرح اگر کوئی شخص مدینہ کی طرف سے آ رہا ہو تو اس پر واجب ہے کہ وہ مدینہ کے میقات سے احرام باندھے اور اگر کوئی شخص بغیر احرام میقات سے گزر جائے تو اس کے لیے یہ ضروری ہے کہ وہ واپس لوٹ کر میقات سے احرام باندھے لہٰذا جس شخص نے آپ کی رہنمائی کی کہ آپ واپس جائیں اور یلملم سے احرام باندھیں اس نے بہت اچھا کیا اور آپ نے بھی بہت اچھا کیا جو میقات پر واپس آ گئے اور وہاں سے احرام باندھا۔ والحمد للہ!

اگر آپ اسی جگہ سے احرام باندھتے' جہاں آپ کی رہنمائی کی گئی تھی تو پھر دم واجب ہوتا کیونکہ آپ نے میقات سے تجاوز کر لیا تھا حالانکہ آپ کا عمرے کا ارادہ تھا۔ دم اونٹ یا گائے کا ساتواں حصہ یا بھیڑ کا چھ ماہ کا بچہ یا وہ بکری ہے جو دوسرے سال میں داخل ہو چکی ہو کہ اسے مکہ میں ذبح کر کے حرم کے فقراء میں تقسیم کر دیا جائے تاکہ عمرہ کے لیے میقات سے بغیر احرام کے گزرنے کا کفارہ ادا ہو سکے۔ واللہ ولی التوفیق۔

——— شیخ ابن باز ———

مکہ میں رہنے والے کی عمرے کے لیے میقات

سوال مکہ میں رہنے والے کے لیے میقات عمرہ کون سی جگہ ہے؟

جواب مکہ میں رہنے والے کے لیے میقات عمرہ حِل (حرم سے باہر کی جگہ) ہے کیونکہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ حج قران کے بعد جب ایک مستقل عمرہ کرنے کی خواہش کا اظہار کیا تو آپ نے آپ کے بھائی عبدالرحمٰن رضی اللہ عنہ کو حکم دیا کہ وہ آپ کے ساتھ تنعیم تک جائیں اور وہاں سے عمرے کا احرام باندھ کر آئیں۔ مکہ سے قریب ترین مقام حل تنعیم ہی ہے' چنانچہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا رات کے وقت تنعیم گئی تھیں۔[1] اگر مکہ یا حرم کی کسی بھی جگہ سے احرام باندھنا جائز ہوتا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عبدالرحمٰن رضی اللہ عنہ کو یہ حکم نہ دیتے کہ وہ اپنی بہن حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے ساتھ تنعیم جائیں اور وہاں سے احرام باندھ کر آئیں۔ یہ رات کا وقت تھا' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سفر کا ارادہ فرما چکے تھے اور انتظار میں بہت دشواری بھی تھی لہٰذا اگر بطحاء مکہ میں اپنی رہائش ہی سے احرام باندھنا جائز ہوتا تو شریعت کے آسانی و سہولت کے اصول کے مطابق آپ اس کی اجازت دے دیتے کیونکہ آپ کو جب دو کاموں میں اختیار دیا جاتا تو آپ اس کا انتخاب فرماتے جس میں آسانی ہوتی بشرطیکہ وہ گناہ نہ ہوتا اور اگر وہ گناہ کا کام ہوتا تو آپ اس سے سب لوگوں سے زیادہ دور ہوتے تھے لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جب حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کو مکہ مکرمہ کے اندر احرام باندھنے کی اجازت نہ دی تو یہ اس بات کی دلیل ہے کہ مکہ عمرے کا احرام باندھنے والوں کے لیے میقات نہیں ہے اور اس نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اس حدیث کی تخصیص بھی کر دی جس میں یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اہل مدینہ کے لیے ذوالحلیفہ' اہل شام کے لیے جحفہ اور اہل یمن کے لیے یلملم کو میقات مقرر کیا اور فرمایا:

«هُنَّ لَهُنَّ، وَلِمَنْ أَتَى عَلَيْهِنَّ مِنْ غَيْرِ أَهْلِهِنَّ لِمَنْ كَانَ يُرِيدُ الْحَجَّ وَالْعُمْرَةَ، فَمَنْ كَانَ دُونَ ذٰلِكَ فَمِنْ حَيْثُ أَنْشَأَ حَتَّى أَهْلُ مَكَّةَ مِنْ مَكَّةَ»(صحيح البخاري، الحج، باب مهل أهل الشام، ح:١٥٢٦، وباب مهل أهل اليمن، ح:١٥٣٠ وصحيح مسلم، الحج، باب مواقيت الحج، ح:١١٨١)

"یہ ان علاقوں کے لوگوں کے لیے میقات ہیں اور ان کے لیے بھی جو یہاں سے گزریں اور یہاں کے باشندے نہ ہوں اور ان کا حج و عمرہ کا ارادہ ہو۔ جو لوگ میقات کے اندر ہوں تو وہ اپنی جگہ ہی سے احرام باندھیں حتیٰ کہ اہل مکہ' مکہ ہی سے (احرام باندھیں۔")"

——— فتویٰ کمیٹی ———

جو شخص حج اور عمرہ کی نیت کے بغیر مکہ جائے

سوال اس شخص کے بارے میں حکم شریعت کیا ہے جو ریاض سے مکہ مکرمہ جاتا ہے لیکن اس کا ارادہ حج و عمرہ کا نہیں ہے لیکن پھر مکہ میں پہنچ کر اس نے حج کا ارادہ کر لیا اور جدہ سے حج قران کا احرام باندھ لیا تو کیا جدہ سے یہ احرام باندھنا صحیح

[1] صحیح بخاری' باب کیف تھل الحائض والنفساء' حدیث: 1556 و صحیح مسلم' الحج' باب بیان وجوہ ..... الخ' حدیث: 1211-

ہے یا اس صورت میں اس پر دم واجب اور کسی معلوم میقات کے پاس جاکر احرام باندھنا ضروری ہے؟ فتویٰ دیجئے۔ اللہ تعالیٰ آپ کو اجروثواب سے نوازے گا۔

جواب جو شخص ریاض وغیرہ سے مکہ مکرمہ جائے اور اس کا ارادہ حج و عمرہ کا نہ ہو بلکہ اس کا کوئی اور مقصد مثلاً تجارت یا اعزہ و اقارب سے ملاقات وغیرہ ہو اور پھر مکہ مکرمہ پہنچ کر اس کا حج کرنے کا ارادہ ہو جائے تو وہ اسی جگہ سے احرام باندھ لے جہاں وہ موجود ہو۔ اگر اس وقت جدہ میں ہو تو جدہ سے احرام باندھ لے اور اگر مکہ میں ہو تو مکہ میں احرام باندھ لے۔ الغرض جس وقت وہ حج یا عمرہ کا ارادہ کرے تو اسی جگہ سے احرام باندھ لے جہاں اس نے یہ ارادہ کیا ہو جب کہ وہ میقات کے اندر ہو اور اس صورت میں اس میں کوئی حرج نہیں کیونکہ اس کے لیے میقات وہی جگہ ہے جہاں اس نے نیت کی کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے میقات کا تعین کرتے ہوئے فرمایا تھا:

«وَمَنْ كَانَ دُونَ ذٰلِكَ فَمُهَلُّهُ مِنْ حَيْثُ أَنْشَأَ حَتَّى أَهْلُ مَكَّةَ مِنْ مَّكَّةَ» (صحيح البخاري، الحج، باب مهل أهل اليمن، ح:١٥٣٠ وصحيح مسلم، الحج، باب مواقيت الحج، ح:١١٨١)

"جو شخص ان کے اندر ہو تو وہ وہاں سے احرام باندھے جہاں وہ موجود ہو حتیٰ کہ اہل مکہ' مکہ ہی سے (احرام باندھیں۔)"

فتویٰ کمیٹی

احرام کے بغیر میقات سے گزرنا

سوال جو شخص حج یا عمرہ یا کسی اور غرض سے مکہ مکرمہ جا رہا ہو اور وہ احرام کے بغیر میقات سے گزر جائے تو اس کے بارے میں کیا حکم ہے؟

جواب جو شخص حج اور عمرہ کے لیے بغیر احرام کے میقات سے گزر جائے تو اس کے لیے واجب ہے کہ وہ واپس لوٹ کر میقات سے حج و عمرہ کا احرام باندھے کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے اس کا حکم دیتے ہوئے فرمایا:

«يُهِلُّ أَهْلُ الْمَدِينَةِ مِنْ ذِي الْحُلَيْفَةِ، وَأَهْلُ الشَّامِ مِنَ الْجُحْفَةِ، وَأَهْلُ نَجْدٍ مِّنْ قَرْنٍ وَّيُهِلُّ أَهْلُ الْيَمَنِ مِنْ يَّلَمْلَمَ»(صحيح البخاري، الحج، باب ميقات أهل المدينة... الخ، ح:١٥٢٥ وصحيح مسلم، الحج، باب مواقيت الحج، ح:١١٨٢)

"اہل مدینہ ذوالحلیفہ سے' اہل شام جحفہ سے' اہل نجد قرن سے اور اہل یمن یلملم سے احرام باندھیں۔"

اسی طرح صحیح حدیث میں ہے' ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا کہ رسول اللہ ﷺ نے اہل مدینہ کے لیے ذوالحلیفہ' اہل شام کے لیے جحفہ' اہل نجد کے لیے قرن منازل اور اہل یمن کے لیے یلملم کا تعین کرتے ہوئے فرمایا:

«هُنَّ لَهُنَّ، وَلِمَنْ أَتٰى عَلَيْهِنَّ مِنْ غَيْرِ أَهْلِهِنَّ، مِمَّنْ أَرَادَ الْحَجَّ وَالْعُمْرَةَ»(صحيح البخاري، الحج، باب مهل أهل مكة للحج والعمرة، ح:١٥٢٤ وصحيح مسلم، الحج، باب مواقيت الحج، ح:١١٨١)

"یہ مواقیت ان علاقوں کے لوگوں کے لیے ہیں' نیز ان لوگوں کے لیے بھی جو ان کے باشندے تو نہ ہوں لیکن

وہ حج اور عمرہ کے ارادہ سے یہاں سے گزریں۔"

لہٰذا جس شخص کا حج یا عمرہ کا ارادہ ہو تو اس کے لیے یہ لازم ہے کہ اس میقات سے احرام باندھے جس سے وہ گزر رہا ہو۔ یعنی اگر وہ مدینے کے راستہ سے آ رہا ہے تو ذوالحلیفہ سے' شام یا مصر یا مغرب کے راستہ سے آ رہا ہے تو جحفہ سے جسے آج کل رابغ کہا جاتا ہے اور اگر یمن کے راستہ سے آ رہا ہے تو یلملم سے احرام باندھے اور اگر وہ نجد یا طائف کے راستہ سے آ رہا ہے تو وادی قرن سے جسے آج کل "سیل" یا بعض لوگ وادی محرم کے نام سے موسوم کرتے ہیں' حج یا عمرہ کا احرام باندھے طواف کرے' سعی کرے' بال کتروائے اور حلال ہو جائے اور پھر حج کے وقت میں حج کا احرام باندھے اور اگر حج کے مہینوں کے علاوہ دیگر مہینوں مثلاً رمضان یا شعبان میں یہاں سے گزرے تو صرف عمرہ کا احرام باندھے۔ یہی حکم شریعت ہے۔

جو شخص مکہ مکرمہ میں حج و عمرہ کی نیت سے نہیں بلکہ کسی اور ارادے سے مثلاً خرید و فروخت' رشتہ داروں یا دوست احباب کی ملاقات وغیرہ کے لیے آ رہا ہو تو صحیح قول کے مطابق اس کے لیے احرام ضروری نہیں بلکہ وہ بغیر احرام کے بھی مکہ میں داخل ہو سکتا ہے۔ علماء کا راجح قول یہی ہے لیکن افضل یہ ہے کہ وہ اس فرصت کو غنیمت جانتے ہوئے عمرہ کا احرام باندھ لے۔

——— شیخ ابن باز ———

جن کے لیے احرام کے بغیر میقات سے گزرنا جائز ہے

سوال کس کے لیے احرام کے بغیر میقات سے گزرنا جائز اور کس کے لیے ناجائز ہے؟ اور جو شخص احرام کے بغیر میقات سے گزر جائے تو اس کے لیے کیا لازم ہے؟

جواب حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی صحیح حدیث میں ہے: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اہل مدینہ کے لیے ذوالحلیفہ' اہل شام کے لیے جحفہ' اہل نجد کے لیے قرن المنازل اور اہل یمن کے لیے یلملم کو میقات مقرر کرتے ہوئے فرمایا:

«هُنَّ لَهُنَّ، وَلِمَنْ أَتَى عَلَيْهِنَّ مِنْ غَيْرِ أَهْلِهِنَّ، مِمَّنْ أَرَادَ الْحَجَّ وَالْعُمْرَةَ» (صحيح البخاري، الحج، باب مهل أهل مكة للحج والعمرة، ح:١٥٢٤ وصحيح مسلم، الحج، باب مواقيت الحج، ح:١١٨١)

"یہ ان علاقوں کے باشندوں کے لیے ہیں اور ان کے لیے بھی جو یہاں کے باشندے تو نہ ہوں لیکن یہاں سے حج اور عمرہ کے ارادہ سے گزریں۔"

یہ حدیث اس بات کی دلیل ہے کہ جو شخص حج یا عمرہ کی نیت سے مکہ مکرمہ جاتے ہوئے ان میں سے کسی ایک میقات کے پاس سے گزرے تو اس کے لیے احرام لازم ہے اور اگر اس کا ارادہ و نیت حج اور عمرہ کا نہ ہو بلکہ وہ کسی عزیز سے ملنے یا کسی اور خاص کام کے لیے مکہ جا رہا ہو تو اس کے لیے احرام کے بغیر میقات سے گزرنا جائز ہے۔ اسی طرح ایندھن اور ڈاک لانے لے جانے والوں اور گاڑیوں کے ڈرائیوروں وغیرہ کے لیے بھی یہاں سے بغیر احرام کے گزرنا جائز ہے لیکن اس شخص کے لیے ہرگز جائز نہیں جو حج یا عمرہ کے لیے مکہ مکرمہ جا رہا ہو۔ حج اور عمرہ کے لیے جانے والا اگر کوئی شخص احرام

کے بغیر میقات سے گزر جائے تو اس کے لیے لازم ہے کہ وہ واپس آئے اور میقات سے احرام باندھے۔ اگر کوئی شخص ہوائی جہاز سے سفر کے ذریعے جدہ اترے تو وہ گاڑی پر سفر کر کے اہل نجد کے میقات پر چلا جائے اور وہاں سے احرام باندھ کر آئے اور اگر اس کا حج و عمرہ کا ارادہ ہو اور وہ جدہ سے احرام باندھ لے تو اس صورت میں احرام کے بغیر میقات سے گزرنے سے کفارہ کے طور پر دم لازم ہو گا۔

——— شیخ ابن جبرین ———

بحری یا ہوائی سفر کی صورت میں احرام

سوال ہوائی راستہ سے حج اور عمرہ کے لیے آنے والا کس وقت احرام باندھے؟

جواب فضائی یا بحری راستے سے آنے والا بھی اسی وقت احرام باندھے جب وہ میقات کے قریب پہنچے جس طرح خشکی کے راستے سے آنے والا احرام باندھتا ہے۔ ہوائی جہاز' بحری جہاز یا کشتی کی تیز رفتاری کی وجہ سے احتیاط اس بات میں ہے کہ میقات سے کچھ پہلے ہی احرام باندھ لیا جائے۔

——— شیخ ابن جبرین ———

جدہ سے احرام باندھنا

سوال فقہی کونسل نے مکہ مکرمہ میں منعقد ہونے والے اجلاس میں اس موضوع کا جائزہ لیا کہ جدہ سے احرام باندھنے کے بارے میں کیا حکم ہے؟ نیز فضائی اور بحری راستے سے حج اور عمرہ کے لیے مکہ مکرمہ آنے والے بہت سے لوگ ان مواقیت سے جہالت کی وجہ سے گزر جاتے ہیں جن کا رسول اللہ ﷺ نے تعین کرتے ہوئے یہاں رہنے والوں اور حج و عمرہ کی غرض سے یہاں سے گزرنے والوں کے لیے واجب قرار دیا کہ وہ احرام کے بغیر یہاں سے نہ گزریں۔ ان کے بارے میں کیا حکم ہے؟ اس موضوع کے مطالعہ اور نصوص شرعیہ کے جائزہ کے بعد کونسل نے حسب ذیل قرار داد پاس کی:

اولاً : وہ مواقیت جن کو نبی کریم ﷺ نے مقرر کیا اور جن کے رہنے والوں یا وہاں سے حج اور عمرہ کے لیے گزرنے والوں کے لیے وہاں سے احرام باندھنا واجب قرار دیا وہ یہ ہیں (۱) ذوالحلیفہ' یہ اہل مدینہ اور یہاں سے گزرنے والے دیگر لوگوں کے لیے ہے۔ اسے آج کل ابیار علی کہا جاتا ہے۔ (۲) جحفہ' یہ اہل شام و مصر اور یہاں سے گزرنے والے دیگر لوگوں کے لیے ہے۔ اسے آج کل رابغ کہا جاتا ہے۔ (۳) قرن المنازل' یہ اہل نجد اور اس راستے سے گزرنے والے دیگر لوگوں کے لیے ہے' اسے آج کل وادی محرم کہا جاتا ہے نیز اسے "السیل" بھی کہا جاتا ہے۔ (۴) ذات عرق' یہ اہل عراق و خراسان اور اس راستہ سے گزرنے والے دیگر لوگوں کے لیے ہے۔ اسے آج کل ضریبہ کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے اور (۵) یلملم یہ یمن اور اس راستہ سے گزرنے والے دیگر لوگوں کے لیے ہے۔

کونسل نے یہ واجب قرار دیا ہے کہ جب بھی فضائی یا بحری راستہ سے جانے والے ان مواقیت خمسہ میں سے کسی ایک قریب ترین میقات کے پاس سے گزریں تو وہ احرام باندھ لیں۔ اگر صورتحال واضح نہ ہو اور کوئی ایسا آدمی بھی ہمراہ نہ ہو جو میقات کے بارے میں رہنمائی کر سکے تو پھر واجب یہ ہے کہ وہ احتیاطاً میقات سے اس قدر پہلے احرام باندھ لیں کہ ظن

غالب یہ ہو کہ ابھی وہ میقات کے برابر نہیں پہنچے کیونکہ احرام میقات سے پہلے بھی جائز مع الکراہت ہے لیکن جب مقصود یہ احتیاط ہو کہ احرام کے بغیر میقات سے تجاوز نہ ہو تو پھر کراہت زائل ہو جائے گی کیونکہ واجب ادا کرنے میں کوئی کراہت نہیں ہے' چنانچہ مذاہب اربعہ کے اہل علم کا یہی قول ہے اور انہوں نے اس سلسلہ میں رسول اللہ ﷺ کی احادیث صحیحہ سے استدلال کیا ہے۔ ان کا استدلال امیر المومنین حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ سے مروی اس ارشاد سے بھی ہے کہ جب اہل عراق نے آپ کی خدمت میں یہ عرض کیا کہ ہمارا میقات قرن ہمارے راستے سے دور ہٹا ہوا ہے؟" تو آپ نے فرمایا کہ راستہ میں یہ دیکھ لو کہ اس کے برابر کون سی جگہ ہے؟ اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں پر یہ واجب قرار دیا ہے کہ وہ اس سے جہاں تک ہو سکے ڈریں اور جو شخص اصل میقات کے پاس سے نہ گزرے تو مقدور بھر اس کی استطاعت میں یہی ہے کہ وہ اس جگہ سے احرام باندھے لے جو میقات کے برابر ہو' لہٰذا فضائی یا بحری راستے سے حج اور عمرہ کے لیے آنے والوں کے لیے یہ جائز نہیں کہ وہ احرام کو جدہ تک مؤخر کریں کیونکہ جدہ تو رسول اللہ ﷺ کا مقرر کردہ میقات نہیں ہے۔ اسی طرح جس شخص کے پاس احرام کی چادریں نہ ہوں تو اس کے لیے بھی جدہ تک احرام کو مؤخر کرنا جائز نہیں بلکہ اس کے لیے بھی واجب یہ ہے کہ وہ شلوار ہی میں احرام باندھ لے کیونکہ صحیح حدیث میں نبی ﷺ کا فرمان ہے:

«مَنْ لَّمْ يَجِدْ نَعْلَيْنِ فَلْيَلْبَسْ خُفَّيْنِ، وَمَنْ لَّمْ يَجِدْ إِزَارًا فَلْيَلْبَسْ سَرَاوِيلَ»(صحيح البخاري، جزاء الصيد، باب لبس الخفين ... الخ، ح:١٨٤١ وصحيح مسلم، الحج، باب ما يباح للمحرم بحج أو عمرة ... الخ، ح:١١٧٩)

"جس کے پاس جوتے نہ ہوں تو وہ موزے پہن لے' جن کے پاس چادر نہ ہو تو وہ شلوار پہن لے۔"

اور سر کو ننگا رکھے کیونکہ نبی کریم ﷺ سے جب یہ پوچھا گیا کہ محرم کیا پہنے؟ تو آپ نے فرمایا:

«لاَ يَلْبَسُ الْقُمُصَ، وَلاَ الْعَمَائِمَ، وَلاَ السَّرَاوِيلاَتِ، وَلاَ الْبَرَانِسَ، وَلاَ الْخِفَافَ إِلاَّ أَحَدٌ لاَ يَجِدُ نَعْلَيْنِ فَلْيَلْبَسْ خُفَّيْنِ» (صحيح البخاري، الحج، باب ما لا يلبس المحرم... الخ، ح:١٥٤٢ وصحيح مسلم، الحج، باب ما يباح للمحرم بحج أو عمرة ... الخ، ح:١١٧٧)

"وہ قمیصیں' عمامے' شلواریں' ٹوپیاں اور موزے نہ پہنے' ہاں جس کے پاس جوتے نہ ہوں تو وہ موزے پہن لے۔"

یہ جائز نہیں کہ محرم کے سر پر عمامہ یا ٹوپی یا کوئی ایسی چیز ہو جس کو سر پر پہنا جاتا ہو' ہاں البتہ اگر عمامہ ایسا ہو کہ اس سے جسم چھپ سکتا ہو تو اسے چادر کے طور پر استعمال کیا جا سکتا ہے لیکن شلوار پہننا جائز نہیں لہٰذا شلوار کے بجائے چادر استعمال کی جائے۔ اگر آدمی نے شلوار نہ پہنی ہو اور اس کے پاس ایسا عمامہ بھی نہ ہو جس کو چادر کے طور پر استعمال کیا جائے تو اس کے لیے یہ جائز ہے کہ وہ جب ہوائی جہاز' بحری جہاز یا کشتی میں میقات کے برابر پہنچے تو اپنی قمیص ہی میں' جسے اس نے پہنا ہوا ہے' محرم بن جائے اور اپنے سر کو ننگا کر لے۔ جدہ پہنچ کر چادر خرید لے' قمیص اتار دے اور بحالت احرام قمیص پہننے کی وجہ سے کفارہ ادا کرے۔ اس کا کفارہ یہ ہے کہ چھ مسکینوں کو نصف صاع فی مسکین کے حساب سے کھجور' چاول یا کسی دوسری غذائی جنس سے جو شہر کی خوراک ہو' دے دے یا تین روزے رکھے یا ایک بکری ذبح کر دے' اسے اختیار ہے کہ ان تینوں باتوں میں سے جس پر چاہے عمل کرے جیسا کہ نبی ﷺ نے کعب بن عجرہ کو ان تین باتوں میں سے

ایک کا اس وقت اختیار دے دیا تھا[1] جب حالت احرام میں بیماری کی وجہ سے انہیں سر کے بال منڈوانے کی آپ نے اجازت دی تھی۔

ثانیاً: فقہی کونسل رابطہ عالم اسلامی کے سیکرٹریٹ سے یہ درخواست کرتی ہے کہ وہ ہوائی اور بحری کمپنیوں کو یہ خط لکھے کہ وہ میقات کے قریب آنے سے پہلے مسافروں کو خبردار کریں کہ میقات آنے والا ہے لہٰذا وہ احرام باندھنے کی تیاری کر لیں اور انہیں اس قدر پہلے بتا دیا جائے کہ ان کے لیے احرام باندھنا ممکن ہو۔

ثالثاً: اسلامی فقہی کونسل کے رکن جناب شیخ مصطفیٰ احمد زرقاء اور جناب شیخ ابوبکر محمود جومی نے صرف جدہ کی طرف آنے والے (سعودی) باشندوں کے بارے میں اختلاف کیا ہے۔ وصلی اللّٰہ وسلم علی نبینا محمد وآلہ وصحبہ وسلم۔

جدہ میقات نہیں ہے

سوال ہوائی راستے سے حج کے لیے آنے والوں کو بعض لوگ یہ فتویٰ دیتے ہیں کہ وہ جدہ سے احرام باندھ لیں جبکہ بعض لوگ اس کی مخالفت کرتے ہیں' تو سوال یہ ہے کہ اس مسئلہ میں صحیح صورت حال کیا ہے؟ فتویٰ دیجئے' اللہ تعالیٰ آپ کو اجروثواب سے نوازے؟

جواب تمام حاجیوں کے لیے یہ واجب ہے خواہ وہ فضائی' بحری یا بری کسی بھی راستے سے آ رہے ہوں کہ وہ اپنے اپنے میقات سے احرام باندھیں کیونکہ نبی کریم ﷺ نے مواقیت کا تعین کرتے ہوئے فرمایا تھا:

«هُنَّ لَهُنَّ، وَلِمَنْ أَتٰى عَلَيْهِنَّ مِنْ غَيْرِ أَهْلِهِنَّ، مِمَّنْ أَرَادَ الْحَجَّ وَالْعُمْرَةَ» (صحيح البخاري، الحج، باب مهل أهل مكة للحج والعمرة، ح:١٥٢٤ وصحيح مسلم، الحج، باب مواقيت الحج، ح:١١٨١)

"یہ اپنے اپنے علاقے کے لوگوں کے لیے ہیں اور دوسرے علاقوں کے ان لوگوں کے لیے بھی جو حج اور عمرہ کے ارادہ سے یہاں سے گزریں۔"

—— شیخ ابن باز ——

احرام کو جدہ تک مؤخر کرنا

سوال ایک آدمی کا حج یا عمرے کا ارادہ ہے اور اس نے ہوائی جہاز ہی میں احرام پہن لیا لیکن اس کے باوجود اسے میقات کا علم نہیں ہے تو کیا اس کے لیے احرام کو جدہ تک مؤخر کرنا جائز ہے؟

جواب جس شخص کا فضائی راستے سے حج یا عمرے کا ارادہ ہو تو اسے چاہیئے کہ وہ اپنے گھر ہی میں غسل کرے اور اگر چاہے تو احرام کی دونوں چادریں بھی پہن لے اور جب میقات قریب آنے والا ہو تو حج یا عمرے کا احرام باندھ لے اور اس میں کوئی مشقت بھی نہیں ہے۔

---

[1] صحیح بخاری' المحصر' باب قول اللہ تعالیٰ ﴿ فمن کان منکم مریضا ..... ﴾ حدیث: 1814 و صحیح مسلم' الحج' باب جواز حلق الرأس للمحرم ..... الخ' حدیث: 1201۔

اگر اسے میقات کا علم نہ ہو تو وہ ہوائی جہاز یا بحری جہاز کے کپتان یا کسی باخبر اور قابل اعتماد مسافر سے پوچھ لے۔ وباللہ التوفیق' وصلی اللّٰہ وسلم علیٰ نبینا محمد وعلیٰ آلہ و صحبہ

—— فتویٰ کمیٹی ——

ہوائی جہاز کے ذریعے آنے والے کا جدہ سے احرام

سوال جو شخص کسی ملک سے ہوائی جہاز کے ذریعہ سفر کر کے آئے' جدہ ائیرپورٹ پر اترے' اس نے احرام نہ باندھا ہو اور وہ جدہ سے احرام باندھ لے تو اس کے بارے میں کیا حکم ہے؟

جواب جب کوئی شخص ہوائی جہاز سے اترے اور وہ اہل شام یا مصر میں سے ہو تو اسے رابغ سے احرام باندھنا چاہیئے۔ وہ گاڑی وغیرہ کے ذریعے رابغ چلا جائے اور وہاں سے احرام باندھے۔ جدہ سے احرام نہ باندھے' اگر نجد کی طرف سے آنے والے نے احرام نہ باندھا ہو تو وہ "سیل" یعنی وادی قرن سے جا کر احرام باندھے اور اگر وہ میقات پر نہ جائے اور جدہ ہی سے احرام باندھ لے تو اسے ایک ایسی بکری ذبح کرنا ہوگی جس کی قربانی کرنا جائز ہو۔ اسے ذبح کر کے مکہ کے فقراء میں تقسیم کر دے یا اونٹ اور گائے کا ساتواں حصہ تقسیم کر دے تا کہ حج اور عمرہ کی اس کمی کی تلافی ہو سکے۔ وباللہ التوفیق۔

—— شیخ ابن باز ——

کام کے لیے طائف اور جدہ کے درمیان بغیر احرام کے آنا جانا

سوال ایک ملازم کا حج کا ارادہ ہے لیکن کام کی وجہ سے اسے طائف اور جدہ کے درمیان بار بار احرام کے بغیر آنا جانا پڑتا ہے تو اس کے بارے میں کیا حکم ہے؟

جواب اس میں کوئی حرج نہیں کیونکہ طائف اور جدہ کے درمیان بار بار آنے جانے کے وقت اس کا حج یا عمرے کا قصد نہیں بلکہ اپنی دیگر ضرورتوں کی تکمیل مقصود ہے لیکن طائف سے آخری بار واپس لوٹتے وقت جب اسے یہ معلوم ہو کہ وہ حج سے پہلے واپس نہیں آئے گا تو اسے چاہیئے کہ میقات سے عمرہ یا حج کا احرام باندھ لے اور اگر اسے یہ معلوم نہ ہو اور حج کا وقت اسے جدہ میں آ جائے تو وہ جدہ ہی سے حج کا احرام باندھ لے۔ اس صورت میں بھی اس پر کوئی کفارہ وغیرہ نہیں ہے کیونکہ اس کا حکم جدہ میں مقیم ان لوگوں کا ہو گا جو اپنے بعض کاموں کے لیے جدہ آئے ہوں اور میقات سے گزرتے وقت ان کا حج یا عمرہ کا ارادہ نہ ہو۔

—— شیخ ابن باز ——

اہل طائف کے لیے جدہ شہر سے احرام باندھنا

سوال اس شخص کے بارے میں کیا حکم ہے جو طائف سے آکر وقت حج تک جدہ میں مقیم ہو گیا ہو' مقیم ہوتے وقت ہی اس کی نیت اس سال حج کرنے کی ہو' وہ حج کے مہینوں میں یہاں آیا ہو اور پھر اس نے جدہ ہی سے حج یا عمرہ کا احرام باندھ لیا ہو؟

جواب ادلہ شرعیہ سے بظاہر یوں معلوم ہوتا ہے کہ اسے واپس جا کر طائف کے میقات سے احرام باندھنا چاہیئے کیونکہ اس کی حج کی نیت تھی اور یہ احرام کے بغیر میقات سے گزرا ہے اور جو شخص میقات پر احرام نہ باندھ سکے اسے چاہیئے کہ جدہ میں احرام باندھ لے اور مکہ میں ایک دم ذبح کر کے فقراء میں تقسیم کر دے اور اگر میقات سے گزرتے وقت حج یا عمرہ کی نیت نہ تھی تو پھر جدہ سے حج یا عمرہ کا احرام باندھنے میں کوئی حرج نہیں کیونکہ نبی کریم ﷺ نے مواقیت کا تعین کرتے ہوئے فرمایا تھا:

«هُنَّ لَهُنَّ، وَلِمَنْ أَتَى عَلَيْهِنَّ مِنْ غَيْرِ أَهْلِهِنَّ، مِمَّنْ أَرَادَ الْحَجَّ وَالْعُمْرَةَ، فَمَنْ كَانَ دُونَهُنَّ فَمِنْ أَهْلِهِ حَتَّى أَهْلُ مَكَّةَ يُهِلُّونَ مِنْهَا» (صحيح بخاري، الحج، باب مهل أهل مكة للحج والعمرة، ح:١٥٢٤ وصحيح مسلم، الحج، باب مواقيت الحج، ح:١١٨١)

"یہ اپنے علاقوں کے لوگوں کے لیے ہیں نیز ان دوسرے علاقوں کے لوگوں کے لیے بھی جن کا یہاں سے حج یا عمرہ کے لیے گزر ہو اور جو شخص میقات کے اندر ہو تو وہ اپنی جگہ ہی سے احرام باندھ لے حتیٰ کہ اہل مکہ، مکہ ہی سے احرام باندھ لیں۔"

——— شیخ ابن باز ———

مدینہ سے آنے والے نے جدہ سے احرام باندھا

سوال میں ایک طالب علم ہوں۔ مدینہ میں پڑھتا ہوں۔ میں نے عمرے کا ارادہ کیا تو مجھے براہ راست مکہ پہنچانے والی گاڑی نہ ملی، لہٰذا میں پہلے جدہ چلا گیا اور وہاں سے احرام باندھ لیا۔ اس صورت میں مجھ پر کیا واجب ہے؟ کیا میرا جدہ سے احرام باندھنا صحیح ہے؟

جواب اگر واقعہ اسی طرح ہے جس طرح آپ نے ذکر کیا ہے کہ آپ نے عمرے کا ارادہ کیا جب کہ آپ مدینہ میں تھے لیکن آپ نے احرام جدہ جا کر باندھا تو یہ آپ کی غلطی ہے کہ آپ اہل مدینہ کے میقات سے احرام کے بغیر گزر گئے۔ اس غلطی کی وجہ سے اللہ تعالیٰ سے معافی مانگئے اور آئندہ ایسی غلطی نہ کیجئے اور احرام کے بغیر میقات سے گزرنے کی اس غلطی کا کفارہ یہ ہے کہ مکہ مکرمہ میں کسی بھی وقت ایک ایسی بکری ذبح کر دی جائے جس کی قربانی جائز ہو اور اسے حرم کے فقراء میں تقسیم کر دیا جائے اور اس میں سے خود کچھ نہ کھائیں۔ وباللہ التوفیق۔ وصلی اللہ علی محمد وآلہ وصحبہ وسلم۔

——— فتویٰ کمیٹی ———

عبادات حج

تلبیہ بھول جانے والے کے متعلق حکم؟

سوال ایک حاجی نے میقات سے احرام باندھا لیکن تلبیہ میں وہ یہ کہنا بھول گیا لبیک عمرۃ متمتعا بھا الی الحج تو کیا اس کا حج تمتع ہو جائے گا؟ اور اگر وہ عمرہ سے حلال ہو کر پھر مکہ سے حج کا احرام باندھے تو اس صورت میں اس کے لیے کیا لازم ہو گا؟

جواب اگر احرام کے وقت عمرہ کی نیت تھی اور وہ تلبیہ بھول گیا تو اس کا حکم ایسے ہی ہے جیسے اس نے تلبیہ کہا ہو، لہٰذا اسے چاہیئے کہ وہ طواف کرے، سعی کرے، بال کتروائے اور حلال ہو جائے۔ راستے میں تلبیہ کہنا بھی مشروع ہے اور اگر

تلبیہ نہ بھی کہے تو اس کا کوئی کفارہ نہیں کیونکہ تلبیہ واجب نہیں بلکہ سنت مؤکدہ ہے۔ لہٰذا وہ طواف کرے' سعی کرے بال کتروائے اور اسے عمرہ بنادے کیونکہ اس کی نیت عمرہ ہی کی تھی اور اگر احرام کے وقت اس کی نیت حج کی تھی اور اب وقت کافی ہو تو پھر بھی افضل یہ ہے کہ حج کو فسخ کر کے اسے عمرہ بنادے۔ یعنی طواف و سعی کرے اور بال کتروا کر حلال ہو جائے۔ بحمد اللہ اس صورت میں اس کا حکم حج تمتع کرنے والوں کا ہو گا۔

——— شیخ ابن باز ———

رمضان میں عمرہ اور اسی سال حج ....

سوال فضیلۃ الشیخ! اس شخص کے بارے میں آپ کیا فرماتے ہیں جو رمضان المبارک میں عمرہ ادا کرے اور پھر اسی سال اس کا حج کا بھی ارادہ ہو تو کیا اس کے لیے فدیہ لازم ہے؟ نیز یہ فرمائیں کہ حج کی کون سی قسم افضل ہے؟

جواب جس شخص نے رمضان میں عمرہ کیا اور پھر اسی سال حج مفرد کا احرام باندھ لیا تو اس پر کوئی فدیہ نہیں کیونکہ فدیہ تو اس شخص کے لیے لازم ہے جو حج کے وقت تک عمرہ سے فائدہ اٹھائے جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ فَمَن تَمَتَّعَ بِٱلْعُمْرَةِ إِلَى ٱلْحَجِّ فَمَا ٱسْتَيْسَرَ مِنَ ٱلْهَدْيِ ﴾ (البقرۃ۲/ ۱۹۶)

"تو جو (تم میں سے) حج کے وقت تک عمرے سے فائدہ اٹھانا چاہے تو وہ جیسی قربانی میسر ہو کرے۔"

اور جو شخص رمضان میں عمرہ کرے اور پھر حج کے مہینوں میں احرام باندھ لے تو اسے متمتع (فائدہ اٹھانے والا) نہیں کہتے بلکہ متمتع تو وہ شخص ہوتا ہے جو حج کے مہینوں یعنی شوال' ذوالقعدہ اور ذوالحجہ کے ابتدائی عشرہ میں عمرہ کا احرام باندھے اور پھر اسی سال حج بھی کرے یا حج اور عمرہ کو ملا دے تو اسے متمتع کہتے ہیں اور اس پر فدیہ لازم ہے۔ حج کا ارادہ کرنے والے کے لیے افضل یہ ہے کہ وہ حج کے ساتھ عمرہ کرے یعنی طواف اور سعی کر کے بال کتروا دے اور حلال ہو جائے اور پھر اسی سال حج کا احرام باندھے۔ اور افضل یہ ہے کہ حج کا احرام آٹھ ذوالحج کو باندھے جیسا کہ نبی کریم ﷺ نے صحابہ کرام کو حجۃ الوداع کے موقع پر اس کا حکم دیا تھا۔[1]

حج تمتع کرنے والے کے لیے لازم ہے کہ وہ حج کے لیے بھی اسی طرح طواف اور سعی کرے جس طرح اس نے عمرہ کے لیے طواف و سعی کیا تھا' اکثر اہل علم کے نزدیک عمرہ کی سعی حج کی سعی سے کفایت نہیں کرے گی اور رسول اللہ ﷺ کی صحیح احادیث کی دلالت سے یہی بات درست ہے۔

——— شیخ ابن باز ———

حج کے مہینوں سے پہلے عمرہ کرنے والا متمتع نہیں ہے

سوال جب کوئی مسلمان حج کے مہینوں سے پہلے حج کی نیت سے مکہ میں آ جائے اور عمرہ کر کے حج تک مکہ ہی میں رہے اور حج کرے تو کیا اس کا یہ حج تمتع ہو گا یا افراد؟

جواب اس کا یہ حج مفرد ہو گا کیونکہ حج تمتع تو یہ ہے کہ حج کے مہینوں میں عمرہ کا احرام باندھا جائے اور اس سے فراغت

[1] صحیح مسلم' باب حجۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم' حدیث: 1218-

کے بعد پھر اسی سال حج کا احرام باندھ لیا جائے۔ اور اگر کوئی شخص حج اور عمرہ دونوں کا اکٹھا احرام باندھ لے تو اسے حج قران کہتے ہیں۔ حج تمتع تو اس شخص کے ساتھ مخصوص ہے جو حج کے مہینوں میں عمرہ کا احرام باندھے کیونکہ جب حج کے مہینے شروع ہو جائیں تو پھر عمرہ کے بجائے احرام حج ہی کے لیے مخصوص ہوتا ہے لیکن اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں سے تخفیف کر دی اور اس بات کی نہ صرف اجازت دی بلکہ اسے پسند بھی فرمایا کہ حاجی پہلے عمرے کا احرام باندھیں اور حج تک فائدہ اٹھا لیں یعنی وہ کام کر سکیں جو احرام کی وجہ سے حرام ہو گئے تھے۔

—— شیخ ابن عثیمین ——

جس شخص نے شوال میں عمرہ کیا' گھر لوٹ آیا ....

سوال میں نے ماہ شوال کے آخر میں عمرہ ادا کیا اور پھر اس نیت سے گھر واپس لوٹ آیا کہ حج مفرد کروں گا۔ امید ہے رہنمائی فرمائیں گے۔ کیا اس طرح میرا شمار حج تمتع کرنے والوں میں ہو گا اور مجھ پر ہدی لازم ہو گی یا نہیں؟

جواب جب کوئی انسان شوال یا ذوالقعدہ میں عمرہ ادا کر کے اپنے گھر واپس لوٹ جائے اور پھر حج مفرد کرے تو جمہور کا مذہب یہ ہے کہ تمتع نہیں ہے اور نہ اس پر ہدی لازم ہے کیونکہ یہ تو اپنے اہل خانہ کے پاس واپس لوٹ گیا تھا اور اب اس نے حج مفرد کیا ہے۔ حضرت عمر اور ابن عمر رضی اللہ عنہما سے اسی طرح مروی ہے۔ جمہور کا بھی یہی قول ہے' جب کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ اس صورت میں بھی انسان متمتع ہو گا اور اس پر ہدی واجب ہو گی کیونکہ اس نے ایک ہی سال کے حج کے مہینوں میں حج اور عمرہ کو جمع کیا ہے۔ جمہور کہتے ہیں کہ جب کوئی شخص اپنے گھر واپس لوٹ آئے اور بعض کے بقول مسافت قصر کے بقدر سفر کر لے اور پھر حج مفرد کرے تو وہ تمتع نہیں ہے۔ بظاہر یوں معلوم ہوتا ہے کہ اس مسئلہ میں حضرت عمر اور ابن عمر رضی اللہ عنہما کا قول راجح ہے۔ واللہ اعلم۔ کہ جب وہ اپنے گھر واپس لوٹ آئے تو وہ متمتع نہیں ہے ہاں البتہ جو شخص حج کے لیے آئے اور عمرہ ادا کر کے جدہ یا طائف میں رہے اور پھر حج کا احرام باندھ لے تو یہ شخص بلاشبہ متمتع ہی ہو گا۔ طائف' جدہ یا مدینہ جانے سے اس کا تمتع ختم نہیں ہو گا کیونکہ یہ حج اور عمرہ دونوں کی ادائیگی کے لیے آیا ہے اور اس نے جدہ یا طائف کی طرف سفر ضرورت کی وجہ سے کیا ہے یا مدینہ کا سفر زیارت کی وجہ سے کیا ہے تو ظاہر اور راجح بات یہ ہے کہ یہ سفر اس کے تمتع کے خلاف نہیں ہے۔ لہٰذا اسے حج تمتع کی ہدی کرنا ہو گی۔ نیز اسے حج کے لیے بھی اسی طرح سعی کرنا ہو گی جس طرح اس نے عمرہ کے لیے سعی کی تھی۔

—— فتویٰ کمیٹی ——

راجح بات یہ ہے کہ اس پر ہدی تمتع لازم ہے

سوال میں ۱۴۰۳ھ میں ریاض میں مقیم تھا۔ ماہ شوال میں جدہ چلا گیا اور وہاں سے میں عمرہ ادا کرنے کے لیے چلا گیا اور عمرہ کر کے پھر واپس لوٹ آیا اور اس سال کے موسم حج تک میں وہاں ہی رہا' پھر حج کے لیے چلا گیا اور پھر حج اور عمرہ کے بعد ریاض واپس لوٹ آیا۔ اب اس سال مجھے ایک بھائی نے بتایا کہ میرا یہ حج اور عمرہ قران تھا لہٰذا میرے لیے جانور ذبح کرنا ضروری ہے۔ کیا یہ بات صحیح ہے' ہمیں فتویٰ عطا فرمائیے۔ جزاکم اللہ خیرًا

جواب بہت سے اہل علم کے بقول حج تمتع کرنے والا جب جدہ یا مدینہ یا طائف کے درمیان سفر کرے' پھر جدہ سے حج کا

احرام باندھ لے اور اگر مدینہ کی طرف سفر کیا ہو تو میقات مدینہ سے احرام باندھ لے اور اگر طائف کی طرف سفر کیا تو میقات طائف سے احرام باندھ لے تو اس سے حج تمتع کا دم ساقط ہو جاتا ہے۔ بعض دیگر اہل علم کے بقول اس صورت میں دم ساقط نہیں ہوتا اور اس سفر سے تمتع کا وصف زائل نہیں ہوتا۔ لہٰذا اسے تمتع کا دم دینا ہو گا اور حسب ذیل ارشاد باری تعالیٰ:

﴿ فَمَن تَمَتَّعَ بِٱلْعُمْرَةِ إِلَى ٱلْحَجِّ فَمَا ٱسْتَيْسَرَ مِنَ ٱلْهَدْيِ ﴾ (البقرۃ۲/ ۱۹۶)

"تو جو (تم میں سے) حج کے وقت تک عمرے سے فائدہ اٹھانا چاہے تو وہ جیسی قربانی میسر ہو کرے۔"

کے عموم کے پیش نظر یہی قول راجح ہے۔ اس سلسلہ میں وارد احادیث کے عموم کے پیش نظر بھی یہی قول راجح معلوم ہوتا ہے۔ وباللہ التوفیق۔

—— شیخ ابن باز ——

جدہ کی طرف سفر سے تمتع ختم نہیں ہوتا

سوال میں نے عمرے کا احرام باندھا اور میرا ارادہ حج تمتع کا تھا پھر عمرہ کے بعد میں جدہ چلا گیا اور اب واپس آکر جب حج کروں گا تو کیا میرا یہ حج تمتع شمار ہو گا؟

جواب صحیح بات یہ ہے کہ اس سے تمتع ختم نہیں ہوتا۔ جب کوئی شخص مکہ میں رمضان کے بعد تمتع کی نیت سے آئے' اس نے عمرے کا احرام باندھا ہو اور اس کا ارادہ حج کرنے کا ہو پھر عمرہ سے فراغت کے بعد وہ کسی ضرورت سے طائف یا جدہ چلا جائے تو صحیح بات یہ ہے کہ اس حالت میں اس کا تمتع برقرار رہتا ہے۔

بعض اہل علم کا قول ہے کہ جب آدمی مسافت قصر کے بقدر مکہ سے باہر چلا جائے اور پھر حج کا احرام باندھ کر واپس آ جائے تو اس سے اس کا تمتع ختم ہو جائے گا اور اس کا حج مفرد ہو گا' لیکن زیادہ صحیح اور ظاہر بات یہ معلوم ہوتی ہے کہ حج اور عمرہ کے مابین ان تصرفات سے اس کا حج مفرد نہیں ہو گا' بلکہ تمتع ہی ہو گا الا یہ کہ وہ اپنے وطن واپس لوٹ آئے اور پھر حج مفرد کے لیے جائے تو اس صورت میں اس کا حج مفرد ہو گا اور اس پر دم بھی لازم نہ ہو گا۔ یہ بعض اہل علم کا قول ہے۔ حضرت عمر اور عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے بھی یہی مروی ہے۔ وباللہ التوفیق۔

—— شیخ ابن باز ——

گروپ کے ساتھ حج مفرد کا احرام باندھنا.......

سوال میں گروپ کے ساتھ حج کے لیے آیا تھا' حج مفرد کا احرام باندھا تھا اور اب میرا گروپ مدینہ جانا چاہتا ہے تو کیا میرے لیے یہ جائز ہے کہ گروپ کے ساتھ مدینہ چلا جاؤں اور پھر تھوڑے دنوں بعد عمرہ ادا کرنے کے لیے مکہ واپس آجاؤں؟

جواب جب کوئی شخص گروپ کے ساتھ حج کرے' اس نے حج مفرد کا احرام باندھا ہو اور پھر گروپ کے ساتھ ہی وہ زیارت کے لیے (مدینہ) چلا جائے تو اس کے لیے حکم شریعت یہ ہے کہ وہ اپنے احرام کو عمرہ کے لیے خاص کر دے اور عمرہ

کا طواف وسعی کرے اور پھر بال کٹوا کر حلال ہو جائے اور پھر حج کے وقت میں حج کے لیے احرام باندھے تو اس طرح وہ متمتع ہو جائے گا اور تمتع کی ہدی (قربانی) اس پر لازم ہو گی جیسا کہ نبی کریم ﷺ نے ان صحابہ کرام ؓ کو یہی حکم دیا تھا جن کے ساتھ ہدی نہ تھی۔ [1]

شیخ ابن باز

متمتع جب اپنے وطن واپس لوٹ آئے ....

سوال میں نے سنا ہے کہ متمتع جب اپنے وطن واپس لوٹ آئے تو اس کا تمتع منقطع ہو جاتا ہے تو کیا یہ جائز ہے کہ وہ حج مفرد کرے اور اس پر دم نہ ہو؟

جواب ہاں حج تمتع کرنے والا جب اپنے وطن واپس لوٹ آئے اور پھر اپنے ملک سے حج کے لیے سفر کرے تو وہ مفرد ہے کیونکہ اس نے وطن واپس لوٹ کر عمرہ و حج کو منقطع کر دیا' تو دوبارہ سفر شروع کرنے کا معنی یہ ہے کہ اس نے حج کے لیے یہ نیا سفر کیا ہے لہٰذا اس کا یہ حج مفرد ہو گا اور اس صورت میں اس پر حج تمتع کی ہدی واجب نہ ہو گی لیکن اگر کسی نے ہدی کو ساقط کرنے کے لیے حیلہ سازی سے ایسا کیا تو اس سے ہدی ساقط نہ ہو گی کیونکہ حیلہ سازی سے واجب ساقط نہیں ہوتا جیسا کہ حیلہ سازی سے محرم حلال نہیں ہوتا۔

شیخ ابن عثیمین

حج تمتع میں عمرہ ادا کرنے کے بعد ....

سوال میں حج تمتع کی نیت سے گیا تھا' عمرہ ادا کرنے کے بعد میں تین ذوالحج کو منیٰ چلا گیا اور جب میں عمرہ سے حلال ہوا تو میں نے گھٹنے میں اس قدر درد محسوس کیا جس نے مجھے چلنے پھرنے سے عاجز کر دیا۔ میں نے ڈاکٹر سے رجوع کیا تو اس نے مجھے مشورہ دیا کہ میں حج نہ کروں' لہٰذا میں مدینہ واپس لوٹ آیا' جہاں میں مقیم ہوں اور میں نے حج نہیں کیا۔ یاد رہے کہ عمرہ کی نیت کرتے ہوئے میں نے یہ الفاظ نہیں کہے تھے کہ "اگر مجھے کسی مجبوری نے روک دیا تو میں وہاں حلال ہو جاؤں گا' جہاں مجھے رک جانا پڑا۔" اس صورت حال میں اب آپ سے سوال یہ ہے کہ کیا مجھ پر دم لازم ہے یا نہیں؟

جواب اگر امر واقع اسی طرح ہے جس طرح آپ نے ذکر کیا ہے کہ آپ نے عمرہ سے حلال ہو کر حج کا ارادہ موقوف کر دیا اور حج کا احرام باندھنے سے پہلے اپنے شہر واپس لوٹ آئے تو اس صورت میں کوئی دم وغیرہ لازم نہیں ہے کیونکہ عمرہ تو ادا کرنے اور اس سے حلال ہونے سے مکمل ہو گیا اور حج کا تو آپ نے ابھی احرام ہی نہیں باندھا تھا۔

فتویٰ کمیٹی

وقت تمتع اور یوم ترویہ (آٹھ ذوالحج) سے پہلے حج کا احرام باندھنا

سوال کیا تمتع کرنے والے کے لیے تمتع کا کوئی وقت محدود ہے؟ اور کیا وہ یوم ترویہ سے پہلے بھی حج کا احرام باندھ

[1] صحیح مسلم' الحج' باب حجۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم' حدیث: 1218

سکتا ہے؟

جواب ہاں تمتع کے لیے احرام باندھنے کا وقت محدود ہے اور وہ ہے شوال' ذوالقعدہ اور ذوالحجہ کے ابتدائی دس دن۔ یہ حج کے مہینے ہیں۔ کوئی شخص شوال سے پہلے اور عید کی رات کے بعد تمتع کا احرام نہیں باندھ سکتا لیکن افضل یہ ہے کہ پہلے صرف عمرہ کا احرام باندھا جائے اور عمرہ سے فراغت کے بعد صرف حج کا احرام باندھا جائے اور یہ ہے تمتع کامل۔ اور اگر کوئی شخص عمرہ اور حج دونوں کا احرام باندھ لے تو اسے متمتع بھی کہتے ہیں اور قارن بھی اور ان دونوں صورتوں میں دم دینا لازم ہے' جسے دم تمتع کہتے ہیں اور اس سے مراد یہ ہے کہ ایک ایسا جانور ذبح کیا جائے جسے بطور قربانی کے ذبح کرنا جائز ہو' اس سلسلہ میں قربانی کی طرح گائے یا اونٹ کا ساتواں حصہ بھی کافی ہے کیونکہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ فَمَن تَمَتَّعَ بِٱلْعُمْرَةِ إِلَى ٱلْحَجِّ فَمَا ٱسْتَيْسَرَ مِنَ ٱلْهَدْيِ ﴾ (البقرة۲/ ۱۹۶)

"تو جو (تم میں سے) حج کے وقت تک عمرے سے فائدہ اٹھانا چاہے تو وہ جیسی قربانی میسر ہو کرے۔"

اور اگر کوئی شخص قربانی نہ کر سکتا ہو تو وہ اس طرح دس روزے رکھے کہ تین تو ایام حج ہی میں اور سات اپنے گھر واپس آکر رکھے' جیسا کہ قبل ازیں بیان کیا گیا' حج کا وقت محدود ہے' غیر محدود نہیں ہے۔

اگر کوئی شخص شوال کے آغاز میں احرام باندھے تو پھر عمرہ سے لے کر آٹھ ذوالحج کو حج کا احرام باندھنے تک مدت طویل ہو گی جیسا کہ حضرات صحابہ کرام نے نبی کریم ﷺ کے حکم سے احرام باندھا تو آپ نے انہیں یہ حکم دیا تھا کہ احرام کھول کر حلال ہو جائیں۔ [1] حضرات صحابہ کرام میں سے بعض مفرد تھے اور بعض قارن تو نبی ﷺ نے حکم دیا کہ حلال ہو جائیں سوائے ان کے جن کے ساتھ قربانی کا جانور ہو تو صحابہ کرام نے طواف کیا' سعی کی' بال کتروائے' اور حلال ہو گئے اور اس طرح وہ متمتع بن گئے تو یوم ترویہ یعنی آٹھ ذوالحج کو نبی ﷺ نے ان کو یہ حکم دیا کہ اپنی رہائش گاہوں سے حج کا احرام باندھ لیں' لہٰذا افضل طریقہ یہی ہے۔ اگر کوئی شخص ذوالحج کے آغاز میں یا اس سے بھی پہلے حج کا احرام باندھ لے تو یہ بھی صحیح ہے لیکن افضل یہ ہے کہ حج کا احرام آٹھ ذوالحج کو باندھے جیسا کہ حضرات صحابہ کرام نے نبی ﷺ کے حکم سے کیا تھا۔

——— شیخ ابن باز ———

مفرد کے لیے ایک ہی سعی ہے

سوال میں نے حج مفرد کیا ہے اور عرفہ سے پہلے ہی طواف و سعی کر لیا ہے تو کیا میرے لیے افاضہ کے وقت یا طواف افاضہ کے ساتھ طواف اور سعی کرنا لازم ہے؟

جواب جو شخص حج مفرد کرے' اور اسی طرح اگر وہ حج اور عمرہ ملا کر' یعنی قران کرے پھر مکہ مکرمہ میں آکر طواف و سعی کرے اور حالت احرام میں برقرار رہے' کیونکہ وہ مفرد یا قارن ہے اور حلال نہ ہو تو اس کے لیے ایک ہی سعی کافی ہے۔ اس کے لیے دوسری سعی لازم نہیں ہے' لہٰذا جب وہ عید کے دن طواف کرے تو یہ طواف افاضہ ہی اس کے لیے کافی ہو گا بشرطیکہ وہ قربانی کے دن تک اپنے احرام سے حلال نہ ہو یا اس کے ساتھ قربانی کا جانور ہو تو وہ اس وقت تک احرام نہ

---

[1] امام بخاری نے اسے کتاب العمرة' باب متی یحل المعتمر میں تعلیقاً ذکر کیا ہے اور باب عمرة التنعیم میں موصولاً ذکر کیا ہے۔ و صحیح مسلم' الحج' باب حجة النبی صلی اللہ علیہ وسلم' حدیث: 1218۔

کھولے جب تک قربانی کے دن حج و عمرہ دونوں سے حلال نہ ہو جائے اور اس نے جو پہلی سعی کی تھی تو یہی کافی ہے' خواہ اس کے ساتھ قربانی کا جانور ہو یا نہ ہو بشرطیکہ وہ عید کے دن عرفہ میں آنے کے بعد حلال ہوا ہو تو اس صورت میں پہلی سعی کافی ہو گی' دوسری سعی کی اسے ضرورت نہیں ہے جب کہ وہ قارن یا مفرد ہو کیونکہ دوسری سعی تو صرف تمتع کرنے والے کے لیے ہے یعنی جس نے پہلے عمرہ کا احرام باندھا ہو اور صرف عمرہ کے لیے طواف و سعی کی ہو اور پھر حلال ہو گیا ہو اور پھر حج کا از سرنو احرام باندھا ہو تو اسے عمرہ کی سعی کے علاوہ حج کے لیے بھی دوسری سعی کرنا ہو گی۔

——— شیخ ابن باز ———

حج قران کی تمتع میں تبدیلی کا حکم

سوال اس شخص کے بارے میں کیا حکم ہے جس نے حج قران کا احرام باندھا تھا لیکن عمرہ کے بعد اس نے احرام کھول دیا تو کیا اسے متمتع شمار کیا جائے گا؟

جواب ہاں جب حج و عمرہ کا اکٹھا احرام باندھے پھر طواف اور سعی کرے اور بالوں کو کتروا کر اسے عمرہ بنا دے تو اسے متمتع کہا جائے گا اور تمتع کا دم اس پر لازم ہو گا۔

——— شیخ ابن باز ———

جس نے پہلے إفراد کی نیت کی پھر-----

سوال اس شخص کے بارے میں کیا حکم ہے جس نے حج مفرد کی نیت کی تھی لیکن مکہ مکرمہ میں پہنچ کر اس نے اسے تمتع میں بدل دیا اور عمرہ ادا کر کے حلال ہو گیا تو اس کے لیے کیا فدیہ ہو گا؟ وہ حج کا احرام کب اور کہاں سے باندھے؟

جواب افضل یہی ہے کہ جب کوئی شخص حج یا حج اور عمرہ دونوں کا اکٹھا احرام باندھ کر آئے تو وہ اس کو عمرہ کا احرام بنا دے۔ صحابہ کرام جب مکہ میں آئے تو نبی ﷺ نے انہیں اسی طرح کرنے کا حکم دیا تھا کیونکہ ان میں سے بعض قارن تھے اور بعض مفرد اور ان کے پاس ہدی بھی نہ تھی تو آپ نے انہیں حکم دیا کہ اس احرام کو عمرہ کے لیے خاص کر دو' چنانچہ انہوں نے طواف و سعی کی اور بال کتروا کر حلال ہو گئے۔ [1] ہاں البتہ جس کے پاس ہدی کا جانور ہو تو اسے بدستور حالت احرام میں رہنا چاہیئے حتیٰ کہ وہ اپنے حج قران یا مفرد سے عید کے دن حلال ہو جائے۔ مقصود یہ ہے کہ جو شخص مکہ میں صرف حج یا حج اور عمرہ دونوں کا اکٹھا احرام باندھ کر آئے اور اس کے ساتھ ہدی (قربانی) کا جانور بھی نہ ہو تو پھر سنت یہ ہے کہ وہ حج کے احرام کو فسخ کر کے صرف عمرہ کے لیے خاص کر دے اور طواف و سعی کرے اور بالوں کو کتروا کر حلال ہو جائے اور پھر حج کے وقت' حج کا احرام باندھے اس طرح وہ متمتع ہو جائے گا' لہٰذا اسے دم تمتع بھی ادا کرنا ہو گا۔

——— شیخ ابن باز ———

---

[1] حوالہ سابق۔

کیا قران اور افراد منسوخ ہیں؟

سوال بعض لوگوں کا یہ دعویٰ ہے کہ حج قران اور افراد منسوخ ہو چکے ہیں کیونکہ نبی کریم ﷺ نے صحابہ کرام کو تمتع کا حکم دیا تھا۔ تو جناب کی اس دعوے کے بارے میں کیا رائے ہے؟

جواب یہ ایک بالکل باطل قول ہے جو ہرگز ہرگز صحیح نہیں ہے کیونکہ علماء کا اجماع ہے کہ حج کی تین قسمیں ہیں (۱) افراد (۲) قران (۳) تمتع۔ جو شخص حج افراد کی نیت کرتا ہے تو اس کا احرام صحیح ہے' حج بھی صحیح ہے اور اس پر کوئی فدیہ بھی نہیں لیکن اگر وہ اسے فسخ کر کے عمرہ کے لیے خاص کر دے تو علماء کے صحیح ترین قول کے مطابق یہ افضل ضرور ہے کیونکہ نبی ﷺ نے ان لوگوں کو حکم دیا تھا جنہوں نے حج افراد یا قران کا احرام باندھا تھا اور ان کے ساتھ قربانیوں کے جانور بھی نہ تھے کہ وہ اپنے اس احرام کو عمرہ کے لیے خاص کر دیں اور طواف و سعی کرنے اور بال کتروانے کے بعد حلال ہو جائیں' [1] چنانچہ صحابہ کرام ﷺ نے اسی طرح کیا تھا لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ حج افراد منسوخ ہو گیا ہے بلکہ یہ تو نبی اکرم ﷺ کی طرف سے افضل و اکمل صورت کی طرف رہنمائی تھی۔ واللہ ولی التوفیق۔

——— شیخ ابن باز ———

جس نے نیت تمتع کی کی اور تلبیہ مفرد کا کہا

سوال اس شخص کے بارے میں کیا حکم ہے جس نے حج تمتع کی نیت کی لیکن میقات کے بعد اس نے اپنی رائے تبدیل کر کے مفرد کے لیے لبیک کہنا شروع کر دیا تو کیا اس پر ہدی (قربانی) لازم ہو گی؟

جواب اس کی صورتیں مختلف ہیں اگر اس نے میقات پر پہنچنے سے پہلے تمتع کی نیت کی اور میقات پر پہنچنے کے بعد نیت بدل کر صرف حج کا احرام باندھ لیا تو اس صورت میں کوئی حرج نہیں اور کوئی فدیہ نہیں لیکن اگر اس نے میقات سے یا میقات سے پہلے عمرہ و حج کے لیے لبیک کہا اور پھر یہ ارادہ کر لیا کہ اس احرام کو حج کے لیے خاص کر دے تو اسے ایسا نہیں کرنا چاہیئے۔ اس احرام کو وہ صرف عمرہ کے لیے تو خاص کر سکتا ہے لیکن صرف حج کے لیے نہیں۔ قران کو فسخ کر کے صرف حج کے لیے خاص نہیں کیا جا سکتا' ہاں البتہ اسے فسخ کر کے صرف عمرہ کے لیے خاص کیا جا سکتا ہے کیونکہ اس میں مومن کے لیے زیادہ آسانی بھی ہے اور نبی کریم ﷺ نے صحابہ کرام ﷺ کو اسی کا حکم بھی دیا تھا [2] تو گویا معلوم یہ ہوا کہ جب میقات سے عمرہ اور حج دونوں کا احرام باندھا ہو تو پھر اسے صرف حج کے لیے خاص نہیں کیا جا سکتا ہاں' البتہ عمرہ کے لیے اسے ضرور خاص کیا جا سکتا ہے' بلکہ افضل یہی ہے کہ اسے عمرہ ہی کے لیے خاص کر دیا جائے اور طواف و سعی اور حجامت کے بعد حلال ہو جائے اور پھر بعد میں وقت پر حج کا احرام باندھ لیا جائے اور اس طرح آدمی متمتع ہو جاتا ہے۔

——— شیخ ابن باز ———

---

[1] حوالہ سابق۔

[2] حوالہ سابق۔

رقم گم ہو جانے کی وجہ سے فدیہ (قربانی) کی استطاعت نہ تھی ---؟

سوال جس شخص نے حج اور عمرے کا احرام باندھا تھا لیکن مکہ مکرمہ پہنچنے کے بعد اس کے اخراجات کی رقم گم ہو گئی اور فدیہ کی استطاعت نہ رہی تو اس نے تبدیلی کر کے حج مفرد کی نیت کر لی تو کیا یہ صحیح ہے؟ اور اگر وہ کسی اور کی طرف سے حج کر رہا ہو جس نے حج تمتع کی شرط عائد کی تھی تو پھر وہ کیا کرے؟

جواب ایسا کرنا درست نہیں' خواہ اس کی رقم گم ہی کیوں نہ ہو گئی ہو کیونکہ فدیہ کی عدم استطاعت کی صورت میں وہ دس روزے رکھ سکتا ہے۔ الحمد للہ! تین روزے ایام حج میں رکھے اور سات اپنے گھر واپس لوٹ کر' لہٰذا اسے حالت تمتع پر برقرار رہنا ہو گا اور شرط کو بھی پورا کرنا ہو گا' لہٰذا اسے چاہیئے کہ عمرے کا احرام باندھے' طواف و سعی کرے اور بال کتروا کر حلال ہو جائے اور پھر حج کا احرام باندھے اور فدیہ دے۔ اگر فدیہ ادا کرنے سے عاجز و قاصر ہو تو اس طرح دس روزے رکھے کہ تین ایام حج میں عرفہ سے پہلے اور سات اپنے گھر واپس لوٹ کر۔ یاد رہے نبی کریم ﷺ کی اقتداء کے پیش نظر افضل یہ ہے کہ عرفہ کے دن آدمی نے روزہ نہ رکھا ہو کیونکہ آپ نے یوم عرفہ میں روزے کے بغیر وقوف فرمایا تھا۔ [1]

——— شیخ ابن باز ———

حج افراد کو قران میں تبدیل کرنا

سوال بعض جدید کتب میں ہے کہ حج افراد کرنے والے کے لیے یہ جائز نہیں ہے کہ وہ حج افراد کو حج قران میں تبدیل کرے' تو کیا یہ صحیح ہے؟

جواب رسول اللہ ﷺ نے افراد اور قران حج کرنے والوں کو یہ حکم دیا تھا کہ وہ اسے عمرہ میں بدل دیں [2] اور رسول اللہ ﷺ کے فرمان کی موجودگی میں کسی اور کا کلام حجت نہیں ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے صحابہ کرام کو حجۃ الوداع کے موقع پر حکم دیا تھا حالانکہ وہ تین قسموں میں بٹے ہوئے تھے ان میں سے بعض نے حج قران' بعض نے حج افراد اور بعض نے صرف عمرہ کا احرام باندھا تھا۔ خود نبی اکرم ﷺ نے حج قران کا احرام باندھا ہوا تھا کیونکہ آپ ہدی کا جانور ساتھ لائے تھے۔ مکہ مکرمہ کے قریب پہنچ کر رسول اکرم ﷺ نے فرمایا: "اس احرام کو عمرہ کے لیے خاص کر دو لیکن جن کے ساتھ ہدی کا جانور ہو وہ اپنے احرام کو تبدیل نہ کریں" لہٰذا صحابہ کرام جب مکہ میں داخل ہوئے تو انہوں نے طواف و سعی کیا اور نبی ﷺ نے تاکید کے ساتھ فرمایا کہ "بال کتروا دیں اور حلال ہو جائیں سوائے ان لوگوں کے جن کے ساتھ قربانی کے جانور ہوں۔" کیونکہ وہ تمتع نہیں کر سکتے۔ صحابہ کرام نے آپ کے اس ارشاد کو سنا تو اطاعت بجا لائے اور بال کتروا کر حلال ہو گئے۔ یہ سنت اس حاجی کے لیے ہے جو حج افراد یا قران کے لیے آئے اور اس کے ساتھ ہدی کا جانور نہ ہو' اسی میں آرام و راحت ہے اور کوئی تکلیف بھی نہیں اور پھر اس کے بعد جب ذوالحج کی آٹھ تاریخ آئے تو حج کا احرام باندھ لیا جائے۔ اس

---

[1] صحیح بخاری' الحج' باب صوم یوم عرفة' حدیث: 1658 و صحیح مسلم' الصیام' حدیث: 1123

[2] حوالہ سابق۔

صورتحال میں جو خیر عظیم ہے وہ کسی سے مخفی نہیں۔ یعنی حاجی اگر ذوالحجہ کے ابتداء یا ذوالقعدہ کے نصف سے محرم رہے تو احرام کی پابندیوں کی وجہ سے اسے مشقت ہو گی لہٰذا اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس آسانی کو قبول کر لینا چاہیے۔ واللہ ولی التوفیق۔

———— شیخ ابن باز ————

جس نے حج کیا اور عمرہ نہ کیا

سوال میں نے فرض حج ادا کیا لیکن اس کے ساتھ عمرہ نہ کیا تو اس صورت میں مجھ پر کچھ لازم ہے؟ اور جو حج کے ساتھ عمرہ کرے تو کیا اسے دوبارہ عمرہ کرنا لازم ہے؟

جواب جب انسان حج کرے اور اس نے پہلے زندگی میں کبھی بھی بلوغت کے بعد عمرہ نہ کیا ہو تو اسے عمرہ کرنا چاہیئے خواہ حج سے پہلے کرے یا بعد میں۔ اور اگر اس نے حج کیا اور عمرہ نہ کیا تو عمرہ حج کے بعد کرے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے حج اور عمرہ دونوں کو واجب قرار دیا ہے جیسا کہ نبی اکرم ﷺ کی بہت سی احادیث بھی اس امر پر دلالت کرتی ہیں' لہٰذا مرد مومن کے لیے یہ واجب ہے کہ وہ عمرہ بھی ادا کرے۔ اگر حج اور عمرہ ملا کر دونوں کے لیے اکٹھا احرام باندھ لے تو اس میں بھی کوئی حرج نہیں اور یہ احرام کافی ہو گا اور اگر اس نے میقات سے حج افراد کا احرام باندھا ہو اور اسی احرام میں اس نے حج مکمل کر لیا ہو تو پھر عمرہ کے احرام کے لیے اسے تنعیم یا جعرانہ کے مقام پر جانا چاہیئے یعنی حرم سے باہر کسی مقام حِل سے جا کر احرام باندھنا چاہیئے اور پھر مکہ مکرمہ میں آ کر طواف و سعی کرنے کے بعد بال کتروا یا منڈوا کر حلال ہو جانا چاہیئے' عمرہ بس یہی ہے۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے بھی اسی طرح کیا تھا۔[1] آپ جب مکہ میں تشریف لائیں تو آپ نے عمرے کا احرام باندھا ہوا تھا مگر مکہ کے قریب ہی آپ کے ایام شروع ہو گئے جس کی وجہ سے آپ کے لیے بیت اللہ کا طواف ممکن ہوا نہ عمرہ کی تکمیل' لہٰذا رسول اللہ ﷺ نے آپ کو حج کا احرام باندھنے کا حکم دیا تاکہ آپ قران کر لیں' چنانچہ آپ نے ایسا ہی کیا اور حج کو مکمل کر لیا اور پھر نبی ﷺ کے سامنے اس خواہش کا اظہار کیا کہ آپ عمرہ بھی کرنا چاہتی ہیں کیونکہ آپ کے ہمراہ دیگر خواتین نے الگ سے عمرہ کیا تھا تو آپ نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے بھائی عبدالرحمٰن رضی اللہ عنہ کو حکم دیا کہ وہ آپ کے ہمراہ مقام تنعیم تک جائیں تاکہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا وہاں سے عمرہ کا احرام باندھ سکیں' چنانچہ آپ وہاں سے عمرہ کا احرام باندھ کر مکہ مکرمہ میں آئیں اور طواف و سعی کرنے کے بعد قصر کیا۔ تو یہ اس بات کی دلیل ہے کہ جو شخص حج میں عمرہ نہ کر سکے تو اس کے لیے یہ کافی ہے کہ وہ تنعیم یا اس جیسے کسی دوسرے مقام حل سے جا کر احرام باندھ لے۔ اس کے لیے میقات تک جانا لازم نہیں ہے ہاں البتہ جس نے پہلے حج و عمرہ کیا ہو اور وہ دوبارہ حج کے لیے آیا ہو تو اس کے لیے عمرہ کرنا لازم نہیں ہے بلکہ اس کے لیے سابقہ عمرہ ہی کافی ہے کیونکہ عمرہ بھی حج کی طرح عمر بھر میں صرف ایک بار ہی واجب ہے۔

———— شیخ ابن باز ————

---

[1] صحیح بخاری' الحج' باب کیف تهل الحائض و النفساء' حدیث: 1556 و صحیح مسلم' الحج' حدیث: 1211

احرام اور حج کی نیت

احرام کا معنی اور محرم کے لیے مسنون اعمال

سوال احرام کا کیا معنی ہے؟ اور محرم کے لیے کون کون سے اعمال مسنون ہیں؟

جواب احرام حج و عمرہ کی نیت کو کہتے ہیں یعنی (کسی انسان کا) دل میں یہ ارادہ کرنا کہ وہ حج یا عمرہ کو شروع کرنے لگا ہے اور اس کے ساتھ ہی وہ ان امور سے رک جاتا ہے جو محرم کے لیے حرام قرار دیئے گئے ہیں۔ احرام محض لباس ترک کرنے کا نام نہیں کیونکہ دو چادریں تو انسان کبھی اپنے شہر میں بھی نیت کے بغیر پہن لیتا ہے تو اسے محرم نہیں کہا جاتا کیونکہ انسان محرم تو دل کے قصد و ارادہ سے ہوتا ہے اور اس ارادہ کے ساتھ ہی وہ اپنے معمول کے لباس قمیص اور عمامہ وغیرہ کو اتار کر احرام کا لباس پہن لیتا ہے اور فدیہ دیتا ہے۔

اگر صفائی و ستھرائی کو دیر ہو گئی ہو تو احرام کے وقت غسل کرنا مسنون ہے اور اگر ایک دن پہلے غسل اور صفائی وغیرہ کی ہو تو پھر تجدید غسل کی ضرورت نہیں ہے' ہاں البتہ میل کچیل وغیرہ دور کر کے صفائی حاصل کرنا مسنون ہے' لہٰذا مونچھیں اگر لمبی ہوں تو انہیں کاٹ لیا جائے تاکہ احرام کے بعد بڑھ جانے کی وجہ سے اسے تکلیف نہ ہو۔ احرام کی نیت سے پہلے خوشبو کا استعمال بھی مسنون ہے جبکہ نیت کے بعد خوشبو کا استعمال ممنوع ہے۔ احرام سے پہلے خوشبو لگانا اس لیے جائز ہے تاکہ بعد میں پسینے اور میل سے تکلیف نہ پہنچے اور اگر ایسا کوئی اندیشہ نہ ہو تو پھر ترک خوشبو میں کوئی حرج نہیں کیونکہ حج ہو یا عمرہ احرام کی مدت کم ہی ہوتی ہے۔ واللہ اعلم۔

——— شیخ ابن جبرین ———

نبی ﷺ کا احرام' تلبیہ اور غسل برائے احرام

سوال کیا رسول اللہ ﷺ نے مدینہ منورہ ہی میں احرام باندھا اور غسل فرمایا تھا؟

جواب نبی ﷺ نے مدینہ منورہ سے نہیں بلکہ ذوالحلیفہ سے احرام باندھا تھا کیونکہ نبی ﷺ نے مواقیت کا تعین کرتے ہوئے اہل مدینہ کے لیے ذوالحلیفہ میقات قرار دیا ہے اور یہ ناممکن ہے کہ آپ ایک چیز کا تعین فرمائیں اور پھر خود ہی اس کی مخالفت بھی کریں' چنانچہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے اہل مدینہ کے لیے ذوالحلیفہ' اہل شام کے لیے جحفہ' اہل نجد کے لیے قرن المنازل اور اہل یمن کے لیے یلملم کو میقات مقرر کیا اور فرمایا:

«هُنَّ لَهُنَّ، وَلِمَنْ أَتَى عَلَيْهِنَّ مِنْ غَيْرِ أَهْلِهِنَّ، مِمَّنْ أَرَادَ الْحَجَّ وَالْعُمْرَةَ وَمَنْ كَانَ دُوْنَ ذٰلِكَ فَمِنْ حَيْثُ أَنْشَأَ حَتَّى أَهْلُ مَكَّةَ مِنْ مَكَّةَ»(صحيح البخاري، الحج، باب مهل أهل مكة للحج والعمرة، ح:١٥٢٤ وصحيح مسلم، الحج، باب مواقيت الحج، ح:١١٨١)

''یہ ان علاقوں کے لوگوں کے لیے بھی میقات ہیں اور دوسرے علاقوں کے ان لوگوں کے لیے بھی جو یہاں سے

گزریں اور ان کا حج و عمرہ کا ارادہ ہو۔ اور جو لوگ میقات کے اندر رہ رہے ہوں تو وہ اپنی اپنی جگہ سے احرام باندھ لیں حتیٰ کہ اہل مکہ مکہ ہی سے احرام باندھ لیں۔"

حضرت سالم بن عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ انہوں نے اپنے والد گرامی کو یہ فرماتے ہوئے سنا:

«مَا أَهَلَّ رَسُولُ اللهِ ﷺ إِلاَّ مِنْ عِنْدِ الْمَسْجِدِ يَعْنِي مَسْجِدَ ذِي الْحُلَيْفَةِ»(صحيح البخاري، الحج، باب الإهلال عند مسجد ذي الحليفة، ح:١٥٤١ وصحيح مسلم، الحج، باب أمر أهل المدينة بالإحرام ... الخ، ح:١١٨٦)

"رسول اللہ ﷺ نے مسجد ذی الحلیفہ کے پاس احرام باندھا تھا۔"

ذوالحلیفہ ہی میں آپ نے غسل فرمایا تھا چنانچہ خارجہ بن زید بن ثابت رضی اللہ عنہ اپنے والد سے روایت کرتے ہیں کہ انہوں نے نبی کریم ﷺ کو دیکھا کہ آپ نے ذوالحلیفہ میں احرام باندھا اور غسل فرمایا تھا۔ [1]

وصلى الله على نبينا محمد و آله وصحبه وسلم۔

——— فتویٰ کمیٹی ———

افضل یہ ہے کہ غسل احرام سے پہلے کیا جائے

سوال جب حج کا ارادہ کرنے والا شخص آٹھ ذوالحج کو مکہ سے منیٰ کی طرف آئے اور منیٰ میں غسل کرے تو کیا یہ غسل اس کے لیے کافی ہے اور اس سلسلہ میں اس کے لیے کیا واجب ہے؟

جواب اگر منیٰ میں غسل کرے تو کوئی حرج نہیں لیکن افضل یہ ہے کہ احرام باندھنے سے پہلے اپنے گھر میں یا مکہ میں کسی بھی جگہ غسل کرے اور پھر اپنے گھر سے حج کا احرام باندھے اور اس وقت طواف کے لیے مسجد حرام میں جانے کی ضرورت نہیں ہے کیونکہ آٹھ ذوالحج کو منیٰ کی طرف جانے والے پر طواف وداع واجب نہیں ہے۔ اگر کوئی شخص غسل کے بغیر احرام باندھ لے تو پھر بھی کوئی حرج نہیں۔ اور اگر احرام کے بعد منیٰ میں غسل کر لے تو پھر بھی کوئی حرج نہیں لیکن افضل اور سنت یہ ہے کہ احرام سے قبل غسل کیا جائے اور اگر کوئی غسل اور وضو کے بغیر احرام باندھ لے تو پھر بھی کوئی حرج نہیں کیونکہ اس موقع پر غسل اور وضو واجب نہیں بلکہ سنت ہے۔

——— شیخ ابن باز ———

حج اور عمرہ میں نیت کی الفاظ سے ادائیگی

سوال کیا عمرہ یا حج یا طواف و سعی بیت حرام کے ادا کرنے کے لیے نیت کو الفاظ میں ادا کرنا جائز ہے؟ نیت کے الفاظ استعمال کرنا کس وقت جائز ہے؟

جواب نبی اکرم ﷺ سے نماز، طہارت، روزہ یا کسی بھی دوسری عبادت میں نیت کی الفاظ سے ادائیگی ثابت نہیں ہے حتیٰ کہ حج اور عمرہ میں بھی ثابت نہیں ہے اور نہ آپ نے صحابہ کرام میں سے کسی کو اس کا حکم دیا۔ زیادہ سے زیادہ اس

[1] جامع ترمذی، الحج، باب ماجاء فی الاغتسال عند الاحرام، حدیث: 830

سلسلہ میں جو ثابت ہے وہ یہ کہ ضباعہ بنت زبیر رضی اللہ عنہا نے جب یہ عرض کیا کہ ان کا حج کا ارادہ ہے لیکن وہ بیمار ہیں تو نبی اکرم ﷺ نے فرمایا:

«حُجِّي وَاشْتَرِطِي، أَنَّ مَحِلِّي حَيْثُ حَبَسْتَنِي "فَإِنَّ لَكِ عَلَى رَبِّكِ مَا اسْتَثْنَيْتِ"»

(صحيح البخاري، النكاح، باب الأكفاء في الدين، ح:٥٠٨٩ وصحيح مسلم، الحج، باب جواز اشتراط المحرم ... الخ، ح:١٢٠٧ وسنن النسائي، مناسك الحج، باب كيف يقول إذا اشترط، ح:٢٧٦٧)

”حج کرو اور ساتھ یہ شرط عائد کرلو کہ میں وہاں حلال ہو جاؤں گی جہاں تو مجھے روک لے گا اس طرح تو نے جو شرط کرلی تھی وہ اب تیرے لیے تیرے رب کے ذمے ہوگی۔“

اور یہ کلام زبان ہی سے تھا کیونکہ عقد حج نذر کی طرح ہے اور نذر زبان سے ہوتی ہے' اس لیے کہ اگر انسان محض دل میں نذر کی نیت کرے تو یہ نذر نہ ہوگی۔ اور جب حج کو آدمی شروع کر دے تو اسے پورا کرنا اسی طرح لازم ہے جس طرح نذر کو پورا کرنا لازم ہے تو یہی وجہ ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ضباعہ کو حکم دیا کہ وہ اپنی زبان سے اس شرط کو بھی ذکر کریں کہ اگر مجھے رکاوٹ نے روک لیا تو میں وہاں حلال ہو جاؤں گی جہاں مجھے تو روک لے گا اور حدیث سے جو یہ ثابت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

«أَتَانِي اللَّيْلَةَ آتٍ مِّنْ رَّبِّي فَقَالَ: صَلِّ فِي هٰذَا الْوَادِي الْمُبَارَكِ، وَقُلْ عُمْرَةٌ فِي حَجَّةٍ أَوْ عُمْرَةٌ وَّحَجَّةٌ»(صحيح البخاري، الحج، باب قول النبي ﷺ العقيق واد مبارك، ح:١٥٣٤، والاعتصام، باب ما ذكر النبي ﷺ وحض على اتفاق أهل العلم ... الخ، ح:٧٣٤٣)

”آج رات میرے پاس میرے رب کی طرف سے ایک آنے والا (جبریل علیہ السلام) آیا اور اس نے کہا: کہ اس مبارک وادی میں نماز پڑھو اور کہو: عمرہ حج میں (داخل) ہے یا یہ کہا کہ کہو: حج اور عمرہ (ایک ہی احرام سے ادا کروں گا۔)“

تو اس کا یہ معنی نہیں کہ زبان سے نیت کے الفاظ ادا کرے۔ اس کا معنی صرف یہ ہے کہ تلبیہ میں حج کا ذکر کرے کیونکہ نبی کریم ﷺ نے الفاظ کے ساتھ نیت نہیں کی تھی۔

—— شیخ ابن عثیمین ——

نیت کا محل دل ہے اور حج میں ....

سوال کیا احرام کی نیت زبان سے الفاظ ادا کرنے سے ہوتی ہے؟ اور آدمی جب کسی دوسرے کی طرف سے حج کر رہا ہو تو کس طرح نیت کرے؟

جواب نیت کا مقام دل ہے اور اس کا طریقہ یہ ہے کہ آدمی اپنے دل میں یہ ارادہ کرے کہ وہ فلاں شخص یا اپنے بھائی یا فلاں بن فلاں کی طرف سے حج کر رہا ہے اور اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی مستحب ہے کہ زبان سے یہ الفاظ ادا کرے کہ ”اے اللہ! میں فلاں کی طرف سے حج کے لیے حاضر ہوں یا فلاں کی طرف سے (اپنے باپ کی طرف سے) یا فلاں بن فلاں کی طرف سے عمرہ کے لیے حاضر ہوں۔“

تاکہ دل کے ارادے کی زبان کے ان الفاظ سے تاکید ہو جائے کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے حج اور عمرہ کے الفاظ زبان سے بھی ادا فرمائے تھے۔ تو اس سے معلوم ہوا کہ رسول اللہ ﷺ کے اسوہ پر عمل کے پیش نظر نیت کے الفاظ کی زبان سے ادائیگی بھی صحیح ہے۔ حضرات صحابہ کرام نے بھی زبان سے حج کی نیت کے الفاظ کو ادا فرمایا تھا جیسا کہ نبی ﷺ نے انہیں اس کی تعلیم دی تھی۔ حضرات صحابہ کرام ان الفاظ کو بلند آواز سے ادا فرمایا کرتے تھے' لہٰذا سنت یہی ہے اور اگر زبان سے الفاظ ادا نہ کرے اور نیت ہی پر اکتفاء کرے تو یہ بھی کافی ہے۔ حج بدل کے تمام اعمال کو بھی اسی طرح ادا کیا جائے جس طرح انسان اپنے حج کے اعمال ادا کرتا ہے یعنی فلاں بن فلاں کے ذکر کے بغیر مطلقاً تلبیہ کہے ہاں البتہ اگر نیت کرتے وقت ایک بار تلبیہ میں اس شخص کا تعین کرے جس کی طرف سے حج کر رہا ہو تو یہ افضل ہے اور پھر تلبیہ اسی طرح کہے جس طرح حج اور عمرہ کرنے والے لوگ کہتے ہیں یعنی: ”حاضر ہوں میں اے اللہ! حاضر ہوں' تیرا کوئی شریک نہیں میں حاضر ہوں۔ بے شک تمام تر تعریف اور انعام (و احسان) تیرا ہی ہے اور بادشاہت بھی تیری ہی ہے۔ تیرا کوئی شریک نہیں۔ حاضر ہوں میں اے اللہ! میں حاضر ہوں' حاضر ہوں اے معبود (حقیقی حاضر ہوں)“

یعنی مقصد یہ ہے کہ اسی طرح لبیک کہے جس طرح وہ اپنی طرف سے لبیک کہتا ہے اور کسی کا نام نہ لے' ہاں البتہ صرف ابتداء میں ایک دفعہ کہہ دے کہ ”فلاں کی طرف سے حج کے لیے' یا فلاں کی طرف سے عمرہ کے لیے یا فلاں کی طرف سے عمرہ اور حج کے لیے حاضر ہوں۔“ یہ افضل ہے کہ احرام کے آغاز میں نیت کے ساتھ یہ کہا جائے۔

——— شیخ ابن باز ———

دو حجوں کا احرام جائز نہیں ہے

سوال کیا دو حجوں یا دو عمروں کا احرام باندھنا صحیح ہے؟ نیز تلبیہ' اس کی شروط' حکم اور وقت کے بارے میں رہنمائی فرمائیں؟

جواب یہ صحیح نہیں کہ ایک سال میں دو حجوں کا احرام باندھ لیا جائے کیونکہ ہر سال صرف ایک ہی حج جائز ہے۔ اسی طرح ایک ہی وقت میں دو عمروں کا احرام باندھنا بھی جائز نہیں۔ ایک حج دو آدمیوں کی طرف سے بھی نہیں ہو سکتا' اسی طرح ایک عمرے میں دو آدمیوں کی طرف سے بھی احرام نہیں باندھا جا سکتا کیونکہ دلائل سے ایسا ہرگز ثابت نہیں ہے۔

اور تلبیہ دراصل اللہ تعالیٰ کی اس پکار کا جواب ہے:

﴿ وَأَذِّن فِى ٱلنَّاسِ بِٱلْحَجِّ ﴾ (الحج٢٢/ ٢٧)

”لوگوں میں حج کا اعلان کر دیجئے۔“

اور اس کے الفاظ یہ ہیں:

«لَبَّيْكَ اللَّهُمَّ لَبَّيْكَ، لَبَّيْكَ لاَ شَرِيكَ لَكَ لَبَّيْكَ، إِنَّ الْحَمْدَ وَالنِّعْمَةَ لَكَ وَالْمُلْكَ لاَ شَرِيكَ لَكَ»(صحيح البخاري، الحج، باب التلبية، ح:١٥٤٩ وصحيح مسلم، الحج، باب التلبية وصفتها ووقتها، ح: ١١٨٤)

”میں حاضر ہوں' اے اللہ! میں حاضر ہوں۔ تیرا کوئی شریک نہیں۔ میں حاضر ہوں۔ بے شک تمام تر تعریف

اور انعام (و احسان) تیرا ہی ہے اور بادشاہت بھی تیری ہے' تیرا کوئی شریک نہیں۔"

ان سے زیادہ الفاظ کہنا بھی جائز ہے مثلاً آپ یہ کہہ سکتے ہیں:

«لَبَّيْكَ وَسَعْدَيْكَ وَالْخَيْرُ كُلُّهُ بِيَدَيْكَ وَالشَّرُّ لَيْسَ إِلَيْكَ لَبَّيْكَ وَالرَّغْبَاءُ إِلَيْكَ وَالْعَمَلُ حَقًّا حَقًّا، تَعَبُّدًا وَرِقًّا»

"میں حاضر ہوں اور تیری فرمانبرداری کے لیے تیار ہوں اور ہر خیر و خوبی تیرے ہی ہاتھوں میں ہے اور برائی کی نسبت تیری طرف نہیں ہے۔ میں حاضر ہوں اور تیری جانب میری رغبت اور میرا عمل ہے۔ میں بندگی اور غلامی کا اظہار کرتے ہوئے سچ مچ حاضر ہوں۔"

تلبیہ کا حکم یہ ہے کہ یہ سنت مؤکدہ ہے جب کہ بعض نے اسے رکن قرار دیا ہے کیونکہ یہ حج و عمرہ کا ظاہری شعار ہے۔ اس کا وقت نیت کے بعد احرام باندھنے کے فوراً بعد ہے جب کہ احرام باندھنے والا ابھی اسی جگہ ہو جہاں اس نے نماز پڑھی ہو نیز ہر اس وقت تلبیہ کہنا چاہیے جب سواری پر سوار ہو' سواری سے اترے' اونچی جگہ پر چڑھے یا نشیبی جگہ پر اترے' کسی اور کو لبیک کہتے ہوئے سنے یا ساتھیوں سے ملے یا کسی ممنوع کام کا ارتکاب کر بیٹھے یا فرض نماز ادا کرے یا رات یا دن کا آغاز ہو اور اسی طرح تغیر احوال کے دیگر مواقع پر بھی۔ واللہ اعلم۔

—— شیخ ابن جبرین ——

احرام کے وقت نماز شرط نہیں ہے

سوال کیا احرام کی دو رکعتیں ادا کیے بغیر بھی مسلمان کا حج یا عمرے کا احرام صحیح ہے؟ کیا احرام کے صحیح ہونے کے لیے یہ شرط ہے کہ احرام کی نیت کے الفاظ بلند آواز سے کہے جائیں؟

جواب احرام سے پہلے نماز ادا کرنا احرام کے لیے شرط نہیں بلکہ اکثر کے نزدیک یہ مستحب ہے اور مشروع یہ ہے کہ دل میں حج یا عمرے کی نیت کی جائے اور زبان سے یہ الفاظ ادا کیے جائیں:

«اَللّٰهُمَّ لَبَّيْكَ عُمْرَةً»

"اے اللہ! میں عمرہ کے لیے حاضر ہوں۔"

یا یہ کہے:

«اَللّٰهُمَّ لَبَّيْكَ حَجًّا»(صحيح مسلم، الحج، باب في الإفراد والقران، ح:١٢٣٢)

"اے اللہ! میں حج کے لیے حاضر ہوں۔"

یا اگر قران کا ارادہ ہو تو حج اور عمرہ دونوں کا ذکر کرے۔ جیسا کہ نبی اکرم ﷺ اور حضرات صحابہ کرام نے کیا تھا۔[1] نیت کے الفاظ کی زبان سے ادائیگی شرط نہیں ہے بلکہ دل کی نیت ہی کافی ہے۔ تلبیہ شرعیہ کے الفاظ یہ ہیں:

«لَبَّيْكَ اللّٰهُمَّ لَبَّيْكَ، لَبَّيْكَ لاَ شَرِيكَ لَكَ لَبَّيْكَ، إِنَّ الْحَمْدَ وَالنِّعْمَةَ لَكَ وَالْمُلْكَ لاَ شَرِيكَ لَكَ»(صحيح البخاري، الحج، باب التلبية، ح:١٥٤٩ وصحيح مسلم، الحج، باب التلبية

[1] صحیح مسلم' الحج' باب فی الافراد و القران' حدیث: 1232

وصفتها ووقتها، ح: ١١٨٤)

یہ ہے نبی کریم ﷺ کا وہ تلبیہ جو صحیح بخاری و مسلم اور دیگر کتب حدیث سے ثابت ہے۔ [1]

——— شیخ ابن باز ———

کیا احرام کے لیے دو رکعتیں شرط ہیں؟

سوال کیا احرام کے لیے دو رکعتیں شرط ہیں یا نہیں؟

جواب یہ دو رکعتیں احرام کے لیے شرط نہیں بلکہ ان کے مستحب ہونے کے بارے میں بھی علماء میں اختلاف ہے۔ جمہور نے اسے مستحب قرار دیا ہے کہ وضو کرے' دو رکعتیں پڑھے اور پھر تلبیہ پڑھے۔ ان کی دلیل یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے نماز کے بعد احرام باندھا تھا۔ [2] یعنی آپ نے حجۃ الوداع کے موقع پر پہلے نماز ظہر ادا فرمائی اور پھر احرام باندھا اور فرمایا:

«أَتَانِي اللَّيْلَةَ آتٍ مِّنْ رَبِّي فَقَالَ: صَلِّ فِي هٰذَا الْوَادِي الْمُبَارَكِ، وَقُلْ عُمْرَةٌ فِي حَجَّةٍ»

(صحيح البخاري، الحج، باب قول النبي ﷺ العقيق واد مبارك، ح: ١٥٣٤)

"آج رات میرے پاس میرے رب کی طرف سے ایک آنے والا (جبریل علیہ السلام) آیا اور اس نے کہا کہ اس مبارک وادی میں نماز پڑھیں اور کہیں کہ عمرہ حج میں (داخل) ہے۔"

یہ اس بات کی دلیل ہے کہ دو رکعت نماز پڑھنا مشروع ہے۔ جمہور اہل علم کا بھی یہی قول ہے۔

دیگر اہل علم کا یہ کہنا ہے کہ یہ حدیث اس مسئلہ میں نص نہیں کیونکہ اس بات کا احتمال ہے کہ مذکورہ حدیث میں نماز سے مراد فرض نماز ہو' لہٰذا یہ حدیث احرام کی دو رکعتوں کے بارے میں نص نہیں ہے۔ فرض نماز کے بعد احرام باندھنا بھی اس بات کی دلیل نہیں کہ احرام کی دو مخصوص رکعتیں مشروع ہیں بلکہ اس سے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ اگر آسانی سے ممکن ہو تو حج یا عمرہ کا نماز کے بعد احرام باندھنا افضل ہے۔

——— شیخ ابن باز ———

میقات سے پہلے احرام باندھنا

سوال میقات سے پہلے احرام باندھنے کے بارے میں کیا حکم ہے؟ کیا حج کے مہینوں سے پہلے حج کا احرام باندھنا صحیح ہے؟

جواب مکانی میقات سے پہلے احرام باندھنے میں کوئی حرج نہیں مثلاً یہ کہ صفائی حاصل کر کے طائف سے احرام باندھ لیں' نیت کریں اور تلبیہ پڑھنا شروع کر دیں' اسی طرح اہل مدینہ کے لیے اپنے گھروں سے احرام باندھنا بھی جائز ہے۔ اہل مصر کے لیے بھی جائز ہے کہ وہ جب سفر کا ارادہ کریں تو اپنے گھروں سے نکلتے وقت یا جدہ کی طرف سفر کے لیے ہوائی جہاز پر سوار ہوتے وقت احرام باندھ لیں لیکن یہ خلاف اولیٰ ہے۔

---

[1] صحیح بخاری' الحج' باب التلبیة' حدیث: 1549 و صحیح مسلم' الحج' باب التلبیة وصفتها ووقتها حدیث: 1184

[2] السنن الکبریٰ: 33/5

حج کے مہینوں سے قبل حج کا احرام باندھنا مثلاً رمضان میں حج کا احرام باندھنا' تو اس سے بعض علماء نے منع کیا ہے اور کہا ہے کہ یہ ایسے ہی ہے جیسے قبل از وقت نماز ادا کر لی جائے لیکن شاید زیادہ صحیح بات یہ ہے کہ قبل از وقت حج کا احرام باندھنا صحیح ہے کیونکہ تقدیم نفسِ عمل کے لیے نقصان دہ نہیں ہوتی البتہ طویل عرصہ تک احرام باندھنے کی وجہ سے محرم کے لیے ضرور دشواری ہے کہ اسے عرفہ اور قربانی کے دن تک محرم رہنا پڑے گا اور اس میں بہت دشواری ہے۔

——— شیخ ابن جبرین ———

میقات کے اندر رہنے والا شخص اپنی جگہ سے احرام باندھے

سوال جو شخص میقات کے اندر رہائش پذیر ہو وہ کہاں سے احرام باندھے؟

جواب جو شخص میقات کے اندر ہو تو وہ اپنی جگہ سے احرام باندھ لے مثلاً ام سلم اور بحرہ کے لوگ اپنے علاقے سے اور جدہ کے باشندے اپنے شہر سے احرام باندھ لیں کیونکہ حدیث ابن عباس میں ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا:

«وَمَنْ كَانَ دُونَ ذٰلِكَ ـ أَيْ دُونَ الْمَوَاقِيتِ ـ فَمِنْ حَيْثُ أَنْشَأَ»(صحيح البخاري، الحج، باب مهل أهل مكة للحج والعمرة، ح: ١٥٢٤ وصحيح مسلم، الحج، باب مواقيت الحج، ح: ١١٨١)

"جو میقات کے اندر رہتا ہو تو وہ وہاں سے احرام باندھے جہاں سے چلے۔"

اور ایک روایت میں الفاظ یہ ہیں:

«فَمُهَلُّهُ مِنْ أَهْلِهِ، حَتَّى أَهْلُ مَكَّةَ يُهِلُّونَ مِنْهَا»(صحيح البخاري، الحج، باب مهل أهل الشام، ح: ١٥٢٦ وصحيح مسلم، الحج، باب مواقيت الحج، ح: ١١٨١)

"وہ اپنے گھر سے احرام باندھ لے حتیٰ کہ اہل مکہ' مکہ ہی سے احرام باندھ لیں۔"

——— شیخ ابن باز ———

جو منیٰ میں ہو وہ منیٰ ہی سے احرام باندھ لے

سوال اس شخص کے بارے میں کیا حکم ہے جو یوم ترویہ (آٹھ ذوالحج) سے قبل منیٰ میں ہو تو کیا وہ مکہ میں جا کر احرام باندھے یا منیٰ میں احرام باندھ لے؟

جواب جو شخص منیٰ میں بیٹھا ہو تو اس کے لیے حکم شریعت یہ ہے کہ وہ منیٰ ہی سے احرام باندھ لے۔ والحمدللہ! اسے مکہ میں جانے کی ضرورت نہیں ہے۔ بلکہ جب وقت آئے تو وہ اپنی جگہ سے حج کے لیے تلبیہ کہہ دے۔

——— شیخ ابن باز ———

ترویہ کے دن احرام باندھنا

سوال ترویہ کے دن حاجی احرام کس جگہ سے باندھے؟

جواب حاجی اپنی جگہ ہی سے احرام باندھے جس طرح کہ حجۃ الوداع کے موقع پر حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے نبی اکرم ﷺ کے حکم سے ابطح میں اپنی اپنی رہائش گاہوں سے احرام باندھا تھا۔[1] اسی طرح جو شخص مکہ کے اندر ہو وہ بھی اپنی جگہ ہی سے احرام باندھ لے کیونکہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی حدیث میں ہے:

«فمَنْ كَانَ دُونَهُنَّ فَمُهَلُّهُ مِنْ أَهْلِهِ، حَتَّى أَهْلُ مَكَّةَ يُهِلُّونَ مِنْهَا» (صحيح البخاري، الحج، باب مهل أهل الشام، ح:١٥٢٦ وصحيح مسلم، الحج، باب مواقيت الحج، ح:١١٨١)

"جو شخص میقات کے اندر ہو تو وہ اپنے گھر ہی سے احرام باندھ لے حتیٰ کہ اہل مکہ' مکہ ہی سے احرام باندھ لیں۔"

——— شیخ ابن باز ———

فضائی اور بحری راستے سے آنے والا کب احرام باندھے

سوال حج اور عمرہ کے لیے فضائی راستے سے آنے والا کب احرام باندھے؟

جواب فضائی اور بحری راستے سے آنے والا بھی خشکی کے راستہ سے آنے والے کی طرح اس وقت احرام باندھے جب وہ میقات کے برابر آئے یا میقات کے آنے سے تھوڑی دیر پہلے احرام باندھ لے تاکہ ہوائی یا بحری جہاز کی تیز رفتاری کی وجہ سے وہ احتیاط سے کام لے اور میقات سے احرام کے بغیر نہ گزرے۔ وباللہ التوفیق۔

——— شیخ ابن باز ———

جدہ سے احرام باندھنا

سوال بعض لوگ فضائی راستے سے حج کے لیے آنے والوں کو یہ فتویٰ دیتے ہیں کہ وہ جدہ سے احرام باندھیں جبکہ (کچھ) دوسرے لوگ اس کا انکار کرتے ہیں' تو آپ ہمیں فتویٰ دیں کہ اس مسئلہ میں درست بات کون سی ہے؟ اللہ تعالیٰ آپ کو اجر و ثواب سے نوازیں۔

جواب ہوائی' سمندری اور خشکی کے راستے سے آنے والے تمام حاجیوں کے لیے ضروری ہے کہ وہ اس میقات سے احرام باندھیں جس پر سے وہ خشکی کے راستے سے گزر رہے ہوں یا فضائی اور سمندری راستہ سے اس کے برابر سے گزر رہے ہوں کیونکہ نبی ﷺ نے جب مواقیت مقرر فرمائے تو ارشاد فرمایا:

«هُنَّ لَهُنَّ، وَلِمَنْ أَتَى عَلَيْهِنَّ مِنْ غَيْرِ أَهْلِهِنَّ، مِمَّنْ أَرَادَ الْحَجَّ وَالْعُمْرَةَ»(صحيح البخاري، الحج، باب مهل اهل مكة للحج والعمرة، ح:١٥٢٤ وصحيح مسلم، الحج، باب مواقيت الحج، ح:١١٨١)

"یہ مواقیت ان علاقوں کے باشندوں کے لیے ہیں اور ان لوگوں کے لیے بھی جو ان کے باشندے تو نہ ہوں لیکن حج یا عمرہ کے ارادے سے ان میقاتوں سے گزریں۔"

---

[1] صحیح مسلم' الحج' باب بیان وجوه الاحرام--- الخ' حدیث: 1214

رہا جدہ' تو وہاں سے گزرنے والوں کے لیے میقات نہیں بلکہ وہ تو صرف اہل جدہ ہی کے لیے میقات ہے اور ان کے علاوہ ان لوگوں کے لیے بھی میقات ہے جو حج اور عمرہ کے ارادے کے بغیر وہاں آئیں پھر وہاں آ کر انہوں نے حج یا عمرہ کرنے کا ارادہ کر لیا ہو۔

——— شیخ ابن باز ———

ایک شخص نے از راہ جہالت جدہ سے حج کا احرام باندھا

سوال ایک شخص نے جدہ سے حج کا احرام باندھا اور جب حج کے بعد وہ مدینہ پہنچا تو اسے بتایا گیا کہ آپ کے حج میں نقص ہے تو کیا اس صورت میں اس پر دم ہے یا نہیں؟

جواب حج یا عمرہ کا ارادہ کرنے والے کے لیے یہ ضروری ہے کہ وہ اس میقات سے یا اس کے برابر سے احرام باندھے جس سے وہ گزر رہا ہو۔ اگر وہ بغیر احرام کے میقات سے گزر جائے اور میقات کے بجائے مکہ کے قریب کسی دوسری جگہ سے احرام باندھے تو اکثر اہل علم کے نزدیک اس پر دم لازم ہے۔ اور اس میں کوئی شک نہیں کہ جدہ میقات کے اندر ہے' پس جو شخص یہاں سے احرام باندھتا ہے تو وہ گویا شرعی میقات سے احرام کے بغیر تجاوز کر آیا ہے' لہٰذا اس کے ذمہ دم لازم ہے اور وہ یہ ہے کہ بھیڑ کا چھ ماہ کا بچہ یا بکری جو دو دانت والی (دوندی) ہو ذبح کرے یا اونٹ اور گائے کے ساتویں حصے کو حرم میں ذبح کرنے کے بعد حرم کے مساکین میں تقسیم کر دے جیسا کہ ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے:

«مَنْ نَسِيَ مِنْ نُسُكِهِ شَيْئًا، أَوْ تَرَكَهُ فَلْيُهْرِقْ دَمًا»(موطأ للإمام مالك، الحج، باب جامع الفدية، ح: ٢٥٧، ١/ ٤١٩/ ٢٤٠)

"جو شخص حج کا کوئی رکن بھول جائے یا ترک کر دے تو وہ خون بہائے۔" وصلی اللہ علی نبینا محمد و آلہ وصحبہ وسلم۔

——— فتویٰ کمیٹی ———

جو شخص بغیر ارادہ حج کے مکہ آئے پھر-----

سوال اس شخص کے بارے میں کیا حکم ہے جو مکہ مکرمہ میں کسی کام یا ملازمت کے لیے آیا ہو اور پھر اسے حج کرنے کی فرصت بھی حاصل ہو گئی تو کیا وہ اپنی جگہ ہی سے احرام باندھے یا حرم سے باہر حل میں جا کر احرام باندھے؟

جواب جب کوئی شخص مکہ مکرمہ میں آئے اور اس کی حج یا عمرہ کی نیت نہ ہو بلکہ وہ کسی ضرورت' کسی رشتہ دار کی ملاقات' کسی مریض کی عیادت یا تجارت وغیرہ کے لیے آیا ہو اور پھر اس کا حج یا عمرے کا ارادہ بن گیا ہو تو اسے چاہیئے کہ حج کا احرام تو اپنی جگہ ہی سے باندھ لے خواہ وہ مکہ شہر کے اندر رہ رہا ہو یا مضافات میں۔ اور اگر اس کا عمرے کا ارادہ ہو تو پھر اسے احرام کے لیے حدود حرم سے باہر حل کی طرف نکلنا پڑے گا خواہ تنعیم چلا جائے' جعرانہ یا کسی اور جگہ کیونکہ عمرہ کے لیے سنت بلکہ واجب یہی ہے کہ وہ حل کی طرف جائے جیسا کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کو حکم دیا تھا[1] جب

---

[1] صحیح بخاری' الحج' باب کیف تهل الحائض والنفساء' حدیث: 1556 و صحیح مسلم' الحج' حدیث: 1211

انہوں نے عمرے کا ارادہ کیا کہ تنعیم جائیں اور آپ کے بھائی حضرت عبدالرحمٰن رضی اللہ عنہ کو حکم دیا کہ وہ آپ کے ہمراہ حدود حرم سے باہر حل یعنی تنعیم تک جائیں چنانچہ عمرے کا ارادہ کرنے والے کے لیے واجب یہی ہے لیکن حج کا ارادہ کرنے والے کو چاہیئے کہ وہ ایک جگہ ہی سے احرام باندھ لے خواہ وہ حدود کے اندر ہو یا باہر جیسا کہ قبل ازیں بیان کیا جا چکا ہے۔

——— شیخ ابن باز ———

یہ لوگ اپنے گھروں سے احرام باندھیں

سوال گزشتہ سال میں اپنے رشتہ داروں سے ملاقات کے لیے جدہ گیا اور وہاں کچھ قیام کے بعد میں نے حج کی نیت کر کے میقات جدہ سے احرام باندھ لیا اور حج کے لیے مکہ چلا گیا تو ایک بھائی نے مجھے بتایا کہ میں نے چونکہ احرام کے بغیر میقات سے تجاوز کیا ہے لہٰذا مجھے ایک جانور ذبح کرنا چاہیئے۔ کیا یہ بات صحیح ہے؟ جبکہ جدہ ملاقات کے لیے گیا تھا اور ریاض سے روانہ ہوتے وقت میری نیت حج کی نہ تھی۔ فتویٰ دیجئے جزاکم اللہ خیرًا؟

جواب اگر ریاض سے روانہ ہوتے وقت آپ کی نیت حج کی نہ تھی اور یہ نیت آپ نے جدہ میں کی تو پھر آپ کا جدہ سے احرام باندھنا صحیح ہے اور اس صورت میں کوئی فدیہ نہیں ہے کیونکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے مواقیت کا تعین کرتے ہوئے فرمایا:

«هُنَّ لَهُنَّ، وَلِمَنْ أَتَى عَلَيْهِنَّ مِنْ غَيْرِ أَهْلِهِنَّ، مِمَّنْ أَرَادَ الْحَجَّ وَالْعُمْرَةَ وَمَنْ كَانَ دُوْنَ ذٰلِكَ فَمِنْ حَيْثُ أَنْشَأَ حَتَّى أَهْلُ مَكَّةَ مِنْ مَكَّةَ»(صحيح البخاري، الحج، باب مهل أهل مكة للحج والعمرة، ح: ١٥٢٤ وصحيح مسلم، الحج، باب مواقيت الحج، ح: ١١٨١)

''یہ ان علاقوں کے باشندوں کے لیے ہیں اور ان کے لیے بھی جو ان کے باشندے تو نہ ہوں لیکن یہاں سے گزریں اور ان کا حج اور عمرہ کا ارادہ ہو اور جو ان کے اندر ہوں تو وہ اپنی جگہ ہی سے احرام باندھیں حتیٰ کہ اہل مکہ' مکہ ہی سے احرام باندھیں۔''

اس حدیث کے حکم میں اہل جدہ' ام سلم' بحرہ اور ان جیسے وہ سب لوگ داخل ہیں جو حدود حرم سے باہر لیکن مواقیت کے اندر رہ رہے ہوں۔ یہ لوگ جب بھی حج یا عمرہ کا ارادہ کریں تو یہ اپنے گھروں ہی سے احرام باندھیں گے۔ وباللہ التوفیق۔

——— شیخ ابن باز ———

طویل مدت تک حالت احرام میں رہنا

سوال میں رمضان میں عمرہ کے لیے گیا' میری والدہ بھی میرے ساتھ تھیں۔ ہوائی جہاز ابیار علی کے اوپر تھا کہ میں نے احرام باندھ لیا اور ہم جدہ میں اتر پڑے اور یہاں بیٹھے رہے حتیٰ کہ روزہ افطار کرنے کے بعد شام کو ہم عمرہ ادا کرنے کے لیے مکہ مکرمہ روانہ ہوئے اور ہم نے عمرہ کی تکمیل سے پہلے احرام نہ اتارا' تو سوال یہ ہے کہ کیا جدہ میں کچھ دیر تک بحالت احرام بیٹھے رہنے کی وجہ سے کچھ لازم ہے؟ رہنمائی فرمائیں' جزاکم اللہ خیرًا۔

جواب جب امر واقع اسی طرح ہے جیسا کہ آپ نے ذکر کیا ہے تو آپ پر یا آپ کی والدہ پر جدہ میں بحالت احرام قیام کی وجہ سے کچھ لازم نہیں ہے کیونکہ محرم کیلئے یہ واجب نہیں ہے کہ وہ تسلسل کے ساتھ اپنے سفر کو جاری رکھے بلکہ اسے اس بات کی اجازت ہے کہ وہ راستہ میں آرام یا دیگر ضروریات کی وجہ [illegible] ام کے باوجود قیام بھی کر سکتا ہے۔ وفق اللہ الجمیع

——— شیخ ابن باز ———

احرام کا لباس

جو شخص احرام نہ پہن سکتا ہو

سوال ایک شخص رمضان میں عمرہ ادا کرنا چاہتا ہے لیکن وہ احرام نہیں پہن سکتا کیونکہ وہ معذور ہے اور اس کے ہاتھ شل ہیں تو کیا وہ اپنے معمول کے کپڑوں میں عمرہ ادا کر سکتا ہے؟ اور کیا (احرام نہ پہن سکنے کی وجہ سے) اسے کفارہ ادا کرنا ہو گا؟

جواب ہاں انسان جب لباس احرام نہ پہن سکتا ہو تو وہ کوئی دوسرا مناسب اور جائز لباس پہن لے اور اس صورت میں اہل علم کے نزدیک اس کے لیے یہ لازم ہے کہ ایک بکری ذبح کر کے فقرا میں تقسیم کر دے' یا نصف صاع فی مسکین کے حساب سے چھ مسکینوں کو کھانا کھلا دے یا تین روزے رکھے' سر منڈانے پر قیاس کرتے ہوئے اہل علم کا اس مسئلہ میں یہی قول ہے' چنانچہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ وَلَا تَحْلِقُوا۟ رُءُوسَكُمْ حَتَّىٰ يَبْلُغَ ٱلْهَدْىُ مَحِلَّهُۥ ۚ فَمَن كَانَ مِنكُم مَّرِيضًا أَوْ بِهِۦٓ أَذًى مِّن رَّأْسِهِۦ فَفِدْيَةٌ مِّن صِيَامٍ أَوْ صَدَقَةٍ أَوْ نُسُكٍ ۚ ﴾ (البقرة۲/ ۱۹۶)

"اور جب تک قربانی اپنے مقام پر نہ پہنچ جائے سر نہ منڈاؤ اور اگر کوئی تم میں بیمار ہو یا اس کے سر میں کسی طرح کی تکلیف ہو تو اگر وہ سر منڈا لے تو اس کے بدلے میں روزے رکھے یا صدقہ دے یا قربانی کرے۔"

اور نبی کریم ﷺ نے اس کی وضاحت فرمائی ہے کہ اس صورت میں تین روزے رکھنا ہے اور صدقہ چھ مسکینوں کو نصف صاع فی کس کے حساب سے کھانا کھلانا ہے اور قربانی ایک بکری ذبح کرنا ہے۔ [1]

——— شیخ ابن عثیمین ———

لباس احرام پر خوشبو لگانا

سوال نیت اور تلبیہ سے پہلے احرام کو خوشبو لگانے کے بارے میں کیا حکم ہے؟

جواب احرام کی چادروں کو خوشبو نہیں لگانی چاہیئے' سنت یہ ہے کہ خوشبو بدن مثلاً سر' داڑھی' بغلوں اور جسم کے باقی حصے پر لگائی جائے۔ احرام کے وقت لباس کو خوشبو نہ لگائی جائے کیونکہ احرام باندھنے والوں کیلئے نبی کریم ﷺ کا یہ حکم ہے:

---

[1] صحيح بخارى' المحصر' باب قول الله تعالى (فمن كان منكم مريضا...... الخ' حديث: 1814 و صحيح مسلم' الحج' باب جواز حلق الرأس للمحرم...... الخ' حديث: 1201

«لاَ يَلْبَسُوا مِنَ الثِّيَابِ مَسَّهُ زَعْفَرَانُ وَلاَ الْوَرْسُ»(صحيح البخاري، الحج، باب ما لا يلبس المحرم من الثياب، ح:١٥٤٢ وصحيح مسلم، الحج، باب ما يباح للمحرم بحج أو عمرة ... الخ، ح:١١٧٧ ومسند أحمد:٢/ ٥٩)

"تم کوئی ایسا کپڑا نہ پہنو جسے زعفران اور ورس لگا ہو۔" [1]

سنت یہ ہے کہ خوشبو صرف جسم پر لگائی جائے (احرام پر نہ لگائی جائے) اور اگر کسی نے احرام کو معطر کر لیا ہو تو اسے دھوئے بغیر نہ پہنے یا کوئی دوسرا احرام پہن لے۔

—— شیخ ابن باز ——

احرام کی چادر پہننے کی کیفیت

سوال کیا محرم کے لیے دونوں کندھے ڈھانپنا افضل ہے یا بحالت احرام ایک کندھا ننگا رکھنا افضل ہے؟

جواب سنت یہ ہے کہ محرم اوپر کی چادر کو دونوں کندھوں کے اوپر کر کے ان کے کناروں کو اپنے سینے کے اوپر کر لے' چنانچہ نبی اکرم ﷺ نے اسی طرح کیا تھا ہاں البتہ طواف قدوم کے موقع پر اپنی چادر کے وسط کو اپنی دائیں بغل کے نیچے سے نکال کر اس کے کناروں کو اپنے بائیں کندھے پر ڈال لے اور دائیں کندھے کو ننگا کر لے اور یہ صرف طواف قدوم یعنی حج یا عمرہ کے لیے مکہ مکرمہ میں آکر جو سب سے پہلا طواف کیا جاتا ہے' اس کے ساتھ خاص ہے' لہٰذا طواف قدوم سے فراغت کے بعد چادر کو درست کر کے اپنے دونوں کندھوں پر کر لے اور طواف کی دو رکعتیں پڑھے' جو شخص ہر وقت اپنے کندھے کو ننگا رکھتا ہے تو یہ خلاف سنت ہے' اسی طرح دونوں کندھوں کو ننگا رکھنا بھی خلاف سنت ہے۔

سنت یہ ہے کہ حالت احرام میں چادر کے ساتھ دونوں کندھوں کو چھپایا جائے' ہاں البتہ کوئی چادر اتار دے اور بیٹھتے یا کھانا کھاتے یا اپنے بھائیوں کے ساتھ باتیں کرتے ہوئے اس کے کندھے ننگے ہوں تو اس میں کوئی حرج نہیں لیکن سنت یہ ہے کہ جب چادر پہنے تو وہ اس کے کندھوں پر اور اس کے کنارے اس کے سینے پر ہوں۔

—— شیخ ابن باز ——

محرم کے لیے پیٹی یا تھیلی وغیرہ باندھنے کا حکم

سوال محرم حاجی کے لیے نقدی وغیرہ کی حفاظت کے لیے پیٹی یا تھیلی باندھنے کا کیا حکم ہے؟ کیا یہ جائز ہے یا اسے بھی سلا ہوا کپڑا سمجھ کر ناجائز قرار دیا جائے گا؟

جواب پیٹی یا تھیلی وغیرہ پہننے میں کوئی حرج نہیں' اسی طرح تہبند کو باندھنے یا نقدی کی حفاظت کے لیے رسی یا رومال وغیرہ استعمال کرنے میں بھی کوئی حرج نہیں۔ وباللہ التوفیق

—— شیخ ابن باز ——

---

[1] ورس' ایک قسم کی گھاس تل کے مانند ہے' جس سے رنگائی کا کام لیتے ہیں۔

لباس احرام کو تبدیل کرنا

 کیا دھونے کے لیے احرام کے لباس کو تبدیل کرنا جائز ہے؟

جواب لباس احرام کو دھونے میں کوئی حرج نہیں' اسی طرح احرام کو تبدیل کر کے اس کے بجائے دوسرا نیا یا دھلا ہوا احرام پہننے میں بھی کوئی حرج نہیں۔

——— شیخ ابن باز ———

حالت احرام میں جرابوں اور دستانوں کا استعمال

سوال حالت احرام میں جرابوں اور دستانوں کے استعمال کے بارے میں کیا حکم ہے؟ اور اس کی کیا دلیل ہے؟

جواب مرد کے لیے حالت احرام میں جرابوں اور موزوں کا استعمال جائز نہیں ہے' الا یہ کہ اس کے پاس جوتے نہ ہوں کیونکہ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا:

«مَنْ لَّمْ يَجِدِ النَّعْلَيْنِ فَلْيَلْبَسِ الْخُفَّيْنِ وَمَنْ لَمْ يَجِدْ إِزَارًا فَلْيَلْبَسِ السَّرَاوِيلَ»(صحيح البخاري، جزاء الصيد، باب لبس الخفين ... الخ، ح:١٨٤١ وصحيح مسلم، الحج، باب ما يباح للمحرم بحج أو عمرة ... الخ، ح:١١٧٩)

"جس شخص کے پاس جوتے نہ ہوں' وہ موزے پہن لے اور جس کے پاس تہبند نہ ہو وہ شلوار پہن لے۔"

ہاں البتہ عورت کے لیے حالت احرام میں بھی موزے اور جرابیں پہننے میں کوئی حرج نہیں کیونکہ اسکا سارا بدن پردہ ہے اور موزوں اور جرابوں کا استعمال اس کے لیے ستر پوشی کا موجب ہے اور اگر عورت اپنے کپڑوں کو اس قدر نیچے لٹکائے کہ جس سے اس کے پاؤں چھپ جائیں تو یہ بھی نماز اور غیر نماز دونوں حالتوں میں موزوں اور جرابوں کے بجائے کافی ہے۔ مرد اور عورت دونوں ہی کے لیے حالت احرام میں دستانوں کا استعمال جائز نہیں ہے کیونکہ نبی اکرم ﷺ نے محرم عورت کے بارے میں فرمایا ہے:

«لاَ تَنْتَقِبِ الْمُحْرِمَةُ وَلاَ تَلْبَسِ الْقُفَّازَيْنِ»(صحيح البخاري، جزاء الصيد، باب ما ينهى من الطيب ... الخ، ح:١٨٣٨)

"محرمہ عورت نقاب استعمال نہ کرے اور نہ دستانے پہنے۔"

جب عورت کے لیے دستانوں کا استعمال حالت احرام میں حرام ہے تو مرد کے لیے یہ بالاولیٰ حرام ہو گا' اسی وجہ سے نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اس شخص کے بارے میں فرمایا تھا' جو حالت احرام میں فوت ہو گیا تھا:

«اِغْسِلُوهُ بِمَاءٍ وَّسِدْرٍ، وَّكَفِّنُوهُ فِي ثَوْبَيْهِ، (وَلاَ تُحَنِّطُوهُ) وَلاَ تُخَمِّرُوا رَأْسَهُ وَلاَ وَجْهَهُ فَإِنَّهُ يُبْعَثُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ مُلَبِّيًا»(صحيح البخاري، جزاء الصيد، باب المحرم يموت بعرفة... الخ، ح:١٨٤٩ وصحيح مسلم، الحج، باب ما يفعل بالمحرم إذا مات، ح:١٢٠٦ واللفظ لمسلم)

"اسے پانی اور بیری کے پتوں کے ساتھ غسل دو' احرام کی دونوں چادروں میں کفن دو' اسے خوشبو نہ لگاؤ اور نہ اس کے سر اور چہرے کو ڈھانپو کیونکہ اسے روز قیامت لبیک کہتے ہوئے اٹھایا جائے گا۔"

عورت کو چاہیئے کہ وہ نقاب کے بجائے مردوں کی موجودگی میں اپنے چہرے کو دوپٹے سے چھپا لے جیسا کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے:

«كَانَ الرُّكْبَانُ يَمُرُّونَ بِنَا وَنَحْنُ مَعَ رَسُولِ اللهِ ﷺ مُحْرِمَاتٌ فَإِذَا حَاذُوا بِنَا سَدَلَتْ إِحْدَانَا جِلْبَابَهَا مِنْ رَأْسِهَا عَلَى وَجْهِهَا، فَإِذَا جَاوَزُونَا كَشَفْنَاهُ»(سنن أبي داود، المناسك، باب في المحرمة تغطي وجهها، ح:١٨٣٣ وسنن ابن ماجه:٢٩٣٥)

”قافلے گزرتے تھے‘ ہم رسول اللہ ﷺ کے ساتھ حالت احرام میں تھیں‘ جب قافلے ہمارے قریب آتے تو ہم سر سے دوپٹے کھینچ کر چہرے کو چھپا لیتیں اور جب وہ گزر جاتے تو ہم پھر چہرے کو ننگا کر لیا کرتی تھیں۔“

دارقطنی میں یہ روایت اسی طرح حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا سے بھی مروی ہے۔ [1]

—— شیخ ابن باز ——

عورت کے لیے حالت احرام میں جرابوں اور دستانوں کا استعمال

سوال عورت کے لیے حالت احرام میں جرابوں اور دستانوں کے استعمال کے بارے میں کیا حکم ہے؟ کیا عورت کے لیے احرام کے لباس کو اتارنا جائز ہے؟

جواب عورت کے لیے افضل یہ ہے کہ وہ جوتے اور جرابوں میں احرام باندھے کیونکہ یہ اس کے لیے افضل اور زیادہ ستر پوشی کا موجب ہے اور اگر معمول کے لباس میں ہو تو یہ بھی کافی ہے اگر عورت نے احرام کی حالت میں جرابوں کو پہنا ہو اور پھر انہیں اتار دے تو اس میں بھی کوئی حرج نہیں جیسا کہ کسی آدمی نے حالت احرام میں جوتے پہنے ہوں اور پھر جب چاہے انہیں اتار دے تو اس میں کوئی حرج نہیں‘ لیکن عورت کے لیے یہ جائز نہیں کہ وہ حالت احرام میں دستانے پہنے کیونکہ محرم عورت کے لیے دستانے پہننے اور چہرے پر نقاب ڈالنے کی ممانعت ہے‘ اسی طرح برقعہ وغیرہ استعمال کرنے کی بھی ممانعت ہے کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے اس سے منع فرمایا ہے۔ عورت کو چاہیئے کہ وہ غیر محرم مردوں کی موجودگی اور طواف و سعی کے وقت اپنے چہرے پر دوپٹے یا چادر کو لٹکا لے جیسا کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے:

«كَانَ الرُّكْبَانُ يَمُرُّونَ بِنَا وَنَحْنُ مَعَ رَسُولِ اللهِ ﷺ مُحْرِمَاتٌ فَإِذَا حَاذُوا بِنَا سَدَلَتْ إِحْدَانَا جِلْبَابَهَا مِنْ رَأْسِهَا عَلَى وَجْهِهَا، فَإِذَا جَاوَزُونَا كَشَفْنَاهُ»(سنن أبي داود، المناسك، باب في المحرمة تغطي وجهها، ح:١٨٣٣ وسنن ابن ماجه:٢٩٣٥)

”قافلے ہمارے پاس سے گزرتے تھے جب کہ ہم رسول اللہ ﷺ کے ہمراہ حالت احرام میں تھیں‘ قافلے جب ہمارے قریب آتے تو ہم سر سے دوپٹے کو کھینچ کر چہرے پر لٹکا لیتیں اور جب قافلے گزر جاتے تو ہم اپنے چہرے کو ننگا کر لیا کرتی تھیں۔“

مردوں کے لیے صحیح قول کے مطابق موزوں کا پہننا بھی جائز ہے خواہ وہ کٹے ہوئے نہ بھی ہوں جبکہ جمہور کی رائے یہ ہے کہ انہیں کاٹ لے لیکن صحیح بات یہ ہے کہ جب جوتے نہ ہوں تو موزوں کو کاٹنا لازم نہیں ہے کیونکہ

---

[1] سنن دارقطنی‘ 294/2‘ ح:2738

نبی اکرم ﷺ نے لوگوں کو عرفہ میں خطبہ دیتے ہوئے ارشاد فرمایا تھا:

«مَنْ لَّمْ يَجِدِ النَّعْلَيْنِ فَلْيَلْبَسِ الْخُفَّيْنِ، وَمَنْ لَّمْ يَجِدْ إِزَارًا فَلْيَلْبَسِ السَّرَاوِيلَ»(صحيح البخاري، جزاء الصيد، باب لبس الخفين ... الخ، ح:١٨٤١ وصحيح مسلم، الحج، باب ما يباح للمحرم بحج أو عمرة ... الخ، ح:١١٧٨)

"جس کے پاس جوتے نہ ہوں تو وہ موزے پہن لے اور جس کے پاس تہبند نہ ہو تو وہ شلوار پہن لے۔"

اس حدیث میں آپ نے موزوں کے کاٹنے کا حکم نہیں دیا تو اس سے معلوم ہوا کہ کاٹنے کا حکم منسوخ ہے۔

——— شیخ ابن باز ———

عورت کا حالت احرام میں جرابیں پہننا

سوال میں حالت احرام میں سیاہ رنگ کی جرابیں پہنتی ہوں تاکہ میرے پاؤں چھپ جائیں اور پھر انہیں جرابوں کے ساتھ میں طواف کرتی اور نماز پڑھتی ہوں' لیکن مجھ سے کہا گیا ہے کہ اس سے احرام باطل اور دم لازم ہو جاتا ہے' لہٰذا آنجناب سے گزارش ہے کہ آپ میری رہنمائی فرمائیں کہ حالت احرام' طواف اور نماز میں ان جرابوں کے استعمال کے بارے میں کیا حکم ہے؟ جزاکم اللہ خیرًا۔

جواب یہ ایک نہایت پسندیدہ اور قابل ستائش عمل ہے کیونکہ اس میں ستر پوشی بھی ہے اور اسباب فتنہ سے دوری بھی' جس شخص نے آپ سے کہا ہے کہ اس (جرابیں پہننے) کی وجہ سے آپ پر دم ہے تو اس کی یہ بات غلط ہے کیونکہ محرم عورت کے لیے صرف دستانے پہننے کی ممانعت ہے' عورت کے لیے پاؤں میں جرابیں پہننے کی ممانعت نہیں ہے بلکہ اسے طواف کرتے اور نماز پڑھتے ہوئے جرابیں ضرور استعمال کرنا چاہیئے اور اگر وہ احتیاط کے ساتھ کشادہ لباس پہن کر طواف اور نماز میں اپنے پاؤں کو چھپا لے تو پھر بھی کوئی حرج نہیں۔ جرابوں کے لیے کالے رنگ کا ہونا شرط نہیں بلکہ کسی بھی رنگ کی جرابیں استعمال کرنا جائز ہے بشرطیکہ ان سے پاؤں چھپ جائیں۔ اللہ تعالیٰ سب کو حق پر چلنے کی توفیق عطا فرمائے۔

انه سميع مجيب۔

——— شیخ ابن باز ———

عورت جن کپڑوں میں چاہے احرام باندھ سکتی ہے

سوال کیا عورت کے لیے یہ جائز ہے کہ وہ جن کپڑوں میں چاہے احرام باندھ لے؟

جواب ہاں عورت کے لیے یہ جائز ہے کہ وہ جن کپڑوں میں چاہے احرام باندھ لے اس کے احرام کے لیے کوئی مخصوص لباس نہیں ہے جیسا کہ بعض عامۃ الناس کا یہ خیال ہے لیکن افضل یہ ہے کہ احرام کا لباس خوب صورت اور جاذب نظر نہ ہو کیونکہ ایام حج میں عورتوں کا مردوں کے ساتھ بھی میل جول ہو جاتا ہے' لہٰذا عورتوں کے لیے افضل یہ ہے کہ ان کا لباس خوب صورت اور جاذب نظر نہ ہو بلکہ عام سادہ لباس ہو جو فتنہ انگیز نہ ہو۔

مردوں کے لیے افضل یہ ہے کہ وہ سفید کپڑے احرام کے لیے استعمال کریں' اگر سفید کے علاوہ کسی اور رنگ کے کپڑے ہوں تو بھی کوئی حرج نہیں کیونکہ حدیث سے ثابت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے سبز رنگ کی چادر زیب تن فرما کر طواف کیا تھا' [1] اسی طرح آپ نے کالے رنگ کا عمامہ بھی استعمال فرمایا تھا [2] حاصل کلام یہ ہے کہ اس میں کوئی حرج نہیں کہ محرم سفید کے علاوہ کسی اور رنگ کے احرام کو استعمال کرے۔

——— شیخ ابن باز ———

ممنوعاتِ احرام

سوال وہ کون سی اشیاء ہیں جن سے محرم کے لیے اجتناب کرنا واجب ہے؟

جواب محرم کے لیے ان نو اشیاء سے اجتناب کرنا واجب ہے جو علماء نے بیان فرمائی ہیں اور وہ یہ ہیں:

(۱) بالوں کو کاٹنا۔ (۲) ناخنوں کو کاٹنا۔ (۳) خوشبو استعمال کرنا۔ (۴) سلے ہوئے کپڑے پہننا۔ (۵) سر کو ڈھانپنا۔ (۶) شکار کرنا۔ (۷) بیوی سے صحبت کرنا۔ (۸) نکاح کرنا اور (۹) عورتوں سے مباشرت کرنا۔ (یہاں مباشرت سے مراد صحبت کے علاوہ دیگر امور مثلاً بوسہ وغیرہ ہیں۔)

ان تمام اشیاء سے محرم کو حلال ہونے تک اجتناب کرنا چاہیئے' تحلل اول میں جماع کے سوا دیگر سب امور حلال ہو جاتے ہیں۔ اور جب تحلل ثانی بھی مکمل ہو جائے تو پھر جماع کرنا بھی حلال ہو جاتا ہے۔

——— شیخ ابن باز ———

ممنوعات احرام اور ان کی اقسام

سوال ممنوعات احرام اور ان کی اقسام کون کون سی ہیں؟

جواب ممنوعات احرام نو ہیں:

(۱) سر یا جسم کے بال مونڈنا۔ (۲) ہاتھ اور پاؤں کے ناخن کاٹنا۔ (۳) مرد کے لیے سلے ہوئے کپڑے پہننا۔ مثلاً قمیص' شلوار' نیکر (جانگیا)' جبہ' بنیان' قباء (شیروانی) اور چوغہ وغیرہ۔ (۴) سر کو چپکنے والی چیزوں مثلاً عمامہ اور ٹوپی وغیرہ کے ساتھ ڈھانپنا لیکن سر پر چھتری یا خیمہ ہو یا سامان وغیرہ اٹھایا ہو تو اس میں کوئی حرج نہیں۔ (۵) خوشبو کا استعمال' اس سے مراد ہر وہ چیز ہے جس کی بو عطر بیز ہو مثلاً کستوری' گلاب' پھول اور دیگر تمام عطریات کہ ان کو جسم یا لباس میں استعمال کیا جاتا ہو' (۶) خشکی کے جانوروں کا شکار کرنا مثلاً کبوتر' سرخاب' چکور' چڑیا وغیرہ یا ہرن' پہاڑی بکرا' نیل گائے' سانڈا' یربوع اور وبر وغیرہ۔ (۷) محرم کے لیے منگنی کرنا' نکاح کرنا یا کسی نکاح میں ولی بننا جائز نہیں ہے۔ (۸) بیوی یا لونڈی کے ساتھ صحبت کرنا۔ (۹) صحبت کے علاوہ دیگر امور مثلاً شہوت سے بوسہ لینا یا گلے لگانا وغیرہ حرام ہیں۔

---

[1] سنن ابی داود' المناسک' باب الاضطباع فی الطواف' حدیث: 1883 و جامع ترمذی' حدیث: 859۔

[2] صحیح مسلم' الحج' باب جواز دخول مكة بغير احرام' حدیث: 1358 ۔ 1359

ان میں سے پہلی پانچ اشیاء میں سے اگر کسی کا ارتکاب کر لیا جائے تو فدیہ لازم ہے' البتہ اس سے حج باطل نہیں ہو گا' شکار وغیرہ کی صورت میں اس طرح کے جانور کو ذبح کرنا ہو گا' نکاح وغیرہ کی صورت میں فدیہ تو نہیں ہے لیکن اس سے حج باطل ہو جائے گا اور مباشرت وغیرہ کی صورت میں حج تو باطل نہ ہو گا البتہ دم دینا لازم ہو گا۔

——— شیخ ابن جبرین ———

جہالت کی وجہ سے کسی ممنوع کام کا ارتکاب کرنا

سوال جو شخص جہالت یا نسیان کی وجہ سے ان نو قسم کے ممنوعات میں سے کسی ایک کا ارتکاب کرے تو اس کے بارے میں کیا حکم ہے؟

جواب جو شخص بھول کر بال یا ناخن کاٹ لے تو اس میں کوئی گناہ ہے نہ فدیہ' اسی طرح جو شخص بھول کر خوشبو لگا لے یا سر ڈھانپ لے یا سلا ہوا کپڑا پہن لے تو اسے بھی اللہ تعالیٰ نے معاف فرما دیا ہے' کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کی یہ دعا قبول فرمائی ہے:

﴿ رَبَّنَا لَا تُؤَاخِذْنَآ إِن نَّسِينَآ أَوْ أَخْطَأْنَا ﴾ (البقرة٢/ ٢٨٦)

"اے ہمارے رب! اگر ہم سے بھول یا چوک ہو گئی ہو تو ہم سے مؤاخذہ نہ کرنا۔"

اور صحیح مسلم میں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس دعا کو قبول فرمالیا۔ [1]

نیز ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ وَلَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ فِيمَآ أَخْطَأْتُم بِهِۦ وَلَٰكِن مَّا تَعَمَّدَتْ قُلُوبُكُمْ ﴾ (الأحزاب٣٣/ ٥)

"اور جو بات تم سے غلطی سے ہو گئی اس میں تم پر کچھ گناہ نہیں لیکن جو قصد سے کرو اس پر مواخذہ ہے۔"

اور حدیث میں ہے

«إِنَّ اللهَ وَضَعَ عَنْ أُمَّتِي الْخَطَأَ وَالنِّسْيَانَ» (سنن ابن ماجه، الطلاق، باب طلاق المكره والناسي، ح: ٢٠٤٥)

"بلاشبہ اللہ تعالیٰ نے میری امت کے خطا و نسیان کو معاف کر دیا ہے۔"

شکار کے بارے میں جمہور کا فیصلہ یہ ہے کہ اسے اس کی مثل جانور ذبح کرنا ہو گا اور شکار کرنے والے سے یہ تفصیل نہیں پوچھتے کہ اس نے جان بوجھ کر شکار کیا ہے یا غلطی سے لیکن اس مسئلہ میں بھی شاید صحیح بات یہی ہے کہ جو شخص بھول کر یا ازراہ جہالت شکار کرے تو اس پر نہ کوئی گناہ ہے اور نہ فدیہ لازم کیونکہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ وَمَن قَتَلَهُۥ مِنكُم مُّتَعَمِّدًا ﴾ (المائدة: ٥/ ٩٥)

"اور جو تم میں سے جان بوجھ کر اسے مارے۔"

محرم کا نکاح کرنا صحیح نہیں ہو گا' خواہ وہ جہالت کی وجہ سے کر رہا ہو لیکن اس میں کوئی فدیہ نہیں ہے۔ صحبت اور مباشرت میں جمہور کے نزدیک فدیہ ہے خواہ اس نے بھول کر ہی یہ کام کیا ہو کیونکہ اس کا تعلق دو شخصوں سے ہے اور یہ

---

[1] صحیح مسلم' الایمان' باب بیان تجاوز اللہ تعالیٰ عن حدیث النفس الخ' حدیث: 126

بات بعید ہے کہ دونوں ہی بھول جائیں اور احتیاط بھی اسی میں ہے کہ اس کا فدیہ ادا کیا جائے' اگرچہ بعض علماء نے جہالت و نسیان کی وجہ سے اس مسئلہ میں بھی محرم کو معذور قرار دیا ہے۔ واللہ اعلم

——— شیخ ابن جبرین ———

احرام باندھنے سے قبل کچھ بال کاٹنا

سوال میری بیوی نے عمرے کا احرام باندھا لیکن اس نے حمام سے باہر نکلنے اور لباس احرام پہننے سے پہلے کچھ بال کاٹ دیے تو کیا اس صورت میں اس پر کچھ واجب ہے؟

جواب اس میں کوئی حرج یا فدیہ وغیرہ نہیں کیونکہ بالوں کو کاٹنا نیت احرام منعقد ہونے کے بعد منع ہے لیکن اس صورت میں مذکورہ عورت کی نہ ابھی تک نیت منعقد تھی اور نہ اس نے ابھی تک لباس احرام ہی پہنا تھا' لہٰذا اس میں کوئی حرج نہیں' اگر احرام شروع کرنے کے بعد ازراہ جہالت و نسیان ایسا کرتی تو پھر بھی کوئی فدیہ لازم نہ تھا کیونکہ جہالت کی وجہ سے وہ معذور تصور ہو گی۔ واللہ اعلم۔

——— شیخ ابن جبرین ———

جہالت کی وجہ سے احرام کے بعد بال کاٹنا

سوال ایک شخص نے عمرے کا احرام باندھا' احرام کے بعد اسے یاد آیا کہ اس کے لیے بغل کے بالوں کو صاف کرنا واجب ہے' لہٰذا اس نے انہیں صاف کر دیا اور پھر عمرہ کے لیے چل پڑا' تو وضاحت فرمائیں کہ اس کے بارے میں کیا حکم ہے؟ اللہ تعالیٰ آپ کو اجروثواب سے نوازے گا؟

جواب احرام میں بغل کے بالوں کو کاٹنا یا اکھاڑنا واجب نہیں ہے' بلکہ مستحب یہ ہے کہ احرام سے پہلے انہیں اکھاڑ دیا جائے یا کسی پاک چیز سے صاف کر دیا جائے اسی طرح مونچھوں کو کاٹنا' ناخنوں کو تراشنا اور زیر ناف بالوں کو احرام سے پہلے صاف کرنا بھی مستحب ہے بشرطیکہ اس کی ضرورت ہو' نیز یاد رہے کہ احرام کے وقت یہ امور لازم نہیں ہیں بلکہ اگر احرام سے پہلے گھر یا راستہ میں کسی جگہ انہیں سرانجام دے لے تو پھر بھی ٹھیک ہے۔

حکم شریعت سے ناواقفیت کی وجہ سے مذکورہ بالا شخص نے احرام کے بعد جو بغل کے بالوں کو صاف کر لیا تو اس میں کوئی فدیہ وغیرہ نہیں ہے' اسی طرح احرام کے بعد اگر محرم ممنوعات میں سے کسی کا ارتکاب کرے تو کوئی فدیہ نہیں کیونکہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ رَبَّنَا لَا تُؤَاخِذْنَآ إِن نَّسِينَآ أَوْ أَخْطَأْنَا ﴾ (البقرة۲/ ۲۸٦)

"اے ہمارے رب! اگر ہم سے بھول یا چوک ہو گئی ہو تو ہم سے مؤاخذہ نہ کرنا۔"

اور حدیث سے ثابت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ بے شک اللہ سبحانہ و تعالیٰ نے اپنے بندوں کی اس دعا کو شرف قبولیت سے نواز رکھا ہے۔[1]

[1] صحیح مسلم' الایمان' باب بیان تجاوز اللہ تعالیٰ عن حدیث النفس...... الخ' حدیث: 126

——— شیخ ابن باز ———

محرم کے سر کے بالوں کا گرنا

سوال اگر محرم عورت کے سر کے بال ازخود گر جائیں تو اس کے بارے میں کیا حکم ہے؟

جواب اگر محرم کے سر کے بال خواہ وہ مرد ہو یا عورت' وضو میں سر کا مسح کرتے ہوئے یا غسل کرتے ہوئے گر جائیں تو یہ نقصان دہ نہیں' اسی طرح اگر مرد کی داڑھی یا مونچھوں کے بال گر جائیں یا ناخن وغیرہ ٹوٹ جائیں تو بھی کوئی حرج نہیں بشرطیکہ جان بوجھ کر ایسا نہ کرے۔ ہاں البتہ ممانعت اس بات کی ہے کہ محرم جان بوجھ کر بال یا ناخن کاٹے عورت کو بھی جان بوجھ کر بال یا ناخن وغیرہ نہیں کاٹنے چاہئیں لیکن جو بال وغیرہ ازخود گر جائیں تو یہ مردہ بال ہوتے ہیں جو حرکت وغیرہ سے گر جاتے ہیں اور ان کا گرنا نقصان دہ نہیں ہے۔ واللہ اعلم۔

——— فتویٰ کمیٹی ———

ان شاء اللہ آپ پر کوئی فدیہ نہیں

سوال میں نے دو سال پہلے فریضۂ حج ادا کیا اور یہ میرا پہلا حج تھا' عرفہ کے عظیم دن میں اللہ رب ذوالجلال کے حضور دعا میں مصروف تھا تو میری آنکھیں اشکبار تھیں اور جب دعا سے فراغت کے بعد میں نے اپنے آنسوؤں سے تر چہرے پر ہاتھ پھیرا تو میرے ہاتھوں میں آنکھوں کی پلکوں کے دو بال آ گئے' یہ بال قصد و ارادہ سے نہیں توڑے تھے (بلکہ یہ ازخود گر گئے تھے) تو کیا اس کے لیے کوئی فدیہ وغیرہ لازم ہے؟

جواب اللہ تعالیٰ ہمارے اور آپ کے عمل کو قبول فرمائے' آپ کو اجر بے پایاں سے نوازے اور آپ کے اس شوق' خشوع اور عمل کا ثواب عطا فرمائے جسے آپ نے اللہ تعالیٰ کی رضا کے حصول کے لیے سرانجام دیا ہے۔ آپ نے آنکھوں کی پلکوں کے بالوں کے گرنے کا جو ذکر کیا ہے تو اس کا ان شاء اللہ کوئی فدیہ نہیں ہے کیونکہ آپ نے قصد و ارادہ سے ان بالوں کو نہیں کاٹا' خطاء و نسیان کو اللہ تعالیٰ نے معاف فرما دیا ہے۔ وفقک اللہ۔

——— شیخ ابن جبرین ———

نسیان پر مؤاخذہ نہیں

سوال ایک مسلمان نے عمرے کا احرام باندھا اس کی عادت یہ ہے کہ وہ سوچ بچار کے وقت اپنے بالوں میں ہاتھ پھیرتا رہتا ہے' بھول کر حالت احرام میں بھی اس نے جب ایسا ہی کیا تو اس کے کئی بال گر گئے تو کیا اس صورت میں کوئی کفارہ ہو گا؟

جواب اس پر کوئی کفارہ نہیں کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے مومن بندوں کے بارے میں فرمایا ہے کہ وہ دعا یہ کرتے ہیں:

﴿ رَبَّنَا لَا تُؤَاخِذْنَآ إِن نَّسِينَآ أَوْ أَخْطَأْنَا ﴾ (البقرۃ۲/ ۲۸۶)

"اے ہمارے رب! اگر ہم سے بھول یا چوک ہو گئی ہو تو ہم سے مؤاخذہ نہ کرنا۔"

اور اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کی اس دعا کو شرف قبولیت سے نواز دیا ہے صحیح حدیث میں ہے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ اللہ سبحانہ و تعالیٰ نے اس دعا کے جواب میں فرمایا:

«قَدْ فَعَلْتُ»(صحیح مسلم، الإیمان، باب بیان تجاوز الله تعالی عن حدیث النفس ... الخ، ح:١٢٦)

"میں نے یہ کر دیا۔" (یعنی میں مؤاخذہ نہیں کروں گا۔)

——— شیخ ابن باز ———

سلے ہوئے کپڑے کی حد بندی اور احرام کے نیچے شلوار

سوال سلے ہوئے لباس کی حد بندی کیا ہے؟ کیا آج کل استعمال ہونے والی شلواریں احرام کے نیچے استعمال کی جا سکتی ہیں؟

جواب جس شخص نے حج یا عمرہ کا احرام باندھا ہو اس کے لیے شلوار وغیرہ یا کوئی اور سلا ہوا کپڑا پہننا جائز نہیں ہے' نہ سارے بدن پر اور نہ اوپر کے حصہ پر بنیان وغیرہ اور نہ نچلے حصہ پر شلوار وغیرہ پہننا جائز ہے کیونکہ نبی کریم ﷺ سے جب یہ پوچھا گیا کہ محرم کیا لباس پہنے تو آپ نے فرمایا:

«لاَ يَلْبَسُ الْقُمُصَ، وَلاَ الْعَمَائِمَ، وَلاَ السَّرَاوِيلاَتِ، وَلاَ الْبَرَانِسَ، وَلاَ الْخِفَافَ إِلاَّ أَحَدٌ لاَّ يَجِدُ نَعْلَيْنِ فَلْيَلْبَسْ خُفَّيْنِ، وَلْيَقْطَعْهُمَا أَسْفَلَ مِنَ الْكَعْبَيْنِ»(صحیح البخاري، الحج، باب ما لا یلبس المحرم من الثیاب، ح:١٥٤٢ وصحیح مسلم، الحج، باب ما یباح للمحرم بحج أو عمرة ... الخ، ح:١١٧٧)

"کہ وہ قمیصیں' عمامے' شلواریں' ٹوپیاں اور موزے نہ پہنے' اگر کسی کو جوتے نہ ملیں تو وہ موزے پہن لے اور انہیں ٹخنوں کے نیچے سے کاٹ لے۔"

اس سے سائل کو یقیناً معلوم ہو گیا ہو گا کہ وہ کون سا سلا ہوا لباس ہے' جو محرم کے لیے استعمال کرنا ممنوع ہے۔

مذکورہ حدیث سے یہ بات واضح ہوئی کہ سلے ہوئے لباس سے مراد وہ لباس ہے جو سارے بدن کی پیمائش کے مطابق سلا یا بنا گیا ہو جیسے کہ قمیص یا اوپر کے نصف حصہ کے لیے بنایا گیا ہو جیسے بنیان وغیرہ یا نچلے حصہ کے لیے مثلاً شلوار وغیرہ اور اس کا بھی وہی حکم ہے جو صرف ہاتھ کے لیے بنایا گیا ہو مثلاً دستانے یا پاؤں کے لیے بنایا گیا ہو مثلاً موزے۔ ہاں البتہ جوتے نہ ہونے کی صورت میں موزے استعمال کرنے کی اجازت ہے اور صحیح قول کے مطابق موزوں کا کاٹنا بھی لازم نہیں ہے کیونکہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی روایت سے یہ ثابت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے لوگوں کو عرفات میں خطبہ دیتے ہوئے فرمایا:

«مَنْ لَّمْ يَجِدِ النَّعْلَيْنِ فَلْيَلْبَسِ الْخُفَّيْنِ وَمَنْ لَّمْ يَجِدْ إِزَارًا فَلْيَلْبَسِ السَّرَاوِيلَ» (صحیح البخاري، جزاء الصید، باب لبس الخفین ... الخ، ح:١٨٤١ وصحیح مسلم، الحج، باب ما یباح للمحرم بحج أو عمرة ... الخ، ح:١١٧٨)

"جسے جوتے نہ ملیں' وہ موزے پہن لے اور جسے تہبند نہ ملے' وہ شلوار پہن لے۔"

تو اس حدیث میں موزوں کے کاٹنے کا ذکر نہیں ہے جس سے معلوم ہوا کہ انہیں ٹخنوں کے نیچے سے کاٹنا واجب نہیں ہے اور پہلی حدیث میں جو کاٹنے کا ذکر ہے تو وہ اس حدیث ابن عباس رضی اللہ عنہ کے پیش نظر منسوخ ہے۔ یہ مسائل مرد کے حوالے سے ہیں' جہاں تک حج یا عمرے کا احرام باندھنے والی عورت کا تعلق ہے تو اس کے لیے شلوار اور موزے وغیرہ پہننا مطلقاً جائز ہے لیکن اس کے لیے نقاب اور دستانوں کے استعمال کی ممانعت ہے کیونکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے منع فرمایا ہے [1] جیسا کہ حدیث ابن عمر رضی اللہ عنہما میں مذکور ہے لیکن اجنبی مردوں کے سامنے اسے اپنے چہرے اور ہاتھوں کو نقاب اور دستانوں کے سوا کسی اور چیز مثلاً دوپٹے وغیرہ سے چھپا لینا چاہیئے۔ واللہ ولی التوفیق۔

——— شیخ ابن باز ———

جہالت کی وجہ سے شلوار میں احرام باندھ لیا

سوال ایک سال پہلے میں عمرہ کے لیے گیا تو مجھے بعض شرائط کے بارے میں علم نہ تھا' میں نے جب میقات سے احرام باندھا تو جہالت کی وجہ سے احرام کے نیچے نیکر بھی پہن لی' جب میں عمرہ سے واپس آیا تو بعض لوگوں نے بتایا کہ یہ جائز نہیں اور جب مجھے یہ معلوم ہوا کہ سلا ہوا لباس جائز نہ تھا تو میں نے اس سال پھر عمرہ ادا کر لیا ہے' تو پہلے جو میں نے حالت احرام میں سلا ہوا کپڑا پہن لیا تھا تو کیا اس کی وجہ سے مجھ پر کچھ لازم ہے؟

جواب آپ پر کچھ لازم نہیں کیونکہ آپ کو شرعی حکم کا علم نہ تھا' اس ممنوع کام کے ارتکاب میں جہالت کی وجہ سے آپ معذور ہیں' فدیہ اس شخص کے لیے ہے جو ایسا کام جانتے ہوئے اور قصدوارادہ سے کرے' آپ کے لیے عمرے کا اعادہ بھی لازم نہیں ہے کیونکہ آپ نے کوئی ایسا کام نہیں کیا جس سے عمرہ فاسد ہو گیا ہو' لہٰذا آپ کا دوسرا عمرہ نفل شمار ہو گا۔

——— شیخ ابن جبرین ———

جان بوجھ کر شلوار میں احرام باندھ لیا

سوال میقات کے پاس میں نے حج تمتع کی نیت سے عمرے کا احرام باندھ لیا لیکن شدت حیا کی وجہ سے شلوار نہ اتاری' اور اسی احرام میں جس میں میں نے نیچے شلوار بھی پہنی ہوئی' عمرہ ادا کر لیا اور جب حج کے لیے احرام باندھا تو مجھے معلوم ہوا کہ اس وقت شلوار پہننا میری غلطی ہے' لہٰذا حج ادا کرنے کے لیے میں نے دوران احرام ہی شلوار اتار دی۔ اب سوال یہ ہے کہ عمرہ ادا کرتے ہوئے شلوار نہ اتارنے کی وجہ سے کیا مجھ پر کچھ لازم ہے جبکہ حج ادا کرتے ہوئے میں نے اسے اتار دیا تھا۔ مجھے علم تھا کہ سلا ہوا کپڑا پہننے سے احرام باطل ہو جاتا ہے لیکن جیسا کہ میں نے ذکر کیا کہ شدت حیا کی وجہ سے میں نے ایسا کیا تھا اور یہ میرا پہلی بار حج و عمرہ تھا اور اب اس کو کئی سال ہو گئے ہیں' امید ہے راہنمائی فرمائیں گے کہ مجھے کیا کرنا چاہیئے؟

---

[1] صحیح بخاری' جزاء الصید' باب ماینھی من الطیب للمحرم والمحرمۃ' حدیث: 1838

جواب جان بوجھ کر اس لباس کو برقرار رکھنے کی وجہ سے آپ پر فدیہ واجب ہے' لیکن یاد رہے کہ یہ ممنوعات احرام میں سے ہے۔ اس سے احرام باطل نہیں ہوتا۔ اور فدیہ یہ ہے کہ تین روزے رکھے جائیں یا چھ مسکینوں کو کھانا کھلا دیا جائے یا ایک بکری ذبح کر دی جائے' ان میں سے جو فدیہ بھی ادا کریں وہ صحیح ہے' لیکن ضروری ہے کہ بکری کا گوشت یا کھانا مکہ مکرمہ میں حرم کے مسکینوں میں تقسیم کیا جائے' جب کہ روزہ ہر جگہ رکھنا صحیح ہے۔ تاخیر کی وجہ سے آپ کے لیے اس کے علاوہ اور کچھ لازم نہیں' ہاں البتہ اس قدر طویل مدت میں اس مسئلہ کے بارے میں سوال نہ پوچھ کر آپ نے بہت کوتاہی کی ہے۔

——— شیخ ابن جبرین ———

معمول کے کپڑوں میں احرام

سوال میں نے اس سال رمضان کے آغاز میں عمرہ ادا کیا' پندرہ دن قیام کیا' اور میں نے عمرہ اپنے کپڑوں ہی میں کیا۔ جب حرم میں پہنچا تو میں نے تحیۃ المسجد کی نیت سے دو رکعتیں پڑھیں' بیت اللہ کے گرد سات چکر لگائے اور اس کے بعد مقام ابراہیم پر دو رکعتیں پڑھیں' پھر سعی کے سات چکر لگائے اور اس کے بعد میں نے بال کٹوا دیئے تو کیا میرا یہ فعل صحیح ہے؟

جواب آپ نے اپنے سوال میں عمرہ کے حوالے سے جو ذکر کیا ہے' آپ پر یہی واجب تھا' اس کے علاوہ اور کچھ واجب نہیں تھا بشرطیکہ آپ نے میقات سے احرام باندھا ہو' ہاں البتہ آپ نے مسجد حرام میں داخل ہو کر طواف سے پہلے تحیۃ المسجد کی جو دو رکعتیں پڑھیں تو یہ خلاف سنت ہے کیونکہ مسجد حرام میں داخل ہونے والے خصوصاً محرم کے لیے سنت یہ ہے کہ اگر ممکن ہو تو وہ طواف سے آغاز کرے۔ آپ نے جو یہ ذکر کیا ہے کہ آپ نے اپنے کپڑوں ہی میں احرام باندھ لیا تھا' اگر اس سے آپ کی مراد احرام کے دو کپڑے یعنی چادر اور تہبند ہیں' جنہیں آپ اس عمرہ سے پہلے عمرہ میں بھی استعمال کر چکے تو حج اور عمرہ میں ان کے بار بار استعمال کرنے میں کوئی حرج نہیں' انہیں کسی اور کو استعمال کے لیے دینے میں بھی کوئی حرج نہیں۔ اور اگر آپ کی مراد یہ ہے کہ احرام کی مخصوص چادروں کے بجائے آپ نے معمول کے کپڑوں ہی کو بطور احرام استعمال کر لیا تو یہ آپ کی غلطی ہے اس طرح آپ نے ممنوعات احرام میں سے دو کاموں کا ارتکاب کیا اور وہ ہے سلے ہوئے کپڑوں کو پہننا اور سر کو ڈھانپنا' اگر آپ کو اس کا علم تھا کہ یہ کام احرام میں ممنوع ہیں تو ان کی وجہ سے آپ پر دو فدیے لازم ہیں' ان میں سے ہر فدیے کے طور پر یا تو ایسی بکری ذبح کی جائے جس کی قربانی جائز ہے یا چھ مسکینوں کو نصف صاع فی کس کے حساب سے کھجور یا آپ کے شہر میں جس خوراک کا معمول ہو' وہ دے دی جائے یا تین روزے رکھ لیے جائیں' دونوں بکریوں اور کھانے کو مکہ کے مسکینوں میں تقسیم کر دیا جائے اور اس میں سے نہ خود کچھ کھایا جائے اور نہ کسی کو ہدیہ دیا جائے' روزے ہر جگہ اور ہر وقت رکھے جا سکتے ہیں اور اگر آپ کو حکم شریعت کا علم نہ تھا یا آپ نے بھول کر ایسا کیا تو پھر آپ پر کوئی فدیہ لازم نہیں ہے' ہاں البتہ دونوں حالتوں میں توبہ و استغفار لازم ہے' نیز یہ کہ عزم صمیم کیا جائے کہ آئندہ یہ کام نہیں کیا جائے گا جو احرام کے تقاضوں کے منافی ہے۔ وباللّٰہ التوفیق وصلی اللّٰہ علی نبینا محمد۔

——— فتویٰ کمیٹی ———

محرم کا جوتے یا جرابیں پہننا

سوال اگر محرم مرد یا عورت جوتے یا جرابیں جہالت کی وجہ سے یا جانتے ہوئے یا بھول کر پہن لے تو کیا اس سے احرام باطل ہو جائے گا؟

جواب مرد کے لیے سنت یہ ہے کہ وہ حالت احرام میں جوتے استعمال کرے کیونکہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا ہے:

«لِيُحْرِمْ أَحَدُكُمْ فِي إِزَارٍ وَّرِدَاءٍ وَّنَعْلَيْنِ» (تلخيص الحبير: ٢/ ٢٣٧)

"محرم کو چاہیئے کہ وہ چادر' تہبند اور جوتوں میں احرام باندھے۔"

لہٰذا افضل یہ ہے کہ احرام میں جوتے استعمال کئے جائیں تاکہ محرم کانٹوں' گرمی اور سردی وغیرہ سے بچ سکے' اگر کوئی احرام میں جوتے استعمال نہ کرے تو پھر بھی کوئی حرج نہیں' اگر کسی کے پاس جوتے نہ ہوں تو وہ موزے بھی استعمال کر سکتا ہے لیکن اس مسئلہ میں اہل علم میں اختلاف ہے کہ وہ ان کو کاٹے یا نہ کاٹے؟ آنحضرت ﷺ سے یہ ثابت ہے کہ آپ نے فرمایا:

«مَنْ لَّمْ يَجِدْ نَعْلَيْنِ فَلْيَلْبَسِ الْخُفَّيْنِ، وَلْيَقْطَعْهُمَا أَسْفَلَ مِنَ الْكَعْبَيْنِ» (صحيح البخاري، جزاء الصيد، باب لبس الخفين ... الخ، ح:١٨٤٢ وصحيح مسلم، الحج، باب ما يباح للمحرم بحج أو عمرة ... الخ، ح:١١٧٧)

"جو شخص جوتے نہ پائے تو وہ موزے پہن لے اور انہیں دونوں ٹخنوں کے نیچے سے کاٹ لے۔"

لیکن یہ بھی حدیث سے ثابت ہے کہ حجۃ الوداع کے موقع پر عرفات میں خطبہ ارشاد فرماتے ہوئے آپ نے حکم دیا کہ جس کے پاس جوتے نہ ہوں' وہ موزے پہن لے اور اس موقع پر آپ نے انہیں کاٹنے کا حکم نہیں دیا' اس وجہ سے اس مسئلہ میں اختلاف ہے۔ بعض علماء کی رائے یہ ہے کہ پہلا حکم منسوخ ہے' لہٰذا محرم موزوں کو کاٹنے کے بغیر استعمال کر سکتا ہے جبکہ بعض دیگر علماء کا یہ کہنا ہے کہ پہلا حکم منسوخ تو نہیں ہے لیکن کاٹنا واجب نہیں بلکہ مستحب ہے' کیونکہ عرفات میں آپ نے اس سے سکوت فرمایا۔ زیادہ راجح بات ان شاء اللہ یہ ہے کہ کاٹنے کا حکم منسوخ ہے کیونکہ نبی کریم ﷺ نے جب عرفات میں خطبہ ارشاد فرمایا تو اس میں دیہاتی اور شہری علاقوں کے لوگوں کا ایک جم غفیر موجود تھا جو کہ مدینہ میں اس وقت موجود نہ تھا جب آپ نے انہیں کاٹنے کا حکم دیا تھا۔ لہٰذا اگر کاٹنا واجب یا مشروع ہوتا تو آپ اسے امت کے اس جم غفیر کے سامنے ضرور بیان فرما دیتے' لیکن جب آپ نے عرفات میں اس سے سکوت فرمایا تو معلوم ہوا کہ یہ حکم منسوخ ہے اور اللہ تعالیٰ نے کاٹنے کے حکم سے درگزر کرتے ہوئے اسے معاف فرما دیا ہے کیونکہ کاٹنے کی صورت میں موزے خراب ہو جاتے ہیں۔ واللہ اعلم۔

عورت کے موزے یا جرابیں پہننے میں کوئی حرج نہیں کیونکہ عورت تو سراپا پردہ ہے' ہاں البتہ اس کے لیے دو چیزوں یعنی نقاب اور دستانوں کے استعمال کی ممانعت ہے کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے ان سے منع کرتے ہوئے فرمایا:

«لاَ تَنْتَقِبِ الْمُحرِمَةُ وَلاَ تَلْبَسِ الْقُفَّازَيْنِ»(صحيح البخاري، جزاء الصيد، باب ما ينهى من الطيب ... الخ، ح:١٨٣٨)

"محرمہ عورت نقاب اور دستانے استعمال نہ کرے۔"

نقاب سے مراد وہ چیز جو چہرے کو چھپانے کے لیے بنائی گئی ہو مثلاً برقع وغیرہ' لہٰذا اسے حالت احرام میں استعمال نہ کرے' ہاں البتہ اجنبی مردوں کی موجودگی میں نقاب کے سوا کسی اور چیز سے اپنے چہرے کو ڈھانپ لے اور جب مردوں سے دور ہو تو پھر اپنے چہرے کو ننگا کر لے۔ عورت کے لیے چہرے پر نقاب اور برقع ڈالنا جائز نہیں اور نہ اس کے لیے ہاتھوں پر دستانے استعمال کرنا جائز ہے۔ ہاں البتہ کسی اور چیز سے اپنے ہاتھوں کو ڈھانپ سکتی ہے۔

——— شیخ ابن باز ———

طواف افاضہ سے قبل بوسہ کی وجہ سے انزال

سوال ایک شخص ایک ممنوع کام میں مبتلا ہو گیا اور وہ ہے بیوی کو بوسہ دینا اور شہوت کے ساتھ انزال ہونا اور یہ جمرہ عقبہ کی رمی اور حلق کے بعد مگر طواف افاضہ سے قبل ہوا جب کہ اس کی بیوی حج نہیں کر رہی تھی تو اس صورت میں اس پر کیا واجب ہے؟

جواب جس مسلمان نے حج یا عمرہ یا دونوں کا احرام باندھا ہو تو اس کے لیے یہ جائز نہیں کہ کوئی ایسا کام کرے جس سے اس کا احرام خراب ہو جائے یا عمل ناقص ہو جائے۔ جس نے حج کا احرام باندھا ہو تو اس کے لیے بوسہ حرام ہے' حتیٰ کہ وہ مکمل طور پر حلال ہو جائے یعنی جمرہ عقبہ کو رمی کر لے' بال منڈوا یا کٹوا لے' طواف افاضہ کرے' اگر اس کے ذمہ سعی ہو تو سعی بھی کر لے کیونکہ ان تمام امور کی تکمیل سے قبل وہ حالت احرام ہی میں ہوتا ہے اور اس حالت میں اس کے لیے عورتیں حرام ہیں۔ تحلل اول کے بعد اگر بوسہ لے اور اسے انزال ہو جائے تو اس کا حج فاسد نہیں ہو گا' اسے چاہیئے کہ اللہ تعالیٰ سے اپنے گناہ کی معافی مانگے' آئندہ اس طرح کا کام نہ کرے اور اس کے فدیہ کے طور پر ایک ایسی بکری ذبح کر دے جس کی قربانی جائز ہے اور اس کے گوشت کو حرم مکہ کے فقیروں میں تقسیم کر دے اور جس قدر جلد ممکن ہو یہ فدیہ ادا کر دینا چاہیئے۔ واللہ ولی التوفیق۔ وصلی اللہ علی نبینا محمد وآلہ وصحبہ وسلم

——— فتویٰ کمیٹی ———

تحلل اول سے قبل جماع

سوال کیا اس شخص کے لیے دوبارہ حج کرنا واجب ہے جو تحلل اول سے قبل ہی اپنی بیوی سے جماع کر لے' جبکہ اس کا یہ حج نفل ہو؟

جواب جو شخص تحلل اول سے قبل بیوی سے صحبت کر لے' اس کا حج فاسد ہو جاتا ہے لیکن اس حج کو پورا کرنا چاہیئے اور بعد میں اس کی قضا بھی دینا چاہیئے خواہ حج نفل ہی ہو' چنانچہ اس مسئلہ میں حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا بھی یہی فتویٰ ہے' نیز اسے ایک اونٹ ذبح کر کے مکہ مکرمہ کے فقراء میں تقسیم کر دینا چاہیئے۔ واللہ المستعان۔

——— شیخ ابن باز ———

طواف افاضہ کے بعد عورتوں کے پاس جانا

سوال جب حاجی طواف افاضہ کر لے تو کیا اس کے لیے ایام تشریق میں عورتوں کے پاس جانا حلال ہے؟

جواب جب حاجی طواف افاضہ کر لے تو اس کے لیے عورتوں کے پاس جانا حلال نہیں بشرطیکہ وہ دیگر تمام امور مثلاً رمی جمرہ اور حلق یا تقصیر کی بھی تکمیل کر لے تو اس کے لیے عورتوں کے پاس جانا حلال ہے ورنہ نہیں۔

اکیلا طواف کر لینا ہی کافی نہیں بلکہ ضروری ہے کہ عید کے دن رمی جمرہ کی جائے بالوں کو منڈوانا یا کٹوانا اور طواف بھی ضروری ہے' نیز اس کے ذمہ اگر سعی ہو تو سعی بھی ضروری ہے۔ ان تمام امور کی تکمیل کے بعد عورتوں سے مباشرت حلال ہو گی' تکمیل سے پہلے نہیں۔ لیکن اگر وہ ان تین کاموں میں سے دو کر لے یعنی اگر رمی کر لے اور بالوں کو منڈوایا کٹوا لے تو اس کے لیے لباس اور خوشبو جائز ہو جاتی ہے' عورت سے صحبت نہیں' اسی طرح اگر رمی اور طواف کر لے یا طواف کر لے اور بال منڈوا لے تو اس کے لیے خوشبو' سلا ہوا لباس' شکار اور ناخن تراشنا وغیرہ حلال ہو جاتا ہے لیکن عورتوں سے صحبت صرف اسی صورت میں حلال ہو گی جب وہ یہ تینوں کام کر لے' یعنی جمرہ عقبہ کو رمی کر لے' بالوں کو منڈوایا کٹوا لے' طواف افاضہ کر لے اور اگر متمتع کی طرح اس کے ذمہ سعی ہو تو سعی بھی کر لے تو ان تمام امور کی تکمیل کے بعد اس کے لیے عورتیں حلال ہوں گی۔ واللہ اعلم۔

——— شیخ ابن باز ———

حالت احرام میں احتلام

سوال جب ہم نے آٹھ تاریخ کو احرام پہنا اور منیٰ میں رات بسر کی تو مجھے احتلام ہو گیا' جس کی وجہ سے میں بہت پریشان ہو گیا کہ اگر غسل کروں تو اس سے سر سے بال گریں گے اور مجھے احرام کھولنا پڑے گا جس کی وجہ سے مجھے ممنوعات احرام میں سے دو کاموں کا ارتکاب کرنا پڑے گا اور تیمم کی صورت میں یہ ارتکاب نہیں ہوتا لیکن میں نے تیمم کے بجائے غسل ہی کر لیا تو اس مسئلہ میں کیا حکم ہے؟ فتویٰ دیجئے' اللہ تعالیٰ آپ کو اجر وثواب سے نوازے گا؟

جواب جسے احتلام ہو جائے اس پر غسل کرنا واجب ہے' غسل کیے بغیر نماز' طواف اور قرآن مجید کی تلاوت کرنا صحیح نہیں ہے' لہٰذا اسے ہر صورت میں غسل کرنا چاہیئے خواہ وہ محرم ہی کیوں نہ ہو' غسل کرتے ہوئے اگر سر سے چند بال گر جائیں تو اس میں کوئی حرج نہیں کیونکہ ممنوع یہ ہے کہ آدمی از خود بال منڈوائے یا کٹوائے یا اکھاڑے۔

احتلام کی وجہ سے غسل واجب ہے' غسل کرتے ہوئے سر کو دھونا اور بالوں میں خلال کرنا واجب ہے لیکن بہت مبالغے کے ساتھ بالوں کو نہ ملے بلکہ سر پر پانی بہا دے اور ہاتھوں کی انگلیوں کو بالوں میں پھیرے تاکہ پانی سر کی جلد تک پہنچ جائے کیونکہ جنابت کا اثر ایک ایک بال کے نیچے ہوتا ہے۔ احرام کو اتارنا یعنی تہبند کو ضرورت کے وقت اتارنا ممنوعات احرام میں سے نہیں ہے۔

قضائے حاجت کے وقت بھی تہبند کو اتارنا جائز ہے' احرام کی چادر یا تہبند کو تبدیل کرنا یا میلا ہونے کی وجہ سے دھونا بھی جائز ہے۔ حدیث سے یہ ثابت ہے کہ نبی ﷺ اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم حالت احرام میں غسل فرمالیا کرتے تھے۔[1] واللہ اعلم۔

——— شیخ ابن جبرین ———

احتلام سے حج باطل نہیں ہوتا

سوال میں نے فریضہ حج ادا کیا اور منیٰ میں دوران قیام ایک رات مجھے احتلام ہو گیا لیکن میں غسل نہ کر سکا تو کیا اس صورت میں مجھ پر کچھ لازم ہے؟

جواب جس شخص نے حج یا عمرے کا احرام باندھا ہو اور اسے احتلام ہو جائے تو احتلام اس کے حج اور عمرہ پر اثر انداز نہیں ہوتا یعنی اس سے حج اور عمرہ باطل نہیں ہوتے' لہٰذا جسے احتلام ہو جائے تو وہ بیدار ہونے کے بعد غسل جنابت کر لے' اگر اس نے کپڑے پر منی کو لگا ہوا دیکھا ہو۔ احتلام کی وجہ سے کوئی فدیہ وغیرہ لازم نہیں ہے کیونکہ یہ اختیار میں نہیں ہے۔

——— فتویٰ کمیٹی ———

حیض و نفاس والی خواتین اور حج

حائضہ عورت کا حج

سوال اس مسلمان عورت کے بارے میں کیا حکم ہے جسے ایام حج میں حیض شروع ہو جائے؟ کیا اس کا یہ حج ہو جائے گا؟

جواب جب ایام حج میں کسی عورت کا حیض شروع ہو جائے تو وہ تمام امور اسی طرح سرانجام دے جس طرح دیگر حجاج سرانجام دیتے ہیں' ہاں البتہ وہ پاک ہوئے بغیر بیت اللہ شریف کا طواف اور صفا و مروہ کی سعی نہیں کر سکتی' لہٰذا جب پاک ہو جائے تو پھر طواف اور سعی کرے۔ اگر حیض اس وقت شروع ہو جب وہ تمام اعمال حج سرانجام دے چکی ہو اور صرف طواف وداع باقی ہو تو اسے سفر کی اجازت ہے' طواف وداع اس سے ساقط ہو جائے گا اور اس کا حج صحیح ہو گا۔ اس مسئلہ میں دلیل وہ حدیث ہے جسے امام ترمذی اور امام ابوداود نے حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

«اَلْحَائِضُ وَالنُّفَسَاءُ إِذَا أَتَتَا عَلَى الْوَقْتِ ـ يَعْنِي الْمِيقَاتَ ـ تَغْتَسِلَانِ وَتُحْرِمَانِ وَتَقْضِيَانِ الْمَنَاسِكَ كُلَّهَا غَيْرَ الطَّوَافِ بِالْبَيْتِ»(سنن أبي داود، المناسك، باب الحائض تهل بالحج، ح: ١٧٤٤ وجامع الترمذي، ح: ٩٤٥)

---

[1] صحیح بخاری' الحج' باب الاغتسال عند دخول مکة' حدیث: 1573 و صحیح مسلم' الحج' حدیث: 1259

”حیض اور نفاس والی عورتیں جب میقات پر آئیں تو غسل کریں‘ احرام پہنیں اور تمام مناسک ادا کریں مگر وہ بیت اللہ کا طواف نہ کریں۔“

صحیح بخاری میں روایت ہے کہ عمرہ ادا کرنے سے قبل حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے ایام شروع ہو گئے تو نبی کریم ﷺ نے انہیں حکم دیا کہ حج کا احرام باندھ لیں‘ پاک ہوئے بغیر بیت اللہ شریف کا طواف نہ کریں اور وہ سب کچھ کریں جو حاجی کرتے ہیں اور اس حج کو عمرہ کے ساتھ ملا دیں۔ اسی طرح صحیح بخاری میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ ام المومنین حضرت صفیہ رضی اللہ عنہا کے ایام شروع ہو گئے اور انہوں نے اس کا نبی کریم ﷺ سے ذکر کیا‘ تو آپ نے فرمایا:

«أَحَابِسَتُنَا هِيَ؟ قَالُوا إِنَّهَا قَدْ أَفَاضَتْ قَالَ فَلاَ إِذًا»(صحيح البخاري، الحج، باب إذا حاضت المرأة بعد ما أفاضت، ح:١٧٥٧)

”کیا یہ اب ہمیں سفر سے روکے رکھے گی؟ آپ کی خدمت میں عرض کیا گیا کہ انہوں نے طواف افاضہ کر لیا ہے تو آپ نے فرمایا کہ پھر اب یہ ہمیں نہیں روکے گی۔“

ایک اور روایت میں الفاظ یہ ہیں کہ طواف افاضہ کے بعد حضرت صفیہ رضی اللہ عنہا کے ایام شروع ہو گئے تو حضرت عائشہ نے اس کا رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں ذکر کیا تو آپ نے فرمایا:

«أَحَابِسَتُنَا هِيَ؟ قَالَتْ فَقُلْتُ: يَارَسُولَ اللهِ! إِنَّهَا قَدْ كَانَتْ أَفَاضَتْ وَطَافَتْ بِالْبَيْتِ، ثُمَّ حَاضَتْ بَعْدَ الإِفَاضَةِ، فَقَالَ رَسُولُ اللهِ فَلْتَنْفِرْ» (صحيح مسلم، الحج، باب وجوب طواف الوداع . . . الخ، ح:٣٨٢/ ١٢١١)

”کیا یہ اب ہمیں روکے رکھے گی؟ حضرت عائشہ نے عرض کیا یا رسول اللہ! انہوں نے افاضہ اور بیت اللہ کا طواف کر لیا ہے اور افاضہ کے بعد ایام شروع ہوئے ہیں تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا پھر یہ سفر کر سکتی ہیں۔“

——— شیخ ابن باز ———

حائضہ نماز کے بغیر احرام باندھ لے

سوال حائضہ عورت احرام کی دو رکعتیں کس طرح پڑھے؟

جواب حائضہ عورت احرام کی دو رکعتیں نہ پڑھے بلکہ وہ نماز کے بغیر ہی احرام باندھ لے۔ احرام کی دو رکعتیں جمہور کے نزدیک سنت ہیں۔ بعض اہل علم ان کو مستحب بھی نہیں سمجھتے کیونکہ ان کے بارے میں کوئی مخصوص چیز وارد نہیں ہے جبکہ جمہور انہیں مستحب قرار دیتے ہیں کیونکہ بعض احادیث میں ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: اللہ جل و علا فرماتا ہے:

«صَلِّ فِي هٰذَا الْوَادِي الْمُبَارَكِ، وَقُلْ: عُمْرَةٌ فِي حَجَّةٍ»(صحيح البخاري، الحج، باب قول النبي ﷺ العقيق واد مبارك، ح:١٥٣٤)

”اس وادی مبارک میں نماز پڑھ لو اور کہو عمرہ حج میں داخل ہے“

وادی سے مراد وادی عقیق ہے اور یہ حجۃ الوداع کا واقعہ ہے۔ ایک صحابی سے بھی یہ ثابت ہے کہ انہوں نے نماز پڑھ کر احرام باندھا‘ لہٰذا جمہور نے اسے مستحب قرار دیا ہے کہ نماز کے بعد احرام باندھا جائے نماز خواہ فرض ہو یا نفل‘ یعنی وضو

کر کے دو رکعتیں پڑھ لے۔ حیض اور نفاس والی عورتیں چونکہ نماز نہیں پڑھ سکتیں اس لیے وہ نماز کے بغیر ہی احرام باندھ لیں' ان کے لیے ان دو رکعتوں کی قضا بھی لازم نہیں۔

——— شیخ ابن باز ———

جب احرام کے بعد حیض یا نفاس شروع ہو جائے

سوال جب احرام کے بعد عورت کا حیض یا نفاس شروع ہو جائے تو کیا اس کے لیے بیت اللہ کا طواف کرنا جائز ہے؟ یا وہ کیا کرے؟ کیا ایسی عورت کے لیے طواف وداع بھی لازم ہے؟

جواب جب عمرہ کے لیے آمد کے موقع پر نفاس یا حیض شروع ہو جائے تو عورت پاک ہونے تک رک جائے اور جب پاک ہو جائے تو پھر طواف کرے' سعی کرے' بال کاٹ لے' اس سے اس کا عمرہ مکمل ہو جائے گا۔ اور اگر یہ صورت حال عمرہ ادا کرنے کے بعد پیش آئے یا آٹھ تاریخ کو حج کا احرام باندھنے کے بعد پیش آئے تو وہ اعمال حج یعنی وقوف عرفہ و مزدلفہ' رمی جمار اور تلبیہ و ذکر وغیرہ کو تو سرانجام دے اور جب پاک ہو جائے تو پھر حج کے لیے طواف و سعی کرے' والحمدللہ! اور اگر حیض طواف و سعی کے بعد اور طواف وداع سے قبل شروع ہو جائے تو اس صورت میں طواف وداع ساقط ہو جائے گا کیونکہ حیض اور نفاس والی عورتوں کے لیے طواف وداع معاف ہے۔

——— شیخ ابن باز ———

عمرہ کے احرام کے بعد حائضہ کیا کرے

سوال حج تمتع کرنے والی عورت نے جب احرام باندھا ہو اور پھر بیت اللہ تک پہنچنے سے پہلے ہی حیض شروع ہو جائے تو وہ کیا کرے؟ کیا عمرہ سے پہلے حج کرے؟

جواب وہ اپنے عمرہ کے احرام کو باقی رکھے اور اگر نو ذوالحجہ سے پہلے پاک ہو جائے اور اس کے لیے عمرہ کرنا ممکن ہو تو عمرہ کر لے اور پھر حج کا احرام باندھ کر دیگر مناسک حج کی تکمیل کے لیے عرفہ چلی جائے اور اگر وہ عرفہ کے دن سے پہلے پاک نہ ہو تو وہ حج کو عمرہ پر داخل کر دے اور یہ کہے "اے اللہ! میں نے اپنے عمرہ کے ساتھ حج کا احرام باندھ لیا ہے۔"

اس طرح اس کا حج قران ہو جائے گا' یہ لوگوں کے ساتھ وقوف کرے گی' دیگر تمام اعمال کی تکمیل بھی کرے گی اور اس کا یہ احرام عید کے دن یا اس کے بعد طواف زیارت اور حج و عمرہ کی سعی کے لیے کافی ہو گا اور اس پر حج قران کی قربانی لازم ہو گی جس طرح حج تمتع کرنے والے پر لازم ہوتی ہے۔

——— شیخ ابن جبرین ———

جب طواف افاضہ سے قبل حیض شروع ہو جائے

سوال جب طواف افاضہ سے قبل حیض یا نفاس شروع ہو جائے تو کیا عورت کے لیے یہ لازم ہے کہ وہ مکہ مکرمہ ہی میں رہے حتیٰ کہ پاک ہو جائے اور طواف کرے یا اس کے لیے جدہ وغیرہ کی طرف سفر کرنا جائز ہے اور پھر جب پاک ہو جائے تو

واپس آکر طواف کر لے؟

جواب اگر مکہ میں رہنے کی استطاعت ہو تو مکہ ہی میں رہے حتیٰ کہ طہارت کے بعد اپنے حج کی تکمیل کرے اور اگر مکہ میں قیام کی استطاعت نہ ہو تو اس میں بھی کوئی امر مانع نہیں ہے کہ وہ محرم کے ساتھ جدہ یا طائف وغیرہ کی طرف سفر کرے اور پھر پاک ہونے کے بعد محرم کے ساتھ واپس مکہ آئے اور اپنے مناسک حج کی تکمیل کرے۔

——— شیخ ابن باز ———

حیض اور نفاس والی عورت کا حج کے مہینوں ------

سوال جب طواف افاضہ سے قبل حیض شروع ہو جائے تو کیا حکم ہے؟ جب کہ اس نے دیگر تمام مناسک ادا کر لیے ہوں اور حیض ایام تشریق کے بعد تک جاری رہا ہو؟

جواب جب طواف حج سے قبل عورت کا حیض یا نفاس شروع ہو جائے تو اس کے ذمہ طواف باقی رہے گا' حتیٰ کہ جب پاک ہو جائے تو غسل کر کے طواف حج کرے خواہ یہ طواف حج کے کئی دنوں بعد کرنا پڑے خواہ محرم یا صفر ہی میں کیوں نہ کرنا پڑے کیونکہ اس کے لیے کوئی متعین وقت نہیں ہے۔ بعض اہل علم کا قول یہ ہے کہ اسے اس قدر مؤخر کرنا جائز نہیں کہ ماہ ذوالحج ختم ہو جائے لیکن یہ قول بلادلیل ہے' لہٰذا صحیح قول یہی ہے کہ اسے ذوالحج کے بعد تک مؤخر کرنا بھی جائز ہے لیکن اگر استطاعت ہو تو پھر افضل یہ ہے کہ یہ طواف جلد کر لیا جائے اور اگر اسے ذوالحج سے مؤخر کر دیا تو پھر بھی یہ جائز ہے اور اس صورت میں دم بھی لازم نہیں ہے۔

حیض اور نفاس والی عورتیں معذور ہیں لہٰذا ان کے لیے طواف کو مؤخر کرنے میں کوئی حرج نہیں کیونکہ ان کے لیے اس کے بغیر اور کوئی چارۂ کار بھی تو نہیں' لہٰذا وہ جب بھی پاک ہوں طواف کر لیں خواہ ذوالحج میں پاک ہوں یا محرم میں۔

——— شیخ ابن باز ———

حائضہ کا طواف سے قبل اپنے گھر چلے جانا

سوال کیا حائضہ کے لیے یہ جائز ہے کہ وہ طواف افاضہ سے قبل اپنے گھر چلی جائے اور جب پاک ہو جائے تو پھر طواف افاضہ کے لیے مکہ مکرمہ میں واپس لوٹ آئے یا اس کے لیے یہ ضروری ہے کہ مکہ مکرمہ ہی میں قیام کر کے طہارت کا انتظار کرے اور پھر پاک ہونے کے بعد طواف کرے؟

جواب جب طواف افاضہ سے قبل حیض شروع ہو جائے تو اس کے محرم کو انتظار کرنا چاہیئے حتیٰ کہ یہ پاک ہو جائے اور اگر انتظار ممکن نہ ہو تو اس کے لیے گھر جانا جائز ہے اور پھر جب پاک ہو جائے تو مکہ مکرمہ میں واپس آکر اپنے حج کی تکمیل کرے' اس حالت میں اس کے شوہر کو اس کے قریب نہیں آنا چاہیئے اور اگر اس کے لیے دوبارہ واپس آنا ممکن نہ ہو کہ یہ کسی دور دراز ملک سے آئی ہو تو پھر ضرورت کی وجہ سے اس کے لیے یہ جائز ہے کہ لنگوٹ باندھ کر طواف کرے۔

——— شیخ ابن عثیمین ———

جب طواف افاضہ سے قبل حیض شروع ہو جائے

سوال ایک عورت کے طواف افاضہ سے پہلے ایام شروع ہو گئے' وہ مکہ مکرمہ سے باہر رہتی ہے' اس کا سعودی عرب سے سفر کرنے کا وقت بھی آ گیا ہے اور مکہ میں مزید قیام کی اسے استطاعت نہیں اور دوبارہ مکہ مکرمہ میں واپسی بھی محال ہے تو ایسی عورت کے لیے کیا حکم ہے؟

جواب اگر امر واقع اسی طرح ہے' جس طرح سوال میں مذکور ہے کہ اس عورت نے طواف افاضہ نہیں کیا' حیض شروع ہو گیا' مکہ میں مزید قیام مشکل ہے اور طواف سے قبل اگر سفر شروع کرے تو مکہ میں دوبارہ واپسی مشکل ہے تو اس حالت میں اس کے لیے یہ جائز ہے کہ دو صورتوں میں سے کوئی ایک اختیار کرے۔ (۱) یا تو ایسا ٹیکہ لگوا لے جس سے خون رک جائے یا (۲) اس طرح مضبوطی سے کس کر لنگوٹ باندھ لے کہ مسجد میں خون نہ گرے اور ضرورت کی وجہ سے طواف کر لے' اس مسئلہ میں یہی راجح قول ہے۔ شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ نے بھی اس کو اختیار فرمایا ہے۔ اور اگر اس قول کو اختیار نہ کیا جائے تو پھر دو باتوں میں سے ایک کو ضرور اختیار کرنا ہو گا' اول یہ کہ یہ عورت بدستور حالت احرام میں رہے' جس کی وجہ سے اپنے خاوند کے قریب جانا اس کے لیے حلال نہ ہو گا اور اگر غیر شادی شدہ ہو تو اس حالت میں شادی کرنا جائز نہ ہو گا اور دوم یہ کہ اسے محصر شمار کر لیا جائے اور یہ ایک ہدی ذبح کر کے احرام کو کھول دے اور اس حالت میں اس کا یہ حج نہیں ہو گا' لیکن یہ دونوں باتیں ہی بہت مشکل ہیں لہٰذا راجح قول وہی ہے' جسے شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ نے اختیار فرمایا ہے اور یہ نظریہ ضرورت کی وجہ سے ہے اور ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ وَمَا جَعَلَ عَلَيْكُمْ فِي ٱلدِّينِ مِنْ حَرَجٍ ﴾ (الحج ۲۲/ ۷۸)

"اور تم پر دین (کی کسی بات) میں تنگی نہیں کی۔"

اور فرمایا:

﴿ يُرِيدُ ٱللَّهُ بِكُمُ ٱلْيُسْرَ وَلَا يُرِيدُ بِكُمُ ٱلْعُسْرَ ﴾ (البقرۃ ۲/ ۱۸۵)

"اللہ تمہارے حق میں آسانی چاہتا ہے اور سختی نہیں چاہتا۔"

اس حالت میں عورت کے لیے اگر سفر کرنا ممکن ہو تو وہ سفر کر سکتی ہے اور پھر پاک ہونے کے بعد دوبارہ مکہ مکرمہ میں واپس آ کر طواف حج کرے' اس حالت میں اس کے لیے ازدواجی تعلقات جائز نہیں ہیں کیونکہ ابھی تک اسے تحلل ثانی حاصل نہیں ہوا۔

——— شیخ ابن عثیمین ———

حالت حیض میں حج کا احرام باندھا

سوال ایک عورت نے "سیل" سے حج کا احرام باندھا اور جب مکہ پہنچی تو کسی ضرورت کی وجہ سے اسے جدہ میں جانا پڑا' جدہ جا کر یہ پاک ہو گئی اور اس نے غسل کر کے بالوں کو کنگھی کر لی اور پھر حج کر لیا تو کیا اس کا یہ حج صحیح ہے' اس پر

کوئی فدیہ وغیرہ تو لازم نہیں؟

جواب اس میں کوئی حرج نہیں' حالت حیض میں جدہ کی طرف سفر کرنے کی وجہ سے حج کو کوئی نقصان نہیں پہنچتا اور نہ اس صورت میں اس پر کوئی فدیہ وغیرہ لازم ہے' اسی طرح کنگھی کرنے میں بھی کوئی حرج نہیں بشرطیکہ خوشبو استعمال نہ کی جائے اور بالوں کو نہ کاٹا جائے' اگر بھول کر یا جہالت کی وجہ سے خوشبو استعمال کر لے یا بال کاٹ لے تو پھر بھی کوئی فدیہ لازم نہیں اور اگر جان بوجھ کر اور شرعی حکم کو جانتے ہوئے ایسا کرے تو پھر خوشبو کے استعمال اور بالوں کے کاٹنے میں سے ہر عمل کی وجہ سے فدیہ لازم ہو گا اور وہ یہ کہ چھ مسکینوں کو نصف صاع فی کس کے حساب سے شہر کی خوراک کے مطابق کھانا دیا جائے یا ایک بکری ذبح کر دی جائے یا تین دن کے روزے رکھ لیے جائیں۔

——— شیخ ابن باز ———

عمرہ ادا کرنے سے قبل حیض شروع ہو گیا.........

سوال ایک عورت عمرے کا احرام باندھ کر آئی اور مکہ مکرمہ پہنچنے کے بعد اسے ایام شروع ہو گئے' مگر اس کا محرم فوری سفر کرنے کے لیے مجبور و ناچار ہے اور مکہ میں اس کا کوئی محرم بھی نہیں تو اس عورت کے لیے کیا حکم ہے؟

جواب اگر امر واقع اسی طرح ہے کہ حالت احرام میں طواف سے قبل حیض شروع ہو گیا اور اس کا محرم فوری سفر کے لیے مجبور و ناچار ہے اور مکہ میں اس کا شوہر یا کوئی محرم نہیں تو اس حالت میں ضرورت کے باعث دخول مسجد اور طواف کے لیے حیض سے طہارت کی شرط اس سے ساقط ہو جائے گی۔ لہٰذا اسے چاہیئے کہ لنگوٹ باندھ کر طواف اور سعی کر لے اور اگر قرب مسافت کی وجہ سے اس کے لیے یہ بہ آسانی ممکن ہو کہ سفر کر لے اور طہارت کے فوراً بعد اپنے شوہر یا کسی محرم کے ساتھ واپس آ کر حالت طہارت میں عمرہ کے لیے طواف کرے تو یہ زیادہ بہتر ہے' ورنہ جو پہلے حکم بیان کیا گیا ہے اسی پر عمل کر سکتی ہے کیونکہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ يُرِيدُ ٱللَّهُ بِكُمُ ٱلْيُسْرَ وَلَا يُرِيدُ بِكُمُ ٱلْعُسْرَ ﴾ (البقرۃ ۲/ ۱۸۵)

"اللہ تمہارے حق میں آسانی چاہتا ہے اور سختی نہیں چاہتا۔"

اور فرمایا:

﴿ لَا يُكَلِّفُ ٱللَّهُ نَفْسًا إِلَّا وُسْعَهَا ﴾ (البقرۃ ۲/ ۲۸۶)

"اللہ کسی شخص کو اس کی طاقت سے زیادہ تکلیف نہیں دیتا۔"

اور فرمایا:

﴿ وَمَا جَعَلَ عَلَيْكُمْ فِي ٱلدِّينِ مِنْ حَرَجٍ ﴾ (الحج ۲۲/ ۷۸)

"اور تم پر دین (کی کسی بات) میں تنگی نہیں کی۔"

اور فرمایا:

﴿ فَٱتَّقُوا۟ ٱللَّهَ مَا ٱسْتَطَعْتُمْ ﴾ (التغابن ۶۴/ ۱۶)

"سو جہاں تک ہو سکے اللہ سے ڈرو۔"

اور رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے:

«إِذَا أَمَرْتُكُمْ بِأَمْرٍ فَأْتُوا مِنْهُ مَا اسْتَطَعْتُمْ»(صحيح البخاري، الاعتصام بالكتاب والسنة، باب الاقتداء بسنن رسول الله ﷺ ح:٧٢٨٨ وصحيح مسلم، الحج، باب فرض الحج مرة ... الخ، ح:١٣٣٧ ومسند أحمد: ٢/ ٥٠٨ واللفظ له)

"میں جب تمہیں کوئی حکم دوں تو مقدور بھر اس کی اطاعت بجالاؤ۔"

علاوہ ازیں دیگر بہت سی نصوص بھی ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ دین میں آسانی ہے' تنگی نہیں۔ ہم نے جو ذکر کیا ہے اہل علم کی ایک جماعت نے بھی اس کے مطابق فتویٰ دیا ہے' جن میں شیخ الاسلام ابن تیمیہ اور آپ کے شاگرد رشید علامہ ابن القیم رحمہما اللہ بطور خاص قابل ذکر ہیں۔

——— فتویٰ کمیٹی ———

طواف افاضہ کے دوران حیض شروع ہو گیا

سوال ایک عورت نے حج کے لیے سفر شروع کیا اور سفر شروع کرنے سے پانچ دن پہلے اس کے ایام شروع ہو گئے تھے اور میقات پر پہنچنے کے بعد اس نے غسل کر کے احرام باندھ لیا جب کہ وہ ابھی تک پاک نہیں ہوئی تھی۔ مکہ مکرمہ پہنچنے کے بعد وہ حرم سے باہر رہی اور حج و عمرہ کے شعائر میں سے کوئی کام سرانجام نہ دیا اور پھر منیٰ میں دو دن گزارنے کے بعد وہ پاک ہو گئی' اس نے غسل کیا اور حالت طہارت میں تمام مناسک عمرہ ادا کئے لیکن جب وہ حج کے لیے طواف افاضہ کر رہی تھی تو پھر خون جاری ہو گیا مگر اس نے اسی حالت میں مناسک حج کی تکمیل کر لی اور اس کے بارے میں اپنے ولی کو اپنے شہر میں پہنچنے کے بعد بتایا' تو سوال یہ ہے کہ اس مسئلہ میں کیا حکم ہے؟

جواب اگر امر واقع اسی طرح ہے جس طرح سائل نے ذکر کیا ہے تو اس مذکورہ عورت کے لیے یہ لازم ہے کہ وہ مکہ مکرمہ جائے اور حالت حیض میں کئے ہوئے طواف کے بجائے حج کی نیت سے طواف کرے اور طواف کے بعد مقام ابراہیم یا حرم میں کسی بھی دوسری جگہ دو رکعت نماز پڑھے اس سے اس کا حج مکمل ہو جائے گا۔

اگر حج کے بعد اس کے شوہر نے اس سے مجامعت کر لی ہے تو اسے ایک جانور ذبح کر کے فقراء مکہ میں تقسیم کر دینا چاہیئے کیونکہ محرم عورت سے طواف افاضہ' عید کے دن رمی جمرہ اور بالوں کی کٹنگ کے بعد ہی اس کا شوہر مجامعت کر سکتا ہے۔

اگر یہ عورت حج تمتع کر رہی تھی اور اس نے حج سے قبل عمرہ کے لیے سعی نہیں کی تھی تو اس کے ذمہ صفا و مروہ کی سعی بھی لازم ہے اور اگر یہ حج قران یا حج افراد کر رہی تھی تو پھر اس پر دوسری سعی نہیں ہے جبکہ اس نے طواف قدوم کے ساتھ سعی کر لی ہو۔

اس کے ساتھ ساتھ اس عورت کو چاہیئے کہ اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں توبہ کرے کہ اس نے حالت حیض میں طواف کر لیا' طواف سے قبل مکہ مکرمہ سے چلی گئی اور پھر اس طویل مدت تک طواف کو مؤخر کیا۔ ہم بھی دعا کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ اس کی توبہ قبول فرمائے۔

——— شیخ ابن باز ———

جب آٹھ تاریخ کو نفاس شروع ہو جائے ....

سوال اگر کسی عورت کا نفاس یوم ترویہ یعنی آٹھ ذوالحج کو شروع ہو اور وہ طواف و سعی کے علاوہ دیگر تمام ارکان حج مکمل کر لے اور پھر وہ دس دنوں بعد ہی یہ دیکھ لے کہ وہ پاک ہو گئی ہے تو کیا وہ غسل کر کے باقی رکن یعنی طواف حج کو بھی ادا کر لے؟

جواب ہاں اگر آٹھ تاریخ کو نفاس شروع ہو تو وہ حج کر سکتی یعنی لوگوں کے ساتھ عرفات اور مزدلفہ میں وقوف کر سکتی ہے' اسی طرح رمی جمار' تقصیر اور قربانی بھی کر سکتی ہے اور اس طرح اس کے ذمہ صرف طواف اور سعی باقی رہ جائے گا اور انہیں پاک ہونے تک مؤخر کرنا ہو گا اور اگر وہ دس دنوں یا اس سے کم یا زیادہ میں پاک ہو جائے تو غسل کر کے نماز' روزہ' طواف اور سعی کر سکتی ہے۔ یاد رہے کم از کم نفاس کی کوئی حد محدود نہیں ہے' عورت دس دنوں سے کم یا زیادہ میں بھی پاک ہو سکتی ہے' ہاں البتہ نفاس کی زیادہ سے زیادہ حد چالیس ایام ہے' اگر چالیس دن پورے ہو جائیں اور خون منقطع نہ ہو تو پھر وہ اپنے آپ کو پاک عورتوں کے حکم میں شمار کرے اور غسل کر کے نماز' روزہ شروع کر دے اور چالیس دنوں کے بعد جاری رہنے والے اس خون کو فاسد سمجھے اور اس کی موجودگی میں بھی نماز' روزہ اور اپنے شوہر سے مقاربت کر سکتی ہے لیکن روئی وغیرہ کے استعمال کے ذریعے خون سے حفاظت کرے' ہر نماز کے وقت میں وضو کرے اور اگر ظہر و عصر اور مغرب و عشاء کی نمازوں کو ملا کر پڑھ لے تو پھر بھی اس میں کوئی حرج نہیں کیونکہ نبی کریم ﷺ نے حمنہ بنت جحش کو یہی حکم دیا تھا۔[1]

—————— شیخ ابن باز ——————

حائضہ عورت کا مسعی میں بیٹھنا

سوال کیا حائضہ عورت کے لیے مسعی میں بیٹھنا جائز ہے؟

جواب ہاں حائضہ عورت کے لیے مسعی میں بیٹھنا جائز ہے کیونکہ مسعی (صفا و مروہ کے درمیان کی وہ جگہ جہاں سعی کی جاتی ہے) مسجد حرام میں شمار نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اگر طواف کے بعد اور سعی سے پہلے حائضہ ہو جائے تو وہ سعی کر سکتی ہے کیونکہ سعی طواف نہیں ہے اور نہ اس کے لیے طہارت شرط ہے' لہٰذا اگر حائضہ عورت مسعی میں بیٹھ کر اپنے اہل خانہ کا انتظار کرے تو اس میں کوئی حرج نہیں۔

—————— شیخ ابن عثیمین ——————

---

[1] صحیح بخاری' الحیض' باب عرق الاستحاضۃ' حدیث : 327 و صحیح مسلم' الحیض' باب المستحاضۃ و غسلھا و صلاتھا' حدیث : 334

حج میں وکالت

رمی جمار میں وکالت

سوال رمی جمار میں کب وکالت جائز ہے؟ کیا کچھ ایسے ایام بھی ہیں' جن میں وکالت جائز نہیں؟

جواب تمام جمرات میں وکالت جائز ہے اس مریض کے لیے جو رمی کرنے سے عاجز ہو' اس حاملہ کے لیے جسے اپنے بارے میں خطرہ ہو' اس مرضعہ کے لیے جس کے بچوں کی حفاظت کے لیے کوئی نہ ہو' اور اس بوڑھے مرد و عورت کے لیے جو رمی کرنے سے عاجز ہوں' اسی طرح چھوٹے بچے اور بچی کی طرف سے ولی رمی کر سکتا ہے۔ وکیل اپنی طرف سے اور اپنے مؤکل کی طرف سے ہر جمرہ کے پاس ایک ہی وقت میں رمی کر سکتا ہے' وہ پہلے اپنی طرف سے رمی کرے اور پھر اپنے موکل کی طرف سے' الّا یہ کہ وکیل کا نفل حج ہو تو پھر اس کے لیے یہ لازم نہیں کہ اپنی طرف سے پہلے رمی کرے' لیکن یاد رہے رمی میں وکالت صرف حاجی ہی کر سکتا ہے' جو شخص حج نہ کر رہا ہو تو وہ رمی میں دوسرے کی وکالت بھی نہیں کر سکتا اور نہ اس کا کسی دوسرے کی طرف سے رمی کرنا جائز ہی ہو گا۔

——— شیخ ابن باز ———

طاقت کے باوجود رمی میں نیابت

سوال کیا طاقتور شخص کے لیے یہ ممکن ہے کہ وہ رمی جمار کے لیے ایام تشریق کے دوسرے دن کسی اور شخص کو اپنا وکیل مقرر کر دے کیونکہ گھریلو حالات کی وجہ سے میرا آج ریاض واپس جانا ضروری ہے یا اس کی وجہ سے مجھ پر دم لازم ہو گا؟

جواب کسی شخص کے لیے یہ جائز نہیں کہ وہ کسی کو اپنا نائب بنائے اور رمی کی تکمیل سے قبل خود سفر کرے بلکہ واجب یہ ہے کہ اگر اسے قدرت ہے تو خود رمی کرے اور اگر خود عاجز ہو تو انتظار کرے' کسی کو اپنا نائب مقرر کرے اور اس وقت تک سفر نہ کرے جب تک کہ اس کا وکیل رمی جمار سے فارغ نہ ہو جائے' پھر یہ موکل طواف وداع کرے اور پھر اس کے بعد وہ سفر کر سکتا ہے۔

اگر کوئی شخص خود صحیح سالم ہو تو اس کے لیے کسی کو وکیل بنانا جائز نہیں بلکہ اس پر واجب ہے کہ وہ خود رمی کرے کیونکہ اس نے جب حج کا احرام باندھا ہے تو اس پر واجب ہے کہ اس کی تکمیل بھی کرے جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ وَأَتِمُّوا۟ ٱلْحَجَّ وَٱلْعُمْرَةَ لِلَّهِ ۚ ﴾ (البقرۃ ۲/ ۱۹۶)

"اور اللہ (کی خوشنودی) کے لیے حج اور عمرے کو پورا کرو۔"

اسی طرح عمرہ کے لیے بھی یہی حکم ہے جیسا کہ اس آیت کریمہ میں مذکور ہے کہ جب ایک دفعہ شروع کر دیا جائے تو پھر واجب ہے کہ اسے پایۂ تکمیل تک پہنچایا جائے۔ صحیح قول کے مطابق اس شخص کے لیے بعض اعمال حج میں وکالت جائز

نہیں جو انہیں سرانجام دینے پر قادر ہو اور اگر کوئی شخص رمی سے قبل سفر کر جائے تو اس کے لیے جانور ذبح کر کے فقراء مکہ کو کھلانا واجب ہے۔

—— شیخ ابن باز ——

مریض' عورت اور بچے کی طرف سے رمی میں وکالت

سوال مریض' عورت اور بچے کی طرف سے رمی میں وکالت کے بارے میں کیا حکم ہے؟

جواب مریض اور ایسی عورت جو خود رمی کرنے سے عاجز ہو مثلاً حاملہ' بہت بھاری بھرکم اور کمزور عورت کے لیے وکالت میں کوئی حرج نہیں' ہاں البتہ طاقت ور اور صحت مند عورت کو خود رمی کرنی چاہیئے۔ جو شخص دن کے وقت زوال کے بعد رمی کرنے سے عاجز ہو وہ رات کو رمی کر لے' جو عید کے دن رمی نہ کر سکے وہ گیارہ کی رات کو رمی کرے' جو گیارہ تاریخ کو رمی نہ کر سکے وہ بارہ کی رات کو کر لے اور جو شخص بارہ تاریخ کو بھی نہ کر سکے یا زوال کے بعد رمی نہ کر سکے تو وہ تیرہ تاریخ کی رات کو رمی کر لے اور پھر اس کے بعد طلوع فجر کے ساتھ رمی کا وقت ختم ہو جائے گا۔ یاد رہے ایام تشریق میں دن کو زوال کے بعد ہی رمی کی جا سکتی ہے۔

—— شیخ ابن باز ——

ہجوم وغیرہ کی وجہ سے رمی میں وکالت

سوال کیا اس عورت کے لیے جو فرض حج ادا کر رہی ہو ہجوم وغیرہ کی وجہ سے رمی جمرات میں وکالت جائز ہے یا اسے خود ہی رمی کرنا پڑے گی؟

جواب رمی جمرات کے پاس رش کی وجہ سے جائز ہے کہ عورت کسی کو اپنا وکیل مقرر کر دے خواہ اس کا حج فرض ہی کیوں نہ ہو۔ عورت مرض' کمزوری' حمل کی حفاظت جب کہ وہ حاملہ ہو نیز عزت حرمت کی حفاظت کی وجہ سے کسی کو اپنا وکیل مقرر کر سکتی ہے۔

—— فتویٰ کمیٹی ——

سوال ایک عورت نے رمی جمار کے علاوہ دیگر تمام مناسک حج کو ادا کر دیا اور رمی کے لیے اس نے کسی کو اپنا وکیل مقرر کر دیا کیونکہ اس کے ساتھ ایک چھوٹا بچہ تھا اور یہ اس کا فرض حج تھا تو اس بارے میں کیا حکم ہے' فتویٰ دیجئے' اللہ تعالیٰ آپ کو اجروثواب سے نوازے گا؟

جواب اس سلسلہ میں اس پر کچھ لازم نہیں' وکیل کا رمی کرنا جائز ہے۔ رمی جمار کے وقت رش کی وجہ سے عورتوں کے لیے خصوصاً جن کے ہمراہ بچے بھی ہوں' بہت خطرہ ہوتا ہے لہٰذا ان کے لیے وکالت جائز ہے۔

—— شیخ ابن باز ——

گاڑیوں کے رش کی وجہ سے وکیل مقرر کرنا

سوال جو شخص اپنی گاڑی خود چلا رہا ہو اور رش کی وجہ سے وہ نماز عصر تک راستے ہی میں رک جائے' کیا اس کے لیے یہ جائز ہے کہ رمی جمرات کے لیے کسی کو اپنا وکیل مقرر کر دے؟

جواب مذکورہ شخص کے لیے خود رمی کرنا واجب ہے جب کہ اسے اس کی قدرت ہے اور اس نے خود ہی اپنے اختیار سے اپنے آپ کو گاڑیوں کے درمیان پھنسایا ہے' وہ رمی کرنے کے بعد بھی گاڑی چلا سکتا تھا' تاہم اس کے پاس اب بھی عصر اور مغرب کے درمیان کا وقت باقی ہے اور یہ رمی اور نماز عصر بروقت ادا کرنے کے لیے کافی ہے۔

——— فتویٰ کمیٹی ———

رمی اور طواف وداع میں وکالت

سوال اس شخص کے بارے میں کیا حکم ہے جو دوسرے دن رمی جمرات کے لیے کسی کو اپنا وکیل مقرر کرے؟ اس شخص کے بارے میں کیا حکم ہے جو طواف وداع میں کسی کو وکیل مقرر کر کے خود اپنے ملک کے لیے سفر پر روانہ ہو جائے؟ کیا اس کے لیے یہ جائز ہے جبکہ وہ خود بھی جوان ہو؟

جواب اولاً: اگر موکل خود رمی کرنے سے عاجز ہو اور وکیل حاجی' مکلف اور قابل اعتماد ہو تو رمی میں وکالت صحیح ہے اور خواہ موکل جوان ہی کیوں نہ ہو' وکیل کو چاہیئے کہ پہلے خود اپنی طرف سے رمی کرے اور پھر اپنے موکل کی طرف سے' اگر موکل خود رمی کرنے کی طاقت رکھتا ہو یا وکیل غیر مکلف یا غیر حاجی ہو تو پھر رمی میں وکالت صحیح نہیں اور اس پر دم لازم ہو گا۔

ثانیاً: طواف وداع اور بیت اللہ کے کسی بھی دوسرے طواف میں وکالت صحیح نہیں ہے' لہٰذا جو شخص طواف وداع میں کسی کو وکیل بناتا اور خود طواف نہیں کرتا تو وہ گناہ گار ہوتا ہے اور اس کے ذمہ دم لازم آتا ہے' یعنی طواف وداع ترک کرنے کی وجہ سے اسے حرم میں جانور ذبح کرنا ہو گا۔ موکل کو اس وقت تک سفر نہیں کرنا چاہیئے جب تک وکیل رمی نہ کر لے اور رمی ختم ہونے کے بعد وہ خود طواف وداع نہ کر لے۔

——— فتویٰ کمیٹی ———

طواف میں وکالت جائز نہیں

سوال میری والدہ میرے والد کے ساتھ حج کے لیے گئیں اور ان کے ساتھ تین اور آدمیوں کی جماعت بھی تھی اور ہر آدمی کے ساتھ اس کی بیوی بھی تھی تاکہ سب مل کر فریضۂ حج ادا کر سکیں' چنانچہ ان سب نے فریضۂ حج ادا کیا لیکن طواف وداع کے وقت حرم حاجیوں سے بھرا ہوا تھا' لہٰذا میری والدہ کے ہمراہ عورتیں حرم میں داخل نہ ہو سکیں اور انہوں نے اپنے شوہروں کو وکیل بنا لیا لیکن میری والدہ نے نذر مانی کہ وہ خود طواف کرے گی اور پھر واقعی انہوں نے خود ہی طواف کیا۔ میرا سوال یہ ہے کہ حرم کے اندر اس نذر کے بارے میں کیا حکم ہے؟ نیز کیا طواف وداع میں وکالت جائز ہے؟

جواب طواف میں وکالت جائز نہیں' خواہ طواف زیارت ہو یا وداع' لہٰذا جو شخص طواف ترک کردے' اس کا حج مکمل نہیں' ہاں البتہ طواف وداع ترک کرنے کا کفارہ یہ ہے کہ مکہ میں ایک جانور ذبح کرکے حرم کے مسکینوں کو کھلا دیا جائے' طواف وداع حائضہ و نفساء سے ساقط ہو جاتا ہے جبکہ انہوں نے طواف زیارت کیا ہو' اس نذر کی کوئی اہمیت نہیں کیونکہ طواف واجب کے لیے نذر کی ضرورت نہیں ہے کیونکہ اسے تو خود شریعت نے واجب قرار دے رکھا ہے' ہاں البتہ اگر کوئی شخص ایسے طواف کی نذر مانتا ہے جو واجب نہیں ہے تو پھر اس نذر کو پورا کرنا لازم ہے کیونکہ وہ بھی نذر ماننے کی وجہ سے واجب ہو جائے گا' ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ ثُمَّ لْيَقْضُوا۟ تَفَثَهُمْ وَلْيُوفُوا۟ نُذُورَهُمْ وَلْيَطَّوَّفُوا۟ بِٱلْبَيْتِ ٱلْعَتِيقِ ﴿٢٩﴾ ﴾ (الحج ۲۲/ ۲۹)

"پھر چاہیے کہ لوگ اپنا میل کچیل دور کریں اور نذریں پوری کریں اور خانۂ قدیم (یعنی بیت اللہ) کا طواف کریں۔"

—— شیخ ابن جبرین ——

نائب پہلے اپنی طرف سے رمی کرے

سوال جب کوئی آدمی اپنی طرف سے رمی کے ساتھ ساتھ اپنے ماں باپ کی طرف سے بھی رمی میں نیابت کرے تو کیا اس کے لیے کوئی خاص ترتیب لازم ہے یا اسے اختیار ہے کہ جس کی طرف سے چاہے پہلے رمی کر لے؟

جواب جب کوئی شخص اپنے ماں باپ کے مرض یا عجز کی وجہ سے رمی جمار میں ان کی نیابت کرے تو وہ پہلے اپنی طرف سے رمی کرے اور پھر اپنے ماں باپ کی طرف سے' اور والدین کی طرف سے رمی کرتے ہوئے اگر اپنی ماں کی طرف سے پہلے رمی کرے تو یہ افضل ہے کیوں کہ ماں کا حق زیادہ ہے' اور اگر پہلے باپ کی طرف سے رمی کرے تو بھی کوئی حرج نہیں لیکن پہلے اسے اپنی طرف سے خصوصاً جب کہ حج فرض ہو' رمی کرنا چاہیے۔

نفل حج میں کوئی حرج نہیں خواہ پہلے اپنی رمی کرے یا اپنے ماں باپ کی طرف سے' ہاں البتہ افضل اور احسن یہ ہے کہ پہلے اپنی طرف سے' پھر ماں کی طرف سے اور پھر باپ کی طرف سے رمی کرے اور ایک ہی موقف میں اور عید کے دن رمی کرے' عید کے علاوہ باقی دنوں میں زوال کے بعد رمی کرے اور ہر جمرہ کو اکیس اکیس کنکریاں مارے۔ اگر بعض کی طرف سے رمی کو بعض پر مقدم کر دے تو پھر بھی کوئی حرج نہیں۔ اگر باپ کی طرف سے رمی کو ماں کی طرف سے رمی پر یا ان دونوں کی طرف سے رمی کو اپنی طرف سے رمی پر مقدم کر دے تو کوئی حرج نہیں بشرطیکہ حج نفل ہو اور حج اگر فرض ہو تو پھر یہ ضروری ہے کہ پہلے اپنی طرف سے اور پھر اپنے ماں باپ کی طرف رمی کرے۔

—— شیخ ابن باز ——

سعی میں وکالت

سوال جو شخص حج یا عمرہ کی سعی سے عاجز ہو تو اس کے لیے کیا حکم ہے؟ کیا وہ سعی یا طواف میں کسی کو اپنا نائب مقرر کر سکتا ہے؟ اور اگر حج کا وقت ختم ہونے کے بعد وہ خود تندرست ہو جائے تو کیا کرے؟

جواب طواف اور سعی میں وکالت صحیح نہیں ہے بلکہ لازم یہ ہے کہ طواف اور سعی کو خود کیا جائے خواہ اس کے لیے چارپائی یا گاڑی وغیرہ کا استعمال کیوں نہ کرنا پڑے۔ اگر کسی کو شدت مرض کے باعث اس کی بھی طاقت نہ ہو تو وہ بدستور حالت احرام میں رہے اور شفایاب ہونے کے بعد طواف و سعی کرے خواہ کئی ماہ گزر جائیں بشرطیکہ اس کے شفایاب ہونے کی امید ہو' اس کے لیے احرام کو ختم کرنا جائز نہیں ہے کیونکہ یہ کسی کے باطل کرنے سے باطل نہیں ہوتا اور اگر کوئی شخص شفایاب ہونے سے مایوس ہو جائے تو وہ محصر (راستے میں روکے ہوئے شخص) کی طرح ہے' اسے چاہیئے کہ ایک بکری ذبح کر کے حرم کے مسکینوں کو کھلا دے اور حلال ہو جائے کیونکہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿فَإِنْ أُحْصِرْتُمْ فَمَا اسْتَيْسَرَ مِنَ الْهَدْيِ﴾ (البقرة۲/ ۱۹۶)

"اور اگر (راستے میں) روک لیے جاؤ تو جیسی قربانی میسر ہو (کر دو۔)"

اور اگر بکری کی قیمت موجود نہ ہو تو پھر دس روزے رکھے اور پھر حلال ہو جائے۔ اور اگر کوئی شخص عرفہ سے قبل بیمار ہو جائے اور وقوف عرفہ نہ کر سکے تو اس کا حج فوت ہو گیا' لہٰذا اسے چاہیئے کہ عمرہ کر کے حلال ہو جائے۔ واللہ اعلم۔

——— شیخ ابن جبرین ———

اعمال حج

قربانی کے دن کے اعمال اور تقدیم و تاخیر

سوال قربانی کے دن حاجی کے لیے کون سے اعمال افضل ہیں اور کیا ان میں تقدیم و تاخیر بھی جائز ہے؟

جواب قربانی کے دن سنت یہ ہے کہ جمرات کی رمی کی جائے۔ جمرہ عقبہ سے جو مکہ کے ساتھ ملا ہوا ہے آغاز کیا جائے۔ اسے سات کنکریاں ماری جائیں' ہر کنکری الگ الگ ماری جائے' ہر کنکری کے ساتھ تکبیر پڑھی جائے اور اگر ہدی پاس ہو تو پھر ہدی کو ذبح کیا جائے' پھر حاجی سر کے بال منڈوایا کٹوا دے لیکن بالوں کو منڈوانا افضل ہے۔ پھر طواف کرے اور اگر سعی لازم ہو تو سعی بھی کرے۔ افضل تو یہی ہے جیسا کہ نبی کریم ﷺ نے بھی پہلے رمی کی' پھر قربانی کی' پھر بال منڈوائے اور پھر مکہ مکرمہ جا کر طواف کیا' تو یہ ترتیب افضل ہے' اور ان میں سے اگر کسی عمل کو دوسرے سے مقدم کر دیا تو پھر بھی کوئی حرج نہیں۔ اگر رمی سے پہلے قربانی کر دی' یا رمی سے پہلے افاضہ کر لیا' یا رمی سے پہلے بالوں کو منڈوا دیا' یا قربانی سے پہلے بالوں کو منڈوا دیا تو اس میں کوئی حرج نہیں کیونکہ نبی کریم ﷺ سے جب ان اعمال میں تقدیم و تاخیر کی بابت پوچھا گیا تو آپ نے یہی فرمایا:

«لاَ حَرَجَ لاَ حَرَجَ»(صحيح البخاري، الحج، باب الذبح قبل الحلق، ح:۱۷۲۱ وصحيح مسلم، الحج، باب جواز تقديم الذبح على الرمي ... الخ، ح:۱۳۰۶، ۱۳۰۷)

"اس میں کوئی حرج نہیں' اس میں کوئی حرج نہیں۔"

——— شیخ ابن باز ———

تحلل اول و ثانی کے معنی

سوال تحلل اول اور ثانی سے کیا مراد ہے؟

جواب تحلل اول سے مراد یہ ہے کہ حاجی تین میں سے دو کام کرے یعنی رمی اور حلق یا تقصیر کرے یا رمی اور طواف کرے یا طواف و حلق یا تقصیر کرے تو یہ تحلل اول ہے۔ اور جب وہ تینوں کام ہی کر لے یعنی رمی' طواف اور سر کے بالوں کو منڈوایا کٹوا لے تو یہ تحلل ثانی ہے۔ جب آدمی ان تینوں میں سے کوئی دو کام کر لے تو وہ سلا ہوا کپڑا پہن سکتا ہے' خوشبو استعمال کر سکتا ہے اور بیوی سے جنسی تعلق کے سوا ہر وہ کام اس کے لیے حلال ہو جاتا ہے' جو احرام کی وجہ سے حرام ہو گیا تھا۔ اور جب وہ تیسرا کام بھی سرانجام دے دے تو وہ مکمل طور پر حلال ہو جاتا ہے اور اس کے لیے جنسی عمل بھی جائز ہو جاتا ہے۔ بعض علماء کی یہ رائے ہے کہ جب آدمی عید کے دن رمی جمرہ کر لے تو اسے تحلل اول حاصل ہو جاتا ہے۔ یہ ایک جید (عمدہ) قول ہے' لہٰذا انسان ایسا کرے تو ان شاء اللہ کوئی حرج نہیں' لیکن افضل اور زیادہ محتاط بات یہ ہے کہ جلدی نہ کرے حتیٰ کہ اس کے بعد دوسرا عمل بھی کر لے یعنی بال منڈوا لے یا کٹوا لے یا رمی جمرہ کے بعد طواف کر لے کیونکہ حدیث عائشہ رضی اللہ عنہا میں ہے اگرچہ اس کی سند محل نظر ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

«إِذَا رَمَيْتُمْ وَحَلَقْتُمْ فَقَدْ حَلَّ لَكُمُ الطِّيبُ وَالثِّيَابُ وَكُلُّ شَيْءٍ إِلاَّ النِّسَاءَ» (مسند أحمد: ٦/ ١٤٣)

"جب تم رمی کر لو اور بال منڈوا لو تو تمہارے لیے سوائے عورتوں کے خوشبو' کپڑے (عام لباس) اور ہر چیز حلال ہے۔"

اس باب کی کچھ اور احادیث بھی ہیں جن سے یہی ثابت ہے اور پھر خود نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے جب عید کے دن جمرہ کو رمی کی' ہدی کو نحر کیا اور بال منڈوا دیئے تھے تو حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے آپ کو خوشبو لگائی تھی' ظاہر نص سے یوں معلوم ہوتا ہے کہ آپ نے رمی' نحر اور حلق کے بعد خوشبو استعمال فرمائی تھی۔ لہٰذا افضل اور محتاط بات یہ ہے کہ تحلل اول اس وقت تک اختیار نہ کرے جب تک رمی' حلق یا تقصیر نہ کر لے اور اگر یہ ممکن ہو کہ رمی کے بعد اور بال منڈوانے سے پہلے ہدی کو نحر کر لے تو یہ افضل بھی ہے اور اس طرح تمام احادیث پر عمل بھی ہو جاتا ہے۔

—— شیخ ابن باز ——

طواف اور سعی

تحیۃ المسجد کی جگہ بھی طواف کی دو رکعتیں ....

سوال جب میرا عمرہ یا حج کا ارادہ ہو اور میں نے احرام باندھا ہو تو مسجد حرام میں داخل ہو کر تحیۃ المسجد کی دو رکعتیں پڑھوں یا براہ راست طواف شروع کر دوں؟

جواب حج یا عمرہ کرنے والا جو شخص مسجد حرام میں داخل ہو تو اس کے لیے حکم شریعت یہ ہے کہ وہ سب سے پہلے طواف شروع کرے' طواف کی دو رکعتیں تحیۃ المسجد کی جگہ بھی کافی ہوں گی' ہاں البتہ اگر مسجد میں داخل ہوتے وقت طواف سے کوئی شرعی عذر مانع ہو تو پھر پہلے تحیۃ المسجد کی دو رکعتیں پڑھ لی جائیں اور پھر جب آسانی سے ممکن ہو طواف کر لیا جائے' اسی طرح اگر کوئی شخص مسجد میں اس وقت داخل ہو جب جماعت کھڑی ہو گئی ہو تو وہ پہلے باجماعت نماز ادا کرے اور پھر اس کے بعد طواف کرے۔ واللہ ولی التوفیق۔

———— شیخ ابن باز ————

کعبہ سے دور ہو کر طواف

سوال مقام (ابراہیم) یا زمزم کے پیچھے سے طواف کے بارے میں کیا حکم ہے؟

جواب اس میں کوئی حرج نہیں حتیٰ کہ اگر برآمدہ میں سے طواف کیا جائے تو وہ بھی صحیح ہو گا' لیکن جس قدر کعبہ سے قریب ہو افضل ہے بشرطیکہ گنجائش ہو اور رش نہ ہو۔ اور اگر کعبہ کے قریب ہو کر طواف کرنے میں دشواری ہو تو پھر دور سے طواف کرنے میں بھی کوئی حرج نہیں۔

———— شیخ ابن باز ————

حرم کی بالائی منزل سے طواف

سوال میں نے گزشتہ سال ۱۴۰۰ھ میں حج کیا تھا اور جب میں ایام تشریق کے دوسرے دن زوال کے فوراً بعد مکہ میں واپس آیا تو طواف وداع کے لیے سیدھا کعبہ کی طرف چلا گیا۔ ہمارے خیمے منیٰ کے آخر میں تھے تو وہاں سے پیدل چل کر ہم سیدھے حرم کی طرف چلے گئے اور جب حرم میں پہنچے تو دیکھا تو وہ لوگوں سے اس سے قدر بھرا ہوا ہے کہ طواف کرنے والے برآمدہ تک پہنچے ہوئے ہیں' یہ ظہر کا وقت تھا' ہم بہت تھکے ہوئے بھی تھے تو میرے دونوں ساتھیوں نے کہا کہ آؤ ہم بالائی منزل سے طواف کر لیں اور اس طرح دھوپ اور رش سے بھی بچ جائیں گے' چنانچہ ہم نے طواف کیا اور اپنے وطن واپس لوٹ گئے اور جب اس سال ہم حج کے لیے آئے اور منیٰ میں ادارات بحوث علمیہ و افتاء و دعوت وارشاد کے بعض شیوخ سے اس مسئلہ کے بارے میں پوچھا تو بعض نے کہا کہ بے پناہ رش کی وجہ سے جب لوگ برآمدے میں بھی طواف کر رہے تھے تو بالائی منزل میں طواف کرنے میں کوئی حرج نہیں اور بعض نے کہا کہ یہ جائز نہیں کیونکہ بالائی منزل کعبہ کی سطح سے اونچی ہے۔ امید ہے کہ آپ اس مسئلہ میں رہنمائی فرمائیں گے؟

جواب اگر امر واقع اسی طرح ہے جس طرح سوال میں مذکور ہے تو پھر بالائی منزل میں طواف کرنے میں کوئی حرج نہیں' آپ کا طواف صحیح ہے۔ وباللہ التوفیق۔ وصلی اللہ علی نبینا محمد وآلہ وصحبہ وسلم۔

———— فتویٰ کمیٹی ————

حامل اور محمول کی نیت سے طواف

سوال جب سعی یا طواف کرنے والے نے کسی چھوٹے بچے یا مریض کو اٹھا رکھا ہو تو کیا ایک طواف یا سعی حامل اور محمول دونوں کی طرف سے کافی ہو گا؟

جواب علماء کے صحیح قول کے مطابق حامل اور محمول کی طرف سے جب نیت کر لی گئی ہو تو ایک ہی طواف یا سعی کافی ہو گی۔

وصلی اللہ علی نبینا محمد وآلہ وصحبہ وسلم۔

—— فتویٰ کمیٹی ——

حجر کے اندر سے طواف

سوال ایک شخص نے حجر اسماعیل کے اندر سے طواف کیا' سعی کی' احرام کھول دیا اور گھر جا کر اپنی بیوی سے صحبت کر لی تو کیا اسے اس کا گناہ ہو گا؟

جواب یہ عمرہ فاسد ہے کیونکہ اس کا طواف صحیح نہیں ہے۔ اسے چاہیئے کہ دوبارہ طواف اور سعی کرے' بال منڈوائے اور دم دے۔ دم کا مطلب یہ ہے کہ عمرہ کی تکمیل سے پہلے اس نے اپنی بیوی سے صحبت کر لی ہے' اس کی وجہ سے مکہ مکرمہ میں ایک بکری ذبح کر کے فقراء میں تقسیم کر دے' نیز اس نے حجر کے اندر سے جو طواف کیا ہے' وہ بھی صحیح نہیں کیونکہ یہ ضروری ہے کہ طواف حجر کے باہر سے کیا جائے' حجر کے اندر سے طواف کرنے کی وجہ سے اس کا یہ عمرہ فاسد ہو گیا ہے لہٰذا اسے صحیح عمرہ کرنا چاہیئے اور اس کے لیے اسی میقات سے احرام باندھنا چاہیئے جس سے اس نے پہلے احرام باندھا تھا' نیز بیوی سے صحبت کی وجہ سے اس نے اپنے عمرہ کو جو فاسد کر لیا ہے لہٰذا اس پر واجب ہے کہ دوبارہ عمرہ کرے۔ واللہ ولی التوفیق۔

—— شیخ ابن باز ——

حجر کے اندر سے طواف

سوال کیا حج یا عمرہ کرنے والے کے لیے یہ صحیح ہے کہ طواف کرتے ہوئے وہ حجر اسماعیل کے اندر داخل ہو کر طواف کرے؟

جواب حج یا عمرہ کے لیے بیت اللہ کا طواف کرنے والے یا نفل طواف کرنے والے کے لیے یہ جائز نہیں کہ وہ حجر اسماعیل میں داخل ہو' اگر کسی نے حجر کے اندر سے طواف کیا تو اس کا یہ طواف صحیح نہیں ہو گا کیونکہ طواف بیت اللہ کے باہر سے کرنا ہے اور حجر تو بیت اللہ کا حصہ ہے اور ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ وَلْيَطَّوَّفُوا بِالْبَيْتِ الْعَتِيقِ ﴿٢٩﴾ ﴾ (الحج ٢٢/ ٢٩)

"اور چاہیے کہ وہ (لوگ) خانۂ قدیم (یعنی بیت اللہ) کا طواف کریں۔"

امام مسلم اور کئی دیگر ائمہ نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی یہ حدیث ذکر کی ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے حجر کے بارے میں پوچھا تو آپ نے فرمایا:

«هُوَ مِنَ الْبَيْتِ»(صحيح مسلم، الحج، باب جدر الكعبة وبابها، ح:٤٠٥/١٣٣٣ وسنن ابن ماجه، الحج، باب الطواف بالحجر، ح:٢٩٥٥ واللفظ له)

''وہ بیت اللہ ہی کا حصہ ہے۔''

ایک روایت میں الفاظ یہ ہیں کہ میری یہ خواہش تھی کہ بیت اللہ کے اندر نماز پڑھوں' تو آپ نے فرمایا:

«صَلِّي فِي الْحِجْرِ إِذَا أَرَدْتِ دُخُولَ الْبَيْتِ فَإِنَّمَا هُوَ قِطْعَةٌ مِّنَ الْبَيْتِ» (سنن أبي داود، المناسك، باب الصلاة في الحجر، ح:٢٠٢٨ وجامع الترمذي، ح:٨٧٦ وسنن النسائي، ح:٢٩١٥)

''جب بھی تو بیت اللہ میں داخل ہونا چاہے تو حجر کے اندر نماز پڑھ لے کیونکہ وہ (حجر) بھی بیت اللہ ہی کا حصہ ہے۔''

―――― فتویٰ کمیٹی ――――

رش میں عورتوں کے لیے حجر اسود کا بوسہ

سوال میں نے بعض طواف کرنے والوں کو دیکھا ہے کہ وہ حجر اسود کو بوسہ دینے کے لیے اپنی عورتوں کو آگے دھکیل رہے تھے تو ان میں سے کون سا عمل افضل ہے حجر اسود کو بوسہ دینا یا مردوں کے ہجوم سے دور رہنا؟

جواب اگر سائل نے یہ عجیب صورت حال دیکھی ہے تو میں نے اس سے بھی زیادہ تعجب انگیز صورت دیکھی ہے۔ میں نے دیکھا ہے کہ بعض لوگ فرض نماز کے سلام سے بھی پہلے اٹھ کھڑے ہوتے ہیں تاکہ دوڑ کر حجر اسود کو بوسہ دیں اور اس طرح وہ اپنی فرض نماز کو ضائع کر بیٹھتے ہیں' جو ارکان اسلام میں سے ایک ہے' اس عمل کی وجہ سے جو واجب نہیں ہے بلکہ مشروع بھی نہیں ہے الا یہ کہ طواف میں حجر اسود کو بوسہ دے' لہٰذا لوگوں کا یہ عمل جہالت پر مبنی ہے' جس کی وجہ سے انسان افسوس ہی کر سکتا ہے کیونکہ حجر اسود کو بوسہ دینا اور رکن یمانی کو چھونا صرف طواف ہی میں سنت ہے۔ مجھے نہیں معلوم کہ طواف کے علاوہ بھی حجر اسود کو بوسہ دینا سنت ہو اور اگر کسی شخص کو علم ہو کہ یہ سنت ہے اور وہ اس کی دلیل سے ہمیں بھی آگاہ کر دے تو اللہ تعالیٰ اسے جزائے خیر سے نوازے گا۔

ہمارے علم کے مطابق حجر اسود کو بوسہ دینا طواف کی سنتوں میں سے ایک ہے اور پھر یہ مسنون بھی اس صورت میں ہے کہ اس سے کسی طواف کرنے والے یا کسی دوسرے انسان کو کوئی اذیت نہ پہنچے اور اگر اس سے کسی کو اذیت پہنچے تو پھر ہمیں وہ دوسرا طریقہ اختیار کرنا چاہیئے جو رسول اللہ ﷺ نے ہمارے لیے مقرر فرمایا ہے اور وہ یہ کہ انسان حجر اسود کو ہاتھ سے چھو لے اور اپنے ہاتھ کو بوسہ دے لے[1] اور اگر اس میں بھی کوئی اذیت یا مشقت ہو تو پھر ہمیں وہ تیسرا طریقہ اختیار کرنا چاہیئے جو رسول اللہ ﷺ نے ہمیں تعلیم فرمایا ہے اور وہ یہ کہ ہم دونوں ہاتھوں سے نہیں بلکہ صرف اپنے دائیں ہاتھ سے حجر اسود کی طرف اشارہ کر دیں اور اس صورت میں اپنے ہاتھ کو بوسہ نہ دیں'[2] رسول اللہ ﷺ کی سنت سے یہی ثابت ہے۔

---

[1] صحیح بخاری' الحج' تقبیل الحجر' حدیث: 1610 - 1611 و صحیح مسلم' الحج' حدیث: 1268

[2] صحیح مسلم' الحج' باب جواز الطواف علی البعیر' حدیث: 1273 - 1274

سائل نے جو یہ ذکر کیا ہے کہ کچھ لوگ خود اپنے ہاتھوں سے اپنی خواتین کو حجر اسود کے بوسہ کے لیے آگے دھکیلتے ہیں تو یہ بے حد غیر محتاط اور نامناسب ہے' کیونکہ ہو سکتا ہے کہ عورت حاملہ ہو یا بڑھیا ہو یا ایسی دوشیزہ ہو جسے اس دھکم پیل کی استطاعت نہ ہو یا اس نے بچے کو اٹھا رکھا ہو۔ عورتوں کو دھکیلنا انتہائی منکر بات ہے کیونکہ اس سے انہیں نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہے' مردوں کو بھی اس سے تنگی اور بھیڑ کا سامنا کرنا پڑے گا اور یہ سب صورتیں حرمت یا کراہت سے خالی نہیں ہیں' لہٰذا مردوں کو چاہیئے کہ وہ اس طرح نہ کریں' جب اللہ تعالیٰ نے اس مسئلہ میں گنجائش رکھی ہے تو اس سے فائدہ اٹھانا چاہیئے اور اپنے آپ پر سختی نہیں کرنی چاہیئے ورنہ اللہ تعالیٰ بھی سختی فرمائے گا۔

——— شیخ ابن عثیمین ———

رکن یمانی کو چھونا اور اشارہ کرنا

سوال کعبہ مشرفہ کے رکن جنوبی و غربی کو چھونے یا اشارہ کرنے کے بارے میں کیا حکم ہے؟ رکن یمانی اور حجر اسود کے پاس تکبیروں کی تعداد کتنی ہونی چاہیئے' رہنمائی فرمائیں؟

جواب طواف کرنے والے کے لیے مشروع یہ ہے کہ طواف کے ہر چکر میں حجر اسود اور رکن یمانی کو چھوئے اور مستحب یہ ہے کہ ہر چکر میں حجر اسود کو چھونے کے ساتھ بوسہ بھی دے حتیٰ کہ اگر آسانی سے ممکن ہو تو آخری چکر میں بھی بوسہ دے۔ اگر مشقت ہو تو پھر بھیڑ کرنا مکروہ ہے' لہٰذا اس صورت میں ہاتھ یا عصا سے اشارہ کرے اور تکبیر کہے...... ہمارے علم کے مطابق رکن یمانی کی طرف اشارے کی کوئی دلیل نہیں ہے' اگر مشقت نہ ہو تو اسے دائیں ہاتھ سے چھوا جائے' بوسہ نہ دیا جائے اور یہ کہا جائے باسم اللہ واللہ اکبر یا اللہ اکبر........ مشقت ہو تو پھر اسے ہاتھ لگانا مشروع نہیں ہے' اس صورت میں اشارہ یا تکبیر کے بغیر بس اپنے طواف کو جاری رکھے کیونکہ اس صورت میں اشارہ یا تکبیر نبی کریم ﷺ یا حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے ثابت نہیں جیسا کہ میں نے اپنی کتاب "التحقیق والایضاح لکثیر من مسائل الحج والعمرة والزیارة" میں بیان کیا ہے۔

تکبیر صرف ایک بار ہے' اس کی تکرار کی کوئی دلیل نہیں۔ طواف میں جو آسانی سے ممکن ہوں دعائیں اور اذکار پڑھے جائیں اور جیسا کہ نبی کریم ﷺ کی سنت سے یہ ثابت ہے' طواف کے ہر چکر کو اس مشہور دعا پر ختم کیا جائے:

﴿ رَبَّنَآ ءَاتِنَا فِى ٱلدُّنْيَا حَسَنَةً وَفِى ٱلْءَاخِرَةِ حَسَنَةً وَقِنَا عَذَابَ ٱلنَّارِ ﴿٢٠١﴾ ﴾ (البقرة۲/ ۲۰۱)

"اے ہمارے رب! ہم کو دنیا میں بھی نعمت عطا فرما اور آخرت میں بھی نعمت بخش اور ہمیں دوزخ کے عذاب سے محفوظ فرما۔"

یاد رہے تمام اذکار اور دعائیں طواف اور سعی میں سنت ہیں' واجب نہیں ہیں۔ واللہ ولی التوفیق

——— شیخ ابن باز ———

طواف اور سعی میں طہارت

سوال کیا طواف اور سعی کے لیے طہارت لازم ہے؟

جواب صرف طواف کے لیے طہارت لازم ہے۔ سعی کے لیے افضل یہ ہے کہ طہارت کے ساتھ کی جائے اور اگر کسی نے طہارت کے بغیر سعی کر لی تو وہ بھی جائز ہو گی۔

——— شیخ ابن باز ———

طواف میں عورت کو چھونے کے بارے میں حکم

سوال ایک شخص بے حد رش میں طواف افاضہ کر رہا تھا کہ اس نے ایک اجنبی عورت کے جسم کو چھو لیا تو کیا اس سے طواف باطل ہو جائے گا؟ اور کیا وضو پر قیاس کرتے ہوئے اسے دوبارہ طواف شروع کرنا ہو گا؟

جواب اگر انسان طواف یا بھیڑ میں یا کسی بھی جگہ عورت کے جسم سے چھو جائے تو علماء کے صحیح قول کے مطابق اس سے طواف یا وضو کو کوئی نقصان نہیں پہنچتا۔ اس مسئلہ میں علماء کے کئی اقوال ہیں کہ لمس عورت سے وضو ٹوٹ جاتا ہے یا نہیں؟ ایک قول یہ ہے کہ اس سے مطلقاً وضو نہیں ٹوٹتا' دوسرا قول یہ ہے کہ اس سے مطلقاً وضو ٹوٹ جاتا ہے اور تیسرا قول یہ ہے کہ اگر لمس شہوت سے ہو تو اس سے وضو ٹوٹ جاتا ہے لیکن ان میں سے زیادہ راجح اور صحیح قول یہ ہے کہ اس سے مطلقاً وضو نہیں ٹوٹتا کیونکہ حدیث میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے بعض ازواج مطہرات کو بوسہ دیا اور پھر نماز ادا کی اور وضو نہ فرمایا اور پھر اصل وضو اور طہارت کی سلامتی ہے لہٰذا یہ نہیں کہا جا سکتا کہ وضو ٹوٹ جاتا ہے' الا یہ کہ کوئی ایسی دلیل ہو جس سے یہ ثابت ہو کہ لمس عورت سے مطلقاً وضو ٹوٹ جاتا ہے اور یہ جو قرآن مجید میں ہے:

﴿أَوْ لَـٰمَسْتُمُ ٱلنِّسَآءَ﴾ (المائدۃ: ٥/ ٦)

"یا تم نے عورتوں کو چھوا ہو۔"

تو اس کی صحیح تفسیر یہ ہے کہ اس سے مراد جماع ہے' اسی طرح دوسری قراءت "اَوْلَمَسْتُمُ النِّسَآءَ" کے مطابق بھی اس سے مراد جماع ہی ہے جیسا کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما اور ائمہ تفسیر کی ایک جماعت سے منقول ہے' اس سے محض لمس مراد نہیں ہے جیسا کہ حضرت ابن مسعود سے مروی ہے بلکہ صحیح بات یہ ہے کہ اس سے مراد جماع ہے جیسا کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما اور ائمہ تفسیر کی ایک جماعت سے منقول ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ جس شخص کا طواف میں عورت کے جسم سے لمس ہو جائے اس کا طواف صحیح ہے' وضو بھی صحیح ہے' جو شخص اپنی بیوی کو مس کرے یا اسے بوسہ دے تو اس کا وضو صحیح ہے' بشرطیکہ اس سے کوئی چیز خارج نہ ہو۔

——— شیخ ابن باز ———

آدھی رات سے پہلے جمرہ عقبہ کی رمی اور طہارت کے بغیر طواف

سوال میں نے حج کرتے ہوئے آدھی رات سے قبل جمرہ کبریٰ کو رمی کر لی اور پھر طواف افاضہ کے لیے فوراً حرم کی طرف چلا گیا اور طواف کرتے ہوئے میرا وضو ٹوٹ گیا لیکن رش کی وجہ سے میں نے اسی طرح طواف مکمل کر لیا اور طواف کی دو رکعتیں بھی نہ پڑھ سکا' پھر میں نے حدود حرم اور منیٰ کو چھوڑ دیا اور پھر نماز مغرب کے بعد ہی واپس لوٹا تو سوال یہ ہے کہ اس سے مناسک حج میں کوئی خلل آیا یا نہیں' یاد رہے میرا یہ حج مفرد تھا؟

جواب آدھی رات سے قبل رمی جمرہ جائز نہیں کیونکہ رمی جمرہ کا اول وقت قربانی (دس ذوالحجہ) کی آدھی رات کے بعد ہے' اس پر تمام اہل علم کا اتفاق ہے لہٰذا آدھی رات سے پہلے رمی کرنا جائز نہیں ہے۔

ثانیاً: طواف اگر آدھی رات سے پہلے کیا یا بعد میں وہ بھی صحیح نہیں کیونکہ یہ طواف طہارت کے بغیر کیا گیا ہے جیسا کہ اس نے خود بیان کیا ہے کہ طواف کے دوران اس کا وضو ٹوٹ گیا تھا' لہٰذا صحیح قول کے مطابق اس نے گویا طواف کیا ہی نہیں لہٰذا اس شخص پر واجب ہے کہ وہ ددبارہ رمی اور طواف کرے' بغیر وضو کیا ہوا یہ طواف صحیح نہیں ہے اور اگر رمی کے اوقات گزر جانے کے بعد اسے یہ یاد آئے تو پھر اس پر دم لازم ہے کیونکہ اس نے درحقیقت رمی کی ہی نہیں' لہٰذا ترک رمی کی وجہ سے اس کے ذمہ دم لازم ہے' اسی طرح طواف بھی لازم ہے خواہ کسی وقت بھی کر لے خواہ ذوالحجہ کے آخر میں یا محرم میں کر لے تاکہ حج مکمل ہو جائے' ترک رمی کی وجہ سے جانور کو مکہ مکرمہ ہی میں ذبح کر کے حرم کے فقراء میں تقسیم کرنا ہو گا۔ واللہ اعلم

——— شیخ ابن باز ———

جب دوران طواف نماز کھڑی ہو جائے

سوال حاجی یا معتمر نے طواف اور سعی مکمل نہیں کی اور نماز کھڑی ہو گئی تو اس کے بارے میں کیا حکم ہے کہ وہ کیا کرے؟

جواب وہ لوگوں کے ساتھ نماز پڑھے پھر اپنے طواف اور سعی کو مکمل کرے جہاں سے اس نے ختم کیا تھا۔ یعنی جہاں سے طواف چھوڑا تھا اب وہیں سے شروع کرے۔

——— شیخ ابن باز ———

جب طواف کرتے ہوئے جماعت کھڑی ہو جائے

سوال اگر کوئی انسان بیت اللہ شریف کا طواف شروع کرے اور ابھی تین یا چار چکر ہی لگائے اور جماعت کھڑی ہو جائے تو وہ کیا کرے؟ کیا طواف کو قطع کر دے یا مکمل کرے؟ اور اگر قطع کر دے تو کیا دوبارہ اسی جگہ سے شروع کرے جہاں چھوڑا تھا یا ازسرنو طواف شروع کرے؟

جواب جب جماعت کھڑی ہو جائے اور آدمی طواف کر رہا ہو تو وہ نماز میں شریک ہو جائے اور نماز سے فراغت کے بعد باقی طواف کی تکمیل کرے' نماز سے پہلے چکر اگر مکمل نہ ہو تو اسے شمار نہ کرے' یاد رہے مکمل چکر وہ ہے جو حجر اسود سے شروع ہو کر حجر اسود پر ختم ہو اور اگر چکر ابھی مکمل نہ ہو تو دوبارہ حجر اسود سے شروع کرے' احتیاط اسی میں ہے۔

——— شیخ ابن باز ———

جب طواف کے چکروں کی تعداد میں شک ہو تو ....

سوال گزشتہ رمضان میں میں نے عمرہ ادا کیا تھا' طواف کے آخر میں مجھے یہ شک پڑ گیا کہ چکر چھ ہوئے ہیں یا سات'

لہٰذا اس خوف کو دور کرنے کے لیے کہ چکروں کی تعداد کم نہ رہ جائے نیز شک کو دور کرنے کے لیے میں نے ایک اور چکر لگالیا تھا لیکن مجھے نہیں معلوم کہ میرا یہ عمل صحیح ہے یا نہیں؟ اور کیا اس سلسلہ میں مجھ پر کچھ لازم ہے یا نہیں؟

جواب آپ نے اچھا کیا کہ ایک چکر اور لگالیا' آپ پر یہی واجب تھا کیونکہ جسے طواف و سعی کے چکروں میں شک ہو تو اسے چاہیئے کہ یقین یعنی کم تعداد پر بنا رکھے جیسا کہ نماز میں اگر شک ہو کہ تین رکعتیں پڑھی ہیں یا چار تو وہ یقین پر بنا رکھے اور یقینی تعداد کم یعنی تین ہے اور پھر اس کے بعد چوتھی رکعت پڑھ کر سجدہ سہو کر لے خواہ امام ہو یا منفرد لیکن مقتدی اپنے امام ہی کے تابع ہوتا ہے' اسی طرح طواف اور سعی میں جسے شک ہو کہ اس نے چھ چکر لگائے ہیں یا سات تو اسے بھی یقینی یعنی کم تعداد پر بنا رکھنی چاہیئے اور اس کے بعد ساتواں چکر لگا لے' اس کے علاوہ اس پر کچھ لازم نہیں ہے۔ واللہ ولی التوفیق۔

——— شیخ ابن باز ———

طواف کی دو رکعتیں ----

سوال کیا طواف کی دو رکعتوں کے بارے میں یہ لازم ہے کہ مقام کے پیچھے ہی ادا کی جائیں؟ نیز جو شخص انہیں ادا کرنا بھول جائے اس کے بارے میں کیا حکم ہے؟

جواب ان دو رکعتوں کا مقام کے پیچھے ادا کرنا لازم نہیں ہے' بلکہ انہیں حرم میں ہر جگہ ہی ادا کیا جا سکتا ہے اور جو انہیں بھول جائے تو کوئی حرج نہیں کیونکہ یہ سنت ہیں' واجب نہیں ہیں۔ واللہ الموفق

——— شیخ ابن باز ———

جسے طواف قدوم کی استطاعت نہ ہو ....

سوال جسے طواف قدوم کی استطاعت نہ ہو کہ وہ مکہ مکرمہ میں یوم عرفہ کی عصر کے وقت پہنچا ہو تو کیا وہ حرم میں جانے کے بغیر سیدھا عرفہ چلا جائے یا کیا کرے؟

جواب اس شخص کو اختیار ہے کہ اگر چاہے تو مکہ میں داخل ہو کر طواف و سعی کرے' حالت احرام میں برقرار رہ کر عرفات چلا جائے اور وہاں جب تک اللہ تعالیٰ چاہے وقوف کرے' خواہ یہ وقوف رات ہی کو کر لے' پھر رات بسر کرنے کے لیے مزدلفہ چلاجائے اور اگر چاہے تو عرفات چلا جائے' غروب آفتاب تک وہاں وقوف کر لے' پھر لوگوں کے ساتھ مزدلفہ چلا جائے' وہاں مغرب و عشاء کی نمازیں ادا کرے اور شب بسر کرے اور پھر اس کے بعد قربانی کے دن یا اس کے بعد طواف اور سعی کرے اس میں کوئی حرج نہیں اور نہ اس پر کوئی دم وغیرہ لازم ہے جب کہ اس نے صرف حج ہی کا احرام باندھا ہو اور اگر اس نے حج اور عمرہ کا اکٹھا احرام باندھا ہو تو پھر اس پر ہدی تمتع لازم ہو گی اور وہ ہے اونٹ یا گائے کا ساتواں حصہ یا مینڈھا بکری یا بھیڑ کا ایک سال کا بچہ جسے' منیٰ یا مکہ میں ذبح کرے اور اس سے خود بھی کھائے اور صدقہ بھی کرے کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ لِّيَشْهَدُوا۟ مَنَـٰفِعَ لَهُمْ وَيَذْكُرُوا۟ ٱسْمَ ٱللَّهِ فِىٓ أَيَّامٍ مَّعْلُومَـٰتٍ عَلَىٰ مَا رَزَقَهُم مِّنۢ بَهِيمَةِ

ٱلْأَنْعَٰمِ ۖ فَكُلُوا۟ مِنْهَا وَأَطْعِمُوا۟ ٱلْبَآئِسَ ٱلْفَقِيرَ ﴿٢٨﴾ (الحج ٢٢/ ٢٨)

"تاکہ وہ (لوگ) اپنے فائدے کے کاموں کے لیے حاضر ہوں اور (قربانی کے) ایام معلوم میں چوپائے مویشیوں کے ذبح کے وقت جو اللہ نے ان کو دیئے ہیں' ان پر اللہ کا نام لیں' اس میں سے تم خود بھی کھاؤ اور فقیروں کو بھی کھلاؤ۔"

——— شیخ ابن باز ———

طواف افاضہ سے قبل وفات

سوال ایک شخص نے طواف افاضہ کے علاوہ دیگر تمام اعمال حج پورے کر لے اور پھر وہ فوت ہو گیا تو کیا اس کی طرف سے یہ طواف کیا جائے گا یا نہیں؟

جواب جو شخص طواف افاضہ کے سوا دیگر تمام اعمال حج کو پورا کر لے اور پھر فوت ہو جائے تو اس کی طرف سے طواف نہیں کیا جائے گا کیونکہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ ایک شخص رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ کھڑا تھا کہ اپنی سواری سے گر گیا جس سے اس کی گردن ٹوٹ گئی اور وہ فوت ہو گیا تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

«اِغْسِلُوهُ بِمَاءٍ وَّسِدْرٍ، وَكَفِّنُوهُ فِي ثَوْبَيْنِ، (وَلاَ تُحَنِّطُوهُ) وَلاَ تُخَمِّرُوا رَأْسَهُ وَلاَ وَجْهَهُ فَإِنَّ اللهَ تَعَالٰى يَبْعَثُهُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ مُلَبِّيًا»(صحيح البخاري، جزاء الصيد، باب المحرم يموت بعرفة ... الخ، ح:١٨٤٩، ١٨٥٠ وصحيح مسلم، الحج، باب ما يفعل بالمحرم إذا مات، ح:١٢٠٦ واللفظ لمسلم)

"اسے پانی اور بیری کے پتوں کے ساتھ غسل دو' احرام کے دونوں کپڑوں ہی میں کفن دے دو' خوشبو استعمال نہ کرو' اس کے سر کو نہ ڈھانپو' اللہ تعالیٰ اسے قیامت کے دن اس حال میں اٹھائے گا کہ یہ شخص تلبیہ کہہ رہا ہو گا"

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ حکم نہیں دیا کہ اس کی طرف سے طواف کیا جائے بلکہ آپ نے یہ خبر دی کہ اسے اللہ تعالیٰ قیامت کے دن اس حال میں اٹھائے گا کہ یہ تلبیہ کہہ رہا ہو گا کیونکہ وہ حالت احرام میں باقی رہا کہ نہ اس نے خود طواف کیا اور نہ اس کی طرف سے طواف کیا گیا۔

——— فتویٰ کمیٹی ———

طواف کو سعی سے مؤخر کرنا

سوال اس شخص کے بارے میں کیا حکم ہے جس نے طواف افاضہ تو کر لیا لیکن سعی نہ کی' حتیٰ کہ ایام تشریق کے آخری دن کا سورج بھی غروب ہو گیا اور اگر یہ اس دن غروب آفتاب کے بعد اور ایام تشریق کے بعد سعی کرے تو اس سعی کے بارے میں کیا حکم ہے؟

جواب ایام تشریق کے آخری دن یا اس کے بعد سعی کرنا صحیح ہے اور اس تاخیر میں کوئی حرج نہیں کیونکہ سعی کی صحت

کے لیے یہ شرط نہیں ہے کہ وہ طواف ہی کے ساتھ متصل ہو لیکن نبی ﷺ کے اسوۂ حسنہ کے پیش نظر کمال کی بات یہی ہے کہ سعی طواف کے متصل بعد ہو۔

—— فتویٰ کمیٹی ——

رمی یا وقوف عرفہ سے قبل طواف افاضہ

سوال کیا یہ جائز ہے کہ جمرہ عقبہ کبریٰ کی رمی یا وقوف عرفہ سے قبل طواف افاضہ اور سعی کر لی جائے' رہنمائی فرمائیں' اللہ تعالیٰ آپ کو جزائے خیر سے نوازے؟

جواب حج کے طواف اور سعی کو رمی سے پہلے سرانجام دینا جائز ہے لیکن طواف حج کو عرفات سے پہلے یا قربانی کی نصف رات سے پہلے سرانجام دینا جائز نہیں کیونکہ جب عرفات سے واپس لوٹے اور عید کی رات مزدلفہ سے واپس آئے تو پھر اس کے لیے یہ جائز ہے کہ قربانی کی رات کے نصف اخیر میں طواف اور سعی کرے' نیز قربانی کے دن رمی سے پہلے بھی طواف اور سعی کر سکتا ہے۔ ایک شخص نے نبی کریم ﷺ سے پوچھا کہ میں نے رمی سے پہلے افاضہ کر لیا ہے تو آپ نے فرمایا:

«لاَ حَرَجَ»(صحيح البخاري، الحج، باب الذبح قبل الحلق، ح:١٧٢٢ وصحيح مسلم، الحج، باب جواز تقديم الذبح على الرمي ... الخ، ح:١٣٠٦، ١٣٠٧)

"کوئی حرج نہیں۔"

لہٰذا جب عید کی صبح یا رات کے آخری حصہ میں مزدلفہ سے آئیں تو عورتوں اور ان جیسے کمزور لوگوں کے لیے یہ جائز ہے کہ وہ پہلے طواف کر لیں تاکہ عورت کے ایام نہ شروع ہو جائیں' اسی طرح کمزور مردوں کے لیے بھی جائز ہے کہ وہ پہلے طواف کر لیں اور پھر رمی کر لیں' اس میں کوئی حرج نہیں لیکن افضل یہ ہے کہ پہلے رمی کی جائے' پھر ہدی کو نحر کیا جائے' اگر ہدی موجود ہو' پھر بالوں کو منڈوایا یا کٹوایا جائے لیکن منڈوانا افضل ہے' پھر آخری طواف کیا جائے' رسول اللہ ﷺ نے بھی اسی طرح کیا تھا کہ عید کے دن جمرہ کو رمی کی'[1] پھر خوشبو استعمال فرمائی' پھر سواری کے ذریعہ بیت اللہ تشریف لے گئے اور طواف فرمایا لیکن اگر کوئی شخص ان میں سے بعض اعمال کو بعض دیگر سے پہلے کر لے مثلاً رمی سے پہلے نحر کر لے یا قربانی سے پہلے بال منڈا لے یا رمی سے پہلے بال منڈا لے یا رمی سے پہلے طواف کر لے یا قربانی سے پہلے طواف یا بال منڈانے سے پہلے طواف کر لے تو الحمدللہ یہ تمام صورتیں جائز ہیں کیونکہ رسول اللہ ﷺ سے جب تقدیم و تاخیر کے بارے میں پوچھا گیا تو آپ نے فرمایا:

«لاَ حَرَجَ لاَ حَرَجَ»(صحيح البخاري، الحج، باب الذبح قبل الحلق، ح:١٧٢١ وصحيح مسلم، الحج، باب جواز تقديم الذبح على الرمي ... الخ، ح:١٣٠٦، ١٣٠٧)

کوئی حرج نہیں' کوئی حرج نہیں۔"

—— شیخ ابن باز ——

---

[1] صحیح مسلم' الحج' باب حجۃ النبی ﷺ' حدیث: 1218

طواف افاضہ میں تاخیر

سوال کیا طواف افاضہ کو طواف وداع کے ساتھ مؤخر کرنا جائز ہے؟ کیا حاجی کے لیے یہ جائز ہے کہ وہ طواف کے سات چکروں میں پانی پینے کے لیے وقفہ کرے؟

جواب رش وغیرہ کے خوف کی وجہ سے طواف افاضہ کو مؤخر کرنا جائز ہے' لہٰذا مکہ سے رخصت ہوتے ہوئے افاضہ اور وداع کی نیت سے طواف کر لے تو یہ دونوں سے کفایت کرے گا اور اس کے بعد رخصت ہو جائے تاکہ اس پر یہ بات صادق آ سکے کہ اس نے آخری لمحات بیت اللہ میں گزارے ہیں' لیکن افضل یہ ہے کہ طواف افاضہ عید کے دن یا ایام تشریق میں کیا جائے جب کہ اسے مؤخر کرنا بھی جائز ہے۔

طواف کے چکروں میں تھوڑا سا وقفہ کرنا جائز ہے مثلاً اس قدر کہ وضو کی تجدید کی جا سکے' پانی پیا جا سکے' فرض نماز یا نماز جنازہ وغیرہ ادا کی جا سکے۔

اگر وقفہ طویل ہو مثلاً آدھا گھنٹہ یا اس سے بھی زیادہ تو پھر صحیح بات یہ ہے کہ اس سے طواف باطل ہو جائے گا' لہٰذا اسے چاہیئے کہ اس قدر طویل وقفہ کے بعد طواف از سرنو شروع کرے۔ صفا و مروہ کی سعی کے بارے میں بھی یہی حکم ہے۔ واللہ اعلم

——— شیخ ابن جبرین ———

طواف افاضہ' طواف وداع سے بھی کفایت کرتا ہے

سوال جو شخص طواف افاضہ مؤخر کر دے اور پھر طواف افاضہ اور طواف وداع کی نیت کر کے ایک ہی طواف کر لے تو اس کے بارے میں کیا حکم ہے؟ کیا طواف افاضہ رات کو بھی کیا جا سکتا ہے؟

جواب اعمال حج کے بعد سفر کے وقت اگر یہ طواف کیا جائے تو اس میں کوئی حرج نہیں' طواف افاضہ' طواف وداع سے بھی کفایت کر جائے گا خواہ طواف افاضہ کے ساتھ طواف وداع کی نیت کرے یا نہ کرے۔ مقصود یہ ہے کہ طواف افاضہ' طواف وداع سے بھی کفایت کر جاتا ہے جب کہ وہ مکہ سے خروج کے وقت کیا جائے اور اگر ان دونوں (طواف افاضہ اور وداع) کی نیت کرے تو بھی کوئی حرج نہیں۔ یاد رہے طواف افاضہ اور طواف وداع دن ہو یا رات ہر وقت کرنا جائز ہے۔

——— شیخ ابن باز ———

طواف وداع کے بعد کیا واجب ہے؟

سوال طواف وداع کے بعد حاجی کے ذمہ کیا واجب ہے؟

جواب طواف وداع اعمال حج میں سے آخری عمل ہے۔ اس کے بعد حاجی کو ملتزم کے پاس کھڑے ہو کر دعا کرنی چاہیئے کہ اللہ تعالیٰ اسے دوبارہ بیت اللہ شریف آنے کی توفیق عطا فرمائے' یہ اس کی آخری حاضری نہ ہو' اس کے علاوہ اور بھی مناسب دعائیں کرے اور پھر معمول کی چال کے ساتھ بیت اللہ شریف سے نکل جائے یعنی یہ حکم شریعت نہیں کہ واپسی کے وقت وہ الٹے پاؤں چلے بلکہ معمول ہی کی چال چلے کہ بیت اللہ شریف اس کے پیچھے ہو اور پھر اپنے سفر پر روانہ ہو

جائے اور اگر کسی ضرورت کے بغیر طواف وداع کے بعد مکہ میں طویل قیام کیا ہو مثلاً نصف دن تک تو پھر دوبارہ طواف وداع کرے اور اگر اس نے تجارت یعنی خرید و فروخت کے لیے قیام کیا یا کوئی ایسا کام کیا جس سے اقامت میں رغبت معلوم ہوتی ہو تو پھر بھی اسے دوبارہ طواف وداع کرنا ہو گا اور اگر اس کے بعد اس نے سفر یا اپنے اہل و عیال کی ضرورت کے لیے کوئی چیز خریدی تو پھر دوبارہ طواف وداع لازم نہیں ہے۔ واللہ اعلم۔

——— شیخ ابن جبرین ———

طواف وداع کے بعد سفر نہ کر سکا

سوال ایک آدمی نے حج کیا اور رات کو طواف وداع کیا لیکن طواف کے بعد اس کے لیے مکہ سے خروج ممکن نہ ہوا لہٰذا اس نے صبح تک مکہ ہی میں قیام کیا اور پھر سفر کیا تو اس کے بارے میں کیا حکم ہے؟

جواب حکم شریعت یہ ہے کہ حاجی طواف وداع اس وقت کرے جب وہ مکہ سے رخصت ہو رہا ہو کیونکہ ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی متفق علیہ حدیث میں ہے:

«أُمِرَ النَّاسُ أَنْ يَكُونَ آخِرُ عَهْدِهِمْ بِالْبَيْتِ إِلاَّ أَنَّهُ خُفِّفَ عَنِ الْحَائِضِ» (صحيح البخاري، الحج، باب طواف الوداع، ح:١٧٥٥ وصحيح مسلم، الحج، باب وجوب طواف الوداع ... الخ، ح:١٣٢٨)

"لوگوں کے لیے حکم یہ ہے کہ وہ سفر سے قبل آخری لمحات بیت اللہ میں گزاریں ہاں البتہ حائضہ عورت کے لیے تخفیف (رخصت) ہے۔"

اس شخص نے رات کو اگر اس نیت سے طواف کیا تھا کہ طواف کے بعد خروج کر جانا ہے لیکن صبح تک خروج ممکن نہ ہوا تو اس کے ذمہ کچھ لازم نہیں' ہاں البتہ اگر وہ دوبارہ طواف کرے تو اس میں زیادہ احتیاط ہے۔

——— فتویٰ کمیٹی ———

رش کی وجہ سے طواف وداع میں تاخیر

سوال ہم جدہ کے باشندے ہیں' گزشتہ سال ہم نے حج کیا اور طواف وداع کے علاوہ دیگر تمام مناسک حج کو پورا کیا اور اس طواف کو ذوالحج کے آخر تک مؤخر کر دیا اور جب رش کم ہو گیا تو ہم نے مکہ واپس آ کر طواف کیا تو سوال یہ ہے کیا ہمارا یہ حج صحیح ہے؟

جواب جب انسان حج کرے اور طواف وداع کو دوسرے وقت تک مؤخر کر دے تو اس کا حج صحیح ہے۔ اسے مکہ سے خروج کے وقت طواف کر لینا چاہئے لیکن جو شخص جدہ' طائف یا مدینہ وغیرہ کا باشندہ ہو تو اسے طواف وداع کے بغیر سفر نہیں کرنا چاہئے۔ یاد رہے طواف وداع بیت اللہ شریف کے گرد صرف سات چکروں پر مشتمل ہے اور اس میں صفا و مروہ کی سعی نہیں ہے۔

اگر کوئی شخص طواف وداع کے بغیر خروج کر جائے تو جمہور اہل علم کے نزدیک اس پر دم لازم ہے جسے مکہ میں ذبح کر

کے مکہ کے فقراء و مساکین میں تقسیم کر دیا جائے' اس کا حج صحیح ہو گا' جمہور اہل علم کا یہی مذہب ہے۔ حاصل کلام یہ کہ اہل علم کے صحیح قول کے مطابق طواف وداع واجب ہے اور ابن عباس رضی اللہ عنہما سے ثابت ہے کہ "جو شخص حج کے کسی واجب کو ترک کر دے یا بھول جائے تو وہ خون بہائے۔" [1]

لہٰذا جو انسان عمداً اسے ترک کر دے' اسے ایک جانور ذبح کر کے مکہ کے فقراء و مساکین میں تقسیم کر دینا چاہیئے' مکہ میں دوبارہ واپس لوٹنے سے یہ دم ساقط نہ ہو گا۔ میرے نزدیک یہی مختار اور راجح قول ہے۔ واللہ اعلم

——— شیخ ابن باز ———

حیض و نفاس والی عورت کے لیے طواف وداع نہیں ہے

سوال کیا حیض و نفاس والی عورت اور عاجز و مریض کے لیے طواف وداع لازم ہے؟ میں نے اس مسئلہ کے بارے میں منیٰ میں جب علماء سے پوچھا تو وہ متفق نہ تھے' بعض کہہ رہے تھے کہ ان کے لیے یہ طواف لازم نہیں ہے اور بعض کی رائے یہ تھی کہ ان کے لیے بھی یہ طواف لازم ہے؟

جواب حیض و نفاس والی عورت کے لیے طواف وداع لازم نہیں ہے' ہاں البتہ عاجز و مریض کو اٹھا کر طواف کرایا جائے کیونکہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا:

«لاَ يَنْفِرَنَّ أَحَدٌ حَتَّى يَكُونَ آخِرُ عَهْدِهِ بِالْبَيْتِ»(صحيح مسلم، الحج، باب وجوب طواف الوداع وسقوطه عن الحائض، ح:١٣٢٧ ومسند أحمد:١/ ٢٢٢)

"کوئی اس وقت تک سفر نہ کرے جب تک وہ آخری وقت بیت اللہ میں نہ گزارے"

اور "صحیحین" میں ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے:

«أُمِرَ النَّاسُ أَنْ يَّكُونَ آخِرُ عَهْدِهِمْ بِالْبَيْتِ إِلاَّ أَنَّهُ خُفِّفَ عَنِ الْحَائِضِ» (صحيح البخاري، الحج، باب طواف الوداع، ح:١٧٥٥ وصحيح مسلم، الحج، باب وجوب طواف الوداع ... الخ، ح:١٣٢٨)

"لوگوں کے لیے حکم یہ ہے کہ وہ سفر سے قبل آخری لحات بیت اللہ میں گزاریں ہاں البتہ حائضہ عورت کے لیے رخصت ہے۔"

ایک اور حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ نفاس والی عورت بھی حائضہ کی طرح ہے کہ اس پر بھی طواف وداع نہیں ہے۔

——— فتویٰ کمیٹی ———

عذر کی وجہ سے طواف وداع کا ایک چکر----

سوال میں نے ایک جماعت کے ساتھ حج کیا اور الحمدللہ حج کے تمام مناسک کو ادا کیا لیکن طواف وداع کے چھٹے چکر کے اختتام پر میری بیوی بے ہوش ہو گئی اور میں مجبور ہو گیا کہ اسے اٹھا کر حرم سے باہر لے جاؤں جس کی وجہ سے میں' میری

[1] موطأ إمام مالك' الحج' باب جامع الفدية' حديث: 257' 1/419/420

بیوی اور اس کا بھائی ساتواں چکر پورا نہ کر سکے۔ کیا ہم پر کوئی فدیہ وغیرہ لازم ہے؟

جواب اگر آپ لوگوں نے دوبارہ طواف وداع نہیں کیا تو آپ میں سے ہر ایک پر دم لازم ہے جسے مکہ میں ذبح کر کے فقراء حرم میں تقسیم کر دیا جائے کیونکہ طواف وداع ہر اس حاجی پر واجب ہے جو مکہ مکرمہ میں سے سفر کرنا چاہتا ہو اور اسے ترک کرنے کی صورت میں دم لازم ہے۔ دم کے سلسلہ میں واجب یہ ہے کہ اونٹ یا گائے کا ساتواں حصہ یا وہ بکری جس کے سامنے کے دو دانت گر گئے ہوں یا بھیڑ کا ایسا بچہ ذبح کرے جو قربانی کے جانور کی طرح تمام عیوب سے پاک ہو اور اس کے ساتھ ساتھ توبہ و استغفار بھی کیا جائے کیونکہ نبی ﷺ کے اس ارشاد کے پیش نظر:

«لاَ يَنْفِرَنَّ أَحَدٌ حَتَّى يَكُونَ آخِرُ عَهْدِهِ بِالْبَيْتِ»(صحيح مسلم، الحج، باب وجوب طواف الوداع ... الخ، ح:١٣٢٧ ومسند أحمد: ١/ ٢٢٢)

''کوئی اس وقت تک کوچ نہ کرے' جب تک اپنا آخری وقت بیت اللہ میں نہ گزارے۔''

طواف وداع کو ترک کرنا جائز نہیں ہے۔ یہ حدیث صحیح مسلم میں ہے۔ نیز ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے:

«أُمِرَ النَّاسُ أَنْ يَكُونَ آخِرُ عَهْدِهِمْ بِالْبَيْتِ إِلاَّ أَنَّهُ خُفِّفَ عَنِ الْحَائِضِ» (صحيح البخاري، الحج، باب طواف الوداع، ح:١٧٥٥ وصحيح مسلم، الحج، باب وجوب طواف الوداع ... الخ، ح:١٣٢٨)

''لوگوں کے لیے حکم یہ ہے کہ وہ سفر سے قبل آخری لمحات بیت اللہ میں گزاریں ہاں' البتہ حائضہ عورت کے لیے رخصت ہے۔''

اہل علم کے نزدیک اس مسئلہ میں حیض اور نفاس والی عورتوں کے لیے ایک ہی حکم ہے۔

——— شیخ ابن باز ———

جو حاجی طواف وداع ترک کر دے

سوال اس حاجی کے لیے کیا حکم ہے' جو طواف وداع ترک کر دے؟

جواب رسول اللہ ﷺ کی صحیح حدیث ہے:

«لاَ يَنْفِرَنَّ أَحَدٌ حَتَّى يَكُونَ آخِرُ عَهْدِهِ بِالْبَيْتِ»(صحيح مسلم، الحج، باب وجوب طواف الوداع وسقوطه عن الحائض، ح:١٣٢٧ ومسند أحمد: ١/ ٢٢٢)

''کوئی اس وقت تک کوچ نہ کرے جب تک آخری وقت بیت اللہ میں نہ گزار لے۔''

اور صحیحین میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما ہی سے مروی یہ حدیث بھی ہے

«أُمِرَ النَّاسُ أَنْ يَكُونَ آخِرُ عَهْدِهِمْ بِالْبَيْتِ إِلاَّ أَنَّهُ خُفِّفَ عَنِ الْحَائِضِ» (صحيح البخاري، الحج، باب طواف الوداع، ح:١٧٥٥ وصحيح مسلم، الحج، باب وجوب طواف الوداع ... الخ، ح:١٣٢٨)

''لوگوں کے لیے حکم یہ ہے کہ وہ سفر سے قبل آخری لمحات بیت اللہ میں گزاریں' ہاں البتہ حائضہ عورت کے

لیے رخصت ہے۔"

حجۃ الوداع کے موقع پر نبی ﷺ جب تمام اعمال حج سے فارغ ہو کر سفر کا ارادہ فرما رہے تھے تو آپ نے بھی سب سے آخری عمل جو سرانجام دیا وہ طواف وداع ہی تھا اور آپ نے فرمایا:

«خُذُوا عَنِّي مَنَاسِكَكُمْ»(صحيح مسلم، الحج، باب استحباب رمي جمرة العقبة ... الخ، ح:١٢٩٧ والسنن الكبرى للبيهقي: ٥/ ١٢٥ واللفظ له)

"مجھ سے مناسک حج سیکھ لو۔"

یہ تمام احادیث اس بات پر دلالت کناں ہیں کہ حائضہ و نفساء کے علاوہ دیگر تمام خواتین و حضرات کے لیے طواف وداع واجب ہے' لہٰذا جو حاجی اسے ترک کر دے تو اس پر دم لازم ہے کیونکہ اس نے سنت کی مخالفت کی اور ایک واجب کو ترک کر دیا' چنانچہ اس مسئلہ میں علماء کا صحیح قول یہی ہے۔ حضرت ابن عباس ؓ سے روایت ہے کہ جو شخص حج کے کسی واجب کو ترک کر دے یا بھول جائے تو وہ خون بہائے' [1] اکثر اہل علم کا یہی قول ہے۔ حضرت ابن عباس ؓ کی مذکورہ حدیث اور اس مضمون کی دیگر احادیث کی وجہ سے حیض اور نفاس والی عورت پر طواف وداع نہیں ہے۔

——— شیخ ابن باز ———

طواف وداع واجب ہے

سوال میں جدہ کا باشندہ ہوں اور میں نے سات بار حج کیا ہے' لیکن طواف وداع نہیں کیا' کیونکہ بعض لوگ یہ کہتے ہیں کہ جدہ کے باشندوں کے لیے طواف وداع نہیں ہے۔ تو سوال یہ ہے کہ طواف وداع نہ کرنے کی وجہ سے کیا میرا حج صحیح ہے یا نہیں' رہنمائی فرمائیں' جزاکم اللہ خیراً؟

جواب جدہ' طائف اور ان جیسے دیگر علاقوں کے باشندوں کے لیے بھی یہ واجب ہے کہ حج سے فراغت کے بعد طواف وداع کئے بغیر مکہ مکرمہ سے رخصت نہ ہوں کیونکہ نبی ﷺ کا یہ فرمان عام ہے جس میں آپ نے تمام حاجیوں سے مخاطب ہو کر فرمایا:

«لاَ يَنْفِرَنَّ أَحَدٌ حَتَّى يَكُونَ آخِرُ عَهْدِهِ بِالْبَيْتِ»(صحيح مسلم، الحج، باب وجوب طواف الوداع وسقوطه عن الحائض، ح:١٣٢٧ ومسند أحمد: ١/ ٢٢٢)

"کوئی اس وقت تک کوچ نہ کرے جب تک وہ آخری وقت بیت اللہ میں نہ گزارے۔"

اور صحیحین میں حضرت ابن عباس ؓ سے روایت ہے:

«أُمِرَ النَّاسُ أَنْ يَكُونَ آخِرُ عَهْدِهِمْ بِالْبَيْتِ إِلاَّ أَنَّهُ خُفِّفَ عَنِ الْحَائِضِ» (صحيح البخاري، الحج، باب طواف الوداع، ح:١٧٥٥ وصحيح مسلم، الحج، باب وجوب طواف الوداع ... الخ، ح:١٣٢٨)

"لوگوں کے لیے حکم یہ ہے کہ وہ سفر سے قبل آخری لمحات بیت اللہ میں گزاریں۔ ہاں البتہ حائضہ عورت

[1] موطأ إمام مالک' الحج' باب جامع الفدية' حديث: 257' 420/419/1

کے لیے رخصت ہے۔"

جو شخص طواف وداع ترک کر دے تو اس پر دم لازم ہے۔ دم اونٹ یا گائے کے ساتویں حصہ میں شرکت یا ایسی بکری جس کے سامنے کے دو دانت گر گئے ہوں یا بھیڑ کا بچہ مکہ میں ذبح کر کے فقراء میں تقسیم کرنا ہے۔

اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی لازم ہے کہ توبہ و استغفار کیا جائے اور یہ عزم صادق کہ آئندہ ایسا نہیں کیا جائے گا۔ حیض و نفاس والی عورتوں کے لیے یہ طواف واجب نہیں ہے۔ اسی طرح علماء کے صحیح قول کے مطابق عمرہ کرنے والے کے لیے بھی طواف وداع نہیں ہے۔ جمہور اہل علم کا بھی یہی قول ہے جیسا کہ ابن عبدالبرنے' بہت سے دلائل کی بنا پر اجماع بیان کیا ہے۔ مثلاً جو لوگ حجۃ الوداع کے موقع پر عمرہ کر کے حلال ہو گئے تھے' نبی ﷺ نے انہیں یہ حکم نہیں دیا تھا کہ وہ مکہ سے سفر کرتے وقت طواف وداع کریں' اسی طرح حجۃ الوداع کے موقع پر مکہ کے باشندوں کو آپ نے یہ حکم دیا تھا کہ وہ اپنے گھروں ہی سے منیٰ اور پھر عرفہ چلے جائیں' انہیں بھی آپ نے طواف وداع کا حکم نہیں دیا تھا۔ واللہ ولی التوفیق۔

——— شیخ ابن باز ———

طواف وداع سے قبل جدہ کا سفر

سوال کیا حاجی کے لیے یہ جائز ہے کہ وہ طواف وداع کیے بغیر جدہ کا سفر کرے اور جو ایسا کرے اس کے لیے کیا لازم ہے؟

جواب حاجی کے لیے یہ جائز نہیں کہ حج کے بعد وہ طواف وداع کیے بغیر مکہ سے کوچ کرے کیونکہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا ہے:

«لاَ يَنْفِرَنَّ أَحَدٌ حَتَّى يَكُونَ آخِرُ عَهْدِهِ بِالْبَيْتِ»(صحيح مسلم، الحج، باب وجوب طواف الوداع وسقوطه عن الحائض، ح:١٣٢٧ ومسند أحمد:١/ ٢٢٢)

"کوئی شخص اس وقت تک کوچ نہ کرے' جب تک وہ آخری لمحات بیت اللہ میں نہ گزارے۔"

صحیحین میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے:

«أُمِرَ النَّاسُ أَنْ يَكُونَ آخِرُ عَهْدِهِمْ بِالْبَيْتِ إِلاَّ أَنَّهُ خُفِّفَ عَنِ الْحَائِضِ» (صحيح البخاري، الحج، باب طواف الوداع، ح:١٧٥٥ وصحيح مسلم، الحج، باب وجوب طواف الوداع ... الخ، ح:١٣٢٨)

"لوگوں کے لیے حکم یہ ہے کہ وہ (سفر سے قبل) آخری لمحات بیت اللہ میں گزاریں' ہاں البتہ حائضہ عورت کے لیے یہ رخصت ہے۔"

لہٰذا جدہ' طائف اور دیگر علاقوں کے لوگوں کے لیے جائز نہیں کہ حج سے فراغت کے بعد طواف وداع کیے بغیر مکہ مکرمہ سے رخصت ہوں اور اگر کوئی ایسا کرے تو اس پر دم لازم ہے کیونکہ اس نے ایک واجب کو ترک کر دیا ہے۔

بعض اہل علم نے کہا ہے کہ اگر طواف وداع کی نیت سے واپس آ جائے اور طواف کرے تو یہ طواف صحیح ہو گا اور اس سے دم ساقط ہو جائے گا لیکن یہ قول محل نظر ہے اور مومن کے لیے زیادہ احتیاط اس میں ہے کہ اگر اس نے طواف وداع

کئے بغیر مسافت قصر کے بقدر سفر کر لیا ہو تو وہ حج کے اس نقص کو پورا کرنے کے لیے دم دے۔

——— شیخ ابن باز ———

عمرہ کرنے والے کے لیے طواف وداع اور.........

سوال کیا عمرہ میں بھی طواف وداع واجب ہے؟ کیا عمرہ یا حج میں طواف وداع کے بعد مکہ مکرمہ سے کوئی چیز خریدنا جائز ہے؟

جواب عمرہ میں طواف وداع واجب نہیں ہے' ہاں البتہ یہ افضل ضرور ہے لیکن اگر کوئی بغیر طواف وداع سفر کر جائے تو کوئی حرج نہیں' ہاں البتہ حج میں یہ واجب ہے کیونکہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا ہے:

«لاَ يَنْفِرَنَّ أَحَدٌ حَتَّى يَكُونَ آخِرُ عَهْدِهِ بِالْبَيْتِ»(صحيح مسلم، الحج، باب وجوب طواف الوداع وسقوطه عن الحائض، ح:١٣٢٧ ومسند أحمد:١/ ٢٢٢)

"کوئی اس وقت تک کوچ نہ کرے جب تک آخری وقت بیت اللہ میں نہ گزارے۔"

یہ بات آپ نے حاجیوں کو خطاب کرتے ہوئے فرمائی تھی۔

طواف وداع کے بعد آدمی اپنی ضرورت کی تمام اشیاء خرید سکتا ہے اگر تجارت کے لیے بھی خریدے تو کوئی حرج نہیں بشرطیکہ مدت قلیل ہو طویل نہ ہو اور اگر مدت طویل ہو جائے تو اسے دوبارہ طواف (وداع) کرنا ہو گا اور اگر عرف کے مطابق مدت طویل نہ ہو تو پھر طواف کا مطلقاً اعادہ نہیں ہے۔

——— شیخ ابن باز ———

والدین اور رشتہ داروں کے لیے طواف

سوال کیا یہ جائز ہے کہ انسان اپنے والدین یا کسی فوت شدہ رشتہ دار کی طرف سے طواف کرے؟

جواب اس میں کوئی حرج نہیں کہ انسان اپنے ماں باپ میں سے کسی کے لیے یا کسی رشتہ دار کے لیے حج یا عمرہ کرے اور اس میں بھی ان شاء اللہ کوئی حرج نہیں کہ انسان اپنے والدین میں سے کسی ایک کے لیے یا کسی رشتہ دار کے لیے طواف کرے۔

——— شیخ ابن جبرین ———

طواف یا نفل نماز

سوال کیا بار بار طواف کرنا افضل ہے یا نفل نماز ادا کرنا؟

جواب اس میں اختلاف ہے کہ ان میں سے کون سا عمل افضل ہے لیکن زیادہ بہتر یہ ہے کہ دونوں کام ہی کئے جائیں' نفل نماز بھی کثرت سے ادا کی جائے اور طواف بھی تاکہ دونوں قسم کی نیکیوں کو جمع کر لیا جائے۔ بعض علماء نے فرمایا ہے کہ اجنبی لوگوں کے لیے طواف افضل ہے کیونکہ وہ اپنے ملکوں میں کعبہ کو نہیں پا سکتے' لہٰذا جب تک وہ مکہ میں رہیں ان کے

لیے مستحب یہ ہے کہ وہ طواف کثرت سے کریں جبکہ بعض لوگوں نے نماز ہی کو افضل قرار دیا ہے' لیکن میری رائے یہ ہے کہ دونوں ہی کو کثرت سے ادا کیا جائے خواہ آدمی اجنبی ہی کیوں نہ ہو تا کہ وہ کسی کی بھی فضیلت سے محروم نہ رہے۔

——— شیخ ابن باز ———

طواف وغیرہ کا ایصال ثواب

سوال میں مکہ مکرمہ ہی میں تھی کہ مجھے ایک عزیزہ کی وفات کی خبر پہنچی تو میں نے اس کی طرف سے نیت کر کے طواف کیا تو کیا یہ جائز ہے؟

جواب ہاں یہ جائز ہے کہ آپ طواف کریں اور اس کا ثواب جس مسلمان کو چاہیں بخش دیں۔ امام احمد رحمہ اللہ کے مذہب میں یہی مشہور قول ہے کہ مسلمان جو بھی نیکی کرے اور اس کا ثواب جس زندہ یا مردہ مسلمان کو بخش دے تو وہ اسے نفع دیتا ہے خواہ یہ نیکی محض بدنی عمل ہو جیسے نماز و طواف یا محض مالی ہو مثلاً صدقہ' یا مالی و بدنی ہو مثلاً قربانی وغیرہ' لیکن معلوم ہونا چاہیئے کہ انسان کے لیے افضل یہ ہے کہ تمام اعمال صالحہ کو اپنی طرف سے ادا کرے اور جس مسلمان کے لیے چاہے دعا کر دے کیونکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہی رہنمائی فرمائی ہے جیسا کہ آپ کا ارشاد ہے:

«إِذَا مَاتَ الإِنْسَانُ انْقَطَعَ عَنْهُ عَمَلُهُ إِلاَّ مِنْ ثَلاَثَةٍ: إِلاَّ مِنْ صَدَقَةٍ جَارِيَةٍ، أَوْ عِلْمٍ يُنْتَفَعُ بِهِ، أَوْ وَلَدٍ صَالِحٍ يَدْعُو لَهُ»(صحيح مسلم، الوصية، باب ما يلحق الإنسان من الثواب بعد وفاته، ح: ١٦٣١)

"جب انسان فوت ہو جاتا ہے تو اس کے تمام اعمال اس سے منقطع ہو جاتے ہیں مگر یہ تین اعمال منقطع نہیں ہوتے (۱) صدقہ جاریہ (۲) منفعت بخش علم اور (۳) نیک اولاد جو اس کے لیے دعا کرتی ہو۔

——— شیخ ابن عثیمین ———

حجر اسود کے بوسہ کے لیے رشوت دینا

سوال ایک شخص اپنی والدہ کے ساتھ حجر اسود کے بوسہ کے لیے آیا جب کہ وہ دونوں حج کر رہے تھے لیکن لوگوں کی کثرت کی وجہ سے اس کے لیے بوسہ دینا مشکل تھا تو اس نے سپاہی کو دس ریال دیئے اور حجر اسود کے پاس متعین اس سپاہی نے لوگوں کو دور کر دیا تو اس آدمی اور اس کی والدہ نے حجر اسود کو بوسہ دیا تو سوال یہ ہے کیا یہ جائز ہے یا نہیں؟ کیا یہ حج صحیح ہے یا نہیں؟

جواب اگر امر واقع اسی طرح ہے جس طرح بیان کیا گیا ہے تو اس آدمی نے سپاہی کو جو رقم دی یہ رشوت ہے' جسے دینا جائز نہ تھا۔ حجر اسود کو بوسہ دینا سنت ہے' یہ حج کے ارکان اور واجبات میں سے نہیں ہے' لہٰذا جو شخص کسی کو کچھ دیئے بغیر اسے چھو سکے اور بوسہ دے سکے تو اس کے لیے یہ مستحب ہے۔ اگر اسے چھونا اور بوسہ دینا ممکن نہ ہو تو عصا کے ساتھ چھو لے اور اسے بوسہ دے۔ اگر ہاتھ یا عصا سے بھی چھونا ممکن نہ ہو تو اس کے برابر آ کر اشارہ کرے اور اللہ اکبر کہے' سنت یہی ہے۔

اس کے لیے رشوت دینا جائز نہیں' نہ طواف کرنے والے کے لیے اور نہ سپاہی کے لیے' لہٰذا دونوں کو چاہیئے کہ اللہ سبحانہ و

تعالیٰ کی جناب میں توبہ کریں۔ وصلی اللہ علی نبینا محمدو آلہ وصحبہ وسلم۔

——— فتویٰ کمیٹی ———

سعی کی کیفیت' ابتداء اور چکروں کی تعداد

سوال سعی کی کیا صورت ہے؟ سعی کرنے والا کہاں سے آغاز کرے اور سعی کے چکروں کی تعداد کتنی ہے؟

جواب سعی کو صفا سے شروع کر کے مروہ پر ختم کیا جائے۔ اس کے چکروں کی تعداد سات ہے۔ پہلا چکر صفا سے شروع ہو گا اور آخری مروہ پر ختم ہو گا۔ سعی کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ کا ذکر کیا جائے' تسبیحات پڑھی جائیں اور دعا کی جائے نبی ﷺ کی سنت پر عمل کرتے ہوئے صفا اور مروہ پر قبلہ رخ ہو کر ہاتھ اٹھا کر تین تین بار ذکر' دعا اور تکبیر کہی جائے۔

——— شیخ ابن باز ———

سعی شروع کرتے ہوئے کیا پڑھا جائے؟

سوال کیا سعی کے ہر چکر کے شروع میں یہ پڑھنا جائز ہے:

«بِسْمِ اللهِ نَبْدَأُ بِمَا بَدَأَ اللهُ وَرَسُولُهُ بِهِ إِنَّ الصَّفَا وَالْمَرْوَةَ مِنْ شَعَائِرِ اللهِ»

یا یہ بدعت ہے؟

جواب مشروع یہ ہے کہ سعی کے پہلے چکر میں یہ پڑھا جائے:

﴿ إِنَّ ٱلصَّفَا وَٱلْمَرْوَةَ مِن شَعَآئِرِ ٱللَّهِ ﴾ (البقرة۲/ ۱۵۸)

جیسا کہ نبی ﷺ نے پڑھا تھا۔ ہمیں ایسی کوئی دلیل معلوم نہیں جس سے یہ ثابت ہوتا ہو کہ ہر چکر میں یہ پڑھنا مستحب ہے۔ سعی کرنے والے کو چاہیئے کہ تمام چکروں میں کثرت کے ساتھ اللہ تعالیٰ کا ذکر کرے' دعا کرے' تسبیح' تحمید' تہلیل' تکبیر اور استغفار پڑھے' نیز طواف میں بھی کیونکہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا ہے:

«إِنَّمَا جُعِلَ الطَّوَافُ بِالْبَيْتِ (وَالسَّعْيُ) بَيْنَ الصَّفَا وَالْمَرْوَةِ وَرَمْيُ الْجِمَارِ لِإِقَامَةِ ذِكْرِ اللهِ»(سنن أبي داود، المناسك، باب في الرمل، ح:١٨٨٨ ومسند أحمد:٦/ ٦٤، ٧٥، ١٣٩ واللفظ له)

"بیت اللہ کے طواف' صفا و مروہ کی سعی اور رمی جمار کو اللہ تعالیٰ کے ذکر کے لیے مقرر کیا گیا ہے۔"

——— شیخ ابن باز ———

سعی کے پانچ چکروں کے بعد واپسی

سوال ایک جماعت سعی کر رہی تھی کہ وہ پانچ چکروں کے بعد ہی مسعی سے نکل گئی اور اپنی رہائش گاہ پر جانے کے بعد اسے باقی دو چکروں کے بارے میں یاد آیا تو اس کے لیے کیا حکم ہے؟

جواب یہ لوگ جو پانچ چکروں کے بعد اپنی رہائش گاہ کی طرف چلے گئے اور انہیں آخری دو چکروں کے بارے میں یاد نہ رہا تو انہیں چاہیئے کہ واپس آکر دو چکر مکمل کریں اور اس میں کوئی حرج نہیں۔ اس مسئلہ میں صحیح بات یہی ہے' کیونکہ راجح

قول کے مطابق سعی کے چکروں کے لیے یہ شرط نہیں ہے کہ انہیں مسلسل لگایا جائے اور اگر وہ از سرنو سعی کر لیں تو پھر بھی کوئی حرج نہیں، لیکن صحیح بات یہ ہے کہ ان کے لیے یہی کافی ہے کہ دو چکر اور لگا کر اپنی سعی مکمل کر لیں۔ اس مسئلہ میں علماء کا راجح قول یہی ہے۔

——— شیخ ابن باز ———

طواف سے پہلے سعی

سوال کیا حج یا عمرہ میں طواف سے پہلے سعی کرنا جائز ہے؟

جواب سنت یہ ہے کہ پہلے طواف کیا جائے اور پھر اس کے بعد سعی، لیکن اگر کوئی شخص جہالت کی وجہ سے طواف سے پہلے سعی کر لے تو اس میں بھی کوئی حرج نہیں کیونکہ حدیث سے ثابت ہے کہ جب ایک شخص نے رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں یہ عرض کیا کہ میں نے طواف سے پہلے سعی کر لی ہے تو آپ نے فرمایا:

«لاَ حَرَجَ»(سنن أبي داود، المناسك، باب فيمن قدم شيئًا قبل شيء في حجه، ح:٢٠١٥)

"کوئی حرج نہیں۔"

اس سے معلوم ہوا کہ اگر کوئی پہلے سعی کرے تو وہ ہو جائے گی، لیکن سنت یہ ہے کہ پہلے طواف کرے اور پھر سعی، عمرہ ہو یا حج دونوں میں سنت یہی ہے۔

——— شیخ ابن باز ———

سعی حج طواف افاضہ سے پہلے

سوال کیا حاجی کے لیے یہ جائز ہے کہ وہ طواف افاضہ سے پہلے حج کی سعی کرے؟

جواب حاجی اگر مفرد یا قارن ہو تو اس کے لیے طواف افاضہ سے پہلے سعی کرنا جائز ہے یعنی وہ طواف قدوم کے بعد سعی کرے جیسا کہ نبی کریم ﷺ اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے کیا تھا، جو ہدی کے جانور اپنے ساتھ لائے تھے۔

حاجی اگر متمتع ہو تو اس کے لیے دو سعی ہیں، ایک مکہ میں قدوم کے وقت اور یہ عمرہ کے لیے سعی ہو گی اور دوسری حج کے لیے ہو گی۔ اور افضل یہ ہے کہ طواف افاضہ کے بعد ہو کیونکہ سعی طواف کے تابع ہے اور اگر طواف سے پہلے کر لے تو پھر بھی کوئی حرج نہیں، راجح قول یہی ہے کیونکہ نبی کریم ﷺ کی خدمت میں جب ایک شخص نے یہ عرض کیا کہ میں نے طواف سے پہلے سعی کر لی ہے، تو آپ نے فرمایا:

«لاَ حَرَجَ»(سنن أبي داود، المناسك، باب فيمن قدم شيئًا قبل شيء في حجه، ح:٢٠١٥)

"کوئی حرج نہیں۔"

حاجی کو چاہیئے کہ عید کے دن حج کے پانچ اعمال ترتیب کے ساتھ سرانجام دے اور وہ یہ ہیں (۱) رمی جمرہ عقبہ (۲) قربانی (۳) بالوں کو منڈوانا یا کٹوانا (۴) طواف اور (۵) صفا و مروہ کی سعی، ہاں البتہ حاجی اگر قارن یا متمتع ہو تو پھر اسے طواف قدوم کے بعد سعی کرنا چاہیئے۔ اور افضل یہ ہے کہ یہ اعمال مذکورہ بالا ترتیب کے ساتھ سرانجام دیئے جائیں لیکن اگر بعض کو

بعض سے پہلے انجام دے خصوصاً جب کہ اس کی ضرورت بھی ہو تو کوئی حرج نہیں اور یہ بھی اللہ تعالیٰ کی اپنے بندوں پر رحمت اور آسانی ہے۔ فَلِلّٰهِ الْحَمْدُ رَبِّ الْعَالَمِينَ۔

—— شیخ ابن عثیمین ——

سعی' طواف سے پہلے جائز ہے

سوال ایک آدمی نے یہ سنا کہ سعی طواف سے پہلے بھی جائز ہے تو اس نے سعی کر لی اور پھر بارہ یا تیرہ تاریخ کو طواف کیا تو اسے بتایا گیا کہ اس جواز کا تعلق صرف عید کے دن کے ساتھ ہے تو اس بارے میں کیا حکم ہے؟

جواب صحیح بات یہ ہے کہ عید اور غیر عید کے دن میں اس اعتبار سے کوئی فرق نہیں کہ سعی طواف سے پہلے جائز ہے' لہذا اس حدیث کے عموم کے پیش نظر یہ عید کے دن کے بعد بھی جائز ہے کہ جب ایک شخص نے نبی کریم ﷺ کی خدمت میں یہ عرض کیا کہ میں نے طواف سے پہلے سعی کر لی ہے' تو آپ نے فرمایا:

«لاَ حَرَجَ»(سنن أبي داود، المناسك، باب فيمن قدم شيئًا قبل شيء في حجه، ح:٢٠١٥)

"کوئی حرج نہیں"

لہذا جب یہ حدیث عام ہے تو پھر اس اعتبار سے کوئی فرق نہیں کہ یہ سعی عید کے دن کی جائے یا اس کے بعد۔

—— شیخ ابن عثیمین ——

طواف سے قبل سعی حج

سوال ایک عمرہ کرنے والے نے لاعلمی میں طواف سے پہلے سعی کر لی تو کیا اسے طواف کے بعد دوبارہ سعی کرنی ہو گی؟

جواب اسے دوبارہ سعی کرنے کی ضرورت نہیں ہے کیونکہ امام ابوداود نے صحیح سند کے ساتھ اسامہ بن شریک کی یہ روایت "سنن" میں ذکر فرمائی ہے کہ میں بھی نبی ﷺ کے ساتھ حج میں شریک تھا۔ لوگ آپ کی خدمت میں حاضر ہو کر مسائل پوچھ رہے تھے۔ کوئی یہ کہتا کہ یا رسول اللہ! میں نے طواف سے پہلے سعی کر لی ہے' یا میں نے فلاں چیز پہلے کر لی ہے اور فلاں بعد میں کی ہے' تو آپ نے ان تمام سوالوں کے جواب میں فرمایا:

«لاَ حَرَجَ، لاَ حَرَجَ إِلاَّ عَلٰى رَجُلٍ اقْتَرَضَ عِرْضَ رَجُلٍ مُّسْلِمٍ وَّهُوَ ظَالِمٌ، فَذٰلِكَ الَّذِي حَرِجَ وَهَلَكَ» (سنن أبي داود، المناسك، باب فيمن قدم شيئًا قبل شيء في حجه، ح:٢٠١٥)

"کوئی حرج نہیں' ہاں البتہ جو شخص کسی مسلمان آدمی کی عزت و آبرو کو ظلم سے تار تار کرتا ہے تو وہ یقیناً گناہ اور ہلاکت میں مبتلا ہے۔"

—— فتویٰ کمیٹی ——

طواف تو کر لیا لیکن سعی نہ کی

سوال جس شخص پر سعی واجب ہو اور وہ طواف کر لے اور سعی نہ کرے اور اسے پانچ دن کے بعد یہ بتایا جائے کہ اس پر تو سعی واجب تھی تو کیا اس کے لیے یہ جائز ہے کہ طواف نہ کرے اور صرف سعی کرے؟

جواب جب کوئی انسان یہ سمجھتے ہوئے طواف کر لے کہ اس پر سعی واجب نہیں ہے اور پھر اسے بتایا جائے کہ اس پر تو سعی واجب تھی تو اسے صرف سعی ہی کرنی چاہیئے' طواف کے اعادہ کی ضرورت نہیں کیونکہ طواف اور سعی میں تسلسل شرط نہیں ہے۔ اگر کوئی شخص عمداً بھی سعی کو طواف سے مؤخر کر دے تو اس میں کوئی حرج نہیں لیکن افضل یہ ہے کہ سعی' طواف کے فوراً بعد ہو۔

شیخ ابن عثیمین

مروہ سے آغاز کیا صفا پر بال کٹوا دیئے

سوال میں ایک بوڑھا آدمی ہوں' میں نے عمرہ کے لیے طواف کیا اور پھر سعی کے سات چکر لگائے لیکن میں نے سعی کا آغاز مروہ سے کیا اور صفا پر بال کٹوا دیئے اور سلا ہوا لباس پہن لیا تو اس کے بارے میں کیا حکم ہے؟

جواب اس سائل کو چاہیئے کہ ایک چکر اور لگائے کیونکہ اس کا ایک چکر رہ گیا ہے الّا یہ کہ آٹھ چکر لگا لیے ہوں تو اس میں کوئی حرج نہیں' پہلا چکر زائد ہو گا اور اس کا کوئی نقصان نہیں' مقصود یہ ہے کہ اگر اس نے مروہ سے آغاز کر کے صفا پر سعی کو ختم کیا اور آٹھ لگائے ہیں تو یہ اس کے پورے سات چکر ہی شمار ہوں گے اور اگر اس کے تمام چکر سات ہی ہیں تو پھر اس کا ایک چکر رہ گیا ہے' لہٰذا اسے ایک چکر اور لگا کر سعی کو مکمل کرنا چاہیئے اور بال دوبارہ کٹوانے چاہئیں تاکہ عمرہ مکمل ہو جائے' پہلے کٹوائے ہوئے بال کافی نہ ہوں گے کیونکہ انہیں تکمیل سعی سے پہلے کٹوا لیا گیا ہے' پہلا چکر جو مروہ سے شروع کیا گیا' وہ شمار نہیں ہو گا۔

شیخ ابن باز

بال منڈوانا اور کٹوانا

بال منڈوانا کٹوانے سے افضل ہے

سوال عمرہ یا حج ادا کرنے کے بعد بال منڈوانا افضل ہے یا کٹوانا؟ کیا سر کے بعض حصے کے بال کٹوا دینا بھی کافی ہے؟

جواب عمرہ اور حج دونوں ہی میں بال منڈوانا افضل ہے کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے بال منڈوانے والوں کے لیے مغفرت و رحمت کی تین بار اور کٹوانے والوں کے لیے ایک بار دعا فرمائی تھی'[1] لہٰذا افضل یہ ہے کہ بال منڈوا دیئے جائیں لیکن اگر عمرہ حج کے قریب ہی کیا ہو تو پھر افضل یہ ہے کہ عمرہ میں بال کٹوا دیئے جائیں تاکہ حج میں منڈوانے کے لیے بال موجود ہوں کیونکہ عمرہ کی نسبت حج اکمل ہے اور اکمل عمل اکمل ہی کے لیے ہونا چاہیئے اور اگر عمرہ اور حج میں کافی وقت ہو مثلاً یہ کہ عمرہ شوال میں کیا ہو اور اس مدت میں بالوں کا طویل ہونا ممکن ہو تو وہ بال منڈوا دے تاکہ منڈوانے کی فضیلت کو حاصل کر سکے۔ علماء کے صحیح قول کے مطابق سر کے کچھ حصے کے بالوں کو منڈوانا یا کٹوانا کفایت نہیں کرتا بلکہ واجب یہ ہے کہ سارے سر کے بالوں کو منڈوایا یا کٹوایا جائے' نیز افضل یہ ہے کہ بالوں کے منڈوانے یا کٹوانے کا آغاز دائیں طرف سے کیا جائے۔

[1] صحیح بخاری' الحج' باب الحلق الخ' حدیث: 1727 - 1728 و صحیح مسلم' الحج' حدیث: 1301 - 1302

——— شیخ ابن باز ———

بال کٹوانے کی کیفیت

سوال ہم نے دیکھا ہے کہ حج یا عمرہ میں بعض لوگ صرف سر کے نیچے کے حصہ سے بالوں کو کٹوا دیتے ہیں یعنی دائرہ کی صورت میں سر کے تمام اطراف سے نیچے نیچے سے بال کٹوا دیتے ہیں اور باقی بالوں کو نہیں کٹواتے اور جب ہم نے ان سے یہ کہا کہ سارے سر کے بالوں کو کٹوانا ضروری ہے تو انہوں نے کہا کہ "نہیں" مطلوب صرف یہ ہے کہ سر کے کچھ بالوں کو کٹوا دیا جائے تو سوال یہ ہے کہ اس سلسلہ میں واجب کیا ہے؟

جواب واجب یہ ہے کہ حج ہو یا عمرہ سارے سر کے بال منڈوایا کٹوا دیئے جائیں لیکن یہ لازم نہیں ہے کہ ایک ایک بال کو چن چن کر مونڈا یا کاٹا جائے۔ مذکورہ لوگوں کے بارے میں آپ نے جو ذکر کیا ہے تو علماء کے صحیح قول کے مطابق یہ کافی نہیں ہے اور نہ حضرت محمد بن عبداللہ علیہ الصلاۃ والسلام کی یہ سنت ہے۔

——— فتویٰ کمیٹی ———

جب حاجی سارے سر کے بال نہ کٹوائے

سوال جب حج یا عمرہ کرنے والا اپنے سر کے دونوں طرف سے بال کٹوا دے اور پھر احرام کھول دے' جب کہ اس نے سارے سر کے بال نہ کٹوائے ہوں تو اس کے بارے میں کیا حکم ہے؟

جواب اس کے بارے میں حکم یہ ہے کہ اگر وہ حج کر رہا ہے اور اس نے طواف اور رمی کر لی ہے تو وہ اپنے کپڑوں ہی کو پہنے رہے اور سر کے بالوں کو مکمل طور پر منڈوایا کٹوا دے اور اگر وہ عمرہ کر رہا ہے تو اس کے لیے لازم یہ ہے کہ اپنے کپڑوں کو اتار دے اور دوبارہ احرام پہن لے اور پھر سارے سر کے بال منڈوائے یا کٹوائے جبکہ وہ محرم ہو یعنی اس نے لباس احرام پہن رکھا ہو۔

——— شیخ ابن عثیمین ———

جو شخص جہالت کی وجہ سے حلق یا تقصیر کو ترک کر دے

سوال ایک حاجی تمتع کے لیے آیا اور اس نے طواف و سعی کے بعد اپنے معمول کے کپڑے لیے اور بالوں کو نہ کٹوایا اور نہ منڈوایا اور حج کے بعد جب اس نے اس کے بارے میں پوچھا تو اسے بتایا گیا کہ اس نے غلطی کی ہے' تو سوال یہ ہے کہ وہ اب کیا کرے۔ جبکہ اس کے عمرہ کرنے کے بعد اب حج کا وقت ختم ہو گیا ہے؟

جواب اس آدمی نے عمرہ کے واجبات میں سے ایک واجب حلق یا تقصیر کو ترک کیا ہے اور اس صورت میں اہل علم کے نزدیک اس پر واجب یہ ہے کہ فدیہ کے طور پر مکہ میں ایک جانور ذبح کرے اور اسے فقراء مکہ میں تقسیم کر دے' اس طرح یہ اپنے تمتع پر بدستور برقرار رہے گا۔

——— شیخ ابن عثیمین ———

جو شخص حلق یا تقصیر کو بھول جائے

سوال جو شخص عمرہ میں حلق یا تقصیر کو بھول جائے اور سلے ہوئے کپڑے پہن لے اور پھر اسے یاد آئے کہ اس نے ابھی تک بال منڈوائے یا کٹوائے نہیں تو اس کے بارے میں کیا حکم ہے؟

جواب جو شخص عمرہ میں طواف و سعی تو کر لے لیکن حلق یا تقصیر کو بھول جائے اور حلق و تقصیر سے پہلے معمول کا لباس پہن لے تو وہ یاد آنے پر اپنے کپڑوں کو فورا اتار کر احرام پہن لے اور حلق و تقصیر کے بعد اپنے لباس کو پہنے اور اگر اس نے معمول کا لباس پہن کر جہالت یا نسیان کی وجہ سے حلق یا تقصیر کر لیا تو اس پر کوئی فدیہ نہیں اور اس صورت میں حلق یا تقصیر کے اعادہ کی بھی ضرورت نہیں' لیکن جب وہ خبردار ہو تو پھر اس کے لیے یہ واجب ہے کہ اپنا معمول کا لباس اتار دے تاکہ حالت احرام میں حلق یا تقصیر کرے۔

——— فتویٰ کمیٹی ———

بھول جانے کی وجہ سے بال نہ کٹوائے

سوال ایک عورت نے حج کیا اور تمام اعمال حج سرانجام دیئے لیکن جہالت یا نسیان کی وجہ سے اب تک بال نہیں کٹوائے حتیٰ کہ اب اپنے وطن واپس پہنچ گئی اور وہ سارے کام کر لیے ہیں' جو محرم کے لیے ممنوع ہوتے ہیں' سوال یہ ہے کہ اب اس پر کیا لازم ہے؟ اور اسے کیا کرنا چاہیئے؟

جواب اگر امر واقع اسی طرح ہے جس طرح سائل نے ذکر کیا ہے کہ اس عورت نے جہالت یا نسیان کی وجہ سے تقصیر کے سوا دیگر تمام اعمال حج سرانجام دیئے ہیں تو اسے چاہیئے کہ اب اپنے وطن ہی میں تقصیر کرے۔ جہالت یا نسیان کی وجہ سے یہ جو تاخیر ہوئی تو اس کی وجہ سے کوئی فدیہ وغیرہ نہیں ہے' بس اتمام حج کی نیت سے اب تقصیر کرے۔ ہم اللہ تعالیٰ سے دعا کرتے ہیں کہ وہ سب کو توفیق اور قبولیت عطا فرمائے۔

اس سوال میں جو یہ مذکور ہے کہ تقصیر سے قبل اس کے شوہر نے اس سے مقاربت کی ہے تو اس کی وجہ سے اس پر یہ لازم ہے کہ مکہ میں مساکین حرم کے لیے ایک (مکمل) بکری یا اونٹ کا ساتواں حصہ ---- جو قربانی کی شرائط کے مطابق ہو---- ذبح کرے اور اگر اس عورت نے اپنے شوہر سے مقاربت حرم سے باہر اپنے وطن میں کی ہے تو پھر جانور کو بھی وہاں ذبح کر کے وہاں کے مساکین میں تقسیم کر دیا جائے۔

——— فتویٰ کمیٹی ———

حلق محظورات احرام میں سے ہے ----

سوال معلوم ہے کہ سر کو منڈانا محظورات احرام میں سے ہے تو یہ کس طرح جائز ہے کہ عید کے دن تحلل میں اس کا آغاز کر دیا جائے کیونکہ علماء فرماتے ہیں کہ تحلل تو اس صورت میں ہوتا ہے جب تین میں سے کوئی دو کام کر لیے جائیں اور وہ ان تین میں حلق کو بھی ذکر کرتے ہیں تو کیا یہ جائز ہے کہ حاجی اس سے آغاز کرے؟

جواب ہاں اس سے آغاز کرنا جائز ہے کیونکہ احلال کے وقت حلق حج ہی کے لیے ہے' لہٰذا اس وقت اس کے لیے حلق

حرام نہ ہو گا بلکہ یہ حکم الٰہی کی تعمیل ہے اور جب یہ حکم الٰہی ہے تو پھر اسے بجالانا گناہ نہیں ہے اور نبی کریم ﷺ سے یہ ثابت ہے کہ آپ سے جب قربانی اور رمی سے قبل حلق کے بارے میں پوچھا گیا تو آپ نے فرمایا:

«لاَ حَرَجَ»(صحيح البخاري، الحج، باب الذبح قبل الحلق، ح:١٧٢١، ١٧٢٢ وصحيح مسلم، الحج، باب جواز تقديم الذبح على الرمي ... الخ، ح:١٣٠٦، ١٣٠٧)

"کوئی حرج نہیں"

اور کسی چیز کے بارے میں یہ شریعت ہی سے معلوم ہو سکتا ہے کہ یہ مامور ہے یا ممنوع' مثلاً دیکھئے غیراللہ کو سجدہ کرنا شرک ہے لیکن جب اللہ تعالیٰ نے فرشتوں کو یہ حکم دے دیا کہ وہ حضرت آدم علیہ السلام کو سجدہ کریں تو یہ اطاعت ہو گیا' اسی طرح کسی انسان خصوصاً اولاد کو قتل کرنا کبیرہ گناہ ہے لیکن اللہ تعالیٰ نے جب اپنے نبی حضرت ابراہیم علیہ السلام کو یہ حکم دے دیا کہ وہ اپنے لخت جگر حضرت اسماعیل (علیہ السلام) کو ذبح کر دیں تو یہ حکم اطاعت بن گیا جس کی تعمیل کر کے حضرت ابراہیم علیہ السلام عظیم مرتبے پر فائز ہو گئے تھے' یہ الگ بات ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے پیغمبر حضرت ابراہیم علیہ السلام اور ان کے لخت جگر پر رحمت فرمائی اور اسماعیل علیہ السلام کو ذبح ہونے سے بچا لیا اور فرمایا:

﴿فَلَمَّآ أَسْلَمَا وَتَلَّهُۥ لِلْجَبِينِ ﴿١٠٣﴾ وَنَٰدَيْنَٰهُ أَن يَٰٓإِبْرَٰهِيمُ ﴿١٠٤﴾ قَدْ صَدَّقْتَ ٱلرُّءْيَآ ۚ إِنَّا كَذَٰلِكَ نَجْزِى ٱلْمُحْسِنِينَ ﴿١٠٥﴾ إِنَّ هَٰذَا لَهُوَ ٱلْبَلَٰٓؤُا۟ ٱلْمُبِينُ ﴿١٠٦﴾﴾ (الصافات٣٧/ ١٠٣-١٠٦)

"جب دونوں نے حکم مان لیا اور باپ نے بیٹے کو پیشانی کے بل لٹا دیا' تو ہم نے ان کو پکارا کہ اے ابراہیم! تم نے خواب کو سچا کر دکھایا' ہم نیکوکاروں کو ایسا ہی بدلہ دیا کرتے ہیں' بلاشبہ یہ صریح آزمائش تھی۔"

—— شیخ ابن عثیمین ——

تحلل ثانی کے بعد حلق یا تقصیر

سوال جب تحلل اصغر' یعنی رمی جمرات سے فراغت کے بعد حاجی اپنے بالوں کو منڈوا یا کٹوا لے تو کیا تحلل اکبر کے بعد حلق یا تقصیر واجب ہے؟

جواب جب تحلل اصغر یعنی رمی جمرات سے فراغت کے بعد حاجی اپنے بالوں کو منڈوا یا کٹوا لے تو پھر تحلل اکبر کے بعد حلق یا تقصیر واجب یا مستحب نہیں ہے کیونکہ حلق و تقصیر حج کا ایک عمل اور عبادت ہے اور عبادات توقیفی ہیں اور یہ نبی اکرم ﷺ سے ثابت نہیں کہ آپ نے تحلل اکبر کے بعد حلق یا تقصیر کیا ہو بلکہ یہ آپ نے فقط تحلل اصغر کے بعد ہی کیا تھا اور آپ نے فرمایا ہے:

«خُذُوا عَنِّي مَنَاسِكَكُمْ»(صحيح مسلم، الحج، باب استحباب رمي جمرة العقبة ... الخ، ح:١٢٩٧ والسنن الكبرى للبيهقي:٥/ ١٢٥ واللفظ له)

"مجھ سے اپنے مناسک حج سیکھ لو۔"

—— فتویٰ کمیٹی ——

عمرہ میں حلق یا تقصیر

 عمرہ میں حلق یا تقصیر کے بارے میں کیا حکم ہے؟

جواب عمرہ میں حلق یا تقصیر واجب ہے کیونکہ نبی کریم ﷺ جب حجۃ الوداع کے لیے مکہ مکرمہ میں تشریف لائے' طواف اور سعی کو ادا فرمالیا تو آپ نے ہر اس شخص کو جس کے ہمراہ قربانی کا جانور نہیں تھا' یہ حکم دیا کہ وہ بالوں کو کٹوا دے اور پھر منڈوا دے اور جب آپ نے بالوں کے کٹوانے کا حکم دیا تو اصول یہ ہے کہ حکم سے وجوب ثابت ہوتا ہے لہٰذا معلوم ہوا کہ بال کٹوائے بغیر چارۂ کار ہی نہیں۔ اس کی ایک دلیل یہ بھی ہے کہ غزوۂ حدیبیہ کے موقع پر جب آپ کو اور صحابہ کرام کو عمرہ کرنے سے روک دیا گیا اور آپ کے اس حکم کی اطاعت میں صحابہ کرام سے جب تھوڑی سی تاخیر ہوئی تو آپ نے ناراضی کا اظہار فرمایا۔ اب رہا یہ مسئلہ کہ عمرہ میں تقصیر افضل ہے کہ حلق تو افضل حلق یعنی بال منڈوانا ہے ہاں البتہ حج تمتع کرنے والا حاجی جو تاخیر سے مکہ میں آیا ہو تو اس کے لیے افضل یہ ہے کہ بال کٹوا دے تاکہ حج میں منڈوانے کے لیے اس کے سر پر بال موجود ہوں۔

—— شیخ ابن عثیمین ——

وقوفِ عرفہ

عرفہ میں آمد و رفت کا وقت

سوال حاجی عرفہ میں کب جائے اور وہاں سے کس وقت واپس لوٹے؟

 حکم شریعت یہ ہے کہ عرفہ میں عرفہ کے دن یعنی نو تاریخ کو طلوع آفتاب کے بعد جائے اور ظہر و عصر کی نمازیں جمع اور قصر کی صورت میں جمع تقدیم کے ساتھ ایک اذان اور دو اقامتوں کے ساتھ ادا کرے تاکہ نبی کریم ﷺ اور حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے اسوۂ حسنہ پر عمل کر سکے اور غروب آفتاب تک عرفہ میں ذکر الٰہی' دعا' تلاوت قرآن مجید اور تلبیہ میں مشغول رہے اور یہ کلمات کثرت سے پڑھے:

«لاَ إِلٰهَ إِلاَّ اللهُ وَحْدَهُ لاَ شَرِيكَ لَهُ، لَهُ الْمُلْكُ وَلَهُ الْحَمْدُ، وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ، سُبْحَانَ اللهِ وَالْحَمْدُ للهِ وَلاَ إِلٰهَ إِلاَّ اللهُ وَلاَ حَوْلَ وَلاَ قُوَّةَ إِلاَّ بِاللهِ»(سلسلة الأحاديث الصحيحة، ح:١٥٠٣)

''اللہ کے سوا کوئی لائق عبادت نہیں۔ وہ اکیلا ہے' اس کا کوئی شریک نہیں۔ اسی کا تمام ملک ہے اور اسی کی سب تعریف ہے۔ وہی ہر چیز پر قادر ہے' پاک ہے اللہ اور اسی کے لیے ہی سب تعریف ہے اور اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور کوئی بھی قوت اور طاقت اللہ تعالیٰ (کی مدد) کے بغیر (میسر) نہیں۔''

دعا دونوں ہاتھ اٹھا کر کی جائے' قبلہ رخ ہو کر کی جائے اور دعا سے پہلے اللہ تعالیٰ کی حمد و ثنا کی جائے اور نبی کریم ﷺ

کی ذات گرامی پر درود بھیجا جائے۔ یاد رہے تمام عرفہ موقف ہے۔ جب آفتاب غروب ہو جائے تو پھر حاجیوں کے لیے حکم یہ ہے کہ وہ اطمینان و سکون اور وقار کے ساتھ اور کثرت سے تلبیہ پڑھتے ہوئے عرفات سے مزدلفہ کی طرف روانہ ہو جائیں اور جب مزدلفہ میں پہنچیں تو مغرب و عشاء کی نمازیں ایک اذان اور دو اقامتوں کے ساتھ اس طرح ادا کریں: مغرب کی تین اور عشاء کی صرف دو رکعتیں پڑھی جائیں۔

——— شیخ ابن باز ———

غروب آفتاب سے قبل عرفہ سے روانگی

سوال اس شخص کے بارے میں کیا حکم ہے جو حج میں غروب آفتاب سے قبل ہی اپنے ضروری کاموں کی وجہ سے عرفہ سے روانہ ہو جائے؟

جواب جو شخص غروب آفتاب سے قبل عرفہ سے روانہ ہو جائے اکثر اہل علم کے نزدیک اس پر فدیہ واجب ہے الاّ یہ کہ وہ رات کو واپس آ جائے تو پھر فدیہ ساقط ہو جائے گا۔ فدیہ یہ ہے کہ ایک جانور ذبح کر کے حرم کے مسکینوں میں تقسیم کر دیا جائے۔

——— شیخ ابن باز ———

عرفہ سے باہر وقوف

سوال جب کوئی حاجی حدود عرفہ سے باہر مگر عرفہ کے قریب ہی وقوف کرے' حتیٰ کہ سورج غروب ہو جائے اور پھر وہاں سے روانہ ہو جائے تو اس کے حج کے بارے میں کیا حکم ہے؟

جواب جب کوئی حاجی وقوف کے وقت عرفہ میں وقوف نہ کرے تو اس کا حج نہیں ہوتا کیونکہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا ہے:

«اَلْحَجُّ عَرَفَةُ، مَنْ أَدْرَكَ عَرَفَةَ (بِلَيْلٍ) قَبْلَ أَنْ يَطْلُعَ الْفَجْرُ فَقَدْ أَدْرَكَ الْحَجَّ»(سنن النسائي، مناسك الحج، باب فرض الوقوف بعرفة، ح:٣٠١٩ والسنن الكبرى للبيهقي: ٥/ ١٧٣ واللفظ له)

"حج عرفہ ہے' جو شخص رات کو طلوع فجر سے پہلے پہلے عرفہ میں آ جائے تو یقیناً اس نے حج کو پا لیا۔"

وقوف کا وقت' عرفہ کے دن کے زوال کے بعد سے لے کر قربانی کی رات کی طلوع فجر تک ہے اور اس پر تمام اہل علم کا اجماع ہے۔

زوال سے ماقبل کے بارے میں اہل علم میں اختلاف ہے۔ اکثر کی یہ رائے ہے کہ اگر زوال کے بعد اور رات کو وقوف نہ کرے تو قبل از زوال کا وقوف کفایت نہیں کرے گا۔ جو شخص زوال کے بعد دن کو یا رات کو وقوف کرے تو اس کا یہ وقوف صحیح ہے۔ افضل یہ ہے کہ دن کے وقت ظہر اور عصر کی نمازیں جمع تقدیم کی صورت میں ادا کر کے غروب آفتاب تک وقوف کیا جائے۔ دن کے وقت وقوف کرنے والے کے لیے یہ جائز نہیں کہ وہ غروب آفتاب سے پہلے عرفہ سے واپس لوٹے اور اگر کوئی ایسا کرے تو اکثر اہل علم کے نزدیک اس پر دم لازم ہو گا کیونکہ اس نے ایک واجب کو ترک کر دیا اور وہ یہ کہ دن کو وقوف کرنے والے کے لیے یہ واجب ہے کہ وہ دن رات کے وقوف کو جمع کرے۔

——— شیخ ابن باز ———

جو شخص دن کو عرفہ میں وقوف نہ کر سکے ....

سوال ایک شخص اعمال حج میں شریک ہوا لیکن اپنے کام کی نوعیت کی وجہ سے اس کے لیے دن کے وقت عرفہ میں وقوف ممکن نہ ہوا تو کیا اس کے لیے یہ جائز ہے کہ لوگوں کے یہاں سے رخصت ہو جانے کے بعد وہ رات کو وقوف کر لے؟ کتنا وقوف کافی ہو گا؟ اگر وہ اپنی گاڑی میں عرفہ سے گزر جائے تو کیا یہ بھی کافی ہے؟

جواب وقوف عرفہ کا وقت نو تاریخ کی طلوع فجر سے قربانی کے دن کی طلوع فجر تک ہے' لہٰذا اگر کوئی حاجی نو تاریخ کو دن کے وقت وقوف نہ کر سکے تو وہ رات کو بھی وقوف کر سکتا ہے حتیٰ کہ اگر طلوع صبح سے تھوڑی دیر پہلے خواہ چند منٹ ہی وقوف کر لے تو یہ بھی کافی ہے۔ اسی طرح اگر عرفات سے خواہ گاڑی ہی پر گزر جائے تو یہ بھی کافی ہے' لیکن افضل یہ ہے کہ آدمی اس وقت حاضر ہو جب دیگر سب لوگوں نے وقوف کیا ہو' عرفہ کی شام ان کے ساتھ دعا میں شریک ہو' خشوع اور حضور قلب کا اظہار کرے' لوگوں کی طرح نزول رحمت اور حصول مغفرت کی امید کرے۔ اگر دن کو وقوف نہ کر سکے تو پھر رات کو کر لے' لیکن افضل یہ ہے کہ جس قدر ممکن ہو جلد وقوف کرے اور عرفہ میں آ جائے خواہ تھوڑی ہی مدت کے لیے سہی اور اپنے رب کے سامنے ہاتھ پھیلا دے اور نہایت خشوع و خضوع کے ساتھ دعا کرے اور پھر لوگوں کے ساتھ ہی مزدلفہ چلا جائے اور رات کے آخر تک مزدلفہ ہی میں رہے تاکہ اس کا حج مکمل ہو جائے۔

——— شیخ ابن باز ———

عرفہ وغیرہ میں اجتماعی دعا

سوال عرفہ کے دن عرفات میں اجتماعی دعا کے بارے میں کیا حکم ہے؟ مثلاً یہ کہ ایک حاجی دعاؤں کی کتابوں میں وارد بعض دعاؤں کو عرفہ وغیرہ کے دن پڑھے اور اس سے سن کر باقی حاجی ان دعاؤں کو بار بار دہرائیں اور آمین نہ کہیں تو کیا اس طرح کی یہ دعا بدعت ہے؟ امید ہے دلیل کے ساتھ اس مسئلہ کی وضاحت فرمائیں گے!

جواب اس عظیم الشان دن میں حاجی کے لیے افضل یہ ہے کہ وہ اللہ سبحانہ و تعالیٰ کی بارگاہِ اقدس میں خوب خشوع و خضوع اور الحاح و زاری کے ساتھ ہاتھ اٹھا کر دعا کرے۔ رسول اللہ ﷺ نے بھی غروب آفتاب تک یہ دن دعا اور ذکر الٰہی میں صرف فرمایا تھا۔ آپ نے جب وادی عرنہ میں ظہر و عصر کی نمازیں جمع و قصر کی صورت میں ادا فرمائیں' پھر موقف تشریف لے گئے' صخرات اور جبل دعا --- جسے جبل آل بھی کہتے ہیں --- کے پاس وقوف فرمایا اور دعا اور ذکر الٰہی میں خوب خوب مشغول رہے' دعا کے لیے دونوں ہاتھوں کو اٹھایا اور قبلہ رخ اور اپنی ناقہ پر سوار تھے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کو یہ حکم دیا ہے کہ وہ الحاح و زاری' آہستگی' شوق اور ڈر کے ساتھ اس سے دعا کریں۔ عرفہ دعا کے لیے بہترین جگہ ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ ٱدْعُوا۟ رَبَّكُمْ تَضَرُّعًا وَخُفْيَةً ۚ إِنَّهُۥ لَا يُحِبُّ ٱلْمُعْتَدِينَ ﴿٥٥﴾ ﴾ (الأعراف ۷/ ۵۵)

"(لوگو) اپنے رب سے عاجزی سے اور چپکے چپکے دعائیں مانگا کرو وہ حد سے بڑھنے والوں کو دوست نہیں رکھتا۔"

نیز فرمایا:

﴿ وَٱذْكُر رَّبَّكَ فِى نَفْسِكَ ﴾ (الأعراف۷/ ۲۰۵)

"اور اپنے رب کو اپنے دل ہی میں یاد کرتے رہو۔"

صحیحین میں حضرت ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ لوگوں نے بلند آواز سے دعا شروع کی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

«أَيُّهَا النَّاسُ! ارْبَعُوا عَلٰى أَنْفُسِكُمْ، إِنَّكُمْ لَيْسَ تَدْعُونَ أَصَمَّ وَلاَ غَائِبًا، إِنَّكُمْ تَدْعُونَهُ سَمِيعًا قَرِيبًا وَهُوَ مَعَكُمْ وَالَّذِي تَدْعُونَهُ أَقْرَبُ إِلٰى أَحَدِكُمْ مِّنْ عُنُقِ رَاحِلَةِ أَحَدِكُمْ»(صحيح البخاري، الجهاد، باب ما يكره من رفع الصوت في التكبير، ح:۲۹۹۲ وصحيح مسلم، الذكر والدعاء، باب استحباب خفض الصوت بالذكر ... الخ، ح:۲۷۰٤ واللفظ له)

"لوگو! اپنے آپ پر شفقت و مہربانی کرو' تم کسی ایسی ہستی کو نہیں پکار رہے جو گونگی یا غائب ہو بلاشبہ تم جسے پکار رہے ہو وہ سمیع' قریب اور تمہارے ساتھ ہے اور جس ذات اقدس کو پکار رہے ہو وہ تم سے تمہاری سواری کی گردن سے بھی قریب تر ہے۔"

اللہ تعالیٰ نے حضرت زکریا علیہ السلام کے انداز دعا کا ذکر کرتے ہوئے ان کی تعریف کی اور فرمایا:

﴿ ذِكْرُ رَحْمَتِ رَبِّكَ عَبْدَهُۥ زَكَرِيَّآ ۝٢ إِذْ نَادَىٰ رَبَّهُۥ نِدَآءً خَفِيًّا ۝٣ ﴾ (مريم۱۹/ ۲-۳)

"یہ تمہارے رب کی مہربانی کا بیان (ہے جو اس نے) اپنے بندے زکریا پر (کی تھی) جب انہوں نے اپنے رب کو دبی آواز سے پکارا۔"

نیز فرمایا:

﴿ وَقَالَ رَبُّكُمُ ٱدْعُونِىٓ أَسْتَجِبْ لَكُمْ ﴾ (الغافر: ٤٠/ ٦٠)

"اور تمہارے رب نے فرمایا ہے کہ تم مجھ سے دعا کرو میں تمہاری دعا قبول کروں گا۔"

بے شمار آیات و احادیث ہیں جن میں ذکر الٰہی اور دعا کی ترغیب کا ذکر ہے اور اس جگہ پر تو خاص طور پر کثرت کے ساتھ اخلاص' حضور قلب' ڈر اور شوق کے ساتھ خوب خوب دعا اور ذکر کرنا چاہیے۔ اس مقام پر بلند آواز سے ذکر' دعا اور تلبیہ بھی جائز ہے جیسا کہ قبل ازیں بیان کیا گیا ہے۔ اگر کوئی انسان ایک جماعت کے ساتھ مل کر دعا کر رہا ہو اور سب لوگ اس کی دعا پر آمین کہہ رہے ہوں تو اس میں بھی کوئی حرج نہیں' جیسا کہ قنوت' ختم قرآن اور استسقاء کی اجتماعی دعا میں یہ جائز ہے لیکن عرفہ کے دن عرفہ کے علاوہ کسی اور جگہ پر اجتماع نبی اکرم رضی اللہ عنہ سے ثابت نہیں اور آپ نے فرمایا ہے:

«مَنْ عَمِلَ عَمَلاً لَيْسَ عَلَيْهِ أَمْرُنَا فَهُوَ رَدٌّ» (صحيح مسلم، الأقضية، باب نقض الأحكام الباطلة ورد محدثات الأمور، ح:۱۷۱۸)

"جو کوئی ایسا عمل کرے جس کے بارے میں ہمارا امر نہ ہو تو وہ (عمل) مردود ہے۔" واللہ ولی التوفیق۔

——— شیخ ابن باز ———

مزدلفہ میں رات بسر کرنا

مزدلفہ میں وقوف اور واپسی

سوال مزدلفہ میں وقوف اور رات بسر کرنے کے بارے میں کیا حکم ہے؟ اور یہ کس قدر ہونا چاہیئے؟ اور حاجی مزدلفہ سے واپسی کب اختیار کرے؟

جواب صحیح قول کے مطابق مزدلفہ میں رات بسر کرنا واجب ہے۔ بعض نے اسے رکن اور بعض نے مستحب قرار دیا ہے۔ اہل علم کے اقوال میں سے سب سے زیادہ صحیح قول یہ ہے کہ یہ واجب ہے لہٰذا اس کے ترک کی صورت میں دم لازم ہے اور سنت یہ ہے کہ اس سے واپسی نماز فجر اور روشنی ہونے کے بعد ہونی چاہیئے۔ نماز فجر یہاں ادا کی جائے اور جب روشنی ہو جائے تو پھر لبیک کہتے ہوئے منیٰ کی طرف روانہ ہو جائے۔ سنت یہ ہے کہ نماز کے بعد اللہ تعالیٰ کا ذکر اور دعا کی جائے اور جب روشنی ہو جائے تو پھر تلبیہ پڑھتے ہوئے منیٰ کی طرف روانہ ہو جائے۔

کمزور مردوں' عورتوں اور بوڑھوں کے لیے یہ جائز ہے کہ وہ رات کے نصف اخیر کے وقت مزدلفہ سے روانہ ہو جائیں کہ نبی اکرم ﷺ نے ان کو رخصت دی ہے۔[1] لیکن طاقتور لوگوں کے لیے سنت یہ ہے کہ وہ نماز فجر تک یہاں رہیں' نماز کے بعد کثرت سے اللہ تعالیٰ کا ذکر کریں اور پھر طلوع آفتاب سے پہلے روانہ ہو جائیں۔ عرفہ کی طرح مزدلفہ میں بھی یہ سنت ہے کہ ہاتھ اٹھا کر اور قبلہ رخ ہو کر دعا کی جائے۔ یاد رہے سارا مزدلفہ موقف ہے۔

——— شیخ ابن باز ———

مزدلفہ میں رات بسر کرنا

سوال نصف رات سے قبل مزدلفہ میں رات بسر کرنے کے بارے میں کیا حکم ہے؟

جواب حاجی کے لیے یہ واجب ہے کہ ذوالحج کی دسویں رات طلوع فجر تک مزدلفہ میں بسر کرے' ہاں البتہ اگر مرض وغیرہ کی وجہ سے کوئی عذر ہو تو پھر اس کے لیے اور اس کی نگہداشت کرنے والے کے لیے یہ جائز ہے کہ نصف رات کے بعد وہاں سے منیٰ کی طرف روانہ ہو جائے۔ نبی اکرم ﷺ نے حج میں خود طلوع فجر تک مزدلفہ میں قیام فرمایا تھا اور معذوروں کو یہ اجازت دے دی تھی کہ وہ آدھی رات کے بعد مزدلفہ سے منیٰ کے لیے روانہ ہو سکتے ہیں۔

——— شیخ ابن باز ———

مزدلفہ میں رات بسر کرنے کا ضابطہ

سوال مزدلفہ میں رات بسر کرنے کے لیے کیا ضابطہ ہے اور اگر شب بسر کرنا مشکل ہو اور حاجی یہاں سے گزرنے ہی پر

---

[1] صحیح بخاری' الحج' باب من قدم ضعفة أهله بليل--- الخ' حدیث: 1676 و صحیح مسلم' الحج' حدیث: 1295

اکتفاء کرے تو اس کے حج کے بارے میں کیا حکم ہے؟

جواب حاجی کے لیے یہ واجب ہے کہ وہ آدھی رات تک کا وقت مزدلفہ میں گزارے اور اگر پوری رات یہاں بسر کرے' نماز فجر ادا کرے' نماز کے بعد ذکر و استغفار کرے اور پھر خوب روشنی کے بعد یہاں سے روانہ ہو تو یہ افضل و اکمل ہے۔ ہاں البتہ کمزور مردوں' عورتوں اور بوڑھوں کے لیے آدھی رات کے بعد یہاں سے روانگی جائز ہے کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے اپنے اہل خانہ کے کمزور افراد کو اس کی رخصت دے دی تھی لیکن آپ نے خود یہاں شب بسر فرمائی' نماز فجر ادا فرمائی' نماز کے بعد اللہ تعالیٰ کا ذکر کیا اور تہلیل و استغفار پڑھا اور پھر خوب روشنی ہونے کے بعد منیٰ کی طرف روانہ ہوئے تھے۔ اور حجاج کرام کے لیے افضل یہ ہے کہ وہ رسول اللہ ﷺ کے اسی اسوۂ حسنہ کے مطابق عمل کریں' البتہ کمزوروں کے لیے یہ ضرور رخصت ہے کہ وہ صبح سے پہلے بھی کوچ کر سکتے ہیں جیسا کہ قبل ازیں بیان کیا گیا ہے۔

جو شخص کسی شرعی عذر کے بغیر مزدلفہ میں شب بسر نہ کرے تو اس پر دم لازم ہے کیونکہ اس نے سنت کی خلاف ورزی کی اور ابن عباس رضی اللہ عنہما کا قول ہے کہ "جو شخص حج کے کسی واجب کو ترک کر دے یا اسے بھول جائے تو اس کی جگہ خون بہائے۔"[1]

اور بلاشک و شبہ مزدلفہ میں شب بسر کرنا حج کا ایک عظیم واجب ہے حتیٰ کہ بعض اہل علم نے اسے حج کا رکن قرار دیا ہے اور بعض نے اسے سنت کہا ہے جب کہ صحیح قول یہ ہے کہ حج کے واجبات میں سے ایک واجب ہے لہٰذا اس کے ترک کی وجہ سے دم بھی لازم ہے اور توبہ و استغفار بھی' جب کہ اسے کسی شرعی عذر کے بغیر جان بوجھ کر ترک کر دیا ہو۔

——— شیخ ابن باز ———

جو مزدلفہ میں شب بسر نہ کرے

سوال جو حاجی عید کی رات مزدلفہ میں شب بسر نہ کرے اس کے بارے میں کیا حکم ہے؟

جواب مزدلفہ میں شب بسر کرنا واجب ہے' ہاں البتہ کمزور مردوں اور عورتوں لیے یہ رخصت ہے کہ وہ رات کے آخری پہر وہاں سے روانہ ہو سکتے ہیں۔ اسے عمداً ترک کرنے کی صورت میں جمہور اہل علم کے نزدیک گناہ بھی ہے اور اس کی وجہ سے فدیہ بھی لازم ہے اور اگر جہالت کی وجہ سے ترک کیا ہو تو پھر صرف فدیہ لازم ہے' عجز و درماندگی کی صورت میں دیگر تمام واجبات کی طرح یہ بھی ساقط ہو جائے گا' لیکن جو شخص اول وقت میں یہاں نماز فجر کو پا لے اور پھر نماز کے بعد اللہ تعالیٰ کا ذکر کرے اور پھر یہاں سے روانہ ہو تو یہ بھی کافی ہو گا۔

——— شیخ ابن عثیمین ———

رش کی وجہ سے مزدلفہ میں شب بسر نہ کرنا

سوال ان ایام میں جب ہم عرفات سے مزدلفہ کوچ کرتے ہیں تو بے پناہ رش ہو جاتا ہے کہ مزدلفہ پہنچ کر رش کی شدت کی وجہ سے حاجی کے لیے یہاں شب بسر کرنا ممکن نہیں ہوتا اور اس میں بے حد مشقت ہوتی ہے' تو کیا یہ جائز ہے کہ

---

[1] موطأ إمام مالك' الحج' باب جامع الفدية' حديث: 257' 1/419/420

مزدلفہ میں رات بسر نہ کی جائے اور یہاں شب بسر نہ کرنے کی وجہ سے کیا حاجی پر کچھ لازم ہو گا؟ کیا مغرب و عشاء کی نمازیں اگر مزدلفہ میں ادا کی جائیں تو یہ وقوف اور شب باشی سے کفایت کر سکتی ہیں؟ یعنی مغرب و عشاء کی نمازیں مزدلفہ میں ادا کرنے کے فوراً بعد منیٰ روانگی اختیار کی جائے تو اس طرح یہ وقوف صحیح ہو گا؟ امید ہے دلیل کے ساتھ اس مسئلہ کی وضاحت فرمائیں گے۔

جواب مزدلفہ میں شب بسر کرنا حج کے واجبات میں سے ہے۔ نبی اکرم ﷺ نے یہاں شب بسر فرمائی' صبح کی نماز یہاں ادا فرمائی اور خوب روشنی ہونے تک یہاں مقیم رہے تھے اور آپ کا ارشاد ہے:

«خُذُوا عَنِّي مَنَاسِكَكُمْ»(صحيح مسلم، الحج، باب استحباب رمي جمرة العقبة الخ، ح:١٢٩٧، والسنن الكبرى للبيهقي: ٥/ ١٢٥ واللفظ له)

"مناسک حج کی تعلیم مجھ سے حاصل کرو۔"

جو حاجی یہاں مغرب و عشاء کی نمازیں جمع کر کے ادا کرنے کے بعد یہاں سے چل پڑے تو اس نے گویا اس واجب کو ادا ہی نہیں کیا اس لیے کہ نبی کریم ﷺ نے کمزور لوگوں کو بھی رات کے آخری حصہ میں یہاں سے روانہ ہونے کی اجازت دی ہے۔

جو شخص مزدلفہ میں رات بسر نہ کر سکے تو اس ترک واجب کے کفارہ کے طور پر اس پر دم لازم ہے۔ اہل علم کا یہ اختلاف مشہور و معلوم ہے کہ مزدلفہ میں شب بسر کرنا رکن ہے یا واجب ہے یا سنت' تو ان میں سے راجح ترین قول یہ ہے کہ یہ واجب ہے' جو شخص اسے ترک کر دے اس پر دم لازم ہے اور اس کا حج صحیح ہے۔ اکثر اہل علم کا یہی قول ہے' ہاں البتہ صرف کمزور لوگوں کو یہ رخصت ہے کہ وہ آدھی رات کے بعد یہاں سے کوچ کر سکتے ہیں' طاقتور لوگ جن کے ساتھ کمزور نہ ہوں' ان کے لیے سنت یہ ہے کہ وہ ساری رات مزدلفہ میں گزاریں' نماز فجر ادا کریں' نماز کے بعد اللہ تعالیٰ کا ذکر اور اس سے دعا کریں اور جب دن خوب روشن ہو جائے تو پھر طلوع آفتاب سے قبل رسول اللہ ﷺ کے اسوہ پر عمل کرتے ہوئے یہاں سے روانہ ہوں۔ جو کمزور لوگ یہاں رات کے آخری حصہ میں پہنچیں تو ان کے لیے یہی کافی ہے کہ کچھ دیر یہاں رہیں اور پھر رخصت کو قبول کرتے ہوئے یہاں سے روانہ ہو جائیں۔ واللہ ولی التوفیق

——— شیخ ابن باز ———

جو مغرب و عشا کی نمازیں مزدلفہ سے پہلے ادا کر لے

سوال اس شخص کے بارے میں کیا حکم ہے جو مغرب و عشاء کی نمازیں قصر اور جمع تاخیر کی صورت میں مزدلفہ میں داخل ہونے سے پہلے ادا کرے اور یہ ہنگامی حالات کی وجہ سے ہو' مثلاً یہ کہ مزدلفہ کے راستے میں اس کی گاڑی خراب ہو گئی ہو اور وقت ختم ہونے کے خدشہ کے پیش نظر وہ حدود مزدلفہ کے پاس یعنی مزدلفہ سے بہت ہی قریب مسافت پر دونوں نمازوں کو ادا کر لے اور پھر گاڑی ٹھیک ہونے تک سو جائے اور نماز فجر بھی حدود مزدلفہ کے قریب ہی ادا کر لے اور مزدلفہ میں اس کے لیے داخلہ اس وقت ممکن ہو جب سورج طلوع ہو چکا ہو تو کیا حدود مزدلفہ کے پاس ادا کی گئی مغرب و عشاء اور صبح کی یہ نمازیں صحیح ہوں گی؟ امید ہے عزت مآب دلیل کے ساتھ اس مسئلہ کی وضاحت فرمائیں گے؟

جواب نماز ہر جگہ صحیح ہے سوائے اس کے جسے شارع (علیہ السلام) نے مستثنیٰ قرار دیا ہو' چنانچہ آپ کا ارشاد ہے:

«جُعِلَتْ لِيَ الأَرْضُ مَسْجِدًا وَّطَهُورًا»(صحيح البخاري، الصلاة، باب قول النبي ﷺ 'جعلت لي الأرض مسجدا ... الخ'، ح:٤٣٨ وصحيح مسلم، المساجد، باب المساجد ومواضع الصلاة، ح:٥٢١)

"میرے لیے زمین کو مسجد اور پاک بنا دیا گیا ہے۔"

لیکن حاجی کے لیے مشروع یہ ہے کہ وہ مغرب اور عشاء کی نمازیں جمع کر کے مزدلفہ میں ادا کرے بشرطیکہ نصف رات سے پہلے اس کے لیے یہ ممکن ہو اور اگر رش وغیرہ کی وجہ سے یہ ممکن نہ ہو تو جہاں بھی ممکن ہو پڑھ لے اور نصف رات کے بعد تک اسے مؤخر کرنا جائز نہیں کیونکہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ إِنَّ ٱلصَّلَوٰةَ كَانَتْ عَلَى ٱلْمُؤْمِنِينَ كِتَٰبًا مَّوْقُوتًا ﴿١٠٣﴾ ﴾ (النساء٤/ ١٠٣)

"بے شک نماز کا مومنوں پر اوقات (مقررہ) میں ادا کرنا فرض ہے۔"

یعنی نماز کو اپنے اوقات میں ادا کرنا فرض ہے اور عشاء کی نماز کے بارے میں نبی ﷺ کا ارشاد گرامی ہے

«وَقْتُ الْعِشَاءِ إِلَى نِصْفِ اللَّيْلِ»(صحيح مسلم، المساجد، باب أوقات الصلوات الخمس، ح:٦١٢)

"عشاء کا وقت آدھی رات تک ہے۔"

—————— شیخ ابن باز ——————

جو نماز فجر مزدلفہ میں ادا کرلے ....

سوال ایک گروہ غروب آفتاب کے بعد عرفہ سے نکلا لیکن راستہ بھولنے کی وجہ سے مکہ کی طرف روانہ ہو گیا' پھر سپاہیوں نے اسے عرفہ کی طرف روانہ کر دیا' عرفہ پہنچ کر یہ ٹھہر گیا اور اس نے مغرب و عشاء کی نمازیں عرفہ میں رات کے ایک بجے ادا کیں اور پھر یہ اذان فجر کے وقت مزدلفہ میں داخل ہو گیا اور نماز فجر اس نے مزدلفہ میں ادا کی تو کیا اس پر کوئی کفارہ وغیرہ لازم ہے یا نہیں؟

جواب اس گروہ میں شامل لوگوں پر کوئی کفارہ وغیرہ لازم نہیں کیونکہ انہوں نے نماز فجر مزدلفہ میں ادا کی۔ اذان فجر کے وقت یہ مزدلفہ پہنچ گئے اور نماز فجر انہوں نے اندھیرے میں ادا کی ہے اور نبی کریم ﷺ سے یہ ثابت ہے کہ آپ نے فرمایا:

«مَنْ شَهِدَ صَلَاتَنَا هٰذِهِ وَوَقَفَ مَعَنَا حَتّٰى يَدْفَعَ وَقَدْ وَقَفَ بِعَرَفَةَ قَبْلَ ذٰلِكَ لَيْلاً أَوْ نَهَارًا، فَقَدْ تَمَّ حَجُّهُ وَقَضٰى تَفَثَهُ»(جامع الترمذي، الحج، باب ماجاء فيمن أدرك الإمام بجمع ... الخ، ح:٨٩١)

"جو شخص ہماری اس نماز میں حاضر ہو جائے اور ہمارے ساتھ وقوف کرے حتیٰ کہ ہم یہاں سے روانہ ہو جائیں اور اس سے پہلے دن یا رات کو وہ عرفہ میں بھی وقوف کر چکا ہو تو اس نے حج کو مکمل کر لیا۔"

لیکن ان لوگوں نے یہ غلطی کی ہے کہ نماز کو نصف رات کے بعد تک مؤخر کر دیا جب کہ نماز عشاء کا وقت آدھی

رات تک ہے۔ [1]

——— شیخ ابن عثیمین ———

جسے مزدلفہ میں جگہ نہ ملے

سوال جب عید رات مزدلفہ میں بسر کرنے کے لیے حاجی کو جگہ ہی نہ ملے تو اس کے لیے کیا حکم ہے؟

جواب جسے مزدلفہ میں جگہ ہی نہ ملے تو ظاہر ہے کہ اس پر کوئی فدیہ وغیرہ لازم نہیں کیونکہ عجز و درماندگی کی صورت میں واجبات ساقط ہو جاتے ہیں۔

——— شیخ ابن عثیمین ———

نمرہ کو مزدلفہ سمجھتے ہوئے پڑاؤ ڈال دیا

سوال ایک حاجی نے نمرہ کو مزدلفہ سمجھتے ہوئے وہاں پڑاؤ ڈال دیا تو اس کے حج کے بارے میں کیا حکم ہے؟

جواب جو لوگ نمرہ کو مزدلفہ سمجھتے ہوئے وہاں پڑاؤ ڈال دیں تو ان پر فدیہ لازم ہے کیونکہ انہوں نے کوتاہی کی' انہیں چاہیئے تھا کہ کسی سے پوچھ لیتے' تاہم ان کا حج صحیح ہے۔

——— شیخ ابن عثیمین ———

مشعر حرام کے پاس وقوف واجب نہیں ہے

سوال اس سال حج کرتے ہوئے عرفہ کے بعد جب میں مزدلفہ میں گیا اور وہاں رات بسر کی تو میں مشعر حرام کے پاس جانا بھول گیا تو کیا اس کی وجہ سے مجھے گناہ ہو گا؟

جواب جب آپ نے مزدلفہ میں کسی بھی جگہ رات گزار لی تو آپ پر کوئی گناہ نہیں اور مشعر حرام نہ جانے کی وجہ سے کوئی نقصان نہیں۔ نبی اکرم ﷺ نے مشعر حرام میں وقوف کیا اور فرمایا:

«وَقَفْتُ هَاهُنَا وَجَمْعٌ كُلُّهَا مَوْقِفٌ»(صحيح مسلم، الحج، باب ما جاء أن عرفة كلها موقف، ح:١٤٩/١٢١٨)

''میں نے یہاں وقوف کیا ہے لیکن سارا مزدلفہ موقف ہے۔''

لہذا آپ مزدلفہ میں جہاں بھی وقوف کر لیں اور رات بسر کر لیں کافی ہے۔ نبی ﷺ کے اس فرمان سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ انسان کو چاہیئے کہ وہ مشعر تک پہنچنے کے لیے تکلف نہ کرے اور مشقت نہ اٹھائے بلکہ وہ جہاں بھی ہو وہاں وقوف کر لے اور جب نماز فجر ادا کر لے تو اللہ عزوجل سے دعا کرے اور پھر منیٰ روانہ ہو جائے۔

——— شیخ ابن عثیمین ———

[1] صحیح مسلم' المساجد' باب اوقات الصلوات الخمس' ح: 612

جو شخص گیارہ بج کر چالیس منٹ پر مزدلفہ سے نکلے ------

سوال ہم گیارہ بج کر چالیس منٹ پر مزدلفہ سے نکل گئے کیونکہ ہمارے ساتھ بچے بھی تھے' جب کہ ہم نے گیارہ بج کر پچاس منٹ پر جمرہ کو رمی بھی کر لی تھی اور پھر ہم مکہ مکرمہ روانہ ہو گئے تو اس کے بارے میں کیا حکم ہے؟

جواب آپ پر کچھ لازم نہیں کیونکہ آپ کا مزدلفہ سے خروج نصف رات کے قریب تھا' ہاں البتہ اگر آپ لوگ کچھ دیر اور ٹھہر جاتے حتیٰ کہ چاند غائب ہو جاتا تو یہ افضل اور زیادہ بہتر تھا۔ اللہ تعالیٰ سب کو اپنی رضا کے مطابق عمل کی توفیق عطا فرمائے اور ہمارے' آپ کے اور تمام مسلمانوں کے اعمال کو شرف قبولیت سے نوازے!

——— شیخ ابن باز ———

نصف رات سے پہلے مزدلفہ سے کوچ

سوال ایک مصری شخص جو سعودی عرب میں مقیم ہے' اس نے مصر سے حج کی نیت سے آنے والی اپنی والدہ کا جدہ ایئر پورٹ پر استقبال کیا' جب وہ پہنچ گئی تو یہ لوگ گئے اور انہوں نے مناسک حج ادا کر لیے اور جب مطوف کی معیت میں عرفات سے مزدلفہ کی طرف روانہ ہوئے اور مزدلفہ میں مغرب و عشا کی نمازیں جمع کر کے ادا کر لیں تو مطوف نے آدھی رات سے پہلے ہی انہیں منیٰ جانے پر مجبور کر دیا یعنی یہ لوگ مزدلفہ میں آدھی رات سے پہلے بیٹھے اور پھر مطوف کے مجبور کرنے پر منیٰ روانہ ہو گئے اور اسی طرح انہوں نے حج ادا کیا تو ان کے بارے میں کیا حکم ہے؟ اور اب والدہ مصر سفر کر گئی ہے اور اس کی واپسی ممکن نہیں اور کیا اس کا یہ حج جائز ہے جب کہ اس نے ہوائی جہاز میں محرم کے بغیر سفر کیا ہے؟

جواب اگر امر واقع اسی طرح ہے جس طرح سائل نے ذکر کیا ہے تو مذکورہ عورت کا حج صحیح ہے اور ان کے نصف رات سے قبل مزدلفہ سے روانہ ہونے کی وجہ سے کچھ لازم نہیں ہے کیونکہ انہیں اسی پر مجبور کر دیا گیا تھا' ہاں البتہ محرم کے بغیر مصر سے آنا جائز نہ تھا' لہٰذا اس سے توبہ کرنی چاہیئے لیکن اس سے حج باطل نہیں بلکہ صحیح ہے۔ واللہ ولی التوفیق۔

——— شیخ ابن باز ———

منیٰ میں رات بسر کرنا

منیٰ میں جگہ نہ ملنا

سوال جب کسی حاجی کو تشریق کے دن اور راتوں میں منیٰ میں جگہ نہ ملے تو اس کے بارے میں کیا حکم ہے؟

جواب جن لوگوں کو منیٰ میں جگہ نہ ملے تو وہ حاجیوں کے آخری خیمہ کے پاس پڑاؤ ڈال لیں خواہ ان کا یہ پڑاؤ حدود منیٰ سے باہر ہی ہو کیونکہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ فَاتَّقُوا اللَّهَ مَا اسْتَطَعْتُمْ ﴾ (التغابن ٦٤/ ١٦)

"پس جہاں تک ہو سکے اللہ سے ڈرو۔"

شیخ ابن عثیمین

رش کی وجہ سے منیٰ سے باہر رات بسر کرنا

سوال جب حاجی رات بسر کرنے کے لیے منیٰ میں جگہ نہ پائے تو وہ کیا کرے؟ کیا منیٰ سے باہر رات بسر کرنے کی وجہ سے کوئی فدیہ وغیرہ ہے؟

جواب جب حاجی منیٰ کی راتیں منیٰ میں بسر کرنے کے لیے جگہ تلاش کرنے میں کوشش کرے اور اسے کوئی جگہ نہ ملے تو اس میں کوئی حرج نہیں کہ وہ منیٰ سے باہر پڑاؤ ڈال دے کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ فَاتَّقُوا اللَّهَ مَا اسْتَطَعْتُمْ ﴾ (التغابن ٦٤/ ١٦)

"پس جہاں تک ہو سکے اللہ سے ڈرو۔"

اس پر کوئی فدیہ بھی نہیں کہ اس نے منیٰ میں قیام اس لیے نہیں کیا کہ اسے اس کی قدرت ہی نہ تھی۔

شیخ ابن باز

ناواقفیت کی وجہ سے منیٰ سے باہر رات بسر کرنا

سوال میں نے اور میرے اہل خانہ نے اس سال حج کیا اور تین دن گزارے۔ حاجیوں کی کثرت کی وجہ سے دوسرے دن ہمیں معلوم ہوا کہ ہم تو منیٰ سے باہر ہیں۔ امید ہے رہنمائی فرمائیں گے کہ اس سلسلہ میں مجھ پر کیا لازم ہے؟

جواب اگر آپ کو جگہ ہی نہیں ملی تو آپ پر کچھ لازم نہیں اور اگر آپ کو جگہ ملی اور آپ نے کوتاہی کی تو آپ کو اللہ کی بارگاہ میں توبہ کرنی چاہیئے اور اگر آپ نے تمام راتیں ہی منیٰ سے باہر گزاری ہیں تو پھر اہل علم کے بقول آپ پر فدیہ لازم ہے جسے فقرائے مکہ میں تقسیم کر دیا جائے اور اگر آپ نے ایک رات منیٰ میں نہیں گزاری اور دوسری رات منیٰ میں گزاری ہے تو پھر آپ پر یہ لازم ہے کہ ایک مسکین کو کھانا کھلا دیں۔

شیخ ابن عثیمین

ناواقفیت کی وجہ سے منیٰ سے باہر رات بسر کرنا-----

سوال ایک آدمی نے دو راتیں منیٰ کے بہت ہی قریب یہ سمجھتے ہوئے گزاریں کہ وہ منیٰ ہی میں ہے لیکن اسے بعد میں یہ معلوم ہوا کہ وہ منیٰ کے اندر نہیں بلکہ منیٰ کے قریب ہے اور یہ بات حج کے بعد اسے آج کل انہی ایام میں معلوم ہوئی تو اب اسے کیا کرنا چاہیئے؟

جواب اس آدمی پر ایک دم لازم ہے جسے ذبح کر کے وہ فقرائے مکہ میں تقسیم کر دے کیونکہ اس نے شرعی عذر کے بغیر ایک واجب کو ترک کیا ہے' اس آدمی کے لیے یہ واجب تھا کہ منیٰ کے بارے میں کسی سے پوچھ لیتا اور پھر وہاں رات بسر کرتا لیکن اس نے جب اس واجب کو ادا نہیں کیا تو اس پر دم واجب ہے اور وہ یہ کہ بھیڑ کا بچہ یا ایسی بکری جس کے سامنے

کے دو دانت گر گئے ہوں اور جس کی قربانی کی جا سکتی ہو ذبح کرے۔ جو شخص منیٰ میں جگہ تلاش کرے لیکن اسے جگہ نہ ملے تو اس پر کچھ لازم نہیں کیونکہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ فَاتَّقُوا اللّٰهَ مَا اسْتَطَعْتُمْ ﴾ (التغابن ٦٤/ ١٦)

"پس جہاں تک ہو سکے اللہ سے ڈرو۔"

نیز فرمایا:

﴿ لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا إِلَّا وُسْعَهَا ﴾ (البقرة٢/ ٢٨٦)

"اللہ کسی شخص کو اس کی طاقت سے زیادہ تکلیف نہیں دیتا۔"

اور نبی اکرم ﷺ نے فرمایا:

«إِذَا أَمَرْتُكُمْ بِأَمْرٍ فَأْتُوا مِنْهُ مَا اسْتَطَعْتُمْ»(صحيح البخاري، الاعتصام بالكتاب والسنة، باب الإقتداء بسنن رسول الله ﷺ، ح:٧٢٨٨ وصحيح مسلم، الحج، باب فرض الحج مرة ... الخ، ح:١٣٣٧ ومسند أحمد:٢/ ٥٠٨ واللفظ له)

"جب میں تمہیں کوئی حکم دوں تو مقدور بھر اس کی اطاعت بجالاؤ۔"

منیٰ میں شب بسر کرنے سے وہ لوگ بھی مستثنیٰ ہوں گے جو کسی شرعی عذر کی وجہ سے معذور ہوں مثلاً بیمار' چرواہے اور سقے وغیرہ۔ وباللہ التوفیق۔

——— شیخ ابن باز ———

منیٰ میں ساری رات گزارنا افضل ہے

سوال اللہ تعالیٰ نے توفیق عطا فرمائی' میں نے اپنے خاوند کے ساتھ اس سال حج کیا' تینوں ایام تشریق میں ہم منیٰ میں صرف رات کے ایک بجے تک رہتے تھے اور پھر باقی رات گزارنے کے لیے ہم مکہ میں آ جاتے تھے کیونکہ وہاں ہمارے پاس گھر موجود تھا تو کیا یہ جائز ہے؟ رہنمائی فرمائیں۔ جزاکم اللہ خیراً۔

جواب منیٰ میں رات کا اکثر حصہ گزار دینا کافی ہے والحمدللہ' لہٰذا آپ پر کوئی فدیہ وغیرہ نہیں ہے لیکن اگر آپ نبی ﷺ اور حضرات صحابہ کرام کے اسوہ پر عمل کے پیش نظر ساری رات منیٰ ہی میں بسر کرتے تو یہ افضل تھا۔ وباللہ التوفیق

——— شیخ ابن باز ———

منیٰ میں رات کا اکثر حصہ گزارنا شرط ہے

سوال اس شخص کے بارے میں کیا حکم ہے جو رات کو منیٰ میں بارہ بجے تک رہے پھر مکہ مکرمہ میں واپس لوٹ آئے اور طلوع فجر سے پہلے دوبارہ وہاں نہ جائے؟

جواب اگر بارہ بجے تک آدھی رات ہو جاتی ہو تو پھر اس کے بعد منیٰ سے باہر آنے میں کوئی حرج نہیں' اگرچہ افضل یہ ہے کہ دن رات منیٰ ہی میں بسر کیے جائیں اور اگر بارہ آدھی رات سے پہلے بج جاتے ہوں تو پھر منیٰ سے باہر نہیں آنا

چاہیئے کیونکہ شرط یہ ہے کہ رات کا اکثر حصہ منیٰ میں بسر کیا جائے جیسا کہ ہمارے فقہائے کرام رحمہم اللہ نے ذکر فرمایا ہے۔

——— شیخ ابن عثیمین ———

حاجی کا ایام تشریق مکہ میں گزارنا

سوال یہ تو معلوم ہے کہ حاجی کے لیے یہ لازم ہے کہ وہ ایام تشریق منیٰ میں بسر کرے لیکن جب انسان رات کو سونا نہ چاہے تو کیا وہ منیٰ سے باہر نکل کر حرم میں رات بسر کر سکتا ہے تاکہ حرم میں رہ کر مزید عبادت کر سکے۔ وفقکم اللہ

جواب اہل علم جو یہ فرماتے ہیں کہ ایام تشریق میں منیٰ میں رات بسر کرنا واجب ہے تو اس سے مراد یہ ہے کہ ان دنوں کو انسان منیٰ ہی میں بسر کرے خواہ سو کر یا بیدار رہ کر۔ اس سے یہ مراد نہیں ہے کہ ان دنوں میں منیٰ میں سونا واجب ہے لہٰذا ہم سائل سے یہ کہیں گے کہ ایام تشریق آپ کے لیے مکہ میں گزارنا جائز نہیں بلکہ واجب ہے کہ یہ دن منیٰ میں بسر کیے جائیں ہاں البتہ اہل علم کے بقول اگر رات کا اکثر حصہ منیٰ میں بسر کر لیا جائے تو یہ بھی کافی ہے' اگر منیٰ میں جگہ نہ ملے تو منیٰ کے آخری خیمہ کے پاس پڑاؤ ڈال دے لیکن مکہ مکرمہ نہ جائے کیونکہ واجب ہے کہ لوگ ایک دوسرے کے ساتھ مل کر رہیں جیسا کہ مسجد بھری ہو تو لوگوں کو مل کر ایک دوسرے کے ساتھ کھڑا ہونا چاہیئے۔ واللہ اعلم۔

——— شیخ ابن عثیمین ———

کام کی وجہ سے منیٰ میں رات بسر نہ کرنا

سوال اس شخص کے بارے میں کیا حکم ہے جس کے کام کاج کے حالات اسے ایام تشریق میں رات منیٰ میں بسر کرنے کی اجازت نہ دیتے ہوں؟

جواب عذر والے لوگوں سے منیٰ میں رات بسر کرنے کا حکم ساقط ہے لیکن انہیں چاہیئے کہ باقی اوقات کو غنیمت سمجھتے ہوئے انہیں حجاج کے ساتھ منیٰ میں بسر کریں۔

——— شیخ ابن باز ———

ایام تشریق میں منیٰ سے باہر رات گزارنا

سوال ایام تشریق میں منیٰ سے باہر رات گزارنے کے بارے میں کیا حکم ہے' خواہ یہ جان بوجھ کر ہو یا منیٰ میں جگہ نہ ملنے کی وجہ سے' نیز حاجی منیٰ سے کب کوچ کرنا شروع کریں؟

جواب صحیح قول کے مطابق گیارہ اور بارہ تاریخ کی رات منیٰ میں گزارنا واجب ہے۔ محقق اہل علم نے اسی بات کو ترجیح دی ہے کہ مرد اور عورت حاجیوں پر راتیں منیٰ میں بسر کرنا واجب ہے۔ اگر منیٰ میں جگہ نہ ملے تو یہ حکم ساقط ہو جائے گا اور اس صورت میں کوئی فدیہ وغیرہ نہ ہو گا' لیکن جو شخص اسے بلا عذر ترک کر دے تو اس پر دم لازم ہے۔

حاجی جب بارہ تاریخ کو زوال کے بعد رمی جمرات سے فارغ ہو جائے تو وہ منیٰ سے کوچ کر سکتا ہے۔ پس اسے رخصت ہے کہ وہ منیٰ سے چلا جائے' اور اگر وہ رک جائے حتیٰ کہ تیرہ تاریخ کو زوال کے بعد رمی جمرات سے فراغت کے بعد کوچ

کرے تو یہ افضل ہے۔

——— شیخ ابن باز ———

بغیر عذر کے منیٰ میں رات بسر نہ کرنا

سوال اس شخص کے بارے میں کیا حکم ہے جو منیٰ میں تین یا دونوں دنوں کی راتیں بسر نہ کرے تو کیا اس پر ہر رات بسر نہ کرنے کی وجہ سے ایک دم لازم ہو گا یا تینوں راتوں کے لیے ایک دم ہی کافی ہو گا' امید ہے دلیل کے ساتھ اس مسئلہ کی وضاحت فرمائیں گے؟

جواب جو شخص کسی عذر کے بغیر ایام تشریق کی راتیں منیٰ میں بسر نہیں کرتا تو وہ افعال و ارکان حج میں سے ایک ایسے فعل کا تارک ہے جسے رسول اللہ ﷺ نے اپنے قول و فعل سے مشروع قرار دیا ہے اور اس کے ترک کی آپ نے صرف عذر والوں مثلاً چرواہوں اور سقوں وغیرہ ہی کو رخصت دی ہے اور رخصت عزیمت کے بالمقابل ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ایام تشریق کی راتوں کو منیٰ میں بسر کرنا' اہل علم کے صحیح قول کے مطابق واجبات حج میں شمار کیا گیا ہے' لہٰذا جو شخص اسے شرعی عذر کے بغیر ترک کر دے تو اس پر دم لازم ہے کیونکہ ابن عباس رضی اللہ عنہما سے یہ ثابت ہے کہ "جو شخص حج کے کسی عمل کو ترک کر دے یا بھول جائے تو وہ خون بہائے۔"[1] ان تمام راتوں کے لیے ایک دم ہی کافی ہو گا۔ واللہ اعلم۔

——— شیخ ابن باز ———

بیماری کی وجہ سے منیٰ میں رات بسر نہ کرنا

سوال اس شخص کے بارے میں کیا حکم ہے جو گیارہ تاریخ کی رات منیٰ میں اس لیے بسر نہ کر سکے کہ وہ بیمار تھا' ہاں البتہ دن کو زوال کے بعد اس نے رمی جمار کی اور پھر بارہ تاریخ کو بھی اس نے زوال کے بعد رمی کی تو کیا بیماری کی وجہ سے گیارہ تاریخ کی رات منیٰ میں نہ گزارنے کی وجہ سے اس پر دم لازم ہے' جیسا کہ اس نے بارہ تاریخ کی رات منیٰ میں گزاری تھی اور پھر بارہ تاریخ کو زوال کے بعد رمی جمار کر کے اس نے منیٰ سے مکہ مکرمہ کی طرف کوچ کیا' امید ہے اس مسئلہ کی دلیل کے ساتھ وضاحت فرمائیں گے؟

جواب اگر بیماری کی وجہ سے ایک رات کا قیام ترک کیا ہے تو کوئی فدیہ لازم نہیں ہے کیونکہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ فَاتَّقُوا اللَّهَ مَا اسْتَطَعْتُمْ ﴾ (التغابن ٦٤/ ١٦)

"سو جہاں تک ہو سکے اللہ سے ڈرو۔"

اور نبی کریم ﷺ نے سقوں اور چرواہوں کو ترک قیام کی رخصت عطا فرما دی تھی[2] تو اس سے معلوم ہوا کہ معذور کے لیے ترک قیام کی رخصت ہے۔ واللہ اعلم۔

——— شیخ ابن باز ———

---

[1] موطأ إمام مالک' الحج' باب جامع الفدية' حديث: 257' 419/1' 420

[2] صحيح بخاری' الحج' باب سقاية الحاج' حديث: 1634 - 1635 و صحيح مسلم' الحج' حديث: 1315

یوم عید ایام تشریق میں سے نہیں ہے

سوال بعض لوگ منیٰ میں صرف ایک رات قیام کرتے ہیں یعنی گیارہ کی رات قیام کرتے ہیں اور گیارہ تاریخ کو وہ بارہ کی بھی رمی کر لیتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ اس طرح انہوں نے دو دن گزار لیے ہیں کیونکہ عید کے دن کو بھی وہ ایام تشریق میں سے شمار کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ہم نے عید (قربانی) کے دن اور اس کے بعد دوسرے دن جو کہ گیارہ تاریخ کا دن ہے رمی کر لی ہے اور یہی وہ دو دن ہیں جن کا اللہ تعالیٰ نے اس آیت کریمہ میں ذکر فرمایا ہے:

﴿ فَمَن تَعَجَّلَ فِي يَوْمَيْنِ فَلَآ إِثْمَ عَلَيْهِ ﴾ (البقرۃ۲/ ۲۰۳)

"اگر کوئی جلدی کرے (اور) دو ہی دن میں (چل دے) تو اس پر بھی کچھ گناہ نہیں۔"

اور اس طرح وہ گیارہ تاریخ کو منیٰ چھوڑ جاتے ہیں' تو کیا یہ شرعاً جائز ہے اور کیا یہ صحیح ہے کہ انسان یوم عید کو بھی ان دو دنوں میں شمار کرے۔ امید ہے اس مسئلہ کی دلیل کے ساتھ وضاحت فرمائیں گے؟

جواب ان دو دنوں سے مراد جنہیں منیٰ میں بسر کرنے کے بعد اللہ تعالیٰ نے جلدی کرنے والوں کو منیٰ سے رخصت ہو جانے کی اجازت دی ہے' عید کا دوسرا اور تیسرا دن ہے کیونکہ یوم عید تو یوم حج اکبر ہے اور ایام تشریق عید کے دن کے بعد کے تین دنوں کو کہتے ہیں اور یہی دن رمی جمرات اور اللہ عزوجل کے ذکر کے دن ہیں۔ جو شخص جلدی کرنا چاہے تو وہ بارہ تاریخ کے غروب آفتاب سے پہلے پہلے منیٰ سے کوچ کر جائے' لیکن اگر سورج غروب ہو گیا تو پھر منیٰ ہی میں رات بسر کرنا واجب ہو گا اور اسے تیرہ تاریخ کو بھی رمی کرنا پڑے گی۔ نبی اکرم ﷺ اور صحابہ کرام نے ایسا ہی کیا تھا۔ جو شخص گیارہ تاریخ کو منیٰ سے روانہ ہو جائے تو اس نے ایک واجب یعنی رمی کو ترک کیا ہے' لہٰذا اس پر دم لازم ہے جسے مکہ میں فقراء کے لیے ذبح کیا جائے اور اس نے بارہویں رات کا منیٰ میں جو قیام ترک کیا تو اس کی وجہ سے اسے مقدور بھر صدقہ کرنا چاہیئے نیز اس کوتاہی اور بے وقت جلد بازی کی وجہ سے اللہ تعالیٰ سے توبہ و استغفار بھی کرنا چاہیئے۔

——— شیخ ابن باز ———

بارہ تاریخ کو منیٰ سے چلا گیا.........

سوال جب کوئی حاجی عجلت کی نیت سے بارہ تاریخ کے غروب آفتاب سے قبل منیٰ سے چلا جائے لیکن منیٰ میں کام کی وجہ سے اسے غروب آفتاب کے بعد پھر واپس آنا پڑے تو کیا اسے جلدی سے نکل جانے والوں میں شمار کیا جائے گا۔

جواب ہاں اسے جلدی کرنے والا شمار کیا جائے' کیونکہ اس نے حج کو ختم کر دیا اور دوبارہ منیٰ میں آیا ہے تو وہ کام کی وجہ سے نہ کہ حج کی وجہ سے اور یہ عجلت کے خلاف نہیں ہے۔

——— شیخ ابن عثیمین ———

رمی جمرات

جمار کی کنکریاں

سوال جمار کی کنکریاں کہاں سے لی جائیں؟ وہ کیسی ہوں اور انہیں دھونے کے بارے میں کیا حکم ہے؟

جواب کنکریاں منیٰ سے لی جائیں۔ اگر عید کے دن مزدلفہ سے لے لی جائیں تو پھر بھی کوئی حرج نہیں‘ کنکریوں کی تعداد سات ہونی چاہیئے۔ انہیں دھونے کا حکم نہیں ہے بلکہ انہیں منیٰ یا مزدلفہ یا بقیہ حرم سے کسی بھی جگہ سے لے کر اسی طرح رمی کر دے‘ اس میں کوئی حرج نہیں۔ ایام تشریق میں کنکریوں کو منیٰ سے لیا جائے اور ہر روز اکیس کنکریاں لیجائیں اور اگر عجلت میں ہو تو بیالیس کنکریاں‘ گیارہوں اور بارہویں دن کے لئے درکار ہوں گی اور اگر تین دن ٹھہرنے کا ارادہ ہو تو پھر کل تریسٹھ کنکریاں مارنا ہوں گی۔ کنکری کا سائز بکری کی متوسط سائز کی مینگنی کے بقدر ہونا چاہیئے جو کہ چنے کے دانے سے بڑی ہو اور بندق درخت کے پھل سے چھوٹی ہو جیسا کہ فقہاء نے فرمایا ہے۔ اس کنکری کو حصی الخذف کہا جاتا ہے اور جیسا کہ قبل ازیں بیان کیا جا چکا ہے کہ کنکری بکری کی مینگنی سے تھوڑی سی چھوٹی ہونی چاہیئے۔

—— شیخ ابن باز ——

جمروں کے اردگرد کی کنکریوں سے رمی کرنا

سوال کیا حاجی کے لیے یہ جائز ہے کہ وہ جمروں کے اردگرد پڑی ہوئی کنکریوں سے رمی کر لے؟

جواب ہاں یہ جائز ہے کیونکہ ان کے ساتھ دراصل رمی نہیں ہوئی‘ ہاں البتہ جو حوض میں کنکریاں ہوں تو انہیں رمی کے لیے بالکل استعمال نہ کیا جائے۔

—— شیخ ابن باز ——

مستعمل کنکریوں سے رمی کرنا

سوال کہا جاتا ہے کہ مستعمل کنکریوں سے رمی کرنا جائز نہیں تو کیا یہ صحیح ہے؟ اس کی دلیل ہے؟

جواب یہ بات صحیح نہیں ہے کیونکہ جن لوگوں کا یہ کہنا ہے کہ مستعمل کنکریوں سے رمی کرنا جائز نہیں ہے‘ انہوں نے اس کے تین اسباب بیان کئے ہیں (۱) مستعمل کنکری‘ طہارت واجب کے لیے مستعمل پانی کی طرح ہے اور طہارت واجب میں مستعمل پانی طاہر تو ہوتا ہے لیکن مطہر نہیں۔ (۲) یہ کنکری اس غلام کی طرح ہے جسے ایک بار آزاد کر دیا گیا ہو تو اسے دوبارہ کسی کفارہ وغیرہ کے لیے آزاد نہیں کیا جا سکتا (۳) مستعمل کنکری سے رمی کرنے سے یہ لازم آتا ہے کہ تمام حاجی صرف ایک ہی پتھر سے رمی کر لیں اور وہ اس طرح کہ آپ ایک پتھر پھینکیں اور پھر اسے پکڑ کر دوبارہ سہ بارہ حتیٰ کہ سات بار پھینک دیں اور پھر دوسرا حاجی اسی کو پکڑ کر پھینک دے‘ ان لوگوں نے عدم جواز کی یہ تین علتیں بیان کی ہیں لیکن ان پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ علتیں بے حد علیل (نہایت کمزور) ہیں کیونکہ ان میں سے پہلی علت کے بارے میں ہم

یہ کہیں گے کہ یہ بات درست نہیں ہے کہ طہارت واجب میں استعمال کیا گیا پانی طاہر تو ہوتا ہے مطہر نہیں کیونکہ اس کی کوئی دلیل نہیں ہے اور پانی کو اس کے اصلی وصف یعنی طہوریت سے کسی دلیل ہی سے خارج قرار دیا جا سکتا ہے لیکن اس کی کوئی دلیل نہیں تو معلوم ہوا کہ طہارت واجب میں مستعمل پانی طاہر بھی ہے اور مطہر بھی اور جب مقیس علیہ کے حکم کی نفی ہو گئی تو اس کی فرع کی خود بخود نفی ہو گئی۔ اسی طرح دوسری علت یعنی مستعمل کنکری کو آزاد کردہ غلام پر قیاس کرنا قیاس مع الفارق ہے کہ غلام کو جب آزاد کر دیا جائے تو وہ غلام نہیں بلکہ آزاد ہو جاتا ہے لہٰذا اب دوبارہ اس کی آزادی کے کوئی معنی نہیں لیکن پتھر رمی کے بعد بھی پتھر ہی رہتا ہے اور اس سے وہ صفت زائل نہیں ہوتی جس کی وجہ سے یہ رمی کے قابل تھا اور پھر ایک مرتبہ آزاد کردہ غلام اگر کسی شرعی سبب کے باعث دوبارہ غلام بن جائے تو اسے دوبارہ آزاد کرنا بھی جائز ہے۔ اسی طرح تیسری علت جو یہ بیان کی گئی ہے کہ اس سے تو یہ لازم آتا ہے کہ تمام حاجیوں کے لیے ایک ہی پتھر کافی ہو تو ہم عرض کریں گے کہ اگر ایسا ممکن ہو تو یہ جائز ہے لیکن ایسا ممکن ہی نہیں اور پھر کنکریوں کی کثرت اور فراوانی کی وجہ سے کون ایسا کر سکتا ہے' لہٰذا آپ کے ہاتھ سے جب ایک یا ایک سے زیادہ کنکریاں جمرات کے پاس گر جائیں تو ان کے بجائے اپنے پاس سے کنکریاں پکڑ لو' خواہ ظن غالب کے مطابق وہ رمی میں استعمال ہو چکی ہوں یا استعمال نہ ہوئی ہوں۔

——— شیخ ابن عثیمین ———

رمی جمرات کی ابتداء' کیفیت اور کنکریوں کی تعداد

سوال حاجی رمی جمرات کی کب ابتداء کرے' رمی کی کیفیت کیا ہو' کنکریوں کی تعداد کتنی ہو نیز کس جمرہ سے شروع کرے اور کس پر ختم؟

جواب پہلے جمرہ کو عید کے دن رمی کی جائے۔ یہ وہ جمرہ ہے جو مکہ سے ملا ہوا ہے اور اسے جمرہ عقبہ کہا جاتا ہے۔ اسے عید کے دن رمی کی جائے اور اگر قربانی کی رات نصف اخیر کے وقت رمی کر لی جائے تو یہ بھی صحیح ہے لیکن افضل یہ ہے کہ ضحیٰ کے وقت رمی کی جائے اور غروب آفتاب تک رمی کی جا سکتی ہے اور اگر دن کو رمی نہ کی جا سکے تو عید کے دن کے بعد والی رات کو غروب آفتاب کے بعد بھی رمی کی جا سکتی ہے۔ ایک ایک کنکری پھینکی جائے اور ہر کنکری کے ساتھ اللہ اکبر پڑھا جائے۔ ایام تشریق میں زوال آفتاب کے بعد رمی کی جائے۔ پہلے اس پہلے جمرہ کو رمی کی جائے جو مسجد خیف کے ساتھ ہے۔ اسے سات کنکریاں ماری جائیں اور ہر کنکری کے ساتھ اللہ اکبر پڑھا جائے۔ پھر جمرہ وسطیٰ کو سات کنکریاں ماری جائیں اور پھر آخری جمرہ کو سات کنکریاں ماری جائیں۔ اور جسے (جلدی) نہ ہو وہ گیارہ' بارہ اور تیرہ تاریخ کو اسی طرح کنکریاں مارے۔ سنت یہ ہے کہ پہلے اور دوسرے جمرہ کو رمی کرنے کے بعد رک جائے' پہلے جمرہ کو رمی کرنے کے بعد قبلہ رخ ہو کر کھڑا ہو جائے' جمرہ کو اپنی بائیں طرف کر لے اور اللہ تعالیٰ سے خوب لمبی دعا کرے' جسے جلدی نہ ہو وہ گیارہ' بارہ اور تیرہ تاریخ کو اسی طرح کرے۔ جمرہ اخیرہ جو مکہ مکرمہ سے ملا ہوا ہے' اسے رمی تو کر لے لیکن اس کے پاس کھڑا نہ ہو کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے اسے رمی تو کی تھی لیکن آپ اس کے پاس کھڑے نہیں ہوئے تھے۔ [1]

——— شیخ ابن باز ———

[1] صحیح مسلم' الحج' باب حجۃ النبی ﷺ' حدیث: 1218۔

رمی جمار کا وقت

سوال تینوں ایام تشریق میں رمی جمار کا وقت کب شروع ہوتا ہے اور کب ختم ہوتا ہے؟ کیا یہ صحیح ہے کہ خاص ان دنوں میں حاجی کو چاہیئے کہ ان جمروں کو رات کو رمی کرلے کیونکہ دن کے وقت بے پناہ رش کی وجہ سے رمی کرنا بے حد مشکل ہوتا ہے' لہٰذا بعض لوگ اس صحیح حدیث سے استدلال کرتے ہیں جسے امام بخاری رحمہ اللہ نے صحیح میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے قربانی کے دن منیٰ میں سوال کیا جا رہا تھا تو آپ نے فرمایا:

«لاَ حَرَجَ» ۔

"کوئی حرج نہیں۔"

ایک آدمی نے آپ سے یہ سوال کیا کہ میں نے قربانی سے پہلے بال منڈوا دیئے ہیں تو آپ نے فرمایا:

«اذْبَحْ وَلاَ حَرَجَ»

"اب قربانی کرلو کوئی حرج نہیں۔"

ایک نے کہا کہ میں نے مغرب کے بعد رمی کی ہے تو آپ نے فرمایا:

«لاَ حَرَجَ»

"کوئی حرج نہیں۔"

ان حضرات کا استدلال یہ ہے کہ جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے رات کو رمی کی اجازت دے دی تھی جبکہ قربانی کے دن حاجی کے لیے رمی کرنا ایک انتہائی اہم واجب ہے' حتیٰ کہ وہ تحلل اول کی صورت میں حلال ہو جائے تو باقی تینوں ایام تشریق میں وہ رات کو رمی کیوں نہیں کر سکتا جبکہ وہ یوم نحر کی نسبت کم وجوب کے حامل ہیں' تو یہ گویا اس بات کی دلیل ہے کہ تینوں ایام تشریق میں رات کے وقت بھی رمی کرنا جائز ہے۔ تو سوال یہ ہے کہ اس شخص کے بارے میں کیا حکم ہے جو رات کو رمی جمار کرے' کیا اس پر کوئی فدیہ لازم ہے یا نہیں؟ امید ہے کہ عزت مآب مدلل اس مسئلہ کی وضاحت فرمائیں گے؟

جواب ایام تشریق میں رمی جمار کا وقت زوال آفتاب سے لے کر غروب آفتاب تک ہے کیونکہ صحیح مسلم میں حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے راویت ہے:

«رَمٰی رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ الْجَمْرَةَ يَوْمَ النَّحْرِ ضُحًی، وَأَمَّا بَعْدَ، فَإِذَا زَالَتِ الشَّمْسُ»(صحيح مسلم، الحج، باب بيان وقت استحباب الرمي، ح:١٢٩٩/٣١٤)

"رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قربانی کے دن ضحیٰ کے وقت اور اس دن کے بعد زوال کے بعد رمی کی۔"

اور امام بخاری نے یہ روایت ذکر فرمائی ہے کہ ابن عمر رضی اللہ عنہما سے اس مسئلہ کے بارے میں پوچھا گیا تو انہوں نے فرمایا:

«كُنَّا نَتَحَيَّنُ، فَإِذَا زَالَتِ الشَّمْسُ رَمَيْنَا» (صحيح البخاري، الحج، باب رمي الجمار، ح:١٧٤٦)

"ہم انتظار کرتے تھے اور جب آفتاب زوال پذیر ہو جاتا تو ہم رمی کرتے۔"

جمہور علماء کا بھی یہی مذہب ہے' ہاں البتہ اگر کوئی شخص رات کو کسی مجبوری کی وجہ سے رمی کرے تو اس میں کوئی حرج نہیں لیکن زیادہ احتیاط اس میں ہے کہ جسے استطاعت ہو تو وہ غروب آفتاب سے پہلے پہلے رمی کرلے تاکہ سنت کے مطابق

عمل ہو سکے اور اختلاف سے بھی بچا جا سکے۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی مذکورہ روایت رات کو رمی کرنے کی دلیل نہیں ہے کیونکہ سائل نے نبی کریم ﷺ سے قربانی کے دن سوال کیا تھا' لہٰذا اس کے الفاظ "بَعْدَ مَا أَمْسَيْتُ" کے معنی زوال کے بعد کے ہیں' ہاں البتہ رات کو رمی کرنے کے بارے میں اس سے یہ استدلال ضرور کیا جا سکتا ہے کہ نبی کریم ﷺ سے کوئی ایسی نص صریح ثابت نہیں ہے جو اس بات پر دلالت کناں ہو کہ رات کو رمی کرنا جائز نہیں ہے کہ اصل تو جواز ہے لیکن افضل اور زیادہ احتیاط تو اس میں ہے کہ دن کے وقت رمی کی جائے اور اگر رات کو رمی کرنے کی ضرورت ہو تو اس میں کوئی حرج نہیں' البتہ اگلے دن کی رمی سابقہ رات میں نہ کرے۔ لیکن کمزور لوگوں کو ضرور یہ اجازت ہے کہ وہ قربانی کے دن کی رمی قربانی کی رات کے آخری حصہ میں کر سکتے ہیں جب کہ طاقتور لوگوں کے لیے سنت یہ ہے کہ وہ جمرہ عقبہ کو رمی طلوع آفتاب کے بعد کریں' جیسا کہ قبل ازیں بیان کیا جا چکا ہے تاکہ اس مسئلہ سے متعلق تمام احادیث میں تطبیق دی جا سکے۔ واللہ اعلم۔

——— شیخ ابن باز ———

جمرہ عقبہ کی رمی کا وقت

سوال جمرہ عقبہ کی رمی کا وقت کب شروع ہوتا ہے اور کب ختم ہوتا ہے؟ وقت ادا اور وقت قضا کی وضاحت فرما دیں؟

جواب عید کے دن جمرہ عقبہ کی رمی کا وقت گیارہویں دن کی طلوع فجر کے ساتھ ختم ہو جاتا ہے۔ اور ان کمزور لوگوں کے لیے جو بھیڑ کا سامنا نہ کر سکتے ہوں' رمی کا وقت قربانی کی رات کے آخری حصہ سے شروع ہو جاتا ہے۔ ایام تشریق میں رمی کا وقت بھی ان دونوں جمروں کی طرح جو ان کے ساتھ ہیں' زوال سے شروع ہوتا اور طلوع فجر کے ساتھ ختم ہو جاتا ہے اور اگر ایام تشریق میں سے آخری دن ہو تو پھر رمی کا وقت غروب آفتاب کے ساتھ ختم ہو جاتا ہے۔ دن کے وقت رمی کرنا افضل ہے خواہ دن کے اوقات میں حاجیوں کی کتنی ہی کثرت ہو اور وہ ایک دوسرے کے بارے میں کتنے ہی بے پروا ہوں' ہاں البتہ اگر کسی کو ہلاکت' نقصان یا شدید مشقت کا اندیشہ ہو تو وہ رات کو رمی کر لے اس میں کوئی حرج نہیں' اگر اس طرح کے کسی اندیشہ کے بغیر بھی رات کو رمی کر لے تو پھر بھی کوئی حرج نہیں' لیکن افضل یہ ہے کہ اس مسئلہ میں احتیاط کے پہلو کو مدنظر رکھا جائے' لہٰذا ضرورت کے بغیر رات کو رمی نہ کرے' آنے والے دن کی جب فجر طلوع ہو جائے تو یہ رمی کی قضاء ہو گی۔

——— شیخ ابن عثیمین ———

ایام تشریق میں زوال سے پہلے رمی جمار جائز نہیں

سوال ایک حاجی جس کا تعلق بیرون ملک سے ہے اور وہ سفر کے حالات' ٹکٹوں اور طیاروں کی ترتیب کے بارے میں کچھ نہیں جانتا اور اس نے شہر میں پوچھا کیا ۱۳/ ۱۲/ ۱۴۰۵ھ کی عصر کے وقت چار بجے سیٹ کی بکنگ ممکن ہے تو اسے بتایا گیا کہ ہاں یہ ممکن ہے تو اس نے اس وقت کی سیٹ بک کروائی لیکن پھر اسے تیرہویں تاریخ کی رات منیٰ ہی میں بسر کرنا پڑی تو کیا اس کے لیے یہ جائز ہے کہ وہ صبح کے وقت رمی کر لے اور پھر سفر شروع کرے کیونکہ اگر وہ زوال کے بعد لیٹ

ہو گیا تو سفر نہ کر سکے گا اور اس صورت میں اسے مشقت بھی بہت ہو گی اور ملکی قوانین کی مخالفت بھی لازم آئے گی؟

جواب یہ تو جائز نہیں کہ وہ زوال سے پہلے رمی کرے' ہاں البتہ یہ ممکن ہے کہ اس حالت میں ضرورت کے پیش نظر اس سے رمی ساقط ہو جائے گی اور اس پر فدیہ لازم ہو گا' جسے وہ خود یا اس کا وکیل منیٰ یا مکہ میں ذبح کر کے فقراء میں تقسیم کر دے اور یہ طواف وداع کر کے سفر کرے۔ اگر کوئی یہ کہے کہ ایک قول کے مطابق زوال سے قبل بھی رمی کرنا جائز ہے تو ہم عرض کریں گے کہ یہ قول صحیح نہیں ہے۔ صحیح بات یہی ہے کہ زوال سے قبل رمی جائز نہیں ہے کیونکہ نبی ﷺ نے فرمایا تھا:

«خُذُوا عَنِّي مَنَاسِكَكُمْ»(صحيح مسلم، الحج، باب استحباب رمي جمرة العقبة ... الخ، ح:١٢٩٧ والسنن الكبرى للبيهقي: ٥/ ١٢٥ واللفظ له)

"مجھ سے مناسک حج سیکھ لو۔"

اور نبی ﷺ نے زوال کے بعد رمی فرمائی تھی' اگر کوئی یہ کہے کہ آنحضرت ﷺ کا زوال کے بعد رمی کرنا محض آپ کا فعل ہے اور محض فعل وجوب پر دلالت نہیں کرتا' تو ہم عرض کریں گے کہ ہاں یہ صحیح ہے کہ یہ مجرد فعل ہے اور مجرد فعل وجوب پر دلالت نہیں کرتا اور نبی کریم ﷺ نے یہ حکم نہیں دیا کہ رمی زوال کے بعد ہو اور نہ زوال سے پہلے رمی کرنے سے منع فرمایا ہے اور یہ صحیح ہے کہ فعل وجوب پر دلالت نہیں کرتا کیونکہ وجوب تو اس وقت ثابت ہوتا ہے جب کسی فعل کا حکم دیا گیا ہو یا کسی فعل کے ترک سے منع کر دیا گیا ہو' لیکن ہم عرض کریں گے کہ یہ ایک ایسا فعل ہے جس کے وجوب پر قرینہ دلالت کناں ہے اور وہ یہ کہ رسول اللہ ﷺ رمی کو مؤخر کرتے حتیٰ کہ سورج زوال پذیر ہو جاتا اور اگر رمی زوال آفتاب سے قبل جائز ہوتی تو آپ ضرور زوال سے قبل رمی فرماتے کیونکہ اس میں لوگوں کے لیے زیادہ سہولت اور آسانی ہے اور نبی اکرم ﷺ کا معمول یہ تھا کہ آپ کو جب دو کاموں میں اختیار دیا جاتا تو آپ ان میں سے آسان ترین کو منتخب فرما لیتے بشرطیکہ وہ کام گناہ کا نہ ہوتا اور اگر آپ نے یہاں آسان کام کو منتخب نہیں فرمایا جو کہ یقیناً قبل از زوال رمی ہے تو معلوم ہوا کہ قبل از زوال رمی کرنا گناہ ہے۔ زوال کے بعد رمی کرنے کے وجوب پر دلالت کرنے والا دوسرا قرینہ یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ زوال آفتاب کے فوراً بعد اور نماز ظہر سے قبل رمی شروع فرما دیا کرتے تھے گویا آپ زوال کا شدت سے انتظار فرمایا کرتے تاکہ جلد رمی کر سکیں اور اس کے لیے نماز ظہر کو بھی مؤخر فرما دیتے حالانکہ نماز کو اول وقت ادا کرنا افضل ہے لیکن یہ سارا اہتمام صرف اس لیے ہوتا کہ رمی زوال کے بعد کر سکیں۔

——— شیخ ابن عثیمین ———

زوال سے پہلے رمی جائز نہیں

سوال میں نے حج کے آخری دن جمرات کو اذان ظہر سے پندرہ منٹ پہلے رمی کر دی تھی' تو سوال یہ ہے کہ کیا یہ زوال کا وقت ہے؟ اور اگر زوال کا وقت شروع نہیں ہوا تو کیا اس صورت میں مجھ پر کوئی فدیہ لازم ہے؟

جواب آپ پر دم لازم ہے جسے مکہ میں ذبح کر کے فقراء میں تقسیم کر دیا جائے کیونکہ ایام تشریق میں رمی جمار' زوال آفتاب کے بعد ہے' زوال سے پہلے جائز نہیں ہے کیونکہ نبی کریم ﷺ نے ایام تشریق میں زوال کے بعد رمی کی ہے اور آپ نے فرمایا:

«خُذُوا عَنِّي مَنَاسِكَكُمْ»(صحيح مسلم، الحج، باب استحباب رمي جمرة العقبة ... الخ، ح:١٢٩٧ والسنن الكبرى للبيهقي: ٥/ ١٢٥ واللفظ له)

"مجھ سے اپنے مناسک حج کو سیکھ لو۔"

لہٰذا مسلمانوں پر واجب ہے کہ وہ اس مسئلہ میں بھی آپ کی اتباع کریں۔

دم کے ساتھ ساتھ آپ پر یہ بھی لازم ہے کہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ کے حضور توبہ کریں کیونکہ آپ نے حکم شریعت کی مخالفت کی ہے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں، تمہیں اور تمام مسلمانوں کو معاف فرمائے!

——— شیخ ابن باز ———

جمرہ عقبہ کو رات کو رمی کرنا

سوال کیا یہ جائز ہے کہ عید کی رات مزدلفہ سے منیٰ آنے کے بعد رات کے وقت جمرہ عقبہ کو رمی کر دی جائے اور صحیح حدیث میں جو یہ ہے کہ نبی کریم ﷺ نے غلمان بنی عبدالمطلب سے فرمایا تھا:

«لاَ تَرْمُوا الْجَمْرَةَ حَتَّى تَطْلُعَ الشَّمْسُ» (جامع الترمذي، الحج، باب ما جاء في تقديم الضعفة من جمع بليل، ح:٨٩٣)

"سورج طلوع ہونے تک جمرہ کو رمی نہ کرو۔"

تو اس حدیث کا کیا مفہوم ہے؟

جواب طاقتور لوگوں کے لیے افضل یہ ہے کہ عید کے دن جمرہ عقبہ کو طلوع آفتاب کے بعد رمی کریں تاکہ نبی اکرم ﷺ کی اقتداء اور مذکورہ حدیث کے مطابق عمل ہو سکے، جہاں تک معذوروں اور کمزوروں کا تعلق ہے تو ان کے لیے رات کے نصف اخیر میں بھی رمی کرنا جائز ہے جیسا کہ اس مسئلہ سے متعلق احادیث سے یہ ثابت ہے مثلاً عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی حدیث میں ہے کہ نبی کریم ﷺ نے نحر والی رات حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا کو بھیجا تو انہوں نے فجر سے پہلے جمرہ کو رمی کی تھی۔[1]

اسی طرح امام بخاری رحمہ اللہ نے عبداللہ مولیٰ اسماء سے روایت کیا ہے کہ وہ مزدلفہ کی رات مزدلفہ میں آئیں اور کچھ دیر نماز پڑھتی رہیں اور پھر کہنے لگیں اے میرے بیٹے! کیا چاند غروب ہو گیا ہے؟ میں نے کہا نہیں، تو وہ کچھ دیر نماز پڑھتی رہیں، پھر کہا، کیا چاند غروب ہو گیا ہے؟ میں نے کہا ہاں، تو انہوں نے کہا کہ پھر اب کوچ کرو، چنانچہ ہم نے کوچ کیا حتیٰ کہ انہوں نے جمرہ عقبہ کو رمی کیا، پھر واپس لوٹ آئیں، اور صبح کی نماز اپنی رہائش پر ادا کی۔ میں نے کہا کہ ابھی تک تو بہت اندھیرا ہے تو انہوں نے کہا اے بیٹے! رسول اللہ ﷺ نے خواتین کو اس کی اجازت دے دی تھی۔[2] باقی رہی حدیث ابن عباس رضی اللہ عنہما جس میں طلوع آفتاب کے بعد رمی کا ذکر ہے تو بعض اہل علم نے اسے ضعیف قرار دیا ہے کیونکہ اس کی سند منقطع ہے۔ اور اگر اسے صحیح بھی فرض کر لیا جائے تو یہ استحباب اور افضیلت پر محمول ہو گا تاکہ اس مسئلہ سے متعلق تمام احادیث میں تطبیق دی جا سکے جیسا کہ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے یہ فرمایا ہے۔ واللہ اعلم

---

[1] ابو داود، المناسک، باب التعجيل من جمع، حدیث: 1942۔

[2] صحیح بخاری، الحج، باب من قدم ضعفة أهله بليل فيقفون...... الخ، حدیث: 1679۔

——— فتویٰ کمیٹی ———

جمرہ عقبہ کو رات کے وقت رمی کرنا

سوال حدیث ابن عباس رضی اللہ عنہما میں یہ آیا ہے کہ انہوں نے کہا کہ میں نے شام ہونے کے بعد رمی کی ہے' تو آپ نے فرمایا "کوئی حرج نہیں" اس حدیث کو امام بیہقی نے صحیح قرار دیا ہے تو کیا یہ صحیح ہے کہ قربانی کے دن غروب آفتاب کے بعد جمرہ عقبہ کو رمی کرنا جائز ہے؟

جواب نبی کریم ﷺ سے قربانی کے دن (ایام تشریق میں نہیں) یہ سوال کیا گیا جیسا کہ بخاری میں ہے [1] کہ ایک صحابی نے آپ سے یہ پوچھا کہ میں نے شام کے بعد رمی کی ہے یعنی دن کے آخری حصہ میں رمی کی ہے' تو یہ سب کے نزدیک جائز ہے کہ عید کے دن ظہر یا عصر کے بعد دن کے آخری حصہ میں رمی کر لی جائے' اس میں کوئی حرج نہیں لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ اس صحابی نے رات کو رمی کی تھی کیونکہ اس نے تو یہ سوال ہی رات کے آنے سے پہلے کیا تھا۔ غروب آفتاب کے بعد رمی کرنے کے بارے میں اہل علم میں اختلاف ہے۔ بعض نے کہا کہ یہ جائز ہے اور یہی قول قوی ہے اور بعض نے کہا ہے کہ غروب آفتاب کے بعد رمی کرنا جائز نہیں بلکہ اس صورت میں مؤخر کر دے اور پھر گیارہ تاریخ کو زوال آفتاب کے بعد رمی کرے' لیکن علماء فرماتے ہیں کہ گیارہویں تاریخ کے جمرات سے پہلے جمرہ عقبہ کو رمی کر لے۔ مسلمان کو چاہیئے کہ کوشش کر کے عید کے دن جمرہ عقبہ کو دن کے وقت رمی کر لے جیسا کہ نبی اکرم ﷺ اور حضرات صحابہ کرام نے کیا تھا' اسی طرح رمی کے دیگر ایام میں زوال کے بعد مگر غروب آفتاب سے پہلے پہلے رمی کرے۔ اگر مشکل درپیش ہو' سورج غروب ہو جائے اور رمی نہ کر سکے تو پھر صحیح قول کے مطابق غروب کے بعد سے لے کر رات کے آخری حصہ تک رمی کرنا جائز ہے۔ واللہ ولی التوفیق۔

——— شیخ ابن باز ———

رات کو رمی جمار..........

سوال کیا جسے کوئی عذر نہ ہو اس کے لیے ایام تشریق میں تینوں جمرات کو رات کو رمی کرنا جائز ہے؟ جو شخص کمزوروں اور عورتوں کے ساتھ قربانی کی رات نصف شب کے بعد مزدلفہ سے آیا ہو تو اس کے لیے جمرہ عقبہ کو رمی کرنا جائز ہے یا نہیں؟

جواب صحیح بات یہ ہے کہ غروب کے بعد رمی کرنا جائز ہے' لیکن سنت یہ ہے کہ غروب سے پہلے اور زوال کے بعد رمی کی جائے' لہذا اگر ممکن ہو تو یہی افضل ہے اور اگر ممکن نہ ہو تو صحیح قول کے مطابق غروب آفتاب کے بعد بھی رمی کی جا سکتی ہے۔ جو محرم اور ڈرائیور وغیرہ' کمزوروں اور عورتوں کے ساتھ آئیں تو ان کا حکم بھی وہی ہے جو ان کا ہے' یعنی وہ بھی عورتوں وغیرہ کے ساتھ رات کے آخری حصہ میں رمی کر سکتے ہیں۔

——— شیخ ابن باز ———

[1] صحیح بخاری' الحج' باب اذا رمٰی بعد ما أمسٰی الخ' حدیث : 1735

جسے حوض میں کنکری کے گرنے میں شک ہو

 اس شخص کے بارے میں کیا حکم ہے جسے یہ شک ہو کہ بعض کنکریاں حوض میں نہیں گریں؟

جواب جسے شک ہو وہ کنکریوں کی تعداد مکمل کرے' منیٰ میں اپنی قریبی زمین سے کنکریاں لے لے اور ان کے ساتھ تعداد مکمل کر لے۔

——— شیخ ابن باز ———

جب کنکری حوض میں نہ گرے

سوال ایک حاجی نے مشرقی جانب سے جمرہ عقبہ کو رمی کی لیکن کنکر حوض میں نہیں گرے' اس صورت میں اسے کیا کرنا چاہیئے' یاد رہے اس نے تیرہ تاریخ کو رمی کی ہے' کیا اس کے لیے ایام تشریق میں رمی کا اعادہ لازم ہے؟

جواب اس کے لیے ساری رمی کا اعادہ لازم نہیں ہے بلکہ صرف اس رمی کا اعادہ لازم ہے جس میں اس سے غلطی ہوئی' لہٰذا اسے صرف جمرہ عقبہ کی رمی کو دوبارہ صحیح طریقے سے کرنا ہو گا۔ اور اس نے مشرقی جانب سے جو رمی کی ہے وہ صحیح نہیں ہے کیونکہ اس طرف سے رمی کرنے سے کنکریاں حوض میں نہیں گرتیں جو کہ رمی کی جگہ ہے' ہاں البتہ اگر مشرقی جانب سے پل کے اوپر سے رمی کرے تو وہ صحیح ہو گی کیونکہ اس صورت میں کنکریاں حوض ہی میں گرتی ہیں۔

——— شیخ ابن عثیمین ———

جس نے صرف چھ کنکریاں پھینکی ہوں

سوال اس شخص پر کیا واجب ہے جس نے آخری کنکری پھینکی لیکن وہ جمرہ کبریٰ کے حوض میں نہ گری کیونکہ شدت بھیڑ کی وجہ سے اس کی قوت جواب دے گئی تھی؟

جواب اگر اس کے لیے یہ ممکن ہو کہ کسی مشقت کے بغیر اس کے بجائے اور کنکری پھینک سکے تو ایک کنکری پھینک دے ورنہ جو وہ رمی کر چکا ہے' وہی کافی ہو گی اور اس پر کوئی دم یا کھانا وغیرہ لازم نہ ہو گا۔

——— فتویٰ کمیٹی ———

جس کے ذمہ ایک یا دو کنکریاں ہوں

سوال جب پھینکی گئی سات کنکریوں میں سے ایک یا دو نہ لگیں اور ایک یا دو دن بھی گزر جائیں تو کیا اس ایک یا دو کنکریوں کا اعادہ لازم ہے اور اگر لازم ہے تو کیا وہ اس کے بعد والی رمی کا اعادہ کرے؟

جواب جب کسی ایک جمرہ کی ایک یا دو کنکریاں باقی رہ گئی ہوں تو فقہاء فرماتے ہیں کہ اس آخری جمرہ کی رمی کو مکمل کر لے جو ناقص رہ گئی ہے' اس سے پہلے کی ہوئی رمی کا اعادہ لازم نہیں ہے اور اگر آخری سے کسی پہلے جمرہ کی رمی ناقص رہ گئی ہو تو اسے مکمل کر لے اور پھر اس کے بعد والے جمروں کو رمی کر لے' لیکن میرے نزدیک صحیح بات یہ ہے کہ رمی میں

جو نقص رہ گیا ہو اسے مکمل کر لے اور اس پر بعد والی رمی کا اعادہ لازم نہیں ہے کیونکہ جہالت یا نسیان کی وجہ سے ترتیب ساقط ہو جاتی ہے اور اس آدمی نے جب دوسرے جمرہ کو رمی کی تو اس کے خیال میں پہلے جمرہ کے حوالہ سے اس پر کچھ لازم نہ تھا کیونکہ اس کی حالت جہالت اور نسیان کے درمیان تھی' لہٰذا ہم اس سے یہ کہیں گے کہ جتنی کنکریاں کم رہ گئی ہیں' انہیں پورا کر لو اور اس کے بعد کی رمی آپ پر واجب نہیں ہے۔

جواب ختم کرنے سے پہلے میں اس طرف اشارہ کرنا بھی ضروری سمجھتا ہوں کہ رمی کرنے کی جگہ وہ ہے جہاں کنکریاں جمع ہوتی ہیں نہ کہ وہ ستون جسے اس جگہ کی نشاندہی کے لیے استوار کیا گیا ہے' لہٰذا جو شخص حوض میں کنکری پھینک دے اور اس کی کنکری ستون کو نہ لگے تو اس کی رمی صحیح ہے۔ واللہ اعلم۔

——— شیخ ابن عثیمین ———

تمام جمروں کو ایک ہی دن رمی کرنا

سوال کیا حاجی کے لیے یہ جائز ہے کہ وہ ایام تشریق کے تمام جمروں کو ایک ہی دن رمی کر دے' خواہ وہ ایام تشریق میں سے پہلا دن ہو یا دوسرا یا تیسرا اور منیٰ میں دو یا تین دن بسر کرے اور رمی نہ کرے تو کیا اس طرح ایک ہی دن رمی کرنا صحیح ہے یا یہ ضروری ہے کہ رمی میں ایام کی ترتیب کو ملحوظ رکھا جائے' امید ہے دلیل کے ساتھ اس مسئلہ کی وضاحت فرمائیں گے؟

جواب رمی جمار حج کے واجبات میں سے ہے اور غیر متعجل کے لیے عید کے دن اور ایام تشریق میں رمی کرنا واجب ہے۔ اور متعجل کے لیے یہ واجب ہے کہ وہ ایام تشریق کے پہلے دو دنوں میں رمی کرے اور ہر روز زوال کے بعد رمی کرے کیونکہ نبی کریم ﷺ نے زوال کے بعد رمی کی تھی اور حج کے سلسلہ میں آپ کا مشہور ارشاد گرامی ہے:

«خُذُوا عَنِّي مَنَاسِكَكُمْ»(صحيح مسلم، الحج، باب استحباب رمي جمرة العقبة ... الخ، ح:١٢٩٧ والسنن الكبرى للبيهقي:٥/ ١٢٥ واللفظ له)

"حج کے احکام و اعمال مجھ سے سیکھو۔"

لہٰذا قبل از وقت رمی کرنا جائز نہیں ہے۔ ہاں البتہ شدید ضرورت مثلاً بہت زیادہ بھیڑ وغیرہ کی صورت میں اہل علم کی ایک جماعت کے نزدیک اسے مؤخر کرنا جائز ہے۔ ان اہل علم نے یہ بات ان چرواہوں وغیرہ پر قیاس کرتے ہوئے فرمائی ہے جنہیں نبی کریم ﷺ نے یہ رخصت عطا فرمائی تھی کہ وہ دو دنوں کی رمی دوسرے دن یعنی بارہ تاریخ کو کر لیں [1] اور ترتیب کے لیے نیت کر لیں۔ رمی کے لیے پہلا دن عید کا ہے اور پھر ایام تشریق کا پہلا پھر دوسرا اور پھر تیسرا دن ہے' بشرطیکہ عجلت کا مسئلہ درپیش نہ ہو اور پھر طواف وداع رمی کے بعد ہوتا ہے۔ واللہ اعلم

[1] سنن ابی داود' المناسک' باب فی رمی الجمار' حدیث: 1975 و جامع ترمذی' حدیث: 954 و سنن نسائی' حدیث: 3070 و سنن ابن ماجہ، حدیث: 3036۔

——— شیخ ابن باز ———

جو ایک ہی دفعہ تمام جمروں کو رمی کر لے

سوال میں نے اپنے والد کے ساتھ فریضۂ حج اس وقت ادا کیا جب میری عمر سترہ برس تھی اور مجھے حج کے احکام و مسائل کے بارے میں کچھ خبر نہ تھی۔ میں اپنے والد کے ساتھ جب رمی جمرات کے لیے گئی تو میرے والد نے کنکریوں کو لے کر تمام کو یکبار ہی پھینک دیا تو کیا میرا حج صحیح ہے یا نہیں؟ رہنمائی فرمائیں' اللہ تعالیٰ آپ کو جزائے خیر سے نوازے!

جواب اگر آپ کے والد نے تمام جمرات کو یکبار رمی کر دیا ہے' تو آپ پر دم لازم ہے اور وہ ہے اونٹ یا گائے کا ساتواں حصہ یا ایک عدد بھیڑ یا بکری ہے۔ اس کو مکہ میں ذبح کر کے فقراء میں تقسیم کر دیا جائے کیونکہ رمی جمرات حج کے واجبات میں سے ہے اور واجب یہ ہے کہ ساتوں کنکریوں کو ایک ایک کر کے پھینکا جائے۔ اگر کوئی حاجی تمام کنکریوں کو یکبار مار دے تو یہ ایسے ہو گا جیسے اس نے ایک ہی کنکری ماری ہو۔ اس مذکورہ صورت میں آپ کا حج صحیح ہے' اس کا اعادہ لازم نہیں ہے' ہاں البتہ اس میں جو نقص رہ گیا ہے اسے بیان کردہ مذکورہ دم کے ساتھ پورا کیا جا سکتا ہے۔ اگر آپ کے لیے دوبارہ حج کرنا ممکن ہو تو وہ حج نفل ہو گا۔ بہر آئینہ حج فرض ہو یا نفل' اللہ تعالیٰ توفیق عطا فرمائے تو یہ فضل عظیم اور اجر کبیر کا حامل عمل ہے' بشرطیکہ اسے حکم شریعت کے مطابق ادا کیا جائے جیسا کہ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا:

«اَلْحَجُّ الْمَبْرُورُ لَيْسَ لَهُ جَزَاءٌ إِلاَّ الْجَنَّةَ»(صحيح البخاري، العمرة، باب وجوب العمرة وفضلها، ح:١٧٧٣ وصحيح مسلم، الحج، باب فضل الحج والعمرة، ح:١٣٤٩)

"حج مبرور کی جزا جنت ہی ہے۔"

جو شخص رمی کرنے سے عاجز ہو مثلاً مریض یا بوڑھا یا وہ عورت جو جمرہ تک نہ پہنچ سکتی ہو یا اس طرح کے دیگر لوگ تو ان کے لیے یہ بھی جائز ہے کہ رمی جمار کے لیے کسی کو اپنا وکیل بنالیں کیونکہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ فَاتَّقُوا اللَّهَ مَا اسْتَطَعْتُمْ ﴾ (التغابن٦٤/ ١٦)

"سو جہاں تک ہو سکے اللہ تعالیٰ سے ڈرو۔"

تمام مسلمان مردوں اور عورتوں پر یہ واجب ہے کہ وہ دین کی سمجھ بوجھ حاصل کریں اور ان احکام کو سیکھیں جو ان پر نماز' زکوۃ' روزہ اور حج وغیرہ کے سلسلہ میں واجب قرار دیئے گئے ہیں کیونکہ اللہ تعالیٰ نے جنوں اور انسانوں کو اپنی عبادت کے لیے پیدا فرمایا ہے اور احکام کی معرفت کا اس کے بغیر اور کوئی طریقہ نہیں کہ انسان دین کا علم سیکھے اور اس میں فقاہت حاصل کرے۔ صحیح حدیث میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

«مَنْ يُرِدِ اللهُ بِهِ خَيْرًا يُفَقِّهْهُ فِي الدِّينِ»(صحيح البخاري، العلم، باب من يرد الله به خيرا . . . الخ، ح:٧١ وصحيح مسلم، الزكاة، باب النهي عن المسألة، ح:١٠٣٧)

"جس شخص کے بارے میں اللہ تعالیٰ خیر و بھلائی کا ارادہ فرماتا ہے' اسے دین کی سمجھ بوجھ عطا فرماتا ہے۔"

نیز نبی ﷺ نے یہ بھی فرمایا:

«مَنْ سَلَكَ طَرِيقًا يَلْتَمِسُ فِيهِ عِلْمًا سَهَّلَ اللهُ لَهُ طَرِيقًا إِلَى الْجَنَّةِ» (جامع الترمذي، العلم، باب فضل طلب العلم، ح:٢٦٤٦)

"جو شخص علم حاصل کرنے کے لیے کسی راستہ پر چلے تو اللہ تعالیٰ اس کے لیے اس کی وجہ سے جنت کے

راستے کو آسان بنا دیتا ہے۔"

اللہ تمام مسلمانوں کو علم نافع حاصل کرنے اور اس کے مطابق عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ إِنَّهُ خَيْرُ مَسْئُوْلٍ ۔

——— شیخ ابن باز ———

دوسرے دن زوال سے پہلے رمی کر لینا

سوال جس نے عید کے دوسرے دن ضحیٰ (چاشت) کے وقت رمی کی اور اسے بعد میں معلوم ہوا کہ رمی کا وقت تو ظہر کے بعد تھا' اس پر کیا واجب ہے؟

جواب جو شخص عیدالاضحیٰ کے دوسرے دن زوال سے پہلے رمی کر لے تو اسے اسی دن زوال کے بعد دوبارہ رمی کرنا چاہیئے اور اگر اسے اپنی غلطی کا تیسرے یا چوتھے دن علم ہو تو وہ تیسرے یا چوتھے دن زوال کے بعد رمی کا اعادہ کر لے اور جس دن اسے یاد آئے اس دن کی رمی بعد میں کرے پہلے اس رمی کا اعادہ کرے جسے اس نے غلط وقت پر کیا تھا اور اگر اسے اپنی غلطی کے بارے میں چوتھے دن غروب آفتاب کے بعد علم ہوا تو وہ رمی نہ کرے بلکہ ایک دم ذبح کر کے حرم کے فقراء کو کھلا دے۔

——— فتویٰ کمیٹی ———

جو شخص رمی جمار میں ترتیب بدل دے

سوال میرا ایک قریبی عزیز فریضہ حج ادا کرنے کے لیے ۱۴۰۶ھ میں یہاں آیا اور اس نے رمی جمار کے پہلے دن اصغر' اوسط اور اکبر کو ترتیب کے ساتھ رمی کرنے کے بجائے اس ترتیب کو بدل دیا اور اس غلطی کے بارے میں اسے دوسرے دن اس وقت علم ہوا جب کہ اس نے دوسرے اور تیسرے دن صحیح رمی کی اور پہلے دن جو اس نے غلط رمی کی تھی اس کے بجائے دوبارہ رمی کی اور نہ کوئی کفارہ ادا کیا حتیٰ کہ دیگر تمام مناسک حج ادا کرنے کے بعد وہ اپنے ملک واپس لوٹ گیا اور اس نے خط ارسال کر کے اپنی اس غلطی کے بارے میں پوچھا ہے اور لکھا ہے کہ اس نے جن علماء سے اس مسئلہ کے بارے میں پوچھا ہے' ان کی آراء مختلف ہیں؟

جواب اس شخص پر دم لازم ہے اور وہ یہ کہ اونٹ یا گائے کے ساتویں حصہ کو یا ایک عدد بھیڑ کو یا ایسی بکری کو جس کے سامنے کے دو دانت گر گئے ہوں' مکہ مکرمہ میں ذبح کر کے حرم کے فقراء میں تقسیم کر دے کیونکہ اسے رمی کے دنوں ہی میں اس مسئلہ کے بارے میں علم ہو گیا تھا اور پھر اس نے حکم شریعت کے مطابق رمی کا اعادہ نہ کیا اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ "جو شخص حج کے کسی عمل کو ترک کر دے یا اسے بھول جائے تو وہ خون بہائے۔"[1]

اور یاد رہے کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا یہ قول مرفوع حدیث کے حکم میں ہے کیونکہ ایسی بات اپنی رائے سے نہیں کہی جا سکتی اور پھر حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں سے کسی نے اس مسئلہ میں ابن عباس رضی اللہ عنہما کی مخالفت بھی نہیں کی۔

——— شیخ ابن باز ———

[1] موطأ إمام مالک' الحج' باب جامع الفديه' حديث: 257' 1/419/ 420

تاخیر کی صورت میں شب بسر کرنا واجب ہے اور ....

 اس شخص کے بارے میں کیا حکم ہے جو عید کے بعد دو دن رہے اور تیسرے دن (تیرھویں) کی رات بھی گزارے تو کیا اس کے لیے ناگزیر حالات میں طلوع فجر یا طلوع آفتاب کے بعد رمی کرنا جائز ہے؟

جواب جو شخص منیٰ ہی میں رہے حتیٰ کہ تیرہویں کی رات آ جائے تو اس کے لیے لازم ہے کہ منیٰ ہی میں رات بسر کرے اور پھر زوال کے بعد رمی کرے' پہلے دو دنوں کی طرح اس کے لیے تیرہویں کے دن بھی زوال سے پہلے رمی جائز نہیں ہے کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے تیرہویں کا دن بھی منیٰ میں بسر فرمایا تھا اور اس دن بھی آپ نے زوال کے بعد ہی رمی کی تھی اور آپ نے فرمایا:

«خُذُوا عَنِّي مَنَاسِكَكُمْ»(صحيح مسلم، الحج، باب استحباب رمي جمرة العقبة ... الخ، ح:١٢٩٧ والسنن الكبرى للبيهقي: ٥/ ١٢٥ واللفظ له)

"مجھ سے مناسک حج سیکھ لو۔"

——— شیخ ابن باز ———

جو شخص بارہویں تاریخ کی رمی ترک کر دے ....

سوال میں اپنی بیوی کے ساتھ دوسری مرتبہ فریضۂ حج ادا کر رہا تھا' میرے بچے ریاض میں تھے۔ دوسرے جمرہ کو رمی کرنے کے بعد ہم مکہ میں آ گئے' حج مکمل کر لیا اور ریاض کے لیے سفر پر روانہ ہو گئے کیونکہ دل میں بچوں کا خیال تھا۔ ہم نے ایک قریبی رشتہ دار کو اپنا وکیل مقرر کر دیا کہ وہ ہماری طرف سے رمی جمرات کر دے تو کیا یہ جائز ہے؟ اس صورت میں ہم پر کیا واجب ہے؟

جواب آپ دونوں میاں بیوی پر یہ لازم ہے کہ اللہ سبحانہ و تعالیٰ کی بارگاہ میں توبہ کرو کیونکہ آپ نے بارہویں دن کی رمی کو ترک کیا جو کہ واجب تھی اور پھر طواف وداع کو بروقت نہیں کیا کیونکہ اس کا وقت اختتام رمی کے بعد ہے۔ آپ دونوں میں سے ہر ایک پر یہ واجب ہے کہ وہ ایسے دو جانور مکہ میں ذبح کرے جن کی قربانی جائز ہو اور انہیں فقرائے حرم میں تقسیم کر دیا جائے۔ ان میں سے ایک ایک جانور بارہویں دن ترک رمی کی وجہ سے ہے اور دوسرا جانور طواف وداع ترک کرنے کی وجہ سے ہے اور طواف وداع بھی واجب ہے لیکن آپ نے اسے قبل از وقت کیا ہے اور بارہویں رات منیٰ میں بسر نہ کرنے کی وجہ سے مقدور بھر صدقہ بھی کریں۔ اللہ تعالیٰ ہمارے اور آپ کے گناہوں کو معاف فرما دے۔

——— شیخ ابن باز ———

گیارہویں دن رمی' وداع اور سفر

 اس شخص کے بارے میں کیا حکم ہے جو گیارہویں دن رمی کر کے طواف وداع کرے اور پھر سفر پر روانہ ہو جائے؟

جواب جو شخص گیارہویں دن رمی کر کے طواف وداع کے بعد سفر کرے تو اس نے دو واجب ترک کئے ایک بارہویں دن کا رمی جمرات اور دوسرا اس دن کی رات کو منیٰ میں بسر کرنا' لہٰذا بہت سے اہل علم کے بقول اس پر دو فدیے واجب ہیں' جنہیں مکہ میں ذبح کر کے وہاں کے فقراء میں تقسیم کر دیا جائے۔

——— شیخ ابن عثیمین ———

بیماری یا بڑھاپے کی وجہ سے ایام تشریق کے آخر..........

سوال جب کوئی حاجی بیماری یا بڑھاپے یا بھیڑ کے خوف کی وجہ سے رمی کو آخری یوم تشریق تک مؤخر کر دے تو کیا وہ ایک ہی موقف میں جمرہ عقبہ اور دیگر جمرات کو رمی کر سکتا ہے یا اس کے لیے یہ ضروری ہے کہ ہر دن کی الگ الگ رمی کرے یعنی پہلے پہلے دن کی رمی کرے' پھر از سرنو دوسرے دن کی رمی کرے پھر اسی طرح از سرنو تیسرے دن کی رمی کرے خواہ اس میں اسے کتنی ہی مشقت کیوں نہ ہو؟

جواب پہلے جمرہ عقبہ کو رمی کرے' پھر گیارہویں دن کے جمرات' پھر بارہویں دن کے جمرات اور پھر تیرہویں دن کے جمرات کو رمی کرے بشرطیکہ اسے جلدی نہ ہو' سنت یہ ہے کہ حتی المقدور ہر دن کی رمی کو بروقت کیا جائے۔

——— فتویٰ کمیٹی ———

شرعی عذر کی وجہ سے وکالت جائز ہے

سوال شدت ازدحام کی وجہ سے میری والدہ اور دونوں بہنوں نے رمی جمرات کے لیے مجھے اپنا وکیل مقرر کر دیا تو کیا یہ صحیح ہے؟ رہنمائی فرمائیں۔ جزاکم اللہ خیر الجزاء

جواب اگر وہ شدت ازدحام یا بیماری یا کسی اور شرعی عذر کی وجہ سے عاجز ہوں تو پھر ان کا رمی کیلئے آپ کو وکیل مقرر کرنا صحیح ہے۔

——— شیخ ابن باز ———

فدیہ

ممنوع فعل کا فدیہ' اس کی اقسام اور تکرار

سوال حج میں فدیہ کیا ہے؟ اسکی اقسام کیا ہیں؟ اور اگر ایک ہی طرح کے ممنوع فعل کا بار بار ارتکاب ہو تو پھر اسکا کیا حکم ہے؟

جواب ممنوعات احرام میں سے کسی ممنوع فعل کے ارتکاب کی وجہ سے فدیہ کی کئی قسمیں ہیں:

(۱) اختیار ہے کہ ایک بکری ذبح کر دے یا چھ مسکینوں کو کھانا کھلا دے یا تین دن کے روزے رکھ لے۔ یہ فدیہ اس صورت میں ہے جب بالوں کو مونڈ دے خواہ تین بال ہوں یا ناخن کاٹ دے یا سلا ہوا کپڑا پہن لے یا خوشبو استعمال کر لے یا سر کو ڈھانپ لے۔

(۲) شکار کی صورت میں اختیار ہے کہ اسی طرح کا کوئی چوپایہ جانور ذبح کرے یا اس کی قیمت کا اندازہ کر کے اس کے بقدر کھانا صدقہ کر دے یا اندازہ کر کے ایک مد کھانے کے عوض ایک دن کا روزہ رکھ لے۔

(۳) تمتع اور قران کے فدیہ کی صورت میں دم لازم ہے' بشرطیکہ اس کے پاس موجود ہو اور اگر موجود نہ ہو تو دس دن کے روزے رکھ لے' تین روزے مکہ مکرمہ میں رکھے اور سات گھر واپس آکر رکھ لے۔

(۴) حج کے واجبات میں سے کسی واجب کو ترک کرنے کی صورت میں دم لازم ہے مثلاً مزدلفہ میں رات بسر کرنا' رمی جمار' بال منڈانا' طواف وداع اور میقات سے احرام باندھنے میں سے اگر کسی واجب کو ترک کر دے تو اس پر لازم ہے کہ ایک جانور ذبح کر کے مساکین حرم میں تقسیم کر دے۔ اگر ایک ہی جنس کے ممنوع کا کئی بار ارتکاب ہو تو اس پر ایک ہی فدیہ لازم ہے مثلاً یہ کہ ہر دن کئی بال منڈا دے یا کئی بار اپنے سر کو ڈھانپ لے لیکن اگر پہلی بار کے فعل کا فدیہ دے اور پھر دوبارہ اس کا ارتکاب کرے تو دوبارہ فدیہ لازم ہو گا۔

——— شیخ ابن جبرین ———

جو شخص حرم کا درخت کاٹ دے

سوال جو شخص حرم کا درخت کاٹ دے' اس پر کیا واجب ہے؟ حرم مکہ کی حدود کیا ہیں؟

جواب جو شخص حرم مکہ کا ایک بڑا درخت کاٹ دے تو اس پر واجب ہے کہ ایک اونٹ ذبح کرے اور جو کوئی چھوٹا درخت کاٹ دے تو اس پر واجب ہے کہ ایک بکری ذبح کرے اور جڑی بوٹی کی صورت میں اس کی قیمت ادا کی جائے۔ ہاں البتہ ان ٹہنیوں کو کاٹنا جائز ہے جو پھیل کر راستے پر آ گئی ہوں اور ان سے گزرنے والوں کو تکلیف ہوتی ہو' اسی طرح آدمی نے خود جو فصل اگائی ہو اسے کاٹنا بھی جائز ہے۔ حرم مکہ کی حدود معروف ہیں۔ ان کے اختتام پر نمایاں علامات لگا دی گئی ہیں جیسا کہ وہ علامت جو مزدلفہ اور عرفہ کے درمیان لگا دی گئی ہے' اسی طرح جدہ کے راستہ میں شمیسی کے قریب یعنی حدیبیہ کے مقام پر بھی علامت لگائی گئی ہے۔

——— شیخ ابن جبرین ———

واجب ترک کرنے والے سے دم ساقط نہیں ہوتا

سوال کیا دم ساقط ہو جاتا ہے' اس جاہل سے جو حکم نہیں جانتا یا اس شخص سے جو بھول کر واجبات حج میں سے کسی واجب مثلاً رات بسر کرنا' رمی کرنا اور بال منڈانا وغیرہ کو ترک کر دے یا ضروری ہے کہ دم دیا جائے؟ نیز کیا ممنوعات احرام میں سے کسی کے ارتکاب کی صورت میں بھی دم ضروری ہے؟

جواب جو شخص جاہل ہو یا بھول کر ممنوعات احرام میں سے کسی ممنوع کا ارتکاب کرے تو اس سے تو دم ساقط ہو جاتا ہے' لیکن جو شخص جہالت یا نسیان کے باعث حج یا عمرہ کے واجبات میں سے کسی واجب کو ترک کر دے تو اس سے دم ساقط نہیں ہوتا کیونکہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ جو شخص حج کے کسی حکم کو ترک کر دے یا بھول جائے تو اسے چاہیئے کہ وہ خون بہائے' نیز اس حدیث سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے جس میں یہ ہے کہ ایک شخص نے عمرہ کی حالت میں خوشبو سے معطر جبہ پہن لیا تھا۔

——— فتویٰ کمیٹی ———

احصار

میقات سے احرام باندھا لیکن ....

سوال اس شخص کے بارے میں کیا حکم ہے جو میقات سے حج یا عمرہ کا احرام باندھے مگر پھر کسی رکاوٹ کی وجہ سے طواف اور سعی نہ کر سکے؟

جواب اگر اس رکاوٹ کے جلد دور ہو جانے کی امید ہو تو بدستور حالت احرام میں رہے' مثلاً رکاوٹ سیلاب کی وجہ سے ہو یا کسی ایسے دشمن کی وجہ سے جس سے سمجھوتہ ہو جانے کی وجہ سے مکہ مکرمہ میں داخلہ ممکن ہو تو اس صورت میں احرام کھولنے میں جلدی نہ کرے جیسا کہ نبی ﷺ اور حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے اس وقت احرام کھولنے میں جلدی نہیں کی تھی جب انہیں حدیبیہ کے مقام پر روک دیا گیا تھا اور انہوں نے اہل مکہ کے ساتھ مذاکرات شروع کر دیئے تھے کہ شاید وہ کسی لڑائی جھگڑا کے بغیر مکہ میں جاکر عمرہ ادا کرنے کی اجازت دے دیں' لیکن جب ایسا ممکن نہ ہوا اور اہل مکہ نے یہ مصمم ارادہ کر لیا کہ وہ کسی قیمت پر بھی مکہ میں داخل ہونے کی اجازت نہیں دیں گے خواہ اس کے لیے انہیں جنگ ہی کیوں نہ کرنا پڑے تو اس صورتحال کو دیکھ کر نبی ﷺ اور حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے اپنے ہدی کے جانور ذبح کر کے بال منڈوا دیئے اور احرام کھول دیئے تھے۔

مُحْصَر کے لیے یہی حکم شریعت ہے کہ وہ انتظار کرے۔ اگر رکاوٹ کا خاتمہ ممکن ہو تو اپنے احرام کو باقی رکھے اور مناسک ادا کرے اور اگر یہ ممکن نہ ہو اور اس جگہ جہاں اسے روک دیا گیا ہو' قیام میں دشواری ہو تو اس عمرہ یا حج کے احرام کو کھول دے اور اس پر سوائے اس کے اور کچھ واجب نہیں کہ جانور ذبح کر کے اور بال منڈوایا کٹوا کر حلال ہو جائے جیسا کہ نبی ﷺ اور حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے حدیبیہ کے مقام پر کیا تھا اور جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ بھی ہے:

﴿ فَإِنْ أُحْصِرْتُمْ فَمَا اسْتَيْسَرَ مِنَ الْهَدْيِ وَلَا تَحْلِقُوا رُءُوسَكُمْ حَتَّىٰ يَبْلُغَ الْهَدْيُ مَحِلَّهُ ﴾ (البقرۃ۲/ ۱۹۶)

''اور اگر تم (راستے میں) روک لیے جاؤ تو جیسی قربانی میسر ہو (کر دو) اور جب تک قربانی اپنے مقام پر پہنچ نہ جائے سر نہ منڈاؤ۔''

یاد رہے حلق' ذبح کے بعد ہو گا' یعنی پہلے قربانی کا جانور ذبح کرے اور پھر اس کے بعد بال منڈوائے یا کٹوائے پھر احرام کھول دے اور اپنے وطن واپس لوٹ جائے۔

—————— شیخ ابن باز ——————

حج کی راہ میں کسی رکاوٹ کا پیش آ جانا

سوال جب کوئی حج یا عمرہ کیلئے لبیک کہتا ہوا میقات سے گزر جائے اور اس نے نیت کرتے ہوئے کسی شرط کو بھی عائد نہ کیا ہو اور اسے بیماری وغیرہ کی وجہ سے رکاوٹ پیش آ جائے جس کی وجہ سے وہ حج یا عمرہ کو مکمل نہ کر سکتا ہو تو اسے کیا کرنا چاہیئے؟

جواب اس طرح کے شخص کو "مُحْصَر" کہتے ہیں۔ اگر اس نے کوئی شرط نہ بھی ذکر کی ہو اور اسے کوئی ایسی رکاوٹ پیش آجائے جس کی وجہ سے وہ (حج یا عمرہ) مکمل نہ کرسکتا ہو تو اس صورت میں اگر اس کے لیے صبر کرنا ممکن ہو کہ شاید یہ رکاوٹ دور ہو جائے اور اس کے لیے حج یا عمرہ کو مکمل کرنا ممکن ہو جائے تو اسے صبر کرنا چاہیئے اور اگر ایسا ممکن نہ ہو تو صحیح بات یہ ہے کہ وہ محصر ہے اور محصر کے بارے میں ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ فَإِنْ أُحْصِرْتُمْ فَمَا اسْتَيْسَرَ مِنَ الْهَدْيِ ﴾ (البقرة ٢/ ١٩٦)

"اور اگر تم (راستے میں) روک لیے جاؤ تو جیسی قربانی میسر ہو (کردو۔)"

صحیح بات یہ ہے کہ یہ رکاوٹ دشمن کی وجہ سے بھی ہو سکتی ہے اور دشمن کے علاوہ کسی اور وجہ سے بھی' تو اس صورت میں قربانی کر دی جائے' بال منڈوا یا کٹوا دیئے جائیں اور احرام کھول دیا جائے۔ محصر کے لیے یہی حکم ہے کہ اسے جہاں روک دیا جائے' وہ وہاں جانور ذبح کر دے خواہ وہ جگہ حدود حرم کے اندر ہو یا اس سے باہر' اور قربانی کے گوشت کو اسی جگہ کے فقراء میں تقسیم کر دے خواہ وہ جگہ حرم سے باہر ہو اور اگر وہاں گوشت لینے والے لوگ موجود نہ ہوں تو اسے فقرائے حرم کے پاس یا اس جگہ کے گردوپیش یا بعض بستیوں وغیرہ کے فقراء کے پاس پہنچا دیا جائے۔ قربانی کے بعد بال منڈوائے یا کٹوائے اور احرام کھول دے۔ اور اگر قربانی کی طاقت نہ ہو تو دس روزے رکھ لے اور پھر بال منڈوا یا کٹوا دے اور احرام کھول دے۔

——— شیخ ابن باز ———

جب حاجی احرام کے بعد محصر ہو جائے

سوال جب کوئی مسلمان حج کا عزم کر لے لیکن احرام باندھنے کے بعد اس کیلئے حج کرنا مشکل ہو جائے تو وہ کیا کرے؟

جواب جب کوئی انسان احرام باندھنے کے بعد بیماری وغیرہ کی وجہ سے محصر ہو جائے تو اس کے لیے یہ جائز ہے کہ قربانی کر دے اور پھر سر کے بال منڈوا یا کٹوا کر حلال ہو جائے' ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ وَأَتِمُّوا الْحَجَّ وَالْعُمْرَةَ لِلَّهِ فَإِنْ أُحْصِرْتُمْ فَمَا اسْتَيْسَرَ مِنَ الْهَدْيِ وَلَا تَحْلِقُوا رُءُوسَكُمْ حَتَّى يَبْلُغَ الْهَدْيُ مَحِلَّهُ ﴾ (البقرة ٢/ ١٩٦)

"اور اللہ (کی خوشنودی) کے لیے حج اور عمرے کو پورا کرو اور اگر تم (راستے میں) روک لیے جاؤ تو جیسی قربانی میسر ہو (کردو) اور جب تک قربانی اپنے مقام پر پہنچ نہ جائے سر نہ منڈاؤ۔"

نبی ﷺ کو جب مکہ مکرمہ میں داخل ہونے سے حدیبیہ کے مقام پر روک دیا گیا تو آپ نے قربانی کر دی' اپنے سر کو منڈوا دیا اور پھر حلال ہو گئے اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو بھی حکم دیا کہ وہ بھی اسی طرح کریں۔[1] اگر محصر احرام کے وقت یہ کہے کہ اگر کسی رکاوٹ نے مجھے روک دیا تو میں وہاں حلال ہو جاؤں گا جہاں رکاوٹ پیش آئے گی تو وہ حلال ہو جائے' اس پر کچھ بھی لازم نہیں ہو گا' نہ قربانی اور نہ کچھ اور کیونکہ "صحیحین" میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ ضباعہ بنت زبیر بن عبدالمطلب رضی اللہ عنہا نے کہا یا رسول اللہ! میرا حج کا ارادہ ہے اور میں بیمار ہوں۔" تو نبی ﷺ نے ان سے فرمایا:

---

[1] صحیح بخاری' المحصر' باب اذا احصر المعتمر' حدیث: 1807 و صحیح مسلم' الحج' حدیث: 1230۔

«حُجِّي وَاشْتَرِطِي، أَنَّ مَحِلِّي حَيْثُ حَبَسْتَنِي»(صحيح البخاري، النكاح، باب الأكفاء في الدين، ح:٥٠٨٩ وصحيح مسلم، الحج، باب جواز اشتراط المحرم ... الخ، ح:١٢٠٧ واللفظ له)

"حج کرو اور یہ شرط عائد کر لو کہ میں وہاں حلال ہو جاؤں گی' جہاں روک دی جاؤں گی۔"

——— شیخ ابن باز ———

جسے احرام سے قبل ہی حج سے روک دیا جائے

سوال جب کوئی انسان حج یا عمرہ کے لیے نکلے اور اسے راستے میں کوئی جماعت یا قانون کو اپنے ہاتھ میں لینے والے روک دیں تو اس کے لیے کیا حکم ہے؟

جواب جس شخص کو کوئی دشمن یا رہزن حج سے روک دے تو یہ رکاوٹ احرام سے پہلے ہو گی یا بعد میں' لہٰذا اگر کوئی مسلم حج یا عمرہ ادا کرنے کے لیے نکلے اور احرام باندھنے سے پہلے ہی کوئی دشمن اسے مکہ جانے سے روک دے تو وہ اپنے گھر واپس آ جائے' اس پر کوئی فدیہ بھی لازم نہ ہو گا اور نیت کے مطابق اسے ثواب ملے گا اور جب راستے پر امن ہو جائیں تو پھر اسے فریضۂ حج جلد ادا کرنا چاہیے اور اگر حج یا عمرہ ادا کرنے کے لیے نکلے' میقات تک پہنچ جائے' احرام باندھ لے اور پھر دشمن اسے آگے نہ جانے دیں اور راستے میں رکاوٹ بن جائیں تو اسے چاہیے کہ ایک بکری ذبح کر دے اور محصر کی طرح حلال ہو جائے جس کا ذکر اللہ تعالیٰ نے اس آیت کریمہ میں کیا ہے:

﴿فَإِنْ أُحْصِرْتُمْ فَمَا ٱسْتَيْسَرَ مِنَ ٱلْهَدْيِ﴾ (البقرة٢/ ١٩٦)

"اور اگر تم (راستے میں) روک دیئے جاؤ تو جیسی قربانی میسر ہو (کر دو)"

اور اگر بکری نہ ملے تو احرام نہ کھولے اور دس روزے رکھے اور پھر احرام کھول کر حلال ہو جائے' اور اگر اس نے احرام کے وقت یہ شرط عائد کی ہو کہ اگر مجھے کسی روکنے والے نے روک دیا تو میں وہاں حلال ہو جاؤں گا جہاں کوئی مجھے روک دے گا تو پھر اس پر کوئی چیز لازم نہیں۔ اس صورت میں اس کیلئے یہ جائز ہے کہ قربانی کے بغیر ہی احرام کھول کر حلال ہو جائے۔

——— شیخ ابن جبرین ———

احرام حج کے بعد مکہ میں داخلہ سے روک دیا گیا

سوال جس شخص نے میقات سے احرام باندھا اور پھر وہ مکہ کے قریب پہنچ گیا مگر چیک پوسٹ والوں نے اسے مکہ میں داخل ہونے سے روک دیا کیونکہ اس کے پاس حج پاسپورٹ نہ تھا تو اس کے لیے کیا حکم ہے؟

جواب اس صورت میں جب اس کیلئے مکہ میں داخل ہونا مشکل ہو تو وہ محصر کے حکم میں ہے۔ اسے چاہیے کہ جہاں اسے روک دیا گیا ہو وہاں قربانی کا جانور ذبح کر دے اور احرام کھول کر حلال ہو جائے۔ اگر وہ یہ فرض حج ادا کرنے آ رہا تھا تو اسے بعد میں ادا کر لے اور یہ بعد میں ادا کرنا ادا ہی ہو گا قضا نہیں۔ اور اگر یہ حج فرض نہیں تھا تو پھر اس کیلئے کچھ بھی لازم نہیں' راجح قول یہی ہے کیونکہ نبی کریم ﷺ نے ان صحابہ کرام کو عمرہ کی قضا کا حکم نہیں دیا تھا جنہیں عمرہ کرنے سے غزوۂ حدیبیہ میں روک دیا گیا تھا۔ محصر کیلئے وجوب قضاء کا حکم کتاب اللہ میں ہے اور نہ سنت رسول میں' بلکہ فرمان باری تعالیٰ یہ ہے:

﴿فَإِنْ أُحْصِرْتُمْ فَمَا ٱسْتَيْسَرَ مِنَ ٱلْهَدْيِ﴾ (البقرة۲/ ۱۹۶)

"اور اگر تم (راستے میں) روک دیئے جاؤ تو جیسی قربانی میسر ہو (کر دو۔)"

اس کے علاوہ اللہ تعالیٰ نے کچھ ذکر نہیں فرمایا' لیکن یاد رہے کہ اس عمرہ کو عمرۃ القضاء اس لیے کہا جاتا ہے کہ یہ قضاء معاہدہ کے معنی میں ہے کیونکہ نبی ﷺ نے اس موقع پر قریش سے معاہدہ فرمایا تھا یہ قضاء استدراک مافات کے معنی میں نہیں ہے۔ واللہ اعلم

—— شیخ ابن عثیمین ——

جسے عرفات کے راستے میں کوئی حادثہ پیش آجائے ....

سوال میں سات تاریخ کو بیت اللہ شریف میں آیا' عمرہ ادا کیا اور پھر منیٰ روانہ ہو گیا' منیٰ میں پانچ فرض نمازیں ادا کیں اور پھر عرفات روانہ ہو گیا لیکن عرفات کے راستہ میں گاڑی الٹ گئی' ہم زخمی ہو گئے اور ساتھیوں میں سے ایک جو میری والدہ کی طرف سے حج ادا کر رہا تھا' اس حادثہ میں فوت ہو گیا جس کی وجہ سے میں نو ذوالحجہ کی رات حادثہ کی جگہ سے واپس آگیا تو اس صورت میں کیا حکم ہے؟

جواب جب آپ نے حج کا احرام باندھا تو واجب یہ تھا کہ آپ اس احرام کو بدستور باقی رکھتے حتیٰ کے سارے مناسک حج ادا کر لیتے۔ اس حادثہ کی وجہ سے آپ کو احرام ترک نہیں کرنا چاہیئے تھا۔ جب اللہ تعالیٰ نے آپ کو اس حادثہ میں محفوظ رکھا تو یہ حادثہ ترک حج کے لیے عذر نہیں تھا۔ آپ چونکہ وقوف عرفہ' طواف و داع اور دیگر مناسک کی تکمیل سے قبل واپس چلے گئے لہٰذا آپ کو اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں توبہ و استغفار کرنا چاہیئے' نیز ایک ایسا جانور جس کی قربانی ہو سکتی ہو' ذبح کر کے فقرائے حرم میں تقسیم کر دینا چاہیئے جس میں سے نہ آپ خود کچھ کھائیں اور نہ کسی غنی رشتہ دار کو ہدیہ دیں اور آئندہ سال ان شاء اللہ حج کریں۔ وباللہ التوفیق' وصلی اللہ علی محمد و آلہ وصحبہ وسلم۔

—— فتویٰ کمیٹی ——

احکام ہدی

اہل مکہ کے لیے ہدی نہیں ہے

سوال اہل مکہ میں سے جو شخص صرف حج کا احرام باندھے کیا اس پر ہدی واجب ہے؟ کیا ان کے لیے حج تمتع صحیح ہے یا قران؟ امید ہے دلیل کے ساتھ وضاحت فرمائیں گے۔

جواب اہل مکہ اور دیگر سب لوگوں کے لیے بھی حج تمتع اور قران صحیح ہے لیکن اہل مکہ پر ہدی واجب نہیں ہے بلکہ ہدی تو ان لوگوں پر واجب ہے جو دوسرے علاقوں سے تمتع یا قران کا احرام باندھ کر مکہ مکرمہ میں آئیں کیونکہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿فَمَن تَمَتَّعَ بِٱلْعُمْرَةِ إِلَى ٱلْحَجِّ فَمَا ٱسْتَيْسَرَ مِنَ ٱلْهَدْيِ ۚ فَمَن لَّمْ يَجِدْ فَصِيَامُ ثَلَٰثَةِ أَيَّامٍ فِي ٱلْحَجِّ وَسَبْعَةٍ إِذَا رَجَعْتُمْ ۗ تِلْكَ

عَشَرَةٌ كَامِلَةٌ ذَٰلِكَ لِمَن لَّمْ يَكُنْ أَهْلُهُ حَاضِرِي الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ وَاتَّقُوا اللَّهَ وَاعْلَمُوا أَنَّ اللَّهَ شَدِيدُ الْعِقَابِ ﴿١٩٦﴾ (البقرۃ۲/ ۱۹۶)

"(جو تم میں سے) حج کے وقت تک عمرے سے فائدہ اٹھانا چاہے وہ جیسی قربانی میسر ہو کرے اور جس کو (قربانی) نہ ملے وہ تین روزے ایام حج میں رکھے اور سات جب واپس ہو۔ یہ پورے دس ہوئے۔ یہ حکم اس شخص کے لیے ہے جس کے اہل و عیال مکے میں نہ رہتے ہوں اور اللہ سے ڈرتے رہو اور جان رکھو کہ اللہ سخت عذاب دینے والا ہے۔"

—— شیخ ابن باز ——

کیا ہدی کی طاقت رکھنے والے کے لیے یہ ....

سوال ہدی سے بہت کم استفادہ کیا جاتا ہے' تو کیا یہ افضل نہیں ہے کہ جسے ہدی کی طاقت ہو وہ روزے رکھ لے اور واپس آکر اپنے وطن کے مسکینوں میں ہدی کی قیمت تقسیم کر دے؟ اس مسئلہ میں آپ کی کیا رائے ہے؟ اللہ تعالیٰ آپ کو جزائے خیر سے نوازے۔

جواب یاد رہے کہ احکام شریعت اللہ اور اس کے رسول ﷺ سے لیے جاتے ہیں۔ یہ لوگوں کی آراء پر مبنی نہیں ہوتے اور اللہ سبحانہ و تعالیٰ نے ہمیں حکم یہ دیا ہے کہ حاجی اگر متمتع یا قارن ہو تو وہ قربانی کرے' اور اگر اسے قربانی کرنے کی استطاعت نہ ہو تو پھر وہ دس روزے رکھے تین ایام حج میں اور سات اپنے گھر واپس آکر۔ ہمیں اس بات کا حق نہیں ہے کہ ہم از خود احکام شریعت وضع کر لیں' لہٰذا واجب یہ ہے کہ قربانی میں جو خرابی کی صورت پیدا ہو گئی ہے' اس کی اصلاح کی جائے اور وہ یہ کہ حکمرانوں کو توجہ دلائی جائے کہ قربانی کے جانوروں کے گوشت کی فقراء و مساکین میں تقسیم کا صحیح انتظام کیا جائے' جانوروں کے ذبح کرنے کی جگہوں کا خصوصی اہتمام کیا جائے' ان کو کشادہ بھی کیا جائے اور ان کی تعداد میں بھی اضافہ کیا جائے تاکہ حجاج کرام بروقت سہولت کے ساتھ اپنی قربانی کے جانوروں کو ذبح کر سکیں۔ حکمرانوں پر فرض ہے کہ وہ قربانی کے گوشت کی مستحقین میں تقسیم کا مناسب انتظام کریں۔ فوری طور پر تقسیم ممکن نہ ہو تو ان کے لیے کولڈ سٹوریج کا اہتمام کریں تاکہ اسے ضائع ہونے سے بچایا جا سکے اور بعد میں مکہ اور دیگر ممالک کے فقراء میں تقسیم کیا جا سکے۔

جہاں تک قربانی کے نظام میں تبدیلی کا تعلق ہے کہ اس کی استطاعت رکھنے والا بھی قربانی کرنے کے بجائے روزے رکھ لے یا اپنے ملک کے فقراء کے لیے قربانی کے جانور خرید لے یا اس کی قیمت ہی ان میں تقسیم کر دے تو یہ ایک نئی شریعت ہے۔ مسلمان کو زیب نہیں دیتا کہ وہ اسے اختیار کرے کیونکہ شارع اللہ سبحانہ و تعالیٰ کی ذات گرامی ہے' اس کے علاوہ کسی اور کو شریعت سازی کا حق حاصل نہیں ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ أَمْ لَهُمْ شُرَكَاءُ شَرَعُوا لَهُم مِّنَ الدِّينِ مَا لَمْ يَأْذَن بِهِ اللَّهُ ﴾ (الشوری۴۲/ ۲۱)

"کیا ان کے وہ شریک ہیں جنہوں نے ان کے لیے ایسا دین مقرر کیا ہے جس کا اللہ نے حکم نہیں دیا۔"

مسلمانوں پر یہ واجب ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی نازل کردہ شریعت کے سامنے سر اطاعت خم کر دیں' اسے نافذ کریں اور اگر

لوگوں کی طرف سے اس کی تنفیذ میں کوئی خلل واقع ہو تو اسکی اصلاح واجب ہے جیسا کہ حج کے موقع پر قربانیاں تو کی جاتی ہیں مگر ایسا کوئی معقول انتظام نہیں کہ انہیں مستحقین تک پہنچایا جا سکے' لہٰذا حکمرانوں پر واجب ہے کہ وہ اس کی طرف خصوصی توجہ مبذول کریں اور قربانی کے گوشت کو ضائع ہونے سے بچائیں۔ اسی طرح ہر مسلمان پر بھی یہ فرض ہے کہ وہ اپنی قربانی کی حفاظت کرے' اسے خود مسکینوں میں تقسیم کرے یا خود کھائے یا بعض دوستوں اور بھائیوں کو ہدیہ دے یہ جائز نہیں کہ قربانی کر کے کسی ایسی جگہ رکھ دی جائے' جہاں اس سے استفادہ نہ کیا جا سکتا ہو۔

حکمرانوں پر یہ فرض عائد ہوتا ہے کہ وہ ایسا انتظام کریں کہ گوشت کو بروقت فقراء و مساکین میں تقسیم کیا جا سکے یا پھر اسے فورا کولڈ سٹوریج میں منتقل کر دیں تاکہ اسے بعد میں تقسیم کیا جا سکے اور اسے ضائع ہونے سے بچایا جا سکے۔ حکمرانوں کا یہ فرض ہے اور وہ اس فرض سے عہدہ برآ ہونے کے لیے سرگرم عمل بھی ہیں۔ اہل علم بھی انہیں ہمیشہ اس سلسلہ میں توجہ دلاتے رہتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ ہم سب کی مدد فرمائے کہ ہم اس باب (معاملے) میں بھی اور دیگر ابواب (معاملات) میں بھی وہ کام کریں جن میں مسلمانوں کی مصلحت اور خیر خواہی ہو۔

——— شیخ ابن باز ———

جو قربانی کر کے اسی جگہ چھوڑ جائے

سوال اس شخص کے بارے میں کیا حکم ہے جو قربانی کے جانور کو ذبح کر کے اسی جگہ چھوڑ جائے؟ کیا ایسا کرنا جائز ہے؟

جواب جو شخص قربانی کا جانور ذبح کرے' اس کے لیے یہ واجب ہے کہ اسے مستحق لوگوں تک پہنچائے۔ یہ جائز نہیں کہ قربانی کے جانور کو ذبح کر کے اسی جگہ چھوڑ دے' ہاں البتہ اگر قربانی کے جانور کے گوشت سے تھوڑا سا خود کھا کر باقی صدقہ کر دے تو یہ جائز ہے۔

——— شیخ ابن عثیمین ———

حرم سے باہر قربانی کے جانور کو ذبح کرنا

سوال ایک حاجی نے ایام تشریق میں اپنی قربانی عرفات میں ذبح کر کے وہاں موجود لوگوں میں تقسیم کر دی تو کیا یہ جائز ہے؟ اگر کوئی ناواقفیت کی وجہ سے یا جان بوجھ کر ایسا کرے تو اس کے لیے کیا واجب ہے؟ اگر کوئی شخص عرفات میں قربانی ذبح کر کے اس کا گوشت حرم کے اندر تقسیم کر دے تو کیا یہ جائز ہے؟ وہ کون سی جگہ ہے جہاں قربانی کے جانور کو ذبح کرنا ضروری ہے؟ شکریہ!

جواب حج تمتع اور قران کی قربانی کے جانور کو حرم ہی میں ذبح کرنا چاہیئے۔ اگر کوئی غیر حرم مثلاً عرفات اور جدہ وغیرہ میں ذبح کر دے تو یہ جائز نہیں خواہ وہ اس کے گوشت کو حرم ہی میں کیوں نہ تقسیم کرے .... حرم سے باہر ذبح کرنے کی صورت میں اس کے علاوہ قربانی کا ایک دوسرا جانور حرم میں ذبح کرنا پڑے گا خواہ کوئی ناواقفیت کی صورت میں ایسا کرے یا جان بوجھ کر کیونکہ نبی کریم ﷺ نے اپنے قربانی کے جانوروں کو حرم میں ذبح کیا تھا اور آپ نے فرمایا تھا:

«خُذُوا عَنِّي مَنَاسِكَكُمْ»(صحيح مسلم، الحج، باب استحباب رمي جمرة العقبة ... الخ، ح:١٢٩٧

والسنن الكبرى للبيهقي: ٥/ ١٢٥ واللفظ له)

"مجھ سے حج کے احکام و مناسک کو سیکھو۔"

اسی طرح آپ کے اسوۂ حسنہ پر عمل کرتے ہوئے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے بھی اپنی قربانیوں کو حرم ہی میں ذبح کیا تھا۔

——— شیخ ابن باز ———

ناواقفیت کی وجہ سے عید کے دن سے پہلے قربانی کرنا

سوال ہم نے ایک گروپ کی صورت میں حج تمتع کے لیے احرام باندھا' عمرہ ادا کیا اور حلال ہو گئے۔ اسی اثناء میں بعض نے کہا کہ قربانی کر کے اسے مکہ میں تقسیم کر دیا جائے' چنانچہ ایسا ہی کیا گیا' لیکن پھر ہمیں معلوم ہوا کہ قربانی تو جمرہ عقبہ کی رمی کے بعد ہی ہونی چاہیئے اور مجھے اس بات کا علم بھی تھا اور میں نے یہ کہا بھی کہ قربانی کو عید کے دن یا اس کے بعد کریں لیکن گروپ کے ساتھیوں نے اسی بات پر اصرار کیا کہ عمرہ ادا کرنے کے بعد اسی دن قربانی کر دی جائے۔ اس مسئلہ میں ہمارے لیے کیا حکم ہے؟

جواب جو شخص عمرہ یا تمتع کے دم کو عید کے دن سے پہلے ذبح کر دے تو یہ جائز نہیں کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے قربانی کے جانوروں کو ایام نحر ہی میں ذبح کیا تھا اور وہ چار ذوالحج کو مکہ مکرمہ میں حج تمتع کے لیے تشریف لائے تھے۔ قربانی کے دن تک بکریاں اور اونٹ ان کے پاس رہے۔ اگر اس دن سے پہلے انہیں ذبح کرنا جائز ہوتا تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم ان چار دنوں میں انہیں ذبح کر دیتے جن میں وہ منیٰ کی طرف تشریف لے جانے سے پہلے مکہ مکرمہ میں مقیم رہے اور پھر اس وقت لوگوں کو گوشت کی ضرورت بھی تو تھی لیکن جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے قربانی کے دن سے پہلے جانوروں کو ذبح نہیں کیا تو یہ اس بات کی دلیل ہے کہ قربانی کے دن سے پہلے قربانی کے جانوروں کو ذبح کرنا جائز نہیں ہے' لہٰذا جو شخص قربانی کے دن سے پہلے ذبح کرتا ہے' وہ سنت کی خلاف ورزی کرتا اور نئی شریعت ایجاد کرتا ہے۔ جس طرح قبل از وقت فرض نماز اور روزہ جائز نہیں اسی طرح وقت سے پہلے قربانی بھی جائز نہیں۔

خلاصہ یہ کہ یہ عبادت چونکہ وقت سے پہلے ادا کی گئی ہے لہٰذا یہ صحیح نہ ہوئی۔ اگر استطاعت ہو تو قربانی دوبارہ کرنی ہو گی اور عدم استطاعت کی صورت میں تین روزے ایام حج میں اور سات گھر واپس آکر رکھنے ہوں گے یعنی عدم استطاعت کی صورت میں قربانی کے بجائے دس دن کے روزے رکھنے ہوں گے۔

——— شیخ ابن باز ———

تمتع اور قران کی ہدی عید سے پہلے

سوال ان لوگوں کے بارے میں کیا رائے ہے جو تمتع یا قران کی ہدی یوم عید سے پہلے ذبح کر دیں اور ان اصحاب مذاہب کے قول پر عمل کریں جو اسے جائز قرار دیتے ہیں؟

جواب اس کے جواز کے قائل اصحاب مذاہب کی تقلید کی وجہ سے جو لوگ تمتع یا قران کی ہدی کو عید سے پہلے ذبح کر دیں ان پر کفارہ وغیرہ نہیں ہے لیکن انہیں تنبیہ کی جائے کہ آئندہ ایسا نہ کریں۔

—— شیخ ابن عثیمین ——

جو شخص ناواقفیت کی وجہ سے ہدی ترک کر دے

سوال ایک شخص نے حج قران کیا' تمام مناسک حج کو ادا کیا اور ایام منیٰ میں قربانی کو بھی ذبح کر دیا لیکن ناواقفیت کی وجہ سے ہدی کو ذبح نہیں کیا حتیٰ کہ ایام منیٰ ختم ہو گئے تو کیا اس پر ہدی لازم ہے؟

جواب اگر امر واقع اسی طرح ہے جیسے آپ نے ذکر کیا ہے تو اس پر واجب ہے کہ مکہ مکرمہ میں قران کی ہدی کو ذبح کرے اور اس کے گوشت کو وہ خود بھی کھا سکتا ہے۔ یہ بھی جائز ہے کہ مکہ مکرمہ میں کسی امین شخص کو اپنا وکیل مقرر کر دے جو اس کی طرف سے ذبح کرے' اس نے قربانی کی نیت سے جو جانور ذبح کیا ہے' وہ ہدی سے کفایت نہیں کرے گا۔

—— فتویٰ کمیٹی ——

حج تمتع میں تمام نقدی گم ہو گئی اور ----

سوال میں نے ایسا احرام باندھا تھا جس میں ہدی لازم ہے لیکن میرے پاس جس قدر بھی رقم تھی وہ سب کی سب گم ہو گئی تو اس حالت میں میرے لیے کیا حکم ہے؟ یاد رہے کہ اس موقع پر میری بیوی بھی میرے ساتھ تھی۔

جواب جب کوئی انسان ایام حج میں عمرہ کا احرام باندھے اور پھر حج تک فائدہ اٹھائے یا حج اور عمرہ دونوں کا احرام باندھے تو اس صورت میں دم لازم ہے اور وہ یہ کہ دو دانت والی بکری' یا بھیڑ کا بچہ یا اونٹ اور گائے کا ساتواں حصہ ایام نحر میں ذبح کر کے فقراء و مساکین میں تقسیم کر دے۔ اس سے خود بھی کھا سکتا ہے اور اس سے صدقہ بھی کرے' یہ دم واجب ہے۔ اگر کوئی شخص رقم گم ہو جانے یا فقرو تنگ دستی یا خرچ کی کمی کی وجہ سے دم کی طاقت نہ رکھتا ہو تو وہ تین روزے ایام حج میں رکھ لے اور سات اپنے گھر واپس جا کر جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے اس کا حکم دیا ہے۔ یہ شخص گیارہ' بارہ اور تیرہ تاریخ کے بھی روزے رکھ سکتا ہے اور یہ ان دنوں میں روزہ رکھنے کی ممانعت سے مستثنیٰ ہے اور اگر یہ عرفہ کے دن سے پہلے روزے رکھ لے تو یہ افضل ہے جبکہ رقم پہلے گم ہو گئی ہو بہرحال تین روزے ایام حج میں اور سات اپنے گھر واپس آ کر رکھ لے۔ واللہ اعلم۔

—— شیخ ابن باز ——

رقم بھی گم ہو گئی اور روزے کی بھی طاقت نہیں

سوال میں اس سال فریضہ حج ادا کرنے کے لیے گیا' حج قران کی نیت تھی۔ میں نے جب حج و عمرہ کے تمام مناسک ادا کر لیے اور ہدی کا دن آیا تو میں نے دیکھا کہ میری تمام رقم گم ہو گئی ہے۔ یہ معلوم نہ ہو سکا کہ کہیں گر گئی ہے یا کسی نے چرا لی ہے' گم ہونے والی یہ رقم چار سو پچاس سعودی ریال تھی۔ رقم گم ہونے کی وجہ سے میں قربانی نہیں کر سکتا تھا' لہٰذا میں نے روزے رکھنے کی نیت کر لی لیکن میں بیمار ہو کر انفلوئنزا میں مبتلا ہو گیا اور علاج کے لیے مجھے مکہ مکرمہ میں ہسپتال جانا پڑا جہاں میرا ضروری علاج کیا گیا اور اس بیماری کی وجہ سے میں روزے بھی نہ رکھ سکا اور ٹیکسی کے ذریعہ ریاض واپس

آ گیا' یہاں واپسی کے بعد بیماری اور کمزوری میں مزید اضافہ ہو گیا جس کی وجہ سے مجھے سینی ٹوریم جانا پڑا جہاں میرا مکمل معائنہ اور علاج ہوا بہر حال اس بیماری کی وجہ سے میں روزے نہ رکھ سکا۔ اب سوال یہ ہے کہ مکمل طور پر صحت یاب ہونے کے بعد کیا روزے رکھنا میرے لیے مفید ہو سکتا ہے یا اب مجھے کیا کرنا چاہیئے کہ یاد رہے میری نیت ہدی کی تھی لیکن اللہ کی قضا و قدر سے مذکورہ حالات پیدا ہو گئے کہ میں ہدی نہ کر سکا' لہٰذا فتویٰ عطا فرمایئے کہ مجھے کیا کرنا چاہیئے اللہ تعالیٰ آپ کو دین اسلام کی نصرت و اعانت کی مزید توفیق عطا فرمائے؟

جواب جب امرواقع اسی طرح ہے جیسے آپ نے ذکر کیا کہ آپ نے حج اور عمرہ کے قران کا احرام باندھا تھا' جنہیں آپ نے ادا بھی کیا لیکن آپ کی رقم گم ہو گئی جس کی وجہ سے آپ ہدی کا جانور نہ خرید سکے لہٰذا آپ کو ایام حج میں تین اور اپنے گھر واپس آکر سات روزے رکھنے تھے لیکن ریاض واپسی تک بیماری کی وجہ سے آپ روزے بھی نہ رکھ سکے لہٰذا آپ جب صحت یاب ہوں تو ریاض میں یا جہاں بھی آپ مقیم ہوں دس روزے رکھ لیں' اس کے علاوہ آپ پر اور کچھ لازم نہیں ہے۔ وصلی اللّٰہ علی نبینا محمد و آله وصحبه وسلم۔

——— فتویٰ کمیٹی ———

تمتع کی ہدی کا وقت کب ختم ہوتا ہے؟

سوال حج تمتع کی ہدی ذبح کرنے کا وقت کب ختم ہوتا ہے؟ کیا اس وقت کی تحدید میں آراء مختلف ہیں؟

جواب ہدی ذبح کرنے کا وقت تیرہ ذوالحج کے غروب آفتاب کے ساتھ ختم ہو جاتا ہے اور یہ وقت شروع تب ہوتا ہے جب عید کے دن ایک نیزہ کے بقدر سورج بلند ہونے کے بعد نماز عید کی ادائیگی کے برابر گزر جائے۔ اس وقت کی ابتداء اور انتہاء کے بارے میں اختلاف بھی ہے لیکن راجح یہی بات ہے جو ہم نے ذکر کی ہے۔ واللہ اعلم۔

——— شیخ ابن عثیمین ———

حج تمتع اور قران کی ہدی

ذبح کرنے کا وقت اور جگہ' اسکی قیمت صدقہ کرنے کا حکم گوشت کے سلسلہ میں مشکلات کا حل

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ وَحْدَهُ وَالصَّلٰوةُ وَالسَّلَامُ عَلٰى مَنْ لاَ نَبِيَّ بَعْدَهُ، وَبَعْدُ

جیسا کہ مجلس کبار علماء کے ساتویں اجلاس میں یہ طے ہوا جو کہ شعبان ۱۳۹۵ھ کے نصف اول میں طائف میں منعقد ہوا تھا کہ آٹھویں اجلاس کے ایجنڈا میں حج تمتع اور قران کی ہدی کے مسئلہ کو بھی شامل کر لیا جائے' چنانچہ آٹھویں اجلاس میں جو کہ ربیع الثانی ۱۳۹۶ھ میں ریاض میں منعقد ہوا' اس تحقیقی بحث کا جائزہ لیا گیا جسے بحوث علمیہ وافتاء کی مستقل کمیٹی نے تیار کیا اور اس میں درج ذیل مسائل پر روشنی ڈالی گئی کہ ہدی کے ذبح کرنے کا وقت اور جگہ کون سی ہے؟ کیا جانور ذبح کرنے کے بجائے

اس کی قیمت کو بھی صدقہ کیا جا سکتا ہے؟ ہدی کے جانوروں کے گوشت کے سلسلہ میں مشکلات کا کیا حل ہے؟

اس بحث کے جائزہ اور افکار و آراء کے تبادلہ کے بعد درج ذیل مسائل بالاتفاق طے پائے۔

۱۔ یہ جائز نہیں کہ تمتع اور قران کی ہدی کا جانور ذبح کرنے کے بجائے اس کی قیمت صدقہ کر دی جائے' کیونکہ کتاب و سنت اور اجماع امت سے اس کی ممانعت ہے کیونکہ ہدی کا جانور ذبح کرنے سے اصلی مقصود خون بہا کر تقرب الٰہی کا حصول ہے جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ لَن يَنَالَ ٱللَّهَ لُحُومُهَا وَلَا دِمَآؤُهَا وَلَٰكِن يَنَالُهُ ٱلتَّقْوَىٰ مِنكُمْ ﴾ (الحج ۲۲/ ۳۷)

"اللہ تک نہ ان کا گوشت پہنچتا ہے اور نہ خون بلکہ اس تک تمہاری پرہیز گاری پہنچتی ہے۔"

اسلامی شریعت کا ایک معروف قاعدہ سدذرائع بھی ہے' اس کی روشنی میں بھی یہ بات صحیح نہیں کہ قربانی کرنے کے بجائے جانور کی قیمت صدقہ کر دی جائے کیونکہ اس سے تو شریعت کھیل بن کر رہ جائے گی' مثلاً آج اگر آپ قربانی کے جانور کی قیمت صدقہ کرتے ہیں تو کل یہ کہیں گے کہ آج کل حج کرنا چونکہ بہت مشکل ہے لہٰذا حج کرنے کے بجائے' حج پر آنے والے خرچہ کو صدقہ کر دیں۔ یاد رہے کہ مصالح کی تین قسمیں ہیں۔ (۱) وہ جن کے قابل اعتبار ہونے پر اجماع ہے۔ (۲) جن کے ناقابل اعتبار ہونے پر اجماع ہے اور (۳) مصالح مرسلہ۔ اور قربانی کے بجائے اس کی قیمت کو صدقہ کرنا ایک ایسی مصلحت ہے جس کے ناقابل اعتبار ہونے پر اجماع ہے کیونکہ یہ مصلحت ادلہ شرعیہ کے معارض ہے' لہٰذا یہ ناقابل اعتبار ہے۔

۲۔ کونسل نے کثرت رائے سے یہ قرار دیا کہ قربانی کے چار دن ہیں یعنی ایک یوم عید اور تین دن اس کے بعد' نیز ایام تشریق کی راتوں میں بھی قربانی کے جانوروں کو ذبح کرنا جائز ہے کیونکہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ لِّيَشْهَدُوا۟ مَنَٰفِعَ لَهُمْ وَيَذْكُرُوا۟ ٱسْمَ ٱللَّهِ فِىٓ أَيَّامٍ مَّعْلُومَٰتٍ عَلَىٰ مَا رَزَقَهُم مِّنۢ بَهِيمَةِ ٱلْأَنْعَٰمِ ۖ فَكُلُوا۟ مِنْهَا وَأَطْعِمُوا۟ ٱلْبَآئِسَ ٱلْفَقِيرَ ﴿٢٨﴾ ثُمَّ لْيَقْضُوا۟ تَفَثَهُمْ وَلْيُوفُوا۟ نُذُورَهُمْ وَلْيَطَّوَّفُوا۟ بِٱلْبَيْتِ ٱلْعَتِيقِ ﴿٢٩﴾ ﴾ (الحج ۲۲/ ۲۸۔۲۹)

"تاکہ وہ (لوگ) اپنے فائدے کے کاموں کے لیے حاضر ہوں اور (قربانی کے) ایام معلوم میں چوپائے مویشیوں (کے ذبح کے وقت) جو اللہ نے ان کو دیئے ہیں ان پر اللہ کا نام لیں۔ اس میں سے تم خود بھی کھاؤ اور فقیر و درماندہ کو بھی کھلاؤ' پھر چاہیئے کہ لوگ اپنا میل کچیل دور کریں اور اپنی نذریں پوری کریں اور خانہ قدیم (یعنی بیت اللہ) کا طواف کریں۔"

اس آیت کریمہ سے استدلال یہ ہے کہ میل کچیل کو دور کرنا اور طواف زیارت قربانی کے دن سے پہلے نہیں ہو سکتا اور جب ان افعال کو ہدی ذبح کرنے کے بعد قرار دیا گیا ہے تو معلوم ہوا اس سے قران اور تمتع کی ہدی مراد ہے کیونکہ تمام اقسام کی ہدی پر تو یہ افعال مرتب نہیں ہوتے۔ نبی ﷺ سے یہ ثابت ہے کہ آپ نے اپنی ہدی کو عید کے دن ذبح فرمایا' اسی طرح آپ نے ازواج مطہرات رضی اللہ عنہن کی طرف سے ہدی کو بھی عید ہی کے دن ذبح فرمایا' نبی ﷺ یا کسی بھی صحابی سے یہ ثابت نہیں کہ انہوں نے ہدی کو عید کے دن سے پہلے یا ایام تشریق کے بعد ذبح کیا ہو۔ سلیمان بن موسیٰ نے جبیر بن مطعم سے روایت کیا ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا:

«كُلُّ عَرَفَاتٍ مَوْقِفٌ ـ وَكُلُّ أَيَّامِ التَّشْرِيقِ ذَبْحٌ»(مسند أحمد:٤/ ٨٢ وصحيح ابن حبان (موارد الظمآن)، ح:١٠٠٨)

"سارا عرفات موقف ہے۔" اور "تمام ایام تشریق میں ہدی کے جانور ذبح کیے جا سکتے ہیں۔"

حافظ ابن قیم رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ یہ روایت دو مختلف سندوں سے مروی ہے جو ایک دوسرے کے لیے باعث تقویت ہیں۔

۳- ہدی کے جانور صرف منیٰ ہی میں نہیں بلکہ مکہ مکرمہ میں بھی اور حرم میں کسی بھی جگہ ذبح کیے جا سکتے ہیں کیونکہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

«كُلُّ مِنًى مَنْحَرٌ وَكُلُّ فِجَاجِ مَكَّةَ طَرِيقٌ وَمَنْحَرٌ»(سنن أبي داود، المناسك، باب الصلاة بجمع، ح:١٩٣٧ وسنن ابن ماجه، ح:٣٠٤٨)

"سارا منیٰ قربان گاہ ہے اور مکہ مکرمہ کے تمام علاقے اور راستے قربان گاہ ہیں۔"

۴- جو گوشت قربان گاہوں میں چھوڑ دیئے جائیں' ان کے بارے میں حکومت پر یہ ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ ان کی اس طرح سے حفاظت کا اہتمام کیا جائے کہ وہ فقرائے حرم میں تقسیم ہو سکیں۔

۵- حکومت کے لیے یہ بھی جائز ہے کہ لوگ قربان گاہوں میں گوشت کے علاوہ جانوروں کی دیگر چیزیں مثلاً کھالیں' ہڈیاں اور اون وغیرہ جو چھوڑ جائیں تو ان کی حفاظت کا بھی ایسا اہتمام کرے کہ وہ فقرائے حرم کے استعمال میں آ سکیں۔

۶- حکومت کو چاہیے (اللہ تعالیٰ اسے توفیق عطا فرمائے) کہ وہ منیٰ' مکہ مکرمہ اور دیگر حرم میں اس قدر کثرت کے ساتھ قربان گاہیں بنا دے کہ حجاج کرام آسانی اور سہولت کے ساتھ قربانی کے جانوروں کو ذبح کر سکیں اور ان کے گوشت سے حسب خواہش استفادہ بھی کر سکیں۔ وباللہ التوفیق' وصلی اللہ علی نبینا محمد و آلہ وصحبہ وسلم

———— مجلس کبار العلماء ————

عمرہ کے احکام

بیوی کے مال سے عمرہ

سوال ایک بیوی نے اپنے خاص مال سے اپنے شوہر کو عطیہ دیا تاکہ وہ عمرہ کر سکے جب کہ شوہر کو خاص اپنے مال سے بھی عمرہ کرنے کی استطاعت ہے۔ دینی نقطۂ نگاہ سے یہ عمل کیا ہے؟ فتویٰ دیجئے' اللہ آپ کو اجر و ثواب سے نوازے گا۔ ان شاء اللہ۔

جواب اس میں کوئی حرج نہیں کہ یہ نیکی اور تقویٰ کے کاموں میں تعاون کے باب سے ہے۔ اس بیوی کو اس عمل صالح کی وجہ سے اللہ تعالیٰ جزائے خیر سے نوازے۔

———— شیخ ابن باز ————

جو دوست سے ملنے جدہ جائے اور ....

سوال میں اپنے دوستوں سے ملنے کیلئے جدہ گیا اور وہاں ایک دن قیام کے بعد میں نے عمرے کا پروگرام بنا لیا اور جدہ سے احرام باندھ کر مکہ مکرمہ چلا گیا اور عمرہ ادا کر لیا' تو بعض دوستوں نے کہا کہ آپ پر دم لازم ہے کیونکہ آپ کیلئے یہ واجب تھا کہ

وادی محرم سے احرام باندھتے یا میقات پر پہنچنے کے وقت طیارہ کے اندر ہی احرام باندھ لیتے۔ براہ کرم رہنمائی فرمائیں؟

جواب اگر آپ نے ریاض میں عمرہ کی نیت کی تھی تو پھر یہ لازم تھا کہ میقات سے یا ہوائی جہاز جب اس کے برابر آتا تو احرام باندھتے اس صورت میں اگر آپ نے میقات سے احرام نہیں باندھا تو اس کی تلافی کیلئے دم لازم ہے اور اگر سفر شروع کرتے وقت آپ کا عمرے کا ارادہ نہیں تھا اور یہ ارادہ آپ نے جدہ پہنچ کر کیا تو اس صورت میں آپ کیلئے وہی جگہ میقات ہے جہاں آپ نے یہ ارادہ کیا اور جیسا کہ آپ نے ذکر کیا وہ جگہ جدہ ہے جہاں آپ نے ارادہ کیا تھا لہٰذا آپ پر دم لازم نہیں ہے۔

——— شیخ ابن جبرین ———

مکہ مکرمہ میں مقیم جب عمرہ کا ارادہ کرے

سوال اہل مکہ میں سے یا مکہ میں آنے والے لوگوں میں سے جب کوئی عمرے کا ارادہ کرے تو وہ کہاں سے احرام باندھے؟ کیا مکہ ہی سے یا حل سے یا اپنے ملک کے میقات سے؟ امید ہے دلیل کے ساتھ اس مسئلہ میں مستفید فرمائیں گے۔

جواب مکہ میں مقیم لوگوں میں سے جب کوئی عمرہ کا ارادہ کرے' خواہ وہ مکہ مکرمہ کے باشندوں میں سے ہو یا باہر کسی دوسرے ملک سے آیا ہو' تو اس کے لیے مشروع یہ ہے کہ وہ حل سے احرام باندھے کیونکہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا جب حجۃ الوداع کے موقع پر مکہ مکرمہ میں مقیم تھیں اور انہوں نے عمرہ کا ارادہ کیا تو نبی کریم ﷺ نے انہیں یہ حکم دیا تھا کہ وہ حرم سے باہر جا کر احرام باندھیں۔ نبی کریم ﷺ نے آپ کے ساتھ آپ کے بھائی عبدالرحمٰن رضی اللہ عنہ کو بھیج دیا تھا جن کے ساتھ جا کر آپ نے مقام تنعیم سے احرام باندھا۔[1] یہ جگہ آج کل مسجد عائشہ کے نام سے معروف ہے۔ بعض اہل علم کا یہ مذہب ہے کہ اہل مکہ کے لیے عمرہ نہیں ہے کیونکہ نبی کریم ﷺ نے جب رمضان میں مکہ کو فتح کیا تو آپ عمرہ کے لیے مکہ سے باہر نہیں نکلے' لیکن پہلا قول ہی صحیح ہے۔ حضرت عائشہ سے مروی مذکورہ حدیث کے پیش نظر جمہور اہل علم کا بھی یہی قول ہے۔

نبی کریم ﷺ نے فتح مکہ کے سال مکہ سے باہر جا کر احرام نہیں باندھا تو یہ عمرہ کی عدم مشروعیت کی دلیل نہیں ہے کیونکہ نبی کریم ﷺ بسا اوقات ایک چیز کو بہت سے اسباب کی وجہ سے ترک کر دیا کرتے تھے اور بعض صحابہ کو اس کا حکم بھی دے دیا کرتے تھے تاکہ امت کو اس کی مشروعیت کا بھی علم ہو جائے جیسا کہ آپ نے ابو ہریرہ[2] اور ابو الدرداء رضی اللہ عنہما[3] کو تو نماز ضحیٰ پڑھنے کی تاکید فرمائی لیکن آپ خود اسے ہمیشہ نہیں پڑھا کرتے تھے' اسی طرح آپ نے نفل روزے کے بارے میں فرمایا کہ اس کی افضل صورت حضرت داود علیہ السلام کے روزہ کی ہے[4] اور وہ یہ کہ ایک دن روزہ رکھ لیا جائے اور ایک دن افطار کر دیا جائے لیکن بعض اسباب کے پیش نظر آپ خود اس کی پابندی نہیں فرمایا کرتے تھے اور ان اسباب میں سے ایک اہم سبب یہ بھی ہے کہ آپ کو امت کے مشقت میں پڑ جانے کا اندیشہ تھا۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی

---

[1] صحیح بخاری' الحج' باب کیف تھل الحائض والنفساء' حدیث: 1556 و صحیح مسلم' الحج' حدیث: 1211۔

[2] صحیح بخاری' التھجد' باب صلاۃ الضحی فی الحضر' حدیث: 1178 و صحیح مسلم' صلاۃ المسافرین' باب استحباب صلاۃ الضحیٰ' حدیث: 721۔

[3] سنن ابن ماجہ' الفتن' باب الصبر علی البلاء' حدیث: 4034 - 3371۔

[4] صحیح بخاری' فضائل القرآن' باب فی کم یقراء القرآن' حدیث: 5052۔

وہ حدیث جو بالاتفاق صحیح ہے کہ جو لوگ میقات کے اندر رہتے ہوں تو وہ حج اور عمرہ کا احرام اپنی جگہ ہی سے باندھیں تو یہ حکم مکہ مکرمہ میں مقیم لوگوں کے صرف حج کے لیے ہے اور عمرہ کے لیے واجب یہ ہے کہ اس کا حل سے احرام باندھا جائے جیسا کہ عائشہ رضی اللہ عنہا کی مذکورہ حدیث سے ثابت ہے[1] اور اس طرح ان دونوں حدیثوں میں تطبیق بھی ہو جاتی ہے۔

—— شیخ ابن باز ——

عمرے کا احرام باندھ کر کھول دینا

سوال میں اور میری اہلیہ نے عمرے کا پروگرام بنایا اور جس دن پروگرام بنا' اسی دن میں نے عمرے کا احرام باندھ لیا لیکن پھر پروگرام تبدیل کر لیا اور کہا کہ کسی دوسرے دن جائیں گے اور میں نے احرام کھول دیا تو کیا اس صورت میں میرے لیے کوئی کفارہ وغیرہ ہے؟

جواب جب آپ نے عمرے کا احرام باندھنے کی نیت کر لی تو پھر رجوع کرنا جائز نہیں بلکہ حج کی طرح عمرہ کو پورا کرنا بھی واجب ہے' کیونکہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ وَأَتِمُّوا الْحَجَّ وَالْعُمْرَةَ لِلَّهِ ﴾ (البقرۃ ٢/ ١٩٦)

''اور اللہ (کی خوشنودی) کے لیے حج اور عمرے کو پورا کرو۔''

اس پر اہل علم کا اجماع ہے' لہٰذا آپ کو چاہیئے کہ احرام پہنیں اور فوراً مکہ مکرمہ چلے جائیں اور طواف کریں' سعی کریں اور بال منڈوا یا کٹوا دیں' اس سے آپ کا عمرہ مکمل ہو جائے گا اور ازراہ جہالت آپ نے جو خوشبو استعمال کی' سلے ہوئے کپڑے پہنے اور سر کو ڈھانپ لیا وغیرہ تو اس سے آپ پر کچھ لازم نہیں اور اگر آپ کو شرعی حکم کا علم تھا کہ عمرہ کو جب ایک بار شروع کر لیا جائے تو یہ جائز نہیں کہ تکمیل سے قبل احرام کھول دیا جائے لیکن آپ نے تساہل سے کام لیتے ہوئے احرام کھول دیا تو آپ پر لازم ہے کہ چھ مسکینوں کو کھانا کھلائیں یا ایک بکری ذبح کریں یا تین روزے رکھیں۔ یہ کفارہ ہے سر ڈھانپنے' سلے ہوئے کپڑے پہننے' خوشبو استعمال کرنے' ناخن تراشنے اور سر منڈانے وغیرہ کا۔ ان میں سے ہر چیز کا ایک مستقل کفارہ ہے اور وہ یہ کہ ان تینوں میں سے کوئی ایک کفارہ ادا کر دیا جائے۔ یاد رہے کہ روزے تو کسی بھی جگہ رکھے جا سکتے ہیں لیکن کھانا کھلانے کی صورت میں یہ ضروری ہے کہ وہ حرم کے مسکینوں کو کھلایا جائے۔ ہر مسکین کو نصف صاع کھجور یا شہر میں جو خوراک استعمال ہوتی ہو وہ دے دی جائے' اسی طرح بکری کا گوشت بھی مساکین حرم میں تقسیم کیا جائے۔ اور اگر اسی طرح آپ نے احرام کھولنے کے بعد اپنی بیوی سے صحبت بھی کر لی ہے تو پھر واجب یہ ہے کہ اس عمرہ کو مکمل کریں اور پھر اس کی قضاء بھی دیں اور احرام وہاں سے باندھیں جہاں سے پہلی مرتبہ احرام باندھا تھا' علاوہ ازیں آپ پر دم بھی لازم ہے اور وہ یہ کہ ایک بھیڑ یا بکری ذبح کر کے فقرائے مکہ میں تقسیم کر دی جائے۔ بھیڑ یا بکری کے بجائے اونٹ یا گائے کے ساتویں حصہ میں شرکت بھی جائز ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ اس عظیم عبادت میں تساہل کی وجہ سے اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں توبہ کرنی بھی ضروری ہے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں اور آپ کو توبۃ النصوح کی توفیق بخشے اور ہمیں' آپ کو اور تمام مسلمانوں کو شیطان کے وسوسوں سے محفوظ رکھے۔

---

[1] صحیح بخاری' الحج' باب کیف تھل الحائض والنفساء' حدیث: 1556 و صحیح مسلم' الحج' حدیث: 1211۔

—— شیخ ابن باز ——

جو شخص عمرہ کی تکمیل نہ کرے

سوال میں گزشتہ رمضان المبارک میں عمرہ کے لیے گیا اور جب طواف شروع کیا تو ازدحام کی شدت کی وجہ سے اسے مکمل نہ کر سکا اور مکہ مکرمہ سے اپنے شہر واپس آ گیا' واپسی ستائیس تاریخ کو تھی' اب آنجناب سے سوال ہے کہ اس صورت میں مجھ پر کیا لازم ہے؟ یاد رہے کہ میری صحت الحمدللہ بہت اچھی ہے' رہنمائی فرمائیں۔

جواب آپ نے غلطی کی ہے اللہ تعالیٰ ہمیں اور آپ کو معاف فرمائے۔ آپ پر یہ واجب تھا کہ عمرہ کی کسی دوسرے وقت تکمیل کر لیتے جب رش نہ ہوتا کیونکہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ وَأَتِمُّوا الْحَجَّ وَالْعُمْرَةَ لِلَّهِ ﴾ (البقرۃ۲/ ۱۹۶)

"اور تم اللہ (کی خوشنودی) کے لیے حج اور عمرے کو پورا کرو۔"

علماء کا اس بات پر اجماع ہے کہ جو شخص حج یا عمرہ کا احرام باندھ لے تو اس پر واجب ہے کہ اس کی تکمیل کرے اور عمرہ کے تمام اعمال سے فراغت کے بعد ہی احرام کھولے' الّا یہ کہ وہ محصر ہو یا اس نے مشروط احرام باندھا ہو اور وہ شرط پوری ہو گئی ہو لیکن آپ کے سلسلہ میں ایسی کوئی بات نہ تھی' لہٰذا آپ کو توبہ کرنی چاہیے۔ اور اگر آپ نے مذکورہ مدت میں اپنی بیوی سے صحبت کر لی ہے تو پھر آپ پر دم بھی واجب ہے اور وہ یہ کہ اونٹ یا گائے کے ساتویں حصہ یا ایک عدد بھیڑ یا بکری کی قربانی دی جائے اور اگر آپ کو یہ علم تھا کہ ایسا کرنا جائز نہیں تو پھر آپ کو توبہ کے ساتھ ساتھ چھ مسکینوں کو کھانا بھی کھلانا چاہیے اور وہ یہ کہ ہر مسکین کو شہر کی خوراک کے مطابق نصف صاع گندم یا چاول وغیرہ دیں یا ایک عدد بکری ذبح کریں یا تین روزے رکھیں کیونکہ آپ نے سلے ہوئے کپڑے پہن لیے ہیں۔ اگر مذکورہ مدت میں سر ڈھانپ لیا ہو یا خوشبو استعمال کر لی ہو یا ناخن تراش لیے ہوں یا بال منڈا لیے ہوں تو ان سب کا کفارہ بھی اسی طرح ہے اور اگر آپ نے جہالت کی وجہ سے مذکورہ کام کیا ہے تو پھر آپ پر مذکورہ فدیہ میں سے کچھ بھی واجب نہیں ہے کہ ارشاد باری ہے:

﴿ رَبَّنَا لَا تُؤَاخِذْنَا إِن نَّسِينَا أَوْ أَخْطَأْنَا ﴾ (البقرۃ۲/ ۲۸۶)

"اے ہمارے رب! اگر ہم سے بھول یا چوک ہو گئی ہو تو ہم سے مؤاخذہ نہ کرنا۔"

اور صحیح حدیث میں ہے' رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ "اللہ تعالیٰ نے اس دعا کو قبول فرما لیا ہے۔"[1]

نیز دیگر دلائل سے بھی یہی ثابت ہوتا ہے۔ واللّٰہ ولی التوفیق

—— شیخ ابن باز ——

حائضہ عورت کا عمرہ

سوال ایک عورت نے یہ سوال پوچھا ہے کہ وہ حالت حیض میں تھی کہ اس کے اہل خانہ نے عمرہ کے لیے جانے کا پروگرام بنا لیا اگر یہ ان کے ساتھ نہ جاتی تو گھر میں اکیلی رہ جاتی' یہ ان کے ساتھ چلی گئی اور اس نے عمرہ کے تمام ارکان

---

[1] صحیح مسلم' الایمان' باب بیان تجاوز اللّٰہ تعالٰی عن حدیث النفس...... الخ' حدیث: 126-

طواف اور سعی وغیرہ اس طرح مکمل کر لیے گویا اسے کوئی عذر نہیں تھا کیونکہ ایک تو یہ جاہل تھی' اسے حکم شریعت کا علم نہیں تھا اور دوسرا اس نے شرمندگی کی وجہ سے اپنی حالت کے بارے میں اپنے ولی کو نہیں بتایا تھا' بالخصوص وہ ان پڑھ تھی' پڑھنا لکھنا نہیں جانتی تھی۔ سوال یہ ہے کہ اب اس کے لیے کیا حکم ہے؟

جواب جب اس نے اپنے اہل خانہ کے ساتھ عمرہ کا احرام باندھ لیا تو اسے چاہیئے کہ غسل کے بعد دوبارہ طواف کرے اور دوبارہ بال کٹوائے' جب کہ علماء کے صحیح قول کے مطابق اس مذکورہ حالت میں سعی جائز ہے اور اگر یہ طواف کے بعد سعی بھی دوبارہ کر لے تو یہ بہتر ہے اور اس میں زیادہ احتیاط بھی ہے۔ حالت حیض میں اس نے جو طواف کر لیا اور طواف کی دو رکعتیں بھی پڑھ لیں تو اس کی وجہ سے اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں توبہ کرنی چاہیئے۔

اگر یہ عورت شادی شدہ ہے' تو عمرہ کی تکمیل سے قبل اس کے شوہر کے لیے مقاربت جائز نہیں ہے اور اگر اس نے عمرہ کی تکمیل سے پہلے مقاربت کر لی ہے' تو اس سے عمرہ فاسد ہو گیا اور اس پر دم لازم ہو گیا اور وہ یہ کہ ایک بھیڑ یا دو دانت والی (دوندی) بکری ذبح کر کے مکہ مکرمہ کے فقراء میں تقسیم کی جائے اور اس عمرہ کی تکمیل کرے اور اس فاسد عمرہ کے بجائے دوسرا عمرہ کرے جس کا احرام اسی میقات سے باندھے' جہاں سے پہلے عمرہ کا احرام باندھا تھا اور اگر اس نے طواف و سعی محض شرم و حیا کی وجہ سے کیا ہے اور میقات سے عمرہ کا احرام نہیں باندھا تھا' تو پھر سوائے اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی بارگاہ اقدس میں توبہ کے سوا اور کچھ اس پر لازم نہیں ہے کیونکہ عمرہ اور حج' احرام کے بغیر صحیح نہیں ہیں۔ اور احرام یہ ہے کہ عمرہ یا حج یا دونوں ہی کی نیت کی جائے۔ دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہم سب کو ہدایت عطا فرمائے اور شیطان کے وسوسوں سے محفوظ رکھے۔

——— شیخ ابن باز ———

عمرہ کی نامکمل سعی

سوال ایک شخص نے عمرہ کیا لیکن اس نے نسیان یا جہالت کی وجہ سے سعی کے چار چکر چھوڑ دیئے تو اس کے لیے کیا حکم ہے؟

جواب اس کے لیے یہ حکم ہے کہ ان چکروں کو مکمل کرے تاکہ اس کی سعی پوری ہو جائے۔ خواہ عمرہ کی ہو یا حج کی' اسے مکمل کرنا چاہیئے! اور اگر اس نے اپنے وطن کی طرف سفر کر لیا ہے تو پھر بھی اسے مکہ واپس آکر ان چکروں کو مکمل کرنا ہو گا جو اس نے چھوڑے ہیں تاکہ اس کا عمرہ مکمل ہو جائے اور جب تک وہ اپنے عمرہ کو مکمل نہیں کر لیتا احرام کے حکم میں ہے' لہٰذا اسے اپنی بیوی سے دور رہنا چاہیئے۔

——— شیخ ابن باز ———

عمرہ میں حلق اور تقصیر

سوال عمرہ میں حلق یا تقصیر کے بارے میں کیا حکم ہے؟

جواب عمرہ میں بھی بالوں کو منڈانا یا کٹانا واجب ہے' کیونکہ نبی ﷺ جب حجۃ الوداع کے موقع پر مکہ مکرمہ میں تشریف

لائے اور آپ نے طواف و سعی کر لیا تو آپ نے حکم دیا کہ "جو شخص اپنے ساتھ قربانی کا جانور نہیں لایا وہ بالوں کو کٹوا دے یا منڈوا دے" [1] تو جب آپ نے بالوں کے کٹوانے کا حکم دیا اور اصول یہ ہے کہ امرو جوب کے لیے ہوتا ہے تو اس سے معلوم ہوا کہ بال کٹوانا واجب ہے اور اس کی ایک یہ دلیل بھی ہے کہ غزوۂ حدیبیہ کے موقع پر جب نبی ﷺ اور حضرات صحابہ کرام کو کفار مکہ نے مکہ میں جانے سے روک دیا تو نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام نے صحابہ کرام کو حکم دیا کہ وہ اپنے سروں کو منڈا دیں اور جب انہوں نے اس سلسلہ میں سستی کی تو آپ نے ناراضی کا اظہار فرمایا۔ [2] اب رہا یہ مسئلہ کہ عمرہ میں بالوں کو منڈانا افضل ہے یا کٹانا' تو افضل یہ ہے کہ منڈا دیا جائے' ہاں البتہ وہ شخص جس کا حج تمتع کا ارادہ ہو اور وہ دیر سے آیا ہو تو اس کے لیے بالوں کو کٹوانا افضل ہے تاکہ حج میں منڈانے کے لیے بال کافی ہوں۔

——— شیخ ابن عثیمین ———

بال کٹانے سے قبل احرام کھول دینا

سوال میں نے گزشتہ سال رمضان المبارک میں عمرہ ادا کیا اور جب ہم اپنی رہائش گاہ پر واپس آئے تو میں نے بال کٹانے سے قبل احرام کھول دیا کیونکہ مجھے اس کا علم نہ تھا اور میرے اہل خانہ کو بھی اس چیز کا علم نہ تھا کہ مجھے یہ مسئلہ معلوم نہیں ہے اور جب انہیں علم ہوا کہ میں نے بال نہیں کٹوائے تو انہوں نے بتایا کہ یہ جائز نہیں تو میں نے فوراً بال کٹوا دیئے' تو سوال یہ ہے کہ کیا یہ عمرہ مقبول ہے یا نہیں؟

جواب عمرہ میں محرم کے لیے یہ جائز نہیں کہ وہ اپنے سر کے بالوں کے منڈوانے یا کٹوانے سے پہلے احرام کھولے' لٰہذا جو شخص بالوں کے کٹوانے سے پہلے احرام کھول دے' سلے ہوئے کپڑے پہن لے اور سر ڈھانپ لے اور اسے اس مسئلہ کا علم ہو تو اس پر فدیہ لازم ہے اور اگر اسے یہ مسئلہ معلوم نہ ہو یا وہ بھول کر ایسا کر لے تو پھر فدیہ لازم نہیں ہے لیکن جب اسے معلوم ہو یا یاد آ جائے تو اسے چاہیے کہ فوراً لباس اتار دے' احرام پہن لے اور بالوں کو منڈانا یا کٹانا شروع کر دے' ان احکام سے ناواقفیت کی وجہ سے اسے معذور سمجھا جائے گا۔

——— شیخ ابن جبرین ———

عمرہ کرنے والے کے لیے طواف وداع کا واجب نہ ہونا

سوال عمرہ ادا کرنے کے بعد اگر کوئی شخص حدود حرم سے باہر اپنے رشتہ داروں سے ملنے کے لیے جانا چاہے تو کیا اس کے لیے طواف وداع لازم ہے؟ اور کیا یہ طواف نہ کرنے کی صورت میں کوئی فدیہ وغیرہ ہے؟

جواب عمرہ کرنے والے کے لیے طواف وداع نہیں ہے جب کہ وہ حرم سے باہر مکہ کے مضافات میں اپنے رشتہ داروں سے ملنے کے لیے جانا چاہے' اسی طرح حاجی کے لیے بھی یہی حکم ہے لیکن جب وہ اپنے گھر یا کسی اور جگہ جانے کے لیے سفر کا ارادہ کرے تو پھر اس کے لیے طواف وداع مشروع ہے' لیکن واجب نہیں ہے کیونکہ وجوب کی کوئی دلیل نہیں ہے۔

---

[1] صحیح مسلم' الحج' باب حجۃ النبی ﷺ' حدیث: 1218

[2] صحیح بخاری' المحصر' باب اذا احصر المعتمر' حدیث: 1807 و صحیح مسلم' الحج' حدیث: 1230

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم عمرہ سے حلال ہونے کے بعد منیٰ اور عرفات کی طرف گئے تھے اور انہیں یہ حکم نہیں دیا گیا تھا کہ وہ طواف وداع کریں لیکن حاجی جب مکہ مکرمہ سے رخصت ہونا چاہے تو اس کے لیے طواف وداع لازم ہے کیونکہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا قول ہے:

«أُمِرَ النَّاسُ أَنْ يَّكُونَ آخِرُ عَهْدِهِمْ بِالْبَيْتِ إِلاَّ أَنَّهُ خُفِّفَ عَنِ الْمَرْأَةِ الْحَائِضِ»(صحيح البخاري، الحج، باب طواف الوداع، ح:١٧٥٥ وصحيح مسلم، الحج، باب وجوب طواف الوداع ... الخ، ح:١٣٢٨)

"لوگوں کو یہ حکم دیا گیا کہ وہ مکہ میں آخری وقت بیت اللہ میں گزاریں' ہاں البتہ حائضہ عورت اس حکم سے مستثنیٰ ہے۔"

"لوگوں کو حکم دیا گیا" سے مراد یہ ہے کہ یہ حکم نبی کریم ﷺ نے دیا ہے چنانچہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ایک دوسری حدیث میں الفاظ یہ ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا:

«لاَ يَنْفِرَنَّ أَحَدٌ حَتَّى يَكُونَ آخِرُ عَهْدِهِ بِالْبَيْتِ»(صحيح مسلم، الحج، باب وجوب طواف الوداع ... الخ، ح:١٣٢٧ ومسند أحمد:١/ ٢٢٢)

"اس وقت تک کوئی شخص کوچ نہ کرے جب تک وہ اپنا آخری وقت بیت اللہ میں نہ گزارے۔"

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ حج اور عمرہ میں حائضہ عورت طواف وداع سے مستثنیٰ ہے' اسی طرح نفاس والی عورت بھی اس سے مستثنیٰ ہے کیونکہ اہل علم کے نزدیک ان دونوں کے لیے حکم ایک جیسا ہے۔

—— شیخ ابن باز ——

عمرہ میں طواف وداع واجب نہیں

سوال میں عمرہ کرنے والوں کے لیے بھی یہ لازم قرار دیتا تھا کہ وہ مکہ مکرمہ سے کوچ کرتے وقت طواف وداع کریں لیکن میں نے حرم میں آپ کے درس میں یہ سنا کہ ان کے لیے طواف وداع نہیں ہے۔ امید ہے اس مسئلہ کی مزید وضاحت فرمائیں گے؟

جواب جو شخص حج کرے' اس کے لیے یہ واجب ہے کہ مکہ مکرمہ سے کوچ کرتے وقت طواف وداع کرے کیونکہ ابن عباس رضی اللہ عنہما کا قول ہے:

«أُمِرَ النَّاسُ أَنْ يَّكُونَ آخِرُ عَهْدِهِمْ بِالْبَيْتِ إِلاَّ أَنَّهُ خُفِّفَ عَنِ الْمَرْأَةِ الْحَائِضِ» (صحيح البخاري، الحج، باب طواف الوداع، ح:١٧٥٥ وصحيح مسلم، الحج، باب وجوب طواف الوداع ... الخ، ح:١٣٢٨)

"لوگوں کو یہ حکم دیا گیا ہے کہ ان کا آخری کام بیت اللہ کا طواف ہو البتہ حائضہ عورت اس سے مستثنیٰ ہے۔"

نیز آپ کا قول ہے کہ "لوگ ہر طرف سے رخصت ہو جاتے تھے تو رسول اللہ ﷺ نے انہیں حکم دیا:

«لاَ يَنْفِرَنَّ أَحَدٌ حَتَّى يَكُونَ آخِرُ عَهْدِهِ بِالْبَيْتِ»(صحيح مسلم، الحج، باب وجوب طواف الوداع

... الخ، ح:١٣٢٧ ومسند أحمد: ١/ ٢٢٢)

''اس وقت تک کوئی رخصت نہ ہو جب تک وہ آخر میں بیت اللہ کا طواف نہ کرے۔''

قرینۂ حال سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ حکم حاجیوں کے لیے ہے کیونکہ آپ نے حاجیوں کے لیے حج سے فراغت کے بعد یہ ارشاد فرمایا تھا۔ عمرہ کرنے والے کے لیے طواف وداع واجب نہیں ہے۔ ہاں البتہ اس کے لیے مسنون (یعنی مستحب) ضرور ہے کہ وہ بھی کوچ کرتے وقت طواف کرے لیکن ہم اسے واجب نہیں کہیں گے کیونکہ وجوب کی کوئی دلیل نہیں ہے اور پھر یہ اس لیے بھی کہ عمرۃ القضاء کے بعد رسول اللہ ﷺ نے مکہ مکرمہ سے رخصت ہوتے وقت طواف وداع نہیں فرمایا تھا۔ ہمارے علم کے مطابق آپ کی سنت سے یہی ثابت ہوتا ہے۔

——— فتویٰ کمیٹی ———

رمضان میں عمرہ کرنا افضل ہے

سوال کیا حج کے مہینوں میں عمرہ کرنا دیگر مہینوں میں عمرہ کرنے سے افضل ہے؟

جواب عمرہ کی ادائیگی کے لیے افضل وقت رمضان ہے کیونکہ نبی کریم ﷺ کا یہ فرمان ہے:

«عُمْرَةٌ فِي رَمَضَانَ تَعْدِلُ حَجَّةً»(جامع الترمذي، الحج، باب ما جاء في عمرة رمضان، ح:٩٣٩ وسنن ابن ماجه، المناسك، باب العمرة في رمضان، ح:٢٩٩٤)

''رمضان میں عمرہ حج کے برابر ہے۔''

اور صحیحین کی ایک دوسری روایت میں ہے:

«تَقْضِي حَجَّةً أَوْ حَجَّةً مَّعِي»(صحيح البخاري، جزاء الصيد، باب حج النساء، ح:١٨٦٣ وصحيح مسلم، الحج، باب فضل العمرة في رمضان، ح:١٢٥٦)

''یہ حج کے یا میرے ساتھ حج کے برابر ہے۔''

یعنی الفاظ شک کے ساتھ ہیں۔ رمضان کے بعد ذوالقعدہ میں عمرہ کرنا افضل ہے کیونکہ نبی ﷺ نے تمام عمرے ذوالقعدہ ہی میں ادا فرمائے تھے اور ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ لَّقَدْ كَانَ لَكُمْ فِي رَسُولِ ٱللَّهِ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ ﴾ (الأحزاب٣٣/ ٢١)

''تمہارے لیے رسول اللہ ﷺ میں بہترین نمونہ ہے۔''

——— شیخ ابن باز ———

رمضان میں عمرہ حج کے برابر ہے

سوال کیا احادیث سے یہ ثابت ہے کہ رمضان میں عمرہ حج کے برابر ہے؟ یا رمضان میں بھی اس کا ثواب دیگر تمام مہینوں کی طرح ہے؟

جواب ہاں صحیح مسلم میں ہے، نبی ﷺ نے فرمایا:

«عُمْرَةٌ فِي رَمَضَانَ تَعْدِلُ حَجَّةً»(صحيح مسلم، الحج، باب فضل العمرة في رمضان، ح:١٢٥٦ والترمذي، الحج، باب ما جاء في عمرة رمضان، ح:٩٣٩ واللفظ له)

”رمضان میں عمرہ حج کے برابر ہے۔“

یعنی اس کا ثواب حج کے برابر ہے۔ اس کے یہ معنی نہیں کہ اگر آدمی نے حج نہ کیا ہو تو رمضان میں عمرہ کرنے سے اس سے حج ساقط ہو جائے گا جیسا کہ حدیث میں ہے کہ سورۂ اخلاص ایک تہائی قرآن کے برابر ہے۔ لیکن یہ باقی قرآن سے انسان کو بے نیاز نہیں کر سکتی۔ نماز میں اگر کوئی شخص تین بار سورۂ اخلاص پڑھ لے تو وہ سورۂ فاتحہ سے بے نیاز نہیں ہو سکتا' اسی طرح اگر دس بار یہ پڑھ لے:

«لاَ إِلٰهَ إِلاَّ اللهُ وَحْدَهُ لاَ شَرِيكَ لَهُ، لَهُ الْمُلْكُ وَلَهُ الْحَمْدُ، وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ»(صحيح مسلم، الذكر والدعاء، باب فضل التهليل والتسبيح والدعاء، ح:٢٦٩٣)

تو یہ حضرت اسماعیل علیہ السلام کی اولاد سے چار غلام آزاد کرنے کے برابر ہے' لیکن اگر کسی انسان پر گردن آزاد کرنا لازم ہو تو محض ان کلمات کا پڑھنا کفایت نہیں کرے گا۔ اس سے معلوم ہوا کہ کسی چیز کے کسی کے برابر ہونے سے یہ لازم نہیں آتا کہ یہ اس سے کفایت بھی کر سکتی ہے۔

——— شیخ ابن عثیمین ———

کیا رمضان میں عمرہ کی فضیلت کچھ ایام کے ساتھ مخصوص ہے؟

سوال کیا رمضان میں عمرہ کی فضیلت مہینے کے اول' اوسط یا آخری حصہ کے ساتھ مخصوص ہے؟

جواب رمضان میں جب بھی عمرہ کیا جائے فضیلت حاصل ہو گی اور یہ فضیلت اول' اوسط یا آخری حصہ کے ساتھ مخصوص نہیں ہے کیونکہ نبی ﷺ کا یہ ارشاد عام ہے:

«عُمْرَةٌ فِي رَمَضَانَ تَعْدِلُ حَجَّةً»(صحيح مسلم، الحج، باب فضل العمرة في رمضان، ح:١٢٥٦ وسنن الترمذي، الحج، باب ما جاء في عمرة رمضان، ح:٩٣٩ واللفظ له)

”رمضان میں عمرہ حج کے برابر ہے“

آپ نے اسے کسی خاص وقت کے ساتھ مقید نہیں فرمایا۔ جو شخص رمضان میں سفر کر کے جائے اور عمرہ ادا کرے تو اس کا ثواب ایسے ہے جیسے اس نے حج کیا۔ میں یہاں ان بھائیوں کی توجہ اس طرف مبذول کرانا چاہوں گا جو عمرہ ادا کرنے کے لیے مکہ مکرمہ جاتے ہیں تو کچھ لوگ رمضان شروع ہونے سے ایک یا دو دن پہلے عمرہ کر لیتے ہیں اور اس طرح وہ رمضان میں عمرہ کے ثواب سے محروم رہتے ہیں' لہٰذا اگر وہ اپنے سفر کو تھوڑا سا مؤخر کر دیں تاکہ وہ رمضان میں عمرہ کا احرام باندھ سکیں تو یہ بہت بہتر اور افضل ہے۔

اسی طرح ہم نے یہ بھی دیکھا ہے کہ بعض لوگ مہینے کے ابتدائی حصہ میں عمرہ کے لیے آتے ہیں اور پھر مہینے کے درمیان میں تنعیم جا کر دوسرے عمرے کا احرام اور اسی طرح مہینے کے آخر میں پھر تنعیم جا کر تیسرے عمرہ کا احرام باندھ لیتے ہیں تو یہ عمل بے اصل ہے۔ شریعت میں اس کا کوئی ثبوت نہیں۔ نبی اکرم ﷺ نے فتح مکہ کے سال مکہ مکرمہ میں انیس

دن قیام فرمایا تھا لیکن دوسرے عمرہ کے لیے آپ تنعیم تشریف نہیں لے گئے تھے' حالانکہ آپ نے مکہ مکرمہ کو رمضان ہی میں فتح فرمایا تھا مگر قتال کے خاتمہ کے بعد آپ عمرہ کے لیے تنعیم نہیں گئے بلکہ آپ نے عمرہ ذوالقعدہ میں غزوۂ طائف سے واپسی کے وقت ادا فرمایا۔ اس موقع پر مقام جعرانہ میں آپ نے قیام فرمایا اور وہاں ہی غنیمتوں کو تقسیم فرمایا تھا' اسی اثناء میں جعرانہ ہی سے ایک رات عمرہ کے لیے مکہ مکرمہ میں تشریف لائے تھے اور پھر اسی رات عمرہ ادا کرنے کے بعد واپس تشریف لے گئے۔

یہ اس بات کی دلیل ہے کہ انسان کو مکہ سے نکل کر تنعیم یا کسی اور دوسری جگہ نہیں جانا چاہیئے تاکہ وہاں سے احرام باندھ کر ایک اور عمرہ کر سکے۔ اگر یہ نیکی کا کام ہوتا تو اسے سب سے پہلے خود رسول اللہ ﷺ سرانجام دیتے کیونکہ ہمیں یہ معلوم ہے کہ آپ کو سب لوگوں سے زیادہ نیکی کا شوق تھا اور پھر آپ تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے امت تک احکام شریعت کے پہنچانے والے ہیں' لہٰذا اگر یہ حکم شریعت ہوتا تو آپ اسے امت کے سامنے قول' فعل یا تقریر کے ذریعے ضرور بیان فرما دیتے' لیکن جب ان میں سے کوئی صورت بھی موجود نہیں تو پھر ہمیں صرف نبی ﷺ کی سنت ہی پر عمل کرنا چاہیئے کیونکہ اتباع سنت ہی بہتر ہے' خواہ وہ عمل کم ہی کیوں نہ ہوں اس بدعت سے خواہ وہ کم ہو یا زیادہ۔

—— شیخ ابن عثیمین ——

رمضان اور غیر رمضان میں بار بار عمرہ کرنا

سوال رمضان اور غیر رمضان میں حرم سے اس نیت سے نکل کر حل میں جانے کا کیا حکم ہے تاکہ ایک اور عمرہ کر لیا جائے؟

جواب شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ نے ذکر فرمایا ہے کہ باتفاق سلف' عمروں کی کثرت اور تکرار مکروہ ہے۔ اس قول کو خواہ تسلیم کیا جائے یا نہ کیا جائے لیکن یہ بات درست ہے کہ جو شخص اپنے وطن سے مکہ مکرمہ میں عمرہ کے لیے آیا ہے اس کے رمضان اور غیر رمضان میں حرم سے نکل کر حل میں جانا تاکہ وہ دوسرا اور تیسرا عمرہ بھی کر سکے' یہ یقیناً ان امور بدعت میں سے ہے جو رسول اللہ ﷺ کے دور میں معروف نہ تھے۔ عہد نبوی سے اس کی صرف ایک ہی مثال ملتی ہے اور اس کا تعلق بھی ایک خاص مسئلہ سے ہے اور وہ یہ کہ ام المومنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے حج تمتع کی نیت سے عمرہ کا احرام باندھا تھا کہ آپ کے ایام شروع ہو گئے' [1] نبی ﷺ نے دیکھا کہ آپ رو رہی ہیں' رونے کا سبب پوچھا تو انہوں نے بتایا' اس پر آپ نے انہیں تسلی دی اور فرمایا کہ "یہ تو وہ چیز ہے جسے اللہ تعالیٰ نے بنات آدم کے لیے لکھ رکھا ہے' پھر آپ نے حکم دیا کہ حج کا احرام باندھ لیں' چنانچہ آپ نے حج کا احرام باندھ لیا اور اس طرح ان کا حج قران ہو گیا اور جب وہ حج سے فارغ ہوئیں تو انہوں نے نبی کریم ﷺ کے سامنے اس خواہش کا اظہار کیا کہ وہ حج کے علاوہ ایک مستقل عمرہ بھی کرنا چاہتی ہیں تو رسول اللہ ﷺ نے ان کو اس کی اجازت دے دی اور آپ نے ان کے بھائی حضرت عبدالرحمٰن بن ابی بکر رضی اللہ عنہما کو حکم دیا کہ وہ ان کے ساتھ تنعیم تک جائیں تاکہ آپ وہاں سے احرام باندھ آئیں اور اس طرح حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے یہ عمرہ کیا۔ اگر یہ مطلقاً مشروع ہوتا تو آپ اس کی طرف تمام صحابہ کرام کی رہنمائی فرماتے اور بالخصوص عبدالرحمٰن بن ابی بکر رضی اللہ عنہما کو تو اس کی ضرور ترغیب دیتے جو اپنی بہن کے ہمراہ تھے کہ وہ بھی ایک اور عمرہ کا اجر و ثواب حاصل کریں اور پھر ہم سب یہ

---

[1] صحیح بخاری' الحج' باب کیف تهل الحائض والنفساء' حدیث: 1556 و صحیح مسلم' الحج' حدیث: 1211۔

جانتے ہیں کہ فتح مکہ کے موقع پر رسول اللہ ﷺ نے مکہ مکرمہ میں انیس دن قیام فرمایا مگر اس دوران عمرہ نہیں کیا حالانکہ آپ کے لیے اب اس میں کوئی دشواری نہیں تھی' لہٰذا معلوم ہوا کہ جب کوئی شخص رمضان یا غیر رمضان میں عمرہ کے لیے آئے تو وہ حرم سے حل تک نہ جائے تاکہ بار بار عمرہ کرے کیونکہ یہ نبی کریم ﷺ سے یا خلفائے راشدین سے یا حضرات صحابہ کرام میں سے کسی سے بھی ثابت نہیں ہے۔

بہت سے لوگ یہ بھی کہتے ہیں کہ میں رمضان میں عمرہ کے لیے آیا ہوں اور میں یہ چاہتا ہوں کہ ایک عمرہ اپنی ماں یا باپ یا کسی رشتہ دار وغیرہ کے لیے بھی کر لوں تو ہم عرض کریں گے کہ فوت شدگان کے لیے ایصال ثواب امور مشروع میں سے نہیں ہے۔ یعنی کسی بھی آدمی سے یہ مطالبہ نہیں ہے کہ وہ اپنی ماں یا باپ یا بہن وغیرہ کے لیے نیک عمل کرے' ہاں البتہ اگر کوئی ایسا کرے تو یہ جائز ہے کیونکہ نبی کریم ﷺ نے حضرت سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہ کو اجازت دی تھی کہ وہ اپنی ماں کی طرف سے اپنے نخلستان میں صدقہ کریں' [1] اسی طرح ایک آدمی نے آپ کی خدمت میں جب یہ عرض کیا کہ میری امی اچانک فوت ہو گئی ہیں اور میرا گمان ہے کہ اگر انہیں بات کرنے کا موقع ملتا تو وہ ضرور صدقہ کرتیں۔ کیا میں ان کی طرف سے صدقہ کر سکتا ہوں؟ تو آپ نے فرمایا ہاں! [2] لیکن اس کے باوجود آپ نے علی العموم صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو یہ حکم نہیں دیا کہ اپنے فوت شدہ ماں' باپ یا دیگر رشتہ داروں کی طرف سے صدقہ کرو۔ ہر طالب علم کے لیے یہ بھی واجب ہے کہ وہ امر مشروع اور امر واجب میں فرق معلوم کرے' یعنی امر مشروع تو وہ ہے جس کے بارے میں ہر مسلمان سے یہ تقاضا ہے کہ وہ اسے ضرور سرانجام دے اور امر جائز وہ ہے جسے شریعت جائز تو ضرور قرار دیتی ہے لیکن ہر مسلمان سے اسے سرانجام دینے کا مطالبہ نہیں کرتی۔ یہاں بطور مثال میں اس صحابی کے واقعہ کی طرف اشارہ کروں گا جسے نبی کریم ﷺ نے ایک سریہ میں بھیجا تھا اور وہ جب بھی نماز پڑھتے تو اپنی قراءت کو سورہ اخلاص پر ختم کرتے' [3] واپسی پر صحابہ کرام نے جب نبی اکرم ﷺ سے اس کا ذکر کیا تو آپ نے فرمایا کہ ان سے پوچھو کہ وہ ایسا کیوں کرتے ہیں؟ تو انہوں نے بتایا کہ اس سورت میں چونکہ اللہ تعالیٰ کی صفات کا تذکرہ ہے' لہٰذا میں اس سورت سے محبت رکھتا ہوں' یہ سن کر نبی کریم ﷺ نے فرمایا "جاؤ انہیں بتا دو کہ اللہ تعالیٰ بھی ان سے محبت رکھتا ہے" لیکن اس کے باوجود نبی کریم ﷺ کا یہ معمول نہیں تھا کہ اپنی ہر قراءت کو سورۂ اخلاص پر ختم فرمائیں اور نہ آپ نے امت کو اس کی تلقین فرمائی۔

اس سے امر مشروع اور امر جائز میں فرق واضح ہو گیا اور یہ بھی معلوم ہو گیا کہ اگر آپ نے سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہ کو اجازت دی کہ اپنی ماں کی طرف سے باغ کو صدقہ کریں یا اس سائل کو اپنی ماں کی طرف سے صدقہ کرنے کی اجازت دی تو اس کے یہ معنی نہیں کہ ہر شخص کے لیے یہ حکم شریعت ہے کہ وہ ایسا ضرور کرے' ہاں البتہ کوئی ایسا کرتا ہے تو اس سے اسے ضرور نفع پہنچتا ہے جس کی طرف سے صدقہ کیا جائے' لیکن ہمیں حکم شریعت یہ ہے کہ اپنے والدین کے لیے دعا کریں۔ نبی اکرم ﷺ کا ارشاد ہے:

---

[1] سنن نسائی' الوصایا' باب اذا مات الفجأة هل یستحب لاهله --- الخ' حدیث: 3680-

[2] صحیح بخاری' الجنائز' باب موت الفجأة البغتة' حدیث: 1388 و صحیح مسلم' الزکاة' حدیث: 1004-

[3] صحیح بخاری' التوحید' باب ماجاء فی دعاء النبی ﷺ' حدیث: 7375 و صحیح مسلم' صلاة المسافرین' باب فضل قراءة قل هو اللہ أحد' حدیث: 813-

«إِذَا مَاتَ الْعَبْدُ انْقَطَعَ عَنْهُ عَمَلُهُ إِلاَّ مِنْ ثَلاَثٍ : إِلاَّ مِنْ صَدَقَةٍ جَارِيَةٍ، أَوْ عِلْمٍ يُنْتَفَعُ بِهِ، أَوْ وَلَدٍ صَالِحٍ يَدْعُو لَهُ»(صحیح مسلم، الوصية، باب ما يلحق الإنسان من الثواب ... الخ، ح:١٦٣١ والأدب المفرد، باب بر الوالدين بعد موتهما، ح:٣٨ واللفظ له)

"جب بندہ فوت ہوتا ہے تو تین طرح کے اعمال کے سوا اس کے تمام اعمال منقطع ہو جاتے ہیں اور وہ تین یہ ہیں: صدقہ جاریہ' وہ علم جس سے نفع اٹھایا جا رہا ہو اور نیک اولاد جو اس کے لیے دعا کرتی ہو۔"

——— شیخ ابن عثیمین ———

مختلف فتوے

حج اور گناہوں پر اصرار

سوال اس شخص کے حج کے بارے میں کیا حکم ہے جو معصیت کے کاموں پر اصرار کرتا ہو یا صغیرہ گناہوں کا ارتکاب کرتا رہتا ہو؟

جواب اس کا حج تو صحیح ہے بشرطیکہ وہ مسلمان ہو لیکن ہے حج ناقص' اس کے لیے یہ لازم ہے کہ اللہ سبحانہ و تعالیٰ کی بارگاہ میں توبہ کرے خصوصاً جب وہ مکہ مکرمہ میں حج کے لیے آیا ہو تو اسے تمام گناہوں سے توبہ کرنی چاہیئے اور جو شخص توبہ کرے تو اللہ تعالیٰ بھی اس کی توبہ کو قبول فرمالیتا ہے' ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ وَتُوبُوٓاْ إِلَى ٱللَّهِ جَمِيعًا أَيُّهَ ٱلْمُؤْمِنُونَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ ﴿٣١﴾ ﴾ (النور٢٤/ ٣١)

"اے مومنو! سب اللہ کے آگے توبہ کرو تاکہ تم فلاح پاؤ۔"

اور فرمایا:

﴿ يَٰٓأَيُّهَا ٱلَّذِينَ ءَامَنُواْ تُوبُوٓاْ إِلَى ٱللَّهِ تَوْبَةً نَّصُوحًا عَسَىٰ رَبُّكُمْ أَن يُكَفِّرَ عَنكُمْ سَيِّـَٔاتِكُمْ وَيُدْخِلَكُمْ جَنَّٰتٍ تَجْرِى مِن تَحْتِهَا ٱلْأَنْهَٰرُ ﴾ (التحريم٦٦/ ٨)

"اے مومنو! اللہ کے آگے صاف دل سے توبہ کرو امید ہے کہ وہ تمہارے گناہ تم سے دور کر دے گا اور تم کو باغ ہائے بہشت میں جن کے نیچے نہریں بہہ رہی ہیں داخل کرے گا۔"

"توبۃ النصوح" یہ ہے کہ انسان اللہ تعالیٰ کی عظمت و جلالت اور اس کے عذاب کے خوف سے گناہوں کو ترک کر دے۔ ماضی میں جو گناہ ہوئے ان پر ندامت کا اظہار کرے اور اس بات کا سچا ارادہ کرے کہ وہ آئندہ ان کا ارتکاب نہیں کرے گا۔ توبہ کی تکمیل کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ جن لوگوں کو جانی' مالی یا عزت و آبرو کا نقصان پہنچایا ہو تو اسے پورا کرے یا ان سے معاف کروا لے۔ اللہ تعالیٰ مسلمانوں کو اصلاح قلوب اور اعمال کی توفیق بخشے اور ہم پر اور ان سب پر یہ احسان فرمائے کہ ہم تمام گناہوں سے پکی سچی توبہ کر سکیں۔ اِنَّہٗ جَوَّادٌ کَرِیْمٌ۔

——— شیخ ابن باز ———

حج میں نماز قصر کرنا

سوال حاجی اگر مکہ مکرمہ میں چار دن سے زیادہ اقامت اختیار کرے تو اس کے لیے نماز قصر کرنے کے بارے میں کیا حکم ہے؟

جواب حاجی اگر مکہ مکرمہ میں چار دن یا اس سے کم مدت کے لیے مقیم ہو تو سنت یہ ہے کہ چار رکعتوں والی نماز کی دو رکعتیں ادا کرے' کیونکہ حجۃ الوداع کے موقع پر نبی اکرم ﷺ کا یہی عمل تھا۔ اور اگر چار دن سے زیادہ اقامت کا ارادہ ہو تو پھر زیادہ احتیاط اس میں ہے کہ پوری نماز پڑھے' اکثر اہل علم کا یہی قول ہے۔

——— شیخ ابن باز ———

حج یا عمرہ کرنے والے کا حرم میں نماز ادا کرنا

سوال بعض لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ جب وہ عمرہ کے لیے جائیں تو ان کے لیے یہ واجب ہے کہ فرض نماز حرم ہی میں ادا کریں' ورنہ ان کا عمرہ باطل ہو جائے گا۔ امید ہے آپ اس مسئلہ میں رہنمائی فرمائیں گے۔ جزاکم اللہ خیراً۔

جواب یہ بات صحیح نہیں ہے۔ حج یا عمرہ کرنے والے کے لیے یہ واجب نہیں ہے کہ وہ فرض نماز مسجد حرام ہی میں ادا کرے' بلکہ اگر وہ مکہ کی کسی دوسری مسجد میں نماز پڑھ لے تو کوئی حرج نہیں۔ اس مسئلہ میں اہل علم میں کوئی اختلاف نہیں بلکہ اس پر تو اجماع ہے۔ والحمدللہ!

عمرہ کرنے والے کے لیے واجب یہ ہے کہ وہ طواف کرے' سعی کرے اور بال منڈا یا کٹا دے' اس سے عمرہ مکمل ہو جائے گا اور ان تمام امور سے پہلے یہ ضروری ہے کہ اس نے مکہ مکرمہ کی طرف آتے ہوئے اپنے میقات سے احرام باندھا ہو' بشرطیکہ وہ میقات کے باہر سے آیا ہو۔ اور اگر وہ میقات کے اندر ہی رہتا ہو جیسا کہ جدہ' ام سلم' بحرہ' لزیمہ اور شرائع وغیرہ کے باشندے ہیں تو وہ اسی جگہ سے احرام باندھیں گے جہاں سے انہوں نے حج یا عمرہ کی نیت کی ہو جیسا کہ صحیحین میں حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی یہ حدیث ہے کہ نبی کریم ﷺ نے اہل مدینہ کے لیے ذوالحلیفہ' اہل شام کے لیے جحفہ' اہل نجد کے لیے قرن المنازل اور اہل یمن کے لیے یلملم کو میقات مقرر کیا اور فرمایا:

«هُنَّ لَهُمْ وَلِمَنْ أَتٰى عَلَيْهِنَّ، مِنْ غَيْرِ أَهْلِهِنَّ، مِمَّنْ أَرَادَ الْحَجَّ وَالْعُمْرَةَ، وَمَنْ كَانَ دُونَ ذٰلِكَ فَمِنْ حَيْثُ أَنْشَأَ، حَتّٰى أَهْلُ مَكَّةَ مِنْ مَكَّةَ»(صحيح البخاري، الحج، باب مهل أهل مكة للحج والعمرة، ح:١٥٢٤ وصحيح مسلم، الحج، باب مواقيت الحج، ح:١١٨١)

''یہ میقات ان لوگوں کے لئے بھی ہیں۔ جو ان علاقوں کے باشندے ہوں اور ان لوگوں کے لئے بھی جو ان کے باشندے تو نہ ہوں لیکن وہ یہاں سے گزریں اور ان کا حج و عمرہ کا ارادہ ہو اور جو ان کے اندر رہتے ہوں تو وہ وہاں ہی سے احرام باندھیں حتیٰ کہ اہل مکہ مکہ ہی سے (احرام باندھیں)۔''

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے منیٰ کے آخری دن جب عمرہ کا ارادہ کیا تو آپ نے انہیں حکم دیا کہ وہ حرم کے باہر سے جا کر احرام باندھیں تو انہوں نے تنعیم سے احرام باندھا اور مکہ مکرمہ آکر طواف سعی اور تقصیر کیا تو اس صحیح حدیث سے معلوم ہوا کہ جو شخص عمرہ کا ارادہ کرے اور وہ حرم مکہ کے اندر ہو تو اس کے لیے یہ واجب ہے کہ وہ حرم سے باہر حل میں جا کر

احرام باندھے کیونکہ نبی کریم ﷺ نے حضرت عائشہ کو یہی حکم دیا تھا۔ [1] حضرت ابن عباس ؓ سے مروی مذکور حدیث میں جو عموم ہے' حضرت عائشہ ؓ کی اس حدیث سے اس کی تخصیص ہو جاتی ہے' یعنی وہ حکم حج کرنے والے کے لیے ہے اور عمرہ کرنے والے کے لیے یہ حکم ہے کہ وہ حدود حرم سے باہر جا کر حل سے احرام باندھے۔ واللہ ولی التوفیق۔

——— شیخ ابن باز ———

اس شخص کا حج جو بوجہ عذر رمضان کے روزے نہ رکھ سکا

سوال رمضان المبارک میں بیماری کی وجہ سے میں روزے نہ رکھ سکا اور میں نے یہ نیت کر لی کہ اگر اللہ تعالیٰ نے مجھے زندگی عطا فرمائی تو کسی دوسرے مہینے میں یہ روزے رکھ لونگا اور اس کے بعد جب حج کا مہینہ آیا تو میں نے اس سال حج کرنے کا ارادہ کر لیا تو کیا میرے لیے یہ جائز ہے کہ میں حج کروں جب کہ میں نے ابھی تک وہ روزے نہیں رکھے؟

جواب اگر آپ نے ابھی تک رمضان کے روزوں کی قضاء نہیں دی تو پھر بھی حج جائز ہے لیکن اگر روزوں کی قضاء کی طاقت ہو تو پھر انہیں اس قدر مؤخر کرنا جائز نہیں کہ اگلا رمضان آ جائے۔

وصلی اللہ علی نبینا محمد و آلہ وصحبہ وسلم۔

——— فتویٰ کمیٹی ———

کعبہ کے بیت اللہ ہونے کی وجہ تسمیہ

سوال کعبہ کو "بیت اللہ الحرام" کے نام سے کیوں موسوم کیا گیا ہے؟

جواب کعبہ کو بیت اللہ کے نام سے اس لیے موسوم کیا گیا ہے کہ یہ اللہ عزوجل کی تعظیم کی جگہ ہے۔ لوگ ہر جگہ سے قصد کر کے یہاں آتے ہیں تاکہ فریضۂ حج ادا کر سکیں۔ دنیا بھر کے لوگ نماز میں منہ بھی اسی کی طرف کرتے ہیں تاکہ صحت نماز کی شرطوں میں سے ایک اہم شرط کو پورا کر سکیں کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ وَمِنْ حَيْثُ خَرَجْتَ فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ۚ وَحَيْثُ مَا كُنتُمْ فَوَلُّوا وُجُوهَكُمْ شَطْرَهُ ﴾

(البقرة۲/ ۱۵۰)

"اور (اے پیغمبر!) جہاں سے نکلیں مسجد محترم کی طرف منہ (کر کے نماز پڑھا) کریں اور مسلمانوں تم جہاں ہوا کرو (مسجد) کی طرف رخ کیا کرو۔"

اس گھر کی تشریف' تعظیم اور تکریم کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے اپنے نام کی طرف نسبت کی ہے۔ اللہ تعالیٰ کے پاک نام کی طرف جو چیزیں مضاف ہیں ان کی دو قسمیں ہیں (۱) یا تو وہ صفات باری تعالیٰ ہیں مثلاً سمع' بصر' علم' قدرت اور کلام اور (۲) یا وہ اللہ تعالیٰ کی مخلوقات ہیں اور عزت کی وجہ سے انہیں اللہ کے پاک نام کی طرف منسوب کیا گیا ہے مثلاً ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ وَطَهِّرْ بَيْتِيَ لِلطَّائِفِينَ ﴾ (الحج ۲۲/ ۲۶)

---

[1] صحیح بخاری' باب کیف تھل الحائض و النفساء' حدیث: 1556 و صحیح مسلم' الحج' حدیث: 1211۔

"اور میرے گھر کو طواف کرنے والوں کے لیے پاک (صاف رکھا) کرو۔"

شیخ ابن عثیمین

مکہ مکرمہ میں برائی کا گناہ زیادہ ہونا

سوال کیا مکہ مکرمہ میں' دوسری جگہ کی نسبت برائی کا گناہ بھی کئی گنا زیادہ ہوتا ہے' جس طرح نیکی کا ثواب کئی گناہ زیادہ ہوتا ہے اور یہ کیوں؟

جواب ادلۂ شرعیہ سے معلوم ہوتا ہے کہ افضل زمان و مکان مثلاً رمضان' عشرہ ذی الحجہ اور حرمین شریفین میں نیکیوں کا ثواب زیادہ ہوتا ہے' لہٰذا مکہ مکرمہ میں بلاشبہ نیکیوں کا ثواب کئی گنا زیادہ ہوتا ہے۔

حدیث صحیح میں ہے' نبی کریم ﷺ نے فرمایا:

«صَلَاةٌ فِي مَسْجِدِي هٰذَا خَيْرٌ مِّنْ اَلْفِ صَلَاةٍ فِي مَاسِوَاهُ إِلاَّ الْمَسْجِدَ الْحَرَامَ، وَصَلَاةٌ فِي الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ خَيْرٌ مِّنْ مِّائَةِ صَلَاةٍ فِي مَسْجِدِي»(مسند أحمد: ٤/ ٥ وصحيح ابن حبان، ح: ١٠٢٧ واللفظ للبيهقي في السنن الكبرى ٥/ ٢٤٦ وأصله متفق عليه من حديث أبي هريرة)

"میری اس مسجد میں نماز دیگر مسجدوں کی ایک ہزار نماز سے بہتر ہے ہاں البتہ مسجد حرام میں ایک نماز میری اس مسجد کی ایک سو نماز سے بہتر ہے۔"

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ مسجد حرام میں ایک نماز کا ثواب ایک لاکھ نمازوں کے بقدر اور مسجد نبوی میں ایک نماز کا ثواب ہزار نماز کے بقدر ملتا ہے' اسی طرح دیگر اعمال صالحہ کا ثواب بھی یہاں زیادہ ملتا ہے لیکن ان کے بارے میں کوئی حد مذکور نہیں ہے کہ کس قدر زیادہ ملتا ہے بلکہ یہ حد صرف نماز کے بارے میں ہے' دیگر اعمال مثلاً روزہ' اذکار' قراءت قرآن اور صدقات وغیرہ کے بارے میں مجھے کوئی نص معلوم نہیں کہ ان کا کس قدر زیادہ ثواب ملتا ہے۔ ہاں البتہ اتنی بات یقینی ہے کہ یہاں اعمال صالحہ کا ثواب زیادہ ملتا ہے۔ اور وہ حدیث جس میں یہ ذکر کیا گیا ہے:

«مَنْ صَامَ فِي مَكَّةَ كَتَبَ اللهُ لَهُ مِائَةَ أَلْفِ رَمَضَانَ»(سنن ابن ماجه، الأضاحي، باب صوم شهر رمضان بمكة، ح: ٣١١٧)

"جو شخص مکہ میں روزہ رکھے تو اللہ تعالیٰ اس کے لیے ایک لاکھ رمضان کا ثواب لکھ دیتا ہے۔"

تو یہ حدیث اہل علم کے نزدیک ضعیف ہے۔

حاصل کلام یہ ہے کہ بلاشبہ مکہ مکرمہ میں نیکیوں کا ثواب تو زیادہ ملتا ہے۔ لیکن کسی نص سے اس اضافہ کی مقدار کا تعین ثابت نہیں' ہاں البتہ صرف نماز کے بارے میں یہ ثابت ہے کہ یہاں ایک نماز کا ثواب ایک لاکھ نماز کے برابر ملتا ہے جیسا کہ قبل ازیں بیان کیا جا چکا ہے۔

برائیوں کے بارے میں محقق اہل علم کی یہ رائے ہے کہ ان کا گناہ عدد کے اعتبار سے تو زیادہ نہیں ہوتا' ہاں البتہ کیفیت کے اعتبار سے ضرور زیادہ ہوتا ہے کیونکہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿مَن جَآءَ بِٱلْحَسَنَةِ فَلَهُۥ عَشْرُ أَمْثَالِهَا ۖ وَمَن جَآءَ بِٱلسَّيِّئَةِ فَلَا يُجْزَىٰٓ إِلَّا مِثْلَهَا﴾ (الأنعام٦/ ١٦٠)

"جو کوئی (اللہ کے حضور) نیکی لے کر آئے گا اس کو ویسی دس نیکیاں ملیں گی اور جو کوئی برائی لائے گا اسے سزا ویسی ہی ملے گی۔"

برائیوں کا گناہ عدد کے اعتبار سے زیادہ نہیں ہوتا خواہ ان کا ارتکاب رمضان میں کیا جائے یا حرم میں۔ ایک برائی کو ہمیشہ ایک ہی قرار دیا جاتا ہے اور یہ اللہ سبحانہ و تعالیٰ کا اپنے بندوں پر فضل و احسان ہے۔

ہاں البتہ جو برائی حرم میں یا رمضان میں یا عشرہ ذی الحجہ میں کی جائے اس کا گناہ یقیناً زیادہ ہے یعنی مکہ میں کی جانے والی برائی کا گناہ جدہ اور طائف وغیرہ میں کی جانے والی برائی سے زیاہ ہو گا' اسی طرح رمضان اور عشرۂ ذی الحجہ میں کی جانے والی برائی کا گناہ رجب اور شعبان وغیرہ میں کی جانے والی برائی سے زیادہ ہو گا لیکن یہ اضافہ کیفیت کے اعتبار سے ہے عدد کے اعتبار سے نہیں جب کہ نیکیوں کے ثواب میں اضافہ اللہ سبحانہ و تعالیٰ کے فضل سے کیفیت اور عدد دونوں اعتبار سے ہوتا ہے۔

حرم میں برائی کے ارتکاب کے شدید ہونے پر یہ ارشاد باری تعالیٰ دلالت کناں ہے:

﴿ وَمَن يُرِدْ فِيهِ بِإِلْحَادٍۭ بِظُلْمٍ نُّذِقْهُ مِنْ عَذَابٍ أَلِيمٍ ﴿٢٥﴾ ﴾ (الحج٢٢/ ٢٥)

"اور جو اس میں شرارت سے کجروی (و کفر) کرنا چاہے اس کو ہم درد دینے والے عذاب کا مزہ چکھائیں گے۔"

اس آیت سے معلوم ہوا کہ حرم میں برائی کا ارادہ کرنے پر بھی وعید ہے اور اگر حرم میں الحاد کے ارادہ پر عذاب الیم کی وعید ہے تو جو یہاں الحاد اور سیئات و منکرات کا ارتکاب کرے تو اس کا گناہ یقیناً محض ارادہ کرنے والے سے زیادہ ہو گا' لہٰذا معلوم ہوا کہ حرم میں برائی کا ارتکاب بے حد خطرناک ہے۔

الحاد کا لفظ عام ہے اور یہ ہر باطل کی طرف میلان کو شامل ہے خواہ اس کا تعلق عقیدہ سے ہو یا کسی اور بات سے۔ یہی وجہ ہے کہ ﴿ وَمَن يُرِدْ فِيهِ بِإِلْحَادٍۭ بِظُلْمٍ ﴾ (الحج' 25/22) میں الحاد کا لفظ نکرہ استعمال ہوا یعنی خواہ جس الحاد کا بھی ارادہ کیا جائے اور الحاد کے معنی حق سے روگردانی کے ہیں اور یہ روگردانی عقیدہ میں بھی ہو سکتی ہے' لہٰذا جو کوئی یہاں کفر اختیار کرے اس کا گناہ اعظم اور اس کا الحاد بہت بڑا ہو گا۔ حق سے اس روگردانی کا تعلق دیگر برائیوں مثلاً شراب نوشی' بدکاری اور ماں باپ کی نافرمانی سے بھی ہو سکتا ہے' تو جو شخص ان میں سے کسی ایک کا ارتکاب کرے تو اس کی سزا کفر کی نسبت کم ہو گی۔

الحاد کی نوعیت اگر انسانوں پر ظلم کی ہے یعنی اگر یہاں کوئی قتل کرتا ہے یا مارتا ہے یا مال چھینتا ہے یا گالی وغیرہ دیتا ہے تو یہ بھی بے شک الحاد اور ظلم ہے اور اس کی سزا بھی بے حد خطرناک ہے لیکن وہ الحاد جو کفر باللہ اور دائرۂ اسلام سے خروج کی شکل میں ہے وہ دیگر تمام برائیوں کی نسبت بدترین صورت ہے جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ إِنَّ ٱلشِّرْكَ لَظُلْمٌ عَظِيمٌ ﴿١٣﴾ ﴾ (لقمان٣١/ ١٣)

"بے شک شرک تو بڑا (بھاری) ظلم ہے۔" واللہ اعلم۔

شیخ ابن باز

حرم کے کبوتروں کی کوئی خصوصیت نہیں

ایک حاجی کا کہنا ہے کہ جب مدینہ منورہ کے کسی کبوتر کی موت کا وقت قریب آتا ہے تو وہ مکہ مکرمہ آ جاتا ہے اور

کعبہ مشرفہ کے اوپر چکر لگاتا ہے گویا طواف وداع کر رہا ہو اور پھر کچھ میلوں کی مسافت تک اڑنے کے بعد مر جاتا ہے' کیا یہ بات صحیح ہے یا نہیں؟

جواب مدینہ اور مکہ کے کبوتروں کی دوسرے مقامات کے کبوتروں کی نسبت کوئی خصوصیت نہیں' سوائے اس کے کہ کسی کیلئے ان کا شکار کرنا یا انہیں بھگانا جائز نہیں' خواہ اس نے حج یا عمرہ کا احرام باندھا ہو یا نہ باندھا ہو اور اگر کوئی حرمین شریفین سے نکل جائے تو پھر اس کے لیے ان کا شکار حلال ہے بشرطیکہ وہ یہ شکار محرم کے لیے نہ کرے کیونکہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ يَٰٓأَيُّهَا ٱلَّذِينَ ءَامَنُوا۟ لَا تَقْتُلُوا۟ ٱلصَّيْدَ وَأَنتُمْ حُرُمٌ ﴾ (المائدۃ: ٥/ ٩٥)

"اے مومنو! جب تم احرام کی حالت میں ہو تو شکار نہ مارنا۔"

اور نبی ﷺ کے اس ارشاد کے عموم کا بھی یہی تقاضا ہے:

«إِنَّ اللهَ حَرَّمَ مَكَّةَ فَلَمْ تَحِلَّ لأَحَدٍ قَبْلِي، وَلاَ تَحِلُّ لأَحَدٍ بَعْدِي، وَإِنَّمَا أُحِلَّتْ لِي سَاعَةً مِّنْ نَّهَارٍ لاَ يُخْتَلَى خَلاَهَا، وَلاَ يُعْضَدُ شَجَرُهَا، وَلاَ يُنَفَّرُ صَيْدُهَا»(صحيح البخاري، جزاء الصيد، باب لا ينفر صيد الحرم، ح:١٨٣٣)

"بے شک اللہ تعالیٰ نے مکہ کو حرم قرار دیا ہے' مجھ سے پہلے یہ کسی کے لیے حلال نہیں تھا اور نہ میرے بعد کسی کے لیے حلال ہو گا۔ میرے لیے بھی دن کی صرف ایک گھڑی میں اسے حلال قرار دیا گیا تھا' نہ اس کے گھاس کو کاٹا جائے اور نہ ہی اس کے درخت کو چھانٹا یا کاٹا جائے اور نہ اس کے شکار کو بھگایا جائے۔"

نیز آپ ﷺ کا ارشاد گرامی ہے:

«إِنَّ إِبْرَاهِيمَ حَرَّمَ مَكَّةَ، وَإِنِّي حَرَّمْتُ الْمَدِينَةَ مَا بَيْنَ لاَبَتَيْهَا، لاَ يُقْطَعُ عِضَاهُهَا، وَلاَ يُصَادُ صَيْدُهَا»(صحيح مسلم، الحج، باب فضل المدينة ... الخ، ح:١٣٦٢)

"بے شک ابراہیم علیہ السلام نے مکہ کو حرم قرار دیا تھا اور میں مدینہ کی دونوں سرحدوں کے درمیان کو حرم قرار دیتا ہوں' اس کے کانٹے دار درخت کو نہ کاٹا جائے اور نہ اس کے جانوروں کا شکار کیا جائے۔"

جو شخص یہ دعویٰ کرے کہ جب مدینہ منورہ کے کسی کبوتر کی موت کا وقت قریب آتا ہے تو وہ اڑ کر مکہ چلا جاتا ہے اور کعبہ کی فضا میں چکر لگاتا ہے تو وہ جاہل ہے۔ اس نے ایک ایسی بات کا دعویٰ کیا ہے جو قطعاً صحیح نہیں ہے کیونکہ موت کا علم اللہ تعالیٰ کی ذات گرامی کے سوا اور کسی کو نہیں ہے' ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ وَمَا تَدْرِى نَفْسٌۢ بِأَىِّ أَرْضٍ تَمُوتُ ﴾ (لقمان٣١/ ٣٤)

"اور کوئی نفس نہیں جانتا ہے کہ کس سرزمین میں اسے موت آئے گی۔"

کعبہ کا طواف وداع تو اس کے لیے ہے جو حج یا عمرہ کرے۔ یہ دعویٰ کرنا کہ کبوتر کو موت کے وقت کا علم ہو جاتا ہے' لہٰذا وہ کعبہ کے اوپر اڑ کر طواف وداع کرتا ہے یہ ایک بالکل جھوٹا دعویٰ ہے' اس کی جرأت کوئی جاہل شخص ہی کر سکتا ہے جو اللہ تعالیٰ اور اس کے بندوں کے بارے میں افتراء پرداز ہے۔ واللہ المستعان۔ وصلی اللہ علی نبینا محمد و آلہ وصحبہ وسلم۔

——— فتویٰ کمیٹی ———

مکہ کے لقطہ کو ملکیت میں نہ لیا جائے

سوال کیا یہ جائز ہے کہ مکہ مکرمہ میں گری ہوئی چیز کو لوں اور جس علاقے میں میں رہتا ہوں وہاں جا کر اس کے بارے میں اعلان کروں؟ یا یہ واجب ہے کہ اس کے بارے میں مکہ مکرمہ ہی کی مسجدوں کے دروازوں اور بازاروں وغیرہ میں اعلان کروں؟

جواب مکہ مکرمہ کے لقطہ کے بارے میں بطور خاص یہ حکم ہے کہ اسے اٹھانا کسی کے لیے بھی حلال نہیں' سوائے اس شخص کے جو ہمیشہ اس کا اعلان کرتا رہے یا اس حاکم کے سپرد کر دے جو اس قسم کے اموال کو وصول کرتا ہو کیونکہ نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے:

«لاَ تَحِلُّ لُقْطَتُهَا إِلاَّ لِمُنْشِدٍ»(صحيح البخاري، اللقطة، باب كيف تعرف لقطة أهل مكة؟، ح: ٢٤٣٣)

''مکہ کے لقطہ کو سوائے اعلان کرنے والے کے اور کسی کے لیے اٹھانا حلال نہیں ہے۔''

اس میں حکمت یہ ہے کہ اگر گری ہوئی چیزوں کو انہی کی جگہ پڑا رہنے دیا جائے تو ہو سکتا ہے کہ ان کے اصل مالک وہاں آکر انہیں خود ہی اٹھالیں' لہٰذا ہم اس بھائی سے یہ کہیں گے کہ واجب ہے کہ آپ اس کا مکہ مکرمہ اس کی جگہ اور اس کے گردوپیش میں مسجدوں کے دروازوں اور اجتماعات میں اعلان کریں یا پھر اسے ان حکام کے سپرد کر دیں' جن کی لقطوں وغیرہ کے سلسلہ میں سرکاری ڈیوٹی ہے۔

——— شیخ ابن عثیمین ———

زیارت کے احکام

مسجد نبوی کی زیارت اور اس کے لیے سفر

سوال ایک شخص مکہ میں ہے اور وہ مدینہ منورہ میں مسجد نبوی کی زیارت کے لیے جانا چاہتا ہے تو کیا یہ اس کے لیے جائز ہے؟

جواب مسلمان کے لیے یہ جائز' بلکہ مستحب ہے کہ وہ مسجد نبوی میں نماز ادا کرنے کے لیے مدینہ کا سفر کرے کیونکہ مسجد نبوی میں ایک نماز کا ثواب بیت اللہ شریف کے علاوہ باقی تمام مساجد میں (ادا کی گئی) ایک ہزار نماز کے برابر ہے اور اگر آدمی مکہ میں ہو تو پھر مسجد نبوی میں نماز کے لیے سفر کے بجائے مسجد حرام میں نماز پڑھنا افضل ہے کیونکہ مسجد حرام کی ایک نماز دوسری مسجدوں کی ایک لاکھ نماز کے برابر ہے۔ لیکن محض نبی کریم ﷺ کی قبر کی زیارت یا مدینہ کی دوسری قبروں کی زیارت کی نیت سے سفر کرنا جائز نہیں کیونکہ نبی ﷺ سے یہ ثابت ہے کہ آپ نے فرمایا:

«لاَ تُشَدُّ الرِّحَالُ إِلاَّ إِلٰى ثَلاَثَةِ مَسَاجِدَ: الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ وَمَسْجِدِي هٰذَا وَالْمَسْجِدِ

الأَقْصٰى»(صحيح البخاري، فضل الصلاة في مسجد مكة والمدينة، باب فضل الصلاة في مسجد ... الخ، ح:١١٨٩ وصحيح مسلم، الحج، باب فضل المساجد الثلاثة، ح:١٣٩٧ ومسند أحمد:٦/٧ واللفظ له)

"تین مسجدوں کے سوا اور کسی کے لیے سفر اختیار نہ کیا جائے (اور وہ تین یہ ہیں) مسجد حرام' میری یہ مسجد (مسجد نبوی) اور مسجد اقصیٰ (بیت المقدس۔)" وصلى الله على نبينا محمد وآله وصحبه وسلم۔

—— فتویٰ کمیٹی ——

زیارت مدینہ کا عمرہ سے تعلق

سوال میں ماہ رمضان میں عمرہ کی نیت سے مکہ مکرمہ میں گیا لیکن مکہ میں ایک دن کے قیام کے بعد ہی بیمار ہو گیا جس کی وجہ سے عمرہ کے شعائر کو مکمل نہ کر سکا یعنی میں نے کعبہ شریف کے گرد سات چکر لگا کر طواف تو کر لیا اور صفا و مروہ کی سعی بھی کر لی لیکن اس بیماری کی وجہ سے حرم رسول ﷺ کی زیارت کے لیے مدینہ منورہ نہ جا سکا اور اپنے شہر میں واپس لوٹ آیا' سوال یہ ہے کہ کیا میرا یہ عمرہ صحیح ہے؟

جواب جب طواف اور سعی کر لی جائے اور بال کٹوا دیئے جائیں تو یہ عمرہ کامل ہے' اس کا اجروثواب ملے گا۔ زیارت مدینہ' عمرہ کی تکمیل کے لیے شرط نہیں ہے اور نہ اس کا عمرہ کے ساتھ کوئی تعلق ہے۔ ہاں البتہ مسجد نبوی کی زیارت سنت ہے' لہٰذا جب ممکن ہو مسلمان کو مسجد نبوی کی زیارت ضرور کرنی چاہیے۔

—— شیخ ابن عثیمین ——

مسجد نبوی کی زیارت واجب نہیں ہے

سوال بعض حاجیوں کا یہ اعتقاد ہے کہ اگر مسجد نبوی کی زیارت نہ کی جائے تو حج ناقص ہے' کیا یہ بات صحیح ہے؟

جواب مسجد نبوی کی زیارت سنت ہے' واجب نہیں اور اس کا حج سے کوئی تعلق نہیں بلکہ مسجد نبوی کی زیارت تو سارا سال مسنون ہے اور یہ حج کے وقت کے ساتھ خاص نہیں ہے۔ نبی کریم ﷺ نے فرمایا:

«لاَ تُشَدُّ الرِّحَالُ إِلاَّ إِلٰى ثَلاَثَةِ مَسَاجِدَ: الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ، وَمَسْجِدِي هٰذَا وَالْمَسْجِدِ الأَقْصٰى»(صحيح البخاري، فضل الصلاة في مسجد مكة، باب فضل الصلاة في مسجد ... الخ، ح:١١٨٩ وصحيح مسلم، الحج، باب فضل المساجد الثلاثة،ح:١٣٩٧ ومسند أحمد:٦/٧ واللفظ له)

"تین کے سوا اور کسی مسجد کی طرف کجاوے نہ کسے جائیں (اور وہ تین مسجدیں یہ ہیں) مسجد حرام' (بیت اللہ) میری یہ مسجد (مسجد نبوی) اور مسجد اقصیٰ (بیت المقدس)۔"

جب کوئی شخص مسجد نبوی کی زیارت کرے تو اس کے لیے مشروع یہ ہے کہ روضہ میں دو رکعتیں پڑھے اور نبی ﷺ اور آپ کے دونوں ساتھیوں حضرت ابوبکر اور حضرت عمر رضی اللہ عنہما کی خدمت میں سلام عرض کرے' اسی طرح بقیع کی زیارت بھی مسنون ہے تاکہ وہاں مدفون شہداء حضرات صحابہ کرام اور دیگر مسلمانوں کی خدمت میں سلام پیش کیا جائے اور ان کے

لیے دعا کی جائے جیسا کہ نبی کریم ﷺ بھی بقیع کی زیارت کے لیے تشریف لے جاتے اور صحابہ کرام کو یہ تعلیم فرماتے کہ جب قبروں کی زیارت کریں تو یہ دعا پڑھیں:

«اَلسَّلَامُ عَلَيْكُمْ، أَهْلَ الدِّيَارِ مِنَ الْمُؤْمِنِينَ وَالْمُسْلِمِينَ، وَإِنَّا إِنْ شَاءَ اللهُ بِكُمْ لَاحِقُونَ، نَسْأَلُ اللهَ لَنَا وَلَكُمُ الْعَافِيَةَ»(صحيح مسلم، الجنائز، باب ما يقال عند دخول القبور والدعاء لأهلها، ح:٩٧٥ وسنن ابن ماجه، الجنائز، باب ما جاء في ما يقال إذا دخل المقابر، ح:١٥٤٧ واللفظ له)

”اے اس بستی کے رہنے والے مومنو! اور مسلمانو! تم پر سلام! بے شک ہم بھی ان شاء اللہ تم سے عنقریب ملنے والے ہیں۔ ہم اللہ تعالیٰ سے اپنے اور تمہارے لیے عافیت کی دعا کرتے ہیں“

ایک روایت میں ہے کہ نبی ﷺ بقیع کی زیارت کے وقت یہ دعا پڑھا کرتے تھے:

«يَرْحَمُ اللهُ الْمُسْتَقْدِمِينَ مِنَّا وَالْمُسْتَأْخِرِينَ، اَللّٰهُمَّ اغْفِرْ لِأَهْلِ بَقِيعِ الْغَرْقَدِ»(صحيح مسلم، الجنائز، باب ما يقال عند دخول القبور والدعاء لأهلها، ح:٩٧٤، ٩٧٥)

”اللہ تعالیٰ ہم میں سے پہلے جانے والوں اور پیچھے آنے والوں پر رحم فرمائے۔ اے اللہ! تو اہل بقیع الغرقد کو معاف فرما دے۔“

مسجد نبوی کی زیارت کرنے والے کے لیے یہ بھی مشروع ہے کہ وہ مسجد قباء کی بھی زیارت کرے اور اس میں دو رکعتیں پڑھے کیونکہ نبی کریم ﷺ ہر ہفتہ کے دن اس مسجد کی زیارت کرتے اور اس میں دو رکعتیں پڑھا کرتے تھے اور آپ نے ارشاد فرمایا ہے:

«مَنْ تَطَهَّرَ فِي بَيْتِهِ، ثُمَّ أَتَى مَسْجِدَ قُبَاءٍ، فَصَلَّى فِيهِ صَلَاةً، كَانَ لَهُ كَأَجْرِ عُمْرَةٍ»(سنن ابن ماجه، إقامة الصلوات، باب ما جاء في الصلاة في مسجد قباء، ح:١٤١٢)

”جو شخص اپنے گھر میں وضو کرے اور پھر مسجد قباء میں آکر نماز پڑھے تو اسے عمرہ جتنا ثواب ملتا ہے۔“

یہ ہیں مدینہ کے وہ مقامات جن کی زیارت کی جاتی ہے' ان کے علاوہ باقی مقامات مثلاً مساجد سبعہ' مسجد قبلتین اور دیگر مقامات وغیرہ جن کی زیارت کے بارے میں مناسک حج پر لکھنے والے بعض مؤلفین نے لکھا ہے تو یہ بے اصل اور بے دلیل ہے۔ مرد مومن کے لیے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے مشروع یہ ہے کہ وہ سنت پر عمل کرے اور بدعت سے بچے۔

——— شیخ ابن باز ———

روضۂ رسول کی زیارت کے بارے احادیث کا حکم

سوال امید ہے درج ذیل احادیث کی صحت کے بارے میں رہنمائی فرمائیں گے۔

«مَنْ حَجَّ الْبَيْتَ وَلَمْ يَزُرْنِي فَقَدْ جَفَانِي»

”جو شخص بیت اللہ کا حج کرے اور میری زیارت نہ کرے تو اس نے جفا سے کام لیا۔“

«مَنْ زَارَنِي بَعْدَ مَوْتِي فَكَأَنَّمَا زَارَنِي فِي حَيَاتِي»

"جو شخص میری موت کے بعد میری زیارت کرے' اس نے گویا میری زندگی ہی میں میری زیارت کی۔"

«مَنْ زَارَنِي بِالْمَدِينَةِ مُحْتَسِبًا كُنْتُ لَهُ شَفِيعًا شَهِيدًا يَوْمَ الْقِيَامَةِ»

"جو شخص حصول ثواب کی نیت سے مدینہ میں میری زیارت کرے تو میں قیامت کے دن اس کی شفاعت کروں گا اور اس کے بارے میں گواہی دوں گا۔"

یہ احادیث بعض کتابوں میں مذکور ہیں' لہٰذا ان کے بارے میں کئی اشکال ہیں اور ان کے بارے میں دو رائے ہیں' جن میں سے ایک رائے کے مطابق یہ احادیث صحیح ہیں اور دوسری کے مطابق صحیح نہیں ہیں؟

جواب ان میں پہلی حدیث کو ابن عدی اور دار قطنی نے بطریق عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نبی کریم ﷺ سے ان الفاظ میں روایت کیا ہے:

«مَنْ حَجَّ الْبَيْتَ وَلَمْ يَزُرْنِيْ فَقَدْ جَفَانِيْ»(الكامل لابن عدي: ٧/ ٢٤٨٠ والسلسلة الضعيفة، ح: ٤٥)

"جس نے حج کیا اور میری زیارت نہ کی تو اس نے مجھ سے جفا کی۔"

یہ حدیث ضعیف ہے بلکہ اس کے بارے میں تو یہ کہا گیا ہے کہ یہ موضوع یعنی جھوٹی اور من گھڑت روایت ہے کیونکہ اس کی سند میں ایک راوی محمد بن نعمان بن شبل باہلی ہے' جو اسے اپنے باپ سے روایت کرتا ہے اور یہ دونوں راوی بے حد ضعیف ہیں۔ امام دار قطنی فرماتے ہیں کہ "اس حدیث میں طعن نعمان کی وجہ سے نہیں بلکہ ابن نعمان کی وجہ سے ہے" اس حدیث کو بزار نے بھی روایت کیا ہے اور اس کی سند میں ابراہیم غفاری ہے اور وہ بھی ضعیف ہے' نیز بیہقی نے اسے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے حوالے سے روایت کیا ہے اور فرمایا ہے کہ اس کی سند مجہول ہے۔

دوسری حدیث کو امام دار قطنی نے عن رجل من آل حاطب عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم کی سند کے ساتھ انہی الفاظ میں روایت کیا ہے [1] لیکن اس کی سند میں ایک مجہول آدمی ہے۔ امام ابویعلیٰ نے اسے "مسند" میں اور ابن عدی نے "کامل" میں بھی روایت کیا ہے اور اس کی سند میں حفص بن داود ہے جو کہ ضعیف الحدیث ہے۔

تیسری حدیث کو ابن ابی فدیک نے سلیمان بن یزید سے روایت کیا ہے' [2] سلیمان بن یزید کعبی نے جو کہ ضعیف الحدیث ہے' اسے بطریق عمر روایت کیا ہے اور اس کی سند میں ایک مجہول راوی بھی ہے۔ الغرض وہ تمام احادیث جن میں خاص طور پر نبی اکرم ﷺ کی قبر کی زیارت کا ذکر ہے' وہ تمام کی تمام ضعیف ہیں بلکہ ان کے بارے میں کہا گیا ہے کہ یہ موضوع ہیں۔

ہاں البتہ ایسی صحیح احادیث ضرور ہیں جن میں یہ ذکر ہے کہ قبر کی زیارت عبرت و نصیحت اور میت کی دعا کے لیے کی جائے' لہٰذا جو شخص قبروں یا رسول اللہ ﷺ کی قبر کی شرعی زیارت کرنا چاہے یعنی عبرت و نصیحت کے لیے' میت کے لیے دعا کے لیے' نبی کریم ﷺ کی ذات گرامی پر درود بھیجنے کے لیے' صاحبین کے لیے یہ دعا کرنے کے لیے کہ اللہ تعالیٰ ان سے راضی ہو اور وہ اللہ سے راضی ہوں اور پھر اس مقصد کے لیے نہ شد رحال کرے (یعنی نہ تو کجاوے کسے) اور نہ سفر کرے تو یہ زیارت مشروع ہے اور اس میں اجر و ثواب کی امید ہے۔

---

[1] سنن دار قطنی 277/2' حدیث: 2668

[2] تاریخ جرجان ص 220' 434

جو شخص اس مقصد کیلئے شد رحال کرے یا باقاعدہ سفر اختیار کرے تو یہ جائز نہیں کیونکہ نبی کریم ﷺ کا ارشاد گرامی ہے:

«لاَ تُشَدُّ الرِّحَالُ إِلاَّ إِلٰى ثَلاَثَةِ مَسَاجِدَ: الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ، وَمَسْجِدِي هٰذَا، وَالْمَسْجِدِ الأَقْصٰى»(صحيح البخاري، فضل الصلاة في مسجد مكة، باب فضل الصلاة في مسجد... الخ، ح:١١٨٩ وصحيح مسلم، الحج، باب فضل المساجد الثلاثة، ح:١٣٩٧ ومسند أحمد:٦/٧ واللفظ له)

”تین مسجدوں کے سوا اور کسی کی طرف شد رحال نہ کیا جائے (اور وہ تین مسجدیں یہ ہیں) مسجد حرام‘ میری یہ مسجد اور مسجد اقصیٰ۔“

باقی رہی یہ حدیث:

«لاَ تَتَّخِذُوا قَبْرِي عِيدًا وَّلاَ بُيُوتَكُمْ قُبُورًا (وَّصَلُّوا عَلَيَّ) فَإِنَّ تَسْلِيمَكُمْ يَبْلُغُنِي أَيْنَمَا كُنْتُمْ»(مسند أبي يعلى، ح:٤٦٩ من رواية علي بن أبي طالب رضي الله عنه وما بين القوسين لفظ أبي داود، من حديث أبي هريرة رضي الله عنه، في المناسك، باب زيارة القبور، ح:٢٠٤٢)

”میری قبر کو میلہ اور اپنے گھروں کو قبرستان نہ بنانا اور مجھ پر درود بھیجتے رہنا‘ تم جہاں کہیں بھی ہو گے تمہارا سلام مجھے پہنچ جائے گا۔“ اسے ضیاء مقدسی نے ”المختارہ“ میں روایت کیا ہے۔ واللہ اعلم۔

——— شیخ ابن باز ———

نفلی حج

نفل حج یا مجاہدین کے ساتھ امداد

سوال جس شخص نے فریضۂ حج ادا کیا ہو اور وہ دوبارہ حج کر سکتا ہو تو کیا اس کے لیے یہ جائز ہے کہ دوبارہ حج کے اخراجات کو افغانستان کے مسلمان مجاہدین پر خرچ کر دے؟ کیونکہ دوبارہ حج تو نفل ہے اور جہاد کے لیے خرچ کرنا فرض‘ رہنمائی فرمائیں۔ جزاکم اللہ عن المسلمین خیرا الجزاء۔

جواب جس شخص نے فریضۂ حج ادا کیا ہو تو اس کے لیے افضل یہ ہے کہ دوسرے حج کے نفقہ کو مجاہدین فی سبیل اللہ مثلاً مجاہدین افغان یا ان میں سے پاکستان میں پناہ گزین مہاجرین پر خرچ کر دے کیونکہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا جب کہ آپ سے یہ سوال کیا گیا کہ ”کون سا عمل افضل ہے؟“ تو آپ نے فرمایا:

«إِيمَانٌ بِاللهِ وَرَسُولِهِ، قِيلَ ثُمَّ أَيٌّ؟ قَالَ: اَلْجِهَادُ فِي سَبِيلِ اللهِ، قِيلَ ثُمَّ أَيٌّ؟ قَالَ: حَجٌّ مَبْرُورٌ»(صحيح البخاري، الإيمان، باب من قال إن الإيمان هو العمل، ح:٢٦ وصحيح مسلم، الإيمان، باب بيان كون الإيمان بالله تعالى أفضل الأعمال، ح:٨٣)

”اللہ اور اس کے رسول پر ایمان“ سائل نے پوچھا اس کے بعد کون سا عمل افضل ہے؟“ تو آپ نے فرمایا ”جہاد فی سبیل اللہ“ سائل نے پوچھا ”اس کے بعد کون سا“ تو آپ نے فرمایا ”حج مبرور“۔

اس حدیث میں حج کو جہاد کے بعد ذکر کیا گیا ہے کیونکہ اس سے مراد نفل حج ہے جب کہ فرض حج تو اسلام کے ارکان میں سے ایک رکن ہے بشرطیکہ اس کی استطاعت ہو اور صحیح بخاری و مسلم میں نبی اکرم ﷺ کی یہ حدیث موجود ہے

«مَنْ جَهَّزَ غَازِيًا فِي سَبِيلِ اللهِ فَقَدْ غَزَىٰ، وَمَنْ خَلَفَهُ فِي أَهْلِهِ بِخَيْرٍ فَقَدْ غَزَىٰ» (صحيح البخاري، الجهاد، باب فضل من جهز غازيا الخ، ح:٢٨٤٣ وصحيح مسلم، الإمارة، باب فضل إعانة الغازي الخ، ح:١٨٩٥ واللفظ له)

”جس نے راہ الٰہی کے غازی کو تیار کیا اس نے بھی جہاد کیا اور جس نے اچھے طریقے سے اس کے بعد اس کے گھر کی نگہداشت کی اس نے بھی جہاد کیا۔“

اور اس میں کوئی شک نہیں کہ مجاہدین فی سبیل اللہ اس بات کے سخت محتاج ہیں کہ ان کے بھائی ان کی مادی امداد کریں اور مذکورہ بالا دو حدیثوں اور دیگر احادیث سے بھی یہ معلوم ہوتا ہے کہ نفل حج کی نسبت مجاہدین پر خرچ کرنا افضل ہے۔ وباللہ التوفیق۔

——— شیخ ابن باز ———

کیا میں دوبارہ حج کروں یا صدقہ کروں؟

سوال میں نے فریضۂ حج ادا کیا ہے اور اب دوبارہ حج کی بھی استطاعت ہے تو کیا دوبارہ حج کی قیمت کو صدقہ کر دوں یا حج کروں؟

جواب اگر آپ کے پاس مالی استطاعت ہو اور صدقہ بھی کریں اور حج بھی تو یہ افضل ہے۔ اور اگر دونوں کی استطاعت نہ ہو اور آپ کے پاس شدید حاجت مند فقراء ہوں اور ایسی فلاحی سکیمیں ہوں جن میں مال خرچ کرنے کی ضرورت ہو تو ان میں مال خرچ کرنا نفل حج سے افضل ہے۔ اور اگر ایسی کوئی شدید حاجت نہ ہو تو پھر حج کرنا افضل ہے۔

——— شیخ ابن جبرین ———

والد کی طرف سے حج لیکن سفر کا آغاز.........

سوال ایک آدمی نے اس سال اپنے فوت شدہ والد کی طرف سے حج کیا لیکن اس نے سفر کا آغاز اپنے والد کے آبائی وطن سے نہیں کیا تھا' تو وہ یہ پوچھتا ہے' کیا اس کا یہ حج صحیح ہے؟

جواب سائل کے سوال سے بظاہر یوں معلوم ہوتا ہے کہ وہ اپنے والد کی طرف سے حج بدل کر رہا ہے اور اگر امر واقع اسی طرح ہے تو اس حج میں کوئی حرج نہیں خواہ اس نے سفر کا آغاز اپنے والد کے آبائی وطن سے نہ بھی کیا ہو۔

——— فتویٰ کمیٹی ———

مجاہدین کی امداد

سوال میرا اپنے چند دوستوں کے ساتھ اس بات پر جھگڑا ہوا کہ عمرہ افضل ہے یا مجاہدین کی امداد؟ دراصل ہم نے رمضان کے آخر میں عمرہ کی نیت کی' یاد رہے میں اور میرا ایک دوست پہلے بھی کئی بار عمرہ کر چکے ہیں' بالآخر میرا یہ

دوست کہنے لگا کہ وہ عمرہ نہیں کرے گا بلکہ عمرہ پر خرچ ہونے والی اس رقم کو صدقہ کر دے گا یا جہاد فی سبیل اللہ میں خرچ کیلئے افغان مجاہدین کو دے دے گا کیونکہ عمرہ کرنے سے یہ افضل ہے۔ امید ہے آپ رہنمائی فرمائیں گے کیا اس کیلئے یہ افضل ہے کہ عمرہ کرے جبکہ پہلے بھی کئی عمرے کر چکا ہے یا عمرہ کے ان اخراجات کو جہاد فی سبیل اللہ کیلئے افغان مجاہدین کو دے دے؟

جواب جو شخص پہلے فریضۂ حج اور عمرہ ادا کر چکا ہو تو اس کے لیے افضل یہ ہے کہ نفل حج اور عمرہ کے اخراجات کو مجاہدین فی سبیل اللہ مثلاً افغان مجاہدین پر خرچ کر دے کیونکہ شرعی جہاد نفل حج اور عمرہ سے افضل ہے کیونکہ نبی کریم ﷺ سے "جب یہ سوال پوچھا گیا کہ کون سا عمل افضل ہے تو آپ نے فرمایا تھا:

«إِيمَانٌ بِاللهِ وَرَسُولِهِ، قِيلَ ثُمَّ أَيٌّ؟ قَالَ: اَلْجِهَادُ فِي سَبِيلِ اللهِ، قِيلَ ثُمَّ أَيٌّ؟ قَالَ: حَجٌّ مَبْرُورٌ»(صحيح البخاري، الإيمان، باب من قال إن الإيمان هو العمل، ح:٢٦ وصحيح مسلم، الإيمان، باب بيان كون الإيمان بالله تعالى أفضل الأعمال، ح:٨٣)

"اللہ اور اس کے رسول کے ساتھ ایمان" پھر عرض کیا گیا اس کے بعد؟ تو آپ نے فرمایا "جہاد فی سبیل اللہ" عرض کیا گیا پھر کون سا عمل افضل ہے؟ فرمایا "حج مبرور۔"

——— شیخ ابن باز ———

قربانی کے مسائل

قربانی اور ہدی میں فرق

سوال قربانی کا کیا حکم ہے؟ کس پر واجب ہے؟ کیا قربانی اور ہدی میں فرق ہے؟ کیا قربانی حجاج پر بھی واجب ہے یا نہیں؟ رسول اللہ ﷺ نے کیسے، کب اور کہاں قربانی کی تھی؟ امید ہے آپ وضاحت فرمائیں گے کہ رسول اللہ ﷺ کے اس ارشاد سے کیا مراد ہے:

«مَنْ كَانَ لَهُ سَعَةٌ وَلَمْ يُضَحِّ فَلَا يَقْرُبَنَّ مُصَلَّانَا»(سنن ابن ماجه، الأضاحي، باب الأضاحي واجبة أم لا؟، ح:٣١٢٣)

"جس کے پاس استطاعت ہو اور وہ قربانی نہ کرے تو وہ ہماری عید گاہ کے قریب نہ آئے۔" جزاکم اللہ خیراً

جواب اہل علم کے صحیح قول کے مطابق قربانی سنت مؤکدہ ہے۔ جس کے پاس مالی استطاعت ہو اسے قربانی ضرور کرنی چاہیئے کیونکہ یہ عیدالاضحیٰ اور ایام تشریق کی عبادات میں سے بے حد اہم عبادت ہے۔ نبی کریم ﷺ نے مدینہ منورہ میں ہمیشہ قربانی کی ہے۔ آپ ہر سال سفید و سیاہ رنگ کے بڑے بڑے سینگوں والے دو مینڈھوں کی قربانی دیا کرتے تھے جیسا کہ "صحیحین" میں حضرت انس رضی اللہ عنہ کی حدیث سے ثابت ہے۔[1]

قربانی اور ہدی میں فرق یہ ہے کہ تمتع اور قران کی ہدی واجبات حج میں سے ہے کیونکہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿فَمَن تَمَتَّعَ بِٱلْعُمْرَةِ إِلَى ٱلْحَجِّ فَمَا ٱسْتَيْسَرَ مِنَ ٱلْهَدْيِ﴾ (البقرة٢/ ١٩٦)

---

[1] صحیح بخاری، الاضاحی، باب وضع القدم --- الخ، حدیث: 5564 و صحیح مسلم، الاضاحی، حدیث: 1966-

"سو جو (تم میں) حج کے وقت تک عمرے سے فائدہ اٹھانا چاہے تو وہ جیسی قربانی میسر ہو کرے۔"
جب کہ قربانی صحیح قول کے مطابق واجب نہیں ہے کیونکہ کوئی ایسی صحیح اور صریح نص موجود نہیں ہے' جس سے معلوم ہو کہ قربانی واجب ہے۔ ہدی اور قربانی میں ایک فرق یہ بھی ہے کہ ہدی منیٰ اور بقیہ حرم میں ذبح کرنا مشروع ہے جب کہ قربانی ہر جگہ ذبح کی جاسکتی ہے' باقی احکام دونوں کے ایک جیسے ہیں مثلاً ذبح کرنے کے وقت' مطلوبہ شرائط' گوشت کھانے اور صدقہ کرنے وغیرہ کے اعتبار سے دونوں میں کوئی فرق نہیں ہے۔ یہ حدیث:

«مَنْ وَّجَدَ سَعَةً فَلَمْ يُضَحِّ فَلَا يَقْرُبَنَّ مُصَلَّانَا»(مسند أحمد: ٢/ ٣٢١)

"جس کے پاس استطاعت ہو اور وہ قربانی نہ کرے تو وہ ہماری عید گاہ کے قریب نہ آئے۔"
اس کے بارے میں حافظ (ابن حجر رحمہ اللہ) نے "بلوغ المرام" میں لکھا ہے کہ اسے امام احمد اور ابن ماجہ نے روایت کیا اور امام حاکم نے اسے صحیح قرار دیا ہے جب کہ دیگر ائمہ نے کہا ہے کہ صحیح بات یہ ہے کہ یہ حدیث موقوف ہے اور پھر یہ قربانی کے واجب ہونے کی صحیح دلیل بھی نہیں ہے۔ اگر اس کا مرفوع ہونا ثابت ہو بھی تو یہ بھی حدیث سے ثابت ہے کہ آپ نے فرمایا:

«مَنْ أَكَلَ ثُومًا أَوْ بَصَلًا فَلْيَعْتَزِلْ مَسْجِدَنَا»(صحيح البخاري، الأذان، باب ما جاء في الثوم النَّيِّء ... الخ، ح: ٨٥٥)

"جو لہسن یا پیاز کھائے' وہ ہماری مسجد سے دور رہے (قریب نہ آئے)۔"
اہل علم کی رائے میں یہ حدیث لہسن اور پیاز کی حرمت کی موجب نہیں ہے بلکہ اس سے انہوں نے یہ استدلال کیا ہے کہ ان چیزوں کے استعمال کے بعد مسلمانوں کے ساتھ نماز میں شریک ہونا مکروہ ہے کیونکہ ان کی ناگوار بو سے مسلمانوں کو ایذاء پہنچتی ہے۔ واللہ ولی التوفیق۔

——— شیخ ابن باز ———

قربانی کی نیت کرنے والے کے لیے بال کٹوانا

سوال عشرۂ ذوالحجہ میں بال کٹوانے کے بارے میں کیا حکم ہے؟ جب کہ انسان نے قربانی کی نیت کر رکھی ہو اور بال خواہ وہ بھول کر کٹوا دے یا جان بوجھ کر اور عورت جب اس عشرہ میں حیض سے پاک ہو اور اس نے قربانی کی نیت کر رکھی ہو تو کیا وہ اپنے بالوں میں کنگھی کرے یا نہ کرے؟ امید ہے آپ رہنمائی فرمائیں گے۔ جزاكم الله عنا وعن المسلمين أحسن الجزاء

جواب جو شخص قربانی کرنے کا ارادہ رکھتا ہو تو اسے چاہیئے کہ ماہ ذوالحجہ کے آغاز سے لے کر قربانی کرنے تک بال اور ناخن نہ کٹوائے کیونکہ اس حدیث صحیح میں اس کی ممانعت آئی ہے جسے امام مسلم رحمہ اللہ نے "صحیح" میں حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا سے روایت کیا ہے [1] کہ جب حیض اور نفاس والی عورتیں عشرۂ ذوالحجہ میں پاک ہو جائیں اور وہ قربانی کا ارادہ رکھتی ہوں تو انہیں چاہیئے کہ وہ اپنے بال اور ناخن نہ کٹوائیں' جیسا کہ قربانی کا ارادہ رکھنے والے دیگر مسلمان بھی اس موقع پر اپنے جسم کے بال اور ناخن نہیں کٹواتے لیکن انہیں غسل کے وقت بال کھولنے اور کنگھی کرنے میں کوئی حرج نہیں' لیکن جان بوجھ کر بال نہ کاٹیں' بال کھولنے اور کنگھی کرنے کے وقت اگر غیر ارادی طور پر کچھ بال گر جائیں تو اس میں کوئی حرج نہیں۔

[1] صحيح مسلم' الاضاحی' باب نهي من دخل عليه عشر ذي الحجة --- الخ' حديث: 1977-

اسی طرح اگر قربانی کرنے والا کوئی شخص بھول کر یا جہالت کی وجہ سے بال یا ناخن کاٹ لے تو اس پر کوئی کفارہ وغیرہ نہیں کیونکہ اللہ سبحانہ و تعالیٰ نے اس طرح کے اور دیگر امور میں خطاونسیان کو معاف فرما دیا ہے اور جو شخص جان بوجھ کر ایسا کرے تو اسے اللہ سبحانہ و تعالیٰ کے حضور توبہ کرنی چاہیے' ہاں قربانی کرنے والے کے اہل خانہ پر کچھ واجب نہیں ہے' یعنی علماء کے صحیح قول کے مطابق ان کے لیے بال اور ناخن کاٹنے کی ممانعت نہیں ہے کیونکہ یہ حکم قربانی کرنے والے یعنی اپنے مال سے قربانی خریدنے والے ہی کے لیے خاص ہے۔ اسی طرح وکلاء کے لیے بھی یہ حکم نہیں ہے کیونکہ وہ قربانی کرنے والے نہیں ہیں بلکہ قربانی کرنے والے تو ان کے موکل ہیں۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو علم نافع اور اس کے مطابق عمل کی توفیق عطا فرمائے۔

——— شیخ ابن باز ———

اپنے مال سے قربانی کرنے والا بال نہ کٹوائے

سوال عشرۂ ذی الحجہ میں کس شخص کے لیے بال اور ناخن کاٹنے حرام ہیں؟ کیا اس سے مراد جانور کو ذبح کرنے والا ہے یا وہ جس کی طرف سے قربانی کی جا رہی ہو جب کہ وہ زندہ ہو اور قربانی خواہ اس ایک ہی کی طرف سے ہو یا وہ کچھ لوگوں کے ساتھ قربانی میں شریک ہو؟

جواب ماہ ذوالحجہ کے آغاز کے ساتھ ہی جس کے لیے بال اور ناخن کاٹنے حرام ہیں' اس سے مراد وہ شخص ہے جو اپنے مال سے اپنے لیے یا کسی اور کے لیے قربانی کرنا چاہتا ہو کیونکہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا:

«إِذَا رَأَيْتُمْ هِلَالَ ذِي الْحِجَّةِ، وَأَرَادَ أَحَدُكُمْ أَنْ يُضَحِّيَ، فَلْيُمْسِكْ عَنْ شَعْرِهِ وَأَظْفَارِهِ»

(صحيح مسلم، الأضاحي، باب نهي من دخل عليه عشر ذي الحجة ... الخ، ح:١٩٧٧)

"جب تم ذوالحجہ کا چاند دیکھ لو اور تم میں سے کوئی شخص قربانی کا ارادہ کرے تو وہ اپنے بال اور ناخن نہ کاٹے۔"

اس حدیث کو امام مسلم نے اپنی "صحیح" میں بروایت حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا بیان کیا ہے۔ ہاں! جو شخص اس کی طرف سے قربانی کر رہا ہو مثلاً قربانی کرنے والے کی اولاد اور بیوی وغیرہ تو ان کے لیے بال یا ناخن کاٹنا حرام نہیں ہے جب کہ یہ اپنے اور اپنے اہل خانہ کی طرف سے قربانی کر رہا ہو کیونکہ اس کے اہل خانہ قربانی کرنے والے نہیں ہیں' کیونکہ علماء کے صحیح قول کے مطابق قربانی کرنے والا وہ ہے جو اپنے مال سے قربانی کی قیمت ادا کرے۔ اسی طرح اگر کسی کو قربانی کے لیے وکیل مقرر کیا ہو تو اس کے لیے بھی بال اور ناخن کاٹنے میں کوئی حرج نہیں کیونکہ وہ قربانی کرنے والا نہیں ہے۔ واللہ ولی التوفیق۔

——— شیخ ابن باز ———

مشترکہ طور پر قربانی کرنے والے بال نہ کٹوائیں

سوال میں ایک بیوہ عورت ہوں۔ میرے بیٹے اور ایک بیٹی ہے اور ہم سب ایک ہی گھر میں رہتے ہیں۔ ہمارا مال و اسباب بھی ایک ہی ہے کہ شوہر کی وفات کے بعد ہم نے اسے تقسیم نہیں کیا۔ میں ہر سال اپنے ایک بیٹے کو قربانی کا جانور

خریدنے اور ذبح کرنے کے لیے کہہ دیتی ہوں' تو سوال یہ ہے کہ کیا ہم سب کے لیے یا کس کے لیے یہ لازم ہے کہ وہ عشرۂ ذوالحجہ میں بال اور ناخن نہ کاٹے؟

جواب اگر امر واقع اسی طرح ہے جس طرح سوال میں ذکر کیا گیا ہے کہ آپ سب کا مال اور قربانی میں اشتراک ہے تو پھر آپ سب لوگ قربانی کرنے والے شمار ہوں گے۔ لہٰذا ماہ ذوالحجہ کے آغاز کے بعد آپ میں سے کسی کے لیے بھی بال یا ناخن کاٹنا جائز نہیں ہے کیونکہ نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے:

«إِذَا رَأَيْتُمْ هِلاَلَ ذِي الْحِجَّةِ، وَأَرَادَ أَحَدُكُمْ أَنْ يُضَحِّيَ، فَلْيُمْسِكْ عَنْ شَعْرِهِ وَأَظْفَارِهِ»

(صحيح مسلم، الأضاحي، باب نهي من دخل عليه عشر ذي الحجة ... الخ، ح:١٩٧٧)

"جب تم ذوالحجہ کا چاند دیکھ لو اور تم میں سے کوئی شخص قربانی کا ارادہ کرے تو وہ اپنے بال اور ناخن نہ کاٹے۔"

شیخ ابن باز

جب کسی کی طرف سے کوئی دوسرا شخص قربانی کرے ....

سوال ایک شخص کی طرف سے کوئی اور قربانی کرے گا تو کیا ذوالحجہ کے عشرہ کے آغاز کے بعد ان میں سے کسی کے لیے بال وغیرہ کاٹنا جائز ہے؟ کیا ان میں سے کسی ایک کے لیے جائز اور دوسرے کے لیے ناجائز ہیں یا دونوں ہی کے لیے ناجائز ہیں؟ اس شخص کے بارے میں کیا حکم ہے جس کی وہ بکری گم ہو گئی ہو جس کی قربانی کرنے کی اس نے نیت کی تھی' لیکن پھر وہ ایام حج ختم ہو جانے کے بعد مل گئی ہو؟

جواب صحیح حدیث میں آیا ہے:

«إِذَا رَأَيْتُمْ هِلاَلَ ذِي الْحِجَّةِ، وَأَرَادَ أَحَدُكُمْ أَنْ يُضَحِّيَ، فَلْيُمْسِكْ عَنْ شَعْرِهِ وَأَظْفَارِهِ»

(صحيح مسلم، الأضاحي، باب نهي من دخل عليه عشر ذي الحجة ... الخ، ح:١٩٧٧)

"جب تم ذوالحجہ کا چاند دیکھ لو اور تم میں سے کوئی شخص قربانی کا ارادہ کرے تو وہ اپنے بال اور ناخن نہ کاٹے۔"

حدیث میں اس شخص کا ذکر نہیں جس کی طرف سے کوئی اور قربانی کر رہا ہو' لیکن بعض علماء نے ایسے شخص کے لیے بھی یہ مکروہ قرار دیا ہے' ہاں البتہ اگر ان میں سے کوئی شخص بال یا ناخن کاٹ لے تو اس پر کوئی فدیہ نہیں ہے' اس کی قربانی بھی باطل نہ ہو گی' لہٰذا وہ قربانی ترک نہ کرے' اس کی قربانی ان شاء اللہ تعالیٰ مقبول ہو گی۔

جب کوئی شخص قربانی کرنے کا عزم کر لے اور جانور کو خرید لے لیکن جانور گم ہو جائے اور وہ ایام قربانی ختم ہو جانے کے بعد ملے تو اس کا ذبح کرنا لازم نہیں ہے' الّا یہ کہ نذر کی وجہ سے یا اس جانور کی تعیین کی وجہ سے قربانی اس کے ذمہ واجب ہو' لیکن اگر وہ اسے ذبح کر دے اور اس کے گوشت کو بھی قربانی کی طرح صدقہ کر دے تو اسے ان شاء اللہ اجر وثواب ملے گا۔ اور اگر اس نے ایام عید میں گم شدہ جانور کے بجائے کوئی اور جانور ذبح کر دیا ہو تو پھر اس کے لیے دوسرا جانور ذبح کرنا لازم نہیں ہے۔

شیخ ابن جبرین

قربانی کرنے والے کے لیے عشرۂ ذوالحجہ میں سر دھونا اور کنگھی کرنا

سوال کیا عشرۂ ذوالحجہ میں بالوں میں کنگھی کرنا جائز ہے؟

جواب عشرۂ ذوالحجہ میں سر کو دھونے اور آہستہ آہستہ سر میں کنگھی کرنے میں کوئی حرج نہیں اور اگر اس طرح سر کا کوئی بال گر جائے تو اس میں کوئی حرج نہیں' اس سے قربانی کے اجروثواب میں کوئی کمی واقع نہ ہو گی۔ اگر کوئی شخص جان بوجھ کر بھی بال یا ناخن کاٹ لے تو اس کی وجہ سے بھی وہ قربانی کو ترک نہ کرے۔ قربانی کا اسے ان شاء اللہ تعالیٰ پورا پورا ثواب ملے گا۔

شیخ ابن جبرین

قربانی کرنے والے کا داڑھی میں کنگھی کرنا

سوال میں قربانی کرنے کا ارادہ رکھتا ہوں اور عشرۂ ذوالحجہ میں جب داڑھی میں کنگھی کرتا ہوں تو اس سے کچھ بال گر جاتے ہیں' تو کیا میں کنگھی کر سکتا ہوں یا نہیں؟

جواب داڑھی میں کنگھی کرنے سے قصد و ارادہ کے بغیر جو بال گر جائیں یہ قابل معافی ہیں کیونکہ یہ بال بے جان شمار ہوتے ہیں' اسی طرح وضو اور غسل کرتے وقت محرم کے سر اور داڑھی سے جو بال از خود گر جائیں وہ بھی قابل معافی ہیں کیونکہ یہ بال بے جان ہوتے ہیں تو عشرہ کے آغاز کے بعد قربانی کرنے والے کے بالوں کے بارے میں بھی یہی حکم ہے' ہاں البتہ حرام یہ ہے کہ حالت احرام میں یا قربانی کرنے والا عشرۂ ذوالحجہ کے شروع ہونے کے بعد جان بوجھ کر بال یا ناخن کاٹے۔ یاد رہے کہ داڑھی کے بالوں کو جان بوجھ کر کاٹنا نہ حالت احرام میں جائز ہے اور نہ کسی دوسری حالت میں' کیونکہ نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے:

«قُصُّوا الشَّوَارِبَ وَأَعْفُوا اللِّحَى (خَالِفُوا الْمُشْرِكِينَ)»(مسند أحمد: ٢/٢٢٩ عن أبي هريرة، بدون الشطر الأخير الذي رواه البخاري في الصحيح، اللباس، باب تقليم الاظفار، ح: ٥٨٩٢، عن ابن عمر)

''مونچھیں کاٹو' داڑھی بڑھاؤ اور مشرکین کی مخالفت کرو۔''

شیخ ابن باز

قربانی کرنے والے کا نماز عید سے قبل سر منڈانا

سوال اس شخص کے بارے میں کیا حکم ہے جو عیدالاضحیٰ کی نماز کے لیے جانے سے پہلے سر منڈا دے حالانکہ اسے نصیحت بھی کی گئی تھی لیکن اس نے نماز سے پہلے ہی سر منڈانے پر اصرار کیا؟

جواب قربانی کا ارادہ کرنے والے کے لیے یہ حرام ہے کہ وہ قربانی سے پہلے ایام عشرہ میں بال منڈائے یا ناخن کاٹے

لیکن اگر کوئی شخص ایسا کرے تو اس سے قربانی باطل نہ ہو گی اور نہ اس پر کوئی فدیہ ہو گا' ہاں البتہ وہ ایسا کرنے سے خطا کار ضرور ہے لیکن اس کی وجہ سے قربانی ترک نہیں کرنی چاہیئے۔ واللہ الموفق۔

—— شیخ ابن جبرین ——

قربانی کے ارادے کے باوجود بال کٹوا دیئے

سوال اس شخص کے بارے میں کیا حکم ہے جس نے اپنے لیے قربانی کرنے کا ارادہ کیا تھا لیکن پھر اس نے عشرۂ ذوالحجہ میں ناپسندیدگی کے باوجود بال یا ناخن کاٹ دیئے؟

جواب جس شخص کے پاس جانور ہو' وہ اسے قربان کرنا چاہتا ہو اور ذوالحجہ کا مہینہ شروع ہو جائے تو اس کے لیے قربانی کرنے تک بال یا ناخن کاٹنا جائز نہیں کیونکہ "صحیح مسلم" میں حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا سے مروی یہ حدیث موجود ہے وہ فرماتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

«مَنْ كَانَ لَهُ ذِبْحٌ يَذْبَحُهُ، فَإِذَا أُهِلَّ هِلاَلُ ذِي الْحَجَّةِ، فَلاَ يَأْخُذَنَّ مِنْ شَعْرِهِ وَلاَ مِنْ أَظْفَارِهِ شَيْئًا، حَتَّى يُضَحِّيَ»(صحيح مسلم، الأضاحي، باب نهي من دخل عليه عشر ذي الحجة ... الخ، ح:١٩٧٧)

"جس شخص کے پاس ذبح کرنے کے لیے جانور موجود ہو تو وہ ذوالحجہ کا چاند طلوع ہونے سے لے کر قربانی کرنے تک بال اور ناخن نہ کاٹے۔"

اگر کوئی شخص اس حکم کی مخالفت کرتے ہوئے بال یا ناخن کاٹ لے تو وہ اللہ تعالیٰ سے معافی مانگے لیکن اس پر کوئی فدیہ وغیرہ نہیں ہے خواہ اس نے جان بوجھ کر ہی ایسا کیا ہو۔ وصلی اللّٰہ علی نبینا محمد وآلہ وصحبہ وسلم

—— فتویٰ کمیٹی ——

افضل قربانی

سوال کیا مینڈھے کی قربانی افضل ہے یا گائے کی؟

جواب سب سے افضل قربانی اونٹ کی ہے' پھر گائے کی' پھر بکری کی' پھر اونٹ یا گائے میں اشتراک کیونکہ جمعہ کے بارے میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ:

«مَنِ اغْتَسَلَ يَوْمَ الْجُمُعَةِ غُسْلَ الْجَنَابَةِ ثُمَّ رَاحَ فَكَأَنَّمَا قَرَّبَ بَدَنَةً، وَمَنْ رَاحَ فِي السَّاعَةِ الثَّانِيَةِ فَكَأَنَّمَا قَرَّبَ بَقَرَةً، وَمَنْ رَاحَ فِي السَّاعَةِ الثَّالِثَةِ فَكَأَنَّمَا قَرَّبَ كَبْشًا أَقْرَنَ، وَمَنْ رَاحَ فِي السَّاعَةِ الرَّابِعَةِ فَكَأَنَّمَا قَرَّبَ دَجَاجَةً، وَمَنْ رَاحَ فِي السَّاعَةِ الْخَامِسَةِ فَكَأَنَّمَا قَرَّبَ بَيْضَةً» (صحيح البخاري، الجمعة، باب فضل الجمعة، ح:٨٨١ وصحيح مسلم، الجمعة، باب الطيب والسواك يوم الجمعة، ح:٨٥٠)

"جو شخص جمعہ کے دن غسل جنابت کی طرح (اہتمام سے) غسل کر کے پھر پہلی گھڑی میں آئے اس نے گویا

اونٹ کی قربانی کی‘ جو دوسری گھڑی میں آئے اس نے گویا گائے کی قربانی کی‘ جو تیسری گھڑی میں آئے اس نے گویا سینگ والے مینڈھے کی قربانی کی‘ جو چوتھی گھڑی میں آئے اس نے گویا مرغی کی قربانی کی اور جو پانچویں گھڑی میں آئے اس نے گویا انڈے کی قربانی کی۔"

وجہ استدلال یہ ہے کہ اس حدیث میں تقرب الٰہی کے حصول کے لیے اونٹ کی قربانی کو افضل قرار دیا گیا ہے پھر گائے اور پھر بکری کی قربانی کو۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ قربانی تقرب الٰہی کے حصول کا سب سے عظیم ذریعہ ہے اور اونٹ چونکہ قیمت‘ گوشت اور منفعت کے اعتبار سے سب سے بڑھ کر ہے‘ لہٰذا ائمہ ثلاثہ ابو حنیفہ‘ شافعی اور احمد رحمہم اللہ نے اس کی قربانی کو افضل قرار دیا ہے جب کہ امام مالک رحمہ اللہ نے سب سے افضل مینڈھے کی قربانی کو‘ پھر گائے اور پھر اونٹ کی قربانی کو افضل قرار دیا ہے کیونکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیشہ دو مینڈھوں کی قربانی کی تھی [1] اور آپ تو ہمیشہ وہی عمل سرانجام دیا کرتے تھے جو سب سے افضل ہوتا تھا۔ لیکن اس کا جواب یہ ہے کہ آپ کبھی غیر اولیٰ کو بھی امت کے لیے سہولت و آسانی کی خاطر اختیار فرمالیا کرتے تھے کیونکہ امت نے تو آپ کے اسوہ حسنہ ہی کو اختیار کرنا ہوتا ہے اور آپ یہ پسند نہیں فرماتے تھے کہ امت کو مشقت میں مبتلا کریں اور جیسا کہ بیان کیا جا چکا ہے کہ آپ نے یہ واضح فرما دیا ہے کہ اونٹ‘ گائے اور بکری وغیرہ کی نسبت افضل ہے۔ واللہ اعلم۔

——— فتویٰ کمیٹی ———

میت کی طرف سے قربانی

سوال قربانی کے بارے میں کیا حکم ہے؟ کیا میت کی طرف سے بھی قربانی کرنا جائز ہے؟

جواب اکثر علماء کے قول کے مطابق قربانی کرنا سنت مؤکدہ ہے کیونکہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے خود بھی قربانی کی اور اپنی امت کو بھی قربانی کی ترغیب دی۔ قربانی دراصل زندہ انسان سے مطلوب ہے کہ وہ اپنی زندگی میں اپنی طرف سے اور اپنے اہل خانہ کی طرف سے قربانی کرے‘ لیکن وہ اپنی قربانی کے ثواب میں زندہ اور مردہ انسانوں میں سے جس کو چاہے شریک کر سکتا ہے۔

میت کی طرف سے قربانی کے بارے میں گزارش یہ ہے کہ میت نے اگر اپنے ثلث مال میں سے اس کی وصیت کی ہو یا اپنے وقف مال کے بارے میں یہ وصیت کی ہو کہ اس سے اس کی طرف سے قربانی کی جائے تو وارثوں کے لیے یہ واجب ہے کہ اس کی وصیت اور وقف کو اس کی خواہش کے مطابق عملی جامہ پہنائیں اور اگر وصیت و وقف کی صورت نہ ہو اور کوئی انسان اپنے ماں‘ باپ یا کسی اور کی طرف سے قربانی کرنا چاہے تو یہ ایک اچھا عمل ہے‘ اسے میت کی طرف سے صدقہ شمار کیا جائے گا اور اہل سنت والجماعت کے قول کے مطابق میت کی طرف سے صدقہ مشروع ہے۔

قربانی کے جانور کی قیمت کو جانور ذبح کرنے سے افضل قرار دیتے ہوئے صدقہ کرنے کے بارے میں حکم یہ ہے کہ اگر وصیت یا وقف میں قربانی ہی کا ذکر ہو تو پھر وکیل کے لیے یہ جائز ہی نہیں کہ قربانی کے بجائے قیمت کو صدقہ کر دے‘ اس صورت میں اسے قربانی ہی کرنی چاہیئے۔ اگر کوئی شخص ازخود کسی کی طرف سے صدقہ کر رہا ہو تو اس میں بہت وسعت ہے

---

[1] صحیح بخاری‘ الاضاحی‘ باب وضع القدم علی صفح الذبیحة‘ حدیث: 5564 و صحیح مسلم‘ الاضاحی‘ باب استحباب استحسان الضحیة‘ حدیث: 1966

جس صورت کو وہ چاہے اختیار کر لے۔ ہر وہ زندہ مسلمان جسے استطاعت ہو اس کے لیے اپنے اور اپنے اہل خانہ کی طرف سے قربانی کرنا سنت مؤکدہ ہے اور قربانی کے جانور کی قیمت صدقہ کرنے سے افضل ہے۔

——— شیخ ابن باز ———

قربانی زندہ و مردہ کی طرف سے مشروع ہے

سوال کیا میت کی طرف سے قربانی کرنا جائز ہے' امید ہے آپ دلیل کے ساتھ اس مسئلہ کی وضاحت فرمائیں گے' نیز یہ فرمائیں گے کہ جانور کی قیمت صدقہ کر دینے کے بارے میں کیا حکم ہے؟

جواب زندہ اور مردہ کی طرف سے قربانی مشروع ہے' نبی ﷺ مدینہ میں ایک بکری کی اپنے اور اپنے اہل بیت کی طرف سے قربانی دیا کرتے تھے'[1] حالانکہ آپ کے اہل بیت میں بعض فوت شدہ گان بھی تھے' مثلاً حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا اور آپ کی دو صاجزادیاں حضرت رقیہ اور ام کلثوم رضی اللہ عنہما قربانی بھی ایک صدقہ ہے۔ لہٰذا یہ صدقہ اور قربت کے اعتبار سے دیگر صدقات کے مشابہہ ہے' نبی ﷺ کے عمل سے زندہ انسان کے لیے اس کی بہت تاکید معلوم ہوتی ہے نیز آپ کے اس ارشاد سے بھی ہے:

«إِذَا رَأَيْتُمْ هِلَالَ ذِي الْحِجَّةِ، وَأَرَادَ أَحَدُكُمْ أَنْ يُضَحِّيَ، فَلْيُمْسِكْ عَنْ شَعْرِهِ وَأَظْفَارِهِ»

(صحيح مسلم، الأضاحي، باب نهي من دخل عليه عشر ذي الحجة ... الخ، ح:١٩٧٧)

"جب تم ذوالحجہ کا چاند دیکھ لو اور تم میں سے کوئی قربانی کا ارادہ کرے تو وہ اپنے بال اور ناخن نہ کاٹے۔"

بعض فقہاء نے اس مسئلہ میں جو یہ ذکر کیا ہے کہ جو شخص کسی کی طرف سے قربانی کر رہا ہو تو وہ بھی اپنے بال اور ناخن نہ کاٹے تو مجھے اس کی کوئی قابل اعتبار دلیل نہیں ملی کیونکہ اس حکم کا مخاطب صرف وہ انسان ہے جو اپنے مال سے قربانی کر رہا ہو' لہٰذا اس کے بیوی بچوں کو بال اور ناخن کاٹنے سے منع نہیں کیا جائے گا کیونکہ یہ قربانی کرنے والے نہیں ہیں بلکہ ان کی طرف سے ان کے گھر کے سربراہ نے قربانی کی ہے' لہٰذا اس ممانعت کا مخاطب بھی وہی ہے۔

قربانی کے جانور کو ذبح کرنا اس کی قیمت صدقہ کرنے سے افضل ہے کیونکہ اس میں سنت کا احیاء' اظہار اور نبی کریم ﷺ اور آپ کے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے اسوۂ حسنہ کی اتباع ہے۔ واللہ ولی التوفیق۔

——— شیخ ابن باز ———

فوت شدہ کی طرف سے قربانی

سوال کیا یہ جائز ہے کہ قربانی کا ثواب فوت شدہ کو ہدیہ کر دیا جائے؟

جواب قربانی' عیدالاضحیٰ یا اس کے تین دن بعد جانور ذبح کر کے یا اونٹ نحر کر کے تقرب الٰہی حاصل کرنے کا نام ہے۔ زندہ انسان کے لیے یہ سنت ہے کہ وہ اپنے اور اپنے اہل خانہ کی طرف سے قربانی کرے جیسا کہ نبی کریم ﷺ قربانی کیا کرتے تھے۔

---

[1] جامع ترمذی' الاضاحی' باب ماجاء ان الشاۃ الواحدۃ تجزئ عن اھل البیت' حدیث: 1505 و سنن ابن ماجہ' حدیث: 3147۔

جب کوئی انسان اپنے اور اپنے اہل خانہ کی طرف سے قربانی کرے اور یہ نیت کرے کہ اس کا اجر و ثواب اس کے اور اس کے زندہ و مردہ اہل خانہ کے لیے ہے تو اس میں کوئی حرج نہیں' باقی رہی میت کے لیے خاص قربانی تو اس کی دو حالتیں ہیں:

(ا) میت نے اس کی وصیت کی ہو تو اس کی وصیت پر عمل کے پیش نظر اس کی طرف سے قربانی کی جائے گی کہ وصیت کے ذکر میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

﴿ فَمَنۢ بَدَّلَهُۥ بَعْدَمَا سَمِعَهُۥ فَإِنَّمَآ إِثْمُهُۥ عَلَى ٱلَّذِينَ يُبَدِّلُونَهُۥٓ ۚ إِنَّ ٱللَّهَ سَمِيعٌ عَلِيمٌ ﴿١٨١﴾ فَمَنْ خَافَ مِن مُّوصٍ جَنَفًا أَوْ إِثْمًا فَأَصْلَحَ بَيْنَهُمْ فَلَآ إِثْمَ عَلَيْهِ ۚ إِنَّ ٱللَّهَ غَفُورٌ رَّحِيمٌ ﴿١٨٢﴾ ﴾ (البقرۃ۲/ ۱۸۱۔۱۸۲)

"جو شخص وصیت کو سننے کے بعد بدل ڈالے تو اس کے (بدلنے) کا گناہ انہیں لوگوں پر ہے جو اس کو بدلیں اور بے شک اللہ تعالیٰ خوب سننے' جاننے والا ہے۔ اگر کسی کو وصیت کرنے والے کی طرف سے (کسی وارث کی) طرف داری یا حق تلفی کا اندیشہ ہو تو اگر وہ (وصیت کو بدل کر) وارثوں میں صلح کرا دے تو اس پر کچھ گناہ نہیں۔ بے شک اللہ بڑا بخشنے والا نہایت رحم والا ہے۔"

یہ دونوں آیتیں اس بات پر دلالت کرتی ہیں کہ میت کی وصیت پر عمل کیا جائے گا بشرطیکہ اس میں گناہ یا کسی کی حق تلفی نہ ہو۔

(۲) میت نے وصیت تو نہ کی ہو بلکہ از خود اس کی طرف سے قربانی کی جائے' اس کے بارے میں علماء میں اختلاف ہے کہ یہ مشروع ہے یا غیر مشروع! بعض نے اسے زندہ کی طرف سے قربانی اور مردہ کی طرف سے صدقہ کی طرح مشروع قرار دیا ہے اور بعض نے کہا ہے کہ یہ غیر مشروع ہے کیونکہ یہ نبی کریم ﷺ سے ثابت نہیں ہے۔ آپ کی حیات میں آپ کے اعزہ و اقارب اور ازواج مطہرات میں سے کئی ایک کا انتقال ہوا لیکن یہ ثابت نہیں کہ آپ نے ان میں سے کسی کی طرف سے بطور خاص قربانی کی ہو۔ اسی طرح آپ کی حیات پاک ہی میں آپ کی تین صاحبزادیوں اور تین صاحبزادوں کا انتقال ہوا لیکن یہ قطعاً ثابت نہیں ہے کہ آپ نے ان میں سے کسی کی طرف سے بطور خاص قربانی کی ہو۔ آپ کے چچا حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ غزوۂ احد میں شہید ہوئے اور آپ نے ان کی طرف سے قربانی نہیں کی اور اسی طرح آپ کی حیات ہی میں آپ کی دو بیویوں حضرت خدیجہ اور زینب بنت خزیمہ رضی اللہ عنہا کا انتقال ہوا اور آپ نے ان کی طرف سے بھی کبھی کوئی قربانی نہیں کی تھی۔

اس سے معلوم ہوا کہ اگر یہ امر مشروع ہوتا تو آپ اسے ضرور سرانجام دیتے' لیکن میں یہ بھی کہتا ہوں کہ اگر آپ کا ارادہ میت کی طرف سے قربانی کرنے کا ہے تو اپنی طرف سے اور اپنے اہل بیت کی طرف سے قربانی کیجئے اور نیت یہ کیجئے کہ یہ آپ کی اور آپ کے زندہ اور مردہ قریبی رشتہ داروں کی طرف سے ہے اور اللہ تعالیٰ کا فضل و کرم بے حد وسیع ہے۔ (امید ہے وہ ان سب کو اپنے فضل و کرم سے سرفراز فرما دے گا)۔

——— شیخ ابن عثیمین ———

بوقت ضرورت عورت کے لیے بھی قربانی کرنا جائز ہے

سوال جب وقت ذبح آ جائے اور گھر میں کوئی مرد موجود نہ ہو تو کیا عورت کے لیے قربانی کرنا جائز ہے؟

جواب ہاں عورت کے لیے یہ جائز ہے کہ وہ بوقت ضرورت قربانی یا دوسرے جانور کو ذبح کر سکتی ہے جبکہ ذبح کرنے کی دیگر شرائط موجود ہوں۔

قربانی ذبح کرتے وقت ان لوگوں کا نام لینا مسنون ہے' جن زندہ یا مردہ لوگوں کی طرف سے ذبح کرنے کی اس نے نیت کی ہو اور اگر نام نہ لیا جائے تو نیت بھی کافی ہے۔ اور اگر کسی اور کا نام غلطی سے لے لے تو کوئی حرج نہیں کیونکہ اللہ تعالیٰ نیتوں کو خوب جانتا ہے۔ واللہ الموفق۔

——— شیخ ابن جبرین ———

قربانی کے گوشت کو کھانے کا حکم

سوال کیا قربانی کرنے والے کے لیے یہ ضروری ہے کہ وہ قربانی کے گوشت سے کھانے کا آغاز کرے؟

جواب جس نے قربانی کرنی ہو اس کے لیے مستحب ہے کہ کچھ نہ کھائے حتیٰ کہ عید کی نماز پڑھ لے اور پھر اپنی قربانی کے جانور کو ذبح کرے۔ اور اگر آسانی سے ممکن ہو تو اس دن کے کھانے کا آغاز اپنی قربانی کے گوشت سے کرلے' اکثر اہل علم کا جن میں حضرت علی' ابن عباس رضی اللہ عنہما' مالک' شافعی رحمہما اللہ اور کئی دیگر بھی ہیں' یہی قول ہے۔ امام ترمذی اور اثرم نے حضرت بریدہ کی یہ روایت بیان کی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم عیدالفطر کے دن کچھ کھائے بغیر تشریف نہیں لے جایا کرتے تھے اور عیدالاضحیٰ کے دن نماز سے پہلے کچھ نہیں کھایا کرتے تھے۔[1] اثرم کی روایت میں الفاظ یہ ہیں کہ آپ قربانی کرنے سے پہلے کچھ نہیں کھایا کرتے تھے۔ امام احمد فرماتے ہیں کہ عیدالاضحیٰ کے دن نہ کھائے حتیٰ کہ نماز سے واپس آجائے بشرطیکہ اس نے قربانی کرنی ہو[2] کیونکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اپنی قربانی کے گوشت کو تناول فرمایا کرتے تھے اور اگر قربانی نہ کرنی ہو تو پھر کوئی حرج نہیں کہ کسی اور کی قربانی کے گوشت کو عید سے پہلے کھالے یا بعد میں۔ واللہ اعلم۔

——— فتویٰ کمیٹی ———

قربانی کا گوشت امیروں اور فقیروں سب کے لیے جائز ہے

سوال اس شخص کے بارے میں کیا حکم ہے جو دس ذوالحجہ کو کسی سے قربانی کا گوشت لے لے جبکہ وہ خود بھی خوش حال ہو اور اسے گوشت کی ضرورت نہ ہو؟

جواب جائز ہے کیونکہ ہدی' قربانی اور ہدی تمتع و قران کا گوشت تمام حاجیوں کے لیے خواہ وہ امیر ہوں یا فقیر جائز ہے خصوصاً جب کہ گوشت کے خراب ہونے کا بھی اندیشہ ہو جیسا کہ آج کل قربانی کے بہت سے جانوروں کے گوشت کو پھینک دیا' جلا دیا یا دفن کر دیا جاتا ہے اور ان سے کوئی فائدہ نہیں اٹھایا جاتا اور پھر ارشاد باری تعالیٰ بھی ہے:

﴿ فَكُلُوا۟ مِنْهَا وَأَطْعِمُوا۟ ٱلْقَانِعَ وَٱلْمُعْتَرَّ ﴾ (الحج ٢٢/ ٣٦)

"ان میں سے تم (خود) بھی کھاؤ اور قناعت سے بیٹھ رہنے والوں اور سوال کرنے کو بھی کھلاؤ۔"

قَانِع سے مراد قناعت سے بیٹھ رہنے والا اور سوال نہ کرنے والا ہے جبکہ مُعْتَر سے مراد وہ ہے جو سوال کرنے والا ہو۔

——— شیخ ابن جبرین ———

[1] جامع ترمذی' الجمعة' باب ماجاء فی الاكل یوم الفطر قبل الخروج' حدیث: 54

[2] نیل الاوطار 329/3' تحفة الاحوذی بشرح' حدیث: 542

قربانی کا گوشت کافر کو ہدیہ کرنا

سوال کیا قربانی کرنے والے کے لیے یہ جائز ہے کہ کسی کافر کو قربانی کا گوشت تحفہ میں دے؟

جواب مستحب یہ ہے کہ قربانی کے گوشت کے تین حصے کر لیے جائیں (۱) قربانی کرنے والے کیلئے (۲) دوست واحباب کے لیے اور (۳) مسکینوں کے لیے' فقر' قرابت' پڑوس یا تالیف قلب کے لیے کافر کو بھی قربانی کا گوشت دینا جائز ہے۔

——— فتویٰ کمیٹی ———

عقیقہ اور احکام مولود

مولود کے عقیقہ کا حکم

سوال مولود کے عقیقہ کے کیا معنی ہیں؟ کیا یہ فرض ہے یا سنت؟

جواب مولود کے عقیقہ سے مراد وہ ذبیحہ ہے جسے بچے کی پیدائش کے بعد ساتویں دن تقرب الٰہی کے حصول اور اولاد جیسی نعمت کے ملنے پر اللہ تعالیٰ کے شکر کے طور پر ذبح کیا جاتا ہے۔ اس کے بارے میں اہل علم میں یہ اختلاف ہے کہ یہ سنت ہے یا واجب! اکثر اہل علم نے اسے سنت مؤکدہ قرار دیا ہے حتیٰ کہ امام احمد رحمۃ اللہ علیہ تو یہاں تک فرماتے ہیں کہ قرض لے کر عقیقہ کیا جائے' یعنی جس کے پاس مال نہیں ہے تو وہ قرض لے کر عقیقہ کرے اللہ تعالیٰ اسے اس کا بدل عطا فرما دے گا کیونکہ وہ ایک سنت کو زندہ کرتا ہے۔ آپ نے جو یہ فرمایا ہے کہ قرض لے لے تو یاد رہے کہ اس سے وہ شخص مراد ہے جسے مستقبل میں قرض ادا کرنے کی امید ہو اور جسے امید نہ ہو تو وہ قرض نہ لے' بہر حال امام احمد رحمۃ اللہ علیہ کے اس ارشاد سے معلوم ہوا کہ یہ سنت مؤکدہ ہے اور آپ کی یہ بات درست ہے۔ لہٰذا بچے کی طرف سے دو اور بچی کی طرف سے ایک جانور (بکرا) پیدائش کے ساتویں دن بطور عقیقہ ذبح کیا جائے اور اسے خود بھی کھائے' دوستوں اور عزیزوں کو تحفہ بھی دے اور صدقہ بھی کرے اور اس میں بھی کوئی حرج نہیں کہ اسے پکا کر صدقہ بھی کیا جائے اور رشتہ داروں اور پڑوسیوں وغیرہ کو کھانے کی دعوت پر مدعو بھی کیا جائے۔

——— شیخ ابن عثیمین ———

حکم واحکام عقیقہ

سوال بچے اور بچی کی طرف سے بطور عقیقہ جانور ذبح کرنے کے بارے میں کیا حکم ہے؟ کیا بچے کی طرف سے دو بکرے ذبح کرنا واجب ہے؟ اگر بچے کی پیدائش کو طویل عرصہ ہو گیا اور ایک جانور ذبح کر دیا جائے تو اس کے بارے میں کیا حکم ہے؟ اگر دادا پوتے کی طرف سے عقیقہ کر دے تو اس کا کیا حکم ہے؟ کیا وہ جانور خریدنے میں مدد کر سکتا ہے؟ دعوت عقیقہ کے بارے میں کیا حکم ہے؟ اس دعوت میں کن امور کو ملحوظ رکھنا واجب ہے؟

جواب عقیقہ سے مراد وہ جانور ہے جسے بچے کی پیدائش پر ذبح کیا جاتا ہے' یہ سنت مؤکدہ ہے۔ بعض علماء کے نزدیک یہ واجب ہے کیونکہ نبی ﷺ نے فرمایا ہے:

«كُلُّ غُلَامٍ مُرْتَهَنٌ بِعَقِيقَتِهِ تُذْبَحُ عَنْهُ يَوْمَ سَابِعِهِ وَيُسَمَّى»(سنن أبي داود، الضحايا، باب في العقيقة، ح: ٢٨٣٧، ٢٨٣٨ وجامع الترمذي، ح: ١٥٢٢ وسنن ابن ماجه، ح: ٣١٦٥ وسنن النسائي، ح: ٤٢٢٥ ومسند أحمد: ٥/ ٧ واللفظ له)

"ہر بچہ اپنے عقیقہ کے ساتھ گروی ہے' لہٰذا عقیقہ ساتویں دن کیا جائے اور ساتویں دن ہی بچے کا نام بھی رکھا جائے۔"

لیکن اس حدیث سے بھی اس کی تاکید ہی معلوم ہوتی ہے اور اصل بات یہ ہے کہ یہ واجب نہیں ہے۔ سنت یہ ہے کہ بچے کی طرف سے دو بکریاں یا دو بھیڑیں ذبح کی جائیں اور بچی کی طرف سے ایک ذبح کی جائے' بچے کی طرف سے بھی اگر ایک ہی جانور ذبح کیا جائے تو ان شاء اللہ یہ بھی کافی ہوگا۔ یہ بھی جائز ہے کہ ایک ہفتے کے بعد ایک جانور اور دوسرے ہفتے کے بعد دوسرا جانور ذبح کیا جائے لیکن یہ خلاف اولیٰ ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ والد پر یہ واجب ہے کہ وہ اس اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرے جس نے اسے اولاد جیسی نعمت سے نوازا ہے۔ اگر بچے کا دادا یا بھائی یا کوئی اور عقیقہ کر دے تو یہ بھی جائز ہے یا ان میں سے کوئی اگر جانور خریدنے میں تعاون کر دے تو یہ بھی جائز ہے۔ سنت یہ ہے کہ عقیقہ کے گوشت کا ایک ثلث خود کھا لے' ایک ثلث اعزہ و اقارب کو ہدیہ کر دیا جائے اور ایک ثلث مسلمانوں میں صدقہ کر دیا جائے۔ یہ بھی جائز ہے کہ دعوت عقیقہ پر اعزہ و اقارب کو مدعو کیا جائے یا عقیقہ کے تمام گوشت کو صدقہ کر دیا جائے۔

——— شیخ ابن جبرین ———

عقیقہ مولود کے لیے ہے میت کے لیے نہیں

سوال میری والدہ فوت ہو گئی ہیں اور میں ان کا عقیقہ کرنا چاہتا ہوں اور جب اس کے بارے میں میں نے ایک امام صاحب سے استفسار کیا تو انہوں نے بتایا کہ عقیقہ تو زندہ کی طرف سے ہوتا ہے' مردہ کی طرف سے نہیں۔ تو سوال یہ ہے کہ اس کے بارے میں حکم شریعت کیا ہے؟

جواب عقیقہ کا حکم میت کے لیے نہیں ہے بلکہ یہ تو کسی انسان کے پیدا ہونے کے ساتویں دن کیا جاتا ہے۔ بچے کے باپ کے لیے حکم شریعت یہ ہے کہ وہ بچے کی طرف سے دو بکرے اور بچی کی طرف سے ایک بکرا عقیقہ کے طور پر ذبح کرے اور اگر والد کی مالی حالت کمزور ہو تو وہ بچے کی طرف سے بھی ایک بکرا ذبح کر سکتا ہے۔

عقیقہ کا جانور (بچے کی) پیدائش کے ساتویں دن ذبح کیا جائے' اسے خود بھی کھایا جائے' صدقہ بھی کیا جائے اور ہدیہ بھی دیا جائے اور اس میں بھی کوئی حرج نہیں کہ دعوت عقیقہ میں رشتہ داروں اور پڑوسیوں کو مدعو کیا جائے۔ علماء فرماتے ہیں کہ اگر ساتویں دن (عقیقہ کرنا) ممکن نہ ہو تو چودھویں دن اور اگر چودھویں دن بھی ممکن نہ ہو تو اکیسویں دن اور اگر اکیسویں دن بھی ممکن نہ ہو تو پھر جب چاہے عقیقہ کر لے۔

میت کی طرف سے عقیقہ نہیں بلکہ مغفرت اور رحمت کی دعا کی جاتی ہے کیونکہ میت کے لیے دعا کرنا مشروع اور از حد مفید ہے ہاں اس کی طرف سے صدقہ بھی کیا جا سکتا ہے یا دو رکعتیں پڑھ کر یا قرآن مجید کی تلاوت کر کے میت کے لیے

ایصال ثواب کی نیت سے کی جائے تو اس میں کوئی حرج نہیں لیکن میت کے حق میں دعا کرنا ہی سب سے افضل ہے کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے اسی کی طرف راہنمائی فرمائی ہے۔ [1]

——— شیخ ابن عثیمین ———

عقیقہ کو ساتویں دن سے مؤخر کرنا خلاف سنت ہے

سوال بچی کی وفات کے بعد عقیقہ کیا گیا جب کہ وفات کے وقت اس کی عمر ڈیڑھ سال تھی' کیا یہ عقیقہ صحیح ہے؟ کیا یہ بچی آخرت میں اپنے والدین کے لیے نفع بخش ہوگی' رہنمائی فرمائیں؟

جواب ہاں یہ عقیقہ ہو جائے گا لیکن اسے پیدائش کے ساتویں دن سے زیادہ مؤخر کرنا خلاف سنت ہے' ہر وہ بچہ یا بچی جو چھوٹی عمر میں فوت ہو جائے' اس کی وفات پر صبر کرنے والے اس کے مسلمان والدین کو اللہ تعالیٰ اس سے نفع پہنچائے گا۔

——— فتویٰ کمیٹی ———

استطاعت نہ ہو تو عقیقہ ساقط ہے

سوال میں استطاعت نہ ہونے کی وجہ سے اپنے بچوں کا عقیقہ نہ کر سکا تو اس کے بارے میں کیا حکم ہے؟

جواب اگر آپ کو اس کی استطاعت نہیں تو آپ کو کوئی گناہ نہیں کیونکہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ فَاتَّقُوا اللَّهَ مَا اسْتَطَعْتُمْ ﴾ (التغابن ٦٤/ ١٦)
"سو جہاں تک ہو سکے' اللہ سے ڈرو۔"

نیز فرمایا:

﴿ لَا يُكَلِّفُ اللَّهُ نَفْسًا إِلَّا وُسْعَهَا ﴾ (البقرة ٢/ ٢٨٦)
"اللہ کسی شخص کو اس کی طاقت سے زیادہ تکلیف نہیں دیتا۔"

اور نبی ﷺ نے فرمایا:

«إِذَا أَمَرْتُكُمْ بِأَمْرٍ فَأْتُوا مِنْهُ مَا اسْتَطَعْتُمْ»(صحيح البخاري، الاعتصام بالكتاب والسنة، باب الاقتداء بسنن رسول الله ﷺ، ح:٧٢٨٨ وصحيح مسلم، الحج، باب فرض الحج مرة في العمر، ح:١٣٣٧

---

[1] میت کی طرف سے نفل نماز کا اہتمام کرنا یا ایصال ثواب کی نیت سے قرآن مجید کی تلاوت کرنا قرآن و حدیث کی کسی واضح دلیل سے اس کا جواز نہیں ملتا جیسا کہ خود مفتی علیہ الرحمہ کی کلام سے یہ مترشح ہوتا ہے اور یہی موقف شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ سے منقول ہے تفصیل کے لیے دیکھیے "الاختیارات العلمیة ص:54" و احکام الجنائز ص: 213 صرف میت کے لیے دعا کرنا ہی رسول اللہ ﷺ سے ثابت ہے جیسا کہ کتاب و سنت کے عام دلائل سے ثابت ہے اور یہی افضل ہے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جب انسان فوت ہو جاتا ہے تو اس کے اعمال کا سلسلہ منقطع ہو جاتا ہے صرف تین چیزیں (ایصال ثواب کا باعث بنتی ہیں) (۱) (زندگی میں کیا ہوا) صدقہ جاریہ (۲) علم جس سے بعد میں فائدہ اٹھایا جائے۔ (۳) یا نیک اولاد کی دعا' صحیح مسلم' حدیث: 4223

ومسند أحمد: ۲/ ۵۰۸ واللفظ له)

"جب میں تمہیں کوئی حکم دوں تو مقدور بھر اس کی اطاعت بجالاؤ۔"

جب کوئی انسان بچوں کی ولادت کے وقت فقیر ہو تو اس پر عقیقہ لازم نہیں ہے کیونکہ وہ عاجز ہے اور عجز کی صورت میں عبادات ساقط ہو جاتی ہیں۔

——— شیخ ابن عثیمین ———

قبل از وقت گر جانے والے بچے کا عقیقہ

سوال قبل از وقت ساقط ہو جانے والا ایسا بچہ جس کے بارے میں یہ واضح ہو کہ وہ بچہ ہے کہ بچی' کیا اس کا عقیقہ کیا جائے؟ وہ بچہ جو اپنی ولادت کے چند دن بعد فوت ہو جائے اور اس کی زندگی میں اس کا عقیقہ نہ کیا گیا ہو' کیا بعد از وفات عقیقہ کیا جائے؟ کیا بچے کی ولادت پر جب ایک یا دو ماہ یا نصف یا پورا سال گزر جائے یا وہ بڑا ہو جائے اور اس کا عقیقہ نہ کیا گیا ہو تو کیا اس کا بھی عقیقہ کیا جائے؟

جواب جمہور فقہاء کا قول ہے کہ عقیقہ سنت ہے کیونکہ سلمان بن عامر سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا:

«مَعَ الْغُلَامِ عَقِيقَةٌ فَأَهْرِيقُوا عَنْهُ دَمًا، وَّأَمِيطُوا عَنْهُ الْأَذٰى»(صحيح البخاري، العقيقة، باب إماطة الأذى عن الصبي في العقيقة، ح:٥٤٧٢ ومسند أحمد:٤/ ١٨ وسنن أبي داود، ح:٢٨٣٩ وجامع الترمذي، ح:١٥١٥ وسنن النسائي، ح:٤٢١٩ وسنن ابن ماجه، ح:٣١٦٤)

"بچے کے ساتھ عقیقہ ہے لہٰذا اس کی طرف سے خون بہاؤ اور اس سے ایذاء کو دور کرو۔"

اسی طرح حسن بن سمرہ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا:

«كُلُّ غُلَامٍ رَّهِينَةٌ بِعَقِيقَتِهِ، تُذْبَحُ عَنْهُ يَوْمَ سَابِعِهِ وَيُحْلَقُ وَيُسَمّٰى»(سنن أبي داود، الضحايا، باب في العقيقة، ح:٢٨٣٨)

"ہر بچہ اپنے عقیقہ کے ساتھ گروی ہے' اس (کی طرف) سے ساتویں دن ذبح کیا جائے' اس کا سر مونڈا جائے اور اس کا نام رکھا جائے۔"

اسی طرح عمرو بن شعیب عن ابیہ عن جدہ کے واسطے سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا:

«مَنْ أَحَبَّ مِنكُمْ أَنْ يَّنْسُكَ عَنْ وَّلَدِهِ فَلْيَفْعَلْ، عَنِ الْغُلَامِ شَاتَانِ مُكَافِئَتَانِ وَعَنِ الْجَارِيَةِ شَاةٌ»(سنن أبي داود، الضحايا، باب في العقيقة، ح:٢٨٤٢ وسنن النسائي، ح:٤٢١٧ ومسند أحمد:٢/ ١٨٢ واللفظ له)

"جو شخص اپنے بچے کی طرف سے عقیقہ کرنا چاہے تو وہ کرے۔ بچے کی طرف سے ایک جیسے دو بکرے اور بچی کی طرف سے ایک بکرا ذبح کرے۔"

ساقط ہو جانے والے بچے کی طرف سے عقیقہ نہیں ہے خواہ یہ واضح ہو چکا ہو کہ وہ بچہ ہے یا بچی جب کہ وہ نفخ روح سے قبل ساقط ہو جائے کیونکہ اسے بچہ یا مولود نہیں کہتے۔ عقیقہ ولادت کے ساتویں دن کیا جائے۔

جب بچہ زندہ پیدا ہو لیکن وہ ساتویں دن سے پہلے فوت ہو جائے تو اس کی طرف سے بھی ساتویں دن عقیقہ کرنا مسنون

ہے' بعض فقہاء کی رائے یہ ہے کہ اگر ساتواں دن گزر جائے تو اس کی وفات کے بعد عقیقہ کرنا مسنون نہیں ہے کیونکہ نبی کریم ﷺ نے اس کے لیے ساتویں دن کا تعین فرمایا ہے۔

حنابلہ اور فقہاء کی ایک جماعت کا مذہب یہ ہے کہ ساتویں دن کے بعد بھی عقیقہ کیا جائے خواہ ایک مہینہ یا ایک سال یا ولادت کے بعد اس سے بھی زیادہ مدت گزر چکی ہو کیونکہ احادیث کے عموم سے یہی معلوم ہوتا ہے جیسا کہ امام بیہقی نے حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ نبی کریم ﷺ نے اپنا عقیقہ بعثت کے بعد کیا تھا[1] اور زیادہ احتیاط بھی اسی میں ہے۔

—— فتویٰ کمیٹی ——

وقت سے پہلے گر جانے والے ناتمام بچے کا عقیقہ

سوال کیا وقت سے پہلے گر جانے والے درج ذیل ناتمام بچوں کا عقیقہ کرنا لازم ہے یا نہیں:

(۱) جو بچہ حمل کے تین دن کم چار ماہ بعد گر گیا۔

(۲) جو بچہ حمل کے تین ماہ سترہ دن بعد گر گیا۔

(۳) جو بچہ حمل کے صرف دو ماہ بعد گر گیا۔

یہ تینوں جنین لڑکے تھے اور کیا یہ تینوں روز قیامت میرے بیٹے شمار ہوں گے' قیامت کے دن اٹھنے کے وقت ان کی عمر کیا ہو گی؟

جواب وقت سے پہلے گر جانے والے ناتمام بچے کا عقیقہ سنت ہے' جب کہ اسقاط نفخ روح کے بعد ہو یعنی حمل کے چار ماہ بعد اسقاط ہوا ہو لہٰذا سوال میں مذکور ساقط ہونے والے بچوں کا عقیقہ نہیں ہے۔ قبروں سے اٹھائے جانے کے وقت ان کی عمر کیا ہو گی' اس کا علم اللہ ہی کو ہے اور یہ سوال بھی بے معنی ہے اور آدمی کے اسلام کی خوبی یہ ہے کہ بے معنی کاموں کو ترک کر دے۔

—— فتویٰ کمیٹی ——

ان دونوں بچوں کا عقیقہ مستحب ہے

سوال میری بیوی نے دس سال پہلے دو جڑواں بچوں کو جنم دیا تھا' جب کہ حمل کو ابھی چھ ماہ ہی ہوئے تھے لیکن وہ پیدائش کے بعد پہلے دن ہی فوت ہو گئے تھے' ان کا نام بھی رکھ دیا گیا تھا تو کیا ان کا عقیقہ جائز ہے؟

جواب ان کا عقیقہ مستحب ہے' ان میں سے ہر ایک کی طرف سے دو دو ایسے بکرے ذبح کیے جائیں' جن کی قربانی جائز ہو کیونکہ احادیث کے عموم کا یہی تقاضا ہے مثلاً ام کرز کعبیہ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا:

«عَنِ الْغُلَامِ شَاتَانِ، وَعَنِ الْجَارِيَةِ شَاةٌ»(سنن أبي داود، الضحايا، باب في العقيقة، ح:٢٨٣٥، ٢٨٣٦ وجامع الترمذي، ح:١٥١٦ وسنن النسائي، ح:٤٢٢٢، ٤٢٢٣ وسنن ابن ماجه، ح:٣١٦٢ ومسند أحمد:٦/ ٤٢٢)

---

[1] السنن الکبریٰ: 9/300

"لڑکے کی طرف سے دو بکریاں اور لڑکی کی طرف سے ایک بکری (کا عقیقہ کیا جائے)۔"

اس بات میں آپ کو اختیار ہے کہ آپ جانوروں کے تمام یا کچھ گوشت کو صدقہ کر دیں یا کھانا پکا کر اعزہ و اقارب' پڑوسیوں' دوستوں اور فقراء کی دعوت کر دیں۔

—— شیخ ابن باز ——

نومولود بچے کو تحفہ دینا

سوال بعض عورتوں میں جو یہ رواج ہے کہ جب ان کی کسی سہیلی کے ہاں بچہ پیدا ہوتا ہے تو وہ اس نومولود بچے کو کچھ رقم بطور تحفہ دیتی ہیں' کیا اس رواج کی کوئی شرعی اصل بھی ہے؟

جواب ولادت کے وقت مولود کو ہدیہ دینے میں کوئی حرج نہیں کیونکہ اصول یہ ہے کہ ہدیہ تمام معاملات میں حلال ہے' الا یہ کہ اس کی حرمت کی کوئی دلیل ہو۔ جب عرف و عادت یہ ہے کہ بچے کی ولادت پر اعزہ و اقارب ہدیہ دیتے ہیں تو اس میں کوئی حرج نہیں کیونکہ یہ عبادت کے طور پر نہیں بلکہ محض عرف و عادت کے طور پر ایسا کیا جاتا ہے۔

—— شیخ ابن عثیمین ——

بچے کا نام رکھنے کے لیے اجتماع

سوال کیا بچے کا نام رکھنے کیلئے احباب' پڑوسیوں اور دوستوں کا اجتماع جائز ہے یا اس اجتماع کو بدعت و کفر قرار دیا جائے گا؟

جواب بچے کا نام رکھنے کے لیے اجتماع نبی کریم ﷺ کی سنت نہیں ہے اور نہ آپ کے عہد میں صحابہ کرام میں سے کسی نے ایسا کیا تھا۔ لہٰذا جو اسے سنت سمجھ کر کرے تو وہ دین میں ایک ایسی بات ایجاد کرتا ہے جو اس میں سے نہیں ہے۔ لہٰذا یہ رسم بدعت اور مردود قرار پائے گی کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے:

«مَنْ أَحْدَثَ فِي أَمْرِنَا هٰذَا مَا لَيْسَ مِنْهُ فَهُوَ رَدٌّ»(صحيح البخاري، الصلح، باب إذا اصطلحوا على صلح جور ... الخ، ح:٢٦٩٧ وصحيح مسلم، الأقضية، باب نقض الأحكام الباطلة، ح:١٧١٨)

"جو شخص ہمارے اس دین میں کوئی ایسی چیز ایجاد کرے جو اس میں نہ ہو تو وہ مردود ہے۔"

لیکن اسے کفر قرار نہیں دیا جا سکتا۔ ہاں اگر فرحت اور مسرت کے طور پر یا دعوت عقیقہ کھانے کیلئے اجتماع ہو اور اسے سنت نہ سمجھا جائے تو کوئی حرج نہیں۔ نبی کریم ﷺ سے یہ ثابت ہے کہ ساتویں دن عقیقہ کرنا اور بچے کا نام رکھنا مشروع ہے۔ [1]

—— فتویٰ کمیٹی ——

[1] سنن ابی داود' الاضاحی' باب فی العقیقة' حدیث: 2837 ۔ 2838 و جامع ترمذی' حدیث: 1522 و سنن ابن ماجه' حدیث: 3165 و سنن نسائی' حدیث: 4225 و مسند احمد' 5/8،12۔

باب نہم
کتاب
البیوع
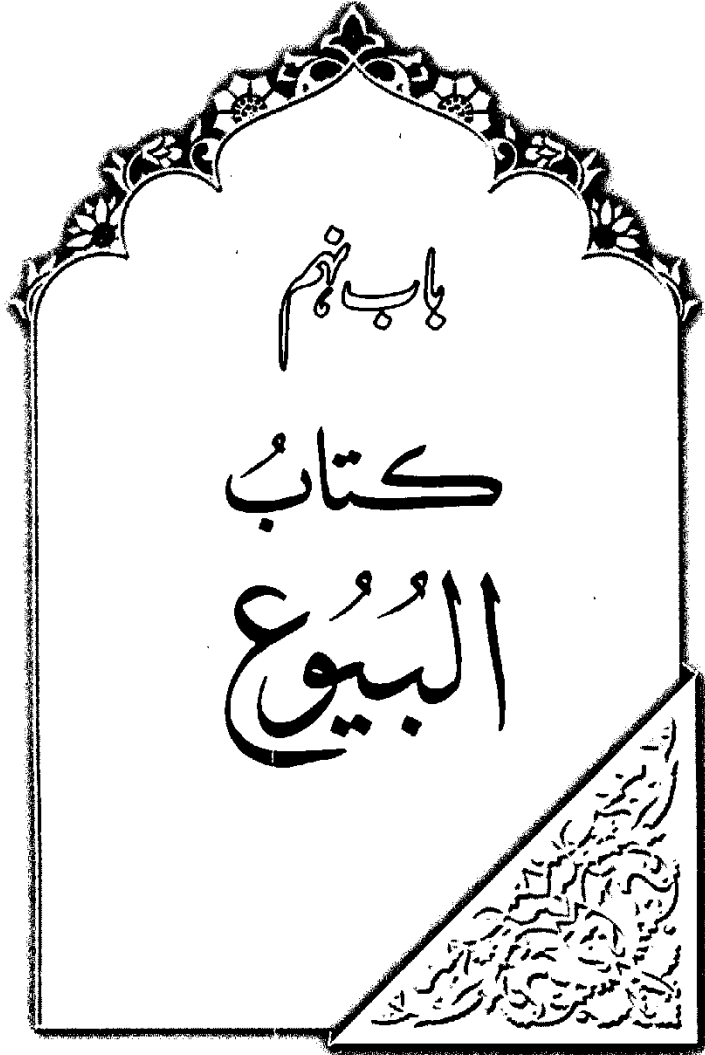
خرید و فروخت کے مسائل

جائز اور سودی معاملات

سماحۃ الشیخ عبدالعزیز بن باز رحمہ اللہ سے سوال پوچھا گیا کہ اگر چینی کی ایک بوری کی نقد قیمت مبلغ ایک سو ریال ہو تو کیا اس کی ادھار مبلغ ایک سو پچاس ریال میں بیع جائز ہے؟ تو آپ نے اس کا حسب ذیل جواب دیا:

اس معاملہ میں کوئی حرج نہیں کیونکہ نقد اور ادھار کی بیع میں فرق ہے اور اس طرح کا لین دین ہمیشہ مسلمان کرتے چلے آئے ہیں' تو یہ گویا ان کا اس کے جواز پر اجماع ہے اور ان اہل علم کی رائے شاذ ہے جنھوں نے ادھار کی صورت میں زائد قیمت کو ناجائز اور سود قرار دیا ہے۔ یہ قول بلا دلیل ہے اور یہ قطعاً سود نہیں ہے کیونکہ تاجر نے جب اپنا سودا ایک مقررہ مدت کے ادھار پر بیچا تو وہ ادھار پر اسی لیے راضی ہوا ہے تاکہ زیادہ قیمت سے فائدہ اٹھا سکے اور خریدار اس لیے راضی ہوا کیونکہ اسے قیمت ادا کرنے میں مہلت مل گئی ہے اور اسے نقد قیمت ادا کرنے پر مجبور نہیں کیا گیا گویا دونوں ہی نے اس معاملہ میں نفع اٹھایا ہے اور نبی کریم ﷺ سے ثابت ہے جو اس معاملہ کے جواز پر دلالت کناں ہے۔ مثلاً آپ نے عبداللہ بن عمرو بن عاص رضی اللہ عنہما کو حکم دیا تھا کہ وہ لشکر کی تیاری کا اہتمام کریں تو حضرت عبداللہ دو اونٹوں کے بدلے ایک اونٹ ادھار خرید لیا کرتے تھے۔[1] اور پھر لین دین کی صورت حسب ذیل ارشاد باری تعالیٰ کے عموم میں بھی داخل ہے:

﴿ يَٰٓأَيُّهَا ٱلَّذِينَ ءَامَنُوٓاْ إِذَا تَدَايَنتُم بِدَيۡنٍ إِلَىٰٓ أَجَلٖ مُّسَمّٗى فَٱكۡتُبُوهُۚ ﴾ (البقرۃ۲/ ۲۸۲)

"مومنو! جب تم آپس میں کسی میعاد کے لیے قرض کا معاملہ کرنے لگو تو اس کو لکھ لیا کرو۔"

یہ معاملہ قرض کے ان معاملات میں سے ہے جو جائز اور آیت مذکورہ میں داخل ہیں۔ معاملہ کی یہ صورت بیع سلم کی جنس سے ہے کہ جس میں بائع دانے یا دیگر ایسی اشیاء جن میں بیع سلم صحیح ہے ایسی قیمت کے ساتھ بیچتا ہے جو نقد کی صورت میں ادھار سے کم ہوتی ہے لیکن اس میں قیمت کو جلد ادا کر دیا جاتا ہے لیکن خریدی ہوئی چیز کو ایک مدت کے بعد ادا کیا جاتا ہے گویا یہ صورت اس کے بالکل برعکس ہے جس کے بارے میں آپ نے سوال کیا ہے اور یہ صورت بالا جماع جائز ہے اور یہ صورت معنوی طور پر ادھار بیع ہی کی طرح ہے اور بیع سلم کی طرح اس کی ضرورت بھی پیش آتی رہتی ہے۔ بیع سلم کی صورت میں قیمت میں اضافہ بھی اس طرح ہے جس طرح ادھار بیع کی صورت میں قیمت میں اضافہ ہے اور اس اضافے کا سبب بیع سلم کی صورت میں فروخت شدہ چیز کو دینے میں تاخیر اور ادھار بیع میں قیمت کے ادا کرنے میں تاخیر ہے بشرطیکہ چینی کی بوری وغیرہ کے خریدار کا مقصود بیع اور اس کی قیمت سے نفع اٹھانا ہو محض اس سودے سے نفع اٹھانا مقصود نہ ہو۔ معاملہ کی اس صورت کو "تورق" اور بعض عامۃ الناس "وعدہ" کے نام سے موسوم کرتے ہیں۔ علماء کا اس کے جواز

---

[1] سنن ابی داود' البیوع' باب فی الرخصۃ' حدیث: 3357

میں اختلاف ہے۔ ایک قول تو یہ ہے کہ یہ صورت ممنوع یا مکروہ ہے کیونکہ اس سے مقصود دراہم کی دراہم کے بدلے خریداری ہے اور فروخت شدہ سامان ایک ایسا واسطہ ہے جو بذات خود مقصود نہیں ہے اور دوسرا قول یہ ہے کہ یہ معاملہ جائز ہے کیونکہ اس کی حاجت و ضرورت پیش آتی رہتی ہے' ہر ضرورت مند کو بغیر سود کے قرض دینے والا نہیں مل سکتا اور پھر یہ صورت ارشاد باری تعالیٰ:

﴿ وَأَحَلَّ ٱللَّهُ ٱلۡبَيۡعَ ﴾ (البقرة ۲/ ۲۷۵)

"اور اللہ تعالیٰ نے سودے کو حلال قرار دیا ہے۔"

نیز ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ يَٰٓأَيُّهَا ٱلَّذِينَ ءَامَنُوٓاْ إِذَا تَدَايَنتُم بِدَيۡنٍ إِلَىٰٓ أَجَلٍ مُّسَمًّى فَٱكۡتُبُوهُۚ ﴾ (البقرة ۲/ ۲۸۲)

"مومنو! جب تم آپس میں کسی میعاد کے لیے قرض کا معاملہ کرنے لگو تو اس کو لکھ لیا کرو۔"

کے عموم میں داخل ہے۔

شرعی اصول یہ ہے کہ تمام معاملات حلال ہیں الا یہ کہ کسی معاملہ کی حرمت کی کوئی دلیل موجود ہو اور اس معاملہ کے بارے میں ہمیں کوئی ایسی شرعی دلیل معلوم نہیں جس سے یہ حرام قرار پاتا ہو' جن لوگوں نے اس کے ممنوع یا مکروہ ہونے کی یہ علت بیان کی ہے کہ اس سے مقصود نقدی کی بیع ہی ہوتی ہے تو یہ کوئی ایسی علت نہیں ہے جو حرمت یا کراہت کی موجب ہو کیونکہ اکثر و بیشتر معاملات میں تاجروں کا مقصود کم نقدی کے ساتھ زیادہ نقدی کا حصول ہی ہوتا ہے اور فروخت کیا جانے والا سامان ہی اس سلسلہ میں واسطہ ہوتا ہے اور یہ عقد بیع صرف اس صورت میں ممنوع ہے جب بیع اور شراء کا تعلق مسئلہ عینہ کی طرح ایک ہی شخص سے ہو کہ اسے سود کے لیے حیلہ بنایا جاتا ہے اور اس کی صورت یہ ہوتی ہے کہ ایک شخص کسی دوسرے سے (ادھار قیمت پر) سامان خریدے اور پھر اس کو وہی سامان اس (ادھار پر خریدی ہوئی قیمت) سے کم (نقد) قیمت پر بیچ دے جو اس نے اسے ادا کرنی ہو تو یہ صورت شرعاً ممنوع ہے کیونکہ یہ سود کا ایک حیلہ ہے اور اسے ہی بیع عینہ کہا جاتا ہے اور حضرت عائشہ [1] اور ابن عمر رضی اللہ عنہما [2] سے مروی حدیث اس کی ممانعت کی دلیل ہے۔ لیکن یہ مسئلہ تورق جسے بعض لوگ "وعدہ" کے نام سے بھی موسوم کرتے ہیں یہ بالکل ایک دوسرا معاملہ ہے جو بیع عینہ کی جنس سے نہیں ہے کیونکہ اس میں تو خریدار نے ایک شخص سے سودا ایک مدت کے ادھار پر خریدا ہے اور پھر کسی دوسرے کو نقد بیچ دیا ہے کیونکہ اسے نقدی کی ضرورت ہے اور ظاہر ہے کہ یہ سود کا حیلہ نہیں ہے کیونکہ اس میں مشتری اور بائع الگ الگ ہیں لیکن اکثر لوگوں کو چونکہ اس مسئلہ میں شریعت کے تقاضا کا علم نہیں ہوتا اس لیے کچھ لوگ تو ایسا سودا بیچ دیتے ہیں جو ان کے پاس موجود ہی نہیں ہوتا اور سودا کرنے کے بعد خریدتے اور پھر اسے خریدار کے سپرد کرتے ہیں اور بعض خرید کر اسے بائع کی جگہ ہی پر یعنی شرعی قبضہ میں لیے بغیر فروخت کر دیتے ہیں اور یہ دونوں صورتیں ناجائز ہیں کیونکہ نبی کریم ﷺ نے حکیم بن حزام رضی اللہ عنہ سے فرمایا تھا:

«لَا تَبِعْ مَا لَيْسَ عِنْدَكَ»(سنن أبي داود، البيوع، باب في الرجل يبيع ما ليس عنده، ح: ۳۵۰۳)

[1] سنن ابی داود' الاجارۃ' باب النھی عن العینۃ' حدیث: 3462

[2] لم أجده

"جو چیز تمہارے پاس موجود ہی نہ ہو تو اسے نہ بیچو۔"

نیز نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام نے یہ بھی فرمایا ہے:

«لاَ يَحِلُّ سَلَفٌ وَّبَيْعٌ، وَّلاَ بَيْعُ مَا لَيْسَ عِنْدَكَ»(سنن أبي داود، البيوع، باب في الرجل يبيع ماليس عنده، ح: ٣٥٠٤)

"سلف و بیع حلال نہیں اور اس چیز کی بیع بھی حلال نہیں ہے جو تمہارے پاس موجود ہی نہ ہو۔"

آپ نے یہ بھی فرمایا ہے:

«مَنِ اشْتَرٰى طَعَامًا فَلاَ يَبِعْهُ حَتّٰى يَسْتَوْفِيَهُ»(صحيح البخاري، البيوع، باب الكيل على البائع والمعطي، ح:٢١٢٦ وصحيح مسلم، البيوع، باب بطلان بيع المبيع قبل القبض، ح:١٥٢٥، ١٥٢٦ واللفظ له)

"جو شخص کھانے کی کوئی چیز خریدے تو وہ اس وقت تک نہ بیچے جب تک اسے مکمل طور پر اپنے قبضہ میں نہ لے لے۔"

ابن عمر رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ ہم کھانے کی اشیاء اٹکل (اندازے) سے خریدا کرتے تھے تو رسول اللہ ﷺ ہماری طرف قاصد بھیج دیتے جو ہمیں منع کرتے کہ ہم انہیں اس وقت تک نہ بیچیں جب تک ہم ان کو اپنی جگہوں پر منتقل نہ کر لیں۔" [1]

نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام سے یہ بھی ثابت ہے:

«نَهٰى أَنْ تُبَاعَ السِّلَعُ حَيْثُ تُبْتَاعُ حَتّٰى يَحُوزَهَا التُّجَّارُ إِلٰى رِحَالِهِمْ»(سنن أبي داود، البيوع، باب في بيع الطعام قبل أن يستوفي، ح:٣٤٩٩)

"آپ نے اس بات سے منع فرمایا کہ سامان کو وہاں بیچا جائے جہاں خریدا گیا ہو' حتیٰ کہ تاجر اسے اپنی جگہوں پر منتقل نہ کر لیں۔"

ان اور ان کے ہم معنی دیگر احادیث سے ایک طالب حق کے لیے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ کسی مسلمان کے لیے یہ جائز نہیں کہ وہ کسی ایسے سودے کو بیچے جو اس کی ملکیت میں نہ ہو اور پھر اسے خود ہی خرید لے بلکہ واجب یہ ہے کہ اس کی بیع کو مؤخر کرے یعنی خرید کر پہلے اسے اپنی ملکیت میں لے۔ ان احادیث سے یہ بھی واضح ہوتا ہے کہ بہت سے لوگ جو یہ کرتے ہیں کہ سودے کو بائع کی جگہ ہی بیچ دیتے ہیں اور اسے اپنی جگہ یا بازار میں منتقل نہیں کرتے تو یہ جائز نہیں' کیونکہ اس میں سنت نبوی کی مخالفت' معاملات کے ساتھ مذاق اور شریعت مطہرہ کی خلاف ورزی ہے [illegible] اس کے خرابی اور برائی کے علاوہ اور بھی بہت سے بھیانک انجام ہیں' جن کو اللہ تعالیٰ کے سوا اور کوئی نہیں جانتا۔ ہم اللہ تعالیٰ سے اپنے لیے اور تمام مسلمانوں کے لیے یہ دعا کرتے ہیں کہ وہ ہمیں شریعت پر چلنے کی توفیق عطا فرمائے اور اس کی مخالفت کرنے سے بچائے۔

---

[1] صحیح بخاری' البیوع' باب من رأى إذا اشترى طعاما جزافاً...... الخ' حدیث: 2137

وہ اضافہ جس کے ساتھ معاملہ سودی ہو جاتا ہے اس سے مراد وہ اضافہ ہے جو مدت گزرنے کے بعد قرض دینے والے کو ادا کیا جاتا ہے تاکہ وہ مقروض کو کچھ عرصہ کے لیے مزید مہلت دے دے جیسا کہ زمانۂ جاہلیت میں دستور تھا کہ لوگ مقروض سے کہتے کہ یا تو قرض ادا کرو اور یا پھر تمہیں قرض کی اصل رقم سے زیادہ دینا ہو گا' اسلام نے اس سے منع کیا اور اللہ تعالیٰ نے اس کے لیے یہ حکم نازل فرمایا:

﴿ وَإِن كَانَ ذُو عُسْرَةٍ فَنَظِرَةٌ إِلَىٰ مَيْسَرَةٍ ﴾ (البقرة ٢/ ٢٨٠)

"اور اگر مقروض تنگ دست ہو تو (اسے) کشائش (کے حاصل ہونے تک) مہلت دو۔"

علماء کا اجماع ہے کہ اس طرح کا اضافہ اور ہر وہ معاملہ جو اس طرح کے اضافے کو حلال قرار دینے کا وسیلہ بنے' حرام ہے' مثلاً اگر کوئی قرض دینے والا مقروض سے یہ کہے کہ یہ چینی یا کوئی اور سامان مجھ سے ادھار خرید لو اور پھر مجھے نقد بیچ کر مجھ سے جو قیمت حاصل کرو اس سے میرا قرض ادا کر دو تو یہ معاملہ ایک کھلم کھلا حیلہ ہے جسے اس سود کو حلال قرار دینے کے لیے اختیار کیا گیا ہے جس کے زمانۂ جاہلیت کے لوگ عادی تھے' لیکن طریق کار میں تھوڑی سی تبدیلی کر لی گئی ہے۔ لہٰذا واجب یہ ہے کہ اسے بالکل ترک کر کے اس سے اجتناب کیا جائے اور تنگ دست مقروض کو مہلت دی جائے حتیٰ کہ اللہ تعالیٰ اس کے لیے آسانی پیدا فرما دے' اسی طرح تنگ دست مقروض پر بھی یہ واجب ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ سے ڈرے اور ایسے جائز اسباب اختیار کرے جن سے وہ اپنے قرض کو ادا کرے اور قرض دینے والوں کے حقوق کو ادا کر سکے۔ اگر وہ سستی کرے' حقوق ادا کرنے کے لیے اسباب و وسائل حاصل کرنے کے لیے محنت نہ کرے تو وہ اہل حق پر ظلم کرنے والا اور خیانت کرنے والا ہو گا اور یہ اس دولت مند کے حکم میں ہو گا جو قرض کی ادائیگی میں ٹال مٹول سے کام لیتا ہو اور اس سلسلہ میں رسول اللہ ﷺ کا ارشاد یہ ہے:

«مَطْلُ الْغَنِيِّ ظُلْمٌ»(صحيح البخاري، الاستقراض، باب مطل الغني ظلم، ح:٢٤٠٠ وصحيح مسلم، المساقاة، باب تحريم مطل الغني، ح:١٥٦٤)

"دولت مند کا ٹال مٹول کرنا ظلم ہے۔"

نیز آپ نے یہ بھی فرمایا ہے:

«لَيُّ الْوَاجِدِ يُحِلُّ عِرْضَهُ وَعُقُوبَتَهُ» (سنن أبي داود، القضاء، باب في الدين هل يحبس به، ح:٣٦٢٨)

"جس شخص کے پاس مال موجود ہو اور وہ ٹال مٹول کرے تو اس کی بے عزتی کرنا اور اسے سزا دینا حلال ہے۔"

بینکوں اور بعض تاجروں کا یہ معاملہ بھی سودی ہے جو قرض دے کر زیادہ وصول کرتے ہیں یا تو مطلقاً یا ہر سال ایک معلوم شرح کے حساب سے پہلے کی مثال یہ ہے کہ وہ اس شرط پر ایک ہزار قرض دے کہ (مقروض) اس (ایک ہزار) کے بجائے ایک ہزار ایک سو واپس لوٹائے گا یا اپنے گھر یا دوکان میں جگہ دے گا یا ایک معلوم مدت تک کے لیے اسے اپنی گاڑی یا سواری وغیرہ دے گا۔ اور دوسرے کی مثال یہ ہے کہ وہ قرض پر لی ہوئی رقم کے مقابلہ میں ہر سال یا ہر ماہ معلوم شرح کے حساب سے منافع (سود) ادا کرے گا خواہ اس نے یہ رقم اسے قرض کے نام سے دی ہو یا امانت کے نام سے' کیونکہ جب

وہ اسے اپنے مصرف میں لانے کے لیے امانت کے نام سے لے گا تو یہ بھی قرض ہو گا جس کا وہ ضامن ہے۔ نفع ادا کرنے کی اس کے سوا اور کوئی صورت جائز نہیں کہ وہ اور بینک یا تاجر اس بات پر متفق ہو جائیں کہ وہ اس مال کو مضاربت کے لیے استعمال کرے گا اور نفع کا ایک معلوم و معروف حصہ ایک کے لیے اور باقی دوسرے کے لیے ہو گا' اس نفع کو "قراض" بھی کہتے ہیں اور یہ بالاجماع جائز ہے کیونکہ وہ دونوں نفع و نقصان میں شریک ہیں۔ اس معاہدہ میں بنیادی سرمایہ درحقیقت عامل کے ہاتھ میں امانت ہوتا ہے کہ اگر کسی افراط و تفریط کے بغیر تلف ہو جائے تو وہ اس کا ضامن نہیں ہے اور اسے اپنے کام کے عوض نفع کا صرف اتنا ہی معلوم حصہ ملتا ہے جو معاہدہ میں طے کر لیا گیا ہو۔ اس تفصیل سے شرعی معاملہ اور سودی معاملہ میں فرق واضح ہو جاتا ہے۔

—— شیخ ابن باز ——

قسطوں پر ادھار بیع

سوال نقد کی بجائے اگر ادھار اور قسطوں کی صورت میں ہونے کی وجہ سے قیمت زیادہ ہو تو اس کے بارے میں کیا حکم ہے؟

جواب مدت معلوم تک بیع جائز ہے بشرطیکہ وہ معتبر شرائط پر مشتمل ہو' اسی طرح قیمت بالاقساط ادا کرنے میں بھی کوئی حرج نہیں بشرطیکہ اقساط معروف اور مدت معلوم ہو' ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ يَٰٓأَيُّهَا ٱلَّذِينَ ءَامَنُوٓاْ إِذَا تَدَايَنتُم بِدَيْنٍ إِلَىٰٓ أَجَلٍ مُّسَمًّى فَٱكْتُبُوهُ ﴾ (البقرۃ۲/ ۲۸۲)

"مومنو! جب تم آپس میں کسی میعاد معین کے لیے قرض کا معاملہ کرنے لگو تو اس کو لکھ لیا کرو۔"

اور نبی کریم ﷺ نے فرمایا ہے:

«مَنْ أَسْلَفَ فِي شَيْءٍ فَلْيُسْلِفْ فِي كَيْلٍ مَّعْلُوم وَّوَزْنٍ مَّعْلُومٍ إِلٰى أَجَلٍ مَّعْلُوم»(صحيح البخاري، السلم، باب السلم في وزن معلوم، ح:۲۲٤۰ وصحيح مسلم، المساقاة، باب السلم، ح:١٦٠٤)

"جو شخص کسی چیز کی ادھار بیع کرنا چاہے تو اسے چاہیئے کہ معلوم ناپ' معلوم وزن اور معلوم مدت کے لیے بیع کرے۔"

اسی طرح "صحیحین" میں موجود بریرہ کے قصہ [1] سے بھی اس کا جواز معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے اپنے مالک سے اپنے آپ کو نو اوقیہ پر اس شرط پر خریدا کہ وہ ہر سال ایک اوقیہ ادا کرے گی اور یہ قسطوں ہی کی بیع ہے لیکن نبی کریم ﷺ نے اس سے منع نہیں فرمایا' بلکہ اسے برقرار رہنے دیا اور اس اعتبار سے اس میں کوئی فرق نہیں' ادھار ادا کی جانے والی قیمت نقد قیمت کے برابر ہو یا مدت کی وجہ سے اس سے زیادہ ہو۔ واللہ ولی التوفیق

—— شیخ ابن باز ——

---

[1] صحیح بخاری' المکاتب' باب استعانۃ المکاتب --- الخ' حدیث: 2563 و صحیح مسلم' العتق' حدیث: 1504

ادھار اور سامان کو قبضہ میں لینے سے پہلے بیع

سوال جب انسان کے پاس کوئی سامان مثلاً دانے یا چینی یا تیل یا مویشی ہو جس کی نقد قیمت ایک سو ریال ہو اور وہ اسے ایک محدود مدت کے ادھار پر جو کہ عموماً ایک سال ہوتی ہے' ایک سو تیس ریال پر بیچ دے تو کیا یہ جائز ہے جب کہ خریدار بسا اوقات ایک سال یا دو سال گزرنے پر بھی قیمت ادا نہیں کرتا؟

اسی طرح مقروض سٹور یا دوکان سے ایک چیز خرید تا ہے تو کیا وہ اسے گننے اور وصول کرنے کے بعد اسی جگہ بیچ سکتا ہے یا ضروری ہے کہ وہ اسے اپنے قبضہ میں لے کر کسی دوسری جگہ منتقل بھی کرے؟ فتویٰ عطا فرما کر ثواب حاصل کریں!

جواب انسان کے لیے یہ جائز ہے کہ وہ کھانے کی اشیاء یا کوئی اور سامان مدت معلوم کے ادھار پر بیچے خواہ وہ بیع کے وقت کی قیمت سے زیادہ قیمت پر فروخت کرے اور مقروض کو چاہیئے کہ وہ مقررہ مدت پر قرض کو ادا کردے جیسا کہ حسب ذیل ارشاد باری تعالیٰ کے عموم کا تقاضا ہے:

﴿ فَإِنْ أَمِنَ بَعْضُكُم بَعْضًا فَلْيُؤَدِّ الَّذِي اؤْتُمِنَ أَمَانَتَهُ وَلْيَتَّقِ اللَّهَ رَبَّهُ ﴾ (البقرة۲/ ۲۸۳)

"اور اگر کوئی کسی کو امین سمجھے تو امانت دار کو چاہیئے کہ صاحب امانت کی امانت ادا کردے اور اللہ سے جو اس کا پروردگار ہے ڈرے۔"

اور رسول اللہ ﷺ سے ثابت ہے کہ آپ نے فرمایا ہے:

«مَنْ أَخَذَ أَمْوَالَ النَّاسِ يُرِيدُ أَدَاءَهَا أَدَّى اللهُ عَنْهُ، وَمَنْ أَخَذَ يُرِيدُ إِتْلَافَهَا أَتْلَفَهُ اللهُ»(صحيح البخاري، الاستقراض، باب من أخذ أموال الناس ... الخ، ح:۲۳۸۷)

"جو شخص لوگوں کے اموال لے اور انہیں ادا کرنے کا ارادہ بھی رکھتا ہو تو اللہ تعالیٰ اس کے لیے ادا کرنے کے اسباب مہیا فرما دیتا ہے اور جو لوگوں کے اموال لے اور انہیں تلف کرنے کا ارادہ رکھتا ہو تو اللہ تعالیٰ اسے ضائع کر دیتا ہے۔"

اور جب کوئی انسان کسی سٹور یا دوکان سے کوئی سامان خریدے اور مالک گن کر اسے دے دے تو مشتری (خریدار) کے لیے اسے اسی جگہ بیچنا جائز نہیں' بلکہ ضروری ہے کہ اسے اپنے قبضہ میں لے کر کسی دوسری جگہ منتقل کرے' کیونکہ امام احمد رحمہ اللہ نے حضرت حکیم بن حزام کی روایت بیان فرمائی ہے کہ میں نے عرض کیا یا رسول اللہ! میں کچھ اشیاء خریدتا ہوں' ان کی کون سی صورت حلال اور کون سی حرام ہے؟ آپ نے فرمایا:

«إِذَا اشْتَرَيْتَ بَيْعًا فَلَا تَبِعْهُ حَتَّى تَقْبِضَهُ» (مسند أحمد:۳/ ۴۰۲)

"جب تم سودا خریدو تو اسے اس وقت تک نہ بیچو جب تک اپنے قبضہ میں نہ لے لو۔"

اسی طرح امام احمد اور ابوداود نے حضرت زید بن ثابت کی اس روایت کو بیان کیا ہے:

«نَهَى أَنْ تُبَاعَ السِّلَعُ حَيْثُ تُبْتَاعُ حَتَّى يَحُوزَهَا التُّجَّارُ إِلَى رِحَالِهِمْ» (سنن أبي داود، البيوع، باب في بيع الطعام قبل أن يستوفى، ح:۳۴۹۹)

"نبی کریم ﷺ نے منع فرمایا ہے کہ سودے کو وہاں بیچا جائے جہاں سے اسے خریدا ہو' اور یہ اس وقت تک جائز نہیں جب تک تاجر سامان کو اپنی جگہوں پر منتقل نہ کرلیں۔"

اور امام احمد اور مسلم نے حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے مروی اس حدیث کو بھی بیان کیا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

«إِذَا ابْتَعْتَ طَعَامًا فَلَا تَبِعْهُ حَتَّى تَسْتَوْفِيَهُ»(صحیح مسلم، باب بطلان بیع المبیع قبل القبض، ح:١٥٢٩)

"جب تم غلہ خریدو تو اسے اس وقت تک نہ بیچو جب تک اس کو اپنے قبضہ میں نہ لے لو۔"

مسلم کی روایت میں یہ الفاظ بھی ہیں:

«مَنِ ابْتَاعَ طَعَامًا فَلَا يَبِعْهُ حَتَّى يَكْتَالَهُ»(صحیح مسلم، البیوع، باب بطلان بیع المبیع قبل القبض، ح:١٥٢٥، ١٥٢٨)

"جو شخص غلہ خریدے وہ اسے اس وقت تک نہ بیچے جب تک اسے تول کر اپنے قبضہ میں نہ لے لے۔"

—— فتویٰ کمیٹی ——

ادھار کی وجہ سے سامان کو زیادہ قیمت پر خریدنا

سوال میں جس کمپنی میں ملازم ہوں' اس سے میں نے زیادہ قیمت پر مکان خریدا ہے کیونکہ میں ایک کم آمدنی والا ملازم ہوں' تو کیا یہ وہ سود تو شمار نہ ہو گا' جسے اللہ تعالیٰ نے حرام قرار دیا ہے؟

جواب یہ وہ سود نہیں ہے جسے اللہ تعالیٰ نے حرام قرار دیا ہے بشرطیکہ آپ کے معاہدہ کرنے سے قبل کمپنی اس مکان کی مالک ہو۔ اگر انسان کسی چیز کو اس کی موجودہ قیمت سے زیادہ پر ادھار کی صورت میں خریدے تو اس میں کوئی حرج نہیں۔ شیخ الاسلام ابن تیمیہ نے اس کے جواز پر مسلمانوں کا اجماع نقل فرمایا ہے اور پھر اس میں بائع و مشتری دونوں ہی کی مصلحت ہے۔ بائع کا فائدہ یہ ہے کہ اسے قیمت زیادہ ملتی ہے اور مشتری کا فائدہ یہ ہے کہ اسے قیمت ادا کرنے کے لیے مہلت مل جاتی ہے اور یہ سود نہیں ہے کیونکہ سود تو کچھ معین اشیاء کے ساتھ مخصوص ہے جو کہ حضرت عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث میں مذکور ہیں اور وہ یہ کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے:

«اَلذَّهَبُ بِالذَّهَبِ، وَالْفِضَّةُ بِالْفِضَّةِ، وَالْبُرُّ بِالْبُرِّ، وَالشَّعِيرُ بِالشَّعِيرِ، وَالتَّمْرُ بِالتَّمْرِ، وَالْمِلْحُ بِالْمِلْحِ، مِثْلًا بِمِثْلٍ، سَوَاءً بِسَوَاءٍ، يَدًا بِيَدٍ» (صحیح مسلم، المساقاة، باب الصرف وبیع الذهب بالورق نقدا، ح:١٥٨٧)

"سونا سونے کے ساتھ' چاندی چاندی کے ساتھ' گندم گندم کے ساتھ' جو جو کے ساتھ' کھجور کھجور کے ساتھ اور نمک نمک کے ساتھ' جب کہ وہ ایک جیسے' برابر برابر اور دست بدست ہوں۔"

ان چھ اشیاء اور جو علت میں ان میں شریک ہوں (حسب اختلاف علماء) ان میں سود ہے اور جو چیز اپنی ہی جنس کے ساتھ بیچی جا رہی ہو' اس کے لیے دو شرطیں ہیں۔ (١) تول والی اشیاء وزن میں اور ناپ والی اشیاء ناپ میں برابر ہوں۔ (٢) فریقین الگ الگ ہونے سے پہلے قبضہ میں لے لیں اور اگر کوئی چیز کسی دوسری جنس کے ساتھ بیچی جا رہی ہو تو پھر مساوی ہونا شرط نہیں ہے' لیکن جب اسے کسی ایسی چیز کے ساتھ بیچا جا رہا ہو جو اس کے ساتھ علت میں اشتراک رکھتی ہو تو پھر ضروری ہے کہ دونوں الگ الگ ہونے سے پہلے اسے قبضہ میں لے لیں کیونکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے:

«فَإِذَا اخْتَلَفَتْ هٰذِهِ الأَصْنَافُ، فَبِيعُوا كَيْفَ شِئْتُمْ، إِذَا كَانَ يَدًا بِيَدٍ» (صحيح مسلم، المساقاة، باب الصرف وبيع الذهب بالورق نقدا، ح: ١٥٨٧)

"جب یہ اصناف مختلف ہوں تو پھر جیسے چاہو بیچو جب کہ سودا دست بدست ہو۔"

اور وہ اشیاء جو ان اصناف کے سوا اور علت میں مشترک ہوں تو ان میں سود نہیں ہے' مثلاً حیوان اور کپڑوں وغیرہ کی بیع۔ نبی کریم ﷺ نے عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما کو لشکر کی تیاری کا حکم دیا تو وہ ایک اونٹ خریدتے کہ جب صدقہ کے اونٹ آئیں گے تو دو اونٹ ادا کر دیں گے [1] اور دو اونٹ لیتے کہ وہ تین دے دیں گے' لیکن اگر سودے میں درہم آ جائیں اور ادا کرنے کے لیے مدت کا تعین کیا جائے تو یہ حرام ہے کیونکہ یہ سود ہے۔

——— شیخ ابن عثیمین ———

ادھار کی صورت میں نقد سے زیادہ قیمت

سوال ایک آدمی اگر نقد قیمت پر دس گنی میں ایک سودا بیچتا ہے لیکن اگر وہ اسی سودے کو نقد قیمت کے بجائے ماہانہ قسطوں پر بیچے تو وہ اس سے بہت زیادہ قیمت وصول کرتا ہے' تو کیا یہ زائد قیمت سود شمار ہو گی یا زائد قیمت کے لیے کوئی حد مقرر ہے جس کی بائع کے لیے پابندی کرنا واجب ہے جب کہ وہ قسطوں میں قیمت وصول کر رہا ہو؟

جواب جب امر واقع اسی طرح ہو جیسا کہ سوال میں مذکور ہے تو ادھار کی صورت میں نقد سے زیادہ قیمت پر سامان بیچنا جائز ہے خواہ قیمت قسطوں میں ادا کی جا رہی ہو یا طے شدہ مدت پر یک مشت ہی ادا کر دی جائے۔ لیکن شرط یہ ہے کہ وہ الگ الگ ہونے سے پہلے بیع کی قسم کا تعین کر لیں اور اس بات کو بھی طے کر لیں کہ یہ بیع نقد ہو گی یا ادھار! زیادہ قیمت کو وصول کرنا سود نہیں ہے۔ شریعت میں ایسی کوئی بھی نص نہیں ہے جس نے نقد کے بجائے ادھار کی صورت میں زائد قیمت کی مقدار کا تعین کیا ہو۔ ہاں البتہ رسول اللہ ﷺ نے اس بات کی ضرور ترغیب دی ہے کہ بیع و شراء میں اور وصولی اور ادائیگی میں عالی ظرفی اور رواداری کا ثبوت دینا چاہیئے۔

——— فتویٰ کمیٹی ———

ادھار بیع میں زیادہ قیمت کی کوئی حد مقرر نہیں ہے

سوال جب کسی آدمی کے پاس چینی کی ایک بوری ہو جو نقد قیمت پر ۸۰ ریال کی ہو لیکن جب ایک خریدار نے اس سے ادھار پر خریدنے کا مطالبہ کیا تو اس نے اسے ایک سو پچاس ریال میں بیچا۔ سوال یہ ہے کہ ادھار کی صورت میں زیادہ قیمت وصول کرنے کی کوئی حد مقرر ہے جس کی پابندی کی جائے؟

جواب بیع نقد ہو یا ادھار دونوں طرح جائز ہے اور قیمتوں کے بارے میں اصول یہ ہے کہ ان میں تحدید نہیں ہے خواہ بیع نقد ہو یا ادھار کیونکہ اس کا تعلق رسد اور طلب سے ہے' لیکن لوگوں کو چاہیئے کہ وہ آپس میں رحم دلی اور رواداری سے کام لیں' بیع و شراء میں عالی ظرفی اور فراخ دلی کو اختیار کریں اور معاملات میں لوگوں کی تنگی اور مشکلات میں مبتلا کر

---

[1] سنن ابی داود' البیوع' باب في الرخصة' حدیث: 3357

دینے کے موقع کی تلاش میں نہ رہیں۔ نبی ﷺ نے فرمایا ہے:

«رَحِمَ اللّٰهُ رَجُلًا سَمْحًا إِذَا بَاعَ، وَإِذَا اشْتَرٰی»(صحيح البخاري، البيوع، باب السهولة والسماحة في الشراء ... الخ، ح:٢٠٧٦)

"اللہ تعالیٰ اس آدمی پر رحم فرمائے جو بیع و شراء (خرید و فروخت) میں روا داری سے کام لیتا ہے۔"

جب کوئی انسان اپنے بھائی کو مشکل میں مبتلا کر دینے کے موقع کی تلاش میں ہو کہ اس کے پاس جو سامان ہو اس کے کسی بھائی کو اس کی شدید ضرورت ہو اور وہ سامان کسی اور کے پاس موجود نہ ہو یا موجود تو ہو لیکن بے حد کمائی کے لالچ میں تاجر لوگ بازار میں اس کی قیمت بڑھا دیں تو جس شخص کے پاس سامان موجود ہو تو اس کے لیے یہ حرام ہے کہ ضرورت مندوں کو اس کی نقد یا ادھار کی صورت میں ثمن مثل سے زیادہ قیمت پر فروخت کرے' اور جو شخص اس طرح کے موقع پر موجود ہو تو اسے چاہیئے کہ عدل و انصاف میں مدد دے اور ظلم سے روکے۔ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے اعتبار سے جو شخص جس درجہ پر فائز ہو' اسی کے حساب سے اس پر یہ ذمہ داری عائد ہوتی ہے۔ یاد رہے بیع و شراء کے وقت کی موجود حالت ہی دراصل ثمن مثل کا تعین کرتی ہے کیونکہ ہر بازار اور ہر وقت کا اپنا نرخ ہوتا ہے اور پھر سامان اور طلب کی قلت و کثرت سے بھی قیمتوں کا تعین ہوتا ہے۔

——— فتویٰ کمیٹی ———

قیمت اور حالت کی پہچان ضروری ہے

سوال جس گاڑی کی نقد قیمت دس ہزار ہو' اسے قسطوں کی صورت میں بارہ ہزار میں بیچنے کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے' جیسا کہ آج کل گاڑیوں کی نمائش گاہوں میں یہ ایک عام رواج ہے؟

جواب جب کوئی انسان کسی دوسرے کو گاڑی یا کوئی اور چیز نقد دس ہزار اور ادھار کی صورت میں بارہ ہزار میں بیچے اور وہ مجلس عقد میں کسی ایک معاملہ یعنی نقد یا ادھار قیمت پر متفق ہوئے بغیر الگ الگ ہو جائیں تو یہ بیع جائز نہ ہو گی کیونکہ اس صورت میں قیمت مجہول ہے اور نقد یا ادھار کی قیمت پر اتفاق نہیں ہے اور اس کے ممنوع ہونے کے لیے بہت سے علماء نے اس حدیث سے استدلال کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ایک بیع میں دو بیعوں سے منع فرمایا ہے۔[1] امام احمد و نسائی نے اسے روایت کیا اور امام ترمذی نے اسے صحیح قرار دیا ہے۔ اور اگر دونوں بیع کرنے والے مجلس عقد میں الگ الگ ہونے سے پہلے کسی ایک قیمت یعنی قیمت نقد یا قیمت ادھار پر متفق ہو جائیں اور قیمت کے تعین کے بعد الگ ہوں تو بیع جائز اور صحیح ہے کیونکہ اس صورت میں قیمت اور حالت معلوم ہے۔ وصلی اللّٰہ علی محمد وعلی آلہ وصحبہ وسلم۔

——— فتویٰ کمیٹی ———

بیع کے چند مسائل

سوال جب کوئی شخص دوسرے کے پاس آئے اور اس سے ادھار سامان طلب کرے تو کیا دوسرے کے لیے یہ جائز ہے

[1] جامع ترمذی' البیوع' باب ماجاء فی النھی عن بیعتین فی بیعۃ' ح: 1231 و سنن نسائی' ح: 4636

کہ وہ بازار سے سامان خرید کر اسے بیچ دے یا کچھ سامان تو موجود ہو اور باقی بازار سے خرید کر مقروض کو بیچ دے' تو کیا اس کے لیے یہ جائز ہے کہ اسے اس بات کا پابند کرے کہ اسے ایک ہزار کے بجائے ایک ہزار پانچ سو ادا کرنا ہوں گے اور کیا یہ صحیح ہے کہ قیمت ماہانہ قسطوں کی صورت میں ادا کی جائے؟ اور کیا یہ جائز ہے کہ مثلاً وہ اس طرح کہے کہ دس' پندرہ ہیں؟

جواب ان سوالوں کا جواب کئی وجوہ سے ہے۔ (۱) معاہدے کا محض سابقہ اتفاق ہی فریقین یا کسی ایک کو اس کا پابند نہیں کرتا بلکہ ان میں سے جو بھی چاہے اس معاہدہ سے رجوع کر سکتا ہے۔ تو اس بنیاد پر جب دوسرا شخص بازار سے سامان خریدے' اسے اپنے قبضہ میں لے لے' پھر مقروض کو بیچ دے اور پھر مقروض اسے اپنے قبضہ میں لے لے تو بیع صحیح ہے' لیکن مشتری کا ارادہ اگر محض پیسوں ہی کا حصول ہو اور وہ ادھار پر سودا ایک سو میں خرید کر نقد پر بازار میں ستر میں بیچ دے تو یہ سودا جیسا کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا ہے کہ یہ سودا درہموں کے ساتھ درہموں کا ہے' جن کے درمیان حریرہ ہے اور بعض اہل علم نے جن میں حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ بھی ہیں اسے مکروہ قرار دیا ہے۔ لہٰذا اجتناب ضروری ہے۔ ائمہ دعوت میں شیخ عبداللہ بن محمد بن عبدالوہاب رحمہ اللہ نے اس مسئلہ میں فتویٰ دیتے ہوئے فرمایا ہے:

"بیع اگر ابتداء ہی سے ادھار ہو تو جائز ہے بشرطیکہ مباح صورت میں ہو۔"

اور اگر اس بیع سے مقصود محض دراہم کا حصول ہو یعنی ادھار کی صورت میں ایک سو روپے خرید کر بازار میں نقد پر ستر میں بیچ دے تو علماء کے ظاہر قول کے مطابق یہ بیع مذموم اور ممنوع ہے' اسے "تورق" کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے اور حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ "تورق سود کا بھائی ہے۔"

(۲) سائل نے جو یہ کہا ہے کہ جب سامان میرے پاس آ جائے اور میں ایک ہزار کا معاوضہ بھی لینا چاہوں' تو کیا یہ صحیح ہے کہ میں اسے پابند کروں کہ ایک ہزار کے عوض ایک ہزار پانچ سو ادا کرنا ہوں گے؟ اگر اس سے سائل کا مقصود یہ ہے کہ اسے اس طرح بیچے جس طرح سابقہ مسئلہ میں بیان کیا گیا ہے تو اس کا حکم بھی بیان کیا جا چکا ہے اور اگر اس سے اس کا مقصود یہ ہے کہ بائع اور مشتری اس بات پر متفق ہوتے ہیں کہ جس سودے کی قیمت ایک ہزار ہے' وہ ایک ہزار پانچ سو میں ہو گا' اور مشتری ایک ہزار لے لیتا ہے اور بائع اسے ایک ہزار پانچ سو ادا کرنے کا پابند کرتا ہے' یعنی اس صورت میں سودا صرف فرضی ہوتا ہے اور حقیقت میں کوئی سودا ہوتا ہی نہیں جسے بیچا یا خریدا جا رہا ہو تو یہ بلاشک و شبہ سود ہے اور کتاب و سنت کے ان دلائل کے عموم میں داخل ہے جو سود کی حرمت پر دلالت کناں ہیں۔

(۳) اس میں بھی کوئی ممانعت نہیں کہ تمام قیمت ہی ادھار ہو اور اسے خواہ ایک وقت میں ادا کرنا ہو یا مختلف اوقات میں' یعنی قسطوں کی صورت میں کہ مثلاً ہر ماہ یا ہر دو ماہ بعد ایک قسط ادا کرنا ضروری ہو اور اس سلسلہ میں اصل "آیت دین" کا عموم ہے کہ اس میں اس بات کی تحدید نہیں ہے کہ مدت ایک ہو یا مختلف ہوں' تو اس صورت میں ہر قسم کی قیمت کے لیے ایک مدت ہو گی۔

(۴) انسان کے لیے یہ جائز ہے کہ وہ کہے کہ دس پندرہ ہیں جب کہ اس بات سے اس کا مقصود یہ ہو کہ جس چیز کی نقد قیمت دس ہے اس کی ادھار قیمت پندرہ ہے اور اگر اس کا مقصود یہ ہو کہ دس ریال کو پندرہ ریال کے عوض بیچا جا رہا ہے تو یہ جائز نہیں ہے اور اس مسئلہ کے بارے میں پہلے گفتگو ہو چکی ہے۔

(۵) ایک مسلمان کے لیے دوسرے مسلمان کے حق میں حکم شریعت یہ ہے کہ وہ جب اس سے کوئی سودا ادھار لینے

کے لیے آئے تو وہ اسے اتنی زیادہ قیمت ادا کرنے پر مجبور نہ کرے جو عدل و انصاف کے معروف طریقوں پر مبنی تعامل کے عموم کے خلاف ہو کیونکہ اللہ تعالیٰ نے عدل کا حکم دیتے ہوئے فرمایا:

﴿ إِنَّ ٱللَّهَ يَأْمُرُ بِٱلْعَدْلِ وَٱلْإِحْسَـٰنِ﴾ (النحل١٦/ ٩٠)

"اللہ تم کو انصاف اور احسان کرنے کا حکم دیتا ہے۔"

اور ہر چیز میں عدل اس کے حساب سے ہوتا ہے' اور یہی وجہ ہے کہ شریعت نے اس بات سے منع فرمایا ہے کہ کسی کو ناحق بیع پر مجبور کیا جائے یا تجارتی قافلوں سے (شہر سے باہر) ملاقات کی جائے (کیونکہ انہیں بازار کے نرخ کا علم نہیں ہوتا) یا کوئی شہری کسی دیہاتی کا دلال بنے الآ یہ کہ ان شرائط کی پابندی کی جائے جو مشہور و معروف ہوں۔ پس مسلمانوں پر واجب ہے کہ وہ آپس میں رحم دلی کا مظاہرہ کریں کہ جو شخص کسی پر رحمت کرتا ہے تو اس پر بھی رحم کیا جاتا ہے۔

—— فتویٰ کمیٹی ——

بیع عینہ

سوال ایک آدمی نے شادی کرنے کا ارادہ کیا لیکن اس کے پاس مہر کے لیے مطلوبہ رقم نہ تھی۔ وہ ایک تاجر کے پاس قرض لینے کے لیے گیا تو تاجر نے اس سے کہا کہ میں تجھے یہ گاڑی سترہ ہزار ریال پر ادھار بیچتا ہوں جو تو مجھے سال کے اختتام پر یک مشت ادا کرے گا تو کیا یہ سود ہے؟ یاد رہے کہ اس گاڑی کی نقد قیمت صرف ساڑھے بارہ ہزار ریال ہے اور یہ گاڑی ہی بائع اور اس شادی کرنے والے کے درمیان شرط کا محور ہے۔

جواب اگر امر واقع اسی طرح جس طرح ذکر کیا گیا ہے کہ ایک شخص سے گاڑی ادھار پر نقد قیمت کی نسبت زیادہ پر خریدتا ہے تاکہ مشتری' بائع یا جو اس کے حکم میں ہو اس کے سوا جس کو چاہے بیچ دے تو یہ سود نہیں ہے بلکہ یہ جائز اور صحیح عقد بیع ہے۔ اور اگر وہ ایک شخص سے ادھار گاڑی خریدتا ہے اور اس شرط پر کہ وہ اسے جلد ہی اس سے کم قیمت پر لوٹا دے گا جس پر اس نے خریدا ہے تو یہ نقد کی نقد کے ساتھ اضافہ کے ساتھ بیع ہے اور یہ وہ سود ہے جسے اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ نے حرام قرار دیا ہے' اور گاڑی کی بیع ایک فرضی بیع ہے جسے محض دھوکا' سود کے لیے حیلہ اور باطل طریقے سے مال کھانے کا ایک ذریعہ بنایا گیا ہے۔ اسی طرح اگر مشتری ایک ایسے شخص سے گاڑی خریدتا ہے جس کے بارے میں یہ مشہور ہے کہ کام میں وہ پہلے بائع ہی کے تابع ہے یا کسی ایسے شخص سے جو اس منصوبہ میں شریک ہے کہ گاڑی بائع اول ہی کے پاس واپس لوٹ آئے تو یہ بھی دھوکا اور سود کھانے کے لیے ایک حیلہ سازی ہے۔ وصلی اللّٰه وسلم علی نبینا محمد و آله وصحبه۔

—— فتویٰ کمیٹی ——

مسئلہ تورق

سوال ہم مساجد میں وعظ و نصیحت کرنے والے علماء سے اکثر یہ سنتے ہیں کہ ادھار خرید و فروخت حرام ہے' لہٰذا سوال یہ ہے کہ آپ کی اس شخص کے بارے میں کیا رائے ہے جس نے ایک مال خریدا' اس کی قیمت بھی ادا کر دی اور مالک سے

لے کر مال بھی اپنے قبضہ میں لے لیا اور پھر اس کے پاس کوئی دوسرا شخص آکر اس کی اصل قیمت سے ایک سال کے ادھار پر زیادہ قیمت پر خرید لیتا ہے؟

جواب مال کی ادھار اس کی نقد قیمت سے زیادہ قیمت کے ساتھ بیع' اہل علم کے نزدیک مسئلہ تورق کے نام سے معروف ہے اور حنابلہ کے نزدیک اس مسئلہ میں ترجیح اس بات کو ہے کہ یہ جائز ہے' شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

"جب مشتری کو سامان کی تو ضرورت نہ ہو بلکہ اسے سونے چاندی کی ضرورت ہو اور وہ سامان خرید لے تاکہ اسے اس نقدی کے ساتھ بیچ دے جس کی اسے ضرورت ہے' اس صورت میں اگر اس نے اس سامان کو بائع کے پاس ہی لوٹا دیا تو اس کی حرمت میں کوئی شک نہیں اور اگر وہ یہ سامان کسی اور کو مکمل بیع کی صورت میں فروخت کر دے اور کسی حال میں بھی یہ پہلے مالک کی طرف واپس نہ لوٹے تو سلف کا اس کے مکروہ ہونے میں اختلاف ہے۔ وہ معاملہ کی اس صورت کو "تورق" کے نام سے موسوم کرتے ہیں۔ حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ اسے مکروہ قرار دیتے اور فرماتے تھے کہ تورق سود کا بھائی ہے۔ ایاس بن معاویہ اس کی رخصت دیتے تھے اور امام احمد رحمہ اللہ سے اس مسئلہ میں دو روایتیں منصوص ہیں۔"

شیخ الاسلام مزید فرماتے ہیں:

"جو شخص کسی سے قرض لے تو اس کی تین صورتیں ہیں: (۱) ان کے درمیان لفظی یا عرفی موافقت ہو کہ مشتری دکان کے مالک سے سودا خریدے گا اور پھر اسے بیچے گا لیکن پھر یہ سودا دکان کے مالک ہی کو لوٹا دیا جائے تو یہ جائز نہیں ہے۔

(۲) دکان کے مالک سے خرید کر اسی کو لوٹا دے گا تو یہ صورت بھی حدیث ام ولد زید بن ارقم رضی اللہ عنہ کی وجہ سے جائز نہیں۔

(۳) مشتری اولاً سامان خرید لے اور پھر ثانیاً اس (سامان) کو (اس شخص کے ہاں) فروخت کر دے جس سے اس نے قرض لیا ہے' اس صورت کا نام "تورق" ہے کیونکہ مشتری کی غرض روپیہ حاصل کرنا ہے کہ وہ لیتا تو ایک سو ہے لیکن اس صورت میں اس کے ذمہ ایک سو بیس (مثلاً) ہو جاتا ہے۔ سلف کا اس مسئلہ میں اختلاف ہے۔ اس لیے زیادہ قوی بات یہ ہے کہ یہ ممنوع ہے۔ حضرت عمر بن عبدالعزیز فرماتے ہیں کہ "تورق" سود ہے' اللہ تعالیٰ نے اس بات کو حرام قرار دیا ہے کہ اگر دراہم ایک مدت کے ادھار پر دیئے ہوں تو واپسی پر ان سے زیادہ لیے جائیں کیونکہ یہ محتاج کو ضرر پہنچانا اور اس کے مال کو باطل طریقے سے کھانا ہے اور یہ بات تورق کی صورت میں موجود ہے' اور اعمال کا انحصار نیتوں پر ہے اور اللہ تعالیٰ نے جسے جائز قرار دیا ہے وہ بیع اور تجارت ہے۔"

مشتری کا مقصود اگر اس سامان کو استعمال کرنا ہے جسے اس نے خریدا ہے یا اس سامان سے وہ تجارت کرنا چاہتا ہے تو پھر نقد قیمت سے ادھار کی صورت میں زیادہ قیمت پر اس کی بیع جائز ہے بشرطیکہ بائع اس کا واقعی مالک ہو جس چیز کو اس نے اس سے خریدا ہے۔ وباللہ التوفیق وصلی اللہ علی نبینا محمد وعلی آلہ وصحبہ وسلم۔

——— فتویٰ کمیٹی ———

مسئلہ تورق

سوال ایک آدمی نے دوسرے سے مبلغ دس ہزار ریال اس شرط پر قرض لیے کہ وہ معاہدہ کے ایک سال بعد اسے دو ہزار ریال زیادہ ادا کرے گا اور اس معاملہ کی تفصیل حسب ذیل ہے:

صاحب قرض نے ایک سامان مبلغ دس ہزار ریال میں خریدا اور مقروض کو وہ بارہ ہزار ریال میں اس شرط پر بیچ دیا کہ وہ معاہدہ کے ایک سال بعد اسے سارا قرض ادا کرے گا' لیکن دوسرے شخص نے اس سامان کو اسی جگہ پر نو ہزار آٹھ سو ریال میں فروخت کر دیا......... یاد رہے قرض دہندہ نے پہلے سارا سامان اپنے قبضہ میں لے لیا تھا اور پھر اس نے مقروض کے ساتھ مذکورہ رقم ادا کرنے پر اتفاق کیا تھا' تو کیا قرض دہندہ کا مقروض کے ساتھ یہ معاملہ صحیح ہے؟ کیا مقروض کا جگہ کے مالک کے ساتھ یہ معاملہ صحیح ہے؟ کیا یہ مسئلہ تورق ہے یا یہ سود ہی کا ایک حیلہ ہے؟ اللہ تعالیٰ ہمیں اور آپ کو سود کے شر سے بچائے' ہمیں اس مسئلہ میں فتویٰ دیجئے۔ جزاکم اللہ خیراً۔

جواب یہ مسئلہ اہل علم کے ہاں تورق کے نام سے موسوم ہے اور اس کی صورت یہ ہوتی ہے کہ آدمی کسی دوسرے کو اپنا وہ سامان جس کا وہ مالک ہے اور جسے اس نے اپنے قبضہ میں لے لیا ہے' معلوم قیمت کے ساتھ معلوم مدت کے ادھار پر بیچے اور پھر مشتری اسے اپنے قبضہ میں لینے کے بعد اس میں تصرف کرے۔

اکثر و بیشتر حالات میں اس طرح کا معاملہ نقدی کی ضرورت کی وجہ سے کیا جاتا ہے اور علماء کے صحیح قول کے مطابق اس طرح کی یہ بیع جائز ہے اور یہ ارشاد باری تعالیٰ:

﴿ وَأَحَلَّ ٱللَّهُ ٱلۡبَيۡعَ وَحَرَّمَ ٱلرِّبَوٰاْۚ ﴾ (البقرة٢/ ٢٧٥)

"اور سودے کو اللہ نے حلال کیا ہے اور سود کو حرام۔"

اور فرمان باری تعالیٰ:

﴿ يَـٰٓأَيُّهَا ٱلَّذِينَ ءَامَنُوٓاْ إِذَا تَدَايَنتُم بِدَيۡنٍ إِلَىٰٓ أَجَلٍ مُّسَمًّى فَٱكۡتُبُوهُۚ ﴾ (البقرة٢/ ٢٨٢)

"اے مومنو! جب تم آپس میں کسی میعاد معین کے لیے قرض کا معاملہ کرنے لگو تو اس کو لکھ لیا کرو۔"

میں داخل ہے اور قرض دہندہ کے لیے یہ جائز نہیں کہ وہ کسی ایسے سامان کو بیچے جو تاجروں کے پاس ہو اور جسے اس نے خریدا اور اپنے قبضہ میں نہ لیا ہو بلکہ یہ باطل ہے کیونکہ نبی ﷺ نے فرمایا ہے:

«لاَ يَحِلُّ سَلَفٌ وَبَيْعٌ، وَلاَ بَيْعُ مَا لَيْسَ عِنْدَكَ»(سنن أبي داود، البيوع، باب في الرجل يبيع ما ليس عنده، ح:٣٥٠٤)

"سلف اور بیع حلال نہیں ہے اور نہ اس چیز کی بیع حلال ہے جو تمہارے پاس نہ ہو۔"

اسی طرح آپ نے حکیم بن حزام رضی اللہ عنہ سے فرمایا تھا:

«لاَ تَبِعْ مَا لَيْسَ عِنْدَكَ»(مسند أحمد:٣/ ٤٠٢ وسنن أبي داود، البيوع، باب في الرجل يبيع ما ليس عنده، ح:٣٥٠٣)

"اس سامان کو نہ بیچو جو تمہارے پاس موجود ہی نہ ہو۔"

اس مسئلہ یعنی مسئلہ' تورق' میں بیع جائز ہے بشرطیکہ مال بائع کے پاس موجود ہو اور اس کے قبضہ میں ہو اور پھر مشتری

کے لیے یہ جائز نہیں کہ اسے اپنے قبضہ و ملکیت میں لیے یا بازار میں منتقل کئے بغیر قرض دہندہ ہی کے پاس فروخت کر دے۔ قرض دہندہ کے پاس اس قیمت سے کم پر بیچنا بھی جائز نہیں جس پر اس نے خود خریدا ہو کیونکہ اس صورت کو سود کے لیے ایک حیلہ کے طور پر اختیار کیا جاتا ہے۔

اس سامان کو قرض دہندہ کے پاس اس قیمت سے کم پر بیچنا جس پر اس سے خریدا ہو صحیح نہیں ہے کیونکہ یہ بیع عینہ ہے جو سودی بیوع میں سے ہے۔ واللہ ولی التوفیق۔

—— شیخ ابن باز ——

قسطوں کے ساتھ بیع

سوال ایک شخص یہ کہتا ہے کہ میرے پاس مال ہے اور میں گاڑیوں کی نقد خریداری میں اس کی سرمایہ کاری کرنا چاہتا ہوں۔ گاڑی کی قیمت نو ہزار ریال ہے لیکن میں اسے ایک سال یا دو سال کی مدت کے لیے قسطوں پر چودہ ہزار یا دس ہزار ریال میں فروخت کر دیتا ہوں جب کہ دو ہزار یا تین ہزار ریال پیشگی بھی لے لیتا ہوں لیکن مجھے (اس میں) شک ہے کہ کیا یہ بیع صحیح ہے یا سودی ہے؟ میں دو سال سے اس طرح کی بیع کر رہا ہوں تو جواب تک ہو چکا ہے' اس کے بارے میں کیا حکم ہے؟

جواب اللہ تعالیٰ نے بیع کو حلال اور سود کو حرام قرار دیا ہے' ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ وَأَحَلَّ ٱللَّهُ ٱلْبَيْعَ وَحَرَّمَ ٱلرِّبَوٰاْ﴾ (البقرۃ۲/ ۲۷۵)

"اور سودے کو اللہ نے حلال کیا ہے اور سود کو حرام۔"

اللہ تعالیٰ نے جن بیوع کو حلال قرار دیا ہے' ان میں ادھار کی بیع بھی ہے اور اس کے جائز ہونے کی دلیل حسب ذیل ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ يَٰٓأَيُّهَا ٱلَّذِينَ ءَامَنُوٓاْ إِذَا تَدَايَنتُم بِدَيْنٍ إِلَىٰٓ أَجَلٍ مُّسَمًّى فَٱكْتُبُوهُ ۚ وَلْيَكْتُب بَّيْنَكُمْ كَاتِبٌۢ بِٱلْعَدْلِ ۚ وَلَا يَأْبَ كَاتِبٌ أَن يَكْتُبَ كَمَا عَلَّمَهُ ٱللَّهُ ۚ﴾ (البقرۃ۲/ ۲۸۲)

"اے مومنو! جب تم آپس میں کسی میعاد معین کے لیے قرض کا معاملہ کرنے لگو تو اس کو لکھ لیا کرو اور لکھنے والا تم میں سے کسی کا نقصان نہ کرے بلکہ انصاف سے لکھے اور نیز لکھنے والا جیسا اللہ نے اسے سکھایا ہے لکھنے سے انکار بھی نہ کرے۔"

قرطبی نے اپنی تفسیر میں لکھا ہے کہ اس بات پر اجماع ہے کہ یہ آیت کریمہ قرض کے لین دین کی تمام صورتوں کو شامل ہے۔ "صحیحین" میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے [1] کہ بریرہ کو اس کے مالکان نے نو اوقیوں میں (اسے) بیچا جسے نو قسطوں میں ادا کرنا تھا اور ہر سال ایک اوقیہ کی قسط تھی اور نبی کریم ﷺ نے اس معاملہ کو برقرار رکھا تھا۔ اس سے معلوم ہوا کہ معاملہ کی یہ صورت جائز ہے جس کے بارے میں سائل نے پوچھا ہے اور وہ اس آیت مذکورہ کے عموم میں داخل ہے۔ وباللہ التوفیق۔ وصلی اللہ علی نبینا محمد و علی آلہ وصحبہ وسلم

[1] صحیح بخاری' المکاتب' باب استعانة المکاتب --- الخ' حدیث: 2563 و صحیح مسلم' العتق' حدیث: 1504

—— فتویٰ کمیٹی ——

قسطوں پر بیع

سوال میں قسطوں پر گاڑیاں فروخت کرنے والی ایک کمپنی کے پاس گیا اور اس سے ایک گاڑی خریدی جس کی نقد قیمت پچاس ہزار پانچ سو اور قسطوں کی صورت میں چودہ فی صد زائد کے حساب سے مبلغ چون ہزار ایک سو اکتیس ریال ہے۔ میں نے دس ہزار نقد ادا کر دیئے تھے اور چوالیس ہزار ایک سو اکتیس باقی تھے جو بارہ ماہ کی قسطوں میں چودہ فی صد کی زائد شرح کے ساتھ ادا کرنا تھے۔ گاڑی خریدنے کے چار ماہ بعد اچانک مجھے اس زائد قیمت کا خیال آیا تو میں نے کمپنی سے اس چودہ فی صد زائد ادا کی جانے والی رقم کے بارے میں پوچھا تو کمپنی نے بتایا کہ یہ بینک کے اخراجات ہیں جس کی وجہ سے مجھے شک پیدا ہو گیا ہے' کیا یہ بیع حرام ہے یا حلال؟

جواب جب مشتری گاڑیوں کو فروخت کرنے والی کمپنی کے ساتھ اس بات پر متفق ہو جائے کہ ادھار کی صورت میں گاڑی کی قیمت مبلغ چون ہزار ایک سو اکتیس ہو گی جسے قسطوں میں ادا کیا جائے گا یا جس کا کچھ حصہ نقد اور کچھ ادھار ادا کیا جائے گا تو یہ بیع شرعاً جائز ہے خواہ ادھار کی صورت میں قیمت نقد کی نسبت زیادہ ہو۔

—— فتویٰ کمیٹی ——

قسطوں کی بیع میں کوئی حرج نہیں

سوال قسطوں کی صورت میں فروخت کی جانے والی گاڑیوں کی قیمت زیادہ ہوتی ہے' مثلاً ایک گاڑی کی اگر نقد قیمت پندرہ ہزار ہے تو قسطوں کی صورت میں اس کی قیمت اس سے زیادہ ہو گی تو کیا یہ بیع سود ہے؟

جواب قسطوں کی بیع میں کوئی حرج نہیں جب کہ مدت اور قسطیں معلوم ہوں خواہ قسطوں کی صورت قیمت میں نقد قیمت سے زیادہ ہو کیونکہ قسطوں کی صورت میں بائع اور مشتری دونوں فائدہ اٹھاتے ہیں۔ بائع زیادہ قیمت سے اور مشتری مہلت سے فائدہ اٹھاتا ہے۔

صحیحین میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے [1] کہ بریرہ کے مالکوں نے اسے نو سال کی قسطوں پر چالیس درہم سالانہ کی قسط پر بیچا تھا' تو اس سے معلوم ہوا کہ قسطوں کی بیع جائز ہے اور پھر بیع کی اس صورت میں دھوکہ' سود اور جہالت نہیں ہے لہٰذا یہ بھی دیگر تمام شرعی بیوع کی طرح جائز ہے۔

—— شیخ ابن باز ——

گاڑیوں کی قسطوں میں فروخت

سوال بعض بھائیوں نے جو قسطوں پر گاڑیوں کی خرید و فروخت کی تجارت کرتے ہیں یہ پوچھا ہے کہ وہ ماہانہ قسطوں کی بنیاد پر گاڑی فروخت کرتے ہیں کہ خریدار کے ساتھ قسطیں طے کر لیتے ہیں کیونکہ اسے گاڑی کی ضرورت ہوتی ہے اور

[1] صحیح بخاری المکاتب' باب استعانۃ المکاتب --- الخ' حدیث: 2563 و صحیح مسلم' العتق' حدیث: 1504

اس کے لیے گاڑی خریدنے سے پہلے ہی نفع سمیت بیع طے کر لیتے ہیں تو اس کے بارے میں کیا حکم ہے؟

جواب اگر بائع گاڑی کو اس کا مالک بنے' اسے اپنے نام کرانے اور اپنے قبضہ میں لینے کے بعد خریدار کو فروخت کرے تو اس میں کوئی حرج نہیں جبکہ اس سے پہلے فروخت کرنا جائز نہیں کیونکہ نبی کریم ﷺ نے حکیم بن حزام سے فرمایا تھا:

«لَا تَبِعْ مَا لَيْسَ عِنْدَكَ»(مسند أحمد: ٣/ ٤٠٢ وسنن أبي داود، البيوع، باب في الرجل يبيع ما ليس عنده، ح: ٣٥٠٣)

"اسے نہ بیچو جو تمہارے پاس موجود ہی نہ ہو۔"

نیز آپ نے فرمایا ہے:

«لَا يَحِلُّ سَلَفٌ وَّبَيْعٌ، وَّلَا بَيْعُ مَا لَيْسَ عِنْدَكَ»(سنن أبي داود، البيوع، باب في الرجل يبيع ما ليس عنده، ح: ٣٥٠٤)

"سلف اور بیع حلال نہیں ہے اور نہ یہ حلال ہے کہ وہ چیز بیچو جو تمہارے پاس موجود ہی نہ ہو۔"

یہ دونوں صحیح حدیثیں ہیں ان کے مطابق عمل کرنا اور ان کی مخالفت سے اجتناب کرنا واجب ہے۔ واللہ ولی التوفیق۔

———— شیخ ابن باز ————

قسطوں میں فروخت کرنا

سوال کیا قرض حرام ہے یا نہیں؟ اس سوال کا پس منظر یہ ہے کہ بعض لوگ اس طرح کرتے ہیں کہ وہ تقریباً سولہ ہزار میں ایک گاڑی خرید کر کسی دوسرے شخص کو قریباً چوبیس ہزار میں ایک سال کے قرض پر یا ماہانہ قسطوں کی صورت میں فروخت کر دیتے ہیں' کیا یہ طریقہ صحیح ہے یا نہیں؟ گاڑی کے مالک نے اس صورت میں جو زیادہ قیمت وصول کی ہے کیا یہ حلال ہے؟

جواب آدمی کے لیے یہ جائز ہے کہ وہ بوقت ضرورت گاڑی یا کوئی اور چیز قرض پر لے لے اور اسے نقد قیمت سے زیادہ پر خریدے۔ یہ زائد قیمت مدت کے مقابل ہو گی لیکن عقد بیع اس وقت تک جائز نہیں جب تک گاڑی بائع کے قبضہ میں نہ ہو اور اسے وہ اپنی جگہ سے آگے نہ بھیجے' قبضہ اور ملکیت کے بعد وہ مشتری سے کہہ سکتا ہے کہ یہ گاڑی میں نے خریدی تھی (اور اب تمہیں فروخت کرتا ہوں)' لیکن مقروض کی ضرورت سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اسے نقصان پہنچانا اور اس سے بہت زیادہ قیمت لے لینا جائز نہیں ہے' بلکہ مالدار کو چاہیئے کہ نرمی سے کام لے' تھوڑا نفع لے' کڑی شرطیں نہ لگائے اور قرض کی واپسی کے لیے بہت سختی نہ کرے۔

———— شیخ ابن جبرین ————

یہ حیلہ ہے

سوال میں ایک گاڑی خریدنا چاہتا تھا' گاڑیوں کے شو روم میں گیا' اور وہ گاڑی دیکھی جو میں (خریدنا) چاہتا تھا اور پھر ایک ایسے شخص کے پاس گیا جس سے میری جان پہچان تھی اور وہ قسطوں پر گاڑیوں کی خرید و فروخت کا کام کرتا ہے۔ میں

نے یہ مسئلہ اس کے سامنے پیش کیا تو اس نے کہا کہ میں وہ گاڑی تمہیں خرید کر دے دیتا ہوں لیکن قسطوں کی وجہ سے دس ہزار زیادہ قیمت وصول کروں گا تو میں نے شو روم پر جا کر پانچ سو ریال بیعانہ دے دیا اور پھر وہ میرے ساتھ شو روم پر آیا' گاڑی خریدی' تحریر لکھ دی اور اس نے اس کی نقد قیمت ادا کر دی اور جب ہم شو روم سے باہر نکلے تو اس نے پوچھا کہ گاڑی کہاں ہے؟ میں نے اسے گاڑی دکھائی تو اس نے کہا کہ تمہیں گاڑی مبارک ہو اور یہ کہہ کہ وہ چلا گیا۔ میں نے گاڑی لے لی جبکہ وہ اس کے نام پر ہے اور اس کے بعد میں نے حسب معاہدہ ماہانہ قسطیں ادا کرنا شروع کر دیں' تو سوال یہ ہے کہ کیا یہ بیع جائز ہے یا ناجائز؟ گاڑی تقریباً ایک سال سے میرے قبضہ میں ہے اور میں اسے قطعاً اس شرط کے ختم کرنے پر آمادہ نہیں کر سکتا جو زیادہ قیمت ادا کرنے کے سلسلہ میں اس سے کی تھی۔ میری اس مسئلہ میں رہنمائی فرمائیں۔ جزاکم اللہ خیراً۔

جواب یہ بیع حرام اور سود کے لیے ایک حیلہ ہے کیونکہ حقیقت امر یہ ہے کہ اس آدمی نے آپ کو گاڑی کی قیمت سود پر قرض دی ہے اور اس نے اسے محض صوری طور پر خریدا ہے جبکہ اس کا اپنے لیے گاڑی خریدنا مقصود نہ تھا۔ اللہ تعالیٰ نے جن امور کو حرام قرار دیا ہے' وہ حیلہ سازیوں سے حلال نہیں ہو جاتے بلکہ حیلہ سازیوں سے تو قباحت اور خباثت میں اور بھی اضافہ ہو جاتا ہے اور یہ حیلہ سازیاں آدمی کو ان یہودیوں کے مشابہ بنا دیتی ہیں جو گھٹیا حیلوں کے ذریعہ اللہ تعالیٰ کی حرام کردہ باتوں کو حلال ٹھہرا لیا کرتے تھے' چنانچہ صحیح حدیث میں ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ان کے بارے میں فرمایا:

«قَاتَلَ اللهُ الْيَهُودَ، إِنَّ اللهَ لَمَّا حَرَّمَ (عَلَيْهِمْ) شُحُومَهَا جَمَلُوهُ ثُمَّ بَاعُوهُ فَأَكَلُوا ثَمَنَهُ»(صحيح البخاري، البيوع، باب بيع الميتة والأصنام، ح:٢٢٣٦ وصحيح مسلم، المساقاة، باب تحريم بيع الخمر والميتة ... الخ، ح:١٥٨١)

"اللہ تعالیٰ یہودیوں کو غارت کرے جب اللہ تعالیٰ نے ان پر جانوروں کی چربیوں کو حرام قرار دیا تو انہوں نے ان چربیوں کو پگھلا کر بیچ دیا اور ان کی قیمت کو کھانے لگے۔"

اصحاب سبت کے واقعہ کو تو ہر مومن کتاب اللہ میں پڑھتا ہے کہ دریا کے کنارے آباد بستی کے لوگوں کے لیے اللہ تعالیٰ نے ہفتہ کے دن مچھلی کے شکار کو حرام قرار دیا تھا اور ان کی آزمائش کے طور پر ہفتہ کے دن سطح آب پر مچھلیاں اس قدر کثرت سے نمودار ہوتی تھیں کہ دوسرے دنوں میں اس طرح نمودار نہیں ہوتی تھیں' لیکن جب مدت دراز ہو گئی تو انہوں نے دیکھا کہ اب مچھلی کے شکار کے بغیر چارۂ کار نہیں تو انہوں نے یہ حیلہ اختیار کیا کہ وہ جمعہ کے دن پانی میں جال ڈال دیتے تھے' ہفتہ کے دن آنے والی مچھلیاں ان کے جال میں پھنس جاتی تھیں اور یہ اتوار کے دن انہیں اپنے جال سے نکال لیا کرتے تھے' تو پھر انہیں اس حیلہ سازی کی سزا کیا ملی؟ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ وَلَقَدْ عَلِمْتُمُ ٱلَّذِينَ ٱعْتَدَوْا۟ مِنكُمْ فِى ٱلسَّبْتِ فَقُلْنَا لَهُمْ كُونُوا۟ قِرَدَةً خَـٰسِـِٔينَ ﴿٦٥﴾ فَجَعَلْنَـٰهَا نَكَـٰلًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهَا وَمَا خَلْفَهَا وَمَوْعِظَةً لِّلْمُتَّقِينَ ﴿٦٦﴾ ﴾ (البقرة٢/ ٦٥-٦٦)

"اور تم ان لوگوں کو خوب جانتے ہو جو تم میں سے ہفتے کے دن (مچھلی کا شکار کرنے) میں حد سے تجاوز کر گئے تھے تو ہم نے ان سے کہا کہ ذلیل و خوار بندر ہو جاؤ اور اس قصے کو اس وقت کے لوگوں کے لیے اور جو ان کے بعد آنے والے تھے عبرت اور پرہیز گاروں کے لیے نصیحت بنا دیا۔"

اس موقع کی مناسبت سے میں اپنے مسلمان بھائیوں کو یہ نصیحت کرتا ہوں کہ وہ ان امور کے بارے میں حیلوں بہانوں سے کام نہ لیں' جنہیں اللہ تعالیٰ نے حرام قرار دیا ہے اور پھر یاد رہے کہ عقود میں اعتبار مقاصد کا ہوتا ہے اور نبی کریم ﷺ کا فرمان ہے:

«إِنَّمَا الأَعْمَالُ بِالنِّيَّاتِ وَإِنَّمَا لِكُلِّ امْرِىءٍ مَّا نَوٰی»(صحيح البخاري، بدء الوحي، باب كيف كان بدء الوحي ... الخ، ح:١ وصحيح مسلم، الإمارة، باب قوله ﷺ إنما الأعمال بالنية ... الخ، ح:١٩٠٧)

"تمام اعمال کا انحصار نیتوں پر ہے اور ہر آدمی کے لیے صرف وہی ہے جو اس نے نیت کی۔"

اور اگر یہ شخص واقعی اس کا دوست ہے تو پھر کیا خوب تھا کہ اسے سود کے بغیر قرض حسنہ دے دیتا اور اس طرح ان محسنین کی صف میں شامل ہو جاتا جن کے بارے میں ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ إِنَّ ٱللَّهَ يُحِبُّ ٱلْمُحْسِنِينَ ﴿١٩٥﴾ ﴾ (البقرة٢/ ١٩٥)

"بے شک اللہ نیکی کرنے والوں کو دوست رکھتا ہے۔"

میں اس بھائی اور دوست کو جس نے یہ معاملہ کیا ہے' نصیحت کرتا ہوں کہ گاڑی کی قیمت پر وصول کرنے والے اس سود کو ختم کر دے اور صرف گاڑی کی اس اصلی قیمت کے وصول کرنے پر اکتفاء کرے جس پر آپ نے اسے خریدا ہے۔

——— شیخ ابن عثیمین ———

قسطوں پر اس سامان کو بیچنا جس کا وہ مالک نہ ہو

سوال یہ دیکھا گیا ہے کہ بعض کمپنیاں اس طرح کا کاروبار کرتی ہیں کہ جب ان کے پاس کوئی ایسا شخص آتا ہے جسے سامان یا گاڑی یا گھر وغیرہ خریدنے کی ضرورت ہوتی ہے اور یہ چیزیں کمپنیوں کے پاس نہیں ہوتیں تو وہ ضرورت کی یہ اشیاء خرید کر اس شخص کو قسطوں پر نفع کے ساتھ بیچ دیتی یا کمپنیاں اسے کہہ دیتی ہیں کہ تم خود ہی اپنی ضرورت کا سامان خرید لو اور یہ بل ادا کر دیتی اور اس شخص سے نفع لیتی ہیں تو اس کے بارے میں کیا حکم ہے؟

جواب یہ بات معلوم ہے کہ جو شخص مثلاً ایک لاکھ قرض لے کہ وہ اسے قسطوں میں ادا کرے گا اور ہر قسط کے ساتھ آٹھ فی صد زیادہ ادا کرے گا اور اس شرح میں خواہ مدت زیادہ ہونے کی صورت میں اضافہ ہو یا نہ ہو یہ رباہے' ربا النسیئہ اور ربا الفضل۔ اور اگر مدت میں اضافہ ہونے کے ساتھ ساتھ شرح سود میں بھی اضافہ ہوتا چلا جائے تو اس کی قباحت میں اور بھی اضافہ ہو جاتا ہے کیونکہ یہی وہ زمانہ' جاہلیت کا سود ہے جس کے بارے میں ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ يَٰٓأَيُّهَا ٱلَّذِينَ ءَامَنُوا۟ لَا تَأْكُلُوا۟ ٱلرِّبَوٰٓا۟ أَضْعَٰفًا مُّضَٰعَفَةً ۖ وَٱتَّقُوا۟ ٱللَّهَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ ﴿١٣٠﴾ وَٱتَّقُوا۟ ٱلنَّارَ ٱلَّتِىٓ أُعِدَّتْ لِلْكَٰفِرِينَ ﴿١٣١﴾ وَأَطِيعُوا۟ ٱللَّهَ وَٱلرَّسُولَ لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُونَ ﴿١٣٢﴾ ﴾ (آل عمران٣/ ١٣٠۔١٣٢)

"اے ایمان والو! دگنا چوگنا سود نہ کھاؤ اور اللہ سے ڈرو تاکہ تم نجات حاصل کرو اور (دوزخ کی) آگ سے بچو جو کافروں کے لیے تیار کی گئی ہے اور اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرو تاکہ تم پر رحمت کی جائے۔"

یاد رہے اس معاملہ میں کسی حیلہ سازی سے کام لینا اللہ تعالیٰ کے حرام کردہ امور کے بارہ میں حیلہ سازی ہے اور اس ذات اقدس کے ساتھ مکرو فریب ہے جو آنکھوں کی خیانت اور دلوں کے بھید سے خوب آگاہ ہے۔

یاد رہے حیلوں بہانوں سے اللہ تعالیٰ کے حرام کردہ امور اس وقت حلال نہیں ہو جاتے' جب ان کی ظاہری صورت حلال مگر ان سے مقصود حرام ہو اور پھر حیلہ سازیوں سے تو حرام امور کی قباحت میں اور بھی اضافہ ہو جاتا ہے کیونکہ حیلہ کرنے والا دو حرام کاموں کا ارتکاب کرتا ہے (۱) احکام الٰہی کے ساتھ مکرو فریب اور تلاعب اور (۲) اس حرام کا ارتکاب جس کے لیے اس نے حیلہ سے کام لیا ہے۔

یاد رہے اللہ تعالیٰ کے حرام کردہ امور کے بارے میں حیلہ سازی وہ جرم ہے جس کا یہودیوں نے ارتکاب کیا تھا' اس لیے حیلہ سازی کرنے والا یہودیوں کے مشابہہ بھی ہو جاتا ہے' چنانچہ حدیث شریف میں آیا ہے:

«لَا تَرْتَكِبُوا مَا ارْتَكَبَتِ الْيَهُودُ فَتَسْتَحِلُّوا مَحَارِمَ اللهِ بِأَدْنَى الْحِيَلِ» (تفسير ابن كثير: ١/ ١٦٠، ٢/ ١١٦٨، مطبوعه دارالسلام، بحواله أبوعبدالله بن بطة)

"تم اس جرم کا ارتکاب نہ کرو جس کا یہودیوں نے ارتکاب کیا تھا اور وہ یہ کہ گھٹیا حیلوں کے ساتھ اللہ تعالیٰ کے حرام کردہ امور کو حلال ٹھہرانے لگ جاؤ۔"

جو شخص بھی خواہش نفس سے پاک ہو کر غور کرے گا' اسے معلوم ہو جائے گا کہ جو شخص گاڑی کے خریدار سے یہ کہے کہ جاؤ شو روم میں جا کر اس گاڑی کو پسند کر لو جسے تم خریدنا چاہتے ہو تو میں اسے شو روم سے خرید کر تمہیں قسطوں پر بیچ دوں گا---- یا وہ زمین کے خریدار سے کہے کہ سکیم میں جا کر اس زمین کو پسند کر لو جسے تم خریدنا چاہتے ہو اور پھر اس پلاٹ کو خرید کر میں تمہیں قسطوں میں بیچ دوں گا۔ یا مکان بنانے کے لیے لوہے کے ضرورت مند سے کہے یا سیمنٹ کے ضرورت مند سے کہے کہ فلاں مارکیٹ میں جا کر لوہے اور سیمنٹ کو پسند کر لو جسے تم خریدنا چاہتے ہو تو اسے میں خرید کر قسطوں پر تمہیں بیچ دوں گا۔ تو جو شخص بھی خواہش نفس سے پاک ہو کر ان صورتوں پر غور کرے گا تو اسے معلوم ہو جائے گا کہ یہ محض سود کے لیے ایک حیلہ ہے کیونکہ جس تاجر نے مذکورہ بالا سامان خریدا ہے' اس کا مقصد یہ سامان خریدنا نہ تھا اور نہ اس کا ایسا کوئی ارادہ تھا اور نہ اس نے ضرورت مند کے ساتھ احسان کے لیے اسے خریدا ہے' بلکہ اس نے تو اسے محض اس لیے خریدا ہے کہ جس مدت کے لیے یہ قرض دے رہا ہے اس کے عوض فائدہ حاصل کر سکے اور جیسے جیسے اس کے ادا کرنے کی مدت میں اضافہ ہو گا اس فائدہ میں بھی اضافہ ہوتا چلا جائے گا۔ حقیقت میں اس کی مثال اس طرح ہے جیسے کوئی یہ کہے کہ ان اشیاء کی قیمت میں تجھے قرض دے دیتا ہوں لیکن اس پر تمہیں سود ادا کرنا ہو گا لیکن اس نے درمیان میں سامان کو داخل کر لیا ہے جیسا کہ ثابت ہے کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے ایک آدمی کے بارے میں یہ پوچھا گیا کہ اس نے دوسرے آدمی کو ایک سو درہم میں حریرہ بیچا اور پھر اس سے پچاس درہم میں خرید لیا تو انہوں نے فرمایا کہ یہ درہموں کی درہموں کے اضافہ کے ساتھ بیع ہے اور درمیان میں حریرہ داخل ہو گیا ہے۔ حافظ ابن القیم رحمہ اللہ تہذیب السنن (۵/ ۱۰۳) میں فرماتے ہیں کہ "یہ ربا ہے اور اس کی حرمت اس کے معنی کے تابع ہے اور بیع کی صورت کے نام بدلنے سے اس کی حقیقت تبدیل نہیں ہو گی۔"

اگر آپ اس مسئلہ کا مسئلہ عینہ کے ساتھ تقابل کریں تو اسے مسئلہ عینہ کی بعض صورتوں کی نسبت زیادہ قریب پائیں گے

کیونکہ عینہ تو جیسا کہ فقہاء نے کہا ہے یہ ہے کہ کوئی کسی شخص کو ادھار پر کوئی سامان بیچ دے اور پھر وہ نقد ادا کر کے کم قیمت پر اس سے خرید لے' اس صورت میں بسااوقات بائع کی اسے خریدنے کی نیت بھی نہیں ہوتی لیکن اس کے باوجود یہ حرام ہے اور حیلہ ساز بائع کی اس بات سے یہ معاملہ جائز نہیں ہو جاتا کہ میں نے اسے اس سامان کے خریدنے پر مجبور تو نہیں کیا' کیونکہ یہ تو معلوم ہی ہے کہ مشتری نے اپنی ضرورت ہی کی وجہ سے تو اس سے اس کا مطالبہ کیا ہے اور وہ اس کے خریدنے سے رکے گا بھی نہیں کیونکہ جو لوگ اس طرح سامان خریدنا چاہتے ہیں' ہم نے نہیں سنا کہ کوئی اس کے خریدنے سے باز رہا ہو۔ حیلہ ساز تاجر نے اپنے لیے بظاہر احتیاط سے کام لیا ہے حالانکہ وہ جانتا ہے کہ مشتری اسے ضرور خریدے گا الا یہ کہ اسے سامان میں کوئی عیب یا اس کی کوالٹی میں کوئی نقص نظر آئے۔

اگر کہا جائے کہ جب یہ معاملہ سود کے لیے حیلہ ہے تو کیا کوئی ایسی صورت بھی ہے جس سے یہ مسئلہ سود کے بغیر بھی حل ہو جائے؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی حکمت اور رحمت کے ساتھ اپنے بندوں سے مصلحتوں کے دروازے کو بند نہیں کیا' اگر اللہ تعالیٰ نے ضرر کی وجہ سے ایک چیز کو اپنے بندوں کے لیے حرام قرار دیا ہے تو اس نے ایسے کئی دروازے بھی کھول دیئے ہیں جو ضرر کے بغیر بندوں کی مصلحتوں پر مشتمل ہیں۔ اس معاملہ میں سلامتی کا راستہ یہ ہے کہ یہ سامان تاجر کے پاس موجود ہونا چاہیئے جسے وہ خریداروں کو ادھار بیچ دے' خواہ ادھار کی صورت میں زیادہ قیمت وصول کرے اور میرا خیال ہے کہ بڑے تاجر ایسے سامان خریدنے سے عاجز نہیں ہوتے جن کی خریداری میں لوگوں کی بہت دلچسپی ہو تاکہ وہ اپنی پسندیدہ قیمت کے ساتھ بیچ سکیں اور انہیں سود سے محفوظ رہ کر مطلوبہ نفع بھی حاصل ہو سکے' اور اگر ان کی نیت ان خریداروں کے لیے آسانی پیدا کرنا ہو جو نقد قیمت ادا کر کے خریدنے سے عاجز و قاصر ہوں تو انہیں امید ہے کہ آخرت میں اجر و ثواب بھی ملے گا کہ ارشاد نبوی ہے:

«إِنَّمَا الْأَعْمَالُ بِالنِّيَّاتِ، وَإِنَّمَا لِكُلِّ امْرِیءٍ مَّا نَوٰی»(صحيح البخاري، بدء الوحي، باب كيف كان بدء الوحي . . . الخ، ح:١ وصحيح مسلم، الإمارة، باب قوله ﷺ إنما الأعمال بالنية . . . الخ، ح:١٩٠٧)

''تمام اعمال کا انحصار نیتوں پر ہے اور ہر آدمی کے لیے صرف وہی ہے جس کی وہ نیت کرے۔''

سائل نے جو یہ ذکر کیا ہے کہ کمپنی اسے ہی کہہ دیتی ہے کہ وہ اپنے مطلوبہ سامان کو خرید لے' اگر کمپنی نے اسے اپنا وکیل بنایا ہے تو پھر وہ وہی مسئلہ ہے جس کے بارے میں ہم نے گفتگو کی ہے اور اگر کمپنی کا مقصد یہ ہے کہ وہ اپنے لیے سامان خریدے تو یہ ایسا قرض ہے جو موجب منفعت ہے اور اس کے صریحاً ربا ہونے میں کوئی اشکال نہیں ہے۔

——— شیخ ابن عثیمین ———

جائز بیع سلم کے چند مسائل

سوال جب کوئی شخص ضرورت مند ہو اور وہ کسی سے کچھ نقد رقم اس شرط پر ادھار لے کہ وہ ایک معین مدت کے بعد اس رقم کے عوض اتنے صاع گندم یا مکئی دے دے گا لیکن جب وہ یہ سودا کرتا ہے' اس وقت گندم یا مکئی ابھی تک کھانے کے قابل نہیں ہے؟

جواب جب قرض دہندہ مقروض کے ذمہ مذکورہ صاع لازم قرار دے دے گا' تو یہ مسئلہ مسائل سلم میں سے شمار ہو گا اور سلم بیع کی ایک قسم ہے جو کہ حسب ذیل سات شرطوں کے ساتھ صحیح ہے:

(۱) یہ بیع ایسے سودے کے بارے میں ہو جس کی صفت کو ضبط کرنا ممکن ہو۔

(۲) اس کی ایسی صفت بیان کرے جس سے قیمت کا اختلاف ظاہر ہو۔

(۳) ناپ والی چیز میں اس کے ناپ' تول والی چیز میں اس کے وزن اور پیمائش والی چیز کے بارے میں اس کی پیمائش کی مقدار کو بیان کرے۔

(۴) جس چیز کی بیع سلم کی جا رہی ہو' اسے سپرد کرنے کے لیے مدت معلوم کی شرط عائد کرے۔

(۵) جس چیز کے بارے میں بیع سلم کی جا رہی ہو وہ اپنی جگہ پر موجود ہو۔

(۶) معاہدہ کی مجلس میں قیمت کو اپنے قبضہ میں لے لے۔

(۷) بیع سلم ذمہ کے بارے میں کرے اور اگر سامان کے بارے میں کی تو صحیح نہیں ہو گی۔ قرآن مجید سے بیع سلم کے جواز کی دلیل حسب ذیل آیت کریمہ ہے:

﴿ يَٰٓأَيُّهَا ٱلَّذِينَ ءَامَنُوٓاْ إِذَا تَدَايَنتُم بِدَيۡنٍ إِلَىٰٓ أَجَلٖ مُّسَمّٗى فَٱكۡتُبُوهُۚ ﴾ (البقرة۲/ ۲۸۲)

"اے مومنو! جب تم آپس میں کسی میعاد معین کے لیے قرض کا معاملہ کرنے لگو تو اس کو لکھ لیا کرو۔"

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں "میں گواہی دیتا ہوں کہ وہ قرض جو ایک مدت کے لیے سپرد کیا گیا ہو' اسے اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں حلال قرار دیا اور اس کی اجازت دی ہے اور پھر آپ نے تائید میں اسی مذکورہ بالا آیت کو پڑھا۔ اسے سعید (بن منصور) نے روایت کیا ہے۔

سنت سے اس کی دلیل حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی یہ حدیث ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم جب مدینہ میں تشریف لائے تو اہل مدینہ پھلوں کی ایک یا دو سال کی ادھار بیع کیا کرتے تھے تو آپ نے فرمایا:

«مَنْ أَسْلَفَ فِي شَيْءٍ فَلْيُسْلِفْ فِي كَيْلٍ مَعْلُومٍ، وَوَزْنٍ مَعْلُومٍ، إِلَى أَجَلٍ مَعْلُومٍ»(صحيح البخاري، السلم، باب السلم في وزن معلوم، ح: ٢٢٤٠ وصحيح مسلم، المساقاة، باب السلم، ح: ١٦٠٤)

"جو شخص کسی چیز کی ادھار بیع کرے تو وہ معلوم ناپ' معلوم وزن اور معلوم مدت تک کے لیے بیع کرے۔"

وصلى الله على محمد وعلى آله وصحبه وسلم

فتویٰ کمیٹی

بیع سلم کے کچھ اور مسائل

سوال جب کوئی شخص معلوم وزن کی کھجوروں کی بیع سلم کے سلسلہ میں کسی کو کچھ درہم دے تو کیا اس کے لیے یہ جائز ہے کہ وزن کے اندازے کے مطابق کھجوروں کے کچھ درخت لے لے جبکہ پھل کے پکنے کا آغاز ہو گیا ہو یا اس طرح اندازے سے درخت لینا جائز نہیں ہے؟

جواب اس مسئلہ میں اختلاف ہے' بعض اہل علم نے اسے جائز اور بعض نے ناجائز قرار دیا ہے۔ جن لوگوں نے اسے جائز قرار دیا ہے انہوں نے اس شرط کے ساتھ اسے مشروط قرار دیا ہے کہ ان درختوں کا پھل یقینی طور پر اس سے کم ہو جو مقروض کے ذمہ ہے اور دونوں اس پر راضی بھی ہوں اور معاہدہ کے وقت ایسی کوئی شرط عائد نہ کی ہو۔ ان حضرات کا استدلال حضرت جابر کے قصہ سے ہے جو کہ "صحیح" میں موجود ہے [1] اور پھر باب الابقاء' باب بیع سے زیادہ وسیع ہے اور اس میں اس چیز کی بھی ضرورت پیش آ سکتی ہے جس کی بیع میں ضرورت پیش نہیں آتی۔ اس مسئلہ کا تعلق اس صورت سے بھی ہے کہ اپنا کچھ حق لے لیا جائے اور باقی معاف کر دیا جائے' نیز اس صورت میں مقروض کے ساتھ نرمی' احسان اور رواداری بھی ہے کہ اس سے پورا مال لینے کے بجائے تھوڑے ہی پر اکتفاء کیا جا رہا ہے۔

جمہور نے اسے ناجائز قرار دیا ہے اور "صحیحین" میں موجود حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی اس حدیث سے استدلال کیا ہے جس میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے:

«مَنْ أَسْلَفَ فِيْ شَيْءٍ فَلْيُسْلِفْ فِي كَيْلٍ مَّعْلُومٍ، وَّوَزْنٍ مَّعْلُومٍ، إِلٰى أَجَلٍ مَّعْلُومٍ»(صحيح البخاري، السلم، باب السلم في وزن معلوم، ح:٢٢٤٠ وصحيح مسلم، المساقاة، باب السلم، ح:١٦٠٤)

"جو شخص کسی چیز کی بیع سلم کرے تو وہ معلوم ناپ' معلوم وزن اور معلوم مدت کے لیے کرے۔"

اس حدیث کا مضمون عام ہے جبکہ حضرت جابر رضی اللہ عنہ کا قصہ خاص ہے جس کا حکم عام نہیں ہے۔ لہٰذا سد ذریعہ کے لیے یہ عدم جواز کا نقطہ نظر ہی راجح ہے۔ ان حضرات کا استدلال "صحیحین" [2] میں حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی اس حدیث سے بھی ہے جس میں بیع المزابنہ کی ممانعت ہے' جس کی صورت یہ ہوتی ہے کہ وہ اپنے کھیت کے پھل کو اگر وہ کھجور ہے تو کھجور کے ساتھ اور اگر فصل ہے تو کھانے کی اشیاء کے ساتھ اور اگر تازہ انگور ہوں تو کشمش (خشک انگور) کے ساتھ ناپ کر بیچ دے۔

ان دونوں میں سے پہلا قول زیادہ راجح ہے کیونکہ حدیث جابر اس کے جواز کی نص ہے' نیز مذکورہ بالا وجوہ سے بھی اس کی حلت معلوم ہوتی ہے۔ یعنی پیمائش وزن اور مدت متعین ہونی چاہئے لیکن اگر درختوں کے پھل کی مقدار کم' برابر یا زیادہ ہونے کا محض احتمال ہو تو پھر یہ بیع بالاتفاق ممنوع ہے جیسا کہ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی سابقہ حدیث کے عموم سے معلوم ہوتا ہے۔

—— فتویٰ کمیٹی ——

مشترکہ ملکیت میں سے اپنے حصہ کی بیع

سوال مشترکہ ملکیت کے ایک ایسے قطعہ اراضی میں سے اپنے حصہ کو بیچنے کے بارے میں کیا حکم ہے جس کے حدود' پیمائش اور موقع و محل معروف ہو اور اس حصہ کی دستاویز بھی موجود ہو جس سے اس قطعہ اراضی کی ملکیت میں اشتراک ثابت ہوتا ہو اور اس حصہ کی مقدار کا بھی تعین ہوتا ہو؟

---

[1] صحیح بخاری' البیوع' باب الکیل علی البائع والمعطی' حدیث: 2127-

[2] صحیح بخاری' البیوع' باب بیع المزابنة --- الخ' حدیث: 2185 و صحیح مسلم' البیوع' حدیث: 1539

جواب ایسی مشترکہ جاگیر میں سے جس کے حدود' پیائش اور موقع و محل معروف ہو اپنے حصہ کو بیچنے میں کوئی حرج نہیں جب کہ اس حصہ کی نسبت بھی معلوم ہو کہ یہ چوتھا' آٹھواں یا چالیسواں حصہ وغیرہ ہے' تو اس حصہ کے بطور بیع' شراء' ہبہ' وراثت اور رہن وغیرہ کے لین دین میں کوئی حرج نہیں۔ آدمی کو شرعی طور پر تصرف کے جو حقوق حاصل ہیں' وہ سب یہاں استعمال کر سکتا ہے کیونکہ شرعی طور پر کوئی امر اس سے مانع نہیں ہے۔ وصلى الله على محمد وعلى آله وصحبه وسلم۔

——— فتویٰ کمیٹی ———

کھجور کے درختوں پر پھل کی بیع

سوال کچھ لوگ کھجور کے درختوں پر پھل کو معین قیمت کے ساتھ اس وقت خریدتے ہیں جبکہ وہ پکنا شروع ہو جاتا ہے اور پھل ابھی تک درختوں ہی پر ہوتا ہے تو وہ نفع لے کر آگے بیچ دیتے ہیں' کیا یہ جائز ہے یا ناجائز؟

جواب یہ بیع جائز ہے کیونکہ یہ کتاب و سنت سے بیع کے دلائل کے عموم میں داخل ہے اور ہمیں کوئی ایسی دلیل معلوم نہیں جو اسے اس عموم سے خارج کرتی ہو۔ اور اس لیے بھی کہ یہ "مقبوض بالتخلية" (بائع کا مشتری کو مبیع میں تصرف کا اختیار دینا) ہے۔

——— فتویٰ کمیٹی ———

محنت کی وجہ سے قیمت میں اضافہ

سوال کیا یہ جائز ہے کہ میں جب دور سے سامان خرید کر لاؤں تو اسے اپنے پاس منتقل کرنے اور محنت کرنے کی وجہ سے اس کی قیمت میں تھوڑا سا اضافہ کر کے بیچوں یا یہ اضافہ سود شمار ہو گا؟

جواب ان شاء الله اس میں کوئی حرج نہیں جب آپ سامان خریدیں' اس کی قیمت ادا کر دیں اور دوسرے شہر اسے منتقل کر کے نفع کے ساتھ بیچیں کہ آپ نے کام کیا ہے' اسے اپنے شہر منتقل کیا ہے اور اس پر اپنی رقم خرچ کی ہے۔ یہ بالکل اسی طرح ہے جس طرح تمام لوگ اپنے خریدے ہوئے سامان کو نفع پر بیچتے ہیں' لیکن اگر آپ نے سامان کو اپنے کسی ایسے دوست کے لیے خریدا ہو جس نے آپ کو وکیل بنایا ہو' اس نے خریدنے کے لیے آپ کو رقم دی ہو اور آپ نے اس کے لیے خریدا ہو تو پھر اصل رقم اور حمل و نقل کی اجرت کے سوا اس سے زیادہ رقم نہ لیں۔

——— شیخ ابن جبرین ———

مسلمانوں کو اپنی شرطوں کا پاس کرنا چاہیئے

سوال میں ایسے صوفے بنانے کی صنعت سے وابستہ ہوں' جن کو لکڑی کی چھیلن کے ساتھ بھرا جاتا ہے اور جب میں انہیں بیچتا ہوں تو خریدار کو سمجھا دیتا ہوں کہ انہیں چھیلن کے ساتھ بھرا گیا ہے تو کیا یہ کاروبار جائز ہے؟

جواب جب آپ خریدار کو یہ بتا دیتے ہیں کہ صوفوں کو چھیلن کے ساتھ بھرا گیا ہے اور چھیلن کی یہ قسم اس طرح نمایاں

ہو کہ جب آپ خریدار کو بتائیں تو وہ گویا اس کو دیکھ رہا ہو تو پھر اس میں کوئی گناہ نہیں کیونکہ یہ حدیث کے عموم میں داخل ہے:

«اَلْمُسْلِمُونَ عَلٰی شُرُوطِهِمْ»(جامع الترمذي، الأحكام، باب ما ذكر عن رسول الله ﷺ في الصلح بين الناس، ح:١٣٥٢ وسنن أبي داود، ح:٣٥٩٤)

"مسلمانوں کو اپنی شرطوں کا پاس کرنا چاہیے۔"

——— فتویٰ کمیٹی ———

نفع کی حد اور بھاؤ مقرر کرنا

سوال کیا تجارت میں نفع کی کوئی حد مقرر ہے؟ بھاؤ مقرر کرنے کے بارے میں کیا حکم ہے؟

جواب نفع کی کوئی حد مقرر نہیں ہے کہ یہ تو اللہ عزوجل کی طرف سے رزق ہے اور اللہ تعالیٰ کبھی انسان کو رزق کثیر سے نوازتا ہے کہ اسے کبھی دس فی صد یا اس سے بھی زیادہ نفع ہو جاتا ہے کہ ہو سکتا ہے اس نے سستے بھاؤ کوئی چیز خریدی ہو اور پھر نرخ میں اضافہ ہو جانے کی وجہ سے اسے زیادہ نفع ہو گیا ہو اور کبھی صورت اس کے برعکس بھی ہو سکتی ہے کہ اس نے کوئی چیز مہنگی خریدی ہو اور پھر بعد میں وہ بہت سستی ہو گئی ہو' پس جائز نفع کی کوئی حد مقرر نہیں ہے۔

ہاں البتہ اگر سامان اور اس کی مارکیٹنگ اسی انسان سے مخصوص ہو تو پھر اس کے لے یہ حلال نہیں کہ لوگوں سے بہت زیادہ نفع لے کیونکہ اس صورت میں یہ بیع المضطر کے مشابہہ ہو گا کیونکہ جب لوگوں کو جس چیز کی حاجت ہو اور وہ صرف ایک ہی معین شخص کے پاس موجود ہو تو لوگ اسی سے خریدیں گے خواہ اس کی قیمت کتنی ہی زیادہ کیوں نہ ہو' تو اس صورت میں حکومت اور حکمرانوں کو مداخلت کر کے نرخ مقرر کرنا چاہیئے اور مناسب نفع کا تعین کر دینا چاہیئے کہ جو اس قدر کم بھی نہ ہو کہ اسے نقصان پہنچے اور نہ اس قدر زیادہ ہو کہ دوسروں کو نقصان پہنچے' اس سے معلوم ہوا کہ بھاؤ مقرر کرنے کی دو قسمیں ہیں:

۱۔ لوگوں پر ظلم اور ذخیرہ اندوزی کی وجہ سے جس بھاؤ کے مقرر کرنے کے لیے حکمران مجبور ہوں تو اس میں کوئی حرج نہیں کیونکہ اس کا تعلق سیاست حسنہ سے ہے اور حدیث سے ثابت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا ہے:

«لَا يَحْتَكِرُ إِلَّا خَاطِئٌ»(صحيح مسلم، المساقاة، باب تحريم الاحتكار في الأقوات، ح:١٦٠٥)

"صرف خطا کار ہی ذخیرہ اندوزی کرتا ہے۔"

اور خطا کار وہ ہے جو جان بوجھ کر خطا کا ارتکاب کرے اور اگر وہ غلطی کی وجہ سے ایسا کر رہا ہو تو واجب ہے کہ حکمرانوں کی وساطت سے اس کی اصلاح کی جائے کہ جب کوئی انسان کسی چیز کی ذخیرہ اندوزی کرے' سامان کسی اور کے پاس موجود نہ ہو اور لوگوں کو اس کی ضرورت ہو تو حکمرانوں پر یہ واجب ہے کہ وہ مداخلت کریں اور نفع کی ایک ایسی حد مقرر کر دیں جس سے بائع کو بھی نقصان نہ ہو اور مشتری کو بھی فائدہ ہو۔

۲۔ اگر قیمتوں میں اضافہ کسی ظلم کا نتیجہ نہ ہو بلکہ وہ اللہ تعالیٰ ہی کی طرف سے ہو کہ کسی چیز کی قلت ہو گئی ہو یا اس کا کوئی اور ایسا سبب ہو جو معاشی حالات پر اثر انداز ہوا ہو تو ایسی صورت میں نرخ مقرر کرنا حلال نہیں ہے کیونکہ یہ کسی ایسے

شخص کے ظلم کا ازالہ نہیں جس نے نرخ بڑھا دیا ہو اور پھر سب امور تو اللہ تعالیٰ ہی کے ہاتھ میں ہیں۔ نبی کریم ﷺ کے دور میں جب مدینہ میں قیمتوں میں اضافہ ہوا اور لوگوں نے آ کر رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں یہ عرض کیا کہ "یا رسول اللہ! نرخ مقرر فرما دیجئے! تو آپ نے فرمایا:

«إِنَّ اللهَ هُوَ الْمُسَعِّرُ الْقَابِضُ الْبَاسِطُ الرَّازِقُ، وَإِنِّي لأَرْجُو أَنْ أَلْقَى اللهَ وَلَيْسَ أَحَدٌ مِّنْكُمْ يُطَالِبُنِي بِمَظْلِمَةٍ فِي دَمٍ وَّلاَ مَالٍ»(سنن أبي داود، البيوع، باب في التسعير، ح:٣٤٥١ وجامع الترمذي، ح:١٣١٤ وسنن ابن ماجه، ح:٢٢٠٠)

"بے شک وہ اللہ ہی نرخ مقرر فرمانے والا ہے جو کم کر دینے والا' بڑھا دینے والا اور رزق عطا فرمانے والا ہے' اور مجھے امید ہے کہ میں اللہ تعالیٰ سے اس طرح ملاقات کروں گا کہ کوئی مجھ سے خون یا مال کے ظلم کا مطالبہ نہیں کرے گا۔"

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ نبی کریم ﷺ نے نرخ مقرر کرنے سے انکار فرما دیا تھا کیونکہ یہ مہنگائی لوگوں کی طرف سے مصنوعی طور پر پیدا کردہ نہیں تھی۔

اس سے ہمیں یہ بھی معلوم ہوا کہ نرخ مقرر کرنے کی دو صورتیں ہیں (۱) کہ اگر یہ ظلم کے ازالہ کے لیے ہو تو اس میں کوئی حرج نہیں اور (۲) اور اگر یہ خود ظلم ہو یعنی اگر مہنگائی کسی انسان کے ظلم کی وجہ سے نہ ہو تو پھر نرخ مقرر کرنا بجائے خود ظلم ہونے کی وجہ سے ناجائز ہو گا۔

——— شیخ ابن عثیمین ———

نفع کی کوئی حد مقرر نہیں ہے

سوال کیا ایسی گاڑی کو خریدنا جائز ہے جس کی بازار میں قیمت مبلغ تیس ہزار ریال ہو لیکن ماہانہ قسطوں پر خریدنے کی صورت میں اس کی قیمت پچاس ہزار ہو یعنی نقد اور ادھار قیمت میں بیس ہزار کا فرق ہو تو کیا اس کام میں کوئی شرعی ممانعت تو نہیں؟

جواب عموم ادلہ کے باعث مذکورہ معاملہ میں کوئی حرج نہیں جب کہ گاڑی بائع کے قبضہ و ملکیت میں ہو۔ نفع کی کوئی حد مقرر نہیں ہے بلکہ یہ مشتری کے حالات اور قسطوں کی مدت کے کم یا زیادہ ہونے کی وجہ سے مختلف ہو سکتا ہے۔ "صحیحین" میں عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ بریرہ رضی اللہ عنہا نے اپنے مالک سے اپنے آپ کو نو اوقیوں میں خریدا' جنہیں نو سالوں میں ادا کرنا تھا' [1] یعنی ایک اوقیہ فی سال قسط تھی اور نبی کریم ﷺ نے اس سے منع نہیں فرمایا تھا اور نہ یہ پوچھا کہ نقد بیع ہونے کی صورت میں قیمت کیا ہے۔ واللہ ولی التوفیق۔

——— شیخ ابن باز ———

شرعی نفع بازار کے رواج کے مطابق ہوتا ہے

سوال ایک دوست کچھ سامان ساٹھ اشرفیوں میں خرید کر دو سو اسی اشرفیوں میں فروخت کرتا ہے' اس بارے میں کیا

[1] صحیح بخاری' المکاتب' باب استعانة المکاتب --- الخ' حدیث: 2563 و صحیح مسلم' العتق' حدیث: 1504

حکم شریعت ہے؟ شرعاً تجارت میں کتنا نفع جائز ہے؟

جواب مسلمان پر یہ واجب ہے کہ وہ عامۃ المسلمین کی ہمدردی و خیرخواہی کرے' ان میں اختلاف پیدا نہ کرے' معاملات میں انہیں نقصان نہ پہنچائے اور ناواقف لوگوں کی عدم واقفیت سے فائدہ اٹھاتے ہوئے دگنی چوگنی قیمت وصول نہ کرے۔ بائع کے لیے لازم ہے کہ اسی نفع پر قناعت کرے جس کا عام طور پر بازار میں رواج ہو۔

——— شیخ ابن جبرین ———

نصف قیمت سے بھی زیادہ نفع

سوال کیا سامان کی نصف قیمت سے بھی زیادہ نفع لینا جائز ہے' جب کہ مجھے جگہ کا کرایہ اور کارکنوں کی تنخواہیں بھی ادا کرنا پڑتی ہیں۔

جواب صحیح بات یہ ہے کہ سامان اس قیمت پر فروخت کرنا چاہیئے جو بازار میں قیمت ہو خواہ اس میں نفع کم ہو یا زیادہ یا نقصان ہو۔ اور اگر نرخ کے بارے میں بازار میں کوئی عرف و عادت نہ ہو تو افضل یہ ہے کہ اپنے کاروبار کی نوعیت اور کارکنوں کی اجرت وغیرہ کو سامنے رکھتے ہوئے اعتدال اور میانہ روی کے ساتھ نفع لیا جائے اور ناواقف خریدار سے بہت زیادہ نفع نہ لیا جائے۔

——— شیخ ابن جبرین ———

مشتری نے قیمت تو ادا کر دی لیکن ---!

سوال ایک آدمی نے آٹھ تاریخ کو منیٰ میں ایک حاجی کو اونٹ فروخت کیا اور حاجی نے اسے قیمت تو ادا کر دی لیکن کہا کہ وہ اس سے دس تاریخ کو منیٰ میں اونٹ لے لے گا لیکن خریدار حسب وعدہ' اونٹ لینے کے لیے نہ آیا اور موسم حج کے ختم ہونے' خریدار کے نہ آنے اور اس کے پتہ کے بھی معلوم نہ ہونے کی وجہ سے اس آدمی نے اونٹ سے چھٹکارا حاصل کرنے کی وجہ سے اسے بیچ دیا اور اس کی قیمت وصول کر لی کہ سوال یہ ہے کہ وہ اب اس قیمت کا کیا کرے؟ کیا اسے اس کی طرف سے نیت کر کے صدقہ کر دے یا اس کے بدلہ میں اونٹ خرید لے؟ یاد رہے کہ اس نے اسے اونٹ ذبح کرنے یا اس میں تصرف کرنے کا نہیں کہا تھا؟

جواب اگر یہ آدمی اونٹ کے خریدار کا نام جانتا ہے تو پھر افضل یہ ہے کہ اس کی قیمت مکہ مکرمہ میں محکمہ کے سپرد کر کے اسے اس کا پورا نام بتا دے' ہو سکتا ہے کہ اس طرح وہ معلوم ہو سکے اور اس تک اس کا حق پہنچایا جا سکے۔ اور اگر یہ اس کے نام کو نہیں جانتا تو پھر افضل یہ ہے کہ اس کی طرف سے نیت کر کے اسے فقراء میں تقسیم کر دے یا تعمیر مساجد میں خرچ کر دے' اس سے اس کا ذمہ بری ہو جائے گا اور اونٹ کے مالک کو نفع پہنچے گا۔ اس صورت میں بھی اگر قیمت محکمہ کے سپرد کر دے تو پھر بھی ان شاء اللہ بری الذمہ ہو جائے گا۔

——— شیخ ابن باز ———

آپ کے لیے فسخ بیع لازم نہیں ....

سوال میں نے ایک شخص کو اپنی گاڑی بیچی' اس کی قیمت طے ہو گئی لیکن اس نے مجھے سات سو ریال دیئے اور کہا کہ قیمت ادا کرنے تک گاڑی میرے پاس ہی رہے گی لیکن وہ قریباً نصف ماہ بعد میرے پاس آیا اور اس نے مطالبہ کیا کہ اس بیع کو فسخ کر کے اس کے وہ پیسے اسے واپس دے دیئے جائیں جو اس نے پیشگی ادا کئے تھے' لیکن میں نے اس کے اس مطالبہ کو مسترد کر دیا' کیا اسے ان پیسوں کی واپسی کا مطالبہ کرنے کا حق ہے اور اب میرے لیے کیا لازم ہے؟

جواب اگر آپ اس کی بات کو تسلیم کر لیں اور اس کے پیسے واپس کر دیں تو یہ افضل ہے' اللہ تعالیٰ کے ہاں آپ کو اس کا اجر عظیم ملے گا' کیونکہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا ہے:

«مَنْ أَقَالَ مُسْلِمًا أَقَالَهُ اللهُ عَثْرَتَهُ»(سنن أبي داود، البيوع، باب في فضل الإقالة، ح:٣٤٦٠ وسنن ابن ماجه، التجارات، باب الإقالة، ح:٢١٩٩)

"جو کسی مسلمان کے فسخ بیع کے مطالبہ کو مان لے گا تو اللہ تعالیٰ اس سے درگزر فرمائے گا۔"

جہاں تک لزوم کی بات ہے' اگر بیع میں شرعاً معتبر تمام شرائط پوری ہوں تو پھر فسخ بیع لازم نہیں ہے۔ واللہ ولی التوفیق۔

——— شیخ ابن باز ———

ایک چیز بیچنے کے بعد معلوم ہوا کہ وہ ....

سوال ایک دن میں نے ایک آدمی کو ایک چیز بیچی اور پھر بعد میں مجھے معلوم ہوا کہ وہ ناقابل استعمال ہے' وہ مجھے واپس بھی کرنے آیا لیکن میں نے تسلیم نہ کیا تو وہ پھینک کر چلا گیا لیکن یاد رہے کہ جب میں نے اسے وہ چیز بیچی تو میں یہ سمجھتا تھا کہ وہ درست اور قابل استعمال ہے اور معلوم نہ تھا کہ وہ خراب ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ اس معاملہ میں اسلامی شریعت کا کیا موقف ہے اور میرا اس چیز کے بارے میں کیا موقف ہونا چاہیئے؟ امید ہے رہنمائی فرما کر شکریہ کا موقع بخشیں گے!

جواب اگر بوقت عقد آپ کو اس چیز کی خرابی کا علم نہ تھا تو آپ معذور ہیں اور اب جب کہ اس نے چیز آپ کو واپس کر دی ہے اور آپ کو بھی معلوم ہو گیا ہے کہ اس میں خرابی پہلے سے تھی تو آپ پر واجب ہے کہ اس کے مطالبہ کو قبول کر کے اس کی قیمت اسے واپس لوٹا دیں یا اس کے ساتھ صلح کر لیں اور اسے اس کے بجائے صحیح چیز دے دیں یا خرابی کی وجہ سے قیمت کم کر لیں' لیکن اب جب کہ وہ خود اس چیز کو واپس کر گیا ہے تو آپ کو چاہیئے کہ خریدار کو تلاش کر کے مذکورہ بالا طریقہ سے جیسا کہ ہم نے ذکر کیا ہے' صلح کر لیں اور اگر آپ خریدار کو نہیں جانتے تو اس رقم کو فقراء میں صدقہ کر دو اور نیت یہ کریں کہ اس صدقہ کا ثواب اسے ملے۔ واللہ الموفق۔

——— شیخ ابن جبرین ———

سونے کی خرید و فروخت کے احکام

سونے کی تجارت

سوال میں سونے کی بنی ہوئی سعودی اشرفیوں اور سونے کی اینٹوں کا کاروبار کرتا ہوں' جب بازار میں سونے کا نرخ کم ہو جائے تو خریدتا اور جب زیادہ ہو جائے تو بیچتا ہوں۔ مثلاً سونے کی ایک گنی (اشرفی) تین سو ریال میں خرید کر چار سو اسی ریال میں بیچ دیتا ہوں' کیا اس کاروبار میں شرعاً کوئی ممانعت تو نہیں ہے؟ میں جب اشرفیوں کو خریدتا ہوں تو ان کی قیمت بینک کو ادا کر کے اشرفیوں کو لے لیتا ہوں اور جب بیچتا ہوں تو اشرفیوں کو دے کر ان کی قیمت وصول کر لیتا ہوں؟

جواب مذکورہ معاملہ جیسا کہ آپ نے ذکر کیا اگر دست بدست ہو تو اس میں کوئی حرج نہیں۔ عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ کی حدیث میں ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

«اَلذَّهَبُ بِالذَّهَبِ، وَالْفِضَّةُ بِالْفِضَّةِ، وَالْبُرُّ بِالْبُرِّ، وَالشَّعِيرُ بِالشَّعِيرِ، وَالتَّمْرُ بِالتَّمْرِ، وَالْمِلْحُ بِالْمِلْحِ، مِثْلاً بِمِثْلٍ، سَوَاءً بِسَوَاءٍ، يَدًا بِيَدٍ فَإِذَا اخْتَلَفَتْ هٰذِهِ الأَصْنَافُ، فَبِيعُوا كَيْفَ شِئْتُمْ، إِذَا كَانَ يَدًا بِيَدٍ» (صحيح مسلم، المساقاة، باب الصرف وبيع الذهب بالورق نقدا، ح: ١٥٨٧)

''سونا سونے کے ساتھ' چاندی چاندی کے ساتھ' گندم گندم کے ساتھ' جو جو کے ساتھ' کھجور کھجور کے ساتھ اور نمک نمک کے ساتھ ایک جیسا' برابر برابر اور دست بدست ہو اور جب یہ اصناف مختلف ہو جائیں تو جس طرح چاہو بیع کرو بشرطیکہ سودا دست بدست ہو۔''

——— شیخ ابن باز ———

مشورہ کے لیے سامان لے جانا

سوال ایک آدمی نے مجھ سے زیور لیا اور کہا کہ یہ میں اپنے گھر والوں کو دکھانا چاہتا ہوں کہ کیا یہ انہیں پسند ہے؟ اور اگر پسند ہوا تو میں اس کی قیمت لا کر تمہیں دے دوں گا' تو اس کے بارے میں کیا حکم ہے؟

جواب اگر گھر والوں کو دکھانے کے لیے زیور لینے سے پہلے بیع و شراء کا معاملہ مکمل نہیں ہوا بلکہ اس نے زیور کو صرف اس لیے لیا ہے کہ وہ اپنے گھر والوں کو دکھا دے کہ اگر انہیں پسند آیا تو خرید لیں گے ورنہ واپس لوٹا دیا جائے گا تو اس صورت میں زیور مشتری کے پاس امانت ہو گا' حتیٰ کہ اہل خانہ کی پسند کے بعد عقد بیع مکمل ہو جائے۔

——— فتویٰ کمیٹی ———

سونا خرید کر واپس کر دیا

سوال ایک شخص نے مجھ سے سونا خریدا' اس کی قیمت بھی ادا کر دی اور پھر کچھ مدت کے بعد آیا اور اس نے مطالبہ کیا کہ میں سونا واپس لے کر اس کی قیمت اسے لوٹا دوں تو کیا یہ جائز ہے یا یہ ضروری ہے کہ میں اس سے بازار کے موجودہ ریٹ کے مطابق خریدوں؟

جواب اگر امرواقع اسی طرح ہے جس طرح آپ نے ذکر کیا ہے تو یہ جائز ہے کہ بیع کو توڑ دیا اور فسخ کر دیا جائے۔

—— فتویٰ کمیٹی ——

سونے کی سونے کے ساتھ بیع کا جائز طریقہ

سوال میں ایک سونا بیچنے والے کے پاس کچھ پرانے زیورات لے کر گیا' جن کا اس نے وزن کر کے بتایا کہ ان کی قیمت مبلغ پندرہ سو ریال ہے اور میں نے اس سے نئے زیورات خریدے جن کی قیمت مبلغ اٹھارہ سو ریال ہے۔ کیا میرے لیے یہ جائز ہے کہ میں صرف تین سو ریال ادا کر دوں (جو فرق ہے) یا یہ ضروری ہے کہ پہلے اس سے پندرہ سو ریال وصول کروں اور پھر اسے اٹھارہ سو ریال دوں؟

جواب سونے کی سونے کے ساتھ بیع جائز نہیں الآ یہ کہ وہ ایک جیسا ہو' برابر برابر ہو' وزن ایک جیسا ہو اور دست بدست ہو جیسا کہ احادیث صحیحہ میں نبی کریم ﷺ سے اسی طرح منقول ہے'[1] خواہ سونے کے زیورات قدیم و جدید ہونے کی اعتبار سے مختلف نوعیت کے ہوں یا کسی اور اعتبار سے مختلف ہوں' اسی طرح چاندی کی خرید و فروخت کا بھی یہی حکم ہے۔

جائز طریقہ یہ ہے کہ جو شخص سونے کو سونے کے بدلہ میں خریدنا چاہے تو اس کے پاس جو سونا ہو اسے چاندی یا نوٹوں کے ساتھ بیچ دے اور اس کی قیمت وصول کر لے اور پھر اپنی ضرورت کے مطابق سونا اس کے موجودہ بھاؤ کے حساب سے خریدے اور قیمت میں چاندی یا نوٹ ادا کر کے دست بدست سودا کرے۔ سونے کی سونے کے ساتھ یا سونے کی چاندی کے ساتھ بیع میں سود کے اعتبار سے کرنسی نوٹ بھی سونے اور چاندی ہی کے قائم مقام ہیں۔

اگر سونے یا چاندی کو نقدی کے سوا کسی اور چیز مثلاً گاڑی یا سامان یا چینی وغیرہ کے ساتھ بیچ دیا تو پھر قبضہ کرنے سے پہلے الگ ہونے میں کوئی حرج نہیں کیونکہ سونے' چاندی اور کرنسی نوٹوں اور ان مذکورہ اور ان جیسی دیگر اشیاء میں سود جاری نہیں ہوتا۔ اگر بیع ادھار ہو تو پھر ضروری ہے کہ مدت کی وضاحت کر دی جائے کیونکہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ يَـٰٓأَيُّهَا ٱلَّذِينَ ءَامَنُوٓا۟ إِذَا تَدَايَنتُم بِدَيْنٍ إِلَىٰٓ أَجَلٍ مُّسَمًّى فَٱكْتُبُوهُ ﴾ (البقرۃ۲/ ۲۸۲)

''اے مومنو! جب آپس میں کسی میعاد معین کے لیے قرض کا معاملہ کرنے لگو تو اس کو لکھ لیا کرو۔''

—— شیخ ابن باز ——

[1] صحیح مسلم' المساقاۃ' باب الصرف و بیع الذھب بالورق نقداً' حدیث:1584 - 1587

جائز معاملہ

سوال میرے پاس کچھ قدیم زیورات تھے میں انہیں بازار میں بیچنے کے لیے ایک تاجر کے پاس لے گیا' اس نے مجھ سے کچھ لیے یا دیئے بغیران کے بجائے مجھے دوسرے زیورات دے دیئے۔ میں نے کہا کہ یہ تو جائز نہیں' تو اس نے کہا کہ اس نے مجھ سے جو زیورات لیے اور جو مجھے دیئے ہیں' ان کا وزن برابر ہے تو میں نے اسے سچا مان لیا' امید ہے اس معاملہ میں آپ مجھے فتویٰ عطا فرمائیں گے' لیکن اب میرے لیے اسے سونا واپس کرنا ممکن نہیں ہے؟

جواب اگر دونوں زیورات وزن میں برابر تھے اور ان کا لین دین ایک ہی مجلس میں ہوا تو پھر اس معاملہ میں کوئی حرج نہیں خواہ ایک دوسرے سے عمدہ ہی کیوں نہ ہوں کہ احادیث صحیحہ کے عموم سے اس کا جواز معلوم ہوتا ہے......... اور اگر اس نے جھوٹ بولتے ہوئے کہا کہ یہ ہم وزن ہیں تو پھر اس کا گناہ اسے ہو گا۔

——— شیخ ابن باز ———

سونے کی سونے یا نقدی کے ساتھ بیع میں تاخیر جائز نہیں

سوال اگر میرے پاس ایک شخص کچھ زیورات خریدنے کے لیے آئے اور جب میں اس کے مطلوبہ زیورات کا وزن کر دوں اور اس کے پاس زیورات کی پوری قیمت نہ ہو تو معلوم ہے کہ اس حالت میں میرے لیے اسے سونا بیچنا اور اس کے سپرد کر دینا جائز نہیں کیونکہ اس نے مجھے پوری قیمت ادا نہیں کی' لیکن اگر مثلاً یہ معاملہ ہم صبح کے وقت کر رہے ہوں اور وہ کہے کہ سونا میں تمہارے پاس ہی رہنے دیتا ہوں اور عصر کے وقت میں پوری قیمت لے کر حاضر ہو جاؤں گا اور قیمت ادا کر کے اس خریدے ہوئے سونا کو وصول کر لوں گا' تو کیا یہ جائز ہے کہ اس سونے کو اس کے حساب میں باقی رکھ دوں کہ جب وہ آئے تو اسے لے لے یا یہ ضروری ہے کہ اس معاہدہ کو ختم کر دوں اور اگر وہ آئے تو اس سے دیگر خریداروں ہی کی طرح معاملہ کروں؟

جواب یہ جائز نہیں کہ جس سونے کو اس نے خریدا ہے اسے رقم لانے تک آپ ہی کے پاس رہنے دیا جائے بلکہ اس صورت میں یہ معاہدہ ہی نہیں ہوا تاکہ ربا النسیئۃ سے بچا جاسکے۔ اس صورت میں یہ سونا آپ ہی کی ملکیت ہو گا اور جب وہ باقی رقم بھی لے کر آجائے تو آپ از سرنو معاملہ کریں اور ایک ہی مجلس میں قیمت اور زیورات کا لین دین کریں۔

——— فتویٰ کمیٹی ———

مستعمل سونے کا نئے سونے کے ساتھ تبادلہ ....

سوال اس کے بارے میں کیا حکم ہے کہ زیورات کی دکانوں کے بہت سے مالکان مستعمل سونا خرید لیتے ہیں اور پھر اسے سونے کے تاجر کے پاس لے جاتے ہیں اور اسے سونے کے نئے زیورات کے ساتھ بدل لیتے ہیں؟ وزن تو وزن کے برابر ہوتا ہے البتہ تاجر نئے زیورات کے بنانے کی اجرت وصول کر لیتے ہیں؟

جواب نبی کریم ﷺ نے یہ فرمایا ہے:

«اَلذَّهَبُ بِالذَّهَبِ، وَالْفِضَّةُ بِالْفِضَّةِ، وَالْبُرُّ بِالْبُرِّ، وَالتَّمْرُ بِالتَّمْرِ، وَالشَّعِيرُ بِالشَّعِيرِ،

وَالْمِلْحُ بِالْمِلْحِ، مِثْلًا بِمِثْلٍ، سَوَاءً بِسَوَاءٍ، يَدًا بِيَدٍ»(صحيح مسلم، المساقاة، باب الصرف وبيع الذهب بالورق نقدا، ح:١٥٨٧)

"سونا سونے کے ساتھ' چاندی چاندی کے ساتھ' گندم گندم کے ساتھ' جو جو کے ساتھ اور کھجور کھجور کے ساتھ ایک ہی طرح' برابر برابر اور دست بدست ہونی چاہیئے۔"

آپ نے یہ بھی فرمایا ہے:

«مَنْ زَادَ أَوِ اسْتَزَادَ فَقَدْ أَرْبٰى» صحيح مسلم، المساقاة، باب الصرف وبيع الذهب بالورق نقدا، ح:٨٢/ ١٥٨٤، ١٥٨٨)

"جس نے زیادہ دیا یا زیادہ لیا تو اس نے سود لیا۔"

یہ بھی حدیث سے ثابت ہے کہ آپ کی خدمت میں جب عمدہ کھجوریں پیش کی گئی تھیں تو آپ نے ان کے بارے میں پوچھا تو صحابہ کرام نے بتایا کہ ہم اس طرح کی کھجوروں کا ایک صاع لیتے ہیں اور عام کھجوروں کے دو صاع دے دیتے ہیں یا دو صاع لیتے اور تبادلہ میں تین صاع دے دیتے ہیں تو آپ نے حکم دیا کہ اس بیع کو رد کر دیا جائے کہ یہ عین ربا ہے' پھر آپ ﷺ نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی رہنمائی کرتے ہوئے فرمایا کہ "ردی کھجور کو درہموں کے ساتھ بیچ دو اور پھر ان درہموں کے ساتھ عمدہ کھجور خرید لو۔"[1]

ان احادیث سے استدلال کرتے ہوئے ہم یہ کہتے ہیں کہ سائل نے جو سونے کے ساتھ تبدیلی اور زیورات بنانے کی اجرت ادا کرنے کے بارے میں سوال پوچھا ہے تو یہ معاملہ حرام ہے' جائز نہیں کیونکہ یہ بھی اس ربا میں داخل ہے جس سے نبی کریم ﷺ نے منع فرمایا ہے۔

اس سلسلہ میں محفوظ طریقہ یہ ہے کہ بغیر کسی معاہدہ یا اتفاق کے پرانے سونے کو پہلے بیچ دیا جائے اور قیمت وصول کرنے والا پھر اس کے ساتھ نئے سونے کو خرید لے اور افضل یہ ہے کہ نئے سونے کو کسی اور جگہ سے خریدے اور اگر مطلوبہ زیورات وغیرہ کسی اور جگہ سے نہ مل سکیں تو پھر اسی سے قیمت ادا کر کے خرید لے اور اس صورت میں اسے زیادہ بھی ادا کرنا پڑے تو اس میں کوئی حرج نہیں۔ اس سلسلہ میں اہم بات یہ ہے کہ سونے کا سونے کے ساتھ تبادلہ اضافہ کے ساتھ نہ ہو خواہ یہ اضافہ زیورات کی مزدوری ہی کی وجہ سے کیوں نہ ہو اور یہ اس صورت میں ہے جب تاجر تاجر بیع ہو اور اگر تاجر زرگر ہو تو پھر اس کے پاس جا کر کہیں کہ یہ سونا لے لو اور اس سے مجھے یہ زیورات بنا دو اور جب تم زیورات بنا دو گے تو میں تمہیں مزدوری ادا کر دوں گا تو اس میں کوئی حرج نہیں۔

—— شیخ ابن عثیمین ——

سونے کی دکانوں کے مالکان کا زبانی وکالہ

سوال کیا یہ لازم ہے کہ سونے کی دکانوں کے مالکان کے مابین زبانی وکالہ ہو؟ یا اتنا ہی کافی ہے جیسا کہ ان کی عادت ہے کہ معروف نرخ پر بیچ دیں؟

[1] صحیح بخاری' البیوع' باب اذا اراد بیع تمر بتمر خیر منه' حدیث: 2201 ـ 2202 و صحیح مسلم' المساقاة' حدیث: 1593-

جواب وکالہ عقود میں سے ایک عقد ہے جو کہ قول یا فعل کی دلالت کے مطابق منعقد ہو جاتا ہے۔ جب دکان داروں کی یہ عادت ہو کہ ان میں سے اگر کسی کے پاس کوئی سامان نہ ہو اور مشتری پاس کھڑا ہو تو وہ اپنے پڑوس سے اس سامان کو لے کر اسے بیچ دے اور قیمت اسے بھی معلوم ہو جس نے اس سامان کو لیا اور اس کے مالک کی طرف سے بیچ دیا ہے تو اس میں کوئی حرج نہیں کیونکہ اہل علم کے قول کے مطابق وکالہ اس کے مطابق منعقد ہو جاتا ہے' جس پر قول یا فعل دلالت کرے۔

——— شیخ ابن عثیمین ———

سونا ادھار خریدنا

سوال سونے کی دکانوں کے بعض مالکان جائز سمجھتے ہوئے ادھار سونا خریدتے ہیں اور دلیل یہ دیتے ہیں کہ یہ بھی سامان تجارت ہی ہے۔ اس سلسلہ میں جب ان کے بڑے لوگوں سے بات کی گئی کہ یہ کام جائز نہیں ہے تو انہوں نے جواب دیا کہ اہل علم کو اس کام کے بارے میں علم نہیں ہے؟

جواب یہ معاملہ یعنی سونے کی دراہم کے ساتھ ادھار بیع بالا جماع حرام ہے کیونکہ یہ رباالنسیۂ ہے اور عبادہ بن صامت کی حدیث میں ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا "سونا سونے کے بدلہ' چاندی چاندی کے بدلہ....... الخ اور پھر آپ نے فرمایا:

«فَإِذَا اخْتَلَفَتْ هٰذِهِ الأَصْنَافُ، فَبِيعُوا كَيْفَ شِئْتُمْ، إِذَا كَانَ يَدًا بِيَدٍ» (صحيح مسلم، المساقاة، باب الصرف وبيع الذهب، ح:١٥٨٧)

"جب یہ اصناف مختلف ہوں تو پھر جس طرح چاہو بیچو جب کہ معاملہ دست بدست ہو۔"

انہوں نے جو یہ کہا ہے کہ اہل علم کو اس کا علم نہیں ہے تو یہ اہل علم پر ناحق تہمت ہے کیونکہ اگر یہ انہیں اہل علم کہہ رہا ہے تو پھر انہیں علم ہے کیونکہ علم کی ضد تو جہالت ہے اور اہل علم ہونے کے تو معنی ہی یہ ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول پر جو احکام نازل فرمائے ہیں یہ انہیں جانتے ہیں۔ اور وہ جانتے ہیں کہ یہ معاملہ' حرمت پر دلالت نص کی وجہ سے' ایک حرام کام ہے۔

——— شیخ ابن عثیمین ———

سونے کو اہل خانہ کی پسند کی شرط کے ساتھ خریدنا

سوال اس مسئلہ میں کیا حکم ہے کہ جب ایک خریدار سونے کا سامان خریدے اور پھر یہ شرط لگا دے کہ اگر یہ اہل خانہ کو پسند نہ آیا تو وہ اسے تبدیل کرے گا یا اس کی قیمت واپس لے لے گا۔ اس طرح کے معاملہ میں شرعی طریقہ کیا ہے کیونکہ بعض خریدار بہت دور سے شہر آتے ہیں کہ ان کے لیے اسی دن یا دوسرے دن دوبارہ آنا بہت مشکل ہوتا ہے؟

جواب اس معاملہ میں افضل صورت یہ ہے کہ عقد بیع مکمل ہونے سے پہلے سونے کے زیورات لے کر اہل خانہ کو دکھا دے کہ اگر انہیں پسند آئیں تو دکان دار سے خرید لے۔ خریدنے اور عقد بیع مکمل کرنے کے بعد یہ شرط لگانا کہ اگر اس کے اہل خانہ نے پسند کیا تو خریدے گا وگرنہ واپس کر دے گا' اس میں اہل علم میں اختلاف ہے۔ بعض نے اسے جائز قرار دیا ہے

اور کہا ہے کہ مسلمان اپنی شرطوں کا پاس کرتے ہیں اور بعض نے اسے ناجائز قرار دیا ہے اور کہا ہے کہ یہ شرط چونکہ ایک حرام کام کو حلال قرار دیتی ہے اور وہ تمام عقد سے پہلے علیحدگی ہے۔ ان میں سے پہلا شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ کا ظاہر قول ہے اور دوسرا قول (حنبلی) مذہب کا مشہور قول ہے' لیکن صحیح بات یہی ہے کہ ہر وہ عقد جس میں فریقین کے دست بدست قبضہ کی شرط ہو تو اس میں شرط خیار صحیح نہیں ہے' لہٰذا اگر کوئی شخص یہ چاہے کہ وہ بری الذمہ ہو اور سلامتی کا راستہ اختیار کرے تو اسے چاہیئے کہ عقد بیع مکمل ہونے سے پہلے زیورات کو لے کر اہل خانہ سے مشورہ کرے۔

——— شیخ ابن عثیمین ———

مستعمل سونے کو نئے کے طور پر بیچنا

سوال اس مسئلہ میں کیا حکم ہے کہ سونے کی دکانوں کے بعض مالکان مستعمل مگر صاف ستھرے سونے کو خرید کر نئے (سونے) کے بھاؤ بیچتے ہیں تو کیا یہ جائز ہے یا یہ لازم ہے کہ خریدار کو بتا دیا جائے کہ یہ مستعمل سونا ہے یا یہ بتانا لازم نہیں ہے کہ بعض خریدار یہ پوچھتے ہی نہیں کہ یہ نیا ہے یا پرانا؟

جواب دکان دار کے لیے خیر خواہی واجب ہے اور یہ کہ وہ اپنے بھائی کے لیے بھی وہی پسند کرے جو وہ اپنے لیے کرتا ہے۔ یہ مسلمہ بات ہے کہ اگر کوئی شخص آپ کو کوئی ایسی مستعمل چیز بیچے جو بہت کم استعمال ہوئی ہو اور اس پر کوئی اثر نہ پڑا ہو اور وہ آپ کو اسے نئی چیز کے طور پر بیچ دے تو یقیناً اسے آپ دھوکا اور فریب قرار دیں گے۔ اگر آپ یہ پسند نہیں کرتے کہ لوگ آپ کے ساتھ اس طرح کا معاملہ کریں تو آپ کو یہ بات کس طرح زیب دیتی ہے کہ آپ دوسروں کے ساتھ اس طرح کا معاملہ کریں؟ لہٰذا کسی بھی انسان کو اس طرح نہیں کرنا چاہیئے بلکہ اسے چاہیئے کہ وہ خریدار کو یہ بتا دے کہ یہ تھوڑا سا استعمال ہوا ہے یا اس طرح کی کوئی اور بات کر دے جس سے حقیقت واضح ہو جائے۔

——— شیخ ابن عثیمین ———

بھٹی میں پگھلاتے وقت ایک دوسرے کے سونے کو ملا دینا

سوال جب کوئی شخص زیور بنانے کے لیے اپنا سونا زرگر کو دیتا ہے تو بسا اوقات وہ بھٹی میں پگھلانے کے لیے اس کے سونے کو دوسرے لوگوں کے سونے کے ساتھ ملا دیتا ہے لیکن واپسی کے وقت وہ اسی وزن میں دے دیتا ہے جس وزن میں اس نے لیا ہوتا ہے تو اس بارے میں کیا حکم ہے؟

جواب زرگر کو چاہیئے کہ وہ لوگوں کے اموال آپس میں نہ ملائے اور انہیں الگ الگ ہی رکھے جب کہ مقدار مختلف ہو اور اگر مقدار مختلف نہ ہو تو پھر باہم ملانے میں کوئی حرج نہیں۔

سوال کیا سونا وصول کرتے وقت ہی زیورات کی اجرت دینا لازم ہے۔ یا اس کا حساب جاری رکھ سکتے ہیں؟

جواب اسے فوراً دست بدست ادا کرنا لازم نہیں ہے کیونکہ یہ تو کام کی اجرت ہے۔ زیورات لیتے وقت ہی اگر اجرت ادا کر دی جائے تو بہتر ورنہ جب ادا کر دے صحیح ہے۔

——— شیخ ابن عثیمین ———

نیا سونا خریدنے کی شرط پر پرانا بیچنا

سوال اس مسئلہ میں کیا حکم شریعت ہے کہ سونے کی دکانوں کے بعض مالکان مستعمل سونا بیچنے والے سے کہتے ہیں کہ وہ اس شرط پر پرانا سونا خریدیں گے کہ وہ بھی ان سے نیا سونا خریدے؟

جواب یہ شرط جائز نہیں کیونکہ یہ اضافہ کے ساتھ سونے کے بدلے سونا بیچنے کا ایک حیلہ ہے اور حیلے شریعت میں ممنوع ہیں کیونکہ یہ دھوکا اور احکام الٰہی کا مذاق اڑانے کے مترادف ہیں۔

—— شیخ ابن عثیمین ——

اس کام میں کوئی حرج نہیں

سوال آپ جناب کی اس مسئلہ میں کیا رائے ہے کہ سونے کے بعض خریدار پہلے نئے سونے کا بھاؤ معلوم کرتے ہیں اور پھر اپنے پاس سے مستعمل سونا نکال کر اسے بیچ دیتے ہیں اور رقم وصول کرتے وقت اس سے نیا سونا خرید لیتے ہیں؟

جواب اس میں کوئی حرج نہیں بشرطیکہ پہلے سے یہ طے شدہ نہ ہو' ہاں البتہ امام احمد رحمہ اللہ کی اس جیسی صورت حال میں یہ رائے ہے کہ وہ اپنا پرانا سونا بیچ کر نیا سونا کسی اور جگہ سے خرید لے اور اگر کسی اور جگہ سے نہ ملے تو پھر اسی سے خرید لے تاکہ حیلہ کے شبہ سے بچ جائے۔

—— شیخ ابن عثیمین ——

مستعمل بیچ کر نیا خریدنا

سوال اس شخص کے بارے میں شرعی حکم کیا ہے جو دکان پر جا کر سونا بیچتا ہے اور پھر اپنی قیمت فروخت کے ساتھ اسی دکان سے اور سونا خرید لیتا ہے اور دونوں کی قیمتوں میں جو فرق ہو وہ ادا کر دیتا ہے اور اپنے فروخت کیے ہوئے سونے کی قیمت وصول نہیں کرتا؟

جواب یہ جائز نہیں کیونکہ اس نے اپنی چیز کو بیچ کر اس کی قیمت کو اپنے قبضہ میں نہیں لیا اور اس کے عوض وہ چیز لے لی جس کی اس کے ساتھ ادھار بیع حلال نہیں ہے' چنانچہ فقہاء کی صراحت کے مطابق یہ صورت حرام ہے کیونکہ یہ صورت بسا اوقات ایسی چیز کے لیے حیلہ بن جاتی ہے جس کی اس انداز سے قیمت اپنے قبضہ میں لیے بغیر ادھار بیع جائز نہیں ہے اور اگر اس میں دونوں کے سونے کی جنس ایک ہی ہو تو یہ ربا الفضل بھی ہو گا اور ربا النسیہ بھی۔

—— شیخ ابن عثیمین ——

حرام کاروبار کرنے والے دکانداروں کے پاس ملازمت

سوال سونے کی دکانوں کے ایسے مالکان کے پاس کام کرنے کے بارے میں کیا حکم ہے جو سودی یا حرام حیلے یا ملاوٹ اور دھوکا وغیرہ کے غیر شرعی کام کرتے ہوں؟

جواب ایسے لوگوں کے پاس کام کرنا حرام ہے جو سود یا دھوکا و ملاوٹ کا کاروبار کرتے ہیں کیونکہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ وَلَا تَعَاوَنُوا۟ عَلَى ٱلْإِثْمِ وَٱلْعُدْوَٰنِ ۚ ﴾ (المائدة٥/ ٢)

"اور گناہ اور ظلم کی باتوں میں مدد نہ کیا کرو۔"

یہ ارشاد بھی ہے:

﴿ وَقَدْ نَزَّلَ عَلَيْكُمْ فِى ٱلْكِتَٰبِ أَنْ إِذَا سَمِعْتُمْ ءَايَٰتِ ٱللَّهِ يُكْفَرُ بِهَا وَيُسْتَهْزَأُ بِهَا فَلَا تَقْعُدُوا۟ مَعَهُمْ حَتَّىٰ يَخُوضُوا۟ فِى حَدِيثٍ غَيْرِهِۦٓ ۚ إِنَّكُمْ إِذًا مِّثْلُهُمْ ۗ ﴾ (النساء٤/ ١٤٠)

"اور اللہ نے تم (مومنوں) پر اپنی کتاب میں (یہ حکم) نازل فرمایا ہے کہ جب تم (کہیں) سنو کہ اللہ کی آیتوں سے انکار ہو رہا ہے اور ان کی ہنسی اڑائی جاتی ہے تو جب تک وہ لوگ اور باتیں (نہ) کرنے لگ جائیں ان کے پاس مت بیٹھو ورنہ تم بھی انہی جیسے ہو جاؤ گے۔"

اور نبی اکرم ﷺ نے فرمایا:

«مَنْ رَأَى مِنْكُمْ مُنْكَرًا فَلْيُغَيِّرْهُ بِيَدِهِ، فَإِنْ لَّمْ يَسْتَطِعْ فَبِلِسَانِهِ، فَإِنْ لَّمْ يَسْتَطِعْ فَبِقَلْبِهِ»(صحيح مسلم، الإيمان، باب بيان كون النهي عن المنكر ... الخ، ح:٤٩)

"تم میں سے جو شخص کوئی برا کام دیکھے تو اسے ہاتھ سے مٹا دے' اگر اس کی استطاعت نہ ہو تو زبان سے سمجھا دے اور اگر اس کی بھی استطاعت نہ ہو تو دل سے برا جانے۔"

اور جو ایسے لوگوں کے پاس کام کرتا ہے اس نے گویا اس برے کام کو نہ ہاتھ سے مٹایا' نہ زبان سے سمجھایا اور نہ دل ہی میں برا جانا' لہٰذا وہ رسول اللہ ﷺ کا نافرمان ہے۔

——— شیخ ابن عثیمین ———

قیمت وصول کرنے سے پہلے سونا بیچنا

سوال قیمت وصول کرنے سے پہلے سونا بیچنے کے بارے میں کیا حکم ہے؟ اگر کسی قریبی رشتہ دار سے فوراً قیمت ادا کرنے کا مطالبہ کیا جائے تو قطع رحمی کا خدشہ ہے لیکن اس بات کا پختہ یقین ہے کہ وہ قیمت ضرور ادا کر دے گا' خواہ کچھ عرصہ بعد ہی کرے؟

جواب واجب ہے کہ آپ یہ عمومی قاعدہ جان لیں کہ مکمل قیمت وصول کئے بغیر سونے کی دراہم (روپوں پیسوں) کے ساتھ ہرگز ہرگز بیع جائز ہی نہیں ہے اور اس اعتبار سے کسی قریبی رشتہ دار اور اجنبی میں کوئی فرق ہی نہیں ہے کیونکہ اللہ کے دین کے مقابلے میں کسی سے محبت نہیں کی جا سکتی۔ اور اگر اللہ تعالیٰ کی اطاعت کی وجہ سے کوئی قریبی رشتہ دار ناراض ہوتا ہے تو وہ ہوتا رہے' وہ شخص ظالم اور گناہ گار ہے جو یہ چاہتا ہے کہ آپ اللہ تعالیٰ کی معصیت و نافرمانی کا ارتکاب کریں۔ آپ نے اسے اس سے روک کر درحقیقت نیکی کی ہے کہ آپ نے اسے ایک حرام معاملہ سے روک دیا ہے اور اگر اس وجہ سے وہ ناراض ہوتا ہے یا تعلقات منقطع کرتا ہے تو وہ گناہ گار ہے اور آپ اس گناہ میں شریک نہیں ہیں۔

——— شیخ ابن عثیمین ———

سونا خرید کر رکھا اور قیمت میں اضافہ ہونے پر بیچ دیا

سوال ایک آدمی نے سونے کا ایک ٹکڑا دو سو دینار میں خریدا اور ایک عرصہ تک اسے محفوظ رکھا حتیٰ کہ اس کی قیمت میں کئی گنا اضافہ ہو گیا تو اسے تین ہزار دینار میں بیچ دیا تو اس اضافہ کے بارے میں کیا حکم ہے؟

جواب اس اضافہ میں کوئی حرج نہیں ہے مسلمان بیع و شراء میں ہمیشہ اسی طرح کرتے چلے آئے ہیں کہ سامان خریدتے ہیں اور قیمت میں اضافہ ہونے کا انتظار کرتے ہیں اور بسااوقات اپنے استعمال کے لیے خریدتے ہیں اور قیمت میں بہت زیادہ اضافہ ہو جانے پر بیچ بھی دیتے ہیں حالانکہ پہلے بیچنے کی نیت نہیں ہوتی' اہم بات یہ ہے کہ اگر یہ اضافہ بازار کے مطابق ہو تو پھر اس میں کوئی حرج نہیں' خواہ اس میں کئی گناہ اضافہ ہو جائے۔

ہاں البتہ اگر اضافہ اس طرح ہو کہ سونے کا سونے سے تبادلہ کر کے اضافہ وصول کرے تو یہ حرام ہے کیونکہ سونے کی سونے سے بیع جائز نہیں الا یہ کہ وزن برابر ہو اور سودا دست بدست ہو جیسا کہ حدیث سے ثابت ہے [1] جب آپ سونے کو سونے کے ساتھ بیچیں خواہ ان میں کوالٹی کے اعتبار سے فرق ہو یعنی ایک دوسرے سے زیادہ اچھا ہو تو پھر بھی برابر برابر اور دست بدست سودا کریں۔ اگر سونا نمبر ۱۸ کے دو مثقال سونا نمبر ۲۴ کے ڈیڑھ مثقال کے بدلے میں لیے تو یہ حرام ہے کیونکہ دونوں کا وزن برابر ہونا چاہیئے' اسی طرح یہ بھی ضروری ہے کہ بائع اور مشتری مجلس عقد ہی میں نقد لین دین کریں یعنی اگر ایک نے تو سونے کے دو مثقال لے لیے اور دوسرے نے اسی مجلس میں نہ لیے بلکہ اس کے قبضہ میں تاخیر ہو گئی تو یہ بھی جائز نہیں' اسی طرح سونے کی کرنسی نوٹوں کے ساتھ خرید و فروخت کے بارے میں بھی یہی حکم ہے یعنی اگر کوئی شخص کسی تاجر یا زرگر سے سونا خریدتا ہے تو اس کے لیے یہ جائز نہیں کہ اس کی مکمل قیمت ادا کئے بغیر اس سے جدا ہو کیونکہ کرنسی نوٹ چاندی کے قائم مقام ہیں۔ اور جب سونے کی چاندی کے ساتھ بیع ہو تو پھر بھی واجب ہے کہ بائع اور مشتری جدا ہونے سے پہلے پہلے مجلس عقد میں اپنے خریدے ہوئے سودے کو قبضہ میں لے لیں کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے:

«إِذَا اخْتَلَفَتْ هٰذِهِ الْأَصْنَافُ فَبِيعُوا كَيْفَ شِئْتُمْ إِذَا كَانَ يَدًا بِيَدٍ»(صحيح مسلم، المساقاة، باب الصرف وبيع الذهب ... الخ، ح:١٥٨٧)

"جب یہ اصناف مختلف ہوں تو پھر جس طرح چاہو بیچو بشرطیکہ سودا دست بدست ہو!"

—— شیخ ابن عثیمین ——

مردوں کے لیے سونے کی انگوٹھیاں..........

سوال مردوں کے لیے مخصوص سونے کی انگوٹھیاں بیچنے کے بارے میں کیا حکم ہے' جب کہ تاجر کو یقین بھی ہو کہ مشتری اسے پہنے گا؟

 مردوں کے لیے سونے کی انگوٹھیاں بیچنا حرام ہے جب کہ بائع کو یہ علم ہو یا اس کا ظن غالب ہو کہ مرد اسے پہنے

[1] صحیح مسلم' المساقاۃ' باب الربا' حدیث: 1584 - 1587

گا تو پھر اسے مرد کو فروخت کرنا حرام ہے کیونکہ ہماری امت کے مردوں کے لیے سونا حرام ہے تو جو شخص کسی ایسے مرد کو سونا بیچتا ہے جس کے بارے میں اسے معلوم ہو یا جس کے بارے میں ظن غالب یہ ہو کہ وہ اسے پہنے گا تو اس کے ساتھ اس نے گناہ کے کام میں تعاون کیا اور اللہ تعالیٰ نے منع فرمایا ہے کہ گناہ اور سرکشی کے کام میں تعاون کیا جائے' چنانچہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ وَتَعَاوَنُوا عَلَى الْبِرِّ وَالتَّقْوَىٰ ۖ وَلَا تَعَاوَنُوا عَلَى الْإِثْمِ وَالْعُدْوَانِ ۚ ﴾ (المائدۃ5/ 2)

"اور نیکی اور پرہیز گاری کے کاموں میں تم ایک دوسرے کی مدد کیا کرو اور گناہ اور ظلم کی باتوں میں مدد نہ کیا کرو۔"

زرگر کے لیے بھی یہ حلال نہیں ہے کہ مردوں کے پہننے کے لیے سونے کی انگوٹھیاں بنائے۔

——— شیخ ابن عثیمین ———

سونا رہن رکھ کر مشورہ کے لیے سونا لے جانا

سوال تاجر کے اس سونا کے عوض سونا لینے کے بارے میں کیا حکم ہے' جس کے بارے میں مشتری مشورہ کرنا چاہتا ہو اور تاجر نے مشتری کے واپس کرنے تک جو سونا رہن رکھا ہوتا ہے ظاہر ہے کہ ان دونوں کا وزن ایک نہیں ہوتا؟

جواب اس میں کوئی حرج نہیں جب کہ اس نے بیع نہ کی ہو اور صرف یہ کہا ہو کہ اس سونے کو اپنے پاس رہن رکھ لو حتیٰ کہ میں جا کر مشورہ کر لوں اور پھر واپس آ کر ہم از سرنو سودا کریں گے اور جب وہ سودا کر لیں تو وہ مکمل قیمت ادا کر دے اور رہن رکھے ہوئے اپنے سونے کو واپس لے لے۔

——— شیخ ابن عثیمین ———

سونے کی کچھ رقم ادا کی اور باقی بینک سے لا کر دینا

سوال اس مسئلہ میں کیا حکم ہے کہ جو شخص سونا خریدے' بیع مکمل ہو جائے' مشتری کچھ قیمت ادا کر دے اور باقی رقم لینے کے لیے وہ گاڑی کے پاس یا بینک میں جائے اور تھوڑی دیر بعد ہی لا کر دے دے لیکن سونا وہ مکمل قیمت ادا کرنے کے بعد ہی لے تو کیا یہ صورت صحیح ہے یا یہ ضروری ہے کہ وہ باقی رقم لانے کے بعد از سرنو عقد بیع کریں؟

جواب بہتر یہ ہے کہ باقی رقم لانے کے بعد بیع کا اعادہ کریں اور اس میں کوئی نقصان بھی نہیں صرف الفاظ ہی دوہرانا ہوں گے۔ اور اگر رقم نامکمل ہونے کی صورت میں وہ عقد بیع ہی ترک کر دے حتیٰ کہ مکمل رقم لا کر بیع کرے تو یہ بھی بہتر ہے کیونکہ مکمل رقم لانے سے پہلے بیع کرنے کی کوئی ضرورت بھی نہیں ہے۔

——— شیخ ابن عثیمین ———

پرانے خالص سونے کا ایسے سونے سے تبادلہ جس میں نگینے بھی ہوں

سوال سونے کی دکانوں کے بعض مالکان سونے کے تاجر کے پاس جاتے ہیں اور اس سے مثلاً ایک کلو ایسا سونا خرید لیتے ہیں جو نگینوں کے ساتھ مرصع ہوتا ہے خواہ یہ نگینے الماس یا زرکون جیسے قیمتی پتھروں کے ہوں یا دیگر عام پتھروں کے اور

خریدار اس کے عوض ایک کلو خالص سونا دیتا ہے جس میں نگینے نہیں ہوتے اور پھر بائع زیورات کے بنانے کی اجرت بھی وصول کرتا ہے۔ یعنی بائع اس طرح دو فائدے حاصل کرتا ہے ایک تو یہ کہ وہ نگینوں کے عوض سونا حاصل کرتا ہے اور دوسرے وہ زیورات کے بنانے کی اجرت بھی وصول کرتا ہے حالانکہ وہ سونے کا تاجر ہے زرگر نہیں' تو اس کام کے بارے میں کیا حکم ہے۔ وفقکم اللہ؟

جواب یہ کام حرام ہے کیونکہ یہ سود پر مشتمل ہے اور جیسا کہ سائل نے ذکر کیا' سود اس میں دو طرح سے ہے (۱) نگینوں وغیرہ کے مقابلہ میں سونے کا حصول حالانکہ یہ اس ہار کے مشابہہ ہیں جس کا فضالہ بن عبید رضی اللہ عنہ کی حدیث میں ذکر ہے کہ "انہوں نے بارہ دینار میں ایک ایسا ہار خریدا جس میں سونا بھی تھا اور پتھر کے نگ بھی' تو انہوں نے اسے الگ الگ کر دیا اور دیکھا کہ اس میں نگ سونے سے بھی زیادہ ہیں تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

«لاَ تُبَاعُ حَتَّى تُفَصَّلَ»(صحيح مسلم، المساقاة، باب بيع القلادة ... الخ، ح:١٥٩١)

"اس طرح کے ہار کو الگ الگ کیے بغیر نہ بیچا جائے۔"

(۲) دوسرا اضافہ زیورات کے بنانے کی اجرت ہے اور صحیح یہ ہے اجرت کا اضافہ بھی جائز نہیں کیونکہ اگرچہ زیورات کی صنعت کا تعلق آدمی کے فعل سے ہے لیکن سودی معاملات میں یہ اضافہ اسی طرح ہے جس طرح اللہ تعالیٰ کی پیدا کردہ چیز پر اضافہ لینا ہے اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے منع فرمایا ہے کہ عمدہ کھجور کا ایک صاع' دو صاع ردی کھجور کے عوض خریدا جائے [1] اور مسلمان کے لیے یہ واجب ہے کہ وہ سود سے بچے اور اس سے دور رہے کیونکہ یہ بہت ہی بڑا گناہ ہے۔

—— شیخ ابن عثیمین ——

نقش و نگار والے سونے کا حکم

سوال اس سونے کے بیچنے کے بارے میں کیا حکم ہے جس پر نشانات یا تتلی یا سانپ کا سر یا اس طرح کی اور تصویریں بنی ہوں؟

جواب سونے اور چاندی کا وہ زیور جس پر کسی جاندار کی تصویر بنی ہو تو اس کا بیچنا' خریدنا' پہننا اور استعمال کرنا حرام ہے کیونکہ مسلمان کے لیے یہ واجب ہے کہ وہ جاندار اشیاء کی تصویروں کو مٹا کر ختم کر دے جیسا کہ صحیح مسلم میں ابوالہیاج سے روایت ہے کہ حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ نے ان سے فرمایا:

«أَلاَ أَبْعَثُكَ عَلٰى مَا بَعَثَنِي عَلَيْهِ رَسُولُ اللهِ ﷺ؟ أَنْ لاَ تَدَعَ صُورَةً إِلاَّ طَمَسْتَهَا وَلاَ قَبْرًا مُشْرِفًا إِلاَّ سَوَّيْتَهُ»(صحيح مسلم، الجنائز، باب الأمر بتسوية القبر، ح:٩٦٩)

"کیا آپ کو بھی اس کام کے لیے نہ بھیجوں جس کے لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے بھیجا تھا؟ اور وہ یہ کہ ہر تصویر کو مٹا دو اور ہر اونچی قبر کو برابر کر دو۔"

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بھی فرمایا:

---

[1] صحیح بخاری' البیوع' باب اذا اراد بیع تمر بتمر خیرمنه' ح : 2201 ـ 2202 و صحیح مسلم' المساقاة' باب بیع الطعام مثلا بمثل' ح : 1593

((إِنَّ الْمَلَائِكَةَ لَا تَدْخُلُ بَيْتًا فِيهِ صُورَةٌ)) (صحيح البخاری ' بدء الخلق ' باب إذا قال أحدكم آمين و الملائكة ... الخ، حديث: ٣٢٢٤)

"جس گھر میں تصویر ہو اس میں اللہ کی رحمت کے فرشتے داخل ہی نہیں ہوتے۔"

لہذا مسلمانوں کے لیے واجب ہے کہ وہ تصویروں والے زیور کے استعمال اور اس کی بیع و شراء سے اجتناب کریں۔

—— شیخ ابن عثیمین ——

سونے کی بیع میں چیک کی صورت میں ادائیگی

سوال سونے کی بیع میں چیک کی صورت میں قیمت ادا کرنے کے بارے میں کیا حکم ہے جب کہ بوقت بیع چیک کیش ہو سکتا ہو' سونا خریدنے والے بعض لوگ چیک کے ساتھ اس لیے معاملہ کرتے ہیں کہ رقوم اپنے پاس رکھنے کی صورت میں جانی اور مالی نقصان کا خطرہ ہوتا ہے؟

جواب سونے یا چاندی کی بیع میں چیک کے ساتھ معاملہ جائز نہیں کیونکہ چیک لینے کے یہ معنی نہیں کہ بائع نے قیمت کو قبضہ میں لے لیا ہے' یہ تو صرف ایک دستاویز ہے۔اور اس کی دلیل یہ ہے کہ چیک گم ہونے کی صورت میں چیک دینے والے سے قیمت کا مطالبہ کیا جا سکتا ہے اور اگر یہ قیمت ہی ہوتی تو ضائع ہونے کی صورت میں اس کا دوبارہ مطالبہ نہیں کیا جا سکتا تھا۔ اس کی تفصیل یہ ہے کہ اگر کوئی آدمی درہموں کے ساتھ سونا خریدے اور بائع اس سے درہم وصول کرے اور انہیں اپنے گھر لے جائے اور وہ اس سے ضائع ہو جائیں تو وہ مشتری سے دوبارہ ان کا مطالبہ نہیں کر سکتا' یہ اس بات کی دلیل ہے کہ چیک وصول کرنا قیمت قبضہ میں لینے کے مترادف نہیں ہے اور جب یہ قیمت قبضہ میں لینا نہیں ہے تو پھر یہ بیع بھی صحیح نہیں ہے کیونکہ سونے اور چاندی کی بیع کے بارے میں نبی کریم ﷺ نے حکم یہ دیا ہے کہ یہ دست بدست ہو۔[1] ہاں البتہ چیک بینک کی طرف سے تصدیق شدہ ہو اور بائع بینک میں جا کر یہ کہے کہ ان پیسوں کو اپنے پاس ہی میری ودیعت (امانت) رہنے دو تو پھر اس صورت میں اس کی اجازت ہے۔ واللہ اعلم۔

—— شیخ ابن عثیمین ——

کچھ قیمت ادا کر کے سونا رکھوا دینا

سوال سونا محفوظ رکھوا دینے کے بارے میں کیا حکم ہے؟ یعنی خریدار کچھ قیمت ادا کر کے تاجر سے کہے کہ یہ سونا میرے لیے رکھ دو میں مکمل قیمت ادا کر کے اسے لے لوں گا؟

جواب یہ جائز نہیں کیونکہ جب وہ اسے بیچے تو بیع کا تقاضا یہ ہے کہ وہ اس کی ملکیت کو بائع سے مشتری کی طرف منتقل کر دے اور یہ حرام ہے' ناجائز ہے کیونکہ اس کے لیے ضروری ہے کہ وہ اس کی مکمل قیمت اپنے قبضہ میں لے اور پھر اس کے بعد مشتری چاہے تو اسی کے پاس رہنے دے اور اگر چاہے تو لے جائے ہاں البتہ اگر وہ بائع سے اس کا بھاؤ معلوم کر لے اور بیع نہ کرے بلکہ جا کر باقی قیمت بھی لے آئے اور پھر عقد بیع مکمل کر کے اسے اپنے قبضہ میں لے لے تو یہ جائز ہے

[1] صحیح مسلم' المساقاۃ' باب الصرف و بیع الذھب بالورق نقدا' حدیث: 1584 ۔ 1587

کیونکہ عقد بیع قیمت حاضر کرنے کے بعد ہوا ہے۔

—— شیخ ابن عثیمین ——

سونے کی ادھار بیع

سوال اس شخص کے بارے میں کیا حکم ہے جو سونا خرید تا ہے اور اس کے ذمہ کچھ قیمت باقی رہ جاتی ہے' تو وہ کہتا ہے کہ جب آسانی سے ممکن ہوا میں یہ قیمت ادا کر دوں گا؟

جواب یہ عمل جائز نہیں ہے اور اگر کوئی ایسا کرے تو جس سونے کی قیمت اس نے لے لی ہے اس کے بارے میں عقد صحیح ہو گا اور جس کی قیمت اس نے قبضہ میں نہیں لی اس کے بارے میں عقد باطل ہو گا کیونکہ سونے اور چاندی کی بیع کے بارے میں نبی کریم ﷺ نے فرمایا ہے:

«بِيعُوا كَيْفَ شِئْتُمْ، إِذَا كَانَ يَدًا بِيَدٍ» (صحيح مسلم، المساقاة، باب الصرف وبيع الذهب . . . الخ، ح:١٥٨٧)

"جیسے چاہو بیچو بشرطیکہ سودا دست بدست ہو۔"

—— شیخ ابن عثیمین ——

جاندار اشیاء کی تصویر والے سونے کی بیع

سوال کیا کسی جاندار کی تصویر میں ڈھلے سونے کی بیع جائز ہے' نیز اس سونے کی بیع جس میں انسان کی آدھی تصویر بنی ہوئی ہو؟

جواب جاندار اشیاء کی تصویروں کی بیع و شراء حرام ہے کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

«إِنَّ اللهَ وَرَسُولَهُ حَرَّمَ بَيْعَ الْخَمْرِ وَالْمَيْتَةِ وَالْخِنْزِيرِ وَالأَصْنَامِ»(صحيح البخاري، البيوع، باب بيع الميتة والأصنام، ح:٢٢٣٦ وصحيح مسلم، المساقاة، باب تحريم بيع الخمر والميتة . . . الخ، ح:١٥٨١)

"بے شک اللہ اور اس کے رسول نے شراب' مردار' خنزیر اور بتوں کی بیع کو حرام قرار دیا ہے۔"

کیونکہ یہ تصویریں ان لوگوں کے بارے میں غلو کا سبب بنتی ہیں جن کی یہ ہوں جیسا کہ قوم نوح اس غلو میں مبتلا ہو گئی تھی۔ صحیح بخاری میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے ارشاد باری تعالیٰ:

﴿ وَقَالُوا لَا تَذَرُنَّ آلِهَتَكُمْ وَلَا تَذَرُنَّ وَدًّا وَلَا سُوَاعًا وَلَا يَغُوثَ وَيَعُوقَ وَنَسْرًا ﴿٢٣﴾ ﴾ (نوح ٧١/ ٢٣)

"اور انہوں نے کہا کہ اپنے معبودوں کو ہرگز نہ چھوڑنا اور ود اور سواع اور یغوث اور یعوق اور نسر کو کبھی ترک نہ کرنا۔"

کے بارے میں منقول ہے کہ یہ حضرت نوح علیہ السلام کی قوم کے نیک لوگوں کے نام ہیں سو جب وہ فوت ہو گئے تو شیطان نے ان کے دلوں میں یہ وسوسہ ڈالا کہ ان کے اس طرح بت بناؤ جس طرح گویا یہ اپنی مجلسوں میں بیٹھے ہوں اور پھر ان کو

ان کے اپنے ناموں سے بھی موسوم کر دو' چنانچہ انہوں نے ایسا ہی کیا لیکن ان کی پوجا اس وقت شروع ہوئی جب یہ لوگ بھی فوت ہو گئے اور علم ختم ہو گیا۔"

اس طرح دیگر ان بہت سی نصوص کی وجہ سے بھی یہ حرام ہیں جن میں جاندار چیزوں کی تصویروں کی حرمت کا ذکر ہے۔ ہر وہ تصویر حرام ہے جو کسی بھی جاندار چیز کی ہو خواہ یہ سونے پر بنی ہو یا چاندی پر' کاغذ پر یا کپڑے پر یا کسی آلہ پر۔ اور اگر انہیں دیواروں پر اس طرح لٹکایا جاتا ہو کہ ان کی بے حرمتی نہ ہو تو پھر بھی ان کا لین دین کرنا حرام ہے کیونکہ یہ بھی جاندار چیزوں کی تصویروں کی حرمت کے دلائل کے عموم میں داخل ہے اور اگر تصویر کسی ایسی چیز پر بنی ہوئی ہو جس میں اس کی بے حرمتی ہو مثلاً کسی ایسے آلہ پر جس سے کاٹنے کا کام لیا جاتا ہو' یا کسی ایسے بچھونے پر جسے بچھایا جاتا ہو' یا تکیہ وغیرہ پر جس پر سویا جاتا ہو وغیرہ تو یہ جائز ہے کیونکہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ انہوں نے ایک ایسا پردہ لٹکایا جس پر تصویریں بنی ہوئی تھیں' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے تو آپ نے اسے اتار دیا۔ حضرت عائشہ فرماتی ہیں:

«فَقَطَعْتُهُ وِسَادَتَيْنِ، فَكَانَ رَسُولُ اللهِ ﷺ يَرْتَفِقُ عَلَيْهِمَا»(صحيح مسلم، اللباس، باب تحريم تصوير صورة الحيوان، ح:٩٥/٢١٠٧)

"میں نے کاٹ کر اس کے دو تکیے بنا دیئے تو آپ ان پر ٹیک لگا لیا کرتے تھے۔"

مسند احمد کی روایت میں الفاظ یہ ہیں:

«قَطَعْتُهُ مِرْفَقَتَيْنِ فَقَدْ رَأَيْتُهُ مُتَّكِئًا عَلٰى إِحْدَاهُمَا وَفِيهَا صُورَةٌ»(مسند أحمد:٦/٢٤٧)

"میں نے ان کے دو تکیے بنا دیئے اور میں نے دیکھا کہ آپ نے ان میں سے ایک پر ٹیک لگائی ہوئی تھی اور اس پر تصویر تھی۔"

یاد رہے کہ جاندار اشیاء کی تصویریں بنانا حرام ہے' کپڑوں پر بھی اور کسی دوسری چیز پر بھی بنانا حرام ہے' اجرت کے طور پر تصویروں کا کام بھی حرام ہے' جیسا کہ مذکورہ بالا دلائل سے ثابت ہوتا ہے۔ وباللہ التوفیق وصلی اللہ وسلم علی نبینا محمد و آلہ وصحبہ

——— فتویٰ کمیٹی ———

مردوں کے استعمال کے لیے سونے کی گھڑیاں' انگوٹھیاں اور قلم

سوال کیا مردوں کے لیے ایسی گھڑیاں بیچنا جائز ہے' جن میں سونا استعمال ہوا ہو' نیز سونے کی بنی ہوئی انگوٹھیاں اور قلم بیچنے کے بارے میں کیا حکم ہے؟ اگر کوئی ایسی چیز بیچے تو اس سے حاصل ہونے والے نفع کے بارے میں کیا حکم ہے؟

جواب سونے اور چاندی کی بنی ہوئی گھڑیاں اور انگوٹھیاں مردوں اور عورتوں کو بیچنا تو جائز ہے لیکن مرد کے لیے یہ جائز نہیں کہ وہ سونے کی گھڑی یا انگوٹھی پہنے یا ایسی گھڑی اور انگوٹھی پہنے جس پر سونے کی پالش کی گئی ہو۔

اسی طرح چاندی کی گھڑی بھی صرف عورتوں کے لیے استعمال کرنا جائز ہے البتہ چاندی کی انگوٹھی مردوں اور عورتوں کے لیے جائز ہے۔ سونے اور چاندی کے پین مردوں اور عورتوں سب کے لیے ناجائز ہیں کیونکہ یہ زیورات میں سے نہیں ہیں بلکہ یہ تو سونے اور چاندی کے برتنوں کے مشابہ ہیں اور سونے اور چاندی کے برتن سب کے لیے استعمال کرنا حرام ہے کیونکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے:

«لاَ تَشْرَبُوا فِي آنِيَةِ الذَّهَبِ وَالْفِضَّةِ، وَلاَ تَأْكُلُوا فِي صِحَافِهَا فَإِنَّهَا لَهُمْ فِي الدُّنْيَا وَلَنَا فِي الآخِرَةِ»(صحيح البخاري، الأطعمة، باب الأكل في إناء مفضض، ح:٥٤٢٦ وصحيح مسلم، اللباس، باب تحريم استعمال إناء الذهب ... الخ، ح:٢٠٦٧)

"سونے اور چاندی کے برتنوں میں نہ پیو اور نہ ان کے پیالوں میں کھاؤ کیونکہ یہ ان (کافروں) کے لیے دنیا میں اور ہمارے لیے آخرت میں ہیں۔"

اسی طرح نبی ﷺ نے یہ بھی فرمایا ہے:

«اَلَّذِي يَشْرَبُ فِي إِنَاءِ الْفِضَّةِ (وَالذَّهَبِ) إِنَّمَا يُجَرْجِرُ فِي بَطْنِهِ نَارَ جَهَنَّمَ» (صحيح البخاري، الأشربة، باب آنية الفضة، ح:٥٦٣٤ وصحيح مسلم، اللباس، باب تحريم استعمال أواني الذهب ... الخ، ح:٢٠٦٥)

"جو شخص سونے اور چاندی کے برتن میں پیتا ہے تو یقیناً وہ اپنے پیٹ میں جہنم کی آگ بھرتا ہے۔"

یاد رہے کہ چمچ اور چائے اور قہوہ کے لیے استعمال ہونے والی پیالیاں بھی برتنوں میں شامل ہیں۔ ہم دعا کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ تمام مسلمانوں کو اپنی رضا کے کام کرنے کی توفیق عطا فرمائے اور اپنے غضب اور ناراضی کے کاموں سے محفوظ رکھے! واللہ ولی التوفیق۔

——— شیخ ابن باز ———

حصص کی خرید و فروخت کے احکام

بینکوں کے حصص کی خریدوفروخت حرام اور سود ہے

سوال بینکوں کے حصص خریدنے اور پھر ایک مدت کے بعد فروخت کر دینے کے بارے میں کیا حکم ہے کہ اس طرح ایک ہزار کے تین ہزار بھی ہو جاتے ہیں' کیا یہ خریدوفروخت سود ہے؟

جواب بینکوں کے حصص کی خریدوفروخت جائز نہیں کیونکہ یہ تساوی اور تقابض کی شرط کے بغیر نقدی کی نقدی کے ساتھ بیع ہے اور پھر سودی اداروں کے ساتھ خریدوفروخت کی صورت میں تعاون کرنا بھی جائز نہیں ہے کیونکہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَتَعَاوَنُوا۟ عَلَى ٱلْبِرِّ وَٱلتَّقْوَىٰ ۖ وَلَا تَعَاوَنُوا۟ عَلَى ٱلْإِثْمِ وَٱلْعُدْوَٰنِ ۚ﴾ (المائدة: ٥/ ٢)

"اور نیکی اور پرہیز گاری کے کاموں میں تم ایک دوسرے کی مدد کیا کرو اور گناہ اور ظلم کی باتوں میں مدد نہ کیا کرو۔"

اور حدیث سے ثابت ہے:

«لَعَنَ رَسُولُ اللهِ ﷺ آكِلَ الرِّبَا، وَمُوكِلَهُ، وَكَاتِبَهُ، وَشَاهِدَيْهِ، وَقَالَ: هُمْ سَوَاءٌ»(صحيح

مسلم، المساقاة، باب لعن آكل الربا ومؤكله، ح:۱۵۹۸)

"رسول اللہ ﷺ نے سود کھانے، کھلانے، لکھنے اور دونوں گواہی دینے والوں پر لعنت فرمائی ہے اور فرمایا کہ یہ سب گناہ میں برابر ہیں۔"

آپ کے لیے صرف راس المال ہی جائز ہے۔ آپ کے لیے اور دیگر تمام مسلمانوں کے لیے میری وصیت یہ ہے کہ تمام سودی معاملات سے مکمل طور پر اجتناب کریں اور جو کچھ پہلے ہو چکا ہے، اس سے اللہ تعالیٰ کی جناب میں توبہ کریں کیونکہ سودی معاملات تو اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول اللہ ﷺ سے جنگ ہیں اور یہ اللہ تعالیٰ کے غضب اور عذاب کا سبب ہیں جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ اَلَّذِينَ يَأْكُلُونَ الرِّبَوٰاْ لَا يَقُومُونَ إِلَّا كَمَا يَقُومُ الَّذِى يَتَخَبَّطُهُ الشَّيْطَـٰنُ مِنَ الْمَسِّ ذَٰلِكَ بِأَنَّهُمْ قَالُوٓاْ إِنَّمَا الْبَيْعُ مِثْلُ الرِّبَوٰاْ وَأَحَلَّ اللَّهُ الْبَيْعَ وَحَرَّمَ الرِّبَوٰاْ فَمَن جَآءَهُۥ مَوْعِظَةٌ مِّن رَّبِّهِۦ فَانتَهَىٰ فَلَهُۥ مَا سَلَفَ وَأَمْرُهُۥٓ إِلَى اللَّهِ وَمَنْ عَادَ فَأُوْلَـٰٓئِكَ أَصْحَـٰبُ النَّارِ هُمْ فِيهَا خَـٰلِدُونَ ﴿٢٧٥﴾ يَمْحَقُ اللَّهُ الرِّبَوٰاْ وَيُرْبِى الصَّدَقَـٰتِ وَاللَّهُ لَا يُحِبُّ كُلَّ كَفَّارٍ أَثِيمٍ ﴿٢٧٦﴾ ﴾ (البقرة۲/ ۲۷۵-۲۷٦)

"جو لوگ سود کھاتے ہیں وہ (قبروں سے) اس طرح (حواس باختہ) اٹھیں گے جیسے کسی کو جن نے لپٹ کر دیوانہ بنا دیا ہو، یہ اس لیے کہ وہ کہتے ہیں کہ سودا بیچنا بھی تو (نفع کے لحاظ سے) ویسا ہی ہے جیسے سود (لینا) حالانکہ سودے کو اللہ نے حلال کیا ہے اور سود کو حرام۔ تو جس شخص کے پاس اللہ کی نصیحت پہنچی اور وہ (سود لینے سے) باز آ گیا تو جو پہلے ہو چکا وہ اس کا، اور (قیامت میں) اس کا معاملہ اللہ کے سپرد ہے اور جو پھر لینے لگا تو ایسے لوگ دوزخی ہیں، وہ ہمیشہ دوزخ میں رہیں گے۔ اللہ سود کو مٹاتا (بے برکت کرتا) اور خیرات (کی برکت) کو بڑھاتا ہے، اور اللہ کسی ناشکرے گناہ گار کو دوست نہیں رکھتا۔"

نیز ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ يَـٰٓأَيُّهَا الَّذِينَ ءَامَنُواْ اتَّقُواْ اللَّهَ وَذَرُواْ مَا بَقِىَ مِنَ الرِّبَوٰٓاْ إِن كُنتُم مُّؤْمِنِينَ ﴿٢٧٨﴾ فَإِن لَّمْ تَفْعَلُواْ فَأْذَنُواْ بِحَرْبٍ مِّنَ اللَّهِ وَرَسُولِهِۦ وَإِن تُبْتُمْ فَلَكُمْ رُءُوسُ أَمْوَٰلِكُمْ لَا تَظْلِمُونَ وَلَا تُظْلَمُونَ ﴿٢٧٩﴾ ﴾

(البقرة۲/ ۲۷۸-۲۷۹)

"اے مومنو! اللہ سے ڈرو، اور اگر ایمان رکھتے ہو تو (تمہارا) جتنا سود (لوگوں پر) باقی رہ گیا ہے اسے چھوڑ دو۔ اگر ایسا تم نے نہ کیا تو آگاہ ہو جاؤ کہ اللہ اور اس کے رسول کی طرف سے تمہارے خلاف اعلان جنگ ہے۔ اور اگر تم (اب بھی) توبہ کر لو (اور سود چھوڑ دو تو تمہیں اپنی اصلی رقم لینے کا حق ہے نہ تم ظلم کرو، اور نہ تم پر ظلم کیا جائے۔" اور جیسا کہ سابقہ حدیث شریف سے بھی یہ معلوم ہوتا ہے۔

—— شیخ ابن باز ——

کمپنیوں کے حصص کا کاروبار

بازار میں کام کرنے والی کمپنیوں کے حصص کے بارے میں کیا شرعی حکم ہے؟ کیا ان کا کاروبار جائز ہے؟

جواب میں اس سوال کا جواب نہیں دے سکتا کیونکہ بازاروں میں کام کرنے والی کمپنیاں سودی معاملات کے اعتبار سے مختلف ہیں۔ کسی کمپنی کے بارے میں اگر یہ معلوم ہو کہ یہ سودی کاروبار کرتی اور حصص خریدنے والوں میں سودی نفع تقسیم کرتی ہے تو پھر اس کے حصص خریدنا جائز نہیں ہے۔ اگر آپ نے حصص خرید لیے ہوں اور یہ بعد میں معلوم ہوا کہ اس کا کاروبار سودی ہے تو اس کمپنی کے پاس جاکر اپنا اشتراک ختم کر دو۔ اور اگر یہ ناممکن ہو اور آپکا کمپنی میں حصہ باقی رہے تو پھر اس طرح کرو کہ جب کمپنی سے نفع آئے تو اس میں سے اپنے حلال نفع کو لے لو اور حرام نفع سے نجات حاصل کرنے کے لیے اسے صدقہ کر دو۔ اور اگر نفع میں حلال و حرام کی شرح معلوم کرنا بھی ممکن نہ ہو تو پھر احتیاط کے طور پر نصف نفع صدقہ کر دو اور نصف اپنے پاس رکھ لو کیونکہ آپ کے بس میں یہی ہے اور ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ فَاتَّقُوا اللَّهَ مَا اسْتَطَعْتُمْ ﴾ (التغابن ٦٤/ ١٦)

"سو جہاں تک ہو سکے تم اللہ سے ڈرو۔"

——— شیخ ابن عثیمین ———

کرنسی کا کاروبار

کرنسی کے کاروبار کے بارے میں حکم

سوال کیا مسلمان کیلئے کرنسی کا کاروبار کرنا صحیح ہے؟ کیا اسلام اس کی اجازت دیتا ہے؟ اس کاروبار کے بارے میں شرعی حکم کیا ہے؟

جواب کرنسی کے کاروبار میں کوئی حرج نہیں کیونکہ یہ نقدی کے ساتھ بیع ہے لیکن اس میں شرط یہ ہے کہ الگ ہونے سے پہلے بائع اور مشتری اپنی اپنی نقدی کو قبضہ میں لے لیں' خواہ وہ نقدی دے کر بینک کی طرف سے تصدیق شدہ چیک وصول کریں کیونکہ چیک بھی نقدی ہی کے قائم مقام ہیں اور خواہ یہ دونوں باہمی سودا کرنے والے مالک ہوں یا وکیل۔ اور اگر عرف اس طرح نہ ہو تو پھر یہ کاروبار جائز نہ ہو گا اور ایسا کام کرنے والا گناہ گار اور ناقص الایمان تو ضرور ہو گا لیکن وہ اس سے کافر نہیں ہو گا۔

——— شیخ ابن جبرین ———

کرنسی کی خرید و فروخت

سوال کیا ایک مسلمان کیلئے یہ جائز ہے کہ وہ ڈالر یا کوئی اور کرنسی سستے بھاؤ خریدے اور جب وہ مہنگی ہو جائے تو اسے بیچ دے؟

جواب اس میں کوئی حرج نہیں جب وہ ڈالر یا کوئی بھی اور کرنسی خریدے اور اسے اپنے پاس محفوظ رکھے اور پھر اس کے بعد جب وہ مہنگی ہو تو اسے بیچ دے لیکن اسے ادھار نہیں بلکہ دست بدست خریدے مثلاً ڈالروں کو سعودی ریالوں یا عراقی دیناروں کے ساتھ دست بدست خریدے کیونکہ سونے اور چاندی کی طرح کرنسی کے لیے بھی یہ ضروری ہے کہ اس کا سودا دست بدست ہو۔ واللہ المستعان۔

——— شیخ ابن باز ———

امریکی ڈالروں کی ادھار بیع

سوال امریکی ڈالروں کی کمائی کے لیے ادھار بیع کے بارے میں کیا حکم ہے؟ اور اگر یہ بیع جائز نہیں تو مقررہ مدت آنے پر بائع کو کس حساب سے رقم ادا کی جائے اور اس طرح کا معاملہ کرنے والے فریقوں کو کیا کرنا چاہیئے؟

جواب امریکی ڈالر بھی کرنسی ہے اور اس کے ساتھ معاملہ کرنے کے بارے میں بھی وہی حکم ہے جو دیگر کرنسیوں کا ہے یعنی ڈالر کی ڈالر ہی کے ساتھ کمائی کیلئے ادھار بیع جائز نہیں ہے کیونکہ اس میں ربا الفضل بھی ہے اور ربا النسیئہ بھی اور نہ ہی اس کی کسی دوسری کرنسی کے ساتھ ادھار بیع جائز ہے کیونکہ اس میں ربا النسیئہ ہے' لہٰذا ان دونوں حالتوں میں عقد بیع فاسد ہو گا۔ بائع کو نفع کے بغیر اصل رقم ہی واپس کرنی چاہیئے کیونکہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ وَإِن تُبْتُمْ فَلَكُمْ رُءُوسُ أَمْوَٰلِكُمْ لَا تَظْلِمُونَ وَلَا تُظْلَمُونَ ﴿٢٧٩﴾ ﴾ (البقرة ٢/ ٢٧٩)

"اور اگر تم (اب بھی) توبہ کر لو (اور سود چھوڑ دو) تو تم کو اپنی اصل رقم لینے کا حق ہے نہ تم ظلم کرو' اور نہ تم پر ظلم کیا جائے۔"

اور وہ عقد فاسد ہونے کی وجہ سے فوراً اس کا مستحق ہو گا۔ اس طرح کا کاروبار کرنے والوں میں سے جس شخص کو اس برائی سے روکا جائے تو اسے چاہیئے کہ وہ رک جائے اور اللہ تعالیٰ کے حضور توبہ کرے اور اگر وہ توبہ نہ کرے اور اس حرام کاروبار کو جاری رکھے تو حکمران اسے کوئی مناسب تعزیری سزا بھی دے سکتے ہیں۔ وصلى الله على محمد وعلى آله وصحبه وسلم۔

——— فتویٰ کمیٹی ———

حرام بیوع کا بیان

تجارتی اداروں کی طرف سے انعامات کی پیشکش

یہ دیکھا گیا ہے کہ بعض ادارے اور تجارتی مراکز اخبارات وغیرہ میں یہ اعلانات کرتے ہیں کہ جو لوگ ان سے سامان خریدیں گے یہ ان کی خدمت میں انعامات بھی پیش کریں گے' اس سے برانگیختہ ہو کر لوگ اسی دکان یا ادارے سے سامان خریدتے ہیں اور دوسرے سے نہیں خریدتے یا ان انعامات میں سے کسی ایک انعام کے حصول کے لالچ میں ایسا سامان بھی خرید لیتے ہیں جن کی انہیں ضرورت نہیں ہوتی' یہ چونکہ جوئے کی ایک قسم ہے جو شرعاً حرام ہے اور باطل طریقے سے لوگوں کے مال کھانے کا ایک طریقہ ہے کیونکہ اس طرح لوگوں کو اپنے سامان خریدنے پر برانگیختہ کیا جاتا ہے اور یہ طریقہ دوسرے اداروں کی کساد بازاری کا سبب بنتا ہے جو اس طرح جوئے کا کاروبار نہیں کرتے' لہٰذا میں نے چاہا کہ مسلمانوں کو تنبیہ کروں کہ یہ عمل حرام ہے اور اس طریقہ سے حاصل کیا جانے والا انعام بھی حرام ہے کیونکہ یہ جوا ہے جو شرعاً حرام

ہے لہٰذا تجارت پیشہ لوگوں کو چاہیئے کہ وہ اس جوا سے اجتناب کریں اور دوسرے لوگوں کی طرح معمول کی تجارت پر اکتفاء کریں کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ يَـٰٓأَيُّهَا ٱلَّذِينَ ءَامَنُوا۟ لَا تَأْكُلُوٓا۟ أَمْوَٰلَكُم بَيْنَكُم بِٱلْبَـٰطِلِ إِلَّآ أَن تَكُونَ تِجَـٰرَةً عَن تَرَاضٍ مِّنكُمْ ۚ وَلَا تَقْتُلُوٓا۟ أَنفُسَكُمْ ۚ إِنَّ ٱللَّهَ كَانَ بِكُمْ رَحِيمًا ﴿٢٩﴾ وَمَن يَفْعَلْ ذَٰلِكَ عُدْوَٰنًا وَظُلْمًا فَسَوْفَ نُصْلِيهِ نَارًا ۚ وَكَانَ ذَٰلِكَ عَلَى ٱللَّهِ يَسِيرًا ﴿٣٠﴾ ﴾ (النساء٤/ ٢٩-٣٠)

"مومنو! ایک دوسرے کا مال ناحق نہ کھاؤ' ہاں اگر آپس کی رضامندی سے تجارت کا لین دین ہو (اور اس سے مالی فائدہ حاصل ہو جائے تو وہ جائز ہے) اور اپنے آپ کو ہلاک نہ کرو کچھ شک نہیں کہ اللہ تم پر مہربان ہے۔ اور جو تعدی اور ظلم سے ایسا کرے گا ہم اس کو عنقریب جہنم میں داخل کریں گے اور یہ اللہ کو آسان ہے۔"

اور یہ جوا تجارت نہیں ہے جو باہمی رضامندی کا لین دین ہونے کی وجہ سے جائز ہو بلکہ یہ تو وہ جوا ہے' جسے اللہ تعالیٰ نے حرام قرار دیا ہے کیونکہ یہ تو باطل طریقے سے لوگوں کا مال کھانا اور لوگوں میں عداوت اور دشمنی پیدا کرنا ہے جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ يَـٰٓأَيُّهَا ٱلَّذِينَ ءَامَنُوٓا۟ إِنَّمَا ٱلْخَمْرُ وَٱلْمَيْسِرُ وَٱلْأَنصَابُ وَٱلْأَزْلَـٰمُ رِجْسٌ مِّنْ عَمَلِ ٱلشَّيْطَـٰنِ فَٱجْتَنِبُوهُ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ ﴿٩٠﴾ إِنَّمَا يُرِيدُ ٱلشَّيْطَـٰنُ أَن يُوقِعَ بَيْنَكُمُ ٱلْعَدَٰوَةَ وَٱلْبَغْضَآءَ فِى ٱلْخَمْرِ وَٱلْمَيْسِرِ وَيَصُدَّكُمْ عَن ذِكْرِ ٱللَّهِ وَعَنِ ٱلصَّلَوٰةِ ۖ فَهَلْ أَنتُم مُّنتَهُونَ ﴿٩١﴾ ﴾ (المائدة٥/ ٩٠-٩١)

"اے ایمان والو! شراب اور جوا اور بت اور پانسے (یہ سب) ناپاک کام اعمال شیطان سے ہیں سو ان سے بچتے رہنا تاکہ تم نجات پاؤ۔ شیطان تو یہ چاہتا ہے کہ شراب اور جوئے کے سبب تمہاری آپس میں دشمنی اور رنجش ڈلوا دے اور تمہیں اللہ کی یاد سے اور نماز سے روک دے تو تم کو (ان کاموں سے) باز رہنا چاہیئے۔"

اللہ تعالیٰ ہی سے دعا ہے کہ ہمیں اور تمام مسلمانوں کو اس کی توفیق عطا فرمائے' جس میں اس کی رضا اور اس کے بندوں کی بہتری ہو اور ہم سب کو ان تمام کاموں سے بچائے جو اس کی شریعت کے خلاف ہوں۔ انه جواد کریم' وصلی اللہ وسلم علی نبینا محمد و آله وصحبه۔

———— عبدالعزیز بن عبداللہ بن باز ————

چیئرمین

ادارات بحوث علمیہ وافتاء و دعوت وارشاد

گاہکوں کی تعداد بڑھانے کے لیے خریداری پر انعامات کی تقسیم

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ وَالصَّلٰوةُ وَالسَّلَامُ عَلٰى رَسُوْلِ اللّٰهِ وَآلِهٖ وَصَحْبِهٖ ـ أَمَّا بَعْدُ

بحوث علمیہ وافتاء کی فتویٰ کمیٹی نے اس سوال پر غور کیا جو ادارہ بحوث علمیہ وافتاء و دعوت و ارشاد کے سامنے پیش کیا گیا تھا اور جس کا مضمون حسب ذیل ہے:

"میری بازار میں عطریات' سامان آرائش و زیبائش اور تھیلوں وغیرہ کی دکان ہے اور میں نے خریداروں کے

لیے انعامی سکیم کے ذریعہ مقامی اشیاء کی سیل بڑھانے کا ارادہ کیا ہے جس کی صورت یہ ہو گی کہ جب کوئی گاہک دو سو ریال کا سامان خریدے گا تو وہ لاٹری کا کارڈ نکالے گا اور وہ انعام حاصل کرے گا جو اس کارڈ پر لکھا ہو گا اور جب وہ چار سو ریال کا سامان خریدے گا تو وہ لاٹری کے دو کارڈ نکال کر دو انعام حاصل کر سکے گا۔ اس انعامی سکیم میں رکھے جانے والے انعامات بھی مختلف ہوں گے' ان میں سے کچھ تو قیمتی ہوں گے مگر ان کی تعداد کم ہو گی' کچھ درمیانی قیمت کے ہوں گے اور ان کی تعداد بھی درمیانی ہو گی اور ایسے انعام کی تعداد بہت زیادہ ہو گی جن کی قیمت خریدار کی قیمت خرید کے دس فیصد کے بقدر ہو گی یعنی ایک انعام کی قیمت بیس ریال یا اس سے زیادہ ہو گی یعنی ہر گاہک کوئی انعام تو ضرور حاصل کرے گا لیکن انعام وہ ہو گا جو لاٹری کے کارڈ پر لکھا ہو گا البتہ اس کی قیمت مختلف ہو گی یعنی وہ ٹیپ ریکارڈر یا ائرکنڈیشنر یا ٹیلی وژن یا لائٹر یا عطر کی شیشی وغیرہ حاصل کر سکے گا اور یاد رہے اس انعامی سکیم کے دنوں میں بھی سامان فروخت کی قیمت وہی ہو گی جو عام دنوں میں ہوتی ہے یعنی قیمتوں میں کوئی کمی بیشی نہ ہو گی۔ یہ انعامی سکیم صرف پرچون نرخ پر ہو گی یعنی تھوک نرخ پر نہیں ہو گی' اسی طرح دکان کے ملازمین بھی لاٹری کارڈ نکالنے کے مستحق نہ ہوں گے نیز انتظامیہ کے افراد بھی اس سکیم میں حصہ نہیں لے سکیں گے۔ اب سوال یہ ہے کیا یہ سکیم جائز ہے کہ ہم اخبارات میں اس کا اعلان کر دیں اور نمائش کے دروازہ پر انعامی سکیم کا بورڈ لگا دیں یا یہ جائز نہیں ہے؟ امید ہے آپ اس امر کی طرف میری رہنمائی فرمائیں گے جس میں دین و دنیا کی مصلحت ہو؟ واللہ یحفظکم۔

افتاء کمیٹی نے اس کا حسب ذیل جواب دیا:

"اگر امر واقع اسی طرح ہے جس طرح سوال میں ذکر کیا گیا ہے تو اس طرح انعامات کے نام سے خریداروں کو جو دیا جاتا ہے یہ حرام ہے کیونکہ اپنے سامان کو ترویج دینے اور گاہکوں کی تعداد بڑھا کر اپنے رأس المال میں اضافہ کرنے کے لیے یہ سکیم ہے خواہ اس انعامی سکیم میں بھی مال عام قیمت ہی پر فروخت کیا جائے اور پھر اگر دوسرے تاجر یہ طریقہ اختیار نہ کریں تو اس میں ان کا نقصان بھی ہے یعنی یہ اپنی تجارت کو فروغ دینے اور زیادہ کمائی کرنے کے لیے جوا کی ایک سکیم ہے اور پھر اس کے نتیجہ میں عداوت اور بغض کی آگ بھی بھڑکتی ہے اور یہ لوگوں کے مال باطل طریقے سے کھانے کا بھی ایک طریقہ ہے کیونکہ ممکن ہے کہ ایک شخص کو تو دو سو ریال کا مال خریدنے پر ٹیپ ریکارڈر یا ائرکنڈیشنر مل جائے اور دوسرے...... کو اسی قیمت کے سامان خریدنے کے نتیجہ میں صرف لائٹر یا عطر کی شیشی ہی ملے جس کی قیمت صرف دس یا بیس ریال ہو' لہٰذا یہ ایک حرام طریقہ ہے۔ وصلی اللہ علی نبینا محمد و آلہ وصحبہ وسلم۔

——— فتویٰ کمیٹی ———

یہ کاروبار جوا ہے

سوال ہمارے شہر میں ایک ویلفیئر سوسائٹی ہے جس نے اپنے دفتر کے دروازے کے سامنے ایک گاڑی کھڑی کر رکھی ہے جو شخص عام ریٹ پر ایک سو یا اس سے زیادہ درہم کا سامان خریدے گا تو اسے مفت ایک ٹکٹ دی جائے گی جس پر نمبر لگے

ہوئے ہیں اور جس پر لکھا ہوا ہے کہ اس کی قیمت دس درہم ہے اور پھر بعد میں ٹکٹ کے نمبروں کے حساب سے لاٹری نکالی جائے گی اور جس سعادت مند (ان کے بقول) کی لاٹری نکل آئی اسے گاڑی دے دی جائے گی۔ اس تفصیل کے عرض کرنے سے میرا مقصد یہ پوچھنا ہے کہ:

۱۔ مفت حاصل ہونے والے اس ٹکٹ کے ذریعہ اس لاٹری سکیم میں شرکت کے بارے میں کیا حکم ہے۔ یاد رہے کہ اس سکیم میں شرکت کرنے والے کو اگر کامیابی نہ ہو تو اسے کوئی نقصان بھی نہیں ہے؟

۲۔ اس مذکورہ ٹکٹ کے حاصل کرنے کی غرض سے اس سوسائٹی سے سامان خریدنے اور قرعہ اندازی میں شریک ہونے کے بارے میں کیا حکم ہے؟

اس مسئلہ کے جواز اور عدم جواز کے بارے میں یہاں لوگوں کو' جن میں پڑھے لکھے لوگ بھی شامل ہیں تردد ہے' لہٰذا امید ہے کہ آپ دلائل کے ساتھ مذکورہ بالا دونوں سوالوں کے جواب عطا فرمائیں گے تاکہ لوگوں کو اس مسئلہ میں دینی رہنمائی میسر آ سکے۔ جزاکم اللہ خیراً!

جواب یہ معاملہ جوا ہے اور جوا حسب ذیل ارشاد باری تعالیٰ کے مطابق حرام ہے:

﴿ يَٰٓأَيُّهَا ٱلَّذِينَ ءَامَنُوٓاْ إِنَّمَا ٱلۡخَمۡرُ وَٱلۡمَيۡسِرُ وَٱلۡأَنصَابُ وَٱلۡأَزۡلَٰمُ رِجۡسٞ مِّنۡ عَمَلِ ٱلشَّيۡطَٰنِ فَٱجۡتَنِبُوهُ لَعَلَّكُمۡ تُفۡلِحُونَ ﴿٩٠﴾ إِنَّمَا يُرِيدُ ٱلشَّيۡطَٰنُ أَن يُوقِعَ بَيۡنَكُمُ ٱلۡعَدَٰوَةَ وَٱلۡبَغۡضَآءَ فِي ٱلۡخَمۡرِ وَٱلۡمَيۡسِرِ وَيَصُدَّكُمۡ عَن ذِكۡرِ ٱللَّهِ وَعَنِ ٱلصَّلَوٰةِۖ فَهَلۡ أَنتُم مُّنتَهُونَ ﴿٩١﴾ ﴾ (المائدۃ٥/ ٩٠۔٩١)

"اے ایمان والو! شراب اور جوا اور بت اور پانسے (یہ سب) ناپاک کام اعمال شیطان سے ہیں سو ان سے بچتے رہنا تاکہ نجات پاؤ' شیطان تو یہ چاہتا ہے کہ شراب اور جوئے کے سبب تمہاری آپس میں دشمنی ڈال دے اور تمہیں اللہ کی یاد سے اور نماز سے روک دے تو تم کو (ان کاموں سے) باز رہنا چاہیئے۔

تمہارے شہر اور دیگر تمام شہروں کے حکمرانوں اور اہل علم پر یہ واجب ہے کہ وہ اس معاملہ سے روکیں اور لوگوں کو اس سے بچنے کی تلقین کریں کیونکہ اس میں کتاب اللہ کی مخالفت بھی ہے اور یہ لوگوں کے مال کو باطل طریقے سے کھانے کا ایک ذریعہ بھی ہے۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو ہدایت اور حق پر استقامت عطا فرمائے۔

—— شیخ ابن باز ——

سگریٹ (تمباکو) کی بیع

سوال تمباکو پینے اور بیچنے کے بارے میں کیا حکم ہے؟

جواب تمباکو پینا بھی حرام اور اس کی خرید و فروخت کرنا اور تمباکو و سگریٹ بیچنے والوں کو اپنی دکانیں کرایہ پر دینا بھی حرام ہے کیونکہ یہ گناہ اور سرکشی کے کاموں میں تعاون ہے اور اس کی حرمت کی دلیل حسب ذیل ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ وَلَا تُؤۡتُواْ ٱلسُّفَهَآءَ أَمۡوَٰلَكُمُ ٱلَّتِي جَعَلَ ٱللَّهُ لَكُمۡ قِيَٰمٗا ﴾ (النساء٤/ ٥)

"اور بے عقلوں کو ان کا مال' جسے اللہ نے تم لوگوں کے لیے سبب معیشت بنایا ہے مت دو۔"

اس آیت سے استدلال یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہمیں اس بات سے منع فرمایا ہے کہ ہم بے عقلوں کو مال دیں کیونکہ

بے عقل اس میں ایسا تصرف کرے گا جس میں فائدہ نہ ہو اور اللہ تعالیٰ نے اس مقام پر یہ بھی بیان فرمایا ہے کہ یہ مال دینی و دنیوی مصلحتوں کے حصول کا ذریعہ اور لوگوں کے لیے سبب معیشت ہے اور اس مال کو تمباکو اور سگریٹ میں خرچ کر دینے میں نہ دین کا فائدہ ہے اور نہ دنیا کا' لہٰذا اس میں خرچ کرنا اس مقصد کے منافی ہے جس کے لیے اللہ تعالیٰ نے اسے پیدا فرمایا ہے' اس کی حرمت کی ایک دلیل یہ ارشاد باری تعالیٰ بھی ہے:

﴿ وَلَا تَقْتُلُوٓا۟ أَنفُسَكُمْ ﴾ (النساء٤/ ٢٩)

"اور اپنے آپ کو ہلاک نہ کرو۔"

اس آیت کریمہ سے استدلال یہ ہے کہ طب اور میڈیکل سائنس نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ تمباکو اور سگریٹ نوشی ایسی مہلک بیماریوں کا سبب بنتا ہے جو انسان کو موت کے منہ میں گرا دیتی ہیں مثلاً کینسر کا ایک بڑا سبب بھی حقہ اور سگریٹ نوشی ہے تو تمباکو نوشی کرنے والا ایک ایسی چیز کو استعمال کرتا ہے جو ہلاکت کا سبب ہے اس کے حرام ہونے کی ایک اور دلیل حسب ذیل ارشاد باری تعالیٰ بھی ہے:

﴿ وَكُلُوا۟ وَٱشْرَبُوا۟ وَلَا تُسْرِفُوٓا۟ ۚ إِنَّهُۥ لَا يُحِبُّ ٱلْمُسْرِفِينَ ﴿٣١﴾ ﴾ (الأعراف٧/ ٣١)

"اور کھاؤ اور پیو اور بے جانہ اڑاؤ کیونکہ اللہ بے جا اڑانے والوں کو دوست نہیں رکھتا۔"

اس آیت کریمہ سے استدلال اس طرح ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے مباح چیزوں میں بھی اسراف یعنی حد سے بڑھ کر خرچ کرنے سے منع فرمایا ہے' تو ایک ایسے کام میں مال خرچ کرنا تو بالاولیٰ منع ہو گا جس میں کوئی فائدہ نہ ہو۔

اس کی حرمت کی ایک دلیل یہ بھی ہے کہ نبی کریم ﷺ نے مال ضائع کرنے سے منع فرمایا ہے [1] اور اس میں کوئی شک نہیں کہ تمباکو اور سگریٹ خریدنے میں مال صرف کرنا مال کو ضائع کرنا ہے' کیونکہ کسی بے فائدہ کام میں مال صرف کرنا بلاشبہ اسے ضائع کرنا ہی ہے۔ اس کی حرمت کے اگرچہ اور بھی بہت سے دلائل ہیں لیکن عقل مند کے لیے تو کتاب و سنت کی صرف ایک دلیل ہی کافی ہوتی ہے۔

اس کی حرمت کی عقلی دلیل یہ بھی ہے کہ کسی بھی عقل مند کو یہ بات زیب نہیں دیتی کہ وہ کسی ایسی چیز کو اختیار کرے جو اس کے لیے نقصان اور بیماری کا سبب بنے اور پھر اس میں مال بھی خرچ ہوتا ہو کیونکہ عقلمند تو اپنے جسم اور مال کی حفاظت کرتا ہے اور اس میں کوتاہی صرف وہی کرتا ہے جس کی عقل اور سمجھ بوجھ میں نقص ہو۔ اس کی حرمت کی دوسری عقلی دلیل یہ ہے کہ جب اسے سگریٹ نہیں ملتی تو اس کا سینہ تنگ ہو جاتا ہے' افکار پریشان کا غلبہ ہو جاتا ہے اور سگریٹ نوش کو عبادت خصوصاً روزہ رکھنا بہت مشکل محسوس ہوتا ہے کیونکہ طلوع فجر سے غروب آفتاب تک سگریٹ چھوڑنا اسے بہت گراں معلوم ہوتا ہے اور اگر روزہ موسم گرما کے طویل دنوں کا ہو تو پھر سگریٹ نوش روزے کو انتہائی ناپسندیدہ نگاہوں سے دیکھتا ہے' لہٰذا میں اپنے مسلمان بھائیوں کو عموماً اور سگریٹ نوشی میں مبتلا لوگوں کو خصوصاً یہ نصیحت کرتا ہوں کہ وہ سگریٹ اور تمباکو نوشی سے مکمل اجتناب کریں' اس کی خرید و فروخت بھی نہ کریں اور اس کا کاروبار کرنے والوں سے بھی کرایہ پر دکان دینے یا کسی بھی اور صورت میں ہرگز ہرگز تعاون نہ کریں۔

---

[1] صحیح بخاری' الادب' باب عقوق الوالدین من الکبائر' حدیث: 5975 و صحیح مسلم' الاقضیة' باب النهی عن کثرة المسائل --- الخ' حدیث: 12' 593

شیخ ابن عثیمین

تمباکو اور سگریٹ کی تجارت اور اس سے صدقہ

سوال تمباکو اور سگریٹ وغیرہ کی تجارت کے بارے میں کیا حکم ہے؟ کیا ان کی قیمت اور ان کی تجارت سے حاصل ہونے والے نفع کو صدقہ' حج اور نیکی کے دیگر کاموں میں خرچ کرنا جائز ہے؟

جواب تمباکو' سگریٹ اور دیگر تمام حرام اشیاء کی تجارت ناجائز ہے کیونکہ یہ خبیث اشیاء ہیں۔ ان کے استعمال میں جسمانی' روحانی اور مالی نقصان ہے۔ اگر کوئی شخص صدقہ یا حج یا نیکی کے دیگر کاموں میں خرچ کرنے کا ارادہ کرے تو اسے پاک مال خرچ کرنا چاہیئے کیونکہ حسب ذیل ارشاد باری تعالیٰ کے عموم کا یہی تقاضا ہے:

﴿ يَـٰٓأَيُّهَا ٱلَّذِينَ ءَامَنُوٓاْ أَنفِقُواْ مِن طَيِّبَـٰتِ مَا كَسَبْتُمْ وَمِمَّآ أَخْرَجْنَا لَكُم مِّنَ ٱلْأَرْضِ ۖ وَلَا تَيَمَّمُواْ ٱلْخَبِيثَ مِنْهُ تُنفِقُونَ وَلَسْتُم بِـَٔاخِذِيهِ إِلَّآ أَن تُغْمِضُواْ فِيهِ ۚ﴾ (البقرة۲/ ۲۶۷)

"اے مومنو! جو پاکیزہ اور عمدہ مال تم کماتے ہو اور جو چیزیں ہم تمہارے لیے زمین سے نکالتے ہیں ان میں سے (اللہ کی راہ میں) خرچ کرو اور بری اور ناپاک چیزیں دینے کا قصد نہ کرنا کہ (اگر وہ چیزیں تمہیں دی جائیں تو) بجز اس کے کہ (لیتے وقت) آنکھیں بند کرو اور ان کو کبھی نہ لو۔"

اور نبی ﷺ نے فرمایا:

«إِنَّ اللهَ طَيِّبٌ لاَ يَقْبَلُ إِلاَّ طَيِّبًا» (صحيح مسلم، الزكاة، باب قبول الصدقة من الكسب الطيب ... الخ، ح: ۱۰۱۵)

"بے شک اللہ تعالیٰ کی ذات پاک ہے اور وہ پاک مال ہی قبول فرماتا ہے۔"

فتویٰ کمیٹی

تصویروں اور مجسّموں کی تجارت

سوال کیا ایک مسلمان کے لیے یہ صحیح ہے کہ وہ تصویروں اور مجسّموں کی تجارت کرے اور اس سامان کے ذریعہ وہ گزر بسر کا اہتمام کرے؟

جواب کسی بھی مسلمان کے لیے تصویروں اور مجسّموں کی بیع اور تجارت جائز نہیں ہے کیونکہ احادیث سے ثابت ہے کہ جاندار اشیاء کی تصویریں اور مجسّمے بنانا اور انہیں باقی رکھنا حرام ہے۔ اور ان کی تجارت کے معنی انہیں رواج دینا اور تصویروں کے بنانے اور انہیں گھروں اور محفلوں میں لٹکانے میں مدد دینا ہے اور جب یہ حرام ہے تو پھر تصویروں کو بنانا اور انہیں بیچنا بھی حرام ہے' مسلمان کے لیے ان کی کمائی سے کھانا اور لباس پہننا وغیرہ جائز نہیں ہے۔ اگر کسی نے اس قسم کا کاروبار شروع کر رکھا ہو تو اسے چاہیئے کہ اسے فوراً ترک کر کے اللہ تعالیٰ سے توبہ کرے' امید ہے اللہ تعالیٰ اس کی توبہ کو قبول فرمالے گا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ وَإِنِّى لَغَفَّارٌ لِّمَن تَابَ وَءَامَنَ وَعَمِلَ صَـٰلِحًا ثُمَّ ٱهْتَدَىٰ ﴿٨٢﴾ ﴾ (طٰہٰ۲۰/ ۸۲)

"اور جو توبہ کرے اور ایمان لائے اور نیک عمل کرے' پھر سیدھے راستے پر بھی چلے تو یقیناً میں اس کو بخش دینے والا ہوں۔"

ہماری طرف سے پہلے بھی ایک فتویٰ صادر ہو چکا ہے جس میں یہ بتایا گیا ہے کہ تمام جاندار اشیاء کی تصویریں حرام ہیں خواہ وہ مجسم ہوں یا غیر مجسم اور خواہ انہیں تراش کر بنایا گیا ہو یا ہاتھ سے بنایا گیا ہو یا رنگوں کی آمیزش سے بنایا گیا ہو یا کیمرہ وغیرہ سے بنایا گیا ہو۔ وصلی اللہ علی نبینا محمد وآلہ وصحبہ وسلم۔

——— فتویٰ کمیٹی ———

ویڈیو کیسٹوں کی تجارت

سوال ویڈیو کیسٹوں کی تجارت کے بارے میں کیا حکم ہے جس میں کم سے کم جو برائی ہے وہ یہ کہ عورتیں بے پردہ دکھائی جاتی ہیں اور عشق و محبت کے قصوں کو فلمایا جاتا ہے۔ کیا ان کا کاروبار کرنے والے تاجر کا مال حرام ہے؟ ایسے تاجر کے لیے کیا واجب ہے؟ وہ ان کیسٹوں اور دیگر سامان سے کس طرح نجات حاصل کرے؟ جزاکم اللہ خیراً

جواب ان کیسٹوں کی خریدوفروخت اور ان کو دیکھنا اور سننا حرام ہے کیونکہ یہ فتنہ و فساد کی دعوت دیتی ہیں' لہٰذا واجب ہے کہ انہیں ضائع کر دیا جائے اور ان کا کاروبار کرنے والوں کو روک دیا جائے تاکہ فتنہ و فساد کا خاتمہ ہو اور مسلمانوں کو اسباب فتنہ سے محفوظ رکھا جا سکے۔ واللہ ولی التوفیق۔

——— شیخ ابن باز ———

وی سی آر کی فروخت

سوال میں نے تقریباً اڑھائی سال پہلے فلمیں دیکھنے کے لیے وی سی آر خریدا تھا اور اب تقریباً ایک سال سے میں نے اسے استعمال نہیں کیا۔ میں اس کے خریدنے پر نادم ہوں اور میں اس سے نجات حاصل کرنا چاہتا ہوں۔ سوال یہ ہے کہ میں اس کا کیا کروں کیونکہ میں کسی اور کو اس برائی میں مبتلا نہیں کرنا چاہتا جس میں میں خود مبتلا ہوا ہوں اور کیا اس کے بیچنے میں بھی گناہ ہو گا کیونکہ یہ حرام امور کے لیے استعمال ہوتا ہے؟

جواب زیادہ احتیاط اس میں ہے کہ اسے فروخت نہ کریں کیونکہ اس کا اکثروبیشتر استعمال برائی ہی کے کاموں کے لیے ہے' امید ہے اللہ تعالیٰ آپ کو اس کی قیمت کے بجائے خیروبرکت سے نوازے گا کیونکہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا ہے کہ "جو کوئی اللہ تعالیٰ کے لیے کسی چیز کو چھوڑ دے گا تو اللہ تعالیٰ اسے اس سے بہتر عطا فرمائے گا۔" [1]

——— فتویٰ کمیٹی ———

حرام گانوں کی کیسٹوں کی تجارت اور اس کے لیے دکانیں کرایہ پر دینا

سوال فضیلۃ الشیخ محمد بن عثیمین!

[1] کشف الخفاء للعجلونی: 238/2

اللہ تعالیٰ آپ کی حفاظت فرمائے' جیسا کہ آپ جانتے ہیں' یہ بلا اور مصیبت آج کل بہت عام ہو گئی ہے کہ جگہ جگہ مختلف انواع و اقسام کے گانوں کی کیسٹوں کی دکانیں کھل گئی ہیں۔ آپ سے سوال یہ ہے کہ گانوں کی ان کیسٹوں کی تجارت کے بارے میں کیا حکم ہے؟ یاد رہے کہ یہ کیسٹیں مشتمل ہوتی ہیں:

۱۔ تمام اقسام کے آلات موسیقی پر

۲۔ عشق' فساد اور مرد و عورت کے مابین بے حیائی پھیلانے کی دعوت پر

۳۔ گھٹیا گفتگو اور فحش عشقیہ اشعار پر

لہٰذا سوال یہ ہے کہ ان کیسٹوں کو خریدنے اور ان کے سننے کے بارے میں کیا حکم ہے؟ ان کیسٹوں کی تجارت سے حاصل ہونے والے مال کے بارے میں کیا حکم ہے؟ ان کیسٹوں کے کاروبار کرنے والوں کو کرایہ پر دکانیں دینے کے بارے میں کیا حکم ہے؟ کیا ان کے لیے کرایہ پر دکانیں دینے والے اور ان کے کاروبار کرنے والوں کو کیسٹیں خریدنے والوں کے گناہ کا بار بھی اٹھانا پڑے گا؟ فتویٰ عنایت فرما کر ثواب حاصل کریں!

جواب جب یہ کیسٹیں ان امور پر مشتمل ہیں' جن کا آپ نے ذکر کیا ہے کہ ان میں مختلف اقسام کی موسیقی بھی ہے اور مردوں اور عورتوں میں عشق' فساد اخلاق' فسق و فجور' گھٹیا گفتگو اور فحش گانے پھیلا دینے کی دعوت بھی' تو پھر مومن تو کیا' جو اللہ اور یوم آخرت پر ایمان رکھتا' اس کے عذاب سے ڈرتا اور اس سے ثواب کی امید رکھتا ہو' کسی بھی عقلمند کو یہ شک نہیں ہو سکتا کہ ان کی خرید و فروخت اور ان کو دیکھنا اور سننا حرام ہے کیونکہ یہ اخلاق کو خراب اور معاشرہ کو تباہ و برباد کرنے والی ہیں اور امت کو اس مقام پر لے جانے والی ہیں جہاں عام خاص سبھی عذاب الٰہی کی گرفت میں آ جاتے ہیں۔ ہر اس شخص پر یہ واجب ہے جس کے پاس یہ کیسٹیں ہوں کہ وہ ان کو صاف کر کے ان پر کوئی مفید چیز ریکارڈ کرے۔

ان کیسٹوں کی تجارت سے حاصل ہونے والا مال حرام ہے اور وہ اس کے مالک کے لیے حلال نہیں ہے کیونکہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا ہے:

«إِنَّ اللهَ إِذَا حَرَّمَ شَيْئًا حَرَّمَ ثَمَنَهُ»(مسند أحمد: ١/ ٢٤٧ وسنن الدارقطني: ٣/ ٧، ح: ٢٧٩١ واللفظ له)

"اللہ تعالیٰ جب کسی چیز کو حرام قرار دیتا ہے تو وہ اس کی قیمت کو بھی حرام کر دیتا ہے۔"

ان کیسٹوں کے کاروبار کرنے والوں کو دکانیں کرایہ پر دینا بھی حرام ہے اور ان کا کرایہ لینا بھی حرام ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے گناہ اور سرکشی پر تعاون کرنے سے منع کرتے ہوئے فرمایا ہے:

﴿ وَلَا تَعَاوَنُوا۟ عَلَى ٱلْإِثْمِ وَٱلْعُدْوَٰنِ ۚ﴾ (المائدة٥/ ٢)

"اور گناہ اور ظلم کی باتوں میں ایک دوسرے کی مدد نہ کیا کرو۔"

خریداروں کا گناہ انہی پر ہے اور کچھ بعید نہیں کہ ان کے گناہ میں کمی کئے بغیر اس کا کچھ گناہ کیسٹیں بیچنے والوں اور انہیں کرایہ پر دکانیں دینے والوں کو بھی ہو۔ واللہ اعلم۔

——— شیخ ابن عثیمین ———

فحش اخبارات و مجلّات کی فروخت

سوال ہماری کتابوں اور سٹیشنری کے سامان کی ایک دوکان ہے' علاوہ ازیں بعض اخبارات و جرائد بھی ہوتے ہیں' جن میں سے کچھ کے ٹائٹل پر یا اندرونی صفحات میں لڑکیوں کی رنگین تصویریں بھی شائع ہوتی ہیں جو خریداروں کی توجہ مبذول کرانے کی غرض سے شائع کی جاتی ہیں' تو ایسے جرائد و مجلّات کی وجہ سے بعض لوگوں نے ہم پر تنقید بھی کی ہے اور کہا ہے کہ ان کا بیچنا حرام ہے تو ہم اپنے عظیم المرتبت شیخ سے امید رکھتے ہیں کہ وہ اس مسئلہ میں فتویٰ سے نوازیں گے' جزاکم اللہ خیراً

جواب آپ کے لیے یا کسی اور کے لیے بھی ایسے جرائد و مجلّات کا بیچنا جائز نہیں ہے جو عورتوں کی تصویروں یا خلاف شریعت مقالات پر مشتمل ہوں کیونکہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ وَتَعَاوَنُوا عَلَى الْبِرِّ وَالتَّقْوَىٰ ۖ وَلَا تَعَاوَنُوا عَلَى الْإِثْمِ وَالْعُدْوَانِ ۚ وَاتَّقُوا اللَّهَ ۖ إِنَّ اللَّهَ شَدِيدُ الْعِقَابِ ﴿٢﴾ ﴾

(المائدۃ ۵/ ۲)

"اور نیکی اور پرہیز گاری کے کاموں میں ایک دوسرے کی مدد کیا کرو اور گناہ اور ظلم کی باتوں میں مدد نہ کیا کرو اور اللہ سے ڈرتے رہو' کچھ شک نہیں کہ اللہ کا عذاب سخت ہے۔"

——— شیخ ابن باز ———

تصویروں والے اخبارات و رسائل کی فروخت

سوال میں اکیس برس کا ایک نوجوان ہوں' میرے والد صاحب فوت ہو گئے ہیں' ہم پانچ بھائی ہیں' والدہ بھی حیات ہیں' والد صاحب کے ترکہ میں کئی دکانیں ہیں' جن میں سے ایک مکتبہ بھی ہے جس پر اخبارات و رسائل' دینی کتب اور قرآن مجید فروخت ہوتے ہیں۔ مکتبہ میں ایک غیر مسلم ملازم بھی کام کرتا ہے۔ میں نے اپنے بڑے بھائی سے کہا کہ اس ملازم کے لیے قرآن مجید اور دینی کتابوں کو ہاتھ لگانا جائز نہیں ہے نیز تصویروں والے اخبارات و رسائل کو فروخت کرنا بھی جائز نہیں' لیکن انہوں نے میری اس بات کو رد کر دیا ہے تو اب مجھے کیا کرنا چاہیے؟ کیا میرے لیے اپنے بھائیوں کے ساتھ بیٹھنا اور کھانا جائز ہے' رہنمائی فرمائیں؟

جواب ہم آپ کے تقویٰ اور حرام یا مشتبہ سے بچنے کے لیے احتیاط کو بنظر استحسان دیکھتے ہیں اور یہ نصیحت کرتے ہیں کہ اس کافر کو الگ کر دو' اس کے بجائے کسی امین مسلمان کو ملازم رکھ لو اسے اس سے ان شاء اللہ بہت بہتر پاؤ گے۔ اخبارات و رسائل اگر فحش اور فسق و فجور کی دعوت دینے والے ہوں تو ان کو بیچنا اور ان سے نفع حاصل کرنا حرام اور اگر تصویریں معمولی اور عام نوعیت کی ہوں اور فحاشی و بے حیائی سے خالی ہوں تو پھر ان مجلّات و جرائد کے بیچنے میں کوئی حرج نہیں کیونکہ اس صورت میں ان کی بیع علوم' فوائد اور ان چیزوں میں ہے جو مباح کلام ہے اس کی وجہ سے ہو گی' ان تصویروں کی وجہ سے نہیں۔ ہم آپ کو یہ نصیحت بھی کرتے ہیں کہ اپنے بھائیوں کے ساتھ مل جل کر رہیں کھائیں پیئیں' آپ کو ان شاء اللہ کوئی گناہ نہیں ہو گا۔

——— شیخ ابن جبرین ———

سٹوڈیو کھولنے کے بارے میں حکم

سوال میں ایک ہندوستانی شہری لیکن الحمدللہ مسلمان ہوں اور یہاں سعودی عرب میں کام کرتا ہوں۔ میں اپنے وطن واپس جا کر سٹوڈیو اور فوٹو سٹیٹ کا کاروبار کرنا چاہتا ہوں تا کہ اپنے اور اپنے اہل خانہ کے لیے روزی کما سکوں۔ کیا یہ کام حلال ہے یا حرام؟

جواب جاندار چیزوں کی تصویر بنانا جائز نہیں ہے کیونکہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا ہے:

«أَشَدُّ النَّاسِ عَذَابًا يَوْمَ الْقِيَامَةِ الْمُصَوِّرُونَ»(صحيح البخاري، اللباس، باب عذاب المصورين يوم القيامة، ح:٥٩٥٠ وصحيح مسلم، اللباس والزينة، باب تحريم تصوير صورة الحيوان ... الخ، ح:٢١٠٩، واللفظ له)

”قیامت کے دن سب سے سخت عذاب مصوروں کو ہو گا۔“

نیز آپ نے سود کھانے، کھلانے اور تصویر بنانے والے پر لعنت فرمائی ہے۔[1] ہم آپ کو نصیحت کرتے ہیں کہ سٹوڈیو نہ کھولیں اور اس کے بجائے کمائی کا کوئی حلال ذریعہ اختیار کریں، ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَمَن يَتَّقِ ٱللَّهَ يَجْعَل لَّهُۥ مَخْرَجًا ۝ وَيَرْزُقْهُ مِنْ حَيْثُ لَا يَحْتَسِبُ﴾ (الطلاق٦٥/ ٢-٣)

”اور جو کوئی اللہ سے ڈرے گا تو وہ اس کے لیے (رنج و غم سے) مخلصی کی صورت پیدا کر دے گا اور اس کو ایسی جگہ سے رزق دے گا جہاں سے (وہم و) گمان بھی نہ ہو۔“

اور فرمایا:

﴿وَمَن يَتَّقِ ٱللَّهَ يَجْعَل لَّهُۥ مِنْ أَمْرِهِۦ يُسْرًا ۝﴾ (الطلاق٦٥/ ٤)

”اور جو اللہ سے ڈرے گا اللہ اس کے کام میں سہولت پیدا کر دے گا۔“

اللہ تعالیٰ آپ کو ہر اچھے کام کی توفیق عطا فرمائے۔

—— شیخ ابن باز ——

چوری کے مال کی خرید و فروخت

سوال جب کوئی انسان ایک چیز چوری کر کے بیچ دے اور خریدار کو معلوم ہو کہ یہ مسروقہ مال ہے تو کیا اسے گناہ ہو گا؟

جواب جس شخص کو یہ معلوم ہو کہ فروخت کیا جانے والا مال مسروقہ (چرایا ہوا) ہے تو اس کے لیے اسے خریدنا حرام ہے اور واجب یہ ہے کہ چوری کا مال بیچنے والے کو منع کرے اور اسے نصیحت کرے کہ یہ مال اس کے اصل مالک کو لوٹا دو اور اگر محض نصیحت سے کام نہ بنے تو حکمرانوں سے اس کے لیے مدد لی جائے۔

—— شیخ ابن باز ——

[1] صحیح بخاری، البیوع، باب موکل الربا --- الخ، حدیث: 2086

مردہ جانور کی بیع

سوال کیا کسی انسان کے لیے مردہ جانور کو بیچنا اور اس کی قیمت وصول کرنا جائز ہے؟

جواب مردہ جانور حرام ہے' ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿حُرِّمَتْ عَلَيْكُمُ الْمَيْتَةُ﴾ (المائدة٥/ ٣)

"تم پر مرا ہوا (مردار) جانور حرام کر دیا گیا ہے۔"

اور جب یہ حرام ہے تو اس کی خرید و فروخت اور اس کی قیمت بھی حرام ہے۔ کسی بھی انسان کے لیے اس کا کھانا حرام ہے سوائے اس کے کہ حالت اضطرار ہو جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے سورہ مائدہ میں حرام اشیاء کا ذکر کرنے کے بعد فرمایا ہے:

﴿فَمَنِ اضْطُرَّ فِي مَخْمَصَةٍ غَيْرَ مُتَجَانِفٍ لِإِثْمٍ فَإِنَّ اللَّهَ غَفُورٌ رَحِيمٌ ۝٣﴾ (المائدة٥/ ٣)

"ہاں جو شخص بھوک میں ناچار ہو جائے (بشرطیکہ) گناہ کی طرف مائل نہ ہو تو اللہ بخشنے والا مہربان ہے۔"

لیکن اس سے ٹڈی اور مچھلی مستثنیٰ ہیں کہ ان کی بیع میں کوئی حرج نہیں کیونکہ اللہ تعالیٰ نے مچھلی اور ٹڈی کو حلال قرار دیا ہے خواہ وہ زندہ ہو یا مردہ کیونکہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿أُحِلَّ لَكُمْ صَيْدُ الْبَحْرِ وَطَعَامُهُ مَتَاعًا لَكُمْ وَلِلسَّيَّارَةِ﴾ (المائدة٥/ ٩٦)

"تمہارے لیے دریا (کی چیزوں) کا شکار اور ان کا کھانا حلال کر دیا گیا ہے۔ (یعنی) تمہارے اور مسافروں کے فائدہ کے لیے۔"

اور نبی کریم ﷺ نے سمندر کے بارے میں فرمایا ہے:

«هُوَ الطَّهُورُ مَاؤُهُ الْحِلُّ مَيْتَتُهُ»(سنن أبي داود، الطهارة، باب الوضوء بماء البحر، ح:٨٣ وجامع الترمذي، ح:٦٩ وسنن النسائي، ح:٥٩ وسنن ابن ماجه، ح:٣٨٦)

"اس کا پانی پاک اور اس کا مردہ جانور حلال ہے۔"

نیز آپ نے یہ بھی فرمایا ہے:

«أُحِلَّتْ لَنَا مَيْتَتَانِ وَدَمَانِ، فَأَمَّا الْمَيْتَتَانِ فَالْحُوتُ وَالْجَرَادُ، وَأَمَّا الدَّمَانِ، فَالْكَبِدُ وَالطِّحَالُ»(سنن ابن ماجه، الأطعمة، باب الكبد والطحال، ح:٣٣١٤ ومسند أحمد: ٢/ ٩٧)

"ہمارے لیے دو مردے اور دو خون حلال کر دیئے گئے ہیں' مُردوں سے مراد مچھلی اور ٹڈی اور خونوں سے مراد جگر اور تلی ہے۔"

——— فتویٰ کمیٹی ———

خون کی تجارت

سوال خون کی بیع کے بارے میں کیا حکم ہے نیز کیا خون کی قیمت وصول کرنا جائز ہے یا ناجائز؟

جواب خون ناپاک ہے۔ اس کا استعمال علاج یا کسی اور مقصد کے لیے جائز نہیں ہے خواہ اسے منہ کے ذریعہ استعمال کیا جائے یا شریانوں کے ذریعہ یا کسی اور طریقہ سے کیونکہ ان احادیث کے عموم کا یہی تقاضا ہے جن میں حرام اور ناپاک اشیاء کو

بطور دوا استعمال کرنے کی ممانعت ہے۔ مثلاً ام درداء رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

«إِنَّ اللهَ أَنْزَلَ الدَّاءَ وَالدَّوَاءَ، وَجَعَلَ لِكُلِّ دَاءٍ دَوَاءً، فَتَدَاوَوْا وَلاَ تَتَدَاوَوْا بِحَرَامٍ»(سنن أبي داود، الطب، باب في الأدوية المكروهة، ح:٣٨٧٤)

"بے شک اللہ تعالیٰ نے بیماری اور دواء نازل فرمائی ہے اور ہر بیماری کی دواء بھی بنائی ہے تو تم دواء استعمال کرو لیکن حرام اشیاء کو بطور دواء استعمال نہ کرو۔"

حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے نشہ آور چیز کے بارے میں فرمایا:

«إِنَّ اللهَ لَمْ يَجْعَلْ شِفَاءَكُمْ فِيمَا حَرَّمَ عَلَيْكُمْ»(صحيح البخاري، الاشربة، باب شراب الحلواء والعسل تعليقًا)

"اللہ تعالیٰ نے اس چیز میں تمہارے لیے شفا نہیں رکھی جس کو تمہارے لیے حرام قرار دے دیا ہے۔"

اس قول کو امام بخاری رحمہ اللہ نے ذکر فرمایا ہے۔ لیکن مرض کے باعث جب انسان حالت اضطرار کو پہنچ جائے اور خون استعمال نہ کرنے کی وجہ سے ہلاکت کا اندیشہ ہو تو پھر "الضرورات تبيح المحظورات" کے اصول پر عمل کیا جائے گا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿فَمَنِ ٱضْطُرَّ فِى مَخْمَصَةٍ غَيْرَ مُتَجَانِفٍ لِّإِثْمٍ فَإِنَّ ٱللَّهَ غَفُورٌ رَّحِيمٌ ۝٣﴾ (المائدة٥/ ٣)

"ہاں جو شخص بھوک میں ناچار ہو جائے (بشرطیکہ) گناہ کی طرف مائل نہ ہو تو بلاشبہ اللہ بخشنے والا مہربان ہے۔"

کہ اگر مرض کے باعث نوبت یہاں تک پہنچ جائے کہ خون استعمال نہ کرنے کی وجہ سے ہلاکت کا اندیشہ ہو تو پھر خون دینا نہ صرف جائز بلکہ انسانی جان بچانے کے لیے خون استعمال کرنا واجب ہے لیکن خون کا معاوضہ لینا جائز نہیں ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ جب کسی چیز کو حرام قرار دیتا ہے تو اس کی قیمت کو بھی حرام کر دیتا ہے جیسا کہ ابوداود اور ابن ابی شیبہ میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

«لَعَنَ اللهُ الْيَهُودَ إِنَّ اللهَ حَرَّمَ عَلَيْهِمُ الشُّحُومَ (فَجَمَلُوهَا) فَبَاعُوهَا وَأَكَلُوا أَثْمَانَهَا»(صحيح البخاري، أحاديث الأنبياء، باب ما ذكر عن بني إسرائيل، ح:٣٤٦٠ وصحيح مسلم، المساقاة، باب تحريم بيع الخمر والميتة ... الخ، ح:١٥٨٢ ومصنف ابن أبي شيبة:٦/ ٤٤٤ واللفظ لأبي داود، ح:٣٤٨٨ إلا "فجملوها")

"اللہ تعالیٰ یہودیوں پر لعنت کرے کہ اللہ تعالیٰ نے ان پر چربیوں کو حرام قرار دیا تو انہوں نے انہیں پگھلا کر بیچ دیا اور ان کی قیمت کھانا شروع کر دی۔"

اگر معاوضہ کے بغیر خون کا حصول مشکل ہو تو پھر معاوضہ دے کر حاصل کرنا بھی جائز ہے اور اس صورت میں خون دینے والے کو معاوضہ لینے کا گناہ ہو گا۔

——— فتویٰ کمیٹی ———

ایسے سامان کی فروخت جس کے مالک کا علم نہ ہو اور ....

سوال کچھ سامان دفتر اعلانات میں اس لیے جمع کرا دیئے جاتے ہیں کہ ان کے مالکان کا علم نہیں ہوتا کہ وہ سامان یا تو کسی غلط بندرگاہ پر اتر جاتے ہیں یا ان پر ایڈریس وغیرہ مکمل نہیں لکھے ہوتے یا بندرگاہ پر اترنے کے بعد وہ کسی ایسے سٹور میں پہنچ جاتے ہیں جو ان کی سٹوریج کی جگہ نہیں ہوتی یا اس کے دیگر اسباب ہوتے ہیں جن کی وجہ سے ان کے اصل مالکان کو معلوم کرنا بہت مشکل ہوتا ہے تو کیا اس طرح کے سامان کو بیچنا حلال ہے یا حرام؟

جواب اگر امر واقع اسی طرح ہے جس طرح ذکر کیا گیا ہے کہ کسی بھی سبب کی وجہ سے مالکان کا علم نہ ہو اور اسے دفتر اعلانات میں جمع کرا دیا گیا ہو تو اسے بیچنا جائز ہے اور اصل مالکان تک قیمت کے پہنچانے کا ذمہ دار وہ ہے جس نے اس سامان کو بیچا ہے یا جس نے اس کے بیچنے کا حکم دیا ہے کیونکہ اس طرح کے لاوارث سامان کے نہ بیچنے کی صورت میں ضائع ہونے اور اس کے مالکان کو نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہے۔

سوال اگر اس طرح کے درآمد کیئے گئے سامان میں تمیز کرنا مشکل ہو جسے درآمد کرنے والوں نے بندرگاہ سے وصول نہ کیا ہو اور ان کا علم نہ ہونے کی وجہ سے اسے دفتر اعلانات میں داخل کرا دیا گیا ہو تو کیا اس طرح کے سامان کو گم شدہ سامان کے دفتر سے خریدنا جائز ہے یا نہیں؟

جواب جس کے لیے اس طرح کے سامان کا معاملہ خلط ملط ہو اور حلال و حرام میں تمیز نہ ہو تو حرام کی تعیین نہ ہونے کی وجہ سے اسے خریدنا جائز ہے۔ نبی اکرم ﷺ یہود اور کفار سے بھی عموماً سامان خرید لیا کرتے [1] اور ان کے تحائف کو بھی قبول فرما لیا کرتے تھے' حالانکہ آپ جانتے تھے کہ ان کے مال میں حلال و حرام ملا ہوا ہے۔ وصلی اللّٰہ علی نبینا محمد و آلہ وصحبہ وسلم۔

——— فتویٰ کمیٹی ———

عیب دار چیز کو بیچنا جائز نہیں

سوال میں سبزی کا تاجر ہوں' میرا ایک شراکت دار بھی ہے جس نے ایک ہزار کلو میٹر کی مسافت سے چالیس قطار زرد آلو خریدے اور جب یہ چھوٹے دکاندار کو بیچے جانے لگے تو معلوم ہوا کہ یہ خراب ہیں' ان کو کیڑا لگا ہوا ہے اور یہ کھانے کے قابل نہیں ہیں۔ چھوٹے دکانداروں کو یہ میں نے بیچے اور مجھے علم نہ تھا کہ ان کو کیڑا لگا ہوا ہے اور کھانے کے قابل نہیں ہیں۔ میرا ساتھی جو انہیں خرید کر لایا تھا اسے اس کا اسی وقت علم ہو گیا تھا جب اس نے انہیں اپنے سٹور میں رکھا تھا لیکن اس نے مجھے نہیں بتایا کہ یہ سارا مال خراب ہے' ہاں البتہ یہ کہا کہ چند دانوں میں کیڑے ہیں....... تو اس کے بیچنے کے بارے میں کیا حکم شریعت ہے؟ ان چھوٹے دکانداروں کے بارے میں کیا حکم ہے جن کو معلوم ہو گیا تھا کہ یہ مال خراب ہے اور انہوں نے پھر بھی اسے بیچ دیا؟

جواب عیب دار چیز کو اس کے عیب کے بتائے بغیر بیچنا جائز نہیں ہے کیونکہ یہ تو اس دھوکا کی ایک قسم ہے جس کے

---

[1] صحیح بخاری' الرھن' باب من رھن درعه' حدیث: 2509 و صحیح مسلم' المساقاۃ' حدیث: 1603

بارے میں رسول اللہ ﷺ نے یہ فرمایا ہے:

«مَنْ غَشَّنَا فَلَيْسَ مِنَّا»(صحیح مسلم، الإیمان، باب قول النبي ﷺ من غشنا فلیس منا، ح:۱۰۱)

"جو ہمیں دھوکہ دے وہ ہم میں سے نہیں ہے۔"

آپ نے یہ بھی ارشاد فرمایا ہے:

«اَلْبَيِّعَانِ بِالْخِيَارِ مَالَمْ يَتَفَرَّقَا فَإِنْ صَدَقَا وَبَيَّنَا بُورِكَ لَهُمَا فِي بَيْعِهِمَا، وَإِنْ كَتَمَا وَكَذَبَا مُحِقَتْ بَرَكَةُ بَيْعِهِمَا» (صحیح البخاري، البیوع، باب إذا بین البیعان ... الخ، ح:۲۰۷۹ وصحیح مسلم، البیوع، باب الصدق في البیع والبیان، ح:۱۵۳۲)

"بیع کرنے والے دونوں کو اس وقت تک اختیار ہے جب تک وہ الگ نہ ہوں۔ اگر وہ سچ بولیں اور ہر چیز واضح کر دیں تو ان کی بیع میں برکت ہو گی اور اگر وہ چھپائیں اور جھوٹ بولیں تو ان کی بیع کی برکت ختم ہو جائے گی۔"

جو شخص دھوکا دے اور عیب والی چیز کو صحیح چیز کے بھاؤ بیچے اسے اللہ تعالیٰ کی جناب میں توبہ کرنی چاہیئے' اپنے فعل پر نادم ہونا چاہیئے اور جس کو دھوکا دیا ہے اسے اس کا حق واپس کر کے صلح کر لینی چاہیئے۔

———— فتویٰ کمیٹی ————

جانتے بوجھتے کے باوجود خراب گاڑی فروخت کر دی

سوال میں نے ایک گاڑی خریدی تو اس میں معمولی سا نقص پایا جس کی وجہ سے میں نے اسے بیچ دیا لیکن خریدار کو اس کے بارے میں نہ بتایا تو کیا یہ بھی دھوکا ہے یا نہیں؟

جواب ہاں یہ بھی دھوکا ہے اور دھوکا حرام ہے کیونکہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا ہے:

«مَنْ غَشَّنَا فَلَيْسَ مِنَّا»(صحیح مسلم، الإیمان، باب قول النبي ﷺ من غشنا فلیس منا، ح:۱۰۱)

"جو ہمیں دھوکا دے وہ ہم میں سے نہیں ہے۔"

لہٰذا اللہ تعالیٰ کے حضور توبہ و استغفار کریں اور جلدی سے مشتری کو بھی یہ بتا دیں کہ گاڑی میں یہ نقص ہے تاکہ آپ بری الذمہ ہو جائیں۔ اگر وہ اپنے حق سے دستبردار ہو جائے تو الحمدللہ ! ورنہ اس خرابی کے عوض اسے معاوضہ دینے پر اتفاق کر لیں یا اس کی رقم واپس کر کے اس سے گاڑی لے لیں۔ اگر صلح نہ ہو سکے تو یہ معاملہ اپنے علاقہ کے قاضی کی عدالت میں پیش کر کے فیصلہ کرا لیں۔ اور اگر خریدار کے بارے میں علم نہ ہو تو خرابی کی قیمت کے بقدر اس کی طرف سے صدقہ کر دیں۔

———— فتویٰ کمیٹی ————

کیا یہ ربا ہے؟

سوال ایک آدمی نے دوسرے کے چاول کی بوریاں ایک مدت کے ادھار پر بیچیں تو مشتری نے انہیں بائع سے لے کر

اپنے قبضہ میں لے لیا اور دلال انہیں بازار میں لے گیا تو دلال سے ایک اور آدمی نے انہیں خرید لیا اور کہا کہ انہیں قبضہ میں لے لو لیکن گاہک نے انہیں موجود نہ پایا تو بائع اول نے کہا کہ میں وکیل ہوں' میں انہیں دلال سے لے کر اپنے قبضہ میں لے لوں گا' یہ بات سن کر حاضرین پکار اٹھے کہ یہ تو سود ہے سود! اس مسئلہ میں فتویٰ دیجئے' اللہ تعالیٰ آپ کو اجر و ثواب سے نوازے!

جواب جس شخص نے دلال سے چاول خریدے ہیں اگر اس نے یہ اپنے لیے خریدے ہیں' اس کے اور بائع اول کے درمیان یہ منصوبہ بندی بھی نہیں ہے کہ وہ اس کے لیے خریدے اور وہ اس کے پاس کام بھی نہیں کرتا اور بائع اول کا چاول کی بوریوں کو اپنے قبضہ میں لینا دلال سے مشتری کے لیے بطریق وکالہ ہے تو بیع صحیح ہے اور اس میں ربا نہیں ہے اور اگر بائع اول اور دلال سے چاول کی بوریاں خریدنے والے کے درمیان پہلے سے طے شدہ منصوبہ بندی ہے کہ وہ اس سے خریدے تاکہ یہ بوریاں پھر سے بائع اول کے پاس آ جائیں تو یہ ربا ہے اور بیع صحیح نہیں ہے اور یہ دھوکا ہے جو اللہ تعالیٰ سے مخفی نہیں اور نہ اس سے حرام حلال ہو گا۔

——— فتویٰ کمیٹی ———

سامان خرید کر اسی جگہ فروخت کرنا

سوال بعض تاجر کچھ سامان خریدتے ہیں اور پھر وصول نہیں کرتے اور نہ اس کا معائنہ ہی کرتے ہیں بلکہ بیع اور قیمت کی رسید لے لیتے ہیں اور اس سامان کو اس تاجر اول کے سٹور ہی میں رہنے دیتے ہیں جس سے انہوں نے خریدا ہوتا ہے اور پھر تاجر ثانی پہلے تاجر کے سٹور ہی سے اسے کسی اور کو بیچ دیتا ہے تو اس کے بارے میں کیا حکم ہے؟

جواب خریدار کے لیے یہ سامان اس وقت تک بیچنا جائز نہیں جب تک یہ بائع کی ملکیت میں رہے اور مشتری خریدنے کے بعد اسے اپنے گھر یا بازار میں منتقل نہ کر دے کیونکہ احادیث صحیحہ سے ثابت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا:

«لاَ يَحِلُّ سَلَفٌ وَّبَيْعٌ، وَّلاَ بَيْعُ مَا لَيْسَ عِنْدَكَ»(سنن أبي داود، البيوع، باب في الرجل يبيع ما ليس عنده، ح:٣٥٠٤)

"ادھار اور بیع حلال نہیں اور نہ اس چیز کی بیع حلال ہے جو تمہارے پاس نہ ہو۔"

اسی طرح نبی ﷺ نے حکیم بن حزام رضی اللہ عنہ سے فرمایا:

«لاَ تَبِعْ مَا لَيْسَ عِنْدَكَ»(سنن أبي داود، البيوع، باب في الرجل يبيع ما ليس عنده، ح:٣٥٠٣)

"جو چیز تمہارے پاس موجود نہ ہو' اسے نہ بیچو"

اسے امام احمد' ترمذی' نسائی اور ابن ماجہ نے جید سند کے ساتھ روایت کیا ہے۔ زید بن ثابت رضی اللہ عنہ سے روایت ہے "نبی کریم ﷺ نے اس سے منع فرمایا کہ سامان کو وہاں بیچا جائے جہاں سے خریدا گیا تھا' حتیٰ کہ تاجر اسے اپنے مقامات پر منتقل کر لیں۔" [1]

ان مذکورہ اور ان کے ہم معنی دیگر احادیث سے معلوم ہوا کہ جو شخص مشتری سے خریدے اس کے لیے بھی یہ جائز

[1] سنن ابی داود' البیوع' باب فی بیع الطعام قبل ان یستوفی' حدیث: 3499 و مسند احمد: 191/5

نہیں کہ اسے اپنے گھر یا بازار وغیرہ کسی دوسری جگہ منتقل کیے بغیر بیچے۔ واللہ ولی التوفیق۔

——— شیخ ابن باز ———

جو تمہاری ملکیت میں نہ ہو اسے نہ بیچو

سوال جب میرے پاس مال موجود ہو اور ایک شخص میرے پاس آکر مجھ سے ایک ہزار ریال ادھار مانگے اور میں اس سے یہ کہوں کہ میں ایک ہزار ریال تیرہ سو ریال میں دوں گا۔ یعنی میں ہر دس سو ریال کے عوض تین سو ریال کماؤں گا' جب وہ میری شرط قبول کرے تو میں اس کے ساتھ بازار جاکر اسے ایک ہزار ریال کا سامان خرید کر تیرہ سو ریال میں بیچ دوں تو کیا یہ حلال ہے یا حرام؟ یاد رہے کہ میں سامان خریدنے سے پہلے ہی اس سے عقد بیع کر لیتا ہوں؟

جواب جیسا کہ سائل نے ذکر کیا ہے کہ اس نے ملکیت سے پہلے ہی اس شخص کے ساتھ سامان کا سودا کیا اور سودا کرنے کے بعد بازار سے سامان خرید کر دیا تو اس صورت میں یہ بیع صحیح نہیں ہے کیونکہ اس نے وہ سامان بیچا جو اس کی ملکیت میں نہیں تھا اور آنحضرت ﷺ کا ارشاد ہے:

«لاَ تَبِعْ مَا لَيْسَ عِنْدَكَ»(سنن أبي داود، البيوع، باب في الرجل يبيع ما ليس عنده، ح:٣٥٠٣)

"اسے نہ بیچو جو تمہارے پاس موجود ہی نہ ہو۔"

اس حدیث کو ترمذی' ابن ماجہ اور دیگر محدثین نے بیان کیا ہے۔ وباللہ التوفیق۔ وصلی اللہ علی نبینا محمد وعلی آلہ وصحبہ وسلم

——— فتویٰ کمیٹی ———

بیع عینہ حرام ہے

سوال جب میں ایک شخص کو قسطوں میں گاڑی بیچوں (یاد رہے کہ قسطوں کی صورت میں گاڑی کی قیمت زیادہ ہو گی) اور پھر وہ مجھ سے مطالبہ کرے کہ میں اپنی گاڑی کو اس سے کم قیمت پر خرید لوں تو اس کے بارے میں کیا حکم ہے؟

جواب یہ مسئلہ' مسئلہ' عینہ کے نام سے موسوم ہے اور اس کا حکم یہ ہے کہ یہ حرام ہے کیونکہ ادلہ شرعیہ اس کی ممانعت پر دلالت کناں ہیں۔ وباللہ التوفیق۔ وصلی اللہ وسلم علی نبینا محمد و آلہ وصحبہ

——— فتویٰ کمیٹی ———

سامان کو ملکیت میں لینے سے پہلے بیچنا جائز نہیں ہے

سوال ایک تاجر نے بعض اشیاء مثلاً ریفریجریٹر اور واشنگ مشین وغیرہ کے نمونے رکھے ہوئے ہیں اور جب کوئی گاہک اس سے سامان خریدنے پر متفق ہو جاتا ہے تو پھر وہ درآمد کنندہ سے رابطہ قائم کر کے مطلوبہ تعداد میں سامان خرید کر اپنی گاڑی کے ذریعہ گاہک کے گھر پہنچا دیتا اور اس کے بعد اس سے قیمت وصول کر لیتا ہے تو اس بیع کے بارے میں کیا حکم ہے؟

جواب یہ بیع جائز نہیں کیونکہ یہ سامان کو اپنے قبضہ اور ملکیت میں لیے بغیر بیع ہے اور نبی کریم ﷺ نے فرمایا:

«لاَ يَحِلُّ سَلَفٌ وَّبَيْعٌ، وَّلاَ بَيْعُ مَا لَيْسَ عِنْدَكَ»(سنن أبي داود، البيوع، باب في الرجل يبيع ما ليس عنده، ح:٣٥٠٤)

"ادھار اور بیع حلال نہیں ہے اور نہ ایسی چیز کی بیع حلال ہے جو تمہارے پاس موجود ہی نہ ہو"

اسی طرح نبی ﷺ نے حکیم بن حزام رضی اللہ عنہ سے فرمایا تھا:

«لاَ تَبِعْ مَا لَيْسَ عِنْدَكَ»(سنن أبي داود، البيوع، باب في الرجل يبيع ما ليس عنده، ح:٣٥٠٣)

"اسے نہ بیچو جو تمہارے پاس موجود ہی نہ ہو۔"

نبی کریم ﷺ نے اس بات سے بھی منع فرمایا ہے کہ سامان کو تاجر اپنے مقامات پر منتقل کئے بغیر اسی جگہ بیچیں جہاں انہوں نے خریدا ہو۔" واللہ ولی التوفیق۔

شیخ ابن باز

اسے نہ بیچو جو تمہارے پاس ہی نہ ہو

سوال ایک کمپنی گاڑیوں کے شو رومز میں اپنے نمائندے بھیج دیتی ہے تو جو شخص قسطوں پر گاڑی خریدنا چاہتا ہو تو وہ شو روم کے مالک کے ساتھ قیمت طے کر لیتا ہے اور پھر وہ کمپنی کے نمائندہ سے ملتا ہے اور کمپنی اس گاڑی کی مکمل قیمت ادا کر دیتی ہے اور خریدار کے ساتھ اپنا نفع رکھ کر ماہانہ قسطیں طے کر لیتی ہے' امید ہے کمپنی کے شو رومز کے مالکان اور خریداروں کے ساتھ اس معاملہ کی شرعی حیثیت کے بارے میں رہنمائی فرمائیں گے؟

جواب کمپنی کا یہ معاملہ جس کی طرف آپ نے اشارہ فرمایا ہے' یہ حکم شریعت کے مخالف ہے کیونکہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا ہے:

«لاَ يَحِلُّ سَلَفٌ وَّبَيْعٌ، وَّلاَ بَيْعُ مَا لَيْسَ عِنْدَكَ»(سنن أبي داود، البيوع، باب في الرجل يبيع ما ليس عنده، ح:٣٥٠٤)

"ادھار اور بیع حلال نہیں ہے اور نہ ہی اس چیز کی بیع حلال ہے جو تمہارے پاس ہی نہ ہو۔"

آپ نے حکیم بن حزام سے فرمایا تھا:

«لاَ تَبِعْ مَا لَيْسَ عِنْدَكَ»(سنن أبي داود، البيوع، باب في الرجل يبيع ما ليس عنده، ح:٣٥٠٣)

"وہ چیز نہ بیچو جو تمہارے پاس ہی نہ ہو۔"

زید بن ثابت سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے منع فرمایا کہ سامان وہاں بیچا جائے جہاں سے خریدا گیا ہو' حتیٰ کہ تاجر اسے اپنی جگہوں پر منتقل کر لیں۔" [1]

مذکورہ کمپنی کا طرز عمل ان تمام احادیث کے مخالف ہے کیونکہ وہ اس چیز کی بیع کرتی ہے جس کی وہ مالک ہی نہیں ہے لہذا اس کے ساتھ تعاون جائز نہیں کیونکہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

[1] سنن ابی داود' البیوع' باب فی بیع الطعام قبل ان یستوفی' حدیث: 3499 و مسند احمد: 5/191۔

﴿ وَتَعَاوَنُوا عَلَى الْبِرِّ وَالتَّقْوَىٰ ۖ وَلَا تَعَاوَنُوا عَلَى الْإِثْمِ وَالْعُدْوَانِ ۚ وَاتَّقُوا اللَّهَ ۖ إِنَّ اللَّهَ شَدِيدُ الْعِقَابِ ﴿٢﴾ ﴾

(المائدۃ: ۵/ ۲)

"اور نیکی اور پرہیز گاری کے کاموں میں تم ایک دوسرے کی مدد کیا کرو اور گناہ اور ظلم کی باتوں میں مدد نہ کیا کرو اور اللہ سے ڈرتے رہو کچھ شک نہیں کہ اللہ سخت سزا دینے والا ہے۔"

شرعی طریقہ یہ ہے کہ یہ کمپنی گاڑیاں اور دیگر سامان وغیرہ خرید کر اپنی جگہ منتقل کرے اور پھر جو خریدنا چاہے اسے نقد یا ادھار بیچ دے۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو اپنی رضا کے مطابق عمل کی توفیق عطا فرمائے۔

———— شیخ ابن باز ————

سامان کی قیمت میں اضافہ نہ ہونے دینا

سوال جب کسی سامان کا نیلام ہوتا ہے تو بعض خریدار باہمی طور پر طے شدہ منصوبے کے مطابق ایسا حیلہ کرتے ہیں جس کا بائع یا سامان کے مالک کو علم نہیں ہوتا کہ ایک خریدار مثلاً ایک معین قیمت پر آ کر رک جاتا ہے اور دوسرے بھی اس کی قیمت میں اضافہ نہیں کرتے کیونکہ وہ پہلے سے اس پر متفق ہو چکے ہوتے ہیں' امید ہے رہنمائی فرمائیں گے کہ اس طرح ان میں سے اگر کوئی سامان خریدتا ہے تو کیا یہ صحیح ہے؟

جواب نیلامی یا غیر نیلامی میں کچھ خریداروں کا طے شدہ منصوبے کے مطابق سامان کی قیمت کے سلسلہ میں ایک معین حد پر آ کر رک جانا اور اس کی قیمت میں اضافہ نہ ہونے کے لیے یہ حیلہ کرنا حرام ہے کیونکہ اس طرح سامان کے مالکان کو نقصان پہنچا کر مذموم خود غرضی کا مظاہرہ کیا جاتا ہے اور یہ دونوں چیزیں حرام ہیں۔ یہ بد خلقی بھی ہے جو مسلمانوں کو زیب نہیں دیتی اور نہ اسلامی شریعت ہی اسے مستحسن قرار دیتی ہے۔ یہ طرز عمل ضرورت کے بغیر کسی کو مشکل میں مبتلا کرنے اور شہر سے نکل کر باہر سے آنے والے قافلوں سے سامان خریدنے کے ہم معنی بھی ہے اور یہ ناجائز ہے کیونکہ اس میں کسی فرد یا جماعت کا نقصان بھی ہے۔ اس سے حسد اور دشمنی کے جذبات بھی پیدا ہوتے ہیں اور یہ لوگوں کے مال باطل طریقے سے کھانے کا ایک حیلہ بھی ہے اور نبی کریم ﷺ نے شہر سے نکل کر باہر سے آنے والے قافلوں سے سامان خریدنے' بھائی کی بیع پر بیع کرنے' بھائی کی منگنی پر منگنی کرنے [1] اور اس طرح کی ان تمام باتوں سے منع فرمایا ہے جن میں ظلم ہو' دوسروں کو نقصان پہنچتا ہو اور جن سے عداوت اور حسد کے جذبات پیدا ہوتے ہوں۔ لہٰذا اگر کسی بائع کو یہ معلوم ہو کہ ایک طے شدہ منصوبے کے ساتھ اس کے سامان کی قیمت کو بڑھنے سے روکا گیا ہے تو اسے اختیار ہو گا کہ اگر وہ چاہے تو اس بیع کو فسخ کر دے اور اگر چاہے تو اسے برقرار رہنے دے۔ وصلی اللّٰہ علی محمد وعلی آلہ وصحبہ وسلم.

———— فتویٰ کمیٹی ————

[1] صحیح بخاری' البیوع' باب ھل یبیع حاضر لباد --- الخ' حدیث : 2158 و صحیح مسلم' البیوع' باب تحریم بیع الحاضر للبادی' حدیث : 1521۔

سود، قرض اور بینکوں میں ملازمت کے چند مسائل

پیپر کرنسی کے بارے میں فقہی کونسل کی قرارداد

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ وَحْدَہُ وَالصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ عَلٰی مَنْ لاَ نَبِیَّ بَعْدَہُ، سَیِّدِنَا مُحَمَّدٍ وَّآلِہٖ وَصَحْبِہٖ وَسَلَّمَ تَسْلِیمًا کَثِیرًا ۔ أَمَّا بَعْدُ

اسلامی فقہی کونسل نے اس تحقیقی مقالہ پر غور کیا جو اس کے سامنے پیپر کرنسی اور اس کے شرعی احکام کے موضوع پر پیش کیا گیا۔ کونسل کے ارکان نے مباحثہ اور خصوصی غور و فکر کے بعد یہ طے کیا کہ:

اولاً: اس بات کو پیش نظر رکھتے ہوئے کہ نقدی میں اصل بنیاد تو سونا چاندی ہے اور فقہاء شریعت کے صحیح ترین قول کے مطابق ان میں سود جاری ہونے کی علت مطلق ثمنیت ہے لیکن فقہاء کے نزدیک ثمنیت محض سونے اور چاندی ہی پر منحصر نہیں ہے، اگرچہ اصل بنیاد اسی معدن پر ہے اور اب چونکہ پیپر کرنسی بھی ثمن (قیمت) بن گئی ہے اور معاملہ میں سونے چاندی کی قائم مقام ہے کہ عصر حاضر میں کاروبار اسی کے مطابق ہو رہا ہے اور سونے چاندی کے ساتھ کاروبار پس منظر میں چلا گیا ہے اور اب لوگ سونا چاندی لینے کی بجائے اسی کو مال سمجھنے اور جمع کرنے پر مطمئن ہیں اور عموماً لین دین اسی کے مطابق ہو رہا ہے حالانکہ اس کی قیمت بذات خود کرنسی میں نہیں ہے بلکہ ایک خارجی امر میں ہے اور وہ یہ کہ لین دین کے لیے ایک واسطے کے طور پر اس پر اعتماد کر لیا گیا ہے اور یہی ثمنیت کے ساتھ اس کے تعلق کا راز ہے۔

تحقیق یہ ہے کہ سونے چاندی میں ربا کے پائے جانے کی علت مطلق ثمنیت ہے اور یہ بات پیپر کرنسی میں بھی ہے۔ لہٰذا اسلامی فقہی کونسل یہ قرار دیتی ہے کہ پیپر کرنسی بھی قائم بالذات ہے اور اس کا حکم بھی وہی ہے جو نقدین یعنی سونے اور چاندی کا ہے۔ لہٰذا اس میں بھی زکوٰۃ واجب ہو گی، اس میں بھی سود کی دونوں قسمیں (ربا الفضل اور ربا النسیئۃ) جاری ہوں گی، جیسا کہ یہ نقدین یعنی سونے چاندی میں جاری ہیں کیونکہ ثمنیت کے اعتبار سے پیپر کرنسی کا بھی سونے چاندی ہی پر قیاس ہے لہٰذا پیپر کرنسی کے لیے بھی نقود کے وہ تمام احکام ہوں گے جن کو شریعت نے نقود کے لیے لازم قرار دیا ہے۔

ثانیاً: پیپر کرنسی میں بھی نقدیت کو اسی طرح قائم بالذات شمار کیا جائے گا جس طرح کہ سونے، چاندی اور دیگر اثمان میں نقدیت قائم بالذات ہے۔ اسی طرح پیپر کرنسی کو مختلف اجناس میں شمار کیا جائے گا جو مختلف ممالک سے جاری ہونے کی وجہ سے مختلف ہوں گی یعنی سعودی عرب کی پیپر کرنسی ایک جنس ہے، امریکہ کی پیپر کرنسی ایک دوسری جنس ہے، الغرض اسی طرح ہر پیپر کرنسی ایک مستقل جنس ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس میں بھی سود کی دونوں قسمیں فضل اور نسیئہ اسی طرح جاری ہوں گی، جس طرح وہ سونے چاندی اور دیگر اثمان میں جاری ہوتی ہیں۔ اس ساری تفصیل کا تقاضا یہ ہے کہ:

(الف) پیپر کرنسی کی آپس میں یا دیگر نقدی اجناس مثلاً سونا چاندی وغیرہ کے ساتھ مطلقاً ادھار بیع جائز نہیں ہے۔ مثلاً سعودی ریال کی کسی دوسری کرنسی سے اضافہ کے تقابض کے بغیر ادھار بیع جائز نہ ہو گی۔

(ب) ایک ہی قسم کی پیپر کرنسی کی آپس میں اضافہ کے ساتھ بیع جائز نہ ہو گی خواہ یہ بیع ادھار ہو، یا دست بدست مثلاً

دس سعودی ریال کی بیع گیارہ سعودی ریال کے ساتھ نقد یا ادھار جائز نہیں۔

(ج) ایک کرنسی کی دوسری قسم کی کرنسی کے ساتھ بیع مطلقاً جائز ہے جب کہ دست بدست ہو مثلاً سوریا یا لبنان کے لیرا کی سعودی ریال کے ساتھ خواہ وہ کاغذ کا ہو یا چاندی کا، بیع کمی بیشی کے ساتھ جائز ہے اسی طرح ایک امریکی ڈالر کی مثلاً تین سعودی ریال یا اس سے کم یا زیادہ کے ساتھ بیع جائز ہے بشرطیکہ دست بدست ہو، اسی طرح چاندی کے ایک سعودی ریال کی کاغذ کے تین یا اس سے کم یا زیادہ سعودی ریال کے ساتھ بھی بیع جائز ہے جب کہ سودا نقد ہو کیونکہ اس صورت میں بیع غیر جنس کے ساتھ ہو گی، لہٰذا محض نام میں اشتراک کا کوئی اثر نہیں ہو گا جب کہ دونوں کی حقیقت مختلف ہے۔

ثالثًا: پیپر کرنسی میں بھی زکوٰۃ واجب ہے جب کہ اس کی قیمت سونے یا چاندی میں سے جس کا نصاب کم ہو، اس کے بقدر ہو یا دیگر اثمان اور سامان تجارت کے ساتھ مل کر نصاب مکمل ہو جاتا ہو۔

رابعًا: بیع سلم اور کمپنیوں وغیرہ کی شراکت میں پیپر کرنسی کو رأس المال قرار دینا جائز ہے۔ واللہ اعلم وباللہ التوفیق، وصلی اللہ علی سیدنا محمد وعلی آلہ وصحبہ وسلم۔

——— شیخ ابن باز ———

سودی معاملات کی تحریر

سوال میں ایک تجارتی کمپنی میں محاسب ہوں۔ یہ کمپنی بینک سے سودی قرض لینے پر مجبور ہے۔ معاہدۂ قرض کی ایک کاپی میرے پاس بھی آتی ہے تاکہ کمپنی کے ریکارڈ میں بھی اس کا مقروض ہونا ثابت ہو...... کیا اس صورت میں بھی کاتب سود ہوں کہ میرے لیے اس کمپنی میں کام کرنا جائز نہیں ہے یعنی اگر یہ معاہدہ میں نے نہ کیا ہو تو کیا اسے محض لکھنے کی وجہ سے میں بھی گناہ گار ہوں گا؟ رہنمائی فرمائیں۔ جزاکم اللہ خیراً

جواب مذکورہ کمپنی کے ساتھ سودی معاملات میں تعاون جائز نہیں کیونکہ نبی کریم ﷺ نے سود کھانے والے، کھلانے والے، لکھنے والے اور دونوں گواہی دینے والوں پر لعنت فرمائی ہے اور فرمایا کہ یہ سب (گناہ میں) برابر ہیں۔ [1] اور حسب ذیل ارشاد باری تعالیٰ کے عموم کا بھی یہی تقاضا ہے:

﴿ وَلَا تَعَاوَنُوا۟ عَلَى ٱلْإِثْمِ وَٱلْعُدْوَٰنِ ۚ﴾ (المائدۃ: ۵/ ۲)

"اور گناہ اور ظلم کی باتوں میں ایک دوسرے کی مدد نہ کیا کرو۔"

——— فتویٰ کمیٹی ———

ناواقفیت کی وجہ سے سودی چیک لکھ دیا

سوال سڑک پر ایک شخص نے میرے بھائی سے یہ کہا کہ مہربانی فرما کر فلاں آدمی کے نام یہ چیک لکھ دیں اور اس کا نام بتایا اور کہا کہ میں اسے لوجہ اللہ تعالیٰ یہ قرض دے رہا ہوں لیکن بعد میں میرے بھائی کو معلوم ہوا کہ اس نے تو اسے سود پر ادھار دیا ہے جس کی وجہ سے میرے بھائی کو چیک لکھ دینے پر بہت ندامت ہوئی، امید ہے آپ اس سلسلہ میں رہنمائی

---

[1] صحیح مسلم، المساقاۃ، باب لعن آکل الربا وموکلہ، حدیث: 1598۔

فرمائیں گے؟

جواب اگر امر واقع اسی طرح ہے جس طرح آپ نے ذکر فرمایا ہے کہ آپ کے بھائی کو چیک لکھتے وقت یہ معلوم نہیں تھا کہ یہ سودی قرض کے لیے ہے تو اسے کوئی گناہ نہیں ہے اور وہ اس وعید کے تحت نہیں آتا جس میں سود کھانے والے' کھلانے والے' لکھنے والے اور دونوں گواہی دینے والوں پر لعنت کی گئی ہے۔

——— فتویٰ کمیٹی ———

یہ سود کے لیے حیلہ ہے

سوال مجھے سعودیہ کے ایک شہر میں مکان بنانے کے لیے قرض کی ضرورت محسوس ہوئی تو میں ایک شخص کے پاس گیا اور اس سے میں نے قرض مانگا' تو اس نے کہا کہ میں تجھے گاڑی دیتا ہوں یہ کہہ کر اس نے مجھے بارہ ہزار ریال دیئے لیکن اپنے پاس اس نے اکیس ہزار لکھ لیے حالانکہ میں نے نہ کوئی گاڑی دیکھی اور نہ مجھے اس کے رنگ ہی کا علم ہے۔ اس نے فقط اس کی رسید لکھی اور مجھے کہا کہ ہر ماہ ایک ہزار ریال دے دیا کرو' اس وقت تو میں راضی ہو گیا کیونکہ میں محتاج تھا اور مجھے رقم کی ضرورت تھی لیکن اب جب کہ میں ساڑھے آٹھ ہزار ریال دے چکا ہوں تو پھر بھی میرے ذمہ بارہ ہزار پانچ سو ریال باقی ہیں تو سوال یہ ہے کہ اس کے رأس المال سے زائد رقم ادا کرنا بھی کیا میرے لیے لازم ہے؟ امید ہے رہنمائی فرمائیں گے' جزاکم اللہ خیراً

جواب جب امر واقع اسی طرح ہے جسے سائل نے ذکر کیا ہے تو یہ معاملہ بالکل باطل ہے کیونکہ اس میں ربا الفضل بھی ہے اور ربا النسیۂ بھی۔ لہٰذا جس نے آپ کو قرض دیا ہے اسے صرف اپنا رأس المال بھی بارہ ہزار ریال ہی لینے چاہئیں کیونکہ اس نے آپ کو گاڑی نہیں دی اور نہ اسے بیچا ہے جیسا کہ آپ نے ذکر کیا ہے بلکہ اس نے تو آپ کو دراہم کے بدلے دراہم دیئے ہیں لہٰذا اس صورت میں آپ سے زیادہ لینا بالکل غلط اور صریحاً سود ہے۔ لہٰذا تم دونوں کو اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں توبہ کرنی چاہیئے اور آئندہ کبھی بھی اس طرح کا معاملہ نہیں کرنا چاہیئے۔ ہم اللہ تعالیٰ سے دعا کرتے ہیں کہ وہ آپ دونوں کی توبہ کو قبول فرمائے۔

——— شیخ ابن باز ———

یہ بھی سودی حیلہ ہے

سوال میرے پاس چاول کی کچھ بوریاں سٹور میں پڑی ہیں' کچھ لوگ میرے پاس آکر بازار کی قیمت کے حساب سے خرید لیتے اور دوسرے لوگوں کو ادھار دے دیتے ہیں اور جب یہ چاول مقروض کے حصے کے ہو جاتے ہیں تو میں اس سے ایک ریال کم قیمت پر خرید لیتا ہوں' پھر کچھ اور لوگ آتے ہیں اور وہ مجھ سے خرید لیتے ہیں' ہاں البتہ یہ لوگ اسے خرید کر اپنی جگہ منتقل کر لیتے ہیں کیا اس طرح کی خرید و فروخت میں کوئی گناہ تو نہیں؟ رہنمائی فرمائیں۔ جزاکم اللہ خیراً

جواب یہ طریقہ سود کا ایک حیلہ ہے اور سود بھی مغلظ ہے جس میں فضل اور نسیۂ کی دونوں قسمیں جمع ہیں کیونکہ قرض دہندہ اس طریقے سے زیادہ مثلاً دس کے بدلے بارہ ریال حاصل کرنا چاہتا ہے اور قرض دینے اور لینے والا کبھی کبھی صاحب

دوکان کے پاس آنے سے پہلے بھی اس بات پر متفق ہو جاتے ہیں کہ وہ اس کے بجائے بارہ یا اس سے کم یا زیادہ لے گا اور یہ اتفاق کرنے کے بعد دوکان دار کے پاس آتے ہیں تاکہ اس کے لیے اس حیلہ کو عملی جامہ پہنا دیں۔ شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ نے اسے ''حیلہ ثلاثیہ'' سے موسوم کیا ہے اور یہ بلاشبہ ربا الفضل اور ربا النسیۂ کے لیے ایک حیلہ ہے جو کہ حرام اور کبیرہ گناہ ہے۔ کیونکہ حیلہ سازی سے کوئی حرام چیز مباح نہیں ہو جاتی بلکہ حیلہ سازی سے اس کی خباثت اور گناہ میں اور بھی اضافہ ہو جاتا ہے۔ ایوب سختیانی رحمہ اللہ کے پاس جب اس طرح کے حیلہ سازوں کا ذکر ہوا تو انہوں نے فرمایا کہ ''یہ لوگ اللہ تعالیٰ کو اس طرح دھوکا دینا چاہتے ہیں جس طرح بچوں کو دھوکا دے رہے ہوں' اگر اس حیلہ سازی کے بجائے صاف صاف ارتکاب کرتے تو گناہ اس سے کم تر ہوتا۔'' انہوں نے یہ بالکل سچ فرمایا ہے کہ حیلہ باز درحقیقت منافق کی طرح ہے جو اپنے آپ کو مومن ظاہر کرتا ہے' حالانکہ وہ کافر ہوتا ہے۔ اور اس طرح سود کے بارے میں حیلہ سے کام لینے والا یہ ظاہر کرتا ہے کہ وہ بیع کے لیے ایک صحیح اور حلال طریقہ استعمال کر رہا ہے۔

—— شیخ ابن عثیمین ——

ادھار کی وجہ سے سودا زیادہ قیمت پر بیچنے کا حکم

سوال میں نے گاڑی بارہ ہزار ایک سو ریال میں خریدی تھی اور پانچ ماہ کے ادھار پر چودہ ہزار ایک سو ریال میں بیچ دی۔ امید ہے فتویٰ عطا فرمائیں گے کہ یہ بیع سودی ہے یا غیر سودی؟

جواب اگر امر واقع اسی طرح ہے جس طرح آپ نے ذکر فرمایا ہے تو یہ بیع جائز ہے بشرطیکہ آپ نے گاڑی خریدنے کے بعد اپنے قبضہ میں لے لی ہو اور پھر اسے بیچا ہو ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ يَٰٓأَيُّهَا ٱلَّذِينَ ءَامَنُوٓاْ إِذَا تَدَايَنتُم بِدَيۡنٍ إِلَىٰٓ أَجَلٖ مُّسَمّٗى فَٱكۡتُبُوهُۚ﴾ (البقرۃ۲/ ۲۸۲)

''اے مومنو! جب تم آپس میں کسی میعاد معین کے لیے قرض کا معاملہ کرنے لگو تو اس کو لکھ لیا کرو۔''

اور ''صحیحین'' میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ ''رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک یہودی سے ادھار غلہ خریدا اور اس کے پاس لوہے کی ایک زرہ رہن رکھی[1]'' اس میں ان شاء اللہ سود نہیں ہے خواہ ادھار کی صورت میں قیمت' نقد قیمت کی نسبت زیادہ ہو۔

—— فتویٰ کمیٹی ——

کارکن کی نفع میں شرکت

سوال میرے ایک دوست نے فرنیچر کی ایک چھوٹی ورکشاپ کھولی ہے' جس کے لیے اس نے ایک کارکن کو بیرون ملک سے منگوایا ہے جس کے ساتھ ایک ہزار ریال ماہانہ تنخواہ طے کی گئی تھی لیکن اس کارکن کے سعودیہ پہنچنے پر فریقین نے اس پہلے معاہدہ کو ختم کر دیا اور از سرنو یہ معاہدہ کیا کہ ورکشاپ کا مالک اوزار' ہتھیار اور دیگر تمام ضروری سازوسامان مہیا کرے گا اور یہ کارکن کام کرے گا اور نفع دونوں میں نصف نصف تقسیم ہو جائے گا اس طرح اس کارکن کو اب پندرہ

[1] صحیح بخاری' الرھن' باب من رھن درعه' حدیث: 2509 و صحیح مسلم' المساقاۃ' حدیث: 1603

سو ریال تک بھی مل جاتے ہیں تو کیا یہ طریقہ شرعاً جائز ہے؟

جواب اس دوسرے معاہدے میں کوئی حرج نہیں اور وہ یہ کہ کارکن نفع میں سے پہلے سے طے شدہ ایک معلوم مقدار مثلاً نصف لے لے اور باقی نفع ورکشاپ کا مالک لے لے۔

——— شیخ ابن باز ———

اسے نہ بیچو جو تمہارے پاس نہ ہو

سوال ادھار کی بیع کے بارے میں کیا حکم ہے جس میں بیع و شراء کے لیے یہ طریقہ اختیار کیا جاتا ہے کہ سامان اپنی جگہ پر ہی ہوتا ہے، جیسا کہ اس وقت ادھار کی بیع کے سلسلہ میں یہ طریقہ لوگوں میں رائج ہے؟

جواب کسی بھی مسلمان کے لیے نقد یا ادھار کوئی سامان بیچنا جائز نہیں الا یہ کہ وہ اس کی ملکیت اور قبضہ میں ہو کیونکہ نبی کریم ﷺ نے حکیم بن حزام رضی اللہ عنہ سے فرمایا تھا:

«لاَ تَبِـعْ مَا لَيْسَ عِنْدَكَ»(سنن أبي داود، البيوع، باب في الرجل يبيع ما ليس عنده، ح:٣٥٠٣)

"اس چیز کو نہ بیچو جو تمہارے پاس نہ ہو۔"

اسی طرح حدیث عبداللہ بن عمرو بن عاص رضی اللہ عنہما میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے:

«لاَ يَحِلُّ سَلَفٌ وَبَيْعٌ، وَلاَ بَيْعُ مَا لَيْسَ عِنْدَكَ»(سنن أبي داود، البيوع، باب في الرجل يبيع ما ليس عنده، ح:٣٥٠٤)

"ادھار اور بیع حلال نہیں ہے اور نہ یہ حلال ہے کہ ایسی چیز بیچو جو تمہارے پاس نہ ہو۔"

ان دونوں حدیثوں کے پیش نظر خریدار کو بھی چاہیئے کہ وہ اس وقت تک کوئی چیز نہ بیچے جب تک اسے اپنے قبضہ میں نہ لے لے کیونکہ امام احمد اور ابوداود نے بھی روایت کیا اور ابن حبان و حاکم نے اسے صحیح قرار دیا ہے کہ زید بن ثابت سے مروی ہے کہ "رسول اللہ ﷺ نے منع فرمایا کہ سامان کو اسی جگہ بیچا جائے جہاں سے اسے خریدا گیا ہو تاآنکہ تاجر اسے اپنے مقامات تک نہ منتقل کر لیں" [1] اسی طرح امام بخاری رحمہ اللہ نے "صحیح" میں حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کی اس روایت کو بیان فرمایا ہے:

«لَقَدْ رَأَيْتُ النَّاسَ فِي عَهْدِ رَسُولِ اللهِ ﷺ يَبْتَاعُونَ جِزَافًا يُضْرَبُونَ أَنْ يَبِيعُوهُ فِي مَكَانِهِمْ حَتَّى يُؤْوُهُ إِلَى رِحَالِهِمْ» (صحيح البخاري، البيوع باب من رأى إذا اشترى طعاما ... الخ، ح:٢١٣٧)

"میں نے رسول اللہ ﷺ کے عہد میں لوگوں کو دیکھا کہ وہ غلہ کو اٹکل کی بیع کی صورت میں خریدتے تو انہیں اسی جگہ بیچنے پر مارا جاتا تھا یعنی وہ اسے اپنی جگہ منتقل کئے بغیر کیوں بیچتے ہیں۔" اس مضمون کی اور بھی بہت سی احادیث ہیں۔

——— شیخ ابن باز ———

[1] سنن ابی داود، البیوع، باب فی بیع الطعام قبل ان یستوفی، حدیث: 3499 و مسند احمد: 191/5

یہ معاہدہ صحیح ہے

سوال ایک شخص نے دوسرے سے دس ہزار لیے کہ وہ ایک سال بعد ان کی اسے گاڑی خرید کر دے گا تو کیا یہ معاہدہ جائز ہے یا ناجائز؟

جواب اگر امرواقع اسی طرح ہو جیسا کہ ذکر کیا گیا ہے' گاڑی کے اوصاف معلوم ہوں اس کی قیمت دس ہزار ہی ہو اور مدت بھی معلوم ہو تو پھر یہ معاہدہ صحیح ہے۔

——— فتویٰ کمیٹی ———

کیا بیعانہ جائز ہے؟

سوال اگر بیع مکمل نہ ہو تو بائع کے بیعانہ لینے کے بارے میں کیا حکم ہے؟ اس کی صورت یہ ہوتی ہے کہ دو شخص آپس میں بیع کرتے ہیں' اگر بیع مکمل ہو جائے تو مشتری مکمل قیمت ادا کر دیتا ہے اور اگر بیع مکمل نہ ہو تو بائع بیعانہ پر قبضہ کر لیتا ہے اور وہ مشتری کو واپس نہیں کرتا؟

جواب علماء کے زیادہ صحیح قول کے مطابق بیعانہ لینے میں کوئی حرج نہیں بشرطیکہ بائع اور مشتری کا اس پر اتفاق ہو اور بیع مکمل نہ ہو۔

——— شیخ ابن باز ———

ناواقفیت کی وجہ سے آپ پر کچھ لازم نہیں

سوال میں سعودیہ میں کام کرتا ہوں اور اپنے ملک سوڈان میں رقوم اس طرح منتقل کرتا ہوں کہ ایک شخص جب مجھے سعودی ریال دے دیتا ہے تو میں اسے سوڈان میں اپنے ایجنٹ کے نام خط دے دیتا ہوں تاکہ وہ اسے سعودی ریال کے عوض سوڈانی گنیاں دے دے' تو اس طرح ہم دونوں کرنسی کے فرق سے مستفید ہوتے ہیں۔ پھر میں ریال سٹیٹ بینک امریکہ میں بھیج دیتا ہوں اور وہاں سے سوڈان منتقل کر لیتا ہوں تو اس طرح ایک ڈالر کے دو ڈالر بن جاتے ہیں تو اب کیا کروں جب کہ مجھے معلوم ہو گیا ہے کہ یہ حرام ہے اور اس طرح کمائے ہوئے مال سے میں نے شادی بھی کی ہے اور جائدادیں بھی بنائی ہیں؟

جواب صحیح بات یہ ہے کہ یہ معاملہ ممنوع ہے کیونکہ رقم کے تبادلہ کے لیے یہ شرط ہے کہ وہ دست بدست ہو مثلاً اگر وہ سعودی ریالوں کا سوڈانی گنیوں سے تبادلہ کرنا چاہے اور پھر گنیوں کو سوڈان بھیجنا چاہے تو اس کے لیے ایک طریقہ تو یہ ہے کہ سعودی ریال لے کر سوڈانی گنیاں دے دو اور پھر انہیں اپنے ایجنٹ کو ارسال کر دو یا ریال ہی سوڈان ارسال کر دو اور انہیں وہاں گنیوں سے تبدیل کر دیا جائے تاکہ دونوں طرف سے قبضہ دست بدست ہو لیکن آپ ریال تو یہاں اپنے قبضہ میں لے لیتے ہیں اور ایجنٹ کو خط ارسال کر دیتے ہیں' اس طرح فریقین کے باہمی قبضہ کی صورت ختم ہو جاتی ہے اور اس مدت میں نرخ میں تبدیلی بھی ہو سکتی ہے اور پھر آپ امریکی بینک کے ساتھ جو معاملہ کرتے ہیں تو یہ ایک سودی معاملہ

بھی ہے کیونکہ یہ بینک سود کی بنیادوں پر کام کرتا ہے اور جیسا کہ آپ نے ذکر بھی کیا ہے کہ آپ ایک ڈالر کے دو ڈالر حاصل کر لیتے ہیں تو یہ اضافہ سود ہونے کی وجہ سے صریحاً حرام ہے۔ لہٰذا آپ کے لیے واجب یہ ہے کہ اس کام سے توبہ کریں' اسے بالکل چھوڑ دیں اور اس کے بجائے ایسا جائز طریقہ اختیار کریں جو ہر قسم کے شک و شبہ سے پاک ہو۔ شرعی حکم سے ناواقف ہونے کی وجہ سے اس طرح آپ نے جو مال کمایا ہے تو اسے اپنے پاس رکھنے اور اس سے بنائی ہوئی جائداد اور اس سے ادا کیے ہوئے مہر اور نان و نفقہ میں کوئی حرج نہیں۔

—— شیخ ابن جبرین ——

یہ مال سود نہیں ہے

سوال ہم سوڈان سے کچھ لوگ آئے ہیں جنہوں نے ایک کمپنی کے ساتھ کام کا معاہدہ کیا ہے اور جب ہم اس کمپنی کے دفتر میں پہنچے تو معلوم ہوا کہ اس کمپنی نے بینکوں کے ساتھ معاہدے کر رکھے ہیں اور بینک تو اپنے گاہکوں کے ساتھ سودی معاملہ کرتے ہیں۔ ہم اس کمپنی میں اس کی حفاظت کے لیے چوکیدار کے طور پر کام کرتے ہیں اور یہ بینک سے لیے ہوئے قرض سے بہت معمولی مقدار میں ہمیں تنخواہ دیتی ہے تو ہمارے ایک ساتھی نے کہا کہ یہ تو سود ہے کیونکہ ہمیں یہ تنخواہ اس کمپنی سے ملتی ہے جو بینک سے سودی لین دین کرتی ہے' امید ہے آپ رہنمائی فرمائیں گے کیا یہ سود ہے؟

جواب مجھے اس میں کوئی حرج معلوم نہیں ہوتا کیونکہ آپ تو کمپنی میں کام کرتے ہیں اور بینک کے ساتھ آپ کا کوئی تعلق نہیں ہے کہ آپ تو کمپنی کی حفاظت کے لیے چوکیدار کے طور پر کام کرتے ہیں اور یہ آپ کو تنخواہ ادا کرتی ہے' باقی رہا اس کا بینکوں کے ساتھ معاملہ تو اکثر کمپنیاں اکاؤنٹ رکھنے' گارنٹی فراہم کرنے' درآمد و برآمد اور قرض وغیرہ کے سلسلہ میں بینکوں ہی سے معاملہ کرتی ہیں تو گناہ سودی معاملہ کرنے والی کمپنیوں کے مالکان کو ہو گا۔

—— شیخ ابن جبرین ——

ڈالروں کی قسطوں پر خریداری

سوال میں ایک شخص سے دس ہزار امریکی ڈالر' چالیس ہزار سعودی ریال میں اس شرط پر خریدنا چاہتا ہوں کہ ہر ماہ ایک ہزار ریال کی قسط ادا کر دوں گا اور پھر ان ڈالروں کو بازار میں سینتیس ہزار پانچ سو ریال میں فروخت کر دوں گا' تو اس بارے میں شرعی حکم کیا ہے' جب کہ مجھے اس رقم کی ضرورت ہے؟

جواب اس بارے میں شرعی حکم یہ ہے کہ یہ حرام ہے کیونکہ رقوم کا فرق کے ساتھ تبادلہ حرام ہے' نیز یہ تبادلہ ایک ہی مجلس میں باہمی قبضہ کی صورت میں ہونا چاہیئے۔ تو اس سوال میں بیان کی گئی صورت میں عوض ثانی یعنی ڈالروں کی قیمت کا قبضہ موجود نہیں ہے' لہٰذا یہ معاملہ فاسد اور باطل ہے۔

اور اب جب یہ معاملہ ہو چکا ہو تو ڈالر لینے والے کو چاہیئے کہ وہ ڈالر ہی واپس کرے اور پہلے طے ہونے والے معاہدہ کو ختم کر دے کیونکہ یہ فاسد ہے اور نبی کریم ﷺ نے فرمایا ہے:

«مَا كَانَ مِنْ شَرْطٍ لَّيْسَ فِي كِتَابِ اللهِ فَهُوَ بَاطِلٌ وَّإِنْ كَانَ مِائَةَ شَرْطٍ، قَضَاءُ اللهِ أَحَقُّ

وَشَرْطُ اللهِ أَوْثَقُ»(صحيح البخاري، البيوع، باب إذا اشترط في البيع شروطا لا تحل، ح:٢١٦٨ وصحيح مسلم، العتق، باب بيان أن الولاء لمن أعتق، ح:١٥٠٤)

"ہر وہ شرط جو کتاب اللہ میں نہ ہو تو باطل ہے خواہ وہ سو شرط ہو۔ اللہ تعالیٰ کا فیصلہ زیادہ صحیح اور اللہ تعالیٰ کی شرط زیادہ پختہ ہے۔"

——— شیخ ابن عثیمین ———

گندم اور دیگر غلہ وغیرہ کی اس کی جنس سے اضافہ کے ساتھ بیع

سوال ہمارے علاقے میں غلہ پیدا ہوتا ہے اور رقوم کی قلت کی وجہ سے ہم غلہ کے ساتھ ہی معاملہ کرتے ہیں' تو جب بیج بونے کا وقت آتا ہے تو ہم تاجروں سے غلہ کا ایک صاع ایک ریال میں خرید لیتے ہیں اور جب فصل کاٹنے کا وقت آتا اور غلہ صاف کر لیا جاتا ہے تو تاجر ہم سے ایک ریال کے دو صاع لیتے ہیں کیونکہ بوائی کے وقت کی نسبت اس وقت غلہ سستا ہوتا ہے' تو سوال یہ ہے کیا یہ معاملہ جائز ہے؟

جواب اس معاملہ کے بارہ میں علماء میں اختلاف ہے۔ اکثر علماء کی رائے ہے کہ یہ جائز نہیں کیونکہ یہ گندم وغیرہ کی اس کی جنس سے اضافہ کے ساتھ ادھار بیع ہے اور یہ دو وجہ سے سود ہے' ایک تو اضافہ کی وجہ سے اور دوسرے ادھار کی وجہ سے' جب کہ دیگر اہل علم کا یہ کہنا ہے کہ یہ جائز ہے جب کہ بائع اور مشتری نقدی کے بجائے گندم وصول کرنے پر متفق نہ ہوئے ہوں اور انہوں نے معاہدہ کے وقت ایسی شرط عائد نہ کی ہو تو یہ ہے اہل علم کی اس مسئلہ میں رائے۔ اور آپ کے اس معاملہ سے تو یہ ظاہر ہے کہ آپ کا تھوڑے دانوں کے بجائے زیادہ دانوں پر اتفاق ہو چکا ہے کیونکہ نقود قلیل ہیں' تو یہ جائز نہیں ہے' تو اس صورت میں زمینداروں کو چاہیئے کہ وہ غلہ ایسے تاجروں کو بیچیں جن سے انہوں نے بیج نہ خریدا ہو اور پھر ان کا حق انہیں نقد ادا کر دیں کہ سلامتی' احتیاط اور سود سے بچنے کا یہی طریقہ ہے۔ اگر تاجروں اور زمینداروں میں بیع نقود کے ساتھ ہو اور پھر زمیندار غلے کی صورت میں ادا کر دیں جب کہ پہلے سے یہ طے نہ ہو تو یہ بات صحیح معلوم ہوتی ہے جیسا کہ علماء کی ایک جماعت کا قول یہی ہے' خصوصاً جبکہ زمیندار فقیر ہو اور تاجر کو یہ خدشہ ہو کہ اگر نقدی کے بجائے غلہ نہ لیا تو اس سے کچھ نہ ملے گا اور وہ اپنا حق حاصل نہیں کر سکے گا کیونکہ زمیندار کسی اور کو ادا کر دے گا اور اسے چھوڑ دے گا یا غلے کو اپنی دوسری ضرورتوں میں خرچ کر لے گا جیسا کہ بہت سے فقیر زمیندار کرتے ہیں اور اس سے تاجروں کا حق ضائع ہو جاتا ہے۔ اور اگر تاجر اور زمیندار پہلے سے اس شرط پر متفق ہو جائیں کہ وہ نقدی کے بجائے غلہ ادا کر دے گا تو پہلے سے اس طے شدہ شرط کی وجہ سے یہ بیع صحیح نہیں ہوگی اور تاجر کو کسی اضافہ کے بغیر صرف اتنا ہی غلہ لینا ہوگا جتنا کہ اس نے زمیندار کو دیا تھا' اسے قرض سمجھا جائے گا کیونکہ زیادہ غلہ لینے کی پہلے سے طے شدہ شرط کے ساتھ بیع صحیح نہیں ہے۔

——— شیخ ابن باز ———

نقد ایک بکری کی ادھار دو یا تین بکریوں سے بیع

سوال کیا ایک بکری کی اس شرط پر بیع جائز ہے کہ مثلاً بیس سال یا اس سے بھی زیادہ مدت کے بعد اس کے بجائے دو یا

تین بکریاں ادا کر دی جائیں گی؟

جواب علماء کے صحیح ترین قول کے مطابق ایک معین اور حاضر جانور کی بیع ایک یا ایک سے زیادہ جانوروں کے ساتھ قریب یا بعید مدت تک یا قسطوں میں جائز ہے جب کہ ثمن کا ایسی صفات کے ساتھ تعین کیا گیا ہو جو نمایاں ہوں اور جانور خواہ فروخت کیے گئے جانور کی جنس سے ہو یا کسی اور جنس سے کیونکہ یہ ثابت ہے کہ "نبی کریم ﷺ نے ایک اونٹ خریدا تھا کہ صدقہ کے اونٹ آنے پر اس کے بجائے دو دیئے جائیں گے۔" [1] اس روایت کو حاکم اور بیہقی نے روایت کیا اور اس کے رجال ثقہ ہیں۔

——— شیخ ابن باز ———

ایک میٹر کا دو میٹر کپڑے سے تبادلہ

سوال کیا ایک میٹر کپڑے کا دو میٹر کے ساتھ یا ایک قسم کے کپڑے کا دو قسم کے کپڑوں کے ساتھ تبادلہ جائز ہے؟

جواب کپڑوں کا آپس میں ایک دوسرے کے ساتھ برابری اور اضافہ کی بنیاد پر تبادلہ جائز ہے' خواہ یہ کپڑے ایک یا زیادہ جنسوں سے ہوں' خواہ سودا نقد ہو یا ادھار کیونکہ کپڑے ان جنسوں میں سے نہیں ہیں جن میں سود داخل ہوتا ہے۔

——— فتویٰ کمیٹی ———

سودی کاروبار کرنے والے کا کفارہ

سوال میرا ایک قریبی رشتہ دار فوت ہو گیا ہے جو کہ سودی کاروبار کرتا تھا۔ ہم چاہتے ہیں کہ اس کی طرف سے کفارہ ادا کر دیں تو اس کے لیے شرعی طریقہ کیا ہے؟

جواب وارثوں کو چاہیئے کہ یہ اندازہ لگائیں کہ اس نے کتنا سود لیا ہے اور پھر اس کے بقدر رقم اس کی طرف سے صدقہ کر دیں اور اس کی مغفرت اور بخشش کی دعا کریں' دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہمیں' اسے اور ہر مسلمان کو معاف فرمائے۔

——— شیخ ابن باز ———

بچے کا سود خور باپ کے مال سے کھانا

سوال کیا بچے کے لیے سودی کاروبار کرنے والے اپنے باپ کے مال کو کھانا جائز ہے؟

جواب سود کتاب و سنت اور اجماع کی روشنی میں حرام ہے۔ اگر آپ کا والد سودی کاروبار کرتا ہے تو آپ پر واجب ہے کہ اسے بتائیں کہ سود کس قدر حرام ہے اور سود کا لین دین کرنے والوں کے لیے اللہ تعالیٰ نے کس قدر سخت عذاب تیار کر رکھا ہے۔ آپ کے لیے یہ جائز نہیں کہ اپنے باپ کے اس مال کو استعمال کریں جس کے بارے میں آپ کو یہ معلوم ہو کہ یہ سود ہے اور آپ کے باپ کے پاس یہ سودی لین دین کے ذریعہ آیا ہے۔ آپ رزق اللہ تعالیٰ سے مانگیں اور حصول رزق کے لیے شرعی اسباب کو اختیار کریں۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

---

[1] سنن ابی داود' البیوع' باب فی الرخصة' حدیث: 3357 السنن الکبری للبیهقی' : 287/5 و الحاکم: 56/2۔ 57

﴿ وَمَن يَتَّقِ ٱللَّهَ يَجْعَل لَّهُۥ مَخْرَجًا ۝ وَيَرْزُقْهُ مِنْ حَيْثُ لَا يَحْتَسِبُ ﴾ (الطلاق۶۵/ ۲۔۳)

"اور جو کوئی اللہ سے ڈرے گا تو وہ (اللہ) اس کے لیے (رنج و محن سے) خلاصی کی صورت پیدا کر دے گا اور اس کو ایسی جگہ سے رزق دے گا جہاں سے (وہم و) گمان بھی نہ ہو۔"

اور فرمایا:

﴿ وَمَن يَتَّقِ ٱللَّهَ يَجْعَل لَّهُۥ مِنْ أَمْرِهِۦ يُسْرًا ۝ ﴾ (الطلاق۶۵/ ۴)

"اور جو اللہ سے ڈرے گا' اللہ اس کے کام میں سہولت پیدا کر دے گا۔"

وصلی اللہ علی نبینا محمد وعلی آلہ وصحبہ وسلم

——— فتویٰ کمیٹی ———

سونے کی بیع کے چند مسائل

سونے کی سونے اور چاندی کی چاندی کے ساتھ بیع

سوال میں زیورات کی شکل میں ڈھلے ہوئے سونے کی خریدوفروخت کا کاروبار کرتا ہوں لیکن مجھے ایک آدمی نے بتایا ہے کہ سونے کی بیع صرف اس صورت میں جائز ہے جب کہ وہ نقد ہو اور دست بدست ہو۔ میں نے کہا کہ یہ سعودی گنی کی طرح کوئی کرنسی تو نہیں ہے بلکہ یہ تو زیورات کی شکل میں ڈھلا ہوا ہے اور اس میں نمبر۲۱ بھی ہے اور ۱۸ بھی اور پھر زیورات بنانے کے لیے اس میں تانبے کی ملاوٹ بھی ہے اور اسی طرح چاندی بھی نمبر۲۱ کی بھی ہوتی ہے اور نمبر۱۸ کی بھی اور وہ پیسے جن کے بدلے میں نے اسے خریدا ہے وہ پیپر کرنسی ہے سونا نہیں ہے جبکہ یہ ڈھلا ہوا سونا ہے۔ مجھے بھی اس مسئلہ میں شک پیدا ہو گیا ہے لہٰذا فتویٰ کے لیے یہ خط ارسال کر رہا ہوں۔ جزاکم اللہ خیراً

اگر آپ یہ فرمائیں کہ سونے کے کاروبار کے لیے یہ لازم ہے کہ ایک ہی مجلس میں فریقین کا قبضہ ہو تو کیا مذکورہ صورت میں کاروبار کرنے والے اس آیت کے مصداق ہوں گے:

﴿ ٱلَّذِينَ يَأْكُلُونَ ٱلرِّبَوٰا۟ لَا يَقُومُونَ إِلَّا كَمَا يَقُومُ ٱلَّذِى يَتَخَبَّطُهُ ٱلشَّيْطَٰنُ مِنَ ٱلْمَسِّ ﴾ (البقرۃ۲/ ۲۷۵)

"جو لوگ سود کھاتے ہیں وہ (قبروں سے) اس طرح (حواس باختہ) اٹھیں گے جیسے کسی کو جن نے لپٹ کر دیوانہ بنا دیا ہو۔"

جواب سونے کی سونے کے ساتھ اور چاندی کی چاندی کے ساتھ بیع جائز نہیں الّا یہ کہ وہ برابر برابر اور دست بدست ہوں خواہ عوض میں دی جانے والی یہ دونوں چیزیں زیورات کی شکل میں ڈھلی ہوں یا نقدی کی صورت میں ہوں یا ایک ڈھلی ہو اور دوسری نقدی ہو اور خواہ دونوں بینک نوٹ کی صورت میں ہوں اور خواہ ان میں سے ایک بینک نوٹ کی صورت میں اور دوسری ڈھلی ہوئی یا نقدی کی صورت میں ہو۔

اور اگر ان دونوں معاوضوں میں سے ایک ڈھلا ہوا سونا یا نقدی ہو اور دوسرا ڈھلی ہوئی چاندی یا نقدی ہو تو ان کی مقدار میں تفاوت جائز ہے بشرطیکہ مجلس معاہدہ میں ایک دوسرے سے الگ ہونے سے پہلے فریقین قبضہ کرلیں اور جو صورت اس حکم کے مخالف ہوگی وہ سود ہوگی اور اس کے مطابق عمل کرنے والا اس ارشاد باری تعالیٰ کے عموم میں داخل ہوگا:

﴿ ٱلَّذِينَ يَأْكُلُونَ ٱلرِّبَوٰاْ لَا يَقُومُونَ إِلَّا كَمَا يَقُومُ ٱلَّذِى يَتَخَبَّطُهُ ٱلشَّيْطَٰنُ مِنَ ٱلْمَسِّ ﴾
(البقرۃ۲/ ۲۷۵)

"جو لوگ سود کھاتے ہیں وہ (قبروں سے) اس طرح (حواس باختہ) اٹھیں گے جیسے کسی کو جن نے لپٹ کر دیوانہ بنا دیا ہو۔"

——— فتویٰ کمیٹی ———

سونے کی بیع میں فریقین کے قبضہ کا حکم

سوال ایک شخص بینکوں کی معرفت سونے کی اینٹوں کی خرید و فروخت کرتا ہے' لیکن یہ شخص سونے کو اپنے قبضہ میں نہیں لیتا بلکہ اسے دیکھتا بھی نہیں ہے۔ جب ہم نے اسے یہ بتایا کہ یہ طریقہ جائز نہیں ہے تو وہ کہنے لگا کہ میرے پاس کوئی محفوظ جگہ نہیں ہے جہاں میں اسے حفاظت سے رکھ سکوں اور مجھے چوری کا خدشہ ہے' تو سوال یہ ہے کہ اس کی تجارت کے بارے میں کیا حکم ہے؟

جواب اگر محفوظ جگہ نہ ہونے کی وجہ سے سونا اپنے قبضہ میں لینا اس کے لیے ممکن نہیں ہے تو پھر اس کے لیے یہ معاملہ بھی جائز نہیں ہے کیونکہ حرام سے بچنا واجب ہے اور اس سے بچنے کی تو اسے قدرت ہے کیونکہ اس کے لیے یہ ضروری تو نہیں کہ وہ صرف یہی تجارت کرے' لہٰذا اس کے لیے واجب ہے کہ یا تو وہ اس تجارت میں تقابض کے شرعی تقاضا کو پورا کرے اور یا پھر اس تجارت کو چھوڑ دے۔

——— شیخ ابن عثیمین ———

مستعمل سونے کی نئے سونے سے فرق کے ساتھ بیع

سوال ایک شخص زیورات کی خرید و فروخت کا کام کرتا ہے' ایک شخص اس کے پاس مستعمل سونا لے کر آتا ہے تو وہ اس سے خرید لیتا اور ریالوں میں اس کی قیمت بتا دیتا ہے۔ لیکن قبل اس کے کہ وہ اسی جگہ اور اسی وقت قیمت ادا کرے' پرانا سونا بیچنے والا اس سے نیا سونا خرید لیتا ہے' اس کی قیمت بھی بتا دی جاتی ہے اور مشتری فرق اپنی طرف سے ادا کر دیتا ہے تو کیا یہ جائز ہے یا ضروری ہے کہ وہ پہلے مستعمل سونے کی قیمت ادا کرے اور پھر مشتری سے نئے سونے کی قیمت وصول کرے؟

جواب اس صورت میں یہ واجب ہے کہ مستعمل سونے کی قیمت ادا کی جائے پھر مستعمل سونا بیچنے والے کو اختیار ہوگا کہ وہ اسی سے یا کسی اور سے نیا سونا خریدے اور اگر اسی سے خریدے تو نئے سونے کی قیمت ادا کر دے تاکہ مسلمان سود والی ردی جنس کو اس کی عمدہ جنس سے اضافہ کے ساتھ بیچ کر سود کا ارتکاب نہ کرے جو کہ حرام ہے۔ امام بخاری و مسلم رحمۃ اللہ علیہما نے روایت کیا کہ رسول اللہ ﷺ نے ایک شخص کو خیبر کا عامل مقرر کیا تو وہ آپ کے پاس بہت عمدہ کھجوریں لے کر

آیا تو آپ نے فرمایا:

«أَكُلُّ تَمْرِ خَيْبَرَ هٰكَذَا؟»

کیا خیبر کی تمام کھجوریں اسی طرح کی ہیں؟

اس نے عرض کیا: جی نہیں بلکہ ہم اس طرح کا ایک صاع دو صاع ردی کھجوروں کے عوض خرید لیتے ہیں اور دو صاع تین صاع کھجوروں کے عوض لے لیتے ہیں تو آپ نے فرمایا:

«لَا تَفْعَلْ بِعِ الْجَمْعَ بِالدَّرَاهِمِ، ثُمَّ ابْتَعْ بِالدَّرَاهِمِ جَنِيبًا»(صحيح البخاري، المغازي، باب استعمال النبي ﷺ على أهل خيبر، ح٤٢٤٤، ٤٢٤٥ وصحيح مسلم، المساقاة، باب بيع الطعام مثلا بمثل، ح:١٥٩٣)

"اس طرح جمع کر کے نہ سودا کرو بلکہ کم قیمت کی کھجور کو درہموں کے ساتھ بیچو اور پھر درہموں کے ساتھ عمدہ قسم کی کھجور خرید لو۔"

اسی طرح کی بیع میں ادلہ بدلہ خواہ ایک ہی جگہ اور ایک ہی وقت پر ہو' سونے کی سونے سے اضافہ کے ساتھ بیع کی شکل اختیار کر لیتا ہے اور یہ حرام ہے کیونکہ امام مسلم رحمہ اللہ نے عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

«اَلذَّهَبُ بِالذَّهَبِ، وَالْفِضَّةُ بِالْفِضَّةِ، وَالْبُرُّ بِالْبُرِّ، وَالشَّعِيرُ بِالشَّعِيرِ، وَالتَّمْرُ بِالتَّمْرِ، وَالْمِلْحُ بِالْمِلْحِ، مِثْلًا بِمِثْلٍ، سَوَاءً بِسَوَاءٍ، يَدًا بِيَدٍ، فَإِذَا اخْتَلَفَتْ هٰذِهِ الْأَصْنَافُ فَبِيعُوا كَيْفَ شِئْتُمْ، إِذَا كَانَ يَدًا بِيَدٍ» (صحيح مسلم، المساقاة، باب الصرف وبيع الذهب بالورق نقدا، ح:١٥٨٧)

"سونا سونے سے' چاندی چاندی سے' گندم گندم سے' جو جو سے' کھجور کھجور سے اور نمک نمک سے یکساں برابر برابر اور دست بدست ہونا چاہیے ہاں البتہ اگر یہ اصناف مختلف ہوں تو جس طرح چاہو بیچو بشرطیکہ سودا دست بدست ہو۔"

ابن سعید کی روایت میں یہ الفاظ بھی ہیں:

«مَنْ زَادَ أَوِ اسْتَزَادَ فَقَدْ أَرْبٰى، اَلْآخِذُ وَالْمُعْطِي فِيهِ سَوَاءٌ» (صحيح مسلم، المساقاة، باب الصرف وبيع الذهب بالورق نقدا، ح:٨٢/ ١٥٨٤)

"جس نے زیادہ لیا یا زیادہ دیا اس نے سودی معاملہ کیا اور سود لینے اور دینے والا سب برابر ہیں۔"

—— فتویٰ کمیٹی ——

سونے کا زیور خریدا اور بائع ہی سے قیمت ادھار لے کر ادا کر دی

سوال ایک انسان نے مجھ سے سونے کا زیور خریدا جس کی قیمت ایک ہزار ریال ہے۔ جب میں نے اسے بتایا کہ اس کی بیع نقد ہی جائز ہے تو اس نے کہا کہ آپ مجھے ایک ہزار ریال ادھار دے دیں تو میں نے اسے ایک ہزار ریال ادھار دے

دیئے اور وہ اس نے مجھے سونے کی قیمت کے طور پر واپس کر دیئے تو کیا یہ جائز ہے؟

جواب یہ جائز نہیں کیونکہ یہ تو سود کے لیے حیلہ ہے اور پھر اس میں دو عقد یعنی عقد سلف اور عقد بیع بھی جمع ہیں اور یہ بھی ممنوع ہے۔

——— فتویٰ کمیٹی ———

زرگر کو زیور بنانے کے لیے خام سونا دینا

سوال ایک آدمی نے ایک زرگر کو سونے کی اینٹ دی اور کہا کہ اس کے مجھے کنگن بنا دو اور اس میں تانبا بھی داخل کر لو جس سے سونا نمبر ۲۴ کے بجائے نمبر ۲۱ کا بن جائے اور میں تانبے اور سونے کے وزن کے بقدر ٹوٹے ہوئے کنگن دے دوں گا۔ زرگر نے اس سے کام کی اجرت بھی لی تو کیا یہ معاملہ جائز ہے یا نہیں؟

جواب اگر وہ سونا زرگر کو وزن کے حساب سے دے تاکہ وہ اس کا زیور بنا کر اسے لوٹا دے تو اس میں کوئی حرج نہیں' ان شاء اللہ' بشرطیکہ کام کی طے شدہ اجرت اسے ادا کر دے۔ اور اگر زرگر اس سے سونے کی اینٹ لے کر رکھ لے اور اسے کسی اور سونے سے کنگن بنا دے تو یہ جائز نہیں بشرطیکہ سونا' سونے اور تانبے کے وزن کے ہم مثل ہو۔ کام کے عوض اجرت لینے میں کوئی حرج نہیں۔

——— فتویٰ کمیٹی ———

سونے کی تجارت

سوال سونے کی تجارت کے بارے میں کیا حکم ہے یعنی ایک شخص جب سونا سستا ہوتا ہے تو خرید لیتا اور مہنگا ہوتا تو بیچ دیتا ہے مثلاً تیس ریال میں ایک اوقیہ۔[1] خرید کر پچاس ریال میں فروخت کر دیتا ہے تو اس کے بارے میں شرعی حکم کیا ہے؟ کیا یہ نقد کی نقد کے ساتھ بیع کے حکم میں ہے؟

جواب سونے کی سونے کے ساتھ بیع میں کوئی حرج نہیں' جبکہ یکساں ہو' وزن ایک جیسا ہو' سونا برابر برابر ہو اور سودا دست بدست ہو' سونا خواہ نیا ہو یا پرانا یا ان میں سے ایک نیا اور دوسرا پرانا ہو۔

سونے کی چاندی اور پیپر کرنسی کے ساتھ بیع میں بھی کوئی حرج نہیں جب کہ سودا دست بدست ہو کیونکہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا ہے:

«اَلذَّهَبُ بِالذَّهَبِ، وَالْفِضَّةُ بِالْفِضَّةِ، وَالْبُرُّ بِالْبُرِّ، وَالشَّعِيرُ بِالشَّعِيرِ، وَالتَّمْرُ بِالتَّمْرِ، وَالْمِلْحُ بِالْمِلْحِ، مِثْلًا بِمِثْلٍ، سَوَاءً بِسَوَاءٍ، (وَزْنًا بِوَزْنٍ) يَدًا بِيَدٍ، فَإِذَا اخْتَلَفَتْ هٰذِهِ الْأَصْنَافُ فَبِيعُوا كَيْفَ شِئْتُمْ إِذَا كَانَ يَدًا بِيَدٍ»(صحيح مسلم، المساقاة، باب الصرف وبيع الذهب بالورق نقدا، ح:١٥٨٧، وما بين القوسين لفظ مسلم أيضًا لكن من رواية أبي هريرة برقم:١٥٨٨)

---

[1] ایک اوقیہ رطل کا بارہواں حصہ ہوتا ہے یا یوں کہہ لیجیے کہ ایک اوقیہ سات مثقال کا ہوتا ہے۔ (مترجم)

”سونا سونے کے ساتھ‘ چاندی چاندی کے ساتھ‘ گندم گندم کے ساتھ‘ کھجور کھجور کے ساتھ‘ جو جو کے ساتھ اور نمک نمک کے ساتھ یکساں طور پر برابر برابر وزن بھی ایک جیسا اور سودا دست بدست ہو اور جب یہ اجناس مختلف ہوں تو پھر جس طرح چاہو بیچو بشرطیکہ دست بدست ہو۔“

نیز حدیث ابی سعید رضی اللہ عنہ میں ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا:

«لاَ تَبِيعُوا الذَّهَبَ بِالذَّهَبِ إِلاَّ مِثْلاً بِمِثْلٍ وَّلاَ تُشِفُّوا بَعْضَهَا عَلٰى بَعْضٍ، وَّلاَ تَبِيعُوا الْوَرِقَ بِالْوَرِقِ إِلاَّ مِثْلاً بِمِثْلٍ وَّلاَ تُشِفُّوا بَعْضَهَا عَلٰى بَعْضٍ، وَّلاَ تَبِيعُوا مِنْهَا غَائِبًا بِنَاجِزٍ»(صحيح البخاري، البيوع، باب بيع الفضة بالفضة، ح:٢١٧٧ وصحيح مسلم، المساقاة، باب الربا، ح:٧٥/ ١٥٨٤)

”سونے کو سونے کے ساتھ نہ بیچو الاّ یہ کہ وہ برابر ہو اور ایک دوسرے کو کم یا زیادہ نہ کرو۔ اور چاندی کو چاندی کے ساتھ نہ بیچو الاّ یہ کہ وہ برابر برابر ہو اور ایک دوسرے کو کم یا زیادہ نہ کرو اور نہ ان میں سے غائب کو حاضر کے ساتھ بیچو۔“

یہ دونوں حدیثیں اس بات پر دلالت کرتی ہیں کہ سونے کو سونے کے ساتھ کمائی یا نفع کے لیے نرخوں کی تبدیلی کے بعد بیچنے میں کوئی حرج نہیں جب کہ خرید و فروخت اس طرح ہو جس طرح ان حدیثوں میں مذکور ہے۔ وباللہ التوفیق۔

——— شیخ ابن باز ———

کمپنیوں کے حصص میں شراکت

سودی کاروبار کرنے والی کمپنیوں کے حصص میں شراکت

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ وَالصَّلٰوةُ وَالسَّلاَمُ عَلٰى عَبْدِ اللهِ وَرَسُولِهِ، نَبِيِّنَا مُحَمَّدٍ وَّعَلٰى آلِهِ وَصَحْبِهِ۔ أَمَّا بَعْدُ

مجھے معلوم ہوا ہے کہ بعض کمپنیاں‘ سود کے لین دین کا کام کرتی ہیں اور مجھ سے حصص خریدنے والوں اور دوسرے بہت سے لوگوں نے بھی ان منافع کے بارے میں سوال پوچھا ہے جو سودی کاروبار کرنے کے نتیجہ میں حاصل ہوتے ہیں۔ لہٰذا اس بات کے پیش نظر کہ اللہ تعالیٰ نے یہ واجب قرار دیا ہے کہ مسلمانوں کی ہمدردی و خیرخواہی کی جائے اور نیکی و تقویٰ میں ان کے ساتھ تعاون کیا جائے‘ میں نے یہ مناسب سمجھا کہ یہ بتاؤں کہ سودی کاروبار کرنا حرام اور کبیرہ گناہ ہے جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ ٱلَّذِينَ يَأْكُلُونَ ٱلرِّبَوٰاْ لَا يَقُومُونَ إِلَّا كَمَا يَقُومُ ٱلَّذِى يَتَخَبَّطُهُ ٱلشَّيْطَٰنُ مِنَ ٱلْمَسِّ ذَٰلِكَ بِأَنَّهُمْ قَالُوٓاْ إِنَّمَا ٱلْبَيْعُ مِثْلُ ٱلرِّبَوٰاْ وَأَحَلَّ ٱللَّهُ ٱلْبَيْعَ وَحَرَّمَ ٱلرِّبَوٰاْ فَمَن جَآءَهُۥ مَوْعِظَةٌ مِّن رَّبِّهِۦ فَٱنتَهَىٰ فَلَهُۥ مَا سَلَفَ وَأَمْرُهُۥٓ إِلَى ٱللَّهِ وَمَنْ عَادَ فَأُوْلَٰٓئِكَ أَصْحَٰبُ ٱلنَّارِ هُمْ فِيهَا خَٰلِدُونَ ﴿٢٧٥﴾ يَمْحَقُ ٱللَّهُ ٱلرِّبَوٰاْ

وَيُرْبِي الصَّدَقَاتِ ۗ وَاللَّهُ لَا يُحِبُّ كُلَّ كَفَّارٍ أَثِيمٍ ﴿٢٧٦﴾ (البقرة٢/ ٢٧٥-٢٧٦)

"جو لوگ سود کھاتے ہیں وہ (قبروں سے) اس طرح (حواس باختہ) اٹھیں گے جیسے کہ کسی کو جن نے لپٹ کر دیوانہ بنا دیا ہو' یہ اس لیے کہ وہ کہتے ہیں کہ سودا بیچنا بھی تو (نفع کے لحاظ سے) ویسا ہی ہے جیسے سود (لینا) حالانکہ سودے کو اللہ نے حلال کیا ہے اور سود کو حرام' تو جس شخص کے پاس اللہ کی نصیحت پہنچی اور وہ (سود لینے سے) باز آ گیا تو جو پہلے ہو چکا وہ اس کا اور (قیامت میں) اس کا معاملہ اللہ کے سپرد اور جو پھر لینے لگا تو ایسے لوگ دوزخی ہیں کہ ہمیشہ دوزخ میں (جلتے) رہیں گے۔ اللہ سود کو نابود (یعنی بے برکت) کرتا اور خیرات (کی برکت کو) بڑھاتا ہے اور اللہ کسی ناشکرے گناہ گار کو دوست نہیں رکھتا۔"

اللہ تعالیٰ نے سود کو اپنے اور اپنے رسول ﷺ سے جنگ قرار دیا ہے جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اتَّقُوا اللَّهَ وَذَرُوا مَا بَقِيَ مِنَ الرِّبَا إِن كُنتُم مُّؤْمِنِينَ ﴿٢٧٨﴾ فَإِن لَّمْ تَفْعَلُوا فَأْذَنُوا بِحَرْبٍ مِّنَ اللَّهِ وَرَسُولِهِ ۖ وَإِن تُبْتُمْ فَلَكُمْ رُءُوسُ أَمْوَالِكُمْ لَا تَظْلِمُونَ وَلَا تُظْلَمُونَ ﴿٢٧٩﴾ ﴾ (البقرة٢/ ٢٧٨-٢٧٩)

"اے مومنو! اللہ سے ڈرو اور اگر ایمان رکھتے ہو تو جتنا سود باقی رہ گیا ہے اس کو چھوڑ دو' اگر ایسا نہ کرو گے تو خبردار ہو جاؤ (کہ تم) اللہ اور اس کے رسول سے جنگ کرنے کے لیے (تیار ہوتے ہو)۔ اور اگر توبہ کر لو گے (اور سود چھوڑ دو گے) تو تم کو اپنی اصلی رقم لینے کا حق ہے جس میں نہ اوروں کا نقصان ہو اور نہ تمہارا نقصان۔"

اور حدیث سے ثابت ہے:

«لَعَنَ رَسُولُ اللهِ ﷺ آكِلَ الرِّبَا، وَمُوكِلَهُ، وَكَاتِبَهُ، وَشَاهِدَيْهِ»(صحيح مسلم، المساقاة، باب لعن آكل الربا ومؤكله، ح:١٥٩٨)

"رسول اللہ ﷺ نے سود کھانے والے' کھلانے والے' لکھنے والے اور دونوں گواہی دینے والوں پر لعنت فرمائی ہے۔"

اور فرمایا:

«هُمْ سَوَاءٌ»(صحيح مسلم، المساقاة، باب لعن آكل الربا ومؤكله، ح:١٥٩٨)

"یہ سب لوگ گناہ میں برابر ہیں۔"

ایسی آیات و احادیث بہت زیادہ ہیں جن میں سود سے بچنے کی تلقین کی گئی اور اس کے بھیانک انجام سے ڈرایا گیا ہے۔ لہٰذا جو افراد اور کمپنیاں وغیرہ سودی لین دین کرتی ہیں' ان پر واجب ہے کہ اللہ تعالیٰ کے حضور توبہ کریں اور مستقبل میں سودی معاملہ سے مکمل طور پر اجتناب کریں تاکہ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کی اطاعت بجالائیں' سود کے جرم میں ملنے والی سزاؤں سے بچ سکیں اور اس کام سے دور ہو جائیں جسے اللہ تعالیٰ نے حرام قرار دیا ہے اور تاکہ اللہ تعالیٰ کے اس فرمان پر عمل پیرا ہو سکیں:

﴿ وَتُوبُوا إِلَى اللَّهِ جَمِيعًا أَيُّهَ الْمُؤْمِنُونَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ ﴿٣١﴾ ﴾ (النور٢٤/ ٣١)

"اور اے مومنو! سب اللہ کے آگے توبہ کرو تاکہ تم فلاح پاؤ۔"

اور فرمایا:

﴿ يَـٰٓأَيُّهَا ٱلَّذِينَ ءَامَنُوا۟ تُوبُوٓا۟ إِلَى ٱللَّهِ تَوْبَةً نَّصُوحًا عَسَىٰ رَبُّكُمْ أَن يُكَفِّرَ عَنكُمْ سَيِّـَٔاتِكُمْ وَيُدْخِلَكُمْ جَنَّـٰتٍ تَجْرِى مِن تَحْتِهَا ٱلْأَنْهَـٰرُ ﴾ (التحریم۶۶/۸)

"اے مومنو! اللہ کے آگے صاف دل سے توبہ کرو' امید ہے کہ وہ تمہارے گناہ تم سے دور کر دے اور تم کو باغہائے بہشت میں' جن کے نیچے نہریں بہہ رہی ہیں (داخل کرے گا۔)"

میں دعا کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ ہمیں اور تمام مسلمانوں کو تمام گناہوں سے توبہ کرنے کی توفیق عطا فرمائے' اپنے نفسوں کی شرارتوں اور اپنے اعمال کی برائیوں سے ہمیں محفوظ رکھے اور ہمارے تمام حالات کی اصلاح فرما دے۔ انه جواد کریم' وصلی اللّٰہ وسلم علی نبینا محمد وعلی آله وصحبه۔

—— شیخ ابن باز ——

تجارتی اور انشورنس کمپنیوں کے حصص میں شراکت

سوال میں کویت کا باشندہ ہوں' ہمارے ہاں تجارتی اور زرعی کمپنیوں' انشورنس اور آئل کمپنیوں اور بینکوں کے حصص کو ملک کا ہر شہری اور اس کے افراد خانہ خرید سکتے ہیں' امید ہے آپ رہنمائی فرمائیں گے کہ اس طرح کی کمپنیوں کے حصص خریدنے کے بارے میں شرعی حکم کیا ہے؟

جواب ہر انسان کے لیے ان کمپنیوں کے حصص میں شراکت جائز ہے بشرطیکہ یہ سودی کاروبار نہ کرتی ہوں اور اگر یہ سودی کاروبار کرتی ہوں تو پھر ان میں شراکت جائز نہیں ہے کیونکہ کتاب و سنت اور اجماع امت سے ثابت ہے کہ سودی کاروبار حرام ہے۔ اسی طرح انشورنس کمپنیوں کے حصص میں شراکت بھی جائز نہیں کیونکہ انشورنس کی پالیسی غرر (دھوکا)' جہالت اور سود پر مشتمل ہے اور وہ پالیسیاں جو غرر (دھوکا) جہالت اور سود پر مشتمل ہوں' وہ اسلامی شریعت میں حرام ہیں۔

—— فتویٰ کمیٹی ——

تجارتی حصص میں اپنے اصل سرمایہ پر نفع لینا

سوال ایک آدمی نے کچھ تجارتی حصص خریدے اور پھر جب وہ اپنا سرمایہ واپس لینے کے لیے گیا تو کمپنی کے مالک نے اسے اس کے اصل سرمایہ سے چالیس فی صد زیادہ بھی دے دیا تو کیا یہ اضافہ سود شمار ہو گا یا نہیں؟

جواب اگر امرواقع اسی طرح ہے جس طرح ذکر کیا گیا ہے کہ کمپنی کے مالک نے حصہ دار کو اس کا اصل سرمایہ دے دیا اور اس پر چالیس فی صد نفع بھی دیا تو یہ جائز ہے بشرطیکہ اس نے اسے نفع دیتے وقت کمپنی کے حصص کا حساب لگا کر ہر حصہ کا نفع معلوم کر کے اس سے اس کے حصص کے مطابق نفع دیا ہو اور وہ اس کے مال کا چالیس فی صد بنتا ہو تو یہ جائز ہے' سود نہیں ہے اور نہ اس میں جہالت اور نہ غرر (دھوکا) ہے' لہٰذا جب یہ کمپنی کے مالک سے اس جائداد کے حصص خریدے اور حصص پر چالیس فی صد نفع کے حساب سے زیادہ قیمت ادا کرے تو یہ بھی جائز ہے۔ وصلی اللّٰہ وسلم علی نبینا محمد و آله وصحبه وسلم۔

—— فتویٰ کمیٹی ——

سودی بینک

بینکوں سے کاروبار' ملازمت' اکاؤنٹ' شراکت اور نفع فقہی کونسل کی قرارداد

اسلامی فقہی کونسل نے اپنے نویں اجلاس میں جو دفتر رابطہ عالم اسلامی مکہ مکرمہ میں بروز ہفتہ ۱۲ رجب سے بروز ہفتہ ۲۹ رجب ۱۴۰۶ھ تک منعقد رہا' اس موضوع پر غور کیا کہ سودی بینکوں کا جال پھیلتا جا رہا ہے اور لوگ انہی کے ساتھ کاروبار کرتے ہیں کیونکہ کوئی متبادل نظام موجود نہیں ہے' کونسل کو اس موضوع پر غور کرنے کی دعوت رابطہ کے جنرل سیکرٹری عزت مآب ڈاکٹر صاحب نے دی تھی جو فقہی کونسل کے نائب صدر بھی ہیں۔ کونسل نے فاضل ارکان کے اس اہم مسئلہ سے متعلق ارشادات سنے جس میں ایک ایسے حرام امر کا ارتکاب کیا جا رہا ہے جس کی حرمت کتاب و سنت اور اجماع امت سے ثابت ہے۔

آج کل جدید معاشی تحقیق نے یہ ثابت کر دکھایا ہے کہ سود دنیا کی اقتصادیات' سیاسیات' اخلاقیات اور دنیا کی سلامتی کے لیے انتہائی خطرناک ہے۔ آج دنیا جن بحرانوں میں مبتلا ہے' ان میں سے بہت سے بحرانوں کا سبب یہ سود ہی ہے۔ ان بحرانوں سے نجات کی صرف ایک ہی صورت ہے کہ سود کی اس خبیث بیماری کو بیخ و بن سے اکھاڑ پھینکا جائے جس سے اسلام نے چودہ صدیاں پہلے ہی منع فرما دیا تھا اور پھر ایسے اسلامی بینکوں کے قیام کا مبارک منصوبہ بنایا جائے جو سود اور شرعاً ممنوع معاملات سے یکسر پاک ہوں۔ اس طریقے ہی سے سیکولر اور نئی ثقافتی یلغار کے شکار ان لوگوں کی تکذیب کی جا سکتی ہے' جن کا خیال یہ ہے کہ اقتصادی میدان میں اسلامی شریعت کا نفاذ محال ہے کیونکہ بینکوں کے بغیر کوئی معاشی نظام کامیاب نہیں ہو سکتا اور کوئی بینک سود کے بغیر چل نہیں سکتا' اس لیے کونسل نے یہ قرارداد پاس کی ہے کہ:

اولاً: تمام مسلمانوں پر یہ واجب ہے کہ وہ سودی لین دین اور کسی بھی صورت میں سودی لین دین سے تعاون کو بالکل ختم کر دیں کیونکہ اس سے اللہ تعالیٰ نے منع فرمایا ہے۔

ثانیاً: سودی بینکوں کے متبادل کے طور پر اسلامی بینکوں کے قیام کو کونسل بنظر تحسین دیکھتی ہے اور اس بات کی ضرورت محسوس کرتی ہے کہ سود سے پاک اسلامی بینکوں کا جال تمام اسلامی ملکوں میں پھیلا دیا جائے بلکہ غیر اسلامی ملکوں میں بھی جہاں جہاں مسلمان ہوں ان کی شاخیں کھول دی جائیں تاکہ سود سے پاک یہ اسلامی بینک مکمل اسلامی معاشی نظام کے قیام میں نہایت اہم کردار ادا کر سکیں۔

ثالثاً: ہر وہ مسلمان جسے اسلامی بینکوں کی سہولت میسر ہو اسے اندرون و بیرون ملک غیر اسلامی اور سودی بینکوں سے کاروبار کو حرام سمجھنا چاہیئے کیونکہ متبادل اسلامی بینکوں کی موجودگی میں سودی بینکوں سے کاروبار کا کوئی جواز نہیں ہے بلکہ اس کے لیے یہ واجب ہے کہ وہ ناپاک کے بجائے پاک اور حرام کے بجائے حلال طریق کار کو اختیار کرے۔

رابعاً: کونسل اسلامی ملکوں کے حکمرانوں اور سودی بینکوں کے منتظمین کو یہ دعوت دیتی ہے کہ وہ انہیں سود کی نجاست سے پاک کرنے کے لیے جلد اقدام کریں۔

خامسًا: ہر وہ مال جو سودی نفع کے طور پر حاصل ہو وہ شرعاً مال حرام ہے' لہٰذا کسی بھی مسلمان کے لیے یہ جائز نہیں کہ وہ خود یا اس کے اہل خانہ میں سے کوئی اپنی کسی بھی ضرورت کے لیے استعمال کرے بلکہ واجب ہے کہ اسے مسلمانوں کی بہبود کے عام منصوبوں مثلاً سکولوں یا ہسپتالوں وغیرہ پر خرچ کر دیا جائے یہ صدقہ تو نہیں ہو گا لیکن اس سے ان کا مال حرام سے پاک ہو جائے گا۔

سودی فوائد کو سودی بینکوں ہی میں رہنے دینا جائز نہیں کیونکہ اس سے سودی بینکوں کو تقویت حاصل ہو گی اور اگر یہ بینک غیر ملکی ہو تو اس میں سودی رقم چھوڑ دینے میں اور بھی زیادہ گناہ ہے کیونکہ یہ رقم عموماً عیسائی اور یہودی اداروں پر خرچ کی جاتی ہے اور اس طرح مسلمانوں کے مال مسلمانوں ہی کے خلاف جنگ میں اسلحہ کے طور پر اور مسلمانوں کی اولاد کو ان کے عقیدے سے دور کر کے گمراہ کر دینے میں صرف ہوتے ہیں لیکن یہ بھی یاد رہے کہ نفع لیے یا نہ لیے بغیر ان سودی بینکوں کے ساتھ ہمیشہ لین دین کرتے رہنا بھی جائز نہیں ہے۔

کونسل اسلامی بینکوں کی انتظامیہ سے یہ بھی مطالبہ کرتی ہے کہ ان بینکوں میں کام کرنے کے لیے وہ نیک مسلمانوں کا انتخاب کرے اور ان کے لیے اسلامی احکام و آداب کی تعلیم و تربیت کا اہتمام کرے تاکہ ان کے تمام معاملات اور تصرفات اسلامی تعلیمات کے مطابق ہوں۔ واللّٰہ الموفق والھادی إلی سواء السبیل۔

مجلّۃ الدعوۃ نمبر: ۱۰۳۷

سودی بینکوں کے ساتھ کاروبار

سودی بینکوں کے ساتھ لین دین کے بارے میں حکم

درج ذیل لوگوں کے بارے میں شرعی حکم کیا ہے؟

- جو اپنا سرمایہ بینک میں رکھتا اور سال ختم ہونے پر سود لیتا ہے۔
- جو بینک سے سود پر قرض لیتا ہے۔
- جو شخص بینک میں سرمایہ تو رکھتا ہے لیکن سود نہیں لیتا۔
- وہ صاحب جائداد جو اپنی عمارتیں بینکوں کو کرایہ پر دیتا ہے۔

جواب: بینکوں میں سود پر سرمایہ رکھنا یا سود پر بینکوں سے قرض لینا جائز نہیں ہے کیونکہ یہ صریحاً سود ہے۔ سود پر بینکوں کے سوا کسی اور جگہ سرمایہ رکھنا بھی جائز نہیں ہے اور نہ کسی سے سود پر قرض لینا جائز ہے کیونکہ یہ تمام صورتیں اہل علم کے نزدیک حرام ہیں' اس لیے کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ وَأَحَلَّ ٱللَّهُ ٱلْبَيْعَ وَحَرَّمَ ٱلرِّبَوٰاْ ﴾ (البقرۃ۲/ ۲۷۵)

"اور سودے کو اللہ نے حلال کیا ہے اور سود کو حرام۔"

اور فرمایا:

﴿ يَمۡحَقُ ٱللَّهُ ٱلرِّبَوٰاْ وَيُرۡبِي ٱلصَّدَقَٰتِۗ ﴾ (البقرة۲/ ۲۷۶)

''اللہ سود کو نابود (یعنی بے برکت) کرتا اور خیرات (کی برکت) کو بڑھاتا ہے۔''

اور فرمایا:

﴿ يَٰٓأَيُّهَا ٱلَّذِينَ ءَامَنُواْ ٱتَّقُواْ ٱللَّهَ وَذَرُواْ مَا بَقِيَ مِنَ ٱلرِّبَوٰٓاْ إِن كُنتُم مُّؤۡمِنِينَ ﴿٢٧٨﴾ فَإِن لَّمۡ تَفۡعَلُواْ فَأۡذَنُواْ بِحَرۡبٖ مِّنَ ٱللَّهِ وَرَسُولِهِۦۖ وَإِن تُبۡتُمۡ فَلَكُمۡ رُءُوسُ أَمۡوَٰلِكُمۡ لَا تَظۡلِمُونَ وَلَا تُظۡلَمُونَ ﴿٢٧٩﴾ ﴾ (البقرة۲/ ۲۷۸۔۲۷۹)

''اے مومنو! اللہ سے ڈرو اور اگر ایمان رکھتے ہو تو جتنا سود باقی رہ گیا اس کو چھوڑ دو' اگر ایسا نہ کرو گے تو خبردار ہو جاؤ (کہ تم) اللہ اور رسول سے جنگ کرنے کے لیے (تیار ہوتے ہو) اور اگر توبہ کر لو گے (اور سود چھوڑ دو گے) تو تم کو اپنی اصلی رقم لینے کا حق ہے جس میں نہ اوروں کا نقصان ہو اور نہ تمہارا نقصان۔''

پھر اس کے بعد ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ وَإِن كَانَ ذُو عُسۡرَةٖ فَنَظِرَةٌ إِلَىٰ مَيۡسَرَةٖۚ ﴾ (البقرة۲/ ۲۸۰)

''اور اگر قرض لینے والا تنگ دست ہو تو (اسے) کشائش (کے حاصل ہونے تک) مہلت دو۔''

اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کو تلقین فرمائی ہے کہ تنگ دست سے قرض کا مطالبہ کرنا جائز نہیں ہے اور نہ یہ جائز ہے کہ مہلت کی وجہ سے اس پر اور مالی بوجھ ڈال دیا جائے بلکہ واجب یہ ہے کہ قرض ادا کرنے سے عاجز و قاصر ہونے کی صورت میں اسے مہلت دی جائے' تاآنکہ وہ آسانی سے قرض ادا کر دے' یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے اپنے بندوں پر رحمت اور لطف و کرم ہے اور انہیں اس ظلم اور بدترین لالچ سے بچانا ہے جو ان کے لیے سراسر نقصان دہ ہے اور ان کے لیے ذرہ بھر فائدہ مند نہیں۔

بینکوں میں سود کے بغیر سرمایا رکھنے میں کوئی حرج نہیں' جبکہ مسلمان اس کے لیے مجبور ہو' البتہ سودی بینکوں میں کام کرنا ہرگز جائز نہیں ہے' خواہ کوئی مینجر کے طور پر کام کرے یا کلرک کے طور پر یا اکاؤنٹینٹ کے طور پر یا کسی اور طور پر کیونکہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ وَتَعَاوَنُواْ عَلَى ٱلۡبِرِّ وَٱلتَّقۡوَىٰۖ وَلَا تَعَاوَنُواْ عَلَى ٱلۡإِثۡمِ وَٱلۡعُدۡوَٰنِۚ وَٱتَّقُواْ ٱللَّهَۖ إِنَّ ٱللَّهَ شَدِيدُ ٱلۡعِقَابِ ﴿٢﴾ ﴾ (المائدة۵/ ۲)

''اور نیکی اور پرہیزگاری کے کاموں میں تم ایک دوسرے کی مدد کیا کرو اور گناہ اور ظلم کی باتوں میں مدد نہ کیا کرو اور اللہ سے ڈرتے رہو' کچھ شک نہیں کہ اللہ کا عذاب بہت سخت ہے۔''

اور حدیث سے ثابت ہے کہ ''رسول اللہ ﷺ نے سود کھانے والے' کھلانے والے' لکھنے والے اور دونوں گواہی دینے والوں پر لعنت فرمائی ہے۔'' اور فرمایا:

«هُمْ سَوَاءٌ»(صحيح مسلم، المساقاة، باب لعن آكل الربا ومؤكله، ح:۱۵۹۸)

''یہ سب گناہ میں برابر ہیں۔''

گناہوں پر تعاون کی حرمت پر دلالت کرنے والی آیات اور احادیث بہت سی ہیں' انہی مذکورہ دلائل سے یہ بھی معلوم

ہوتا ہے کہ جائیداد کے مالکان کے لیے یہ جائز نہیں کہ وہ سودی کاروبار کرنے والے بینکوں کو کرایہ پر اپنی عمارتیں دیں کیونکہ یہ بھی سودی کاموں پر اعانت ہے۔

ہم اللہ تعالیٰ سے دعا کرتے ہیں کہ وہ ہم سب کو ہدایت سے سرفراز فرمائے' حاکم اور محکوم سب مسلمانوں کو سود سے جنگ کی توفیق بخشے اور انہی شرعی معاملات پر اکتفاء کرنے کی توفیق بخشے جن کو اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ نے مباح قرار دیا ہے' بے شک وہی قادر و کارساز ہے۔

——— شیخ ابن عثیمین ———

بینکوں میں سود پر رقم جمع کرانا

سوال بینکوں میں سرمایہ کاری کے بارے میں کیا حکم ہے' جب کہ بینک رقوم جمع کرانے پر سود دیتے ہیں؟

جواب اسلامی شریعت کا علم رکھنے والے اس بات کو خوب جانتے ہیں کہ بینکوں میں سود پر سرمایہ کاری حرام ہے' کبیرہ گناہ ہے' اللہ اور اس کے رسول ﷺ سے جنگ ہے جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ اَلَّذِيْنَ يَاْكُلُوْنَ الرِّبٰوا لَا يَقُوْمُوْنَ اِلَّا كَمَا يَقُوْمُ الَّذِيْ يَتَخَبَّطُهُ الشَّيْطٰنُ مِنَ الْمَسِّ ۭ ذٰلِكَ بِاَنَّھُمْ قَالُوْٓا اِنَّمَا الْبَيْعُ مِثْلُ الرِّبٰوا ۘ وَاَحَلَّ اللّٰهُ الْبَيْعَ وَحَرَّمَ الرِّبٰوا ۭ فَمَنْ جَاۗءَهٗ مَوْعِظَةٌ مِّنْ رَّبِّهٖ فَانْتَهٰى فَلَهٗ مَا سَلَفَ ۭ وَاَمْرُهٗٓ اِلَى اللّٰهِ ۭ وَمَنْ عَادَ فَاُولٰۗىِٕكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ ھُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ﴿٢٧٥﴾ يَمْحَقُ اللّٰهُ الرِّبٰوا وَيُرْبِي الصَّدَقٰتِ ۭ وَاللّٰهُ لَا يُحِبُّ كُلَّ كَفَّارٍ اَثِيْمٍ ﴿٢٧٦﴾ ﴾ (البقرۃ۲/ ۲۷۵۔۲۷۶)

"جو لوگ سود کھاتے ہیں وہ (قبروں سے) اس طرح (حواس باختہ) اٹھیں گے جیسے کسی کو جن نے لپٹ کر دیوانہ بنا دیا ہو۔ یہ اس لیے کہ وہ کہتے ہیں کہ سودا بیچنا بھی تو (نفع کے لحاظ سے) ویسا ہی ہے جیسے سود (لینا) حالانکہ سودے کو اللہ نے حلال کیا ہے اور سود کو حرام' تو جس شخص کے پاس اللہ کی نصیحت پہنچی اور وہ (سود لینے سے) باز آگیا تو جو پہلے ہو چکا وہ اس کا' اور (قیامت میں) اس کا معاملہ اللہ کے سپرد اور جو پھر لینے لگا تو ایسے لوگ دوزخی ہیں وہ ہمیشہ دوزخ میں (جلتے) رہیں گے۔ اللہ سود کو نابود (یعنی بے برکت) کرتا اور خیرات (کی برکت) کو بڑھاتا ہے اور اللہ کسی ناشکرے گناہ گار کو دوست نہیں رکھتا۔"

اور فرمایا:

﴿ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَذَرُوْا مَا بَقِيَ مِنَ الرِّبٰٓوا اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ﴿٢٧٨﴾ فَاِنْ لَّمْ تَفْعَلُوْا فَاْذَنُوْا بِحَرْبٍ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ۚ وَاِنْ تُبْتُمْ فَلَكُمْ رُءُوْسُ اَمْوَالِكُمْ ۚ لَا تَظْلِمُوْنَ وَلَا تُظْلَمُوْنَ ﴿٢٧٩﴾ ﴾ البقرۃ۲/ ۲۷۸۔۲۷۹

"اے مومنو! اللہ سے ڈرو اور اگر ایمان رکھتے ہو تو جتنا سود باقی رہ گیا ہے اس کو چھوڑ دو' اگر ایسا نہ کرو گے تو خبردار ہو جاؤ (کہ تم) اللہ اور اس کے رسول سے جنگ کرنے کے لیے (تیار ہوتے ہو)' اور اگر توبہ کر لو گے (اور سود چھوڑ دو گے) تو تم کو اپنی اصلی رقم لینے کا حق ہے جس میں نہ اوروں کا نقصان اور نہ تمہارا (نقصان)۔"

اور صحیح حدیث میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے سود کھانے والے' سود کھلانے والے' لکھنے والے اور دونوں گواہی دینے

والوں پر لعنت فرمائی ہے اور فرمایا:

«هُمْ سَوَاءٌ»(صحيح مسلم، المساقاة، باب لعن آكل الربا ومؤكله، ح:١٥٩٨)

''یہ سب گناہ میں برابر ہیں۔''

صحیح بخاری میں حضرت ابو جحیفہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ''رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سود کھانے والے اور کھلانے والے پر لعنت کی اور مصور پر بھی لعنت فرمائی۔'' [1]

اور صحیحین میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

«اِجْتَنِبُوا السَّبْعَ الْمُوبِقَاتِ»

''سات تباہ و برباد کر دینے والی چیزوں سے اجتناب کرو۔''

عرض کیا گیا۔ یا رسول اللہ! وہ سات چیزیں کون سی ہیں؟ فرمایا:

«اَلشِّرْكُ بِاللهِ، وَالسِّحْرُ، وَقَتْلُ النَّفْسِ الَّتِي حَرَّمَ اللهُ إِلاَّ بِالْحَقِّ، وَأَكْلُ مَالِ الْيَتِيمِ، وَأَكْلُ الرِّبَا، وَالتَّوَلِّي يَوْمَ الزَّحْفِ، وَقَذْفُ الْمُحْصَنَاتِ الْغَافِلاَتِ الْمُؤْمِنَاتِ» (صحيح البخاري، الوصايا، باب قول الله تعالى ﴿إن الذين يأكلون أموال اليتمٰى ... الخ﴾، ح:٢٧٦٦ وصحيح مسلم، الإيمان، باب الكبائر وأكبرها، ح:٨٩)

''شرک کرنا' جادو کرنا' اس نفس کو قتل کرنا جسے اللہ نے حرام قرار دیا ہو مگر حق کے ساتھ' یتیم کے مال کو کھانا' سود کھانا' جنگ کے دن فرار ہونا اور پاک دامن غافل اور مومن عورتوں پر بہتان اور تہمت لگانا۔''

سود کی حرمت اور اس سے بچنے کے بارے میں آیات و احادیث بہت سی ہیں' لہٰذا تمام مسلمانوں پر واجب ہے کہ سود سے بچیں' اس کو ترک کر دیں اور دوسروں کو بھی اسے ترک کر دینے کی تلقین کریں۔ مسلمان حکمرانوں پر بھی یہ واجب ہے کہ وہ اپنے ملکوں میں سودی بینک قائم کرنے والوں کو منع کریں' ان سے شریعت مطہرہ کے حکم کی پابندی کرائیں تاکہ وہ اللہ تعالیٰ کے حکم کو نافذ کر کے اس کے عذاب سے بچ سکیں۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ لُعِنَ ٱلَّذِينَ كَفَرُوا۟ مِنۢ بَنِىٓ إِسْرَٰٓءِيلَ عَلَىٰ لِسَانِ دَاوُۥدَ وَعِيسَى ٱبْنِ مَرْيَمَ ۚ ذَٰلِكَ بِمَا عَصَوا۟ وَّكَانُوا۟ يَعْتَدُونَ ﴿٧٨﴾ كَانُوا۟ لَا يَتَنَاهَوْنَ عَن مُّنكَرٍ فَعَلُوهُ ۚ لَبِئْسَ مَا كَانُوا۟ يَفْعَلُونَ ﴿٧٩﴾ ﴾ (المائدة٥/ ٧٨-٧٩)

''جو لوگ بنی اسرائیل میں کافر ہوئے ان پر داود اور عیسیٰ ابن مریم کی زبان سے لعنت کی گئی' یہ اس لیے کہ وہ نافرمانی کرتے تھے اور حد سے تجاوز کیے جاتے تھے (اور) برے کاموں سے جو وہ کرتے تھے ایک دوسرے کو روکتے نہیں تھے بلاشبہ وہ برا کرتے تھے۔'' اور فرمایا:

﴿ وَٱلْمُؤْمِنُونَ وَٱلْمُؤْمِنَٰتُ بَعْضُهُمْ أَوْلِيَآءُ بَعْضٍ ۚ يَأْمُرُونَ بِٱلْمَعْرُوفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ ٱلْمُنكَرِ ﴾ (التوبة٩/ ٧١)

''اور مومن مرد اور مومن عورتیں ایک دوسرے کے دوست ہیں کہ اچھے کام کرنے کو کہتے اور بری باتوں

---

[1] صحیح بخاری' البیوع' باب موکل الربا لقول اللہ عزوجل --- الخ' حدیث: 2086

سے منع کرتے ہیں۔"

اور نبی کریم ﷺ نے فرمایا:

«إِنَّ النَّاسَ إِذَا رَأَوُا الْمُنْكَرَ، فَلَمْ يُغَيِّرُوهُ أَوْشَكَ أَنْ يَعُمَّهُمُ اللهُ بِعِقَابِهِ» (سنن ابن ماجه، الفتن، باب الأمر بالمعروف ... الخ، ح:٤٠٠٥ وسنن أبي داود، ح:٤٣٣٨ وجامع الترمذي، ح:٣٠٥٧ ومسند أحمد: ١/٢ واللفظ له)

"لوگ جب برائی کو دیکھیں اور اس سے منع نہ کریں تو اللہ تعالیٰ ان سب کو اپنے عذاب کی گرفت میں لے سکتا ہے۔"

امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے وجوب کے بارے میں آیات و احادیث بہت سی ہیں جو معلوم ہیں۔ ہم اللہ تعالیٰ سے دعا کرتے ہیں کہ وہ ہم سب مسلمانوں کو' حکام کو بھی اور محکوم کو بھی' علماء کو بھی اور عوام کو بھی استقامت کے ساتھ اپنی شریعت پر عمل کرنے کی توفیق بخشے اور ہر اس کام سے بچائے جو اس کی شریعت کے مخالف ہو۔ انه خير مسئول۔

——— شیخ ابن باز ———

معین نفع کے ساتھ بینکوں میں سرمایہ رکھنا

سوال معین نفع کے ساتھ بینکوں میں سرمایہ رکھنے کے بارے میں کیا حکم ہے؟

جواب معین نفع کے ساتھ بینکوں میں سرمایہ رکھنا جائز نہیں ہے کیونکہ یہ عقد ربا پر مشتمل ہے اور ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ وَأَحَلَّ ٱللَّهُ ٱلْبَيْعَ وَحَرَّمَ ٱلرِّبَوٰا۟ ﴾ (البقرة٢/ ٢٧٥)

"سودے کو اللہ نے حلال کیا ہے اور سود کو حرام"

اور فرمایا:

﴿ يَـٰٓأَيُّهَا ٱلَّذِينَ ءَامَنُوا۟ ٱتَّقُوا۟ ٱللَّهَ وَذَرُوا۟ مَا بَقِىَ مِنَ ٱلرِّبَوٰٓا۟ إِن كُنتُم مُّؤْمِنِينَ ﴿٢٧٨﴾ فَإِن لَّمْ تَفْعَلُوا۟ فَأْذَنُوا۟ بِحَرْبٍ مِّنَ ٱللَّهِ وَرَسُولِهِۦ ۖ وَإِن تُبْتُمْ فَلَكُمْ رُءُوسُ أَمْوَٰلِكُمْ لَا تَظْلِمُونَ وَلَا تُظْلَمُونَ ﴿٢٧٩﴾ ﴾ (البقرة٢/ ٢٧٨-٢٧٩)

"اے مومنو! اللہ سے ڈرو اور اگر ایمان رکھتے ہو تو جتنا سود باقی رہ گیا ہے اس کو چھوڑ دو' اگر ایسا نہ کرو گے تو خبردار ہو جاؤ (کہ تم) اللہ اور اس کے رسول سے جنگ کرنے کے لیے (تیار ہوتے ہو)' اور اگر توبہ کر لو گے (اور سود چھوڑ دو گے تو تم کو اپنی اصلی رقم لینے کا حق ہے جس میں نہ اوروں کا نقصان اور نہ تمہارا نقصان۔"

بینکوں میں سرمایہ رکھنے والا اپنے سرمایہ پر جو نفع حاصل کرتا ہے' اس میں کوئی برکت نہیں ہوتی جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ يَمْحَقُ ٱللَّهُ ٱلرِّبَوٰا۟ وَيُرْبِى ٱلصَّدَقَـٰتِ ۗ ﴾ (البقرة٢/ ٢٧٦)

"اللہ سود کو نابود (یعنی بے برکت) کرتا اور خیرات (کی برکت) کو بڑھاتا ہے۔"

بینکوں سے معاملہ کی یہ صورت ربا الفضل بھی ہے اور ربا النسیئہ بھی کیونکہ بینک میں رقم جمع کرانے والا معلوم مدت اور معلوم نفع کی شرط کے ساتھ رقم جمع کراتا ہے۔

——— فتویٰ کمیٹی ———

سودی بینکوں میں بطور امانت سرمایہ رکھنا

سوال جس شخص کے پاس کچھ سرمایہ ہو اور وہ حفاظت کے نقطہء نظر سے کسی بینک میں بطور امانت رکھ دے اور ہر سال اس کی زکوٰۃ بھی ادا کرے تو یہ جائز ہے یا ناجائز؟

جواب سودی بینکوں میں اپنا سرمایہ رکھنا جائز نہیں خواہ سود نہ بھی لے کیونکہ اس میں گناہ اور ظلم کی باتوں میں تعاون ہے اور اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے اس سے منع فرمایا ہے' لیکن اگر کوئی شخص مجبور ہو جائے اور سودی بینکوں کے سوا اس کے پاس اپنے سرمایہ کی حفاظت کے لیے کوئی اور جگہ نہ ہو تو پھر نظریہء ضرورت کے پیش نظر اس میں ان شاء اللہ کوئی حرج نہ ہو گا' کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ وَقَدْ فَصَّلَ لَكُم مَّا حَرَّمَ عَلَيْكُمْ إِلَّا مَا ٱضْطُرِرْتُمْ إِلَيْهِ ﴾ (الأنعام٦/ ١١٩)

"اور جو چیزیں اس نے تمہارے لیے حرام ٹھہرا دی ہیں وہ ایک ایک کر کے بیان کر دی ہیں (بے شک ان کو نہیں کھانا چاہیے) مگر اس صورت میں کہ ناچار ہو جاؤ۔"

اور اگر کوئی اسلامی بینک موجود ہو یا کوئی ایسی جگہ جہاں اپنا مال بطور امانت رکھنے میں گناہ اور ظلم کی باتوں میں تعاون نہ ہو تو پھر سودی بینک میں سرمایہ رکھنا جائز نہیں ہے۔

——— شیخ ابن باز ———

نفع کے بغیر سودی بینکوں میں سرمایہ رکھنا

سوال ان لوگوں کے بارے میں اسلام کا کیا حکم ہے' جو بینکوں میں کام کرتے ہیں نیز ان لوگوں کے بارے میں جو سود تو نہیں لیتے لیکن بینکوں میں اپنا سرمایہ رکھ دیتے ہیں؟

جواب لاریب! سودی بینکوں میں کام کرنا جائز نہیں ہے کیونکہ یہ گناہ اور ظلم کی باتوں میں تعاون ہے اور ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ وَتَعَاوَنُوا۟ عَلَى ٱلْبِرِّ وَٱلتَّقْوَىٰ ۖ وَلَا تَعَاوَنُوا۟ عَلَى ٱلْإِثْمِ وَٱلْعُدْوَٰنِ ۚ وَٱتَّقُوا۟ ٱللَّهَ ۖ إِنَّ ٱللَّهَ شَدِيدُ ٱلْعِقَابِ ﴿٢﴾ ﴾

(المائدة٥/ ٢)

"اور نیکی اور پرہیزگاری کے کاموں میں تم ایک دوسرے کی مدد کیا کرو اور گناہ اور ظلم کی باتوں میں مدد نہ کیا کرو' اور اللہ سے ڈرتے رہو' کچھ شک نہیں کہ اللہ کا عذاب سخت ہے۔"

اور حدیث سے ثابت ہے کہ "رسول اللہ ﷺ نے سود کھانے والے' کھلانے والے' لکھنے والے اور دونوں گواہی دینے والوں پر لعنت کی اور فرمایا:

«هُمْ سَوَاءٌ» (صحيح مسلم، المساقاة، باب لعن آكل الربا ومؤكله، ح:١٥٩٨)

"یہ سب گناہ میں برابر ہیں۔"

بینکوں میں ماہانہ یا سالانہ نفع کی بنیاد پر سرمایہ رکھنا سود اور باجماع علماء حرام ہے اور بغیر نفع کے بارے میں بھی زیادہ احتیاط اس میں ہے کہ ضرورت کے بغیر نہ رکھا جائے کیونکہ اگر بینک سودی کاروبار کرتا ہے تو اس میں سرمایہ رکھنے میں سودی کاموں میں تعاون ہے خواہ سرمایہ رکھنے والا سود نہ بھی لے' لہٰذا اس صورت میں خدشہ ہے کہ کہیں یہ بھی گناہ اور ظلم کی باتوں میں تعاون کرنے والوں میں شامل نہ ہو جائے خواہ اس کا ایسا کوئی ارادہ نہ بھی ہو' لہٰذا واجب ہے کہ اس سے اجتناب کیا جائے جسے اللہ تعالیٰ نے حرام قرار دیا ہے اور اپنے سرمایہ کی حفاظت اور تصرف کے لیے ایسے طریقے استعمال کئے جائیں جو پاک ہوں۔ اللہ تعالیٰ مسلمانوں کو ایسے کام سرانجام دینے کی توفیق عطا فرمائے جو ان کے لیے باعث سعادت' عزت اور نجات ہوں اور انہیں جلدازجلد ایسے اسلامی بینک قائم کرنے کی سعادت عطا فرمائے جو سود سے پاک ہوں۔ بے شک وہی قادروکارساز ہے۔

—— شیخ ابن باز ——

بینکوں کے ذریعے سرمایہ کی منتقلی

سوال کیا ایک مسلمان کے لیے ان بینکوں کے ساتھ معاملہ کرنا جائز ہے جو سرمایہ پر سود دیتے اور قرض پر سود لیتے ہیں؟

جواب کسی شخص کے لیے یہ جائز نہیں کہ وہ اپنا سرمایہ کسی ایسے بینک میں رکھے جو اسے سالانہ معین مقدار میں سود دیتا ہو اور نہ یہ جائز ہے کہ وہ سود ادا کرنے کی شرط پر کسی بھی بینک سے قرض لے مثلاً یہ کہ جب وہ بینک کا سرمایہ واپس کرے گا تو اس سے پانچ فی صد سود بھی ادا کرے گا۔ یہ دونوں صورتیں کتاب و سنت اور اجماع کے دلائل کے عموم میں داخل ہیں جو سود کی حرمت پر دلالت کرتے ہیں اور یہ بات بالکل واضح ہے۔ والحمد اللہ!

جہاں تک سود کے بغیر بینکوں میں اپنا سرمایہ محض بطور امانت رکھنے کی بات ہے تو اگر آدمی مجبور و مضطر نہ ہو تو پھر جائز نہیں کیونکہ یہ بینک مالکان کے ساتھ سودی معاملات میں تعاون ہو گا اور ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَتَعَاوَنُوا۟ عَلَى ٱلْبِرِّ وَٱلتَّقْوَىٰ ۖ وَلَا تَعَاوَنُوا۟ عَلَى ٱلْإِثْمِ وَٱلْعُدْوَٰنِ ۚ﴾ (المائدۃ٥/ ٢)

"اور نیکی اور پرہیزگاری کے کاموں میں تم ایک دوسرے کی مدد کیا کرو اور گناہ اور ظلم کی باتوں میں مدد نہ کیا کرو۔"

اور اگر کوئی شخص بینکوں میں اپنا سرمایہ رکھنے کے لیے مجبور ہو تو پھر ان شاء اللہ اس میں کوئی حرج نہ ہو گا۔ ایک بینک کے ذریعے دوسرے بینک میں سرمایہ کی منتقلی میں کوئی حرج نہیں خواہ منتقلی کی خدمات سرانجام دینے والا بینک سرچارج وصول کرے کیونکہ یہ سرچارج درحقیقت منتقلی کے کام کی اجرت ہوتی ہے۔

—— فتویٰ کمیٹی ——

یہ تعاون عین سود ہے

سوال ایک بینک نے سٹوڈنٹس فنڈز کے ذمہ داروں کو یہ پیشکش کی ہے کہ وہ ان فنڈز کی حفاظت اور ان میں تعاون کے لیے تیار ہے کیونکہ وہ ان فنڈز کو اپنے کاروبار میں استعمال کرے گا' تو کیا ان فنڈز کو بینک میں جمع کرانا جائز ہے؟

جواب یہ کام جائز نہیں ہے کیونکہ یہ عین ربا ہے' اس لیے کہ بینک ان فنڈز کو استعمال کرے گا اور ان پر طے شدہ سود ادا کرے گا۔ بینک نے دجل و تلبیس' دھوکا اور سود پر پردہ ڈالنے کے لیے اس کا نام تعاون رکھا ہے اور سود تو بہرحال سود ہے خواہ لوگ اس کا کوئی بھی نام رکھ لیں۔ واللہ المستعان۔

——— شیخ ابن باز ———

نفع پر بل کی بینک کو فروخت

سوال ایک آدمی نے بائع سے کچھ سامان خریدا اور طے کیا کہ وہ ایک یا دو ماہ بعد رقم ادا کرے گا' مشتری نے بائع کے لیے اس کاغذ پر دستخط بھی کر دیئے' جسے بل کہا جاتا ہے اور اس میں قیمت خرید' رقم کی ادائیگی کا وقت اور خریدار کا نام لکھا جاتا ہے اور اس کے بعد بائع یہ بل بینک کو فروخت کر دیتا ہے اور بینک بائع سے نفع لے کر اس کی قیمت ادا کر دیتا ہے تو کیا معاملہ کی یہ صورت حلال ہے یا حرام؟

جواب معلوم مدت کے ادھار پر معلوم قیمت کے ساتھ سامان خریدنا جائز ہے اور اس کی قیمت وغیرہ کو لکھ لینا شرعاً مطلوب ہے کہ حسب ذیل ارشاد باری تعالیٰ:

﴿ يَٰٓأَيُّهَا ٱلَّذِينَ ءَامَنُوٓاْ إِذَا تَدَايَنتُم بِدَيۡنٍ إِلَىٰٓ أَجَلٖ مُّسَمّٗى فَٱكۡتُبُوهُۚ ﴾ (البقرۃ۲/ ۲۸۲)

''اے مومنو! جب تم آپس میں کسی میعاد معین کے لیے قرض کا معاملہ کرنے لگو تو اس کو لکھ لیا کرو۔''

باقی رہا بل کا بینک کو بیچنا' بینک کا اس کی قیمت ادا کر دینا اور پھر اصل خریدار سے اسے وصول کرنا تو یہ معاملہ حرام ہے کیونکہ یہ سود ہے۔ وصلی اللہ علی نبینا محمد وآلہ وصحبہ وسلم۔

——— فتویٰ کمیٹی ———

بینکوں کے حصص کی خریداری

سودی بینکوں کے حصص کو خریدنا

سوال کیا سعودی عرب میں کام کرنے والے بینکوں مثلاً سعودی امریکی بینک' سعودی کمرشل بینک وغیرہ کے حصص کو خریدنا جائز ہے جنھوں نے آج کل فروخت کے لیے اپنے حصص پیش کیے ہیں' رہنمائی فرمائیں' جزاکم اللہ عنا الف خیر؟

جواب سودی بینکوں کے حصص کو خریدنا اور بینکوں وغیرہ کے ساتھ سودی معاملات کرنا جائز نہیں ہے کیونکہ یہ گناہ اور

ظلم کی باتوں میں تعاون ہے اور ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ وَتَعَاوَنُوا عَلَى الْبِرِّ وَالتَّقْوَىٰ ۖ وَلَا تَعَاوَنُوا عَلَى الْإِثْمِ وَالْعُدْوَانِ ۚ﴾ (المائدة٥/ ٢)

"اور نیکی اور پرہیز گاری کے کاموں میں تم ایک دوسرے کی مدد کیا کرو اور گناہ اور ظلم کی باتوں میں مدد نہ کیا کرو۔"

——— شیخ ابن باز ———

بینکوں کے حصص کی خریداری

سوال بینکوں کے حصص کو خریدنا اور پھر انہیں ایک مدت کے بعد فروخت کر دینے کے بارے میں کیا حکم ہے؟ جس میں ایک ہزار مثلاً تین ہزار کے بھی بن جاتے ہیں' کیا یہ سود شمار ہو گا؟

جواب بینکوں کے حصص کی خرید و فروخت جائز نہیں ہے کیونکہ یہ تساوی اور تقابض کی شرط کے بغیر نقود کی نقود کے ساتھ بیع ہے اور پھر یہ سودی ادارے ہیں۔ لہٰذا ان سے تعاون اور خرید و فروخت جائز نہیں ہے کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ وَتَعَاوَنُوا عَلَى الْبِرِّ وَالتَّقْوَىٰ ۖ وَلَا تَعَاوَنُوا عَلَى الْإِثْمِ وَالْعُدْوَانِ ۚ﴾ (المائدة٥/ ٢)

"اور نیکی اور پرہیز گاری کے کاموں میں تم ایک دوسرے کی مدد کیا کرو اور گناہ اور ظلم کی باتوں میں مدد نہ کیا کرو۔"

اور حدیث سے یہ ثابت ہے کہ "رسول اللہ ﷺ نے سود کھانے والے' کھلانے والے' لکھنے والے اور دونوں گواہی دینے والوں پر لعنت کی اور فرمایا:

«هُمْ سَوَاءٌ»(صحيح مسلم، المساقاة، باب لعن آكل الربا ومؤكله، ح:١٥٩٨)

"یہ سب گناہ میں برابر ہیں۔" آپ ان بینکوں سے صرف اپنا اصل سرمایہ لے سکتے ہیں۔

آپ کو اور دیگر تمام مسلمانوں کو میری نصیحت یہ ہے کہ خود بھی سودی معاملات سے بچیں اور دوسروں کو بھی ان سے بچائیں' سابقہ کوتاہیوں سے اللہ تعالیٰ کے سامنے توبہ کریں کیونکہ سودی معاملات تو اللہ سبحانہ وتعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ سے جنگ ہے اور اس کے غضب و عذاب کا سبب جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ الَّذِينَ يَأْكُلُونَ الرِّبَا لَا يَقُومُونَ إِلَّا كَمَا يَقُومُ الَّذِي يَتَخَبَّطُهُ الشَّيْطَانُ مِنَ الْمَسِّ ۚ ذَٰلِكَ بِأَنَّهُمْ قَالُوا إِنَّمَا الْبَيْعُ مِثْلُ الرِّبَا ۗ وَأَحَلَّ اللَّهُ الْبَيْعَ وَحَرَّمَ الرِّبَا ۚ فَمَن جَاءَهُ مَوْعِظَةٌ مِّن رَّبِّهِ فَانتَهَىٰ فَلَهُ مَا سَلَفَ وَأَمْرُهُ إِلَى اللَّهِ ۖ وَمَنْ عَادَ فَأُولَٰئِكَ أَصْحَابُ النَّارِ ۖ هُمْ فِيهَا خَالِدُونَ ﴿٢٧٥﴾ يَمْحَقُ اللَّهُ الرِّبَا وَيُرْبِي الصَّدَقَاتِ ۗ وَاللَّهُ لَا يُحِبُّ كُلَّ كَفَّارٍ أَثِيمٍ ﴿٢٧٦﴾﴾ (البقرة٢/ ٢٧٥-٢٧٦)

"جو لوگ سود کھاتے ہیں وہ (قبروں سے) اس طرح (حواس باختہ) اٹھیں گے جیسے کہ کسی کو جن نے لپٹ کر دیوانہ بنا دیا ہو' یہ اس لیے کہ وہ کہتے ہیں کہ سودا بیچنا بھی تو (نفع کے لحاظ سے) ویسا ہی ہے جیسے سود (لینا) حالانکہ سودے کو اللہ نے حلال کیا ہے اور سود کو حرام' تو جس شخص کے پاس اللہ کی نصیحت پہنچی اور وہ (سود لینے سے) باز آ گیا تو جو پہلے ہو چکا وہ اس کا اور (قیامت میں) اس کا معاملہ اللہ کے سپرد اور جو پھر لینے لگا تو ایسے لوگ دوزخی ہیں کہ ہمیشہ دوزخ میں (جلتے) رہیں گے۔ اللہ سود کو نابود (یعنی بے برکت) کرتا اور خیرات (کی برکت کو) بڑھاتا ہے اور اللہ کسی ناشکرے گناہ گار کو دوست نہیں رکھتا۔"

اور فرمایا:

﴿ يَـٰٓأَيُّهَا ٱلَّذِينَ ءَامَنُوا۟ ٱتَّقُوا۟ ٱللَّهَ وَذَرُوا۟ مَا بَقِىَ مِنَ ٱلرِّبَوٰٓا۟ إِن كُنتُم مُّؤْمِنِينَ ﴿٢٧٨﴾ فَإِن لَّمْ تَفْعَلُوا۟ فَأْذَنُوا۟ بِحَرْبٍ مِّنَ ٱللَّهِ وَرَسُولِهِۦ ۖ وَإِن تُبْتُمْ فَلَكُمْ رُءُوسُ أَمْوَٰلِكُمْ لَا تَظْلِمُونَ وَلَا تُظْلَمُونَ ﴿٢٧٩﴾ ﴾ (البقرۃ۲/ ۲۷۸۔۲۷۹)

"اے مومنو! اللہ سے ڈرو اور اگر ایمان رکھتے ہو تو جتنا سود باقی رہ گیا ہے اس کو چھوڑ دو' اگر ایسا نہ کرو گے تو خبردار ہو جاؤ (کہ تم) اللہ اور اس کے رسول سے جنگ کرنے کے لیے (تیار ہوتے ہو) اور اگر توبہ کر لو گے (اور سود چھوڑ دو گے) تو تم کو اپنی اصلی رقم لینے کا حق ہے جس میں نہ اوروں کا نقصان ہو اور نہ تمہارا نقصان۔" نیز مذکورہ حدیث سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ یہ کام حرام ہے۔

———— شیخ ابن باز ————

بینکوں میں کام

سودی بینکوں میں کام کرنے کے بارے میں حکم

سوال میں سند فراغت حاصل کرنے کے قریب ہوں اور اپنے شہر میں موجود بینکوں میں سے کسی ایک بینک میں کام کرنے کا ارادہ رکھتا ہوں تو اس سلسلہ میں آپ کی کیا رائے ہے' کیا بینکوں میں کام کرنا سود کے بارے میں وارد حدیث شریف کے ضمن میں آتا ہے؟

جواب میں آپ کو یہ نصیحت کرتا ہوں کہ سودی بینکوں میں کام نہ کریں کیونکہ اس میں سودی کام کرنے والوں کے ساتھ تعاون ہے اور سود حرام ہے اور حرام کاموں میں تعاون کرنے کی ممانعت ہے' ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ وَتَعَاوَنُوا۟ عَلَى ٱلْبِرِّ وَٱلتَّقْوَىٰ ۖ وَلَا تَعَاوَنُوا۟ عَلَى ٱلْإِثْمِ وَٱلْعُدْوَٰنِ ۚ وَٱتَّقُوا۟ ٱللَّهَ ۖ إِنَّ ٱللَّهَ شَدِيدُ ٱلْعِقَابِ ﴿٢﴾ ﴾

(المائدۃ۵/ ۲)

"اور نیکی اور پرہیزگاری کے کاموں میں تم ایک دوسرے کی مدد کیا کرو اور گناہ اور ظلم کی باتوں میں مدد نہ کیا کرو۔"

اور حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ "رسول اللہ ﷺ نے سود کھانے والے' کھلانے والے' لکھنے والے اور دونوں گواہی دینے والوں پر لعنت کی اور فرمایا

«هُمْ سَوَاءٌ»(صحیح مسلم، المساقاة، باب لعن آكل الربا ومؤكله، ح:١٥٩٨)

"یہ سب گناہ میں برابر ہیں۔"

میں دعا کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ بینک قائم کرنے والوں کو توفیق بخشے کہ وہ اسلامی شریعت پر عمل کریں' اس سود کو جسے اللہ تعالیٰ نے حرام قرار دیا ہے' ترک کر دیں۔ حکمرانوں کو بھی اللہ تعالیٰ توفیق دے کہ وہ انھیں اس سے منع کریں تاکہ وہ

اللہ تعالیٰ کی شریعت کی پابندی کریں اور اس کی مخالفت سے اجتناب کریں۔ انه خیر مسؤول

——— شیخ ابن باز ———

سودی بینکوں میں کام گناہ میں تعاون ہے

سوال میرا ایک چچا زاد بھائی ایک بینک میں کلرک کے طور پر کام کرتا ہے۔ اسے بعض علماء نے فتویٰ دیا ہے کہ وہ یہ کام نہ کرے اور اسے چھوڑ کر کوئی اور ملازمت تلاش کرے۔ آپ رہنمائی فرمائیں' کیا اس کے لیے بینک میں کام کرنا جائز ہے یا نہیں؟ جزاکم اللہ خیراً۔

جواب جنہوں نے مذکورہ فتویٰ دیا ہے انہوں نے بہت اچھا فتویٰ دیا ہے کیونکہ سودی بینکوں میں کام کرنا جائز نہیں ہے کیونکہ یہ گناہ اور ظلم کی باتوں میں تعاون ہے اور ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ وَتَعَاوَنُوا عَلَى الْبِرِّ وَالتَّقْوَىٰ ۖ وَلَا تَعَاوَنُوا عَلَى الْإِثْمِ وَالْعُدْوَانِ ۚ وَاتَّقُوا اللَّهَ ۖ إِنَّ اللَّهَ شَدِيدُ الْعِقَابِ ﴿٢﴾ ﴾
(المائدۃ ۵/ ۲)

"اور نیکی اور پرہیزگاری کے کاموں میں تم ایک دوسرے کی مدد کیا کرو اور گناہ اور ظلم کی باتوں میں مدد نہ کیا کرو اور اللہ سے ڈرتے رہو' کچھ شک نہیں کہ اللہ کا عذاب سخت ہے۔"

اور صحیح حدیث سے ثابت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے سود کھانے والے' کھلانے والے' لکھنے والے اور دونوں گواہی دینے والوں پر لعنت کی اور فرمایا:

«هُمْ سَوَاءٌ»(صحيح مسلم، المساقاة، باب لعن آكل الربا ومؤكله، ح:١٥٩٨)

"یہ سب گناہ میں برابر ہیں۔"

——— شیخ ابن باز ———

سودی اداروں میں کام کرنے کے بارے میں حکم

سوال کیا کسی سودی ادارے میں ڈرائیور یا چوکیدار کے طور پر کام کرنا جائز ہے؟

جواب سودی اداروں میں کام کرنا جائز نہیں خواہ انسان ڈرائیور یا چوکیدار کے طور ہی پر کیوں نہ کام کرے کیونکہ سودی اداروں میں ملازمت کے معنی یہ ہیں کہ وہ ان کے کام سے خوش ہے کیونکہ جو شخص کسی حرام کام سے خوش ہو تو وہ گناہ میں شریک ہو گا اور جو شخص ان اداروں میں براہ راست ملوث ہے کہ وہ ان کے حساب کتاب کو لکھتا ہے یا ان سے لین دین کرتا ہے یا اس طرح کے کسی اور کام میں شریک ہے تو وہ بلاشبہ حرام کا ارتکاب کرتا ہے۔ اور حدیث جابر رضی اللہ عنہ سے ثابت ہے کہ نبی ﷺ نے سود کھانے والے' کھلانے والے' لکھنے والے اور دونوں گواہی دینے والوں پر لعنت کی اور فرمایا:

«هُمْ سَوَاءٌ»(صحيح مسلم، المساقاة، باب لعن آكل الربا ومؤكله، ح:١٥٩٨)

"یہ سب گناہ میں برابر (کے شریک) ہیں۔

——— شیخ ابن عثیمین ———

بینک میں بطور چوکیدار ملازم

سوال ایک آدمی ایک بینک میں دس سال سے ملازمت کر رہا ہے اور اب اسے معلوم ہوا ہے کہ بینکوں میں کام کرنا جائز نہیں ہے' وہ رات کے چوکیدار کے طور پر کام کرتا ہے اور بینک کے معاملات سے اس کا کوئی تعلق نہیں تو کیا وہ اس ملازمت کو جاری رکھے یا چھوڑ دے؟

جواب سودی بینکوں میں کسی مسلمان کے بطور چوکیدار کام کرنا بھی جائز نہیں کیونکہ یہ گناہ اور ظلم کی باتوں میں تعاون ہے اور اللہ تعالیٰ نے اس سے منع کرتے ہوئے فرمایا ہے:

﴿وَلَا تَعَاوَنُوا۟ عَلَى ٱلْإِثْمِ وَٱلْعُدْوَٰنِ﴾ (المائدۃ۵/ ۲)

"اور گناہ اور ظلم کی باتوں میں تم ایک دوسرے کی مدد نہ کیا کرو۔"

بینکوں کے اکثر معاملات چونکہ سود پر مبنی ہیں لہٰذا آپ کو چاہیئے کہ اس کے بجائے کسی حلال طریقہ سے رزق تلاش کریں۔ وباللہ التوفیق' وصلی اللہ وسلم علی نبینا محمد و آلہ وصحبہ۔

——— فتویٰ کمیٹی ———

ناواقفیت کی وجہ سے بینکوں میں کام اور تنخواہ کا حکم

سوال میں آپ کے علم میں یہ بات لانا چاہتا ہوں کہ میں سعودی ہالینڈی بینک میں جس کی پورے سعودیہ میں شاخیں ہیں' کام کرتا رہا ہوں۔ میں نے سیکنڈری تعلیم سے فراغت کے بعد چھ یا سات ماہ تک اس بینک میں کام کیا ہے اور جب مجھے میرے ایک ساتھی نے یہ بتایا کہ بینک کی ملازمت حرام ہے کیونکہ وہ اپنے بعض معاملات میں سودی لین دین کرتا ہے تو میں بینک کی ملازمت ترک کر کے سعودی ایئرلائن سے وابستہ ہو گیا' اب سوال یہ ہے کہ کیا سات ماہ کی وہ تنخواہ جو میں نے بینک سے اپنے کام کے عوض وصول کی ہے' وہ حرام ہے اور کیا مجھ پر لازم ہے کہ اس تنخواہ کو میں صدقہ کر دوں یا میرے لیے بس یہی کافی ہے کہ میں نے بینک کی ملازمت ترک کر دی ہے؟

جواب اگر امر واقع اسی طرح ہے جیسے آپ نے ذکر کیا ہے کہ جب آپ کو بتایا گیا کہ بینک کی ملازمت جائز نہیں ہے تو آپ نے اسے ترک کر دیا تو مذکورہ مدت میں کام کر کے آپ نے بینک سے جو تنخواہ لی ہے اس میں کوئی حرج نہیں اور اس تنخواہ کو صدقہ کرنا لازم نہیں ہے بلکہ اس سے توبہ کرنا ہی کافی ہے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں اور آپ کو معاف فرمائے۔ وباللہ التوفیق وصلی اللہ وسلم علی عبدہ ورسولہ محمد و آلہ وصحبہ وسلم

——— فتویٰ کمیٹی ———

سودی بینکوں میں ملازمت کا حکم

سوال میں مصر میں حکومت کے تابع ایک بینک میں کام کرتا تھا' اس بینک کا کام یہ ہے کہ یہ زمینداروں اور دیگر لوگوں کو آسان شرطوں پر ایک مدت کے لیے قرض دیتا ہے جو کہ چند مہینوں سے لے کر کچھ سالوں تک کی بھی ہو سکتی ہے۔ بینک ان قرضوں پر سود بھی لیتا ہے اور مقررمدت سے تاخیر کی صورت میں تین سے سات فی صد یا اس سے بھی زیادہ جرمانہ

بھی کرتا ہے اور جب مدت مقررہ آ جاتی ہے تو بینک اصل قرض کے علاوہ سود اور جرمانہ کی رقم بھی نقد وصول کرتا ہے اور اگر مقروض مدت مقررہ پر نہ ادا کر سکے تو بینک ہر دن کے حساب سے سود وصول کرتا ہے۔ الغرض اس بینک کی ساری آمدنی قرضوں کے سود اور تاخیر کی صورت میں وصول کئے جانے والے جرمانوں پر مشتمل ہے اور اس سے بینک کے ملازمین کو تنخواہ ادا کی جاتی ہے۔

میں اس بینک میں بیس سال سے زیادہ عرصہ سے کام کر رہا ہوں' بینک کی تنخواہ ہی سے میں نے شادی کی ہے اور اسی سے گزر بسر' بچوں کی پرورش اور صدقہ کرتا ہوں اور اس کے سوا میرا اور کوئی آمدنی کا ذریعہ نہیں ہے تو سوال یہ ہے کہ اس کے بارہ میں حکم شریعت کیا ہے؟

جواب اس بینک کا قرضوں پر نفع اور قرضوں کی ادائیگی میں تاخیر کی صورت میں جرمانہ وصول کرنا یہ سب سود ہے۔ لہٰذا اس طرح کے بینک میں ملازمت کرنا جائز نہیں ہے کیونکہ یہ گناہ اور ظلم کی باتوں میں تعاون ہے اور ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَتَعَاوَنُوا عَلَى الْبِرِّ وَالتَّقْوَىٰ ۖ وَلَا تَعَاوَنُوا عَلَى الْإِثْمِ وَالْعُدْوَانِ ۚ وَاتَّقُوا اللَّهَ ۖ إِنَّ اللَّهَ شَدِيدُ الْعِقَابِ ﴿٢﴾﴾

(المائدۃ٥/ ٢)

"اور نیکی اور پرہیز گاری کے کاموں میں تم ایک دوسرے کی مدد کیا کرو اور گناہ اور ظلم کی باتوں میں مدد نہ کیا کرو۔"

حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سود کھانے والے' کھلانے والے' لکھنے والے اور دونوں گواہی دینے والوں پر لعنت کی اور فرمایا:

«هُمْ سَوَاءٌ»(صحیح مسلم، المساقاة، باب لعن آكل الربا ومؤكله، ح:١٥٩٨)

"یہ سب گناہ میں برابر ہیں۔"

اگر آپ کو شرعی حکم کا علم نہ تھا تو آپ نے بینک سے جو تنخواہ لی ہے یہ حلال ہے کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَأَحَلَّ اللَّهُ الْبَيْعَ وَحَرَّمَ الرِّبَا ۚ فَمَن جَاءَهُ مَوْعِظَةٌ مِّن رَّبِّهِ فَانتَهَىٰ فَلَهُ مَا سَلَفَ وَأَمْرُهُ إِلَى اللَّهِ ۖ وَمَنْ عَادَ فَأُولَٰئِكَ أَصْحَابُ النَّارِ ۖ هُمْ فِيهَا خَالِدُونَ ﴿٢٧٥﴾ يَمْحَقُ اللَّهُ الرِّبَا وَيُرْبِي الصَّدَقَاتِ ۗ وَاللَّهُ لَا يُحِبُّ كُلَّ كَفَّارٍ أَثِيمٍ ﴿٢٧٦﴾﴾ (البقرۃ٢/ ٢٧٥-٢٧٦)

"اللہ نے سودے کو حلال کیا ہے اور سود کو حرام تو جس شخص کے پاس اللہ کی نصیحت پہنچی اور وہ (سود لینے سے) باز آ گیا تو جو پہلے ہو چکا وہ اس کا اور (قیامت میں) اس کا معاملہ اللہ کے سپرد اور جو پھر لینے لگا تو ایسے لوگ دوزخی ہیں کہ ہمیشہ دوزخ میں (جلتے) رہیں گے۔ اللہ سود کو نابود (یعنی بے برکت) کرتا اور خیرات (کی برکت) کو بڑھاتا ہے اور اللہ کسی ناشکرے گناہ گار کو دوست نہیں رکھتا۔"

اور اگر آپ کو علم تھا کہ یہ کام جائز نہیں تو پھر آپ نے بینک سے جس قدر رقم لی ہے وہ ساری رقم فلاحی اداروں اور فقراء وغیرہ میں تقسیم کر دیں اور اللہ تعالیٰ کے سامنے توبہ کریں کیونکہ جو شخص اللہ تعالیٰ کے سامنے سچی پکی توبہ کرے' تو اللہ تعالیٰ اس کی توبہ کو قبول کر کے اس کے گناہوں کو معاف فرما دیتا ہے جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا تُوبُوا إِلَى اللَّهِ تَوْبَةً نَّصُوحًا عَسَىٰ رَبُّكُمْ أَن يُكَفِّرَ عَنكُمْ سَيِّئَاتِكُمْ وَيُدْخِلَكُمْ جَنَّاتٍ تَجْرِي مِن تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ﴾ (التحریم٦٦/ ٨)

"اے مومنو! اللہ کے آگے صاف دل سے توبہ کرو' امید ہے کہ وہ تمہارے گناہ تم سے دور کر دے گا اور تم کو باغ ہائے بہشت میں جن کے نیچے نہریں بہہ رہی ہیں داخل کرے گا۔"

اور فرمایا:

﴿ وَتُوبُوٓاْ إِلَى ٱللَّهِ جَمِيعًا أَيُّهَ ٱلْمُؤْمِنُونَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ ﴿٣١﴾ ﴾ (النور۲٤/ ۳۱)

"اور مومنو! تم سب اللہ کے آگے توبہ کرو تاکہ فلاح پاؤ۔"

شیخ ابن باز

بینکوں کے ملازمین کی تنخواہیں

سوال کیا بینکوں کے ملازمین خصوصاً عربی بینک کے ملازمین کی تنخواہیں حلال ہیں یا حرام؟ میں نے سنا ہے کہ یہ حرام ہیں کیونکہ بینک اپنے بعض معاملات میں سودی لین دین کرتے ہیں' میں چونکہ ایک بینک میں کام کرنے کا ارادہ رکھتا ہوں اس لیے امید ہے رہنمائی فرمائیں گے؟

جواب سودی بینکوں کی ملازمت جائز نہیں ہے کیونکہ یہ گناہ اور ظلم کی باتوں میں اعانت ہے اور ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ وَتَعَاوَنُواْ عَلَى ٱلْبِرِّ وَٱلتَّقْوَىٰ ۖ وَلَا تَعَاوَنُواْ عَلَى ٱلْإِثْمِ وَٱلْعُدْوَٰنِ ۚ ﴾ (المائدة٥/ ٢)

"اور نیکی اور پرہیزگاری کے کاموں میں تم ایک دوسرے کی مدد کیا کرو اور گناہ اور ظلم کی باتوں میں مدد نہ کیا کرو۔"

اور صحیح حدیث سے ثابت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے سود کھانے والے' کھلانے والے' لکھنے والے اور دونوں گواہی دینے والوں پر لعنت کی اور فرمایا:

«هُمْ سَوَاءٌ» (صحيح مسلم، المساقاة، باب لعن آكل الربا ومؤكله، ح:١٥٩٨)

"یہ سب (گناہ میں) برابر ہیں۔"

شیخ ابن باز

بینک کے منافع

بینکوں کی طرف سے ادا کیے جانے والے منافع کا حکم

سوال لوگ بینکوں میں اپنی جو رقوم جمع کرواتے ہیں' بعض بینک ان پر منافع بھی دیتے ہیں لیکن ہمیں ان منافع کے بارے میں یہ معلوم نہیں کیا یہ سود ہے یا جائز نفع ہے کہ مسلمان کے لیے اسے لینا جائز ہو۔ کیا عرب دنیا میں ایسے بینک موجود ہیں جو لوگوں کے ساتھ اسلامی شریعت کے مطابق معاملہ کرتے ہوں؟

جواب وہ نفع جو بینک جمع کرائی جانے والی رقوم پر ادا کرتا ہے' سود ہے لہٰذا اسے استعمال کرنا حلال نہیں ہے۔ سودی بینک میں رقم جمع کرانے والے کو اللہ تعالیٰ کے آگے توبہ کرنی چاہیئے اور اسے چاہیئے کہ فی الفور بینک سے اپنی رقم اور نفع

نکال لے اپنی اصلی رقم کو تو اپنے پاس محفوظ رکھے اور بینک سے حاصل ہونے والی اس زائد رقم کو فقراء و مساکین اور عام بہبود کے کاموں میں صرف کر دے۔

ثانیاً: کسی ایسی جگہ کو تلاش کرے جہاں سودی کاروبار نہ ہوتا ہو خواہ وہ کوئی دوکان ہی کیوں نہ ہو اور اپنی رقم وہاں مضاربت پر دے دے اور مضاربت میں نفع کا حصہ مثلاً ثلث وغیرہ یا جو بھی ہو وہ معلوم طے شدہ ہونا چاہیئے یا پھر بغیر کسی فائدہ کے محض امانت کے طور پر وہاں اپنی رقم رکھوا دے۔ وصلی اللّٰہ علی نبینا محمد و آلہ وصحبہ وسلم۔

——— فتویٰ کمیٹی ———

بینکوں کے منافع کے بارے میں حکم

سوال کیا یہ نفع جسے بینک اصلی سرمایہ پر ادا کرتے ہیں حلال ہے یا حرام؟ کیا ہم اس نفع کو لے لیں یا اسے چھوڑ دیں؟

جواب یہ نفع عین سود ہے کیونکہ یہ مال کے عوض اسی کی جنس کا مال اس سے زیادہ لینا ہے اور پھر بینک اس مال پر حاصل ہونے والے نفع کی اصل مقدار کو نہیں بتاتے بلکہ اسے دوسرے کے مال کے ساتھ بھی ملا دیتے اور کبھی بہت زیادہ نفع حاصل کرتے اور کبھی خسارہ بھی اٹھاتے ہیں لہٰذا بینکوں کی طرف سے ادا کیا جانے والا یہ نفع ربا بھی ہے اور غرر بھی لیکن بعض علماء نے اس بات کو جائز قرار دیا ہے کہ اسے لے کر خود استعمال نہ کیا جائے بلکہ فقراء و مساکین اور فلاح و بہبود کے کاموں میں صرف کر دیا جائے اور اسے ان لوگوں کے پاس نہ رہنے دیا جائے جو اسے معصیت کے کاموں میں استعمال کریں۔

——— شیخ ابن جبرین ———

بینکوں کے منافع کا خیراتی سکیموں میں استعمال

سوال ہم ترکی کے باشندے ہیں اور سعودی عرب میں کام کرتے ہیں اور جیسا کہ آپ سے مخفی نہیں ہمارے ملک ترکی میں سیکولرازم کو نظام حکومت کے طور پر اختیار کر لیا گیا ہے۔ ہمارے ہاں سودی نظام بری طرح پھیل چکا ہے حتیٰ کہ سود کی شرح پچاس فی صد سالانہ تک بھی پہنچ جاتی ہے' لیکن ہم ترکی میں اپنے اہل خانہ کو رقوم انہی بینکوں سے بھیجنے کے لیے مجبور ہیں جو کہ سود کا اصلی سرچشمہ ہیں۔ اسی طرح چوری ہو جانے' ضائع ہو جانے یا دیگر خطرات کی وجہ سے بھی ہم اپنی رقوم بینکوں میں رکھتے ہیں تو ان حالات کی وجہ سے ہم فتویٰ کے لیے دو اہم سوال آپ کی خدمت میں ارسال کر رہے ہیں۔ جزاکم اللہ عنا خیر الجزاء۔

(۱) کیا یہ جائز ہے کہ سود انہی بینکوں میں چھوڑ دینے کے بجائے اسے فقراء اور خیراتی اداروں میں تقسیم کر دیا جائے؟

(۲) اور اگر یہ جائز نہیں تو کیا چوری یا ضائع ہونے کے خدشہ کی وجہ سے حفاظت کے لیے بینکوں میں اپنی رقوم رکھنا جائز ہے جب کہ بینک ان رقوم کو جب تک یہ اس کے پاس رہیں گی' اپنے مقاصد میں استعمال کرتا رہے گا؟

جواب بوقت ضرورت سودی بینکوں کے ذریعہ اپنی رقوم منتقل کرنے میں ان شاء اللہ کوئی حرج نہیں ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ وَقَدْ فَصَّلَ لَكُم مَّا حَرَّمَ عَلَيْكُمْ إِلَّا مَا اضْطُرِرْتُمْ إِلَيْهِ ﴾ (الأنعام٦/ ١١٩)

"جو چیزیں اس نے تمہارے لیے حرام ٹھہرا دی ہیں وہ ایک ایک کر کے بیان کر دی ہیں مگر اس صورت میں کہ ناچار ہو جاؤ۔"

اور اس میں کوئی شک نہیں کہ عصر حاضر میں انہی بینکوں کے ذریعہ رقوم منتقل کرنا عام ضروریات میں سے ہے' اسی طرح سود کی شرط کے بغیر محض حفاظت کے لیے رقوم رکھنے میں کوئی حرج نہیں اور اگر کسی شرط یا معاہدہ کے بغیر بینک سود ادا کریں تو اسے لے کر خیراتی سکیموں اور فقراء و مقروض لوگوں میں تقسیم کر دینے میں کوئی حرج نہیں' اس سودی رقم میں سے اپنے پاس نہ رکھے اور نہ خود اس سے کوئی فائدہ اٹھائے' یہ کمائی اگرچہ ناجائز ہے لیکن اسے لے کر فقیروں میں تقسیم کر دینا چاہیئے کیونکہ اسے بینک کے پاس چھوڑ دینے میں مسلمانوں کا نقصان ہے۔ لہٰذا اسے مسلمانوں کے مفاد میں صرف کرنا اس سے کہیں بہتر ہے کہ اسے کفار ہی کے پاس رہنے دیا جائے تاکہ وہ اسے حرام کاموں میں استعمال کریں۔ اگر ان رقوم کو غیر سودی بینکوں یا دیگر مباح طریقوں سے منتقل کرنا ممکن ہو تو پھر سودی بینکوں کے ذریعہ انہیں منتقل کرنا جائز نہیں ہے' اسی طرح اگر اسلامی بینکوں یا اسلامی تجارت میں ان رقوم کو لگانا ممکن ہو تو پھر انہیں سودی بینکوں میں رکھنا جائز نہیں کہ اس صورت میں سودی بینکوں کے استعمال کی ضرورت نہیں۔ واللہ ولی التوفیق۔

———— شیخ ابن باز ————

سودی رقوم کو خیراتی سکیموں میں استعمال کرنا

سوال ہم ایک ایسے ملک میں رہ رہے ہیں جس کے باشندے غیر مسلم ہیں' اللہ تعالیٰ نے الحمدللہ اس ملک میں ہمیں خوش حالی سے نوازا جس کی وجہ سے ہم امریکی بینکوں میں اپنی رقوم محفوظ رکھنے کے لیے مجبور ہیں' لیکن ہم ان بینکوں سے اپنی رقوم پر سود نہیں لیتے اور وہ لوگ اس پر بہت خوش ہیں اور ہمیں بے وقوف سمجھتے ہیں کیونکہ وہ مسلمانوں کے ان اموال کو عیسائیت کی تبلیغ و اشاعت میں استعمال کرتے ہیں۔ میرا سوال یہ ہے کہ ہم ان رقوم سے فائدہ کیوں نہ اٹھائیں اور انہیں مسلمان فقراء اور مساجد و مدارس پر کیوں نہ خرچ کریں؟ اگر ان رقوم کو لے کر فی سبیل اللہ جہاد کرنے والے مجاہدین اور ان کے وارثوں میں تقسیم کر دیا جائے تو کیا اس کی وجہ سے مسلمان قابل ملامت ہو گا؟

جواب سودی بینکوں میں اپنے اموال کو رکھنا جائز نہیں ہے' خواہ یہ بینک مسلمانوں کے ہوں یا غیر مسلموں کے کیونکہ اس میں گناہ اور ظلم کی باتوں میں تعاون ہے' خواہ یہ اموال سود کے بغیر ہی رکھے جائیں لیکن اگر کوئی شخص سود کے بغیر محض حفاظت کے لیے رکھنے پر مجبور ہو تو ان شاء اللہ اس میں کوئی حرج نہیں کیونکہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ وَقَدْ فَصَّلَ لَكُم مَّا حَرَّمَ عَلَيْكُمْ إِلَّا مَا اضْطُرِرْتُمْ إِلَيْهِ ﴾ (الأنعام۶/ ۱۱۹)

"اور جو چیزیں اس نے تمہارے لیے حرام ٹھہرا دی ہیں وہ ایک ایک کر کے بیان کر دی ہیں مگر اس میں کہ تم ان کے لیے ناچار ہو جاؤ۔"

سود لینے کی شرط کے ساتھ اگر ان رقوم کو بینکوں میں رکھا جائے تو پھر گناہ زیادہ ہو گا کیونکہ سود کبیرہ گناہ ہے اور اللہ تعالیٰ نے اسے اپنی کتاب کریم میں بھی اور اپنے رسول امین ﷺ کی زبانی بھی حرام قرار دیا ہے اور بتایا ہے کہ وہ اسے نیست و نابود کر کے رہے گا۔ اور جو شخص سودی لین دین سے باز نہ آئے وہ اللہ اور اس کے رسول سے جنگ کرتا ہے۔ مال

دار لوگ اگر اپنے مال کو نیکی' احسان اور مجاہدین کی مدد کے لیے خرچ کریں تو اللہ تعالیٰ انہیں اجر سے بھی نوازے گا اور خرچ کیے جانے والے مال کا نعم البدل بھی عطا فرمائے گا۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ ٱلَّذِينَ يُنفِقُونَ أَمْوَٰلَهُم بِٱلَّيْلِ وَٱلنَّهَارِ سِرًّا وَعَلَانِيَةً فَلَهُمْ أَجْرُهُمْ عِندَ رَبِّهِمْ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ ﴿٢٧٤﴾ ﴾ (البقرة٢/ ٢٧٤)

"جو لوگ اپنا مال رات اور دن اور پوشیدہ اور ظاہر (اللہ کی راہ میں) خرچ کرتے رہتے ہیں ان کا صلہ پروردگار کے پاس ہے اور ان کو (قیامت کے دن) نہ کسی طرح کا خوف ہو گا اور نہ غم۔"

اور فرمایا:

﴿ وَمَآ أَنفَقْتُم مِّن شَيْءٍ فَهُوَ يُخْلِفُهُۥ ۖ وَهُوَ خَيْرُ ٱلرَّٰزِقِينَ ﴿٣٩﴾ ﴾ (سبا٣٤/ ٣٩)

"اور تم جو چیز خرچ کرو گے وہ اس کا (تمہیں) عوض دے گا وہ سب سے بہتر رزق دینے والا ہے۔"

یہ حکم زکوٰۃ اور غیر زکوٰۃ سب کے لیے عام ہے' اسی طرح صحیح حدیث میں ہے' رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

«مَا نَقَصَتْ صَدَقَةٌ مِّنْ مَّالٍ، وَمَا زَادَ اللهُ عَبْدًا بِعَفْوٍ إِلاَّ عِزًّا، وَمَا تَوَاضَعَ أَحَدٌ للهِ إِلاَّ رَفَعَهُ اللهُ»(صحيح مسلم، البر والصلة، باب استحباب العفو والتواضع، ح:٢٥٨٨)

"صدقہ' مال میں کچھ کمی واقع نہیں کرتا' معاف کر دینے سے اللہ تعالیٰ بندے کی عزت میں (کمی نہیں بلکہ) اضافہ ہی فرماتا ہے' اور جو شخص اللہ تعالیٰ (کی رضاجوئی) کے لیے تواضع اختیار کرے تو اللہ تعالیٰ اسے (ذلیل نہیں بلکہ) سربلند ہی کرتا ہے۔"

نیز آپ نے فرمایا:

«مَا مِنْ يَوْمٍ يُصْبِحُ الْعِبَادُ فِيهِ إِلاَّ مَلَكَانِ يَنْزِلاَنِ فَيَقُولُ أَحَدُهُمَا: اَللّٰهُمَّ أَعْطِ مُنْفِقًا خَلَفًا وَيَقُولُ الآخَرُ: اَللّٰهُمَّ أَعْطِ مُمْسِكًا تَلَفًا»(صحيح البخاري، الزكاة، باب قول الله تعالى ﴿فأما من اعطى واتقى ...﴾، ح:١٤٤٢ وصحيح مسلم، الزكاة، باب في المنفق والممسك، ح:١٠١٠)

"ہر روز دو فرشتے نازل ہوتے ہیں جن میں سے ایک یہ کہتا ہے کہ اے اللہ! خرچ کرنے والے کو اس کا بدلہ عطا فرما اور دوسرا یہ کہتا ہے کہ اے اللہ! (مال کو) روک رکھنے والے کے مال کو تباہ و برباد کر دے۔"

نیکی کے کاموں میں خرچ کرنے اور ضرورت مندوں پر صدقہ کرنے کی فضیلت کے بارے میں بہت سی آیات و احادیث ہیں۔ اگر کوئی مال دار شخص جہالت یا تساہل کی وجہ سے اپنے مال پر سود وصول کر لے اور پھر اللہ تعالیٰ اسے رشد و ہدایت عطا فرما دے تو وہ اسے اپنے پاس رکھنے کے بجائے نیکی اور بھلائی کے کاموں میں خرچ کر دے کیونکہ سود جس مال میں بھی شامل ہو' اسے نیست و نابود کر دیتا ہے کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ يَمْحَقُ ٱللَّهُ ٱلرِّبَوٰا۟ وَيُرْبِى ٱلصَّدَقَٰتِ ۗ ﴾ (البقرة٢/ ٢٧٦)

"اللہ سود کو نابود (یعنی بے برکت) کرتا اور خیرات (کی برکت) کو بڑھاتا ہے۔"

——— شیخ ابن باز ———

جو شخص جہالت کی وجہ سے سود لے لے

سوال جب میرے پاس کچھ مال ہو' میں اسے بینک میں رکھ دوں اور اس پر ایک سال یا زیادہ مدت گزر جائے اور مجھے اپنی اصلی رقم سے دس فی صد زیادہ ملے اور مجھے علم نہ ہو کہ یہ سود یا غیر شرعی معاملہ ہے اور میں اس زیادہ رقم کو تو لے لوں اور اصل رقم کو بینک ہی میں رہنے دوں تو کیا یہ ممکن ہے کہ اس رقم کے بقدر میں اپنے کسی دوسرے حلال مال سے نکال دوں؟ کیا یہ جائز ہے کہ یہ سودی رقم میں اپنی ان ضرورت مند اور شادی شدہ چچا زاد بہنوں کو دے دوں جو ہم سے دور کسی اور علاقہ میں رہتی ہیں؟

جواب نفع کے نام سے بینک نے آپ کو جو سود دیا ہے' اسے کھانے کی وجہ سے اللہ تعالیٰ کے آگے توبہ کریں' اس کے بقدر اپنے حلال مال سے نکالنا واجب نہیں ہے بلکہ یہ قابل معافی ہے کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ فَمَن جَآءَهُۥ مَوۡعِظَةٞ مِّن رَّبِّهِۦ فَٱنتَهَىٰ فَلَهُۥ مَا سَلَفَ وَأَمۡرُهُۥٓ إِلَى ٱللَّهِۖ ﴾ (البقرۃ۲/ ۲۷۵)

”تو جس شخص کے پاس اللہ کی نصیحت پہنچی اور وہ (سود لینے سے) باز آگیا تو جو پہلے ہو چکا وہ اس کا' اور (قیامت میں) اس کا معاملہ اللہ کے سپرد۔“

اگر اس کے بعد بھی آپ بینک سے سود لیں تو اسے کسی قریب یا بعید کے ایسے انسان پر صدقہ کر دیں جو صدقہ کا مستحق ہو تو اس سے آپ سود کھانے کے گناہ سے بچ جائیں گے۔

—— شیخ ابن جبرین ——

سودی نفع سے بچنے کا طریقہ

سوال جب ایک سال سے زیادہ مدت کے بعد میں بینک سے اپنی رقم لوں اور اس کے ساتھ نفع بھی ہو تو کیا اس نفع کو لے کر صدقہ کر دوں یا اسے بینک ہی کو دے دوں یا میں کیا کروں؟

جواب مال پر جب بھی ایک سال کی مدت گزر جائے تو آپ کے لیے اس کی زکوٰۃ ادا کرنا واجب ہے' یہ مال بینک میں ہو یا کسی اور جگہ بشرطیکہ نصاب کے مطابق ہو۔ بینک آپ کو جو نفع دے اسے نہ خود کھائیں اور نہ بینک کو دیں بلکہ اسے نیکی کے کاموں میں صرف کریں مثلاً فقیروں پر صدقہ کر دیں' نالیوں اور غسل خانوں وغیرہ کو بنوا دیں اور قرضوں کے ادا کرنے سے عاجز و قاصر مقروضوں کی مدد کریں۔ آپ کے لیے یہ جائز نہیں کہ بینک یا کسی اور کے ساتھ سودی معاملہ کریں کیونکہ سود بدترین قسم کا کبیرہ گناہ ہے' چنانچہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے اپنی کتاب عظیم میں ارشاد فرمایا ہے:

﴿ ٱلَّذِينَ يَأۡكُلُونَ ٱلرِّبَوٰاْ لَا يَقُومُونَ إِلَّا كَمَا يَقُومُ ٱلَّذِي يَتَخَبَّطُهُ ٱلشَّيۡطَٰنُ مِنَ ٱلۡمَسِّۚ ذَٰلِكَ بِأَنَّهُمۡ قَالُوٓاْ إِنَّمَا ٱلۡبَيۡعُ مِثۡلُ ٱلرِّبَوٰاْۗ وَأَحَلَّ ٱللَّهُ ٱلۡبَيۡعَ وَحَرَّمَ ٱلرِّبَوٰاْۚ فَمَن جَآءَهُۥ مَوۡعِظَةٞ مِّن رَّبِّهِۦ فَٱنتَهَىٰ فَلَهُۥ مَا سَلَفَ وَأَمۡرُهُۥٓ إِلَى ٱللَّهِۖ وَمَنۡ عَادَ فَأُوْلَٰٓئِكَ أَصۡحَٰبُ ٱلنَّارِۖ هُمۡ فِيهَا خَٰلِدُونَ ۝٢٧٥ يَمۡحَقُ ٱللَّهُ ٱلرِّبَوٰاْ وَيُرۡبِي ٱلصَّدَقَٰتِۗ وَٱللَّهُ لَا يُحِبُّ كُلَّ كَفَّارٍ أَثِيمٍ ۝٢٧٦ ﴾ (البقرۃ۲/ ۲۷۵-۲۷۶)

”جو لوگ سود کھاتے ہیں وہ (قبروں سے) اس طرح (حواس باختہ) اٹھیں گے جیسے کہ کسی کو جن نے لپٹ کر

دیوانہ بنا دیا ہو' یہ اس لیے کہ وہ کہتے ہیں کہ سودا بیچنا بھی تو (نفع کے لحاظ سے) ویسا ہی ہے جیسے سود (لینا) حالانکہ سودے کو اللہ نے حلال کیا ہے اور سود کو حرام' تو جس شخص کے پاس اللہ کی نصیحت پہنچی اور وہ (سود لینے سے) باز آگیا تو جو پہلے ہو چکا وہ اس کا اور (قیامت میں) اس کا معاملہ اللہ کے سپرد اور جو پھر لینے لگا تو ایسے لوگ دوزخی ہیں کہ ہمیشہ دوزخ میں (جلتے) رہیں گے۔ اللہ سود کو نابود (یعنی بے برکت) کرتا اور خیرات (کی برکت) کو بڑھاتا ہے اور اللہ کسی ناشکرے گناہ گار کو دوست نہیں رکھتا۔" اور آگے فرمایا:

﴿ يَـٰٓأَيُّهَا ٱلَّذِينَ ءَامَنُوا۟ ٱتَّقُوا۟ ٱللَّهَ وَذَرُوا۟ مَا بَقِىَ مِنَ ٱلرِّبَوٰٓا۟ إِن كُنتُم مُّؤْمِنِينَ ﴿٢٧٨﴾ فَإِن لَّمْ تَفْعَلُوا۟ فَأْذَنُوا۟ بِحَرْبٍ مِّنَ ٱللَّهِ وَرَسُولِهِۦ ۖ وَإِن تُبْتُمْ فَلَكُمْ رُءُوسُ أَمْوَٰلِكُمْ لَا تَظْلِمُونَ وَلَا تُظْلَمُونَ ﴿٢٧٩﴾ ﴾

(البقرۃ۲/ ۲۷۸۔۲۷۹)

"اے مومنو! اللہ سے ڈرو اور اگر ایمان رکھتے ہو تو جتنا سود باقی رہ گیا ہے اس کو چھوڑ دو' اگر ایسا نہ کرو گے تو خبردار ہو جاؤ (کہ تم) اللہ اور اس کے رسول سے جنگ کرنے کے لیے (تیار ہوتے ہو)' اور اگر توبہ کر لو گے (اور سود چھوڑ دو گے) تو تم کو اپنی اصلی رقم لینے کا حق ہے جس میں نہ اوروں کا نقصان ہو اور نہ تمہارا نقصان۔"

یہ تمام آیات کریمہ دلالت کناں ہیں کہ سود شدید حرام ہے اور کبیرہ گناہ اور جو اس پر اصرار کرے' اس کے لیے ہمیشہ ہمیشہ جہنم میں رہنے کی وعید ہے۔ ہم اللہ سے پناہ چاہتے ہیں--- اگر کوئی سود کو حلال سمجھتا ہو تو اس کے لیے یہ خلود' کافروں کے خلود کی طرح ظاہر ہی پر محمول ہو گا۔

جو شخص یہ جانتا ہے کہ سود حرام ہے' اس کی حرمت کا عقیدہ بھی رکھتا ہے اور پھر بھی سود پر اصرار کرتا ہے تو وہ بھی مذکورہ وعید کا مصداق ہے۔ اور اگر وہ جہنم رسید ہو گیا تو اس کا یہ خلود کفار کے خلود کی طرح نہ ہو گا بلکہ اس کے خلود کی کوئی نہ کوئی انتہاء ہو گی جیسا کہ خوارج و معتزلہ کے خلاف اس امت کے ائمہ سلف کا عقیدہ ہے۔ اسی طرح خود کشی کرنے والے' کسی انسان کو جان بوجھ کر دشمنی سے قتل کرنے والے اور زانی کے خلود کے بارے میں بھی یہی کہا جائے گا کہ جو شخص ان گناہوں کو حلال سمجھے گا' اسے کافر قرار دیا جائے گا اور وہ کافروں ہی کی طرح ہمیشہ ہمیشہ جہنم میں رہے گا۔ نعوذ باللہ من ذالک۔

جو شخص ان گناہوں کو حلال نہ سمجھے لیکن خواہش نفس اور شیطان کی اتباع میں ان کا ارتکاب کرے تو وہ اگر جہنم رسید ہوا تو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے جہنم میں نہیں رہے گا بلکہ اس کے جہنم میں رہنے کی مدت کی کوئی حد ہو گی کیونکہ عربی زبان میں طویل عرصہ تک اقامت کو بھی خلود کہا جاتا ہے اور قرآن کریم عربوں ہی کی زبان میں نازل ہوا ہے۔ یہ ایک بہت عظیم مسئلہ ہے' لہٰذا اسے بیان کرنا اور کافروں اور گناہ گاروں کے لیے ہمیشہ ہمیشہ جہنم میں رہنے کے فرق کو واضح کرنا واجب تھا۔ کافروں اور گناہ گاروں کے خلود فی النار میں فرق نہ کرنے کی وجہ سے خوارج و معتزلہ ایک "منکر" عظیم اور اعتقاد فاسد میں مبتلا ہو گئے تھے اور کہتے تھے کہ گناہ گار بھی کفار کی طرح ہمیشہ ہمیشہ جہنم ہی میں رہیں گے جب کہ اہل سنت نے ان کے اس عقیدے کی زبردست تردید کی اور کتاب و سنت کے واضح دلائل اور سلف امت کے اقوال کی روشنی میں ان کے مذہب کے باطل ہونے کو واضح کیا۔

صحیح حدیث میں حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سود کھانے والے‘ کھلانے والے‘ لکھنے والے اور دونوں گواہی دینے والوں پر لعنت کی اور فرمایا:

«هُمْ سَوَاءٌ»(صحيح مسلم، المساقاة، باب لعن آكل الربا ومؤكله، ح:١٥٩٨)

"یہ سب (گناہ میں) برابر ہیں۔"

صحیح بخاری میں حضرت ابو جحیفہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے سود کھانے والے‘ کھلانے والے‘ ہاتھ میں گودنے والی‘ ہاتھ میں گودنے کے لیے کہنے والی اور مصور پر لعنت فرمائی ہے۔[1]

تمام مسلمانوں پر واجب ہے کہ وہ سودی معاملات اور سودی لین دین کرنے والوں سے تعاون کرنے سے پرہیز کریں جیسا کہ مذکورہ دونوں حدیثوں اور درج ذیل ارشاد باری تعالیٰ سے ثابت ہے:

﴿وَتَعَاوَنُوا عَلَى الْبِرِّ وَالتَّقْوَىٰ ۖ وَلَا تَعَاوَنُوا عَلَى الْإِثْمِ وَالْعُدْوَانِ ۚ وَاتَّقُوا اللَّهَ ۖ إِنَّ اللَّهَ شَدِيدُ الْعِقَابِ ﴿٢﴾﴾

(المائدة٥/ ٢)

"اور نیکی اور پرہیزگاری کے کاموں میں تم ایک دوسرے کی مدد کیا کرو اور گناہ اور ظلم کی باتوں میں مدد نہ کیا کرو۔ اور اللہ سے ڈرتے رہو کچھ شک نہیں کہ اللہ کا عذاب سخت ہے۔"

ہم دعا کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ تمام مسلمانوں کو اپنی رضا کے کاموں کے کرنے کی اور اسے ناراض کرنے والے اسباب سے بچنے کی توفیق عطا فرمائے۔

——— شیخ ابن باز ———

سودی رقم کو فقیروں پر صدقہ کرنا

سوال بینکوں سے حاصل ہونے والے منافع کو کس طرح خرچ کیا جائے؟ کیا انہیں بینکوں ہی میں رہنے دیا جائے یا انہیں بینکوں سے لے کر صدقہ کر دیا جائے تاکہ آدمی خود سودی رقم استعمال کرنے سے بچ جائے؟

جواب میں اس بات کو ترجیح دیتا ہوں کہ اسے لے کر مسلمان فقیروں میں صدقہ کر دیا جائے‘ ان شاء اللہ اس میں کوئی گناہ نہیں ہو گا بشرطیکہ اسے خود نہ کھائے۔ یہ رقم فقیروں کے لیے سود نہیں ہو گی بلکہ یہ ایسا مال ہے کہ اسے صاحب مال نے حرام طریقہ سے لیا ہے لہٰذا اسے صدقہ کر دینا چاہیئے جیسا کہ اس چوری اور غصب کئے ہوئے مال کے بارے میں یہ حکم ہے کہ اسے صدقہ کر دیا جائے جس کے اصل مالک کے ملنے کی امید نہ ہو۔ فاحشہ عورت کی کمائی‘ کتے کی قیمت اور دیگر حرام اموال کے بارے میں بھی یہی حکم ہے‘ جن سے توبہ کر لی گئی ہو۔

——— شیخ ابن جبرین ———

سودی رقم کو مجاہدین پر خرچ کرنا

سوال کیا شرعاً یہ جائز ہے کہ میں بینک میں اپنا مال رکھوں‘ اس پر سود لوں اور اس سودی رقم کو مجاہدین پر خرچ

[1] صحیح بخاری‘ البیوع‘ باب موکل الربا --- الخ‘ حدیث: 2086۔

کر دوں؟

جواب جب کہ یہ بات مشہور ہے کہ یہ بینک سودی کاروبار کرتے ہیں لہذا ان میں اپنی رقم رکھنا گناہ اور ظلم کی باتوں میں اعانت ہے' لہذا ہم یہ نصیحت کرتے ہیں کہ بینکوں میں رقم نہ رکھی جائے۔ ہاں البتہ اگر کوئی شخص مجبور و مضطر ہو اور کوئی اسلامی بینک نہ ہو تو پھران بینکوں میں رقم رکھنے میں کوئی حرج نہیں۔ بینک نفع کے نام سے جو رقم دیتے ہیں اسے لینا جائز ہے لیکن اسے اپنے مال میں شامل نہ کرے بلکہ اسے فقراء' مساکین اور مجاہدین میں تقسیم کر دے' یہ اس سے بہتر ہے کہ اس رقم کو ان لوگوں کے لیے بینکوں ہی میں چھوڑ دیا جائے جو اسے گرجوں' کفر کی دعوت دینے والوں اور اسلام سے روکنے والوں پر خرچ کریں۔

——— شیخ ابن جبرین ———

سودی منافع کو نیکی کے کاموں میں خرچ کر دیا جائے

سوال سودی منافع سے بچنے کے لیے شرعاً کیا طریقہ ہے؟

جواب میری رائے میں تو یہ بات مستحسن ہے کہ اسے بینکوں سے لے کر محتاج مسلمان ممالک کی مسجدوں اور دینی اداروں اور دیگر نیک کاموں پر خرچ کر دیا جائے تاکہ اسے بینک والے نہ کھائیں ورنہ وہ سب اس حدیث کے مصداق بنیں گے کہ اللہ تعالیٰ سود کھانے والے اور کھلانے والے پر لعنت فرمائے۔

——— شیخ ابن جبرین ———

مجلّہ "منارالاسلام" کے معمولی سود کو جائز قرار دینے پر سماحۃ الشیخ کا تعاقب

اما بعد!

وزارت عدل و دینی امور ابوظبی کی طرف سے شائع ہونے والے مجلّہ "منارالاسلام" شمارہ نمبر ۳ جلد نمبر ۹ ربیع الاول ۱۴۰۴ھ میں متحدہ عرب امارات کے ایک حکومتی ادارے کی طرف سے اس اعلان کے بارے میں مجھے معلوم ہوا ہے جس میں بینک کے سود کو جائز قرار دیا گیا ہے' اس کے بارے میں جھگڑے کو عدالتوں میں لے جایا جا سکتا ہے نیز اس اعلان میں یہ بتایا گیا ہے کہ قرض پر معمولی سود جائز اور حرام سود سے مستثنیٰ ہے بشرطیکہ حاجت و مصلحت کا یہ تقاضا ہو اور بینک چونکہ اپنی موجودہ حالت میں اپنے بین الاقوامی نظام کے مطابق لوگوں کی ضرورت کو پورا کرتے ہیں اور ان کے بغیر معاشی مصلحتوں کے تقاضے پورے ہو ہی نہیں سکتے' لہذا عدالتیں صرف یہ کہہ کر سودی منافع کو ناجائز قرار نہیں دے سکتیں کہ شریعت نے سود کو حرام قرار دیا ہے اور پھر اس کے آخر میں یہ کہا گیا ہے کہ اگر سود معمولی مقدار میں ہو یعنی تجارتی امور میں ۱۲ فی صد اور دیگر امور میں ۹ فیصد سے زیادہ نہ ہو تو جائز ہے اور موجودہ حالات میں بینکوں کا یہ سود اس اسلامی شریعت کے منافی نہیں ہے جس کی پابندی متحدہ عرب امارات کے لیے لازم ہے۔

مجھے اس جری اقدام پر بے حد تعجب ہوا ہے جس میں ایسے عجیب و غریب اصول بیان کئے گئے ہیں' جن سے اللہ تعالیٰ کے احکام کی بے حرمتی ہوتی ہے اور جن میں شریعت بیضاء اور دین اسلام کی ان تعلیمات کا مذاق اڑایا گیا ہے' جو قرآن

کریم اور رسول اللہ ﷺ کی احادیث صحیحہ کی نصوص سے ثابت ہے اور پھر یہ اعلان ایک ایسی اسلامی حکومت کے زیر سایہ کیا گیا ہے جس کا سربراہ ایک مسلمان آدمی ہے۔ اس خطرناک اعلان میں اسلام پر افتراء پردازی بھی ہے کہ اس طرح اس چیز کو حلال قرار دیا گیا ہے جو کہ اللہ تعالیٰ کی شریعت میں سخت حرام ہے جیسا کہ متحدہ عرب امارات کے محکمہ قضاء کے سربراہ نے بھی اس کی تردید کرتے ہوئے حق کو واضح فرما دیا ہے۔

یہ بات معلوم ہے کہ اللہ سبحانہ و تعالیٰ نے اپنی کتاب عزیز کی بہت سی آیات کریمہ میں سود اور اس کی تمام شکلوں اور رنگوں کو حرام قرار دیا ہے۔ مثلاً ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ ٱلَّذِينَ يَأْكُلُونَ ٱلرِّبَوٰاْ لَا يَقُومُونَ إِلَّا كَمَا يَقُومُ ٱلَّذِى يَتَخَبَّطُهُ ٱلشَّيْطَـٰنُ مِنَ ٱلْمَسِّ ۚ ذَٰلِكَ بِأَنَّهُمْ قَالُوٓاْ إِنَّمَا ٱلْبَيْعُ مِثْلُ ٱلرِّبَوٰاْ ۗ وَأَحَلَّ ٱللَّهُ ٱلْبَيْعَ وَحَرَّمَ ٱلرِّبَوٰاْ ۚ فَمَن جَآءَهُۥ مَوْعِظَةٌ مِّن رَّبِّهِۦ فَٱنتَهَىٰ فَلَهُۥ مَا سَلَفَ وَأَمْرُهُۥٓ إِلَى ٱللَّهِ ۖ وَمَنْ عَادَ فَأُوْلَـٰٓئِكَ أَصْحَـٰبُ ٱلنَّارِ ۖ هُمْ فِيهَا خَـٰلِدُونَ ﴿٢٧٥﴾ يَمْحَقُ ٱللَّهُ ٱلرِّبَوٰاْ وَيُرْبِى ٱلصَّدَقَـٰتِ ۗ وَٱللَّهُ لَا يُحِبُّ كُلَّ كَفَّارٍ أَثِيمٍ ﴿٢٧٦﴾ ﴾ (البقرۃ۲/ ۲۷۵۔۲۷۶)

"جو لوگ سود کھاتے ہیں وہ (قبروں سے) اس طرح (حواس باختہ) اٹھیں گے جیسے کہ کسی کو جن نے لپٹ کر دیوانہ بنا دیا ہو' یہ اس لیے کہ وہ کہتے ہیں کہ سودا بیچنا بھی (تو نفع کے لحاظ سے) ویسا ہی ہے جیسے سود (لینا) حالانکہ سودے کو اللہ نے حلال کیا ہے اور سود کو حرام' تو جس شخص کے پاس اللہ کی نصیحت پہنچی اور وہ (سود لینے سے) باز آ گیا تو جو پہلے ہو چکا وہ اس کا اور (قیامت میں) اس کا معاملہ اللہ کے سپرد اور جو پھر لینے لگا تو ایسے لوگ دوزخی ہیں وہ ہمیشہ دوزخ میں (جلتے) رہیں گے۔ اللہ سود کو نابود (یعنی بے برکت) کرتا اور خیرات (کی برکت) کو بڑھاتا ہے اور اللہ کسی ناشکرے گناہ گار کو دوست نہیں رکھتا۔"

اور فرمایا:

﴿ يَـٰٓأَيُّهَا ٱلَّذِينَ ءَامَنُواْ لَا تَأْكُلُواْ ٱلرِّبَوٰٓاْ أَضْعَـٰفًا مُّضَـٰعَفَةً ۖ وَٱتَّقُواْ ٱللَّهَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ ﴿١٣٠﴾ ﴾ (آل عمران۳/ ۱۳۰)

"اے ایمان والو! دگنا چوگنا سود نہ کھاؤ اور اللہ سے ڈرو تاکہ تم نجات حاصل کرو۔"

اور فرمایا:

﴿ وَمَآ ءَاتَيْتُم مِّن رِّبًا لِّيَرْبُوَاْ فِىٓ أَمْوَٰلِ ٱلنَّاسِ فَلَا يَرْبُواْ عِندَ ٱللَّهِ ۖ ﴾ (الروم۳۰/ ۳۹)

"اور جو تم سود دیتے ہو کہ لوگوں کے مال میں افزائش ہو تو اللہ کے نزدیک اس میں افزائش نہیں ہوتی۔"

اور فرمایا:

﴿ يَـٰٓأَيُّهَا ٱلَّذِينَ ءَامَنُواْ ٱتَّقُواْ ٱللَّهَ وَذَرُواْ مَا بَقِىَ مِنَ ٱلرِّبَوٰٓاْ إِن كُنتُم مُّؤْمِنِينَ ﴿٢٧٨﴾ فَإِن لَّمْ تَفْعَلُواْ فَأْذَنُواْ بِحَرْبٍ مِّنَ ٱللَّهِ وَرَسُولِهِۦ ۖ وَإِن تُبْتُمْ فَلَكُمْ رُءُوسُ أَمْوَٰلِكُمْ لَا تَظْلِمُونَ وَلَا تُظْلَمُونَ ﴿٢٧٩﴾ ﴾ (البقرۃ۲/ ۲۷۸۔۲۷۹)

"اے مومنو! اللہ سے ڈرو اور اگر ایمان رکھتے ہو تو جتنا سود باقی رہ گیا ہے اس کو چھوڑ دو۔ اگر ایسا نہ کرو گے تو خبردار ہو جاؤ (کہ تم) اللہ اور اس کے رسول سے جنگ کرنے کے لیے (تیار ہوتے ہو) اور اگر توبہ کر لو گے

(اور سود چھوڑ دو گے) تو تم کو اپنی اصلی رقم لینے کا حق ہے جس میں نہ اوروں کا نقصان ہو اور نہ تمہارا نقصان۔"

یہ شدید اسلوب اس بات کی دلیل ہے کہ سود بہت بڑا اور خطرناک جرم ہے' وہ کبیرہ گناہ ہے جو اللہ تعالیٰ کے غضب کا موجب اور دنیا و آخرت کے عذابوں کا سبب ہے' ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ فَلْيَحْذَرِ الَّذِينَ يُخَالِفُونَ عَنْ أَمْرِهِ أَن تُصِيبَهُمْ فِتْنَةٌ أَوْ يُصِيبَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ ﴾ (النور ٢٤/ ٦٣)

"تو جو لوگ اس کے حکم کی مخالفت کرتے ہیں' ان کو ڈرنا چاہیئے کہ (ایسا نہ ہو کہ) ان پر کوئی آفت پڑ جائے یا تکلیف دینے والا عذاب نازل ہو۔"

اور نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا:

«اِجْتَنِبُوا السَّبْعَ الْمُوبِقَاتِ»

"تباہ و برباد کر دینے والی سات چیزوں سے اجتناب کرو۔" صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے عرض کیا یا رسول اللہ! وہ سات چیزیں کون سی ہیں؟ فرمایا:

«اَلشِّرْكُ بِاللهِ، وَالسِّحْرُ، وَقَتْلُ النَّفْسِ الَّتِي حَرَّمَ اللهُ إِلاَّ بِالْحَقِّ، وَأَكْلُ الرِّبَا، وَأَكْلُ مَالِ الْيَتِيمِ، وَالتَّوَلِّي يَوْمَ الزَّحْفِ، وَقَذْفُ الْمُحْصَنَاتِ الْغَافِلاَتِ الْمُؤْمِنَاتِ» (صحيح البخاري، الوصايا، باب قول الله تعالى ﴿إن الذين يأكلون أموال اليتمٰى﴾، ح:٢٧٦٦ وصحيح مسلم، الإيمان، باب الكبائر و أكبرها، ح:٨٩)

"اللہ کے ساتھ شرک کرنا' جادو کرنا' اس نفس کو قتل کرنا جسے اللہ نے حرام قرار دیا ہو مگر حق کے ساتھ' سود کھانا' مال یتیم کو کھانا' میدان جنگ سے فرار ہونا اور پاک دامن مومن اور غافل عورتوں پر بہتان لگانا۔"

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بھی فرمایا:

«اَلرِّبَا اِثْنَانِ وَسَبْعُونَ بَابًا، أَدْنَاهَا مِثْلُ إِتْيَانِ الرَّجُلِ أُمَّهُ» (المعجم الأوسط للطبراني: ٨/ ٧٣، ٧٤، ح: ٧١٤٧)

"سود کے بہتر دروازے ہیں اور ان میں سے سب سے چھوٹے دروازے سے داخل ہونے کا گناہ اس طرح ہے جیسے کوئی اپنی ماں سے منہ کالا (بدکاری) کرے۔"

صحیح حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سود کھانے والے' کھلانے والے' لکھنے والے اور دونوں گواہی دینے والوں پر لعنت کی اور فرمایا:

«هُمْ سَوَاءٌ» (صحيح مسلم، المساقاة، باب لعن آكل الربا ومؤكله، ح:١٥٩٨)

"یہ سب (گناہ میں) برابر ہیں۔"

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

«اَلذَّهَبُ بِالذَّهَبِ، وَالْفِضَّةُ بِالْفِضَّةِ، وَالْبُرُّ بِالْبُرِّ، وَالشَّعِيرُ بِالشَّعِيرِ، وَالتَّمْرُ بِالتَّمْرِ، وَالْمِلْحُ بِالْمِلْحِ، مِثْلاً بِمِثْلٍ، يَدًا بِيَدٍ، فَمَنْ زَادَ أَوِ اسْتَزَادَ فَقَدْ أَرْبٰى الْآخِذُ وَالْمُعْطِي

فِيهِ سَوَاءٌ»(صحیح مسلم، المساقاة، باب الصرف وبیع الذهب بالورق نقدا، ح:٨٢/ ١٥٨٤)

"سونا سونے کے ساتھ' چاندی چاندی کے ساتھ' گندم گندم کے ساتھ' جو جو کے ساتھ' کھجور کھجور کے ساتھ اور نمک نمک کے ساتھ' برابر برابر اور دست بدست ہونا چاہیئے۔ جو شخص زیادہ لے یا زیادہ دے' اس نے سودی معاملہ کیا۔ اور سود لینے والا اور دینے والا (گناہ میں) برابر ہیں۔"

ان اور ان جیسی دیگر بہت سی آیات و احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ سود خواہ کم ہو یا زیادہ' حرام ہے۔ فرد اور معاشرہ پر اس کے بہت خطرناک اثرات مرتب ہوتے ہیں۔ اور جو شخص سودی لین دین کرے وہ اللہ اور اس کے رسول سے جنگ کرتا ہے۔ سود کی حرمت پر اہل علم میں قطعاً کوئی اختلاف نہیں ہے کیونکہ حرمت سود کے بارے میں نصوص بے حد واضح ہیں۔

دین کے بارے میں کوئی بھی ایسا غیور مسلمان جس کا اس بات پر ایمان ہو کہ اسلام ایک ایسا عظیم' کامل' مکمل اور اکمل دین ہے جو جلب مصالح اور دفع مفاسد پر مشتمل ہے اور ہر زمانے اور ہر خطے کے لوگوں کے لیے قابل عمل ہونے کی خوبی سے بہرہ ور ہے وہ سود اور سودی معاملات کو ہرگز اپنے لیے جائز قرار نہیں دے سکتا۔

متحدہ عرب امارات کے محکمہ "اتحادیہ علیا" کے ایک دفتر نے ضرورت و حاجت کے بہانے اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کے حرام قرار دیئے ہوئے ایک امر کو جو حلال قرار دے دیا ہے تو یہ اللہ تعالیٰ کے بارے میں بڑی دیدہ دلیری کا مظاہرہ اور اس کے احکام کی صریحاً مخالفت ہے اور بغیر علم کے اللہ کی طرف ایک بات کو منسوب کرنا ہے۔ لوگوں کو بینکوں کی طرف اپنی حاجت کے لیے صرف اسی وقت رجوع کرنا چاہیئے جب یہ اسلامی شریعت کی بنیادوں پر استوار ہوں' اللہ تعالیٰ کے حلال کردہ کو حلال اور حرام کردہ کو حرام قرار دیں۔ اور اگر ان کا عمل اس کے خلاف ہو تو پھر یہ شر اور فساد ہیں۔ یاد رہے احکام شریعت ثابت اور قطعی ہیں کیونکہ یہ اس عزیز و حکیم کی طرف سے ہیں جو اپنے بندوں کے حالات کو بھی جانتا ہے اور یہ بھی جانتا ہے کہ ان کے حالات کی بہتری کس بات میں ہے۔ لہٰذا ہمارے لیے یہ جائز نہیں ہے کہ حرام کو حلال قرار دینے یا حلال کو حرام قرار دینے کے لیے اپنی رائے یا خواہش نفس یا اس طرح کی کسی اور چیز سے فیصلہ کریں۔

اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول نے مسلمانوں کی ہمدردی و خیرخواہی کا جو حکم دیا ہے تو اس حکم کی اطاعت کے لیے اور میرے جیسے انسان پر جو یہ واجب ہے کہ وہ بیان کرے اور اس سے ڈرائے جسے اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول نے حرام قرار دیا ہے تو اس فرض کے ادا کرنے کے لیے یہ مختصر مضمون تحریر کیا گیا ہے۔ اور اللہ تعالیٰ سے دعا کرتا ہوں کہ وہ ہمیں اور تمام مسلمانوں کو دین میں تفقہ اور ثبات عطا فرمائے' اللہ تعالیٰ اور اس کے بندوں کی ہمدردی اور خیرخواہی کرنے کی توفیق بخشے اور ہر اس چیز سے بچائے جو اس کی شریعت مطہرہ کے مخالف ہو۔ انه جواد کریم' وصلی اللہ وسلم علی نبینا محمد وآله وصحبه۔

عبدالعزیز بن عبداللہ بن باز

رئیس عام

ادارات بحوث علمیہ و افتاء و دعوت و ارشاد

غیر معینہ مدت کے لیے قرض

بینکوں کا سالانہ نفع کی بنیاد پر قرض

الحمدللہ وحدہ وبعد' بحوث وافتاء کی مستقل کمیٹی نے اس استفتاء کا جائزہ لیا جو انجمن کبار علماء کے سیکرٹری کی طرف سے کمیٹی کو بھیجا گیا ہے اور جس میں سائل نے دو مسئلوں کے بارے میں پوچھا ہے۔ اس نے ذکر کیا ہے کہ ان کے ملک میں ایک بینک قائم ہوا ہے جو حصص خریدنے والوں کو چھ فیصد سالانہ نفع کی بنیاد پر قرض دیتا ہے اور جب تک بینک اپنا سارا قرض واپس نہیں لے لیتا یہ نفع لیتا رہتا ہے۔ تو کیا یہ صحیح ہے؟ (۲) کیا بچیوں کا ختنہ کرنا مستحب ہے یا مکروہ؟

کمیٹی نے استفتاء پر غور کرنے کے بعد پہلے سوال کا یہ جواب دیا ہے کہ بینک کا یہ معاملہ جو سوال میں مذکور ہے یہ ایک حرام معاملہ ہے کیونکہ اس میں ربا الفضل بھی ہے اور ربا النسیئہ بھی۔ ربا الفضل تو اس طرح کہ مثلاً اگر کوئی شخص بینک سے ایک ہزار لے تو وہ بینک کو ایک ہزار ساٹھ واپس کرے گا' اور رباالنسیئہ اس طرح کہ اگر وہ آج بینک سے ایک ہزار لیتا ہے تو ایک سال بعد اسے ایک ہزار ساٹھ ادا کرنا ہوں گے۔ مسند احمد اور صحیح مسلم میں حضرت عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

«اَلذَّهَبُ بِالذَّهَبِ، وَالْفِضَّةُ بِالْفِضَّةِ، وَالْبُرُّ بِالْبُرِّ، وَالشَّعِيرُ بِالشَّعِيرِ، وَالتَّمْرُ بِالتَّمْرِ، وَالْمِلْحُ بِالْمِلْحِ، مِثْلاً بِمِثْلٍ، سَوَاءً بِسَوَاءٍ، يَدًا بِيَدٍ، فَإِذَا اخْتَلَفَتْ هٰذِهِ الأَصْنَافُ فَبِيعُوا كَيْفَ شِئْتُمْ إِذَا كَانَ يَدًا بِيَدٍ»(صحیح مسلم، المساقاۃ، باب الصرف وبیع الذھب بالورق نقدا، ح: ۱۵۸۷)

''سونا سونے کے ساتھ' چاندی چاندی کے ساتھ' گندم گندم کے ساتھ' جو جو کے ساتھ' کھجور کھجور کے ساتھ اور نمک نمک کے ساتھ برابر برابر اور دست بدست ہونا چاہیے اور اگر یہ اجناس مختلف ہوں تو پھر جس طرح چاہو بیچو بشرطیکہ دست بدست ہو۔''

اس حدیث سے استدلال کے پیش نظر یہ معاملہ حرام ہے اور اس میں سود اپنی دونوں قسموں ربا الفضل اور رباالنسیئہ کی صورت میں موجود ہے۔ بینک قرض لینے والے کو اس شرط پر قرض دیتا ہے کہ مدت مقررہ کے بعد وہ قرض واپس کرے تو اس مدت کے عوض وہ زائد رقم بھی ادا کرے گا جب کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ نقود کا معاملہ برابر برابر اور دست بدست ہونا چاہیے' لہٰذا یہ معاملہ حرام ہے اور اس میں سود اپنی دونوں قسموں ربا الفضل اور رباالنسیئہ کی صورت میں موجود ہے۔ ابن المنذر نے لکھا ہے کہ اس بات پر اہل علم کا اجماع ہے کہ جو شخص اس شرط پر قرض دے کہ مقروض واپسی پر زیادہ دے گا یا کوئی ہدیہ دے گا تو یہ بھی سود کی ایک قسم ہے۔

کمیٹی نے دوسرے سوال کا یہ جواب دیا ہے کہ عورتوں کے لیے ختنہ مستحب ہے کیونکہ خلال نے اپنی سند کے ساتھ شداد بن اوس رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

«اَلْخِتَانُ سُنَّةٌ لِّلرِّجَالِ وَمَكْرُمَةٌ لِّلنِّسَاءِ»(مسند أحمد: ٥/ ٧٥)

''ختنہ مردوں کے لیے سنت ہے اور عورتوں کے لیے باعث عزت۔'' وباللہ التوفیق۔ وصلی اللہ علی محمد و آلہ وصحبہ وسلم

—— فتویٰ کمیٹی ——

نفع کے ساتھ قرض

سوال کیا بینک کے ساتھ معاملہ ربا ہے یا جائز ہے؟ یہ سوال اس لیے پوچھا گیا ہے کہ بہت سے ہم وطن بینکوں سے قرض لیتے ہیں۔

جواب مسلمان کے لیے یہ حرام ہے کہ وہ کسی سے بھی سونا یا چاندی یا نقدی اس شرط پر قرض لے کہ وہ واپسی پر اس سے زیادہ ادا کرے گا' خواہ قرض دینے والا کوئی بینک ہو یا کوئی اور ہو کیونکہ یہ سود ہے' اور سود کبیرہ گناہ ہے اور جو بینک اس طرح کا معاملہ کرے وہ سودی بینک ہے۔ وصلی اللہ علی نبینا محمد و آلہ وصحبہ وسلم

—— فتویٰ کمیٹی ——

نفع کے ساتھ قرض جائز نہیں

سوال میں ایک ملازم ہوں' میری تنخواہ ۳۰۴۸ ریال ہے۔ میں ایک سال سے شادی شدہ ہوں اور میرے ذمہ ترپن ہزار ریال قرض ہے۔ قرض دینے والے مجھ سے اکثر اپنے قرض کا مطالبہ کرتے رہتے ہیں لیکن میرے پاس قرض ادا کرنے کے لیے کچھ نہیں ہے۔ تو کیا میرے لیے یہ جائز ہے کہ میں کسی ایسے بینک سے قرض لے لوں جو نفع پر قرض دیتا ہو۔ بینک جو قرض مجھے دے گا اس سے میرے ذمہ جو قرض ہے وہ آدھا بھی ادا نہیں ہو گا۔ رہنمائی فرمائیں۔ جزاکم اللہ خیراً؟

جواب کسی بھی مسلمان کے لیے بینک سے یا کسی اور سے نفع کی شرط کے ساتھ قرض لینا جائز نہیں ہے کیونکہ یہ بہت بڑا سود ہے' لہٰذا اسے چاہیئے کہ وہ طلب رزق اور ادائے قرض کے لیے جائز اسباب اختیار کرے اور اللہ تعالیٰ نے جن معاملات اور کمائی کے طریقوں کو مباح قرار دیا ہے وہ حرام سے بچانے کے لیے کافی ہیں۔ قرض دینے والوں کو جب آپ کی تنگ دستی کا علم ہو تو انہیں چاہیئے کہ آپ کو آسانی تک مہلت دیں کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ وَإِن كَانَ ذُو عُسْرَةٍ فَنَظِرَةٌ إِلَىٰ مَيْسَرَةٍ ۚ وَأَن تَصَدَّقُوا۟ خَيْرٌ لَّكُمْ ۖ إِن كُنتُمْ تَعْلَمُونَ ﴿٢٨٠﴾ ﴾ (البقرة٢/ ٢٨٠)

''اور اگر مقروض تنگ دست ہو تو (اسے) کشائش (کے حاصل ہونے) تک مہلت (دو)' اور اگر (قرض) بخش دو تو وہ تمہارے لیے زیادہ اچھا ہے بشرطیکہ سمجھو۔''

اور رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

«مَنْ أَنْظَرَ مُعْسِرًا، أَظَلَّهُ اللهُ فِي ظِلِّهِ يَوْمَ لاَ ظِلَّ إِلاَّ ظِلُّهُ»(مسند أحمد: ٣/ ٤٢٧ وصحيح مسلم، الزهد، باب حديث جابر الطويل ... الخ، ح: ٣٠٠٦)

"جو شخص کسی تنگ دست کو مہلت دے تو اللہ تعالیٰ اسے اپنے سایہ تلے جگہ دے گا جس دن اس کے سایہ کے سوا اور کوئی سایہ نہ ہو گا۔"

نیز فرمایا:

«مَنْ يَسَّرَ عَلٰى مُعْسِرٍ، يَسَّرَ اللّٰهُ عَلَيْهِ فِي الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ»(صحيح مسلم، الذكر والدعاء، باب فضل الاجتماع على تلاوة القرآن . . . الخ، ح:٢٦٩٩)

"جس نے کسی تنگ دست پر آسانی کی تو اللہ تعالیٰ اس پر دنیا اور آخرت میں آسانی کرے گا۔" واللہ ولی التوفیق۔

—————— شیخ ابن باز ——————

مالدار آدمی کا ترقیاتی بینک سے قرض لینا

سوال ایک آدمی نے ترقیاتی بینک سے عمارت بنانے کے لیے قرض لیا حالانکہ الحمدللہ اس کے مالی حالات اچھے ہیں۔ کچھ مدت تک تو یہ عمارت اسی طرح رہی اور پھر اس نے کرایہ پر دے دی۔ سوال یہ ہے کہ کیا یہ قرض لینے کے لیے اسے گناہ ہو گا؟ کیا اس عمارت کے کرایہ پر زکوٰۃ ہے؟

جواب حکومت نے ---- اللہ تعالیٰ اسے توفیق دے---- یہ بینک کھولا ہے اور اس سے مقصود رہائش کی مشکلات کو حل کرنا اور بعض دوسری پریشانیوں کو دور کرنا ہے جو بعض اوقات پیش آتی ہیں۔ حکومت نے ملک کے ہر باشندے کو اجازت دی ہے کہ وہ معروف شروط کے ساتھ قرض لے سکتا ہے اور اس میں مالدار اور فقیر میں کوئی فرق نہیں ہے اور اس اعتبار سے بھی کوئی فرق نہیں کہ وہ عمارت کو اپنی رہائش کے لیے بنانا چاہتا ہے یا کرایہ پر دینے کے لیے۔ لہٰذا مذکورہ بالا صورت میں کوئی حرج نہیں' یہ تصرف ان شاء اللہ صحیح ہے۔ زکوٰۃ گھروں اور عمارتوں پر واجب نہیں ہے بلکہ کرایہ پر واجب ہے بشرطیکہ وہ مالک کے پاس ہو اور اس پر ایک سال گزر جائے۔ اور اگر وہ کرایہ کی رقم کو خرچ کر لے یا اس کے ساتھ قرض ادا کر دے تو پھر اس میں زکوٰۃ نہیں ہے۔

—————— شیخ ابن جبرین ——————

ملازمین کا کمیٹی ڈالنا

سوال اساتذہ کی ایک جماعت ہر مہینے کے آخر میں جمع ہو کر اپنی تنخواہ میں سے کچھ مال جمع کر کے ایک شخص کو دے دیتی ہے اور دوسرے مہینے کسی اور شخص کو حتیٰ کہ تمام اساتذہ اپنی اس طرح ادا کی ہوئی رقم وصول کر لیتے ہیں۔ اس کو بعض لوگ کمیٹی کے نام سے موسوم کرتے ہیں تو اس کے بارے میں حکم شریعت کیا ہے؟

جواب اس میں کوئی حرج نہیں کیونکہ یہ قرض ہے اور اس میں کسی کے لیے بھی زائد نفع کی کوئی شرط نہیں ہے۔ کبار علماء کی کونسل نے بھی کثرت رائے سے اسے جائز قرار دیا ہے کیونکہ اس میں بغیر نقصان کے سب کی مصلحت ہے۔ واللہ ولی التوفیق۔

——— شیخ ابن باز ———

بیع قرض جائز نہیں مگر..........

سوال میرے ایک دینی بھائی (حسن - م) نے مجھے دو ہزار تونسی دینار قرض دیئے اور اس سلسلہ میں ہم نے جو تحریر لکھی اس میں اس رقم کو جرمن کرنسی میں لکھا۔ قرض کی مدت---- ایک سال---- گزرنے کے بعد جرمن کرنسی کی قیمت بڑھ گئی جس کی وجہ سے مجھے قرض لی ہوئی رقم سے تین سو دینار زیادہ دینا پڑے' تو کیا مجھے قرض دینے والے کے لیے یہ زیادہ رقم لینا جائز ہے یا یہ سود شمار ہو گا؟ خصوصاً جب کہ قرض دہندہ کی خواہش یہی ہے کہ اسے جرمن کرنسی میں قرض ادا کیا جائے تاکہ وہ جرمنی سے گاڑی خرید سکے؟

جواب قرض دہندہ (حسن - م) کے لیے یہ جائز نہیں کہ وہ اس رقم جو اس نے قرض دی ہے یعنی دو ہزار تونسی دینار سے زیادہ وصول کرے' ہاں البتہ اگر آپ اجازت دے دیں تو پھر کوئی حرج نہیں کیونکہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا ہے:

«إِنَّ خِيَارَ النَّاسِ أَحْسَنُهُمْ قَضَاءً» (صحيح مسلم، المساقاة، باب جواز اقتراض الحيوان ... الخ، ح:١٦٠٠)

"بے شک بہترین لوگ وہ ہیں جو قرض ادا کرنے میں اچھے ہوں۔"

صحیح بخاری میں یہ روایت ان الفاظ سے ہے:

«إِنَّ مِنْ خِيَارِ النَّاسِ أَحْسَنَهُمْ قَضَاءً»(صحيح البخاري، الاستقراض، باب هل يعطى أكبر من سنه، ح:٢٣٩٢)

"اچھے لوگوں میں سے وہ بھی ہیں جو قرض ادا کرنے میں اچھے ہوں۔"

مذکورہ معاہدہ پر عمل نہیں ہو گا اور نہ اس سے کچھ لازم آتا ہے کیونکہ یہ ایک غیر شرعی معاہدہ ہے۔ نصوص شرعیہ سے یہ ثابت ہے کہ قرض کی بیع جائز نہیں الا یہ کہ قرض ادا کرتے وقت اتنی رقم ہی ادا کی جائے جتنی کہ بطور قرض لی گئی تھی۔ ہاں البتہ اگر مقروض ازراہ احسان کچھ زائد ادا کرنا چاہے تو وہ ادا کر سکتا ہے جیسا کہ مذکورہ بالا صحیح حدیث سے ثابت ہے۔

——— شیخ ابن باز ———

دوسری کرنسی میں قرض کا ادا کرنا

سوال مجھ سے قاہرہ میں مقیم میرے ایک رشتہ دار نے ۲۵۰۰ مصری گنی قرض طلب کیا تو میں نے اسے دو ہزار ڈالر بھیج دیئے جن سے اسے ۲۴۹۰ مصری گنیاں مل گئیں' اب وہ قرض مجھے واپس لوٹانا چاہتا ہے' یاد رہے ہم نے آپس میں یہ طے نہیں کیا تھا کہ وہ کب اور کس کرنسی میں قرض واپس کرے گا۔ سوال یہ ہے کہ میں اس سے ۲۴۹۰ مصری گنیاں لے لوں جو اب ۱۸۰۰ امریکی ڈالر کے مساوی ہیں (یہ ڈالر ان سے کم ہیں جو میں نے دیئے تھے) یا میں اس سے دو ہزار ڈالر ہی لوں اور یہ ڈالر خریدنے کے لیے اسے ۲۸۰۰ مصری گنیاں ادا کرنا ہوں گی جو کہ تین سو کے قریب اس رقم سے زیادہ ہوں گی جو اسے اس وقت حاصل ہوتی تھی؟

جواب واجب تو یہی ہے کہ وہ آپ کو ڈالر ہی ادا کرے کیونکہ آپ کی طرف سے اسے جو قرض ملا تھا وہ ڈالروں ہی کی صورت میں تھا' لیکن اگر آپ آپس میں اس بات پر مصالحت کر لیں کہ وہ مصری گنیوں میں ادا کر دے تو پھر بھی کوئی حرج نہیں کیونکہ ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ ہم "بقیع یا نقیع میں درہموں کے ساتھ اونٹ بیچتے اور دیناروں میں ان کی قیمت وصول کرتے تھے اور دیناروں میں بیچ کر درہموں میں قیمت وصول کرتے تھے تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

«لاَ بَأْسَ أَنْ تَأْخُذَهَا بِسِعْرِ يَوْمِهَا مَا لَمْ تَفْتَرِقَا وَبَيْنَكُمَا شَيْءٌ»(سنن أبي داود، البيوع، باب في اقتضاء الذهب من الورق، ح:٣٣٥٤ وسنن النسائي، ح:٤٥٨٦)

"اس میں کوئی حرج نہیں جب کہ آپ بیع کے دن کے نرخ کے حساب سے لیں جب کہ بائع اور مشتری کی علیحدگی کے وقت دونوں میں کوئی بات طے ہونے والی باقی نہ رہ گئی ہو۔"

یہ کرنسی کی دوسری کرنسی کے ساتھ بیع ہے' یعنی یہ سونے کی چاندی کے ساتھ بیع کے مشابہہ ہے۔ اگر آپ اور وہ اس بات پر متفق ہو جائیں کہ وہ ان ڈالروں کے عوض مصری گنیاں ادا کرے گا بشرطیکہ آپ اس سے زیادہ گنیاں نہ لیں جو اس وقت آپ کے ادا کئے ہوئے ڈالروں کے مساوی تھیں تو اس میں کوئی حرج نہیں۔ مثلاً اگر دو ہزار ڈالر اب ۲۸۰۰ گنیوں کے مساوی ہیں تو آپ کے لیے تین ہزار گنیاں لینا جائز نہیں ہے' ہاں آپ ۲۸۰۰ گنیاں یا دو ہزار ڈالر لے سکتے ہیں یعنی آپ آج کے نرخ کے مطابق یا اس سے کم لیں' زیادہ نہ لیں کیونکہ زیادہ لینے کی صورت میں آپ اس مال پر نفع لیں گے جو آپ کی کفالت میں نہیں ہے اور نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اس کے نفع سے منع فرمایا ہے جو کفالت میں نہ ہو اور کم لینے کی صورت میں آپ اپنے بعض حق کو لے رہے ہیں اور بعض کو معاف کر رہے ہیں اور اس میں کوئی حرج نہیں۔

—— شیخ ابن عثیمین ——

ہر وہ قرض ربا ہے جو نفع بخش ہو

سوال ایک آدمی نے دوسرے سے قرض مانگا تو اس نے اس شرط پر قرض دیا کہ وہ قرض کی رقم کے عوض اس کی زرعی زمین اپنے پاس رہن رکھے گا اور کاشت کاری بھی کرے گا اور اس کا سارا غلہ خود رکھ لے گا یا آدھا خود رکھے گا اور آدھا زمین کے مالک کو دے دے گا اور یہ سلسلہ اس وقت تک جاری رہے گا جب تک مقروض وہ سارا قرض ادا نہیں کر دیتا جو اس نے لیا تھا' قرض ادا کرنے کے بعد ہی وہ اپنی زمین واپس لے سکے گا۔ اس مشروط قرض کے بارے میں آپ کی رائے میں حکم شریعت کیا ہے؟

جواب قرض تو نرمی کے معاہدوں میں سے ہے اور اس سے مقصود مقروض کے ساتھ نرمی اور احسان ہوتا ہے اور نرمی و احسان وہ امور ہیں جو اللہ تعالیٰ کے ہاں محبوب و مطلوب ہیں کیونکہ اس میں بندگان الٰہی کے ساتھ احسان ہے اور ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَأَحْسِنُوٓا۟ ۛ إِنَّ ٱللَّهَ يُحِبُّ ٱلْمُحْسِنِينَ ﴿١٩٥﴾﴾ (البقرة٢/ ١٩٥)

"اور نیکی کرو بے شک اللہ تعالیٰ نیکی کرنے والوں کو دوست رکھتا ہے۔"

قرض دہندہ کے لیے یہ مشروع و مستحب ہے اور مقروض کے لیے جائز اور مباح ہے۔ حدیث سے ثابت ہے کہ نبی کریم

ﷺ نے ایک شخص سے اونٹ قرض لیا تھا اور پھر آپ نے اس سے بہتر اونٹ واپس کیا۔ [1] قرض جب نرمی اور احسان کا معاہدہ ہے تو پھر یہ جائز نہیں کہ اسے معاوضہ و نفع کے معاہدہ سے بدل دیا جائے کیونکہ یہ اپنے موضوع سے خارج ہو کر بیع اور معاوضہ کے موضوع میں داخل ہو جائے گا۔ یہی وجہ ہے کہ اگر کوئی شخص دوسرے سے یہ کہے کہ "میں تجھے یہ دینار' دوسرے دینار کے عوض ایک سال کے لیے فروخت کرتا ہوں' یا یہ کہے کہ یہ دینار' دوسرے دینار کے عوض فروخت کرتا ہوں" اور پھر دونوں دینار کو قبضہ میں لینے سے پہلے الگ ہو جائیں تو بیع حرام اور ربا ہو گی لیکن اگر وہ اسے ایک دینار بطور قرض دے اور وہ اسے چھ ماہ یا ایک سال بعد واپس کر دے تو یہ جائز ہے حالانکہ قرض دہندہ نے اس کے عوض کو چھ ماہ بعد یا اس سے کم و بیش مدت کے بعد نرمی کے پہلو کو پیش نظر رکھتے ہوئے واپس لیا ہے۔ لہٰذا معلوم ہوا کہ اگر کوئی قرض دہندہ مقروض کے ساتھ کسی مادی نفع کی شرط لگائے تو یہ معاملہ قرض کے موضوع سے خارج ہونے کی وجہ سے حرام ہو جائے گا کیونکہ اہل علم کے ہاں ایک مشہور و معروف قاعدہ ہے کہ ہر وہ قرض جو نفع کا باعث ہو وہ ربا ہے لہٰذا قرض دہندہ کے لیے یہ جائز نہیں کہ وہ مقروض سے کہے کہ میں اس شرط پر قرض دوں گا کہ تم اپنی زمین زراعت کے لیے مجھے دو خواہ وہ اسے اس زمین کی پیداوار سے حصہ بھی دے دے۔ اس صورت میں قرض سے چونکہ قرض دہندہ کو نفع حاصل ہوتا ہے اس لیے یہ قرض اپنے اصلی موضوع نرمی اور احسان سے خارج ہو جانے کی وجہ سے قرض ہی نہیں رہتا۔

——— شیخ ابن عثیمین ———

مال حرام سے قرض لینا

سوال کیا کسی ایسے شخص سے قرض لینا جائز ہے' جس کا کاروبار حرام ہو اور وہ حرام لین دین کرتا ہو؟

جواب میرے بھائی! اس طرح کے آدمی سے نہ قرض لینا چاہیئے اور نہ کوئی اور معاملہ کرنا چاہیئے۔ جب تک اس کے معاملات حرام ہوں' وہ سودی کاروبار کرتا ہو یا کوئی اور حرام معاملہ کرتا ہو تو اس سے لین دین نہ کریں اور نہ اس سے قرض لیں بلکہ واجب ہے کہ ایسے شخص سے دور ہو جائیں' اور اگر وہ حرام اور غیر حرام معاملہ کرتا ہو یعنی اس کے کاروبار میں پاک اور ناپاک کی آمیزش ہو تو پھر اس سے معاملہ کرنے میں اگرچہ کوئی حرج نہیں لیکن افضل یہ ہے کہ اس صورت میں بھی احتیاط کریں کیونکہ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد گرامی ہے:

«دَعْ مَا يَرِيبُكَ إِلٰى مَا لاَ يَرِيبُكَ»(جامع الترمذي، صفة القيامة، باب:٦٠، ح:٢٥١٨ وسنن النسائي، ح:٥٧١٤)

"اس کو چھوڑ دو جس میں شک ہو اور اس کو لے لو جس میں شک نہ ہو۔"

نیز آپ نے فرمایا ہے:

«مَنِ اتَّقَى الشُّبُهَاتِ اسْتَبْرَأَ لِدِينِهِ وَعِرْضِهِ»(صحيح البخاري، الإيمان، باب فضل من استبرأ لدينه، ح:٥٢ وصحيح مسلم، المساقاة، باب أخذ الحلال وترك الشبهات، ح:١٥٩٩)

"جو شخص شبہات سے بچ گیا اس نے اپنے دین اور عزت کو بچا لیا۔"

---

[1] صحیح بخاری' الاستقراض' باب حسن القضاء' حدیث: 2393 و صحیح مسلم' المساقاۃ' حدیث: 1601 - 1600

نیز آپ نے یہ بھی فرمایا ہے:

«الْإِثْمُ مَا حَاكَ فِي نَفْسِكَ وَكَرِهْتَ أَنْ يَطَّلِعَ عَلَيْهِ النَّاسُ»(صحيح مسلم، البر والصلة، باب تفسير البر والإثم، ح: ٢٥٥٣)

''گناہ وہ ہے جو تمہارے دل میں کھٹکے اور تم اس بات کو ناپسند کرو کہ لوگوں کو اس کی اطلاع ہو۔''

مومن تو مشتبہات سے بھی اجتناب کرتا ہے۔ لہٰذا جب آپ کو معلوم ہو کہ اس کے معاملات حرام ہیں یا یہ حرام کاروبار کرتا ہے تو ایسے شخص سے نہ کوئی معاملہ کریں اور نہ اس سے قرض لیں۔

——— شیخ ابن باز ———

ایک کرنسی کی دوسری کرنسی کے ساتھ ادھار بیع

سوال میں نے اضطراری حالات میں ایک غیر مسلم سے اس شرط پر قرض لیا کہ میں اس کے مساوی رقم آزاد کرنسی میں ادا کر دوں گا' یعنی اپنے ملک کی کرنسی کے سوا کسی اور کرنسی میں اور ادا اس وقت کروں گا جب میں سعودیہ میں اپنے کام کی جگہ واپس لوٹ آؤں گا۔ اور جب ایک مدت کے بعد میں سعودیہ میں واپس آیا تو آزاد کرنسی کی قیمت بہت بڑھ گئی اور قرض لی ہوئی رقم سے دگنی ہو گئی' تو کیا اس آزاد کرنسی میں' اس فرق کے باوجود اسے ادا کرنا جائز ہے؟ یا میں اسے صرف اتنی ہی رقم ادا کردوں جتنی میں نے اس سے قرض لی تھی؟

جواب یہ قرض صحیح نہیں ہے کیونکہ یہ حقیقت میں حاضر کرنسی کی دوسری کرنسی کے ساتھ ادھار بیع ہے اور یہ معاملہ سودی ہے کیونکہ ایک کرنسی کی دوسری کرنسی سے بیع صرف اسی صورت میں جائز ہے جب وہ دست بدست ہو۔ لہٰذا آپ کو چاہیئے کہ اسے صرف اتنی رقم واپس کریں جتنی آپ نے اس سے قرض لی تھی نیز اس سودی معاملہ کی وجہ سے اللہ تعالیٰ کے آگے سچی پکی توبہ بھی کریں۔ وباللہ التوفیق۔

——— شیخ ابن باز ———

قرض لے کر تجارت کرنے والے سے زیادہ طلب کرنا

سوال ایک آدمی نے مجھ سے تین سال پہلے قریباً پچاس ہزار ریال قرض لیے اور کہا کہ وہ چھ ماہ کے اندر واپس کر دے گا لیکن اس نے ابھی تک یہ قرض واپس نہیں کیا' اور اس سے وہ تجارت کر رہا ہے' تو کیا یہ جائز ہے کہ میں اس سے اپنے اصل سرمایہ سے زیادہ کا مطالبہ کروں یا یہ ناجائز ہے؟

جواب آپ کو صرف اپنے اصل سرمایہ ہی کا مطالبہ کرنا چاہیئے' اس سے زیادہ کا مطالبہ کرنا جائز نہیں۔ ہاں البتہ اگر وہ ازخود آپ کے حق سے زیادہ اپنی طرف سے دے دے بشرطیکہ آپ اس کا نہ مطالبہ کریں اور نہ اسے اس کا پابند کریں تو یہ اس کے حق میں افضل اور احسان ہے تاکہ وہ اس صحیح حدیث پر عمل کر سکے:

«إِنَّ خِيَارَ النَّاسِ أَحْسَنُهُمْ قَضَاءً» (صحيح البخاري، الاستقراض، باب هل يعطى أكبر من سنه، ح: ٢٣٩٢ وصحيح مسلم، المساقاة، باب جواز اقتراض الحيوان ... الخ، ح: ١٦٠٠)

"بے شک بہترین لوگ وہ ہیں جو احسن انداز میں قرض ادا کریں۔"
اور اس طرح اسے آپ کے احسان کا بدلہ چکانے کا موقع بھی مل جائے گا اور نبی کریم ﷺ کا ارشاد گرامی ہے:
«مَنْ صَنَعَ إِلَيْكُمْ مَعْرُوفًا فَكَافِئُوهُ، فَإِنْ لَمْ تَجِدُوا مَا تُكَافِئُونَهُ فَادْعُوا لَهُ حَتَّى تَرَوْا أَنَّكُمْ قَدْ كَافَأْتُمُوهُ»(سنن أبي داود، الزكاة، باب عطية من سأل بالله عزوجل، ح:١٦٧٢)
"جو شخص تم سے نیکی کرے تو اسے اس کی نیکی کا بدلہ دو اور اگر تمہارے پاس بدلہ دینے کو کچھ نہ ہو تو اس کے لیے اس قدر کثرت سے دعا کرو حتیٰ کہ تمہیں یہ معلوم ہو کہ تم نے اس کا حق ادا کر دیا ہے۔"

——— شیخ ابن باز ———

ہر قرض جو نفع کا باعث ہو وہ سود ہے

سوال اس شخص کے قرض دینے کے بارے میں کیا حکم ہے جو کسی کو اس شرط پر مدت مقررہ کے لیے قرض دیتا ہے کہ وہ بھی اسی مدت کے لیے اتنی ہی رقم اسے بھی بطور قرض دے گا؟ کیا یہ معاملہ اس حدیث کا مصداق ہے کہ ہر قرض جو نفع کا باعث ہے وہ سود ہے۔" لیکن یاد رہے اس نے زیادہ قرض لینے کی شرط عائد نہیں کی۔ رہنمائی فرمائیں۔ جزاکم اللہ خیراً؟

جواب یہ قرض جائز نہیں اس لیے کہ قرض دہندہ نے بھی اتنی ہی رقم قرض لینے کی شرط عائد کی ہے یہ عقد در عقد ہے اور ایک بیع میں دو بیعوں کے حکم میں ہے اور محض قرض دینے کے بجائے منفعت کی شرط ہے اور وہ یہ کہ وہ بھی اسے اتنی ہی رقم بطور قرض دے گا۔ اور علماء کا اجماع ہے کہ ہر وہ قرض جو منفعت زائدہ کی شرط کا متضمن ہو یا اس میں اتنی ہی مقدار میں قرض دینے کی شرط عائد کی گئی ہو تو وہ ربا ہے۔ یہ حدیث:
«كُلُّ قَرْضٍ جَرَّ مَنْفَعَةً فَهُوَ رِبًا»(المطالب العالية:١/ ٤١١، ح:١٣٧٣ وإرواء الغليل ٥/ ٢٣٥، ح:١٣٩٨)
"ہر وہ قرض جو منفعت کا باعث ہو وہ سود ہے۔" ضعیف ہے'
لیکن حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی ایک جماعت سے اس کے ہم معنی اقوال منقول ہیں کہ اگر قرض دیتے ہوئے نفع کی شرط عائد کی گئی ہو یا وہ حکم مشترط میں ہو یا قرض ہی کی شرط عائد کی گئی ہو تو یہ سود ہے۔

——— شیخ ابن باز ———

معینہ مدت کے لیے قرض

ایک مقروض فوت ہوا تو کیا اس کی روح گروی ہو گی؟

سوال جو شخص مقروض فوت ہو جائے اور فقر کی وجہ سے وہ قرض ادا نہ کر سکا ہو تو کیا اس کی روح گروی اور معلق رہتی ہے؟

جواب حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

«نَفْسُ الْمُؤْمِنِ مُعَلَّقَةٌ بِدَيْنِهِ حَتَّى يُقْضٰى عَنْهُ»(جامع الترمذي، الجنائز، باب ما جاء أن نفس المؤمن معلقة ... الخ، ح:١٠٧٩)

"مومن کا نفس اس کے قرض کے ساتھ اس وقت تک معلق رہتا ہے جب تک اسے اس کی طرف سے ادا نہیں کر دیا جاتا۔"

لیکن اس حدیث کو اس شخص پر محمول کیا جائے گا جو مال چھوڑ کر جائے' تو اس کے قرض کو اس کے مال میں سے ادا کر دیا جائے لیکن جس شخص کے پاس مال ہی نہ ہو تو امید ہے کہ یہ حدیث اس کے بارے میں نہیں ہو گی اس لیے کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ لَا يُكَلِّفُ ٱللَّهُ نَفْسًا إِلَّا وُسْعَهَا ﴾ (البقرة٢/ ٢٨٦)

"اللہ کسی شخص کو اس کی طاقت سے زیادہ تکلیف نہیں دیتا۔"

نیز فرمایا:

﴿ وَإِن كَانَ ذُو عُسْرَةٍ فَنَظِرَةٌ إِلَىٰ مَيْسَرَةٍ ﴾ (البقرة٢/ ٢٨٠)

"اور اگر مقروض تنگ دست ہو تو (اسے) کشائش (کے حاصل ہونے) تک مہلت دو۔"

نیز یہ حدیث اس کے لیے بھی نہیں ہے جس نے قرض لیتے وقت اسے ادا کرنے ہی کی نیت کی تھی لیکن وہ وفات تک اسے ادا نہ کر سکا جیسا کہ امام بخاری رحمہ اللہ نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی حدیث کو بیان کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

«مَنْ أَخَذَ أَمْوَالَ النَّاسِ يُرِيدُ أَدَاءَهَا أَدَّى اللهُ عَنْهُ وَمَنْ أَخَذَ يُرِيدُ إِتْلَافَهَا أَتْلَفَهُ اللهُ»(صحيح البخاري، الاستقراض، باب من أخذ أموال الناس ... الخ، ح:٢٣٨٧)

"جو شخص لوگوں سے مال لے اور اسے ادا کرنے کا ارادہ رکھتا ہو تو اللہ تعالیٰ اس کی طرف سے ادا فرما دے گا' اور جو لوگوں سے مال ضائع کرنے کے لیے لے تو اللہ تعالیٰ اسے ضائع کر دے گا۔"

—— فتویٰ کمیٹی ——

مقروض میت کب بری الذمہ ہو گی؟

سوال جیسا کہ آپ جانتے ہیں کہ ترقیاتی بینک ملک کے باشندوں کو مکانات بنانے کے لیے طویل مدت کے لیے قرضے دیتا ہے جنہیں پچیس سالوں میں ادا کرنا ہوتا ہے۔ اگر کوئی مقروض فوت ہو جائے اور اس نے اپنے قرض کی ابھی صرف دو قسطیں ہی ادا کی ہوں اور اس کے بعد اس کے وارث باقی قسطوں کو ان کے اوقات مقررہ میں ادا کریں تو کیا اس سے میت بری الذمہ ہو جائے گی اور وہ اس وعید میں داخل نہ ہو گی جو اس حدیث میں ہے:

«نَفْسُ الْمُؤْمِنِ مُعَلَّقَةٌ بِدَيْنِهِ حَتَّى يُقْضٰى عَنْهُ»(جامع الترمذي، الجنائز، باب ما جاء أن نفس المؤمن معلقة ... الخ، ح:١٠٧٩)

"مومن کی جان اس کے قرض کے ساتھ اس وقت تک معلق ہوتی ہے' جب تک کہ اسے ادا نہیں کر دیا

جاتا۔"

یا وہ تمام قسطوں کے ادا کرنے تک قرض کے ساتھ گروی رہے گی۔ امید ہے آپ اس مسئلہ کی وضاحت فرمادیں گے؟

جواب جب کوئی انسان فوت ہو جائے اور اس کے ذمہ مدت مقررہ میں ادا کیا جانے والا قرض ہو تو اس کی مدت برقرار رہے گی' اور جب اسے وارث ادا کرنے کی ذمہ داری قبول کرلیں اور صاحب قرض مطمئن ہو جائے یا وہ کوئی مناسب ضامن پیش کر دیں یا قرض کے مطابق کوئی چیز رہن رکھ دیں تو امید ہے کہ ان شاء اللہ مقروض اس کی ذمہ داری سے بری ہو جائے گا۔

——— شیخ ابن باز ———

بینک کے قرض کی قسطوں کی فوری ادائیگی

سوال میرے والد صاحب کے ذمہ زمین (جائداد) سے متعلق بینک کا قرضہ تھا اور وہ اب فوت ہو گئے ہیں تو کیا ہم پر یہ واجب ہے کہ ان کی طرف سے سارا قرضہ مکمل طور پر ادا کر دیں یا اگر بینک کی طے شدہ قسطوں کے مطابق ادا کریں تو اس سے بھی وہ بری الذمہ ہو جائیں گے؟

جواب قرضے کو فوری طور پر ادا کرنا لازم نہیں ہے جب کہ وارث یا کوئی اور قرضے کی قسطوں کو ان کے اوقات میں ادا کرنے کی اس طرح سے ذمہ داری اٹھالے جس سے صاحب قرض کا کوئی نقصان نہ ہو کیونکہ مدت مقررہ میت کا حق ہے اور اس حق کے بھی اس کے وارث مالک ہیں' اور ان شاء اللہ اس طرح قسطوں کی صورت میں ادا کرنے میں میت کے لیے بھی کوئی حرج نہیں ہے کیونکہ مؤجل قرضے کی ادائیگی اس کے وقت ہی میں واجب ہے' اور اگر وارث قرض ادا کرنے کی ذمہ داری قبول کریں تو وہ میت کے قائم مقام ہیں' لہٰذا وہ قسطوں کی صورت میں قرض ادا کر سکتے ہیں بشرطیکہ اس میں صاحب قرض کے لیے کسی خطرے کا اندیشہ نہ ہو جیسا کہ ہم ابھی ذکر کر آئے ہیں۔

——— شیخ ابن باز ———

فوت شدہ نے اپنے قرض کے بارے میں نہیں بتایا

سوال ایک شخص فوت ہو گیا' اس کے ذمہ قرض تھا لیکن اس نے قرض کے بارے میں کسی کو نہیں بتایا تو اس کے لیے کیا حکم ہے؟

جواب جب میت کے ذمہ قرض ہو اور وہ وفات سے پہلے کسی کو اس کے بارے میں نہ بتائے تو اس کے وارثوں پر واجب ہے کہ وہ قرض کو اس کے ترکہ میں سے ادا کریں اور اسے اس کی وصیت پر عمل اور وراثت کی تقسیم سے پہلے ادا کریں بشرطیکہ شرعی شہادت سے قرض ثابت ہو جائے۔ اگر وارثوں اور قرض کے دعوے داروں میں کوئی تنازعہ پیدا ہو جائے تو اس کے لیے شرعی عدالت کی طرف رجوع کیا جائے۔

——— شیخ ابن باز ———

تنگ دست کو تمام معاملات میں مہلت دی جائے

سوال کیا تنگ دست کو مہلت دینے کے بارے میں اسلام نے شہری اور تجارتی معاملات میں کوئی تفریق کی ہے؟

جواب ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ وَإِن تُبْتُمْ فَلَكُمْ رُءُوسُ أَمْوَٰلِكُمْ لَا تَظْلِمُونَ وَلَا تُظْلَمُونَ ﴿٢٧٩﴾ وَإِن كَانَ ذُو عُسْرَةٍ فَنَظِرَةٌ إِلَىٰ مَيْسَرَةٍ ﴾ (البقرۃ۲/ ۲۷۹۔۲۸۰)

"اور اگر تم توبہ کر لو گے تو تمہیں اپنی اصلی رقم لینے کا حق ہے جس میں نہ اوروں کا نقصان ہو اور نہ تمہارا نقصان' اور اگر مقروض تنگ دست ہو تو (اسے) کشائش (کے حاصل ہونے) تک مہلت دو۔"

یہ آیات احکام ربا کے سیاق میں ہیں۔ ان میں اللہ تعالیٰ نے اس صاحب سود کو حکم دیا ہے کہ جو کسی فقیر کے ذمہ ہو اور اس کی مدت طویل ہو گئی ہو جس کی وجہ سے سود دگنا' چوگنا ہو رہا ہو تو اللہ تعالیٰ نے اسے حکم دیا ہے کہ وہ سود لینے سے توبہ کر لے اور اپنے اصل مال کے مطالبہ ہی پر اکتفا کرے خواہ وہ کم ہی ہو اور اسی سے وہ اس پر یا اپنے آپ پر ظلم سے بچ جائے گا۔ اور اسے حکم دیا ہے کہ مقروض اگر مفلس اور فقیر ہو تو اپنے اصلی سرمایہ پر اکتفا کرے نیز اسے مہلت دے اور اپنے مال کی واپسی کا سختی سے مطالبہ نہ کرے تو یہ حکم ہر قسم کے مقروض کے لیے ہے خواہ اس کے ذمہ تجارت کا قرض ہو یا ادھار لیا ہوا قرض یا کوئی مالی حق یا اجرت تو اس کی تنگ دستی کی وجہ سے مہلت دینا واجب ہے حتیٰ کہ اللہ تعالیٰ اسے کشائش سے نواز دے۔ تنگ دست مقروض کو قید کرنا جائز ہے نہ اس پر تشدد کرنا جائز جیسا کہ فقہاء نے "باب الحجر" وغیرہ میں لکھا ہے۔

——— شیخ ابن جبرین ———

تنگ دست مقروض کو قید کرنا

سوال میں ایک قیدی ہوں' میرے ذمہ قرض ہے اور قرض کی وجہ سے میں ڈیڑھ سال سے زیادہ عرصہ سے قید میں ہوں۔ میرا قرض خواہ کسی کی ضمانت بھی قبول نہیں کرتا' میں تنگ دست بھی ہوں اور صاحب اہل وعیال بھی تو کیا مجھے قید میں رکھنا جائز ہے؟

جواب اللہ تعالیٰ نے آپ کے مقدر میں جو یہ تکلیف لکھی ہے تو ہم اس پر آپ کو صبر کرنے کی تلقین کرتے ہیں' اللہ تعالیٰ آپ کو اس مشکل سے یقیناً نجات دے گا۔ جس شخص کے بارے میں یہ معلوم ہو کہ وہ تنگ دست ہے اور قرض ادا کرنے کی استطاعت نہیں رکھتا تو اسے قید کرنا جائز نہیں ہے۔ ہاں البتہ کچھ لوگ ایسے بھی ہوتے ہیں جو تنگ دستی کا دعویٰ کرتے ہیں تاکہ لوگوں کے حقوق ہڑپ کر جائیں یا ان کے مال باطل طریقے سے کھا جائیں تو اس صورت میں قید کرنا جائز ہوتا ہے تاکہ یہ معلوم ہو جائے کہ تنگ دستی کے دعویٰ میں سچا کون ہے اور جھوٹا کون!

——— شیخ ابن جبرین ———

صاحب قرض مل نہیں سکا

سوال میرا بھائی فوت ہو گیا ہے اور ان کے ذمہ بہت سے قرض تھے جو کہ الحمدللہ میں نے ادا کر دیئے ہیں اور اب صرف چار سو ریال باقی رہ گئے ہیں اور وہ جس شخص کے ہیں' اسے میں نے بہت ڈھونڈا ہے لیکن وہ مجھے نہیں ملا تو اس

صورت میں مجھے کیا کرنا چاہیئے؟ کیا میں یہ رقم فقراء میں تقسیم کر دوں یا بیت المال میں جمع کرا دوں؟

جواب اگر امر واقع اسی طرح ہے جیسا کہ آپ نے ذکر کیا ہے کہ آپ نے صاحب قرض کو تلاش کیا لیکن وہ نہیں ملا تو آپ اسے اس کی طرف سے صدقہ کر دیں تاکہ اسے اس کا ثواب مل جائے اور اگر بعد میں وہ آ جائے تو اسے آپ بتا دیں۔ اگر وہ اس پر راضی ہو جائے تو بہتر ورنہ اسے اس کی رقم ادا کر دیں اور آپ کو اس صدقہ کی ہوئی رقم کا ان شاء اللہ اجروثواب مل جائے گا۔ وباللہ التوفیق' وصلی اللہ وسلم علی عبدہ ورسولہ محمد وآلہ وصحبہ

—————— فتویٰ کمیٹی ——————

صاحب مال نہیں ملا

سوال میں نے ۱۳۹۸ھ میں حج کیا تو میرے پاس پیسے ختم ہو گئے جس کی وجہ سے میں نے ایک آدمی سے کچھ قرض لیا کہ اپنے گھر واپس جا کر یہ قرض ادا کر دوں گا۔ جب میں حج سے واپس آیا تو میں نے اس آدمی کے بارے میں پوچھا تو مجھے بتایا گیا کہ وہ سفر پر گئے ہیں لیکن اس وقت سے لے کر اب تک وہ واپس نہیں آئے۔ مجھے ان کے پتہ کا بھی علم نہیں اور نہ ان کا کوئی رشتے دار ہی مل سکا ہے تو اس صورت حال میں آپ کی کیا رائے ہے؟ کیا یہ رقم میں سعودیہ کی کسی خیراتی تنظیم کو دے دوں یا اس کی واپسی تک اسے اپنے پاس محفوظ رکھوں یا اسے فقیروں میں تقسیم کر دوں؟ آپ کی اس مسئلہ میں کیا رائے ہے؟

جواب مقدور بھر کوشش کر کے اس آدمی کو مزید تلاش کریں اور اس کے لیے مختلف اسباب و وسائل سے کام لیں' اس کے خاندان' شہر اور شہریت کے بارے میں پوچھیے اور جب امید ختم ہو جائے اور اس کے ملنے سے آپ بالکل مایوس ہو جائیں تو اس کی طرف سے فقراء و مساکین پر صدقہ کر دیں اور جب اس سے ملاقات ہو خواہ بیس سال کے بعد ہو تو اسے حقیقت حال بتا دیں اور اگر وہ اس پر راضی ہو جائے تو بہت بہتر' اسے اس کا اجروثواب ملے گا ورنہ اسے اس کی رقم ادا کر دیں تاکہ آپ اپنے قرض سے عہدہ برآ ہو جائیں اور صدقہ کی ہوئی رقم کا آپ کو اجروثواب مل جائے گا۔ واللہ اعلم۔

—————— شیخ ابن جبرین ——————

وہ فوت ہو گیا اور اس کے میرے پاس تین ہزار ریال ہیں

سوال میرے پاس ایک یمنی آدمی تھا جو میرے گھر میں رنگ سازی کا کام کر رہا تھا' اللہ تعالیٰ کی مشیت سے وہ ایک گاڑی کے حادثہ میں فوت ہو گیا اور اس کے میرے پاس تین ہزار ریال تھے لیکن میرے پاس اس کے وارثوں میں سے کوئی نہیں آیا جسے میں یہ رقم دے دیتا۔ میں نے اپنے شہر کے قاضی سے کہا کہ اس رقم کو وصول کر لے لیکن انہوں نے کہا کہ اس کے وارثوں کے آنے تک میں اسے اپنے پاس ہی رکھوں۔ اب اس شخص کی وفات کو ایک سال سے زیادہ عرصہ ہو گیا ہے' میں نے اس کے بارے میں ان بعض یمنیوں سے بھی پوچھا ہے جن کے ساتھ وہ رہ رہا تھا تو انہوں نے بتایا کہ اس کے حقوق وصول کرنے کیلئے اس کا ایک بھائی عنقریب آئے گا لیکن کافی مدت گزر گئی ہے اور اس کے حقوق وصول کرنے کیلئے کوئی نہیں آیا' لہٰذا امید ہے کہ آپ میری رہنمائی فرمائیں گے کہ میں کیا طریقہ اختیار کروں جس سے بری الذمہ ہو جاؤں اور اس رقم سے نجات حاصل کر لوں جس نے میرے کندھوں پر بوجھ ڈال رکھا ہے؟ اللہ تعالیٰ آپ کی حفاظت فرمائے۔

جواب آپ کو چاہیئے کہ اس کارکن کے حق کی اس کے وارث کی آمد تک حفاظت کریں اور یہ تحقیق کر کے کہ یہ واقعی اس کا وارث ہے' اس کے سپرد کر دیں۔ جب تک آپ کو یہ علم ہے کہ اس کا بھائی آئے گا خواہ یہ مدت کتنی ہی طویل کیوں نہ ہو جائے۔ اگر آپ اس رقم کو تجارت میں لگا کر اس کی افزائش کا اہتمام کریں تو یہ اور بھی بہتر ہے اور اگر اپنے علاقے کی عدالت کے سربراہ کے پاس یہ رقم جمع کرا دیں تو یہ بھی درست ہے اور اگر جمع کراتے ہوئے ان سے رسید بھی لے لیں تو اس میں آپ کے لیے زیادہ احتیاط اور آسانی ہے۔ وصلى الله على نبينا محمد وآله وصحبه وسلم

——— فتویٰ کمیٹی ———

مزدوری اور کرایہ داری کے چند مسائل

نماز جیسے اعمال کے لیے معاہدۂ اجرت

سوال ایک آدمی فوت ہوا جو سخاوت اور حسن اخلاق کا تو مالک تھا لیکن وہ نہ نماز پڑھتا تھا اور نہ روزہ رکھتا تھا تو اس کی وفات کے بعد اس کے اہل خانہ نے ایک شخص کو مال دے دیا تاکہ وہ اس کی طرف سے فوت شدہ نمازیں پڑھے اور روزے رکھے تو کیا یہ شرعاً صحیح ہے؟ اس صورت میں مال لینے کا کیا حکم ہے؟

جواب یہ فوت ہونے والا شخص جو نماز اور روزہ ادا نہیں کرتا تھا' حالت کفر میں فوت ہوا ہے۔ والعیاذ باللہ۔ کیونکہ اہل علم کے راجح قول کے مطابق جس کی نصوص کتاب و سنت اور حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے اقوال سے بھی تائید ہوتی ہے' تارک نماز کافر ہے اور جو نماز کا منکر ہو وہ بھی کافر ہے خواہ وہ نماز پڑھتا بھی ہو۔ نصوص ترک کے بارے میں وارد ہیں' انکار کے بارے میں نہیں' لہٰذا یہ ممکن نہیں کہ اس وصف کو ہم لغو قرار دیں' شریعت نے جس کا اعتبار کیا ہے' یا ہم انہیں انکار پر محمول کریں جیسا کہ بعض اہل علم نے کیا ہے اور تارک نماز کی تکفیر کے بارے میں جو نصوص وارد ہیں' ان کے بارے میں یہ کہا ہے کہ ان سے مراد نماز کا منکر ہے لیکن اس سے تو یہ لازم آتا ہے کہ ہم اس وصف کو لغو قرار دے رہے ہیں جس پر شریعت نے حکم لگایا ہے اور اس وصف کا اعتبار کر رہے ہیں جس کا شریعت نے ذکر ہی نہیں کیا' نیز اس میں تناقض بھی ہے کیونکہ نماز کا منکر تو کافر ہے خواہ وہ نماز پڑھتا بھی ہو' خواہ وہ مسجد میں جا کر باجماعت نماز پڑھتا ہو اور یہ عقیدہ رکھتا ہو کہ نماز پنجگانہ فرض نہیں ہے اور وہ اسے محض نفل عبادت کے طور پر ادا کر رہا ہے تو وہ کافر ہے۔ تو اس سے معلوم ہوا کہ تارک نماز کے کفر کے بارے میں وارد نصوص کو انکار نماز پر محمول کرنا صحیح نہیں ہے۔

اسی طرح اس آدمی کے اہل خانہ نے اس کی نمازوں اور روزوں کے لیے جو مال خرچ کیا ہے تو یہ بھی صحیح نہیں ہے کیونکہ اعمال قربت میں سے کسی عمل کے لیے عقد اجرت صحیح نہیں ہے۔ لہٰذا یہ صحیح نہیں کہ کوئی شخص یہ کہے کہ تم میری طرف سے نماز روزہ ادا کر دو میں تمہیں اس کی اجرت دے دوں گا ہاں البتہ حج کے بارے میں علماء کا اختلاف ہے لیکن یہ اس کی تفصیل کا وقت نہیں ہے لہٰذا اس شخص نے جو یہ مال لیا ہے تو یہ ناحق لیا ہے' اس کے لیے واجب ہے کہ یہ مال انہیں واپس لوٹا دے۔ اس نے جو نمازیں پڑھی ہیں' ان سے اس میت کو کوئی فائدہ نہ ہو گا کیونکہ وہ غیر مسلم ہے اور غیر

مسلم کو کوئی عمل نفع نہیں دیتا حتی کہ اس کا اپنا کوئی عمل بھی نہیں کیونکہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ وَمَا مَنَعَهُمْ أَن تُقْبَلَ مِنْهُمْ نَفَقَٰتُهُمْ إِلَّآ أَنَّهُمْ كَفَرُوا۟ بِٱللَّهِ وَبِرَسُولِهِۦ وَلَا يَأْتُونَ ٱلصَّلَوٰةَ إِلَّا وَهُمْ كُسَالَىٰ وَلَا يُنفِقُونَ إِلَّا وَهُمْ كَٰرِهُونَ ﴿٥٤﴾ ﴾ (التوبة٩/ ٥٤)

"اور ان کے خرچ (اموال) کے قبول ہونے سے کوئی چیز مانع نہیں ہوتی سوا اس کے کہ انہوں نے اللہ سے اور اس کے رسول سے کفر کیا اور نماز کو آتے ہیں تو سست و کاہل ہو کر اور خرچ کرتے ہیں تو ناخوشی سے۔"

نیز فرمایا:

﴿ وَقَدِمْنَآ إِلَىٰ مَا عَمِلُوا۟ مِنْ عَمَلٍ فَجَعَلْنَٰهُ هَبَآءً مَّنثُورًا ﴿٢٣﴾ ﴾ (الفرقان٢٥/ ٢٣)

"اور جو انہوں نے عمل کیے ہوں گے ہم ان کی طرف متوجہ ہوں گے تو ان کو اڑتی خاک کر دیں گے۔"

شیخ ابن عثیمین

کرایہ دار کو نکالنے کے لیے تکلیف پہنچانا

سوال بلڈنگوں کے بعض مالکان کرایہ دار کو اپنی بلڈنگ سے نکالنے کے لیے بعض جواز ڈھونڈتے ہیں اور اس کے لیے کبھی تو صفائی کرنے والے کو صفائی کرنے سے روک دیتے ہیں' کبھی پانی بند کر دیتے ہیں اور کبھی اس طرح کی کوئی اور تکلیف پہنچاتے ہیں' تو کیا شرعاً اس طرح تکلیف پہنچانا جائز ہے؟

جواب مالک پر یہ واجب ہے کہ کرایہ دار کے ساتھ جو معاہدہ کیا ہو تو اسے پورا کرے۔ عمارت اس کے سپرد کرے اور ان تمام شرائط کو پورا کرے جس پر وہ متفق ہوئے ہوں یا جو عرف کے مطابق طے شدہ ہوں اور اس مدت تک ان شرائط کو پورا کرنا چاہیئے جو آپس میں طے ہو' ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ يَٰٓأَيُّهَا ٱلَّذِينَ ءَامَنُوٓا۟ أَوْفُوا۟ بِٱلْعُقُودِ ﴾ (المائدة٥/ ١)

"اے ایمان والو اپنے اقراروں کو پورا کرو۔"

اور رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

«اَلْمُؤْمِنُونَ عَلٰى شُرُوطِهِمْ، إِلاَّ شَرْطًا أَحَلَّ حَرَامًا، أَوْ حَرَّمَ حَلاَلاً» (جامع الترمذي، الأحكام، باب ما ذكر عن رسول الله ﷺ في الصلح بين الناس، ح:١٣٥٢ وسنن ابن ماجه، ح:٢٣٥٣ وسنن أبي داود، ح:٣٥٩٤ والتمهيد:٧/ ١١٧ واللفظ له)

"مومنوں کو اپنی شرطوں کے مطابق عمل کرنا چاہیئے الآیہ کہ کوئی ایسی شرط ہو جو حرام کو حلال یا حلال کو حرام قرار دے۔"

جب معاہدے کی مدت پوری ہو جائے اور فریقین تجدید معاہدہ کے لیے راضی ہوں تو دونوں کو حسب سابق ایک دوسرے کے ساتھ معاہدہ ایفاء کرنا چاہیئے۔ اگر مالک تجدید مدت نہ کرنا چاہے تو کرایہ دار کو چاہیئے کہ عمارت خالی کر کے مالک کو واپس کر دے اور اس میں مزید قیام کر کے اسے تکلیف نہ دے کیونکہ کسی بھی مسلمان کا مال اس کی دلی خوشی کے بغیر حلال نہیں ہے۔

——— فتویٰ کمیٹی ———

حرام کام کرنے والے کو کرایہ پر عمارت دینا

سوال کیا اس شخص کو کرایہ پر عمارت دینا جائز ہے جو حلال و حرام کا کاروبار کرتا ہو اور اس سے کرایہ میں وصول ہونے والی رقم کے بارے میں کیا حکم ہے؟ کیا یہ کمائی حرام ہو گی؟

جواب یہ جائز نہیں کیونکہ اس میں حرام کا اقرار ہے اور اللہ تعالیٰ کے نافرمانوں کے ساتھ معصیت کے کاموں میں تعاون اور ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ وَلَا تَعَاوَنُوا۟ عَلَى ٱلْإِثْمِ وَٱلْعُدْوَٰنِ ﴾ (المائدۃ۵/ ۲)

"اور گناہ اور ظلم کی باتوں میں تم ایک دوسرے کی مدد نہ کیا کرو۔"

ہر وہ شخص جو حرام اشیاء مثلاً آلات لہو و لعب، فحش فلمیں اور فتنہ انگیز تصویریں بیچے تو اسے گھر یا دکان کرایہ پر دینا جائز نہیں ہے، اسی طرح جس شخص کے معاملات سود، دھوکا، چوری اور ناپ تول میں کمی جیسے حرام امور پر مشتمل ہوں یا جو شخص آپ کے گھر کو شراب کی فیکٹری یا لہوولعب یا بدکاری یا اس طرح کے دیگر مذموم اجتماعات کے لیے استعمال کریں جن کے نتیجہ میں نمازوں کا ترک یا حرام امور کا ارتکاب لازم آتا ہو تو ایسے لوگوں کو بھی اپنی عمارت کرایہ پر دینا جائز نہیں ہے اور اس سے حاصل ہونے والا کرایہ اور کمائی مشتبہ اور مکروہ ضرور ہے، کلی طور پر حرام نہیں ہے اور مشتبہ امور سے بچنا بھی مسلمانوں کے لیے واجب ہے۔

——— شیخ ابن جبرین ———

سودی بینکوں کو کرایہ پر عمارتیں دینا

سوال میں ایک عمارت کا مالک ہوں اور مجھ سے ایک ایسا بینک یہ عمارت کرایہ پر لینا چاہتا ہے جو سودی کاروبار کرتا ہے تو کیا ایسے بینک کو کرایہ پر عمارت دینا جائز ہے؟

جواب یہ جائز نہیں کیونکہ مذکورہ بینک اس عمارت کو حرام، سودی کاروبار کے لیے استعمال کرے گا لہٰذا اسے کرایہ پر عمارت دینا ایک حرام کام میں تعاون ہے اور ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ وَتَعَاوَنُوا۟ عَلَى ٱلْبِرِّ وَٱلتَّقْوَىٰ ۖ وَلَا تَعَاوَنُوا۟ عَلَى ٱلْإِثْمِ وَٱلْعُدْوَٰنِ ﴾ (المائدۃ۵/ ۲)

"اور نیکی اور پرہیزگاری کے کاموں میں تم ایک دوسرے کی مدد کیا کرو اور گناہ اور ظلم کی باتوں میں مدد نہ کیا کرو۔"

——— فتویٰ کمیٹی ———

حرام گانوں کی کیسٹوں کے بیچنے والوں کو ....

سوال کیا یہ جائز ہے کہ آدمی اپنی دوکان گانوں کی کیسٹوں اور آلات لہو بیچنے والوں کو کرایہ پر دے؟

جواب کسی ایسے شخص کو کرایہ پر دوکان دینا جائز نہیں جو اسے ایسی اشیاء کے بیچنے کے لیے استعمال کرے جنہیں اللہ تعالیٰ نے حرام قرار دیا ہے۔ مثلاً آلات لہو یا شراب یا سگریٹ وغیرہ کیونکہ یہ اللہ تعالیٰ کے حرام کردہ امور میں تعاون ہے اور ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ وَتَعَاوَنُوا عَلَى الْبِرِّ وَالتَّقْوَىٰ وَلَا تَعَاوَنُوا عَلَى الْإِثْمِ وَالْعُدْوَانِ ﴾ (المائدۃ٥/ ٢)

"اور نیکی اور پرہیزگاری کے کاموں میں تم ایک دوسرے کی مدد کیا کرو اور گناہ اور ظلم کی باتوں میں مدد نہ کیا کرو۔"

اور صحیح حدیث میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے شراب' اس کے پینے والے' پلانے والے' بنانے والے' جس کے لیے بنائی گئی ہو' اٹھانے والے' جس کے لیے اٹھائی گئی ہو' بیچنے والے' خریدنے والے اور اس کی قیمت کھانے والے پر لعنت فرمائی ہے۔ اور یہ اس لیے کہ پلانے والا' بنانے والا' نچوڑنے والا' اٹھانے والا اور بیچنے والا یہ سب لوگ گناہ اور ظلم کی اس بات میں تعاون کرنے والے ہیں۔

—— شیخ ابن باز ——

ویڈیو کی فلمیں بنانے والوں کو کرایہ پر دوکان دینا

سوال میرے پاس ایک شارع عام پر کچھ دوکانیں ہیں جن میں سے بعض میں نے کرایہ پر دے دی ہیں اور بعض باقی ہیں۔ چند دن پہلے میرے پاس ایک آدمی آیا اور اس نے مجھ سے ایک دوکان طلب کی تاکہ وہ اس میں ویڈیو فلموں کا کام شروع کرے لیکن مجھے اسے دوکان دینے میں تردد ہے۔ کیا میرے لیے یہ جائز ہے کہ میں حرام اشیاء بیچنے والوں کو اپنی دوکان کرایہ پر دوں؟ کیا ایسا کرنے میں مجھے گناہ ہو گا؟

جواب حرام اشیاء بیچنے یا بنانے والوں کو دوکان وغیرہ کرایہ پر دینا جائز نہیں مثلاً سگریٹ یا فلمیں بیچنے والوں یا داڑھی مونڈنے والوں کو کیونکہ یہ گناہ اور ظلم کی باتوں میں تعاون ہے اور ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ وَتَعَاوَنُوا عَلَى الْبِرِّ وَالتَّقْوَىٰ وَلَا تَعَاوَنُوا عَلَى الْإِثْمِ وَالْعُدْوَانِ ﴾ (المائدۃ٥/ ٢)

"اور نیکی اور پرہیزگاری کے کاموں میں تم ایک دوسرے کی مدد کیا کرو اور گناہ اور ظلم کی باتوں میں مدد نہ کیا کرو۔"

—— شیخ ابن باز ——

حرام امور کے لیے استعمال کرنے والوں کو دوکانیں کرایہ پر دینا----

سوال ان لوگوں کو دوکانیں اور گودام کرایہ پر دینے کے بارے میں کیا حکم ہے جو حرام اشیاء مثلاً آلات لہو ولعب فروخت کرتے ہوں یا وہ گانوں کی کیسٹیں' سگریٹ یا مخالف شریعت مجلات وغیرہ فروخت کرتے ہوں یا انہوں نے حجامت کی دوکانیں بنائی ہوں؟

نیز ان لوگوں کو عمارات اور گھر کرایہ پر دینے کے بارے میں کیا حکم ہے' جو وہاں آلات لہو پر جمع ہوتے ہوں جس سے نماز میں سستی یا ترک لازم آتا ہو' نیز اس مال کا کیا حکم ہے جو پراپرٹی آفس ایسے لوگوں کو کرایہ پر عمارت دلوا کر وصول کرتا ہے؟

جواب ایسے لوگوں کو دوکانیں یا گودام کرایہ پر دینا جائز نہیں ہے جو ان میں حرام اشیاء بیچیں یا سٹور کریں کیونکہ یہ گناہ اور ظلم کی باتوں میں تعاون ہے اور اس سے اللہ تعالیٰ نے منع فرمایا ہے' ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ وَتَعَاوَنُوا۟ عَلَى ٱلْبِرِّ وَٱلتَّقْوَىٰ ﴾ (المائدة٥/ ٢)

"اور نیکی اور پرہیزگاری کے کاموں میں تم ایک دوسرے کی مدد کیا کرو۔"

اسی طرح ان لوگوں کو بھی دوکانیں کرایہ پر دینا جائز نہیں ہے جو داڑھیاں مونڈتے ہیں کیونکہ داڑھی مونڈنا حرام ہے اور انہیں دوکانیں کرایہ پر دینے میں حرام کام پر اعانت اور سہولت فراہم کرنا ہے۔

اسی طرح ان لوگوں کو بھی گھر وغیرہ کرایہ پر دینا جائز نہیں ہے جو فعل حرام یا ترک واجب کے لیے جمع ہوتے ہوں' لیکن رہائش کے لیے مکان کرایہ پر دینا جائز ہے۔ اور اگر اس میں رہنے والا کسی معصیت یا ترک واجب کا ارتکاب کرے تو اسے گناہ نہیں ہو گا کیونکہ اس نے تو اسے مکان رہائش کے لیے دیا ہے' معصیت یا ترک واجب کے لیے نہیں' اور نبی کریم ﷺ نے فرمایا ہے:

«إِنَّمَا الأَعْمَالُ بِالنِّيَّاتِ، وَإِنَّمَا لِكُلِّ امْرِیءٍ مَّا نَوٰی»(صحيح البخاري، بدء الوحي، باب كيف كان بدء الوحي ... الخ، ح:١ وصحيح مسلم، الإمارة، باب قوله ﷺ إنما الأعمال بالنية، ح:١٩٠٧ واللفظ للبخاري)

"اعمال کا انحصار نیتوں پر ہے اور ہر آدمی کے لیے صرف وہی ہے جو اس نے نیت کی۔"

جب دوکانوں' گوداموں اور گھروں کو کرایہ پر دینا حرام ہے تو ان سے حاصل ہونے والی کمائی بھی حرام ہے۔ پراپرٹی دفتر والے اپنی محنت اور کوشش کا ان سے جو معاوضہ لیتے ہیں وہ بھی حرام ہے کیونکہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا ہے:

«إِنَّ اللهَ إِذَا حَرَّمَ شَيْئًا حَرَّمَ ثَمَنَهُ»(سنن أبي داود، البيوع، باب في ثمن الخمر والميتة، ح:٣٤٨٨ ومسند أحمد: ١/ ٢٤٧ ودارقطني: ٣/ ٧، ح: ٢٧٩١، واللفظ له)

"بے شک اللہ تعالیٰ جب کسی چیز کو حرام قرار دیتا ہے تو اس کی قیمت کو بھی حرام قرار دے دیتا ہے۔"

میں اللہ تعالیٰ سے دعا کرتا ہوں کہ وہ ہم سب کو صراط مستقیم پر چلنے کی توفیق عطا فرمائے' ہمارے رزق کو پاک کر دے اور اسے اپنی اطاعت کے لیے مددگار بنا دے۔

—— شیخ ابن عثیمین ——

شفعے کا بیان

ناگزیر لوازم اور ناقابل تقسیم جائداد میں شفعہ

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ وَحْدَهُ وَالصَّلٰوةُ وَالسَّلَامُ عَلٰی مَنْ لاَّ نَبِيَّ بَعْدَهُ، مُحَمَّدٍ وَّعَلٰی آلِهِ وَصَحْبِهِ ـ وَبَعْدُ

جیسا کہ کبار علماء کی کونسل کے ساتویں اجلاس میں جو طائف شہر میں شعبان ۱۳۹۵ھ کے نصف اول میں منعقد ہوا' یہ طے پایا تھا کہ آٹھویں اجلاس کے ایجنڈا میں ناگزیر لوازم میں شفعہ کے مسائل کو شامل کر لیا جائے' چنانچہ اس مسئلہ پر کونسل کے آٹھویں اجلاس میں غور ہوا جو ریاض شہر میں ربیع الآخر کے نصف اول میں منعقد ہوا تھا' نیز اس اجلاس میں ناقابل تقسیم جائداد میں شفعہ کے مسئلہ پر غور کیا گیا۔

اس تحقیقی مقالہ کو دیکھنے کے بعد جو بحوث علمیہ وافتاء کی مستقل کمیٹی کی طرف سے تیار کیا گیا اور اراکین کونسل کے باہمی تبادلۂ افکار و آراء کے بعد کونسل نے کثرت رائے سے یہ طے کیا کہ ناگزیر لوازم مثلاً کنواں' راستہ اور پانی کی گزر گاہ وغیرہ میں شرکت کی صورت میں شفعہ ثابت ہے' نیز جو ناقابل تقسیم جائداد ہو مثلاً چھوٹے گھر اور دوکانیں وغیرہ تو ان میں بھی شفعہ ثابت ہے کیونکہ دلائل کے عموم کا یہی تقاضا ہے۔ نیز شفعہ میں جو مصلحت یعنی مبیع یا حق مبیع میں شریک سے ضرر کو دور کرنا ہے تو اس کا بھی یہی تقاضا ہے۔ اور شفعہ کی مشروعیت کے بارے میں جو شرعی نصوص ہیں ان سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے۔ امام ترمذی رحمہ اللہ نے اپنی سند کے ساتھ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

«اَلشَّرِيكُ شَفِيعٌ، وَالشُّفْعَةُ فِي كُلِّ شَيْءٍ» (جامع الترمذي، الأحكام، باب ما جاء أن الشريك شفيع، ح:۱۳۷۱)

"شریک کو شفعہ کا حق حاصل ہے اور شفعہ کا حق ہر چیز میں ہے۔" طحاوی نے اپنی سند کے ساتھ حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ "نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ہر چیز میں شفعہ کے ساتھ فیصلہ فرمایا ہے۔"[1]

حافظ ابن حجر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ طحاوی کی سند کے راویوں میں کوئی حرج نہیں۔ اسی طرح امام احمد اور اصحاب سنن اربعہ رحمہم اللہ نے اپنی اپنی سندوں کے ساتھ حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

«اَلْجَارُ أَحَقُّ بِشُفْعَةِ جَارِهِ، يَنْتَظِرُ بِهَا، وَإِنْ كَانَ غَائِبًا، إِذَا كَانَ طَرِيقُهُمَا وَاحِدًا»(سنن أبي داود، البيوع، باب في الشفعة، ح:۳۵۱۸ ومسند أحمد:۳/ ۳۰۳)

"پڑوسی اپنے پڑوسی کے شفعہ کا زیادہ حق دار ہے۔ وہ موجود نہ بھی ہو تو اس کا انتظار کرنا چاہیے بشرطیکہ دونوں کا راستہ ایک ہو۔"

امام بخاری نے "صحیح" میں اور امام ابوداود اور امام ترمذی رحمہم اللہ نے اپنی سنن میں اپنی اپنی سندوں کے ساتھ حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے:

«قَضَى النَّبِيُّ ﷺ بِالشُّفْعَةِ فِي كُلِّ مَالٍ لَمْ يُقْسَمْ، فَإِذَا وَقَعَتِ الْحُدُودُ، وَصُرِّفَتِ الطُّرُقُ فَلَا شُفْعَةَ»(صحيح البخاري، البيوع، باب الأرض والدور والعروض ... الخ، ح:۲۲۱۴)

"رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہر اس چیز میں شفعہ کا فیصلہ فرمایا ہے جو تقسیم نہ ہوئی ہو' اور جب حدود متعین ہو جائیں اور راستے الگ الگ بنا دیے جائیں تو پھر شفعہ نہیں ہے۔"

[1] طحاوی فی شرح معانی الآثار: 122/4

ان احادیث سے استدلال یہ ہے جیسا کہ امام ابن القیم رحمہ اللہ نے اپنی کتاب "اعلام الموقعین" میں ذکر فرمایا ہے کہ وہ پڑوسی جو کسی ناگزیر ضرورت میں دوسرے آدمی کے ساتھ شریک ہو مثلاً یہ کہ دونوں کا راستہ ایک ہو یا پانی میں یا پانی کی گزرگاہ میں وہ شریک ہوں یا اس طرح کے دیگر ناگزیر لوازم میں شریک ہوں تو تقسیم کو کلی تقسیم نہیں سمجھا جائے گا بلکہ وہ اپنے پڑوسی کے ساتھ بعض حقوق ملکیت میں شریک ہو گا' اور اگر دونوں کا راستہ ایک ہو تو پھر حدود واقع نہ ہوں گی بلکہ بعض حاصل ہوں گی اور بعض کی نفی ہو گی کیونکہ حدود کا وقوع تو ہر اعتبار سے اس بات کو مستلزم یا متضمن ہے کہ راستوں کو الگ الگ کر دیا جائے۔

وباللہ التوفیق' وصلی اللہ علی محمد وآلہ وصحبہ وسلم

صدر اجلاس

عبدالعزیز بن عبداللہ بن باز
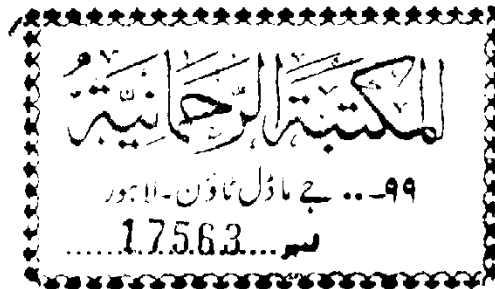
فتاویٰ اسلامیہ (جلد اول)

فتاویٰ علوم اسلامیہ میں ایک ممتاز اور مفید علم اور فن کا درجہ رکھتا ہے۔ قرآن مجید کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ خود اللہ تعالیٰ نے مسائل کے جواب میں فتویٰ کے اسلوب کو قرآن میں بیان کیا ہے۔ حضور نبی اکرم ﷺ کی تمام احادیث صحیحہ عملاً فتاویٰ کی حیثیت رکھتی ہیں۔ آپ ﷺ کی اتباع میں خلفائے راشدین کے علاوہ ایک سو تیس سے زائد صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے فتاویٰ بھی محفوظ ہیں۔ فتویٰ نویسی سے قرآن مجید کے عمدہ تفسیری نکات اور احادیث کی شرح میں تعبیر نصوص کا علم حاصل ہوتا ہے۔ فتاویٰ کے ذریعے ہر عہد کے مسائل و مشکلات میں دینی رہنمائی کا التزام ملتا ہے۔ اسی باعث ہم اس شعبہ علم کو اسلام کی حیات مستقبلہ کی ضمانت تصور کرتے ہیں۔ فتویٰ نویسی کے بہت سے آداب اور تقاضے ہیں۔ جہاں ان سے دینی رہنمائی کے لیے روشنی میسر آتی ہے، وہاں بعض علمائے سوء نے گمراہی اور ضلالت کا سامان بھی پیدا کیا ہے۔

پیش نظر فتاویٰ عصر حاضر کے تین ممتاز سعودی علماء اور مفتیان کرام سماحۃ الشیخ عبدالعزیز ابن باز، فضیلۃ الشیخ محمد بن صالح بن العثیمین رحمہما اللہ تعالیٰ اور فضیلۃ الشیخ عبداللہ بن عبدالرحمٰن الجبرین حفظہ اللہ تعالیٰ اور "اللجنة الدائمة للإفتاء والإرشاد" کی علمی مساعی کا نتیجہ ہیں جن کا بنیادی استدلال کتاب و سنت اور آثار صحابہ پر مبنی ہے۔ اپنے اسی منہج اور طرز استدلال کے باعث یہ فتاویٰ سلفی فکر کی نمائندگی کرتا ہے۔ عقائد و عبادات سے لے کر معاملات تک کوئی پہلو ایسا نہیں ہے جس کے بارے میں کتاب و سنت کے مطابق رہنمائی فراہم نہ کی گئی ہو۔ یوں ہم اسے عہد حاضر میں مسائل دینی اور امور دنیوی کی اصلاح کا دائرۃ المعارف قرار دے سکتے ہیں۔ دارالسلام نے اس عظیم فتاویٰ کا ترجمہ اور اس کی طباعت کے امور کو اپنے روایتی اور مثالی اسلوب کے مطابق پیش کیا ہے۔ اللہ تعالیٰ اس کے مطالعہ کو ہمارے لیے نافع اور آخرت میں موجب فلاح بنائے۔ آمین

پروفیسر عبدالجبار شاکر

دار السلام
کتاب و سنت کی اشاعت کا عالمی ادارہ
ریاض ○ جدہ ○ شارجہ ○ لاہور
لندن ○ ہیوسٹن ○ نیو یارک